کیا اکبر اُمّی محض تھا؟

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اکبر لکھنا پڑھنا مطلقاً نہیں جانتا تھا۔ انگریز مورخین کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ نریندر ناتھ لا نے اپنی کتاب 'پروموشن آف لرننگ' میں اس سے اختلاف کیا ہے۔[1] بیورج نے اپنی کتاب کا جو پیش نامہ لکھا ہے اُس میں اُس نے نریندر ناتھ کے خیال کی تردید[2] کرکے اکبر کے ناخواندہ ہونے پر زور دیا ہے۔ ہم ان سطور میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کرتے ہیں۔

جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے[3]:-

"پدرم در اکثر اوقات با دانایان ہر دین و مذہب صحبت می داشتند خصوصاً با پنڈتان و دانایان ہندو با آنکہ اُمّی بودند از کثرت مجالست با دانایان و ... در گفتگو با ایشان ظاہر می شد کہ ہیچ کس پی بہ اُمّی بودن ایشان نمی بردند و از دقائق نظم و نثر چنان می رسیدند کہ ما فوق آن متصور نبود"

اسمتھ اپنی مشہور تاریخ 'اکبر' میں لکھتا ہے[4] کہ "اگرچہ اکبر کی تعلیم کے لئے پے در پے استاد یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے مگر ان کی سب کوششیں ناکام رہیں۔ اکبر استادوں کے نقطۂ نظر سے بالکل ناکارہ تھا۔ اُسے لکھانے پڑھانے کیلئے جس قدر کوششیں کی گئیں اُن سب کا اس نے اس کامیابی سے مقابلہ کیا کہ وہ الف بے بھی نہ سیکھ سکا۔ وہ آخر عمر تک نہ کچھ پڑھ سکتا تھا اور نہ اپنا نام لکھ سکتا۔"

---

[1] نریندر ناتھ لا۔ پروموشن آف لرننگ صفحہ ۱۳۹

[2] ایضاً ایضاً پیش نامہ صفحہ ی

[3] تزک جہانگیری مرتبہ سرسید احمد مرحوم صفحہ ۱۵

[4] اسمتھ۔ اکبر۔ صفحہ ۲۲

آنحضرت کا ترجمہ بالکل غلط کیا ہے۔ وہ "عمدہ حکم و مصالح" کے یہ معنی سمجھا ہے کہ اکبر عمدہ حکمتوں
سے ماہر تھا۔ پورے فقرہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ "اکبر کے عمدہ حکمتوں میں ماہر ہونے اور نیز
حرف آمیزی کی طرف مائل نہ ہونے کا سبب یہ ہے ...."

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کی اس غلطی سے اصل مطلب پر کچھ اثر نہیں پڑتا لیکن ذرا غور کرنے
سے کافی فرق معلوم ہوتا ہے۔ اکبر نامہ کے مصنف کا منشا اس فقرہ سے اکبر کی بے شوقی اور اس کے لکھنے
پڑھنے کی طرف مطلقاً توجہ نہ کرنے کی بہترین مصلحت بیان کرنا ہے۔ اس طریقہ بیان سے مصنف کی
غرض اخفائے حقیقت زیادہ صاف معلوم ہوتی ہے بمقابلہ اس مفہوم کے جو بیوریج نے لیا ہے۔

تعجب ہے کہ باوجود اکبر نامہ و آئین اکبری میں اکثر مقامات پر اکبر کے براہ راست چشمہ فیض ازلی
سے علم و حکمت مقتبس کرنے کا تذکرہ ہے جو خوشامد و مداہنہ بیانی کے علاوہ [illegible] "پیراں نمی
پرند و مریداں می پرانند" سے مدح و ذم دونوں سے کسی طرح خالی نہیں۔ اسمتھ جیسا قابل مورخ اس قسم کے
بیان کو اس قدر صحیح سمجھتا ہے کہ سر مو اس سے تجاوز کرنا نہیں چاہتا۔

امی محض ہونے کا دعویٰ اپنے مقصد کے لئے مذہبی درس اور بانیان مذاہب کے طبقہ علیا
میں کسی نہ کسی طرح جگہ پانے کیلئے بیقرار ہے ایسی صورت میں جبکہ رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم
جو مسلمانوں کے نزدیک خاتم الرسل اور سرور انبیاء ہیں امی محض تھے ایک معمولی بات ہے۔

یہاں تک تو اسمتھ کا جواب ہوا۔ رہا جہانگیر کا بیان کہ اس کا بھی ایک جواب تو یہی ہے۔
دوسرا جواب یہ ہے کہ تزک جہانگیری کے دو نسخے ہیں۔ ایک وہ جس کو سرسید احمد مرحوم نے مدوّن کیا
اور جس کو راجرز نے انگریزی کا جامہ پہنایا۔ دوسرا نسخہ وہ جس کا پرائس نے ترجمہ کیا۔ اصل نسخہ شائع
نہیں ہوا اس کا برٹش میوزیم میں کوئی نسخہ موجود نہیں۔ اس لئے میں نہ دیکھ سکا۔ پرائس کا ترجمہ
اس وقت پیش نظر ہے اس میں ایک مقام پر جہانگیر اکبر کی بابت لکھتا ہے۔

؎ پرائس۔ انگریزی ترجمہ واقعات جہانگیری مطبوعہ [illegible] صفحہ [illegible] و [illegible]۔

"ان پنڈتوں کے ساتھ میرے والد ہمیشہ گفتگو کیا کرتے تھے - وہ درحقیقت ہندوؤں کے ہر قسم کے علما کے ساتھ صحبت رکھتے تھے - اگرچہ وہ اُن کی قابلیتوں سے خاص طور پر فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن ان کی نثر ونظم میں اس قدر لطافت آگئی تھی کہ ایک انجان شخص ان کو جملہ علوم وفنون کا عالم جید خیال کرتا ہوگا۔"

اگر پرائس والی تزک کے اس مقام کا دوسری تزک کی اوپر نقل کی ہوئی عبارت سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں عبارتوں میں ایک ہی مضمون ہے لیکن پہلی عبارت میں لفظ امی دو جگہ آیا ہے اور اس میں ایک جگہ بھی نہیں۔

اس دوسری تزک (جسے پرائس نے واقعاتِ جہانگیری کا نام دیا ہے) کے اصلی ہونے کی بابت بہت کچھ شکوک ظاہر کئے گئے ہیں۔

ریو مرتب فہرست متحف برطانوی لکھتا ہے[1] کہ دوسری تزک جو جعلی ہے شاہجہاں کے اوائل عہد میں اصلی تزک کو جس میں شاہجہاں کے خلاف بہت سی باتیں ہیں پس پشت ڈالنے کے لئے لکھی گئی۔

ایلیٹ بھی ریو کا ہم خیال ہے۔ اس نے ان دونوں تزکوں کے چند جزوی اختلافات کو بیان کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تزک کسی بادشاہ کی نہیں بلکہ جوہری کی تصنیف ہوسکتی ہے کیونکہ اس میں زروسیم اور جواہرات کی قیمتوں سے خاص طور پر اعتنا کیا گیا ہے[2]۔ جس قدر اختلافات بیان کئے گئے ہیں وہ زیادہ تر مختلف چیزوں کے مصارف کے تخمینہ کی بابت ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس تنقید مخالف کا خواہ وہ ریو کی ہو یا ایلیٹ کی ہو اس امر کہ تزک کی بحث ماتحن فیہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا کیونکہ اس بحث کا تعلق نہ شاہجہان سے ہے جو شاہجہاں کی وجہ سے بدلی گئی نہ زروسیم کی قیمت یا تخمینۂ مصارف سے ہے کہ اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو۔ اس کا تعلق تو اکبر کے امّی وغیر امّی ہونے سے ہے جسے دونوں نقادوں کی تنقیدوں سے کچھ سروکار نہیں۔

---

[1] ریو۔ فہرست کتب فارسیہ متحف برطانوی صفحہ ۲۵۳۔

[2] ایلیٹ۔ تاریخ ہند جلد ۶ صفحہ ۲۵۱ سے ۲۹۰ تک۔

علاوہ بریں "واقعات جہانگیری" اگرچہ جہانگیر کی لکھی یا لکھائی ہوئی نہیں ہے تو کم از کم اس کے شاہجہان کے ابتدائی عہد میں لکھے جانے سے کسی کو انکار نہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جو نہ تو اکبر کے عہد سے بہت پیچھے تھا اور نہ اُس ذہنیت سے جو عہد اکبری میں بانیٔ دین الٰہی کے زیر حمایت نشو و نما پا رہی تھی متاثر تھا۔ اس لیئے اس نام نہاد واقعات جہانگیری کی شہادت تزک اصلی کے مقابلہ میں کم از کم بحث ما نحن فیہ کے متعلق زیادہ معتبر ہو سکتی ہے۔

رہی کیتھولک مشن کی شہادت کہ اکبر اُمّی محض تھا اس کا جواب یہ ہے کہ جب اکبر اور ارکان سلطنت کسی خاص غرض سے اس کے خواندہ ہونے کو چھپا رہے تھے تو ایک اجنبی جماعت جسے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع خاص صورت میں ملتا تھا حقیقت حال کیونکر معلوم کر سکتی تھی۔

اکبر کے اُمّی ہونے کی تائید میں ایک دلیل یہ پیش کیجاتی ہے کہ ہندوستان میں بادشاہوں کا ناخواندہ ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ علاءالدین خلجی اور سلطان حیدر علی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ ان کی بابتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ یہ مکتب میں بٹھائے گئے تھے یا ان کی تعلیم کے لیئے استاد مقرر ہوئے تھے۔ یہ دونوں سپاہی زادہ تھے اور سپاہی زادہ اُس زمانہ میں عام طور پر نوشت و خواند سے بے بہرہ ہوتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں ہمایوں کو اکبر کی تعلیم کی طرف پوری توجہ تھی۔ وہ خود عالم تھا۔ اُس نے کئی استاد یکے بعد دیگرے مقرر کئے۔ اس کا ایک خط موجود ہے جس میں اس نے اکلوتے بیٹے کو تعلیم کی بابت بہت کچھ شفقت انگیز نصیحتیں کی ہیں۔

یہ امر دیگر ہے کہ باپ شفیق کی اس قدر توجہ و اعتنا کے باوجود وہ علم حاصل نہ کر سکا لیکن اسی کے ساتھ یہ لغو ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا بالکل نہ سیکھ سکا۔ ذہین بچے لکھنا پڑھنا بہت جلد سیکھ جاتے ہیں البتہ شوق نہ ہونے کی صورت میں زیادہ ترقی نہیں کر سکتے۔ کوئی ایسی مثال نہیں کہ بچہ باقاعدہ مدرسہ میں بٹھایا گیا ہو یا اس کے لیئے استاد مقرر کیا گیا ہو اور کچھ زمانہ تک یہ سلسلہ جاری رہا ہو اور وہ تاہم لکھنے پڑھنے سے نابلد رہا ہو۔ الف بے تے لکھنے کے بعد سب سے پہلے لڑکے کو اپنے نام لکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ لفظ اکبر کا لکھنا مشکل نہیں۔ پھر یہ کس طرح ذہن میں آسکتا ہے کہ وہ اپنا نام تک

لکھنا نہیں جانتا تھا۔

ہمایوں اپنے بیٹے کو اکثر خط لکھا کرتا تھا۔ یہ کسی طرح قرینِ قیاس نہیں کہ ایسے بیٹے کے پاس جسکی تعلیم کے لئے استاد مقرر ہوں باپ کا خط آئے اور وہ اُسے مطلقاً نہ پڑھ سکے۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں "آئین آموزش" کے زیرِ عنوان جو کچھ لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ "بفرمودۂ گیتی خداوند" طریقۂ حرف آموزی و تعلیم اس قدر سہل کر دیا گیا کہ "بسی روشن آنچہ لبالہا آموختے بماہ بل بروز درکشید و ہمانے بہ شگفت در آمد"

اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ اکبر سواد خواں تھا تب ہی تو وہ یہ طریقہ نکال سکا۔ اگر خود اُس نے یہ طریقہ ایجاد نہیں کیا تو کم از کم مشورہ ضرور دیا۔ طریقۂ نوشت و خواند کی تسہیل کی بابت مشورہ وغیرہ دینا اسی شخص کا کام ہوسکتا ہے جو خود لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ اور اگر بفرض محال اُس نے اپنے زمانۂ طفولیت میں لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تو کیا یہ قرین قیاس ہے کہ اس کے تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد جب "آئین آموزش" اس قدر سہل ہوجاتا ہے تو وہ اس سے متمتع نہیں ہوتا اور جوں کا توں ناخواندہ رہنا گوارا کرتا ہے۔ مذہبی آزادی و روحانی بلند پردازی تو آگے چلکر پیدا ہوئی۔ اوائل حکومت میں تو وہ ہر طرح محتاط و پاسدار مذہب تھا۔ اگر طفولیت میں اُس نے بفرض محال لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا تو نئے قسم کے خیالات پیدا ہونے تک یعنی اُس زمانہ تک جب "امی" بننے کا سودا پیدا ہوا وہ ضرور لکھنا پڑھنا سیکھ گیا ہوگا۔

علاءالدین اور حیدر علی کی بابت یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی نے نبی یا بانئ مذہب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ لہٰذا اگر ان کی ناخواندگی مشہور ہے تو وہ درحقیقت ناخواندہ ہی ہوں گے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان کی تعلیم کا کچھ حال معلوم نہیں۔ لیکن اکبر کا ناخواندہ مشہور ہوتا اسکے مذہبی خیالات کی بنا پر کافی مشکوک ہے اور دیگر دلائل کی روشنی میں کلیتہً مردود۔

لہ آئین اکبری مطبوعہ کلکتہ جلد اوّل صفحہ ۲۰۱۔

ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے[1]۔

"روز بروز کاردانان آگاہ دل آنرا بوقت عرض ہمایوں رسانند و ہر کتابے را از آغاز تا بانجام شنوند و ہر روز کہ بداں جا رسد بشمارہ آں ہندسہ بقلم گوہر بار نقش کنند و بعدد اوراق خوانندہ را نقد از سرخ و سفید بخشش شود"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اکبر ہندسہ لکھنا جانتا تھا۔ بلاخ مَن نے اس عبارت کا ترجمہ اس طرح پر کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقط نشان کر دیتا تھا۔ اس کے ترجمہ کا ترجمہ یہ ہے "...... جہاں کہیں پڑھنے والے رُک جاتے ہیں۔ بادشاہ اپنی قلم سے صفحات کے عدد کے مطابق نشان بنا دیتا ہے ......" یعنی وہ " بشمارہ آں ہندسہ" کا ترجمہ "صفحات کے عدد کے مطابق" کرتا ہے۔ وہ 'کردن' کو فعل مفرد سمجھکر 'نقش' کو مفعول قرار دیتا ہے اور لفظ 'ہندسہ' سے صفحات مراد لیتا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ دراصل 'نقش کردن' فعل مرکب ہے بمعنی "ثبت کردن" اور 'ہندسہ' اس کا مفعول ہے۔ اس جملہ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ہر روز جہاں کہیں پڑھنے والا پہونچتا ہے اُس کے عدد کے مطابق ہندسہ بنا دیتا ہے۔ 'اسکے' میں ضمیر راجع ہے یا تو 'روز' کی طرف یا 'جا' کی طرف۔ یعنی شمار آں سے مراد یا تو 'شمار روز' یعنی تاریخ ہے یا "شمار جا" یعنی شمار صفحہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہر روز اپنی قلم سے جہاں تک پڑھا جاتا ہے تاریخ بنا دیتا ہے۔ بلاخ من کا ترجمہ غلط بھی ہے اور بے معنی بھی کیونکہ صفحات کے نمبر کے مطابق نشان بنا دینے کے کچھ معنی نہیں۔ اگر یوں کہتا کہ صفحات کے نمبر پر نشان کر دیتا ہے تو بھی ایک بات ہوتی۔ گلیڈون نے اس فقرہ کا ترجمہ قریب قریب صحیح کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے[2] کہ تاریخ ماہ کے ساتھ اس جگہ جہاں پڑھنے والا چھوڑتا ہے نشان بنا دیتا ہے۔ بہرحال اس فقرہ سے دو معنی سمجھے جا سکتے ہیں یا تو صفحات کے نمبر

---

[1] آئین اکبری مدونہ بلاخ من جلد اول صفحہ ۱۱۵۔

[2] انگریزی ترجمہ آئین اکبری از گلیڈون (مطبوعہ کلکتہ) صفحہ ۱۳۰

لکھ دینا یا تاریخ بنا دینا (آخری معنی زیادہ صحیح ہیں) دونوں صورتوں میں اکبر کا ہندسہ لکھ دینا ثابت۔

امیر حیدر حسینی واسطی بلگرامی نے جو غلام علی آزاد کے نبیرہ تھے اکبر کی تاریخ میں ایک کتاب موسوم بہ "سوانح اکبری" لکھی ہے۔ اکبرنامہ۔ تاریخ بدایونی۔ طبقات اکبری۔ تاریخ فرشتہ اکبرنامہ شیخ اللہ داد فیضی سرہندی۔ مآثر الامرا اور چہار دفتر منشآت ابوالفضل۔ اس کتاب کے ماخذ ہیں۔ منشآت ابوالفضل کی بابت قابل مصنف لکھتا ہے کہ عام طور پر تین دفتر متداول ہیں اور چوتھا دفتر جو بہ از معلوما ہی کمیاب ہے۔ میں نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اس تالیف کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بلاخ من جیسا فاضل مورخ اسے "تنقیدی تاریخ" بتاتا ہے اور لکھتا ہے[1] کہ "تاوقتیکہ تاریخ عہد اکبر کے متعلق تمام مصادر و ماخذ کا ترجمہ نہ ہو جائے میں یورپین مورخین کو یہ رائے دونگا کہ انہیں 'سوانح اکبری' کو اپنی محنت و کاوش کی بنیاد قرار دینا چاہئے۔ اس کتاب کی تالیف میں ان تاریخوں سے مدد لیگئی ہے جن سے پیشرو مورخین نے کام نہیں لیا۔ ہندوستانی کی لکھی ہوئی تنقیدی تاریخ غالباً صرف یہی ایک ہے۔"

اس سوانح اکبری میں فاضل مورخ اکبر کے مکتب میں بیٹھنے کا حال یوں لکھتا ہے[2]

"مکتب نشستن شاہزادہ و ذکر اساتذہ او۔ ختم شوال سال نہصد و پنجاہ و چہار کہ از عمر شاہزادہ چہار سال و چہار ماہ و چہار روز سپر شدہ بود در مکتب در آوردند و ملا زادہ عصام الدین ابراہیم را بایں خدمت اختصاص بخشیدند و از سوانح ایں کہ برائے افتتاح ساعتے خاص باتفاق اہل تنجیم تعین کردہ بودند۔ چوں ساعت مختار رسید شاہزادہ بذوق بازی در گوشہ رفت کہ بایں ہمہ توجہ و اہتمام جنت آشیانی ہر چند تکاپو نمودند بہ دند دہما حکمت ایزدی دریں باب نزد مولف آنست کہ ظاہر بیناں معلوم کنند کہ حصول ہیں

---

[1] ترجمہ آئین اکبری۔ بلاخ من صفحہ ۳۱۶ حاشیہ ذیل۔

[2] سوانح اکبری قلمی نسخہ صفحہ ۱۹۔ برٹش میوزیم۔

امر موقوف بر عنایت فیاض حقیقی است۔ در تبہ رسوم اصحاب علم نجوم گرفتار تباید بود۔ چنانچہ پادشاہ باآنکہ در ساعت مختار ستارہ شناساں آغاز خواندان نہ نمود لیکن استعداد شایستہ در ادراک دقائق شعر و انشا پیدا کرد و خود ہم سخن را موزوں می نمود "

اس عبارت کے آخری حصہ سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ وہ تعلیم سے ضرور بہرہ اندوز ہوا۔ فاضل مورخ نے اکبر کے "ساعت مختار" کے وقت روپوش ہوجانے کی جو مصلحت ایزدی بیان کی ہے اگر معقول نہیں تو سہی اس کا اصل مطلب پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ہمارا مدعا اس عبارت کے نقل کرنے سے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ 'سوانح اکبری' کے فاضل مؤلف کے نزدیک بھی اکبر کسی صورت سے امی اور ناخواندہ نہ تھا۔ وہ بہرصورت حاصل ہے۔

علاوہ بریں رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ظفرنامہ کا ایک قدیم قلمی نسخہ ہے۔ اس کے سر ورق پر اکبر کے دست خاص کا لکھا ہوا لفظ 'فردیں' موجود ہے۔ اس کے نیچے جہانگیر کے قلم کی لکھی ہوئی یہ تصدیق ہے کہ یہ لفظ عرش آشیانی کا لکھا ہوا ہے اور پھر اس کے نیچے شاہجہاں کی تحریر ہے۔ یہ لفظ 'فردیں' نہ کسی مبتدی بچہ کا خط معلوم ہوتا ہے اور نہ کسی منشی خوش قلم کا۔ اوسط درجہ کا خط ہے۔

ان سطور کو ملاحظہ کرنے کے بعد قارئین کرام خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اسمتھ کا یہ خیال کہ "اکبر آخر عمر تک نہ کچھ پڑھ سکتا تھا اور نہ اپنا نام لکھ سکتا" یا جہانگیر کا یہ ریمارک کہ "اُمّی بودند" کہاں تک صحیح یا غلط ہے۔

زرتشت اور بُدھ

(۲)

(بسلسلہ ماہ نومبر)

جب ہم زرتشتیت کے خدا کی حقیقت و ماہیت سے گزر کر اُس کے افعال و اعمال کی طرف توجہ کرتے ہیں تو ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ اہورامزدہ کی تمام طاقتیں حق و عدل کو اپنی پشت پناہی میں لئے ہوئے ہیں اور جملہ سئیات و منکرات کے خلاف صف آرا ہیں۔ یہ دوگونہ خیال فوراً عقیدۂ جزا و سزا کی تعمیر کردیتا ہے۔ زرتشت ایک ایسے وقت کی آمد کا امیدوار ہے جبکہ حق و باطل کا یہ معرکہ اول الذکر کی فتح کامل پر ختم ہوجائیگا۔ حق کی یہ جیت دنیا کے حق و ناحق کے بڑے بڑے کیمپوں سے لیکر معمولی افراد کے باہمی نزاعات و مشاجرات تک حاوی ہوگی۔ (حدیث نبوی متعلق یوم الحساب .... یہاں تک کہ بے سینگ والی بکری سینگ والی بکری سے بدلہ لیگی!) پس زمین پر خدا کی بادشاہت آنیوالی ہے، اور "جبروت" اسکی زندہ و موجودہ علمبردار ہے۔ مرنے پر ہر شخص کا جائزہ لیا جاتا ہے جس کے بعد نیک کردار لوگ اہورامزدہ کے "دارالنغمات" میں چلے جاتے ہیں، اور بُرے لوگ ایک غار تاریک و عمیق میں جاگرتے ہیں جہاں تمام ارواح خبیثہ انکی رفیق حال اور شریک عذاب ہوتی ہیں (ملاحظہ ہو یاسن ۴۸-۷، ۵۱-۸، اور ۵۰-۴ نیز ۴۶-۱۱، ۳۱-۲۰، اور ۴۹-۱۱) ان فیصلجات میں مسند عدل و قضا پر خود زرتشت متمکن ہوتا ہے۔

"جو لوگ افکار سیئہ کی اقلیم کا تاج و تخت حاصل کرلیتے ہیں وہ اُس دن انتہائی کسمپرسی کی حالت میں ہوں گے۔ وہ نالہ و فغاں کرتے ہوں گے، وہ پیغمبر کی نوید راحت کے لئے تڑپتے ہوں گے۔ لیکن اُسوقت پیغمبر ہی ان کی محرومی پر مہر لگا دیگا اور ان کو

چہرۂ حق کے مشاہدے سے دیدہ بردوختہ کردے گا" (یاسن ۳۲ - ۱۳)

"فانی انسانوں میں سے جس کسی کو اسپیتاما زرتشت کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے کی توفیق ہوگی اُس کو اہورامزدہ زندگیٔ دوام بخشیگا" (یاسن ۴۶ - ۱۳)

زرتشت، شافع امت کی قبا میں بھی نظر آتا ہے، چنانچہ:

"جو کوئی انسان، مرد ہو خواہ عورت، ایسے کام کرتا ہے جو خدا کی نظر میں پسندیدہ اور بہترین اعمال ہیں اُس کو مزدہ اہورا فکر صالح کے توسط سے جبروت عطا کریگا۔ میری جماعت کے جو لوگ فرائض عبادت و عبودیت بجالائینگے ان کو اپنی معیت میں لیکر میں پُل صراط کو عبور کردوں گا" (یاسن ۴۶ - ۱۰)

گاتہ کے اندر اسی قسم کے بیانات کے بین السطور میں ایسا مترشح ہوتا ہے کہ شفاعت کے دائرے میں زرتشت انہی لوگوں کو لینا چاہتا ہے جنہوں نے اسکی حیات میں اسکی ہدایت و لقا کو حاصل کیا اور غالباً وہ ان لوگوں کو اپنے علَم کے سایہ میں رکھنا نہیں چاہتا جو اس کے بعد اُسکی امت میں داخل ہونا چاہیں، البتہ اپنے ذاتی مریدوں کے ساتھ اُس کا جو تعلق ہے اس کا رشتہ موت سے منقطع نہ ہوگا۔

زرتشت کی شریعت میں عورتوں کو جو بلند مقام دیا گیا ہے اور نسائیت کے متعلق جس غیر معمولی اور مفرط قسم کی فیاضی سے کام لیا گیا ہے وہ زرتشتیت کی ممتاز ترین خصوصیات میں سے ہے۔ عورت کی قدر و قیمت میں غالباً عورت کو اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ "شخصیت" کو ہے! شخصیت علی الاطلاق زرتشت کی نظر میں انتہائی محترم چیز ہے اور اس کے تمام مظاہر کو وہ خراج عزت ادا کرنا چاہتا ہے۔ اور بلا شبہ عورت بھی ایک شخصیت کی حامل ہے۔ ہیئت اجتماعیہ کے اندر اپنے فرائض ادا اس کل کے ایک جزء کی حیثیت سے عورت اہم نہیں ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ وہ بھی ایک مستقل شخصیت کا مظہر ہے! خود زرتشت کا خدا اپنی تمام ذات و صفات میں سب سے زیادہ ایک شخصیت ہی ہے![۵]

---

۵ نوٹ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

زرتشت کے دین کا ایک دوسرا عنصر یہ ہے کہ داعی مذہب مستقبل میں ایک "نجات دہندہ" کا منتظر ہے جو اپنی ذات میں خود زرتشت ہی ہوگا۔ لیکن اُس وقت کا زرتشت نہیں بلکہ اُسکا نقش ثانی جسکی نشوونما بعد میں ہوگی۔ گاتھا کی بشارت ہے:

"آنیوالے نجات دہندہ کی ذات قدسی کا جو اپنے وقت میں "بہت شریعت کا مکین ہوگا" زرتشت کے ساتھ ایک رشتۂ خلت "اخوت" یا "ابوت ہوگا" (یاسن ۴۴ - ۱۱)

"مستقبل کے نجات دہندہ کو جاننا چاہیئے کہ خود اُس کا انجام کیا ہوگا" (یاسن ۴۸ - ۹)

گویا زرتشت اپنے ہی انجام بخیر کے لیئے یہاں دست بدعا ہے!

"لوگوں کو مزدہ کی مرضات حاصل کرنا چاہیئے تاکہ آیندہ نجات دہندہ (موعودہ) اہورا کے قدوم میمنت لزوم کیلیئے راستہ صاف ہو" (یاسن ۵۳ - ۲)

عہد حاضر میں ایک ہادی وقائد کی موجودگی اور مستقبل میں ایک نجات دہندہ کی آمد کی خوشخبری ان دونوں چیزوں نے ملکر زرتشتیت کے تخیل کو بہت مستحکم و پائندہ بنا دیا۔ جو محض خواب و خیال

نوٹ صفحہ گزشتہ:-

بدھ کے بعض مقولوں کا جو اس نے عورت کے متعلق کہے ہیں ان خیالات سے موازنہ کیجیئے اور "تفاوت رہ" کو ملحوظ رکھیئے۔

"پس یہ ہے عورت کی سرشت! ایسی حالت میں وہ کیونکر محبوب یا مستند ہو سکتی ہے؟" (فو شو ہسنگ سان کنگ صفحہ ۳۲)

"ایک شخص معہ اپنی اس عقل و دانش کے جو اس نے اپنی سابقہ دنیاؤں میں پیدا کی ہے فنون لطافت کا ماہر بنسکتا ہے لیکن ایک عورت — وہ ضعف ارادہ، نقص عقل، اور غلوئے محبت کی پتلی — بھلا کس طرح بہترین حق کی صفات کی بجا آوری سے عہدہ برآ ہو سکیگی؟"

"پس ہر مرد کو ہوش و حواس سے کام لینا چاہیئے اور عورت کو مردود سمجھکر اُس کے دامن سے بچ جانا چاہیئے"

(صفحات ۲۲۲، ۲۳۳، ۱۰۰۰ کتب مذکورہ) (انتخاب آکسفورڈ تاریخ ہند جلد ۲ باب ۲ صفحہ ۲۴)

سے بہت بالاتر تھا بلکہ جس نے ایک حقیقی واقعیت حاصل کرلی تھی، چنانچہ زرتشت نے اپنی زندگی میں اپنی قوم کے اندر ایک عادل ومحتسب خدا کے عقیدے کو پورے طور پر نقش دل کر دیا ہستی باری کے متعلق بعد کے اَدْوَار میں اگرچہ یہ تصور مسخ وموہوم ہوتا رہا لیکن اُس کا جو نقش اول زرتشت نے قائم کردیا تھا وہ اہلِ زرتشت کے قلوب سے قطعی طور پر کبھی محو نہ ہوا۔ البتہ زرتشت کی وہ بشارتیں بروئے کار نہ آئیں، کوئی دوسرا پیغمبر اس کے عقب میں مبعوث نہ ہوا، اسکی وجہ سے قدیم شرک وبت پرستی کا بیشتر حصہ پھر عود کرآیا لیکن زرتشتیت کا روح رواں یعنی ایک خدائے عادل ومحسن کا خیال حی ولا یموت رہا اور موجودہ "پارسیت" خواہ وہ اپنے کسی اور مقاصد میں ناکام رہی ہو، لیکن اپنے ان مخصوص صفات رکھنے والے خدا کی پرستش کی وہ ایک زندہ یادگار ہے، وہ خدا جو کسی نہ کسی دن اپنے ایوانِ عدالت کو منعقد کریگا اور کسی نجات دہندہ کو بھیجے گا۔

زرتشت کی تعلیمات کی اولین مخاطب اسکی قوم ہی ہے لیکن نفس خطاب کی عمومیت اس تخصیص کو گوارا نہیں کرتی، بلکہ یہ معلم اعظم ساری نوع انسانی کو اپنی چشم تصور کے سامنے اپنے پیغام کو قبول کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ عالمگیر دعوت کیلئے وہ بارگاہِ خداوندی سے اس طرح پر دانۂ اجازت طلب کرتا ہے:

"اے مزدہ! مجھکو حکم فرما کہ میں ہر زندہ متنفس کو اپنی ملت میں داخل کروں" (یاسن ۳۱-۳)

وہ توبہ وانابت کی ایک صلائے عام دیتا ہے:

"ہم اپنے کلمہ حق کے ذریعے سے قزاقوں کے انبوہ کو انکے کیفر کردار کو پہونچائیں گے"
(یاسن ۲۸-۵)

"غلط کاری کا کفارہ کیا ہے؟ یہ نہیں تو معافی کی جستجو کے کیا معنی ہیں؟" (یاسن ۵۱-۴)

"جب تورانی فرائیانہ (ایک غنیم قبیلہ) کی مبارک وسعید ذریات کے نسبی قطب سے

چشمہ حق اُبلے گا تب وہ فکر صالح کے حریم درس میں داخل ہوں گی اور اُس وقت مزدہ انکو

امان بخشے گا"۔ (یاسن ۴۶ - ۱۲)

اب ہم اپنی عنان توجہ ہندوستان کے پیغمبر اعظم گوتم سدھارتھ کی طرف پھیرتے ہیں، یعنی عارف خانوادۂ ساکیا مہاتما بدھ! جیسا کہ معلوم ہے ابتدا میں ہندوستان اور ایران کا قدیم مذہب ایک ہی تھا، لیکن اوّل الذکر ملک کے اندر اس مذہب کو ایک دوسرا ماحول ملا جس کے زیر اثر اُس نے عرصۂ دراز تک ایک مختلف نوعیت کی نشو و نما حاصل کی۔ اہلِ تاریخ کا روایاتی مکتب اگر صحیح کہتا ہے تو اس کا یہ منشا ہے کہ قبل بدھ کی بعثت کے تقریباً نصف صدی کا دور اس مذہب پر ایسا گزرا جس کے اندر اُس نے مخصوص قسم کی ارتقائی تغیرات قبول کئے، لیکن اسی مسئلہ کے متعلق مورخین و محققین کی ایک دوسری جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ زمانہ پانسو برس سے لیکر ایک ہزار سال تک طویل ہے! بہرحال اسی انقلاب کی نوعیت کا یہ حال تھا کہ ایک عام ذہنی بیداری پیدا ہو گئی تھی اور کم از کم ارض و سما کے پُرشوکت مظاہر والے "ارباب فطرت" اب انسان کی جبین نیاز کا مطالبہ کرنے سے قاصر تھے! اس کے علاوہ ایک اور ارادہ اور ایک اور عقیدہ پیدا ہو گیا تھا جنمیں سے ایک کا ظہور ایران کے اندر مسیحی کے عہد تک نہوا اور دوسرا کبھی بھی معرض وجود میں نہ آیا۔ ہمارا روئے سخن علی الترتیب برہمنیت کے احبار و رہبان کے نظام اور تناسخ ارواح کے تخیل مذہبی کی طرف ہے!

آخر الذکر عقیدہ کی ہمہ گیری کا یہ حال تھا کہ اُس کے اثر سے گوتم بدھ بھی نہ بچا، چنانچہ اُس مجدد اعظم کی ذہنیت کی تشکیل میں اس عوام و خواص کے یقین نے معتد بہ دخل پایا۔ گوتم نے ایک ایسے عہد طلائی میں تربیت پائی جس کے محاسن و قبائح دونوں اُس کے دل و دماغ کی ترکیب کے عناصر بنے! ہندوستان جنت نشان کی عام فضا کا ایک نظارہ کر لیجئے اور اس فضا کی جیتی جاگتی پیداوار کے وجود میں آنیکے منتظر ہو جائیے: ایک وسیع و عریض ملک ہے جس کے طول و عرض میں سرسبزی و شادابی، زرخیزی و زرریزی کا ایک منظر بچھا ہوا ہے، اجناس خوراک اور اسباب معیشت کی فراوانی ہے، امن و امان کا دور دورہ ہے، عظیم الشان شہر آباد ہیں جو ایک زبردست تمدن کا گہوارہ

بننے کے لئے تیار ہیں ، لیکن آبادی کے لئے زمین کسی طرح ناکافی نہیں ہے نہ کسی پر دنیا تنگ ہے ، اقتصادی کشمکش کی طرح سیاسی تصادم بھی مفقود ہے ، چنانچہ کوئی ایسا زبردست محرک موجود نہیں ہے جو کسی عظیم حرکت کے لئے داعیۂ عمل بنے ۔ لوگوں کے افکار و خیالات اپنی ذات کے اندر محدود تھے اور کوئی پبلک ذہنیت پیدا نہ تھی ، نہ جماعت و ملت کے مقاصد کی خاطر اپنے ذاتی مفاد کی قربانی کے جذبے نے پرورش پائی تھی ۔ ضعف و پیری اور مرض و موت کے علاوہ انسان کو نظام کائنات سے کوئی شکوہ نہ تھا ۔ آبادی کو کوئی اندرونی یا بیرونی خطرہ لاحق نہ تھا اور اسی وجہ سے ملت نوازی اور وطن خواہی کے تخیلات و جذبات کتم عدم سے منصۂ شہود پر نہ آئے تھے ۔ اسی شے کا فقدان کامل تماجو اس وقت کے ہندوستان کی زندگی کا سب سے مرکزی عنصر ہے ۔ بیشک جنگیں بکثرت ہوتی رہتی تھیں ، لیکن سب ذاتی و شخصی اغراض کے لئے ۔ ایک خاندان انحطاط پذیر ہوتا تو دوسرا تاج و تخت اور علم و نشان کا مالک بنجاتا ۔ مگر یہ اختلال و اضطراب برِاعظم ہند کے بحرِ اعظم کا محض سطحی تموج ہوتا ، چنانچہ علی العموم ہر چہار اطراف میں سکون طاری رہتا اور لوگوں کے لئے آقاؤں کی اس تبدیلی میں موسمی تغیرات سے زیادہ جدت یا اہمیت نہ تھی ! نسل و خون کے احساسات بالکل معدوم اور معطل تھے چنانچہ مروجہ جنگوں کے کسی میدانِ کارزار میں کسی ایک قوم کو بحیثیت مجموعی دوسری قوم کے خلاف صف آرا نہ دیکھا گیا ، بلکہ وہ صرف دو سلطنتوں کے پرچموں کا تصادم ہوتا تھا ۔ ایک ہی نسل کے افراد تقریباً نصف برِاعظم کی وسعت میں پھیلے ہوئے تھے جس کے اندر متعدد اور مختلف تاجداروں کے علم لہراتے ہوتے تھے ، نیز ایک سے زیادہ قومیت کے لوگ کسی ایک ہی حکومت کی رعایا بھی ہوتے تھے ! اس تمام قرن میں ایک مرتبہ بھی ملک کی وحدتِ ملی کے قلعہ کی فصیل میں کسی بیرونی تیشے کی ضرب سے ایسا رخنہ نہ پڑا جس کی طرف احاطۂ قلعہ کی ساری آبادی دوڑ پڑی ہو اور اس رخنے کو اپنے جسموں سے پُر کرنے کی جدوجہد میں اُس کو اپنا گوشتہ لحد بنانا قبول کیا ہو ! یہ کام خاندان تو کرتے تھے یا کبھی کبھی شہر ، لیکن کبھی کسی پوری قوم نے اس وحدتِ ارادہ اور اشتراکِ عمل کا ثبوت نہ دیا ! ہندوستان کی حکومت قومیں نہ تھیں ، انکی صحیح تر تعبیر " ذاتی جائدادوں " سے کیجا سکتی ہے جنکے

اندر حکمراں روح کوئی نہ کوئی مسلک حیات ہوتا تھا۔

پس گوتم نے ہندوستان کے اندر کسی قومی مصیبت کو نہ دیکھا، بلکہ صرف انفرادی و شخصی مشکلات کو۔ اس کے مشاہدے کے سامنے کوئی ملی وطنی حادثہ یا خطرہ نہ تھا جیسا کہ زرتشت کے وطن کے اندر درپیش تھا، بلکہ محض انسانیت عمومی کے مشترک و عالمگیر ہموم و غموم تھے جو مصائب کی حیثیت سے زرتشت کے متخیلہ سے مَس بھی نہ ہوتے تھے! پس مقدس گوتم اور زرتشت بزرگ کی دعوتوں اور تحریکوں میں جو اصولی فرق (انفرادیت و اجتماعیت کا) تھا وہ ان دو مذاہب کی تاریخ کے "مطالعہ مقابلہ" (Comparative Study) میں ایک اہم ترین نکتہ ہے!

گوتم ایک محبت پاش شاہی باپ کی آغوش شفقت میں پلا تھا، جہاں وہ ہر قسم کی ناملائم چیزوں سے مامون و مصئون تھا، وہ شاہی محل کے حصار بلندیوں کی ایک منزل عشرت سے محصور تھا، جہاں اگر دن تھا تو عید کا، اور رات تھی تو شب برات۔ اس بیریہ میش زندگی کے طوفان ناز و نعم میں اگر اس کو ایک امتلائی احساس ہونے لگا ہو تو چنداں عجیب نہیں! اس شبستان عشرت کی بہشتی فضا سے گھبرا کر شہزادہ گوتم کا اس کو خیرباد کہہ دینا اس قدر بوالعجبی آمیز نہیں ہے جس قدر کہ عین توقع کے مطابق اور حالات کا طبعی نتیجہ!

پس جیسا کہ "ٹھنڈے سایہ کے نیچے بندھا ہوا ہاتھی صحرا کے آزاد خارزار کے لئے زنجیریں توڑانے لگتا ہے"[5]، گوتم نے بالآخر اپنے ولی نعمت باپ سے ذرا باہر چلنے پھرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ یہ نقل و حرکت پہلے تو محلات شاہی کے چمنستانوں اور نزہت گاہوں تک محدود رہی لیکن بہت جلد پایہ تخت کے کوچہ و بازار تک جا پہونچی۔ اس وقت ہر قسم کی احتیاط دمیش بینی ملحوظ رکھی جاتی تھی کہ نازک دل شہزادہ کوئی ناگوار منظر نہ دیکھنے پائے، لیکن مقدرات الٰہی کا سد باب کون کر سکتا تھا! شہزادہ محل شاہی کے دروازے پر جونہی اول روز نمودار ہوا تو ہاتف تقدیر نے کہا:

---

[5] بالفاظ تو شو ہنگ سانگ کنگ صفحہ ۱۹۔

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم!

اقلیم عرفان و روحانیت کا تاج و تخت اسی شہزادۂ عالی تبار کا منتظر تھا!

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را!

الغرض شہزادہ گوتم کی سیر و گشت کے دوران میں کئی بار ایسا اتفاق ہو ہو گیا کہ سرِ راہ بعض بڈھے، کمزور اور بیمار لوگ نظر آ گئے، متعدد دفعہ مردہ نعشوں کا منظر بھی پیش نظر ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام اسباب کارکنانِ قضا و قدر نے ترتیب دئے تھے،

بامیدِ آنکہ روزے بشکار خواہی آمد!

شہزادہ ہر بار مکدر و کبیدہ خاطر ہو ہو کر گھر لوٹتا۔ روز بروز یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا کہ اُس کا یہ سارا اثاثہ حصار، قصور و محلات، اشجار و انہار اور خدم و حشم، نیز اُسکی حور تمثال بیوی جو اُسکی آغوش محبت کا سب سے خوشنما گلدستہ تھی، مع اُس نومولود نورِ نظر و لختِ جگر کے جس کی آمد نے محل شاہی کی بزم طرب کو اور بھی چمکا دیا تھا، صرف ایک حسنِ اتفاق کا نتیجہ ہیں، نیز یہ کہ وہ دائمی نہیں!

خوش است عمر دریغا کہ جاودانی نیست — بس اعتبار بریں پنج روز فانی نیست،
درخت قد صنوبر خرام انساں را — مدام رونقِ نوبادۂ جوانی نیست،
گلیست خرم و خنداں و تازہ و خوشبو — و لے امید ثباتش چنانکہ دانی نیست!
کدام باد بہاری وزید در آفاق — کہ باز در عقبش آفت خزانی نیست۔

شہزادہ کا یہ رنگ صحبت دیکھکر باپ نے اُس کی دلبستگی کا سامان کرنا چاہا تاکہ اُس کی توجہ ان پریشان کن خیالات سے ہٹا کر دوسری طرف منعطف ہو جائے، چنانچہ رقاصہ لڑکیوں کی ایک جماعت بھیجی گئی جنہوں نے محبوب شہزادے کو اپنے جھرمٹ میں لے لیا اور رقص و نغمہ شروع کر دئے، لیکن وہ بالکل غیر متاثر رہا۔ باپ نے یہ معلوم کر کے حسینوں کے مجمع کو دوچند اور مرغوب تر

کردیا، لیکن شہزادے کی بے حسی و سرد مہری میں بالکل فرق نہ آیا! تب تو یہ کیا گیا کہ ماہپاروں اور مہرخوں کے ایک پورے پرستان نے دلگرفتہ شہزادے کو اپنی آغوشِ عیش میں لے لیا، لیکن وہاں زبانِ حال پر یہی شکوہ تھا کہ:

دیکھیے حوریں دکھائی جاتی ہیں امتحاں ہے عاشقِ ناشاد کا!

اپنے لختِ دل کی یہ وحشت اور گریز پائی دیکھکر باپ نے گوتم کو ایک ایوانِ عیش میں پہونچا دیا اور حسن و رعنائی کے انتہائی زہد شکن نمونوں کو وہاں اُس کی مصاحبت کے فرائض تفویض کئے، ساتھ ہی چاروں طرف سے دروازے بند کردیئے گئے اور "شوقِ فضول" اور "جرأتِ رندانہ" کی آخری فضا پیدا کردی گئی لیکن وہاں یہ حال تھا کہ ع

بآبِ خضر اگر عاشق رسد لب تر نمی سازد:

ایک ہی ضرب میں ساری زنجیریں کٹ گئی تھیں اور اب اُس جوانِ حق کا پائے آزاد سیم و طلا اور لعل و گوہر کی بیڑیوں کو پازیب تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھا!

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما!
اے علاجِ نخوت و ناموسِ ما اے تو افلاطون و جالینوسِ ما!

قصہ مختصر شہزادہ گوتم کی طبیعت ذرا بھی افاقہ پذیر نہ ہوسکی، دل کی تڑپ اور بیٹ، جنون و خفقان کی درجے کو پہونچ گئی، چنانچہ ایک دن رات کو جو کہ چاندنی رات تھی اور "منزلِ نور" کو جانیوالے مسافروں کے "شدِ رحال" کیلئے موزوں ترین وقت و ساعت، ہر دلعزیز شہزادہ اس ساری جنت ارضی کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتا ہے۔ ایک شاعر نے اس "شبِ ہجرت" کو بڑے اثر انگیز طریقے سے یوں بیان کیا ہے:

اے زمینِ خاک بسر! یوں نہ ہو اندوہگیں میں شہِ یک شب ہوں تیرا، تیری قسمت ہوں نہیں
تیری خاطر اور تیرے بچوں کی خاطر لے زمیں مضطرب ہیں میرے دل کو قرار اصلاً نہیں
ہم تیرے بھی ہوں تو بیتے گر شب غم

لے لیا اپنے جگر میں مَیں نے تیرا تیرِ غم

اتمی صورت ہے تیری اے سیہ پوش آسماں، — تو گھٹا ہے اشکِ غم کی یا ہے آہوں کا دھواں

اشکِ خوں دامن پہ ہیں یا ہیں شفق کی سرخیاں — داغ تاباں ہیں مہ و خورشید سینے میں عیاں

تو ہے محزوں اہلِ عالم کے مصائب دیکھکر

شامِ غم، صبحِ قیامت ہیں ترے شام و سحر

اے ستارو! تم سراپا بنکے چشمِ انتظار — دیکھتے ہو میری جانب صورتِ امیدوار،

لو اب آیا میں! اب آیا تم پہ ہونیکو نثار — کب سے ہوں آوارگی کی آرزو میں بیقرار،

آہ میں جکڑا ہوا ہونیکی زنجیروں میں ہوں

ہر گھڑی آزاد ہو جانے کی تدبیروں میں ہوں

عشرتِ ایامِ آغازِ جوانی الوداع! — الوداع اے تاج و تختِ مرزبانی الوداع!

الوداع اے ذوق و شوقِ عیشِ فانی الوداع! — الفراق اے خرمی و شادمانی الوداع!

الوداع و الوداع لیل و نہارِ آرزو،

اے دلِ غمدیدہ اب بنجا مزارِ آرزو!

آہ پھر تیری جدائی آہ او آرامِ جاں! — اُف! مچلتا ہے تڑپتا ہے دلِ ناشادماں!

تجھکو سوتا چھوڑ جاؤں سنگدل اتنا کہاں! — آئینہ رو! تیری فرقت مجھپہ ہے کوہِ گراں!

عزم راسخ ہے مگر تجھسے موڑوں کس طرح!

رشتۂ عہدِ وفا کو آہ توڑوں کس طرح!

تیری فرقت اور پھر اُس گوہرِ شہوار کی — جو کہ آرامیدہ دامانِ صدف میں ہے ابھی[1]

جس کو نیسانِ محبت نے عطا کی زندگی — آب و تابِ زیست بڑھجائیگی جس سے واقعی

---

[1] شاعر اس تاریخی نظریہ کا معتقد معلوم ہوتا ہے جس میں گوتم کے ترکِ خانماں کے وقت اُسکے بچے کو شکمِ مادر کے اندر فرض کیا گیا ہے۔

شمعِ دل افروز ہوگا خانۂ جاں کے لیے

مایۂ نورِ بصارت چشمِ حیراں کے لیے!

اے فریبِ الفتِ فانی نہ تو بھٹکا مجھے! آہ اے جھوٹی محبت اب نہ دھوکا دے مجھے!

دیدنی ہے روئے گل پھر اس سے مطلب کیا مجھے! گر نظر آیا ریاضِ دہر کانٹوں کا مجھے!

یہ کشاکشہائے بیجا ہیں سلاسل کی طرح

توڑ دوں انکو طلسمِ نقشِ باطل کی طرح:

رخصت اے ماں باپ بیوی رخصت اے اہلِ دیار دیکھنا میری جدائی پر نہ ہونا اشکبار

کی تمہاری ہی لیے میں نے یہ ہجرت اختیار دیکھیے کیا کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار:

المدد اے جستجوئے صادقِ راہِ نجات!

کونسی خلوت میں ہے اے شمعِ رازِ کائنات!

گوتم نے اپنے صحرائی دار الہجرۃ سے اپنے باپ کو یہ پیام بھیجا:

"میں جو اس طرح اپنے گھربار کو چھوڑ کر نکل گیا ہوں تو اس واقعہ پر کوئی ماتم نہ کیجئے۔ یکجائی خواہ وہ کتنی ہی طویل ہو، دائمی نہیں ہو سکتی...... جو قانونِ مفارقت اس قدر ہمہ گیر اور قدیم العہد ہے اُس کے خلاف چند روزہ بقا کا کیا چارہ ہے! میرے لئے ماتم کرنا بے محل ہے اس لئے کہ میں نے اپنے پیچھے جس رنج و غم کو چھوڑا ہے وہ ایک عارضی صدمہ ہے...... جب یہ نقشِ محبت ماند پڑ جائے گا تو یہ غم بھی مندمل ہو جائے گا...... اگر میں اپنے شوقِ آزادیٔ روح میں اپنی بشری محبت کے تقاضے سے آپ لوگوں سے برابر وابستہ رہتا تو جو علیحدگی اس وقت میں نے دانستہ اختیار کی ہے وہ ایک دوسرے گوشے سے عارضِ حال ہوتی یعنی موت یہ کام انجام دیتی۔ غور کیجئے وہ میری والدہ محبوب جن کی آغوشِ رحم میں میں نے پاؤں پھیلائے تھے اور جس کے لئے میں اس طرح [illegible] کرب اور تشنگی و تکلیف کا باعث ہوا تھا، اس وقت کہاں ہے؟ اُس کے سامنے [illegible]

بے ثمرثابت ہوئے! میں اس کے کیا کام آیا؟ .... جس طرح گھمائے ایرانی ستو اتر گردش و حرکت میں چند لموں کے لئے باہم بغل گیر ہو جاتے ہیں میری نظر میں تو اہل زمین کے فانی اتحاد و وصل کی یہی تعبیر ہے!" (بدھا کارتیا ۶، ۱۶۱)

تاہم وہ اس "المیہ" کی درد انگیزی کو تعلیم کرتا ہے چنانچہ :-

"اپنے اعزہ و اقربا کی یہ جدائی کونسا دل ہے جسمیں ہُوک نہ پیدا کرے گی! لیکن آہ! اس جدائی سے تو بہرحال مفر نہیں، پس میں انجام کو آغاز میں خود ہی انگیز کئے لیتا ہوں اور اپنے عاشق باپ کے ظلِ شفقت کو خیر باد کہتا ہوں!" (الیضاً ۹، ۳۲)

"ہماری جتنی مرغوبات و مالوفات ہیں اگر وہ لازوال تباہی جاسکتیں اور تغیر و مفارقت کے خطرے سے بالاتر ہو سکتیں تو یہی دنیا بہشت بنجاتی اور ہم کو اپنے گھروں کی چاردیواری کے اندر ہی دار القرار مل جاتا! لیکن آہ آسمان کے نیچے یہ چیز کہاں!"
(فوشو ہنگ سان کنگ ۱۸۶۳)

"میں نے آپ لوگوں کو پہلے ہی جتا دیا ہے کہ ناموس فطرۃ کا منشا یہ ہے کہ جو چیزیں آج باہم بغل گیر ہیں اُن کا رشتۂ مواصلت ایک وقت منقطع ہو کر رہے گا پس عشق و محبت کی ریشمی ڈوریاں بھی شکستنی ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ جام الفت کے اس بادہ خوار کمبخت دل کو سینے سے نکال کر پھینک دیا جائے!" (الیضاً ۱۸۶۱)

"اگر دنیا کی چیزیں مجھکو قیام و دوام کی ضمانت دیتیں اور ہم لوگ کمزوری و عمر رسیدگی، بیماری و موت کے خمیازوں سے آزاد ہوتے تو کچھ شک نہیں کہ میں بھی ساغر محبت کی شکم سیر ہوکر جرعہ نوشی کرتا اور اس بزم عیش سے کبھی بھی نہ اکتاتا!"[۵] (الیضاً ۳۰۳)

---

۵ یہ عشرت و عیش و کامرانی کب تک   عشرت بھی سہی تو نوجوانی کب تک؟
گر یہ بھی سہی تو قرار دولت ہے محال   دولت بھی سہی تو زندگانی کب تک؟ (۱۱۰)

اس آخری بیان کے بین السطور میں ممکن ہے کچھ رنگ طعن ہو!

خیر گوتم نے دنیا تو چھوڑ دی اور راہ دفا کی یہ "منزل اول" بخیر و خوبی طے ہو گئی لیکن منزل مقصود کی "دہلی ہنوز دور" تھی۔ مروجہ خداؤں کو اُس نے ٹھکرا دیا تھا لیکن کوئی اب نہ تھا جو زرتشت کی طرح مزدہ آہورا کے ساتھ اُس کا معانقہ کرا سکتا۔ سید ہندی کے بت خانہ کا ایک عجیب مضحکہ خیز منظر تھا: یہاں اصنام و اوثان کے پرے جمے ہوئے تھے جن کو کلیسہ برداران کعبۂ دینی یعنی برہمنوں نے اپنی صنعت خیالی سے زرق برق لباس پہنائے تھے اور طلائی و جواہراتی زیورات سے آراستہ و پیراستہ کیا تھا لیکن دراصل اس "لباس مجاز" کے اندر یہ دیوتا وہی قوائے فطرت تھے جو قدیم ویدک مذہب کے معبود تھے۔ پجاری لوگ آندرا اور ماروتس کی نازبرداریاں کرتے اور سوما کی شراب طہور کے جام اُن کی نذر کرتے! ان پیشکشوں کو شرف قبول بخشنے کے لئے یہ دیوتا اپنے قدوم میمنت لزوم سے اپنے استھانوں کو سرفراز فرماتے اور بالخصوص مہاراج آندرا اپنی سبز قدمی کی تہنیت سے باران رحمت کو بھی نازل فرماتے! اسی طرح مہمان سراپردۂ راز (برہمن احبار) مقدس آتشدان کے شعلوں کو جنبش دیتے اور فوراً اگنی دیوتا نزول اجلال فرماتے! برہمن پجاریوں کی یہ ساری جنگ زرگری ایک آزاد فکر ناظر کے لئے کھلا ہوا راز تھا۔ درحقیقت یہ دیوتا اُن کے دیوتا نہ تھے بلکہ اُن کے خادم و غلام! اور حصول زرق و استحصال عیش کی نفسانی اغراض کے لئے آلۂ کار! اُن کے صمٌ بکمٌ خدا اپنی ہی طرح کی کور و کر مخلوق کے حاجت روا و مشکلکشا تھے اور جو لوگ اُن کے مواد ترکیبی اور ان سنگی خداؤں کے طریق "تدبیر امر" کی "ریشہ دوانیوں" کے محرم راز تھے ان کے لئے وہ سنگریزوں سے زیادہ نہ تھے!

ان طریقوں کی نوعیت اور دور از کاری الم نشرح تھی لیکن تاہم گوتم نے ابتداء کافی ایک عرصہ تک پرانے وسائل سے کام لیا۔ اس نیازمندی و تقلید کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کو ابھی اپنے قلب و روح کی عظمت کا پورا اندازہ نہ ہوا تھا۔ پس اُس نے جب مروجہ مذہب ہی میں نور حقیقت کی تلاش کی آزمائش کی اور اسی اثناء میں شدید عبادتوں اور ریاضتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

ان مراقبانہ اعمال کی حقیقی نوعیت ساحرانہ تھی۔ الغرض لیوتھر کی اعتکاف گاہ سینتا اسکیلا کی طرح گوتم نے بھی مشاہدۂ حق کے لیئے ایک تنہا گوشے میں ایک "روحانی رصدگاہ" قائم کی۔ لیکن مشاہدۂ حقیقت کی رونمائی کی ساری آرزوئیں بایوس ناکامی ہوئیں اور گوتم کے ذاتی تجربہ کی بنا پر:

"تزکیۂ نفس اصریت روح" اور معرفت کبریٰ کے حصول کے لیئے یہ شغل کشود کار نہیں کر سکتے" (بدھا کاریتا ۱۲ ، ۹۸)

گوتم جس چیز کی تلاش میں آوارۂ غربت ہوا تھا وہ کسی "ازلی یا کسبی گناہ" سے آزادی کا ذریعہ نہ تھا بلکہ دنیا کی اسی "قید حیات" کی "بند غم" سے گلوخلاصی کا کوئی وسیلہ! "سارے جہان کے اسی درد" نے اس کے درد کو بیدرماں بنا رکھا تھا اور اُس کے دل پر ایک کوہ غم ہر گھڑی سوار رہتا تھا۔ اسی مشکل معمے کے حل کے طور پر اُس کا خیال تناسخ کے تصور کی طرف منتقل ہو گیا!

گوتم ایک غیر معمولی طور سے مزکّیٰ و مطہر روح کا مالک تھا اس لئے طلعت حقیقت کی نقاب برداری کے لیئے اُس نے ہر ممکن و ناممکن نفس کشی و پرہیزگاری کے مطالبات کو پورا کیا، لیکن دل جتنا پاکیزہ تھا دماغ اتنا بیباک نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اتنا بڑا شاہین روح بھی بالآخر تقلید عام کا صید زبوں بن گیا!! اسی نقادانہ میدان میں ہم اُس کو زرتشت سے فروتر پاتے ہیں! تعجب ہے کہ اُس نے عقیدۂ تناسخ کا کبھی آزادانہ جائزہ نہ لیا اور اُس کی مزعومہ صداقت کو مغلوبانہ قبول کر لیا۔ زندگی اور آلام زندگی کو اُس نے ہر شئے یکدگر سمجھا اور آخرالذکر کو ختم کرنے کا علاج یہی دیکھا کہ اول الذکر ہی کا خاتمہ کر لیا جائے! پس زرتشت کے بالکل برعکس، گوتم بدھ کا فلسفۂ حیات تمامتر ایک مایوسی، نفی اور سلبیت کی دعوت ہے۔ وہ نفس کشی اور ترک لذات کا داعی ہے اور یہی تخیل ہے جو آج کے دن تک ہندوستان کے مذہبی دماغ پر مستولی ہے۔

مکاتب مذہب کے اس مکتب کا منشا یہ ہے کہ انسانی روح بے شمار ولادتوں یا جنموں کے ایک طویل سلسلے کے بعد جو مصیبت و مشقت سے لبریز ہوتے ہیں حقیقی زندگی و آزادی حاصل کرتی ہے۔ گوتم تمام ذی روح مخلوق کی زندگی کو یکساں پر حق سمجھتا ہے، چنانچہ جب کسانوں کے ساتھ

جلتی دھوپ میں وہ بیلوں کی گردنوں کو بھی جوئے کے نیچے خونچکاں ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو بے اختیار اُس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ "افسوس کتنا روح فرسا منظر ہے!" ہاں تو نفس و شیطان کی کشمکش کے درمیان روح کے ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا انسان اگر اتفاق سے کسی ادنیٰ سی لغزش کا مرتکب ہو جائے تو اسکی منزل پھر کھوٹی ہو جاتی ہے۔ وہ کسی جانور کے پیکر میں منتقل کر دیا جاتا ہے، چنانچہ مختلف و متدارج حیوانات کے قالب در قالب اس کو یہ سفر تناسخ پھر طے کرنا پڑتا ہے اور انسانی جسم کا بندرگاہ از سر نو حاصل کر کے ساحلِ مراد کا دوبارہ عزم کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ بغیر کسی افتاد و حادثہ کے یہ ساری منازل دمراحل ختم ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو کامیاب روح کا پھر ایک ایسے دار القرار میں خیر مقدم کیا جاتا ہے جو ایک لامتناہی عیش و طرب کا مقام ہے اور جب اس پرہیزگاری اور نیکوکاری کا نعم البدل ہر قسم کی ماکولات و مرغوبات سے دیا جاتا ہے اور ایک بے غل و غش زندگی بسر ہوتی ہے۔ لیکن ابھی معاملے کو ختم نہ سمجھئے۔ بہت ممکن ہے کہ اس "سفرِ سقر" پر یہ روح پھر گامزن نظر آنے لگے! اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس "خام بہشت" کے اندر روح کا جمع کردہ ذخیرۂ استعداد رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے جسکی وجہ سے اُس پر ایک اضطراب طاری ہونے لگتا ہے اور جنت کی مخملی سیج پر پڑے پڑے یکبارگی اُس کے گلے کا پھول مالا مرجھانے لگتا ہے۔ اور بس اُسکے بہشت کے سماوی رفقا صرف نالہ و شیون ہو جاتے ہیں۔ راندۂ درگاہ ہونے والی روح کے لئے یہی پیام الوداع ہوتا ہے! چنانچہ زمین پر اُس کا پھر ہبوط ہوتا ہے اور ارضی زندگی کا پُر عذاب ہفتخواں از سر نو شروع ہو جاتا ہے اور روح اُس غار کی تہ سے پھر دوبارہ جبہ سائی شروع کرتی ہے جہاں سے اُسنے گزشتہ دفعہ وہ پُر کوفت معراج حاصل کی تھی!

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے؟

یہ سارے کاروبارِ رسم کو ایک طلسم ہوشربا نظر آتے ہیں لیکن تو تم اپنی تفصیل، دماغ میں ان کا گویا برائی العین مشاہدہ کرتا تھا۔ نظریۂ تناسخ کسی بالغ نظرانہ مطالعہ و ثبوت پر مبنی نہیں ہے۔ لطف یہ ہے کہ جس معمۂ ہستی کی وہ عقدہ کشائی کرنے کا مدعی ہے اس کی توجیہ کرنے سے وہ

قاصر ہی نہیں بلکہ اُس کو پیچیدہ تر بنا دیتا ہے! اُس کا کہنا ہے کہ مختلف افراد کی زندگیوں کی عدم مُساوات کی اس طرح تعیین ہوتی ہے اور آئین کائنات کے ہر بعض کے خلاف تلخی بغض سے کام لیں یا بعض لوگوں کو بیوجہ منظورِ نظر بنانے کا جو الزام عاید ہوتا ہے اُس کو وہ ایک آیت عدل سے بدل دیتا ہے' لیکن تناسخ کے اُصول کی روشنی میں فطرت کی ستم ظریفیاں اور بھی نمایاں ہو جاتی ہیں. الغرض حرماں نصیب گوتم کی ناشاد روح ہمارے دلوں میں بڑے درد کا احساس پیدا کرتی ہے! گوتم کے حساس دل نے مصائبِ حیات کے مناظر سے ہر چند پیچ و تاب کھایا لیکن اُس کے ذہن نے ذرا بھی رسائی کا ثبوت نہ دیا کہ وہ مذہبِ تناسخ کی مضحکہ خیزی کو دیکھ لیتا!

گزشتہ بیانات میں جس طرح ہم دیکھ چکے ہیں' زرتشت نے جو تخیل ذاتِ باری کے متعلق قائم کیا تھا وہ بجائے خود ایک مکمل عقیدہ تھا جس کے اندر ایک مزید تکمیل کا اشارہ مضمر تھا لیکن یہ "تکمیلِ دین" و "اتمامِ نعمت" اس وجہ سے وجود میں نہ آسکی کہ جن ہادیوں کے ظہور کی زرتشت نے بشارت دی تھی وہ مبعوث نہ ہوئے. لیکن ذاتِ واجب الوجود کے بارے میں بدھ کا تصور یہ ہے کہ ایک آفاق گیر طاقتِ مجردہ جسد کائنات کے اندر کارفرما ہے' جو بلا انقطاع و تعطل ہمہ وقت مصروفِ عمل ہے جسکی غایتِ مقصد بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ استحقاق و معاوضہ کے باہمی مقتضیات توازن کو پورا کرتی رہے. بظاہر یہ مقصد ناقابلِ حصول نظر آتا ہے اور کبھی اُس تک رسائی ہوئی بھی تو مصائب و نوائب کا ایک بحرِ ناپیداکنار عبور کر کے' اور پھر اگر یہ عسیر الوصول سعادت نصیب بھی ہوئی تو اُسکی سبک انجامی سخت یاس افزا ہے اس لئے کہ چند روز کے بعد سرمنزل پھر آغازِ سفر میں تبدیل ہو جاتا ہے! تمام شعوری زندگی مصیبت و مشقت سے لبریز ہے اور جتنی دنیا آگے بڑھتی ہے اُس عذاب میں اضافہ ہوتا ہے پس ایک ہی مطلوب مقصد فنا ہے جو نجات کی منزل دور و دراز کا ایک مختصر راستہ ہے!

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

پس بدھ کی اصل عظمت اُسکے فلسفۂ زندگی میں نہیں ہے بلکہ اُسکی تفسیرِ حیات تو بالکل

ایک ناقابلِ رشک چیز ہے۔ اُسکی شخصیت کی اہمیت کا راز ہم کو کسی دوسری شے میں تلاش کرنا ہوگا!
اصل یہ ہے کہ بدھ ایک پیدائشی قائد تھا۔ تسخیرِ خلق کا ایک عجیب ملکہ قدرت نے اسکو ودیعت
کیا تھا۔ اُس کے ایک اشارۂ ابرو پر لاکھوں انسان سربسجود عقیدت ہوجاتے تھے۔ اُس کی سیرت کی
کتابوں میں ہم جوق جوق اور فوج در فوج لوگوں کو داخلِ سلسلہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ سارا
دفترِ اساطیر ایک مبالغہ آمیز رنگ میں ہے لیکن مشربِ بدھیت نے جو عالمگیر فتوحات اشاعت حاصل
کیں انکو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ واقعات کی عام شاہراہ و بیان ضرور تاریخی ہے۔ حیرت
ہے کہ ایسے خشک، یاس انگیز، اور صبر آزما عقیدۂ مذہبی نے کیوں کر اس کثیر تعداد اتباع کے قلوب
پر قبضہ کیا، اور پھر جس طرح اُس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے وہ بجائے خود ایک ذہنی حقیقت ہے۔ اس
موقع پر لوگ کسی معمولی گرمجوشی اور ولولہ انگیزی کا ثبوت نہیں دیتے، بلکہ پھولوں کی بارشوں اور
وجد آور نغموں کے درمیان بدھیت کے قدوم میمنت لزوم کا نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ لطف یہ
ہے کہ انسانوں کے ساتھ جانور بھی بدھ کو اپنا محسنِ اعظم سمجھتے ہیں اور اس نجات دہندۂ جن و بشر
کی راہ میں اپنی آنکھیں فرش کرتے ہیں!

"ذی روح مخلوق کی تمام اصناف و اقسام ایک دوسرے سے وابستۂ آشنائی
و اُلفت ہوگئی تھیں، باہمی خوف و ہراس کافور ہوگیا تھا۔ عداوت و نفرت مفقود تھی۔۔
۔۔۔۔۔ اشراف و اشرار ہر دو کی روحیں یکساں صورت بدھ کی قدمبوسیوں کی تمنا [illegible]
میں رطب اللسان تھیں۔ عقیدت و ارادت کے ان مناظر میں اور [illegible]
مظاہر میں ہر متنفس ایک روحانی کیف و سرخوشی سے سرشار تھا!"

(فو شو ہنگ سان کنگ ۔۔۔)

"طوفانی ہوائیں تھم گئیں، بادل [illegible] نرم نرم [illegible] فضائے
سماوی سے بہشتی پھول برستے تھے اور [illegible] کی کائنات [illegible]
عالم وجد میں جھوم رہی تھی۔" (ایضاً ص ۱۲۳)

فدائیت اور شیدائیت کی یہ روح ہم کو کس درجہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے! غالباً اس غیر متوقع ذہنیت کی توجیہہ میں دو عمومی اسباب بیان کئے جا سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ عقیدۂ تناسخ کے تہ دل سے قائل ہیں اُن کے لئے زندگی، دوزخ ارضی کی ایک غیر مختتم عذاب کے ہم معنی ہے۔ مصائب وشدائد، آلام وہموم کے اس دریا کے ناقابل پیمائش عمق کا محض تصور ہی تھکی ہوئی روحوں کو اور ماندہ کر دے گا۔ ممکن ہے کہ تعلیم یافتہ فلسفیانہ رنگ طبیعت کے لوگ کسی ذہنی تسکین وتسلی کے حیلے اس تخیل مذہبی سے نکال لیں لیکن عوام الناس کے لئے تو وہ یکسر ایک سوہان روح چیز ہے۔ لیکن بدھیت کے ظہور کے ساتھ جو تناسخ پیش کیا گیا اُس کا ایک روشن پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ "کشتگانِ "تناسخ جو" ہر زماں از غیب جانِ دیگر است" کے عذاب دائمی میں گرفتار تھے اُن کے بعض اغلال وسلاسل اب کاٹ دئے گئے تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بدھ نے بشارت دی تھی کہ دنیا کے لئے سلسلہ تناسخ کی بیڑی کی اب صرف سات یا آٹھ کڑیاں اور جھیلنے کو رہ گئی ہیں۔ ان معدودے چند منازل کو طے کر کے ہر روح اُس مقام تک پہنچ جائیگی جہاں سے آخری دار النجات نظر آنے لگیگا۔ پس یہ ایک نسبتہً مستقبل قریب کی گلو خلاصی کا مژدۂ جاں بخش تھا جس پر روحوں کا لبیک کہنا بالکل قدرتی تھا ؎

کیا بات ہے تمہاری نوید نجات کی۔

لیکن بدقسمتی سے پھر جلد ہی یہ عقیدہ بدعت وضلالت کے گھن میں آ گیا جس کی تحریک کا سرچشمہ شاہ بدھ کی ذات ہی بنی تھی۔ گوتم سدھارتھ کی رحمت عالم ہستی جب پردہ کر گئی تو فطرۃً اُس کے پس ماندہ شیدائیوں کے حجم غفیر کے قلوب کے اندر ایک بیتاب شوق لقا پیدا ہوا!

باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را!

چنانچہ انہوں نے مقام نجات کو ایک ایسے ملک سجنت میں فرض کرنا شروع کیا جہاں بدھ اعظم کی مبارک معیت انہیں بعد حاصل ہوگی۔ تنزل کے علاوہ ایک دوسرا عقیدہ بھی پیروان بدھ میں شائع تھا جس کا تعلق یا ماست تھا۔ یہ اعتبارات بہ ایسے مقامات جہاں بعد موت کے زندوں کے آباؤ اجداد کی روحیں آسودہ ہوتی ہیں۔ اور انہی کے ایصال ثواب کے لئے شرادھ کے مراسم انجام دئے جاتے تھے۔ یہ

بمبسارا اور کوسل کے خطابات کی طرح بدھ نے تل لوگوں (یہ اُس جگہ کے باشندے ہیں جہاں بدھ کا وصال ہوا ہے) کے سامنے اپنی الوداعی تقریر میں "از روئے روایت" یہ کہا:

"جو شخص میرے مقام سکونت میں بہت دور و دراز کسی جگہ رہتا ہے لیکن جادۂ نیکو کاری پر گامزن ہے وہ میرا (معنوی) ہمسایہ ہے۔ علی ہذا القیاس ممکن ہے کہ کوئی آدمی میرے سایۂ دیوار میں رہتا ہو لیکن فاسق ہونے کی وجہ سے مجھ میں اُس میں بعد المشرقین ہو!"

(فوشو ہنگ سان کنگ ۱۹۰)

اور پھر اپنے مریدوں کو تاکید ہے کہ:

"جو وسائل و اعمال تزکیۂ قلب و حصول نجات روح کے لئے تم کو تعلیم کئے گئے ہیں اُن پر پوری جدوجہد کے ساتھ عمل پیرا رہو۔ اُس مسکن امن کو اپنا مطمح نظر بناؤ جس کے دروازے مفارقت کے لئے بند ہیں۔" (ایضاً ۲۰۹۸)

فوشو ہنگ سان کنگ کے اختتامی باب میں اُس کا مصنف بدھ کے متعلق کہتا ہے:

"بس وہ اُسی مقام بقاء سرمدیت میں چلا گیا۔ جو لوگ اُس کے آئین حیات پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بالآخر اُس کی حضوری میں پہونچ جائیں گے۔ پس تمام جن و انس کو "بلا تمیز و استثنا" اس پُرعظمت اور مجسمۂ رافت و رحمت آقا کی تقدیس کرنی چاہئے جو بلند ترین حقانیت و معرفت کے مقام پر فائز ہوا تاکہ تمام ذی روح موجودات کا نجات دہندہ ثابت ہو۔ کون ایسا ہے کہ اُس کا (بدھ کا) ذکر مبارک اُس کا سامعہ نواز ہو اور وہ اس کا والہ و شیدا نہ ہو جائے؟" (ایضاً ۲۳۰۵)

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ جس شخص کی ساری زندگی اس قدر اہتمام و التزام اور اس درجہ قطعیت و حتمیت کے ساتھ ذات و شخصیت کی واقعیت کے ابطال و انکار میں بسر ہوئی ہو اُس کا ذکر اس قسم کی متغزلانہ زبان میں کیا جائے! بلاشبہ فوشو ہنگ سان کنگ کی تعلیمات مسیحیت کے مَس

سے متاثر و متغیر ہوئیں لیکن مسائلِ تشخص و تعین کے متعلق بدھ کے جو تجزیہ و احتجاجات ہیں وہ اس حقیقت
کی غمازی کرتے ہیں کہ داعیانِ مذاہب کی ذات کی پرستش کے رجحانات اُس کے عہد میں بھی موجود تھے
سچ یہ ہے کہ خود بدھ اعظم کی یگانۂ روزگار مقبولیت و محبوبیت کا راز بھی نفسیاتِ انسانی کے اسی نکتہ
میں نہاں تھا!

ہندویت میں بھی بدھیت و غیر معروف کی طرح جو اپنے بعض اطراف و جوانب میں ہندو مذہب
کی گویا شاخ ہے، شخصیت بمنزلہ صفر کے سمجھی گئی ہے۔ ان مذاہب کے تخیل میں ذات و نفس ایک ایسی
چیز ہے جس کو نظر انداز کرنا چاہئے، جس کی وقعت کو کم کرتے رہنا چاہئے اور بالآخر اس کو بالکل مٹا
دینا چاہئے۔ یہی "ترک وجود" اور "نفی خودی" نجات و وصال کے مترادف ہیں۔ ہستی مطلق ان
علائق و قیود سے بالکل مبرا و منزہ ہے۔ یہ صرف انسانیت کے لواحق و عوارض ہیں اور جس قدر
انسانیت اپنے درجے میں فروتر ہوگی اُسی قدر یہ لوازمات اس میں زیادہ ہوں گے۔ ہندوستان
کی تاریخ مذاہب کے عہد اساطیری سے گزر کر ہمیں مشاہیر اور نیم خداؤں کی کثیر التعداد شخصیتیں نظر
آتی ہیں، ہم کو برائے نام افراد ہی بر اعظم ہند کی ناپیداکنار دنیا میں ایسے ملتے ہیں جن کے حالات
زندگی داستانِ امیر حمزہ بنائے جانے سے محفوظ رہے ہوں! اور جس کی وجہ سے اُن کی شخصیت
ایک افسانویت کے ساتھ مدغم ہوگئی ہو۔ اس ملک نے صرف معدودے چند ہی بادشاہ اس پایہ
کے پیدا کئے جن کا شہرہ حدود ہند کو عبور کرکے دوسرے ممالک میں پہنچا۔ [illegible]
اب شاید بمشکل کسی تیسرے کا نام لیا جاسکتا ہے! شعرا میں والمیکی اور ویاس سے بعض غیر ملکی
لوگ آشنا ہیں، رشی وشسٹ اور وشوامتر اور مذاہب فلسفہ کے بعض بانیوں کا بیرونی [illegible]
شناسائی کچھ اس سے زیادہ ہے۔ لیکن ان تمام بین الاقوامی [illegible] میں شخص کوئی ایسا ہوگا
جو اس جماعت سے باہر کا ہو جو "ہندیات" سے مخصوص رہی ہے۔ [illegible]
نے ہندوستان پر عمیق اثرات ڈالے [illegible]
ارباب سیاست جنہوں نے اس ملک کے حکمرانوں کی نام حکومت کی [illegible] شخصیتیں

عام آبادی کے ہجوم میں گم ہیں! ہم کو یہ معاملات تو بخوبی معلوم ہیں کہ برہمہ کے کیا معنی ہیں، انکے کیا اعمال و نوافض اور کیا اغراض و مقاصد زندگی ہیں اور بلاشبہ برہمنیت در ہبانیت یا رہبانیت اکی روحِ مجردہ ہندوستان کی خلقت کی اصل قائد و حاکم ہے، لیکن ہم خود اُن مخصوص افراد کے متعلق بالکل تاریکی میں ہیں جو اس فلسفۂ حیات کے داعی اور مظہر تھے! ہندوستان کی گمنامی پسند دُنیا کی قریباً تمام کی تمام گمنام شخصیتوں کا مقابلہ روشناس عالم یونانی حکماء، رومی اُمرا و عساکر، عبرانی انبیاء و رُسل اور مسیحی اولیاء و اصفیاء سے کیجئے اور دو بالکل برعکس مناظر کا مشاہدہ کیجئے!

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے!

ہند قدیم کے تمام نامعلوم الاسم رجال اعظم میں صرف ایک بُدّھ کی منارہ نما ہستی نظر آتی ہے جس کے وجود کے مرکز قطبیت کے گرد ایک خلقت نے ہجوم کیا اور قلبی خلوص و محبت کے ہدیے پیش کئے لیکن اپنے ان تمام مظاہر ذات کی جس نے پوری سختی سے ہمت شکنی کی:

"لوگو! میرا سایۂ عاطفت مت ڈھونڈو! اپنی روح کے ملجا و ماویٰ خود بنو!"

(کتاب وصال مقدس ۲: ۳۳)

"ہیہات! میں ہنوز ایک عام طالبعلمانہ حالت میں ہوں جس کو اپنی تکمیل نفس کے لئے ابھی بہت کچھ مدارج طے کرنے باقی ہیں اور میرا محترم اور محبوب آقا کوس رحلت بجا رہا ہے!"

بدھ اس بے محل ماتم گری اور روحانی بیراہ روی کی اطلاع پاکر فوراً آنند کو طلب کرتا ہے اور اس کو یوں تسلی دیتا ہے:

"بس بس آنند! اس اضطراب و اضطرار اور شور و شیون کے کیا معنی؟ کیا میں نے تم لوگوں کو اس سے قبل بے شمار موقعوں پر اُس ناموس فطرۃ سے روشناس نہیں کیا ہے کہ جو چیزیں ایک دوسرے سے بحد عزیز و قریب ہیں اُن کے لئے یہ جُدائی مقدر ہوچکی ہے؟ پس میرے معاملہ میں یہ اٹل قانون کیونکر معطل ہوسکتا ہے؟ میرے لئے اس کلیۂ مطلقہ میں کوئی استثنا تلاش نہیں کیا جاسکتا! آنند! عرصۂ دراز تک تم میرے ساتھ اس طرح وابستہ

محبت والفت ہے جس کی کوئی حد وحساب نہیں۔ مدت مدید تک اے آنند! تم نے مجھ پر بڑی
مہربانیاں اور احسانات صرف کئے ہیں اور میرے ساتھ ایک انتہائی قربت ومحبت کا رشتہ
پیدا کر لیا ہے جو غیر منکسرانہ ہے! تمہاری زندگی قابل داد ہے۔ آنند! اپنی مخلصانہ اور
صادقانہ جد وجہد کو اسی طرح جاری رکھو، اور مستقبل قریب میں تم بھی میری طرح تمام مکروہات
ہستی یعنی شہوت نفس وغیرہ، اور تمام سیئات وجود یعنی انفرادیت وشخصیت، وفریب نظر و
جہالت وغیرہ سے نجات پا جاؤ گے!" (ایضاً، ص ۳۴۵ تا ۳۵۱)

تسلی! لیکن کتنی بیدردانہ، اور سرد مہرانہ تسلی! لیکن بدھ کی جنت خیال میں اس سے بڑھ کر اور
کیا تھا؟ یہ ایک ایسے خون دردل کے درد کا مایوسانہ درماں تھا جو بالکل بے یار و مددگار رہ جاتا ہو
اور جس کے سامنے زندگی کا طوفانی سمندر ہے جس کو اسے ایک ایسی کشتی میں بیٹھ کر عبور کرنا ہے جس کا ناخدا
بحر سرمدی کی امواج سے وصل ہو رہا ہے!

گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است!

ہم نے گزشتہ صفحات میں دو تصویریں کھینچی ہیں اور فلسفۂ مذہبی کی دو مختلف دنیاؤں کا منظر
پیش کیا ہے۔ یہ دونوں مرقعے بخط مستقیم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن تحقیق تاریخی کے ماضی قریب
میں ایک اہم انکشاف ہوا ہے جس نے نہایت غیر متوقع طریقے سے ان دو متضاد مظاہر میں ایک
راہ تطبیق بتائی ہے!

جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی جنوری وجولائی ۱۹۱۵ء کی اشاعتوں میں ایک
تاریخی مقالہ ڈاکٹر اسپونر کے قلم سے نکلا جس میں ان "حفریات" (کھدائیوں) کی ایک روئداد ہے جو
ڈاکٹر موصوف کی زیر نگرانی شہنشاہ چندر گپت کے محلات (متصل پٹنہ) کے موقع پر عمل میں آئیں۔ محقق
ممدوح کا بیان ہے کہ انہوں نے اس محل کو شہر پرسی پولیس (دارالحکومت ایران ہخامنشی صدی قبل مسیح)
کے دریافت شدہ قصر شاہی کا نقش ثانی پایا! اور تاریخی شواہد کے پیچھے پیچھے چل کر اور بعض دیگر آثار
وقرائن کا اس پر اضافہ کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ عہد موریہ میں شاہی سلسلے نے مذہب ایران کی

وسیع نوآبادیاں قائم تھیں، جو یہاں نہ صرف تاجرانہ حیثیت سے وارد ہوئے تھے بلکہ اس ملک کے فاتح اور حاکم تھے۔

نیز اُس کا خیال ہے کہ خود بُدھ بھی دراصل ایرانی النسل ہے! وہ اس نظریہ میں اس حد تک متجاوز ہے کہ بُدھ کے لقب ساکیہ مُنی کا ترجمہ بھی وہ "دانشمند ایرانی" کے الفاظ سے کرتا ہے!! اُس کا یہ بھی قیاس ہے کہ گوتم کی اوائل عمر بھی مجوسیت کے ماحول میں بسر ہوئی! اور یہ کہ اُس کی دعوت دینی کی حقیقی تفسیر یہ ہے کہ وہ مجوسیت اور ہندویت کے درمیان ایک مفاہمت ہے! ممکن ہے کہ اس تاریخی خواب کی کچھ بہتر تعبیر مستقبل میں ملے اگر یہ خیال پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا تو ایک یادگار تحقیق ہوگی جس کی دیگر تفصیلات ہندوستان کے غبار آلود مذہبی تاریخ کے مطلع پر بہت روشنی ڈالیں گی۔ اسوقت بھی اُس کے اشارات کی بعض کرنیں چند تاریک گوشوں پر پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں چنانچہ اس نظریہ کی روشنی میں یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی مذہبیات کا عقیدۂ تناسخ ممکن ہے کہ بجائے ڈراویدی توہمات (انتقالِ ارواح موتیٰ باجسامِ حیوانات) سے ماخوذ ہونے کے "ایرانی تخیل" فراوشی" کی خوشہ چینی ہو جس سے مراد نوعِ انسانی کے افراد کے وہ روحانی ننھے ہیں جو "عالم مثال" کی دوسری دنیا میں اس حیاتِ ارضی کے قبل و بعد موجود رہتے ہیں۔ کچھ بعید نہیں کہ مجوسی اور ہندو ہر دو عناصر کا معجون مرکب ہمارے سامنے مذہب گوتم کی شکل میں موجود ہو! اس لئے کہ بُدھیت کا جو سب سے زیادہ مرکزی عقیدہ ہے یعنی نفیٔ وجود، وہ زرتشتیت کی ہر شاخ سے بھی بالکل مختلف ہے اور ہندویت کے سوادِ اعظم کے معتقدات سے بھی قطعاً متبائن!

ہم نے یہاں زرتشت اور بُدھ دونوں کے مذاہب پر پہلو بہ پہلو نظر ڈالی ہے اور اب ہم یہ استفتا پیش کرنا چاہتے ہیں کہ ان ہر دو ملتوں کے داعیوں اور بانیوں کی جو نیت اور جو مطمحِ نظر تھا کیا وہ پورا ہوا؟ زرتشتیت "زمین پر خدا کی حکومت" کی مبشر ثابت نہ ہو سکی اور نہ زرتشت کی اُمید کے مطابق وہ کافۃ الناس کو اپنے علم کے نیچے لانے میں کامیاب ہوئی، بخلاف اس کے اُس نے عرصہ ہوا کہ اپنے کو تبلیغی مذاہب کی فہرست سے بھی خارج کر لیا ہے اور اُس کی داخلی نشو و نما بھی مدت ہوئی کہ معطل ہے۔ بُدھ کی محبوب شریعت کا یہ حشر ہوا کہ جب ایک دفعہ اُس کا مسلک فنا ساحلِ فنا پر جا لگا تو اُس نے پھر

کسی نشاۃ ثانیہ کا ثبوت نہیں پیش کیا۔ بدھیت کا جو حقیقی سرچشمہ تھا وہ قرنہا قرن ہوئے کہ بالکل مکدر یا خشک
ہو گیا اور اگر گوتم بدھ کی اصلی تعلیمات و عقائد کو پیش نظر رکھا جائے تو ہم کو نام نہاد لیکن کثیر التعداد پیرو اِن
بدھ کی مردم شماری میں غیر معمولی قطع و برید کرنی پڑیگی۔ جو بدعت و تحریف بدھیت کے حرم میں ظہور پذیر
ہوئی اسکی نوعیت یہ ہے کہ اُس کے حلقہ بگوش یہی نہیں کہ اس کے نقوش قدم سے بہت پیچھے پڑ گئے
ہوں، بلکہ وہ اصلی شاہراہ سے بالکل برعکس سمت میں جا رہے ہیں!

ہر دو مذاہب کے سروں پر جو گردشیں آئیں اُن کے تاریخی تبصرے سے میں نے جو نتیجہ
اخذ کیا ہے اگر اُسے میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کروں تو میری تشخیص یہ ہوگی کہ یہ
دونوں کاروانِ دعوت اپنی منزلِ مقصود کو نہ پہونچے۔ دونوں جگہ ناکامی کا سبب اثباتِ وجود کے
احساس کا فقدان تھا۔ زرتشتیت کے معاملے میں یہ قصور زرتشت کی ذات کا نہیں، بلکہ اسکے متبعین
کی نا اہلیت سے متعلق ہے، لیکن بدھیت کے بارے میں تو تخریب کے جراثیم اصل مذہب کی استخوان
بست ہی میں پائے جاتے ہیں!

بدھ کے تمام خاکۂ نجات کا سنگِ بنیاد یہ سلبی تخیل ہے کہ وجودِ ذاتی کا کہیں واقعی وجود نہیں۔ یہ
محض ایک اعتباری اتفاق ہے جو ضمناً ایک ایسی دنیا میں ظہور پذیر ہو گیا ہے جس پر ایک غیر شخصی جبروت
مجردہ کی فرمانروائی ہے اور اُس کے پیش نظر جو منزل اخیر ہے وہ "تکمیل و استحکام" کی ہے، "وہ انسانی
افراد کی یکجائی پیدائش کے مبنی بر بخت و اتفاق کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ جیسے " جو
سار ہیں پارہائے ابر کا آنی معانقہ!" اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بدھیت کے سر بفلک قلعہ کی
بنیاد نمو اور کھی گئی۔ شخصیت کو غیر واقعی ثابت کرنے کی مذبوحی کوشش میں اُس نے خود اپنے
وجود کی واقعیت ہی پر ضرب کاری لگالی! چنانچہ شمالی ممالک میں چین اور تبت کے اندر رائے عامہ
کے اجماع نے عملاً اس عقیدہ پر فتوئ ابطال صادر کر دیا تب روحِ انسانیت نے بجائے دوام
کا مطالبہ کیا اور وہ ایک شخصی نجات دہندہ و شفیع کے لئے تشنہ لب ہوئی اور جب کسی کو نہ پایا تو اس
خالی مسند پر خود حضرت گوتم کو متمکن کر دیا!

توڑ ڈالیں فطرۃ انساں نے زنجیریں تمام   دوریٔ جنت میں روتی چشمِ آدم کب تلک!

جنوب میں سیلون اور برما نے بھی متفق اللفظ ہو کر اس نفیٔ خودی کی نفی کر دی، جہاں مذہبی زندگی نے قدرے سکون پذیر ہو کر ایک معتدل قسم کی آرام دہ اور خشک "لا ادریت" کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کی وجہ سے متعلقہ لوگوں کے اضطرابات اور مشکلات قریباً بدستور قائم ہیں اور مستقبل کا مطلع کوئی اُمید بخش منظر پیش نہیں کرتا!

زرتشتیت کی اصلی ہیئت اُس کے بانی کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ اُس کے متبعین ایک شخصیت کے حق میں اپنے اعتماد کو تفویض کرنے سے قاصر ثابت ہوئے اور ایک آئینِ حیات و معاشرت سے وابستہ دامن ہو گئے، کیونکہ یہ آخر الذکر طرزِ عمل اُن کے دل و دماغ کے لئے زیادہ سہل العمل تھا۔ ایک آئین تو محض ایک ذہنی مفاہمت ہی چاہتا ہے درآنحالیکہ ایک شخص قبل اس کے کہ اس کے ساتھ کافی عرصہ تک سابقہ پڑے اور از خود اعتماد کی تخلیق ہو، ہم سے تسلیم و توکلِ کامل کا مطالبہ پیشگی کر دیتا ہے، چنانچہ یہی زیادتی اُس کی اثر آفرینی کی ناکامی کی وجہ ہوتی ہے۔ ایرانی دل و دماغ سے اس "ایمان بالغیب" کی توقع ہی عبث تھی! یہ طبعاً بڑے ہی شکّاک لوگ تھے۔ مزدہ اہورا کے ساتھ انکی عقیدت بھی کافی ناقدانہ رنگ رکھتی تھی۔ چنانچہ اُس کے وعدہ وعید کے ساتھ ساتھ ہی وہ آثار گرد و پیش پر بھی نظر رکھتے تھے اور "باخدا باش ہوشیار" کے مقولے پر عامل تھے! اگرچہ انکی اصلی غایت و نیت کو دیکھتے ہوئے ہم اُن کے اس تذبذب و اضطراب کو بالکل غیر محمود نہیں قرار دے سکتے اسلئے کہ وہ بہر حال روحانی مفاد کے درپے رہتے تھے خواہ بعض اوقات مادی چیزوں ہی کو کشود کار کا وسیلہ کیوں نہ بنانا پڑے۔ اسی ایمانی تزلزل کا یہ کرشمہ تھا کہ جب مجوسیت کی مدائنی شاخ، چند در چند حوادث کے نتیجہ میں، قدیم زرتشت کی مقدس اُمت بن گئی اور اُس نے ایران کے قلب و روح پر تسلط حاصل کر لیا تو اس انقلاب کے باوجود بھی وہ اپنے بعض مراسم و عقائد سے دست بردار نہ ہوئی جنکو زرتشتیت کے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا! اس جدید مذہب نے اپنے تئیں دنیا کے سامنے اس شان سے پیش کیا کہ وہ اپنے مُردوں کو برسرِ عام کھولکر دکھاتا تھا، ابتدائی و اوّلین تعلق خون کے حلقے کے بعد ہی رشتۂ مناکحت

کو جائز رکھتا تھا، سحر و ساحری کے ایک طول و طویل اور تکلیف دہ نظام کو اپنے پیروؤں پر عاید کرتا تھا اور آگ کی پرستش کا حکم دیتا تھا، ساتھ ہی اپنے ایک واحد، قائماً بالقسط، اور حکیم و علیم خدا کے وجود کی شہادت دینے سے بھی بند نہ تھا!

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نبود!

ان سارے معاملات کے حقیقی تصفیہ کے لئے ازبس ضروری و اہم صرف یہ بات ہے کہ ہم مظاہر "وجود" یا "شخصیت" کے بارے میں ایک صحیح نقطۂ نظر تک رسائی حاصل کریں۔ اگر ہم ثنویہ کا زاویۂ نگاہ قبول کر لیں تو لاریب کہ ہستی کے تمام مصائب و آلام کا تریاق بجز اس کے بتائے ہوئے علاج کے کچھ نہیں۔ لیکن اگر حقیقت و حقانیت کا حامل وہ عقیدہ ہے جس پر "ثنویت" کی بنیاد ہے، نیز جس کا اعلان اُن تمام انبیا و رسل نے کیا ہے جو ثنویہ کی بہ نسبت ہمارے عہد سے بمراحل نزدیک تر ہیں، تو پھر ہم کو اسی شاہراہ جد وجہد پر اپنا کاروان عزم و عمل گرم کر دینا چاہئے جو ایک ایسی منزل عظمیٰ پر جا کر ختم ہوتا ہے جس کا تصور بھی اس وقت ہمارا واہمہ بمشکل کر سکتا ہے!

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

حقیقتِ حج

ارکان اسلام میں سے حج ایک ایسا رکن ہے جو توحید کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ جیسی موحدانہ عبودیت، مخلصانہ خشیت الٰہی، اور والہانہ شیفتگی اس میں پیدا ہوتی ہے کسی دوسری عبادت میں نہیں پیدا ہوتی۔ اس مرکز توحید کو جہاں حج کے مناسک ادا کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی خصوصیت بخشی ہے کہ وہاں مومن کے قلب پر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جس کا گمان اور اندازہ بھی دوسری جگہ نہیں کیا جاسکتا۔

دنیاوی حیثیت سے یہ رکن امت اسلامیہ کے اتحاد اور ترقی کا ذریعہ اور اس کے جملہ دینی اور دنیوی مفاسد کا مصلح ہے۔ اس میں اخوت اور مساوات کا عملی درس ہے جس سے شیرازۂ ملت مستحکم ہوسکتا ہے۔ یہ تبادلۂ خیالات کی ایک مقدس انجمن ہے جس میں اقوام مسلمہ ایک دوسرے سے اعانت و ہمدردی، دماغی و عقلی فوائد حاصل کرسکتی ہیں۔ یہاں عالم اسلامی کا اجتماع ہے جس سے امت کے ہر قسم کے تنازعات واختلافات مٹائے جاسکتے ہیں، اور ایک متفقہ نظام عمل تیار ہوسکتا ہے۔

تاریخ حج عہدالست کا حامل انسان ابتدائی دور میں باوجود نبیوں اور رسولوں کی تعلیموں کے توحید کی طرف کم مائل ہوا۔ اور اپنی نادانی سے زیادہ تر مظاہر پرستی میں مبتلا ہوکر شرک کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برگزیدہ فرمایا، جو اپنی مستحکم توحید اور شان حنیفیت کے باعث موحدوں کے پیشوائے اعظم ہوگئے۔ انہوں نے اکیلے اللہ کی خاطر اپنے باپ، گھر، خاندان اور وطن سب کو چھوڑ دیا۔ اور جس وقت حجاز کے اس بے آب وگیاہ خطہ میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو لیکر آئے اسوقت دونوں نے ملکر خلوص قلب اور دلی دعاؤں کے ساتھ اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے کعبہ کو تعمیر کیا جو دنیا میں موحدوں کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ اللہ نے انکی دعائیں قبول کیں، اس گھر کو مبارک اور سرچشمۂ ہدایت بنایا، اور حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔ وہ پاپیادہ اور دُبلی سواریوں پر جو راہ دور سے آتی ہیں آئیں گے، اور اپنے لئے فائدے حاصل

کریں گے۔

اس اعلان کے بعد سے حج شروع ہوا اور سلسلہ وار ہوتا چلا آیا لیکن قرنوں پر قرن اور صدیوں پر صدیاں گزرنے کے بعد اس میں تغیرات پڑنے لازمی تھے۔ اولاد ابراہیم میں سے بنی اسرائیل کا قبلہ جن میں انبیا پیدا ہوتے تھے اور اللہ کی ہدایت اترتی تھی بیت المقدس قرار پاگیا۔ اور کعبہ کا حج ان لوگوں کی رہنمائی میں ہونے لگا جو علم شریعت سے بے بہرہ اور توحید کی حقیقت سے ناآشنا تھے۔ انہوں نے اس موحدانہ عبادت کو مشرکانہ رسوم اور خرافات کا مجموعہ بنادیا۔

جب بنی اسماعیل میں دعائے ابراہیمی کا ظہور ہوا اور نبوت کبریٰ کے وارث رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے بحکم الٰہی پھر اس رکن توحید یعنی حج کو شرکیات سے پاک کرکے اپنی اصلی شکل میں قائم کیا۔ ۹ھ پہلا سال ہے جس میں دوبارہ صحیح اصول پر یہ فریضہ ادا کیا گیا، جو تاریخ میں حج اکبر کے نام سے مشہور ہے۔

فریضہ حج | یہ رکن چونکہ بنیاد اسلام یعنی توحید، نیز ملت کے ہر طرح کے منافع کا کفیل ہے، اسلئے سال کا ایک چوتھائی حصہ یعنی شوال، ذیقعدہ، ذوالحج تین مہینے اس کے لئے مخصوص کیا گیا۔

حج کی نیت کرنے والے خالص توحید اور اکیلے اللہ کی رضامندی کی طلب کے لئے جائیں نہ لڑیں جھگڑیں، نہ عورتوں سے ملاعبت کریں اور زاد راہ ساتھ لیں۔ تجارتی سامان بھی فروخت کے لئے لیجانا ممنوع نہیں ہے۔

ہر مسلم جو حج میں جانے کی استطاعت رکھتا ہو لازم ہے کہ زندگی بھر میں ایک بار ضرور یہ فریضہ ادا کرے۔

احرام | کعبہ ابھی سیکڑوں میل ہے لیکن حجاج معینہ میقاتوں سے غسل کرکے اور دو رکعت نماز پڑھکر اس مقدس مسجد کا زائرانہ لباس پہن لیتے ہیں۔ ایک لنگی اوپر، ایک لنگی نیچے۔ زیب و زینت کچھ نہیں۔ خوشبو اور آرائش ممنوع۔ آقا و غلام برابر ہوگئے۔ شاہ و گدا کا امتیاز اٹھ گیا۔ اخوت ہی اخوت اور مساوات، سب کے سب ایک رب العزت کے آستانہ کے فقیر، سبھی کی توحید کا دم بھرنے والے۔

اللّٰھمّ لبّیک، لا شریک لک لبّیک

ہر ایک کے وردِ زبان۔ سارے جھگڑے ختم۔ شکار و ذبح حرام۔ اور لہو و لعب بند۔

قافلہ رواں اور دواں ہے۔ دفورِ شوق سے دل بیتاب ہو رہے ہیں کہ کب اس منزل پر پہونچیں جہاں برکتیں اترتی اور رحمتیں برستی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جگہ آگئی۔ لبیک کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ زائرین بے قرارانہ داخل ہوئے اور پاک و صاف ہو کر اس گھر میں پہونچے جو دنیا کے تمام گھروں سے زیادہ محترم ہے۔

حجرِ اسود عہدِ ابراہیمی میں پیمانِ عام لینے کا دستور یہ تھا کہ ایک پتھر رکھدیا جاتا جسپر لوگ آ آکر اپنے ہاتھ مارتے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جس عہد کے لئے وہ پتھر رکھا گیا ہے اسکو انہوں نے تسلیم کر لیا۔

حضرت ابراہیم نے جب کعبہ تعمیر کیا تو اس کے ایک کونے پر ایک پتھر نصب کر دیا کہ اس گھر میں جسکی بنیاد اکیلے معبود کی پرستش پر ہے جو داخل ہو پہلے اس پر ہاتھ رکھکر پھر طواف کرے یعنی سات چکر لگائے۔ گویا وہ اپنے آپ کو اس کی توحید پر جسکی عبادت کے لئے یہ گھر ہے نثار کرتا ہے۔ اگر جان بھی دینی پڑیگی تو بھی اس سے منحرف نہ ہوگا۔

اسی پتھر کا نام حجرِ اسود ہے۔ نہ اسمیں کوئی طاقت ہے نہ اسمیں کوئی قوت۔ نہ یہ جنت کی پٹیان ہے نہ عرشِ معلیٰ کا فرش۔ صرف تجدیدِ عہدِ ابراہیمی اور پیمانِ حنیفیت کے لئے ایک نشان ہے اور بس۔ اس کو چھونے یا ہجوم کی صورت میں دور ہی سے اس کی جانب ہاتھ اٹھا دینے کو استلام کہتے ہیں۔ چونکہ یہ توحید کا مقدس پیمان ہے اس لئے ہاتھ یا پتھر کو چوم بھی لیتے ہیں۔ مسجدِ حرم میں پہونچکر سب سے پہلا کام یہی استلام ہے جس سے طواف شروع ہوتا ہے۔

نادان ہیں وہ لوگ جو عہدِ توحید باندھنے والوں پر سنگ پرستی کی تہمت لگاتے ہیں۔ حج کے جتنے اعمال ہیں وہ تو سارے کے سارے شرک کے توڑ ہیں۔ حاجیوں کی امتیازی صفت قرآن میں یہ ہے "حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهٖ" یعنی وہ اللہ کی طرف یکسو ہونیوالے ہیں۔ کسی کو اس کا شریک بنانے والے نہیں۔

طواف | یہ نظارہ کس قدر روح پرور ہے !! سیکڑوں ہیں جو حجرِ اسود کی طرف ہاتھ اٹھا کے طواف شروع کر رہے ہیں۔ ہزاروں ہیں جو پروانہ وار گھوم رہے ہیں اور اللہ کے نام، اُس کی توحید اور اُس کے آستانہ پر نثار ہو رہے ہیں۔ دل سینوں میں اچھل رہے ہیں، آنسو آنکھوں سے اُبل رہے ہیں اور منہ سے یہ کلمات نکل رہے ہیں :-

اَللّٰھُمَّ الحَرَمُ حَرَمُكَ ۔ وَالعَبْدُ عَبْدُكَ ۔ جَاءَكَ تَائِبًا هَارِبًا مِنَ الذُّنُوبِ ۔ هٰذَا مَقَامُ العَائِذِ بِكَ يَا اللّٰهُ ۔

کچھ کعبہ کی چوکھٹ تھامے ہوئے خشوع اور خضوع کے ساتھ استغفار میں محو ہیں۔ بیسیوں غلاف سے لپٹے ہوئے گریہ و زاری کر رہے ہیں۔ بہت سے دیواروں سے لگے ہوئے سجدہ میں پڑے ہیں اور رو رو کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ایک وارفتگی کا عالم ہے جو سارے مجمع پر چھایا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساحتِ قرب کی طنابیں کھینچ گئی ہیں اور جلال کبریائی سے قلوب پگھل پگھل کر پانی ہو رہے ہیں۔

یوں تو اللہ تعالیٰ کب اور کہاں نہیں مگر بعض بعض زمان و مکان کو اس نے خاص خاص خصوصیتیں دے رکھی ہیں جو دوسروں میں نہیں۔

مقام ابراہیم | طواف کے بعد اُس تجلی گاہ میں آتے ہیں جو مطاف کے حاشیہ پر ہے۔ یہ مقام کعبہ حضرت ابراہیم کا مقام ہے جہاں مرمر کا ایک حجرہ اور سائبان بنا ہوا ہے۔ یہ خاص قبولیت کا محل ہے۔ یہاں صلوٰۃ شکر کا دوگانہ ادا کر کے دعائیں کرتے ہیں اور فرطِ رقت سے دل کا خون آنکھوں سے بہاتے ہیں۔

سعی | صفا اور مروہ میں دو فرلانگ سے زیادہ فصل نہیں جس میں نیچے ابن سعود کی بنائی ہوئی پختہ سڑک ہے اور اوپر ترکوں کا ڈالا ہوا سائبان۔ مسجد حرم سے مشرق جانب چلیے قدم جو باہر رکھا جائیگا وہ اسی سڑک پر پڑیگا۔ دو رویہ بازار ہیں اور مکہ کا بڑا بازار۔

طواف کر کے حجاج سعی کے لیے نکلتے ہیں۔ یہ بھی شعائر اللہ میں سے ہے۔ بی بی ہاجرہ نے پانی کی جستجو میں ان پہاڑیوں کے درمیان سات پھیرے لگائے تھے اور اس کی یہ ادا ربّ العزت کو بھا گئی تھی۔

سعی میں بھی دلوں میں وہی رقت ہے اور وہی سوز و گداز۔ تیز گامی بھی ہے اور آہستہ خرامی بھی۔ کبھی حمد و ثنا ہے اور کبھی استغفار و دعا۔ سات بار دوڑتے ہیں اور ہر دوڑ میں وہی محویت ہے اور وہی استغراق۔ جھنڈ کے جھنڈ ہیں مگر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔

سڑک کے دونوں جانب دوکانیں کھلی ہوئی ہیں اور خرید و فروخت جاری ہے لیکن یہ گدایانِ آستانہ کسی اور ہی دھن میں ہیں۔ ان کو کچھ خبر نہیں کہ کدھر بازار ہے اور کیسا کاروبار۔ ان کا سودا ہی دوسرا ہے۔

سعی سے فارغ ہونے کے بعد تمتع یعنی خالی عمرہ کی نیت کرنے والے جامۂ احرام اتار دیتے ہیں کیونکہ ان کا کام پورا ہو گیا۔ جب حج میں جائیں گے تو پھر اس کو پہن لیں گے لیکن قِران یعنی حج و عمرہ دونوں کی ساتھ نیت کرنے والے ابھی اسی فقیرانہ لباس میں رہیں گے تا وقتیکہ جملہ مناسک حج پورے نہ کر لیں۔

اب ہر ایک کے لئے زمانۂ حج تک اپنی اپنی محنت اور کوشش ہے۔ جس قدر چاہیں حرم میں نمازیں پڑھیں، دعائیں مانگیں اور طواف کریں اور جو کچھ ہو سکے خیرات و مبرات میں حصہ لیں۔ یہ مقدس مقام، اور یہ موقع روز روز نہیں مل سکتا۔

عرفات آٹھویں تاریخ آگئی۔ حج کے لئے روانگی ہے۔ راستہ بھرا پڑا ہے۔ اونٹوں کی چار چار قطاریں ایک ایک ساتھ چل رہی ہیں۔ ہزاروں گدھوں پر ہیں اور لاکھوں پیدل۔ سب کے سب کسی خاص دھن میں ہیں۔ نہ بات ہے نہ چیت نہ شور ہے نہ ہنگامہ۔ شام کو منا میں پہونچے۔ رات کو وہیں منزل رہی۔ صبح کو پھر کوچ ہوا۔ دوپہر کو اس مبارک میدان میں داخل ہوئے جو حج کی جگہ ہے جس کی کشش ان سب کو کھینچ کر لائی ہے۔ کارواں پر کارواں پہونچ رہے ہیں۔ اور جہاں تک نگاہ جاتی ہے ڈیرے ہی ڈیرے لگے ہیں۔

عہد ازلی کے متوالے۔ خمخانۂ الست کے سرشار، پیمانِ حنیفیت کے سرمست، مغرب، مشرق، شمال، جنوب، دنیا کی چاروں سمتوں سے، دور دراز راہوں سے، سمندروں کو عبور اور بیابانوں کو

قلوب کے ساتھ ہے کیونکہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ دلوں کی تہ تک نفوذ کرتی ہیں یہ بمنزلہ برقی بیٹری کے ہیں جیسے دلوں کے قمقموں میں روشنی اور حرارت پہونچتی ہے۔ ان سب کا مخزن میدان عرفات کا منبر ہے جو افسوس ہے کہ مدتہائے دراز سے خاموش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے قلوب بے نور، افسردہ، منتشر اور متفرق ہیں۔ تنظیم کی صورت صرف نصب مرکزیت ہے اور کچھ نہیں۔ کیونکہ مرکز کی طرف ہر فرد متوجہ ہو جاتا ہے جس سے خود بخود ساری قوم منظم ہو جاتی ہے۔ جیسے شمع، کہ اس کے روشن ہوتے ہی گھر کی کل چیزیں اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہیں۔ افراد یا جماعتوں وغیرہ سے اس کو شروع کرنے میں ہمیشہ ناکامیابی ہوگی۔ کیونکہ یہ الٹا راستہ ہے۔

مزدلفہ | عرفات میں حج سے فراغت ہوگئی۔ جس کام کے لئے آئے تھے وہ کام ہو چکا۔ غروب کے وقت قافلے روانہ ہوگئے اور مشعر حرام کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ حجاج تھکے ماندے بالعموم سو رہے۔ اِلَّا مَاشَاءَ اللہ۔

اے غفلت زدہ کاروان! یہاں ذکر الٰہی کا حکم تھا۔ سونے کیلئے تو زندگی پڑی ہے نہیں تو موت کی نیند کیا کم پڑی ہے۔ یہ اُس مالک کی یاد کا موقع تھا جس نے ایسا دن دکھایا۔ سب ملکر اسکی حمد و ثنا پڑھتے اور اُس کا شکریہ ادا کرتے۔ تنہا بیٹھ کے ورد اور وظیفہ نہیں۔ کیونکہ یہ انفرادیت ہے اور یہاں جمہوریت چاہیئے۔

قربان گاہ خلیل | صبح اٹھکر مزدلفہ سے منا میں آگئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں توحید کے پیشوائے اعظم اور حنفاء کے سرگروہ نے اپنے پہلوٹھے بیٹے کو اللہ کے حکم کے مطابق قربان کرنے کیلئے پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا تھا اور چھری نکال چکے تھے کہ آسمانی رحمت نے لپک کر ہاتھ تھام لیا اور کہا بس، تم اپنی طرف سے سب کچھ کر چکے اور اس کڑے امتحان میں پورے اتر گئے۔

اسی کا فدیہ یہ ذبح عظیم ہے کہ ہر سال دین حنیف کے شیدائی اور ملت ابراہیمی کے فدائی لاکھوں ذبیحے یہاں اللہ کے نام پر قربان کر کے سنت خلیل کو تازہ کرتے ہیں۔

قربانی | یہ مجمع جو اطراف واکناف عالم سے آکر جمع ہوا ہے بیت اللہ کا زائر اور اپنے رب کا

مہمان ہے۔ اس لئے اس نے اپنے ان بندوں پر جنکو استطاعت دی ہے یہ فرض عائد کیا ہے کہ ان ضیوف کی میزبانی کریں جس کے بدلے میں ان کو اجر اور ثواب ملے گا۔ دور دور کے ذی مقدرت بھی جو خود نہ حاضر ہوں جانوروں کو قربانی کے لئے بھیجکر اس کار خیر میں حصہ لے سکتے ہیں۔

یہی قربانی کی اصل حقیقت ہے یعنی اسکی غرض حجاج کی ضیافت ہے نہ کہ محض خونریزی۔

اللہ کا حکم یہی ہے:۔

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ

یعنی قربانی کو خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدوں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔

قربانی کے بعد حج کی تکمیل اور اس فریضہ سے سبکدوشی ہو جاتی ہے۔ اب کھانا ہے اور کھلانا اور فرق مراتب کا لحاظ۔ اسوجہ سے مساوات کے لباس جامہ احرام کی ضرورت نہیں رہتی۔ حجاج سر منڈاتے، بال ترشواتے اور ناخون کٹاتے ہیں اور صاف ستھرے ہو کر اپنے کپڑے پہن لیتے ہیں۔

تین دن تک یہاں مجمع رہتا ہے اور تینوں دن قربانیاں ہوتی ہیں۔ یہی ایام تشریق ہیں۔

صدیوں سے اس قربانی کی جو حالت ہو رہی ہے اس کا بیان تکلیف دہ ہے۔ لاکھوں جانور ذبح کرکے ڈالدئے جاتے ہیں جنکے کھانے کیلئے گدھ اور گیدڑ بھی نہیں ہوتے۔ آخر ان کو دفن کر دینا پڑتا ہے۔

کاش یہاں بھی تنظیمی شکل ہوتی۔ ہر قوم کے ذمہ دار جماعت میں لگتے ہوئے اپنی جماعت کے اندازہ اور ضرورت کے مطابق قربانیاں کرتے۔ ایک جگہ پکواتے اور ایک ساتھ کھاتے کھلاتے۔ قومیں بھی ایک دوسرے کی مہمانی اور میزبانی کا لطف اٹھاتیں اور باہم الفت و مودت پیدا کرتیں۔ ہر جماعت کے لوگ اپنے ہمراہیوں کو اپنی زبان میں عرفات کا خطبہ سناتے اور سمجھاتے۔ اس صورت میں جو حاجی وہاں سے آتا وہ ملت کا جذبہ اپنے ساتھ لاتا جس سے تمام عالم اسلام میں ایک اجتماعی روح پھیل جاتی۔

رمی جمرات | منا میں تین جگہ تین نشانات بنے ہوئے ہیں جو شیطان سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ ہم تینوں دن حجاج کنکریاں مارتے ہیں۔ گویا اس مجرم سے اس عہد [illegible] انسان کو [illegible]

تعمیل فرمان اور توحید الٰہی سے روکتا ہے لعنت کرتے ہیں۔ یہ دستور پیشتر سے چلا آتا تھا۔ اسلام نے بھی اس کو قائم رکھا ہے

وداع | تین دن یا کم سے کم دو دن منا میں رہکر مکہ میں آجاتے ہیں اور طواف کر کے حج کے کل فرائض سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اب کوئی وطن کو پلٹتا ہے، کوئی مدینہ شریف کو جاتا ہے اور مجمع منتشر ہونے لگتا ہے۔ اسوقت ایک اجتماع عام کی ضرورت تھی جس میں سب ملکر اپنے رب کا ذکر کرتے۔ مواعظ بھی ہوتے اور خطبات بھی۔ حمد و ثنا کے قصیدے پڑھے جاتے اور تشکر کے ترانے گائے جاتے۔ عربی میں بھی۔ عجمی میں بھی۔ ایرانی میں بھی تورانی میں بھی۔ اس کے بعد طواف وداع کر کے اس حرم پاک سے رخصت ہوتے۔

لہ قرین قیاس یہ ہے کہ رمی جمار کی تاریخ عہد ابراہیمی سے نہیں بلکہ اصحاب فیل کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے جو کعبہ کو ڈھانے آئے تھے۔ اہل مکہ نے جو اس طاقتور لشکر کے رو در رو مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے ان تینوں جگہوں پر پہاڑ سے ان پر پتھراؤ کئے تھے جیسا کہ "ترمیہم بحجارۃ من سجیل" سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ ترمی کا فاعل بھی وہی مخاطب ہے جو پہلی آیت میں "الم تر" کا فاعل ہے نہ کہ "طیر" جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ لشکر جب عذاب الٰہی سے ہلاک ہو گیا تو اس کی یاد تازہ رکھنے کیلئے حج سے واپسی کے وقت ان مقامات میں رجم کا دستور مقرر ہو گیا۔ اسی طرح ابرہہ کے راہبر ابو رغال ثقفی کی قبر پر بھی جو مکہ اور طائف کے درمیان مقام مغمس میں ہے ہر عرب جو گزرتا ہے رجم کرتا ہے۔

ماموں جان

(بسلسلہ ماہ نومبر)

چوتھا ایکٹ

وانتشکی کا کمرہ: یہ اُس کا سونے کا بھی کمرہ ہے اور دفتر بھی۔ کھڑکی سے لگی ہوئی ایک میز ہے جس پر حساب کی کتاب اور بے شمار کاغذات کا انبار ہے؛ اس کے بعد ایک لکھنے کی میز، کتابیں رکھنے کی بریکیٹ، ترازو وغیرہ۔ پاس ہی ایک چھوٹی میز ہے جس پر استروف کا سامان ہے؛ رنگ، برش اور نقشہ کھینچنے کی چیزیں۔ اس کے پاس ایک بڑا تھیلا ٹنگا ہے۔ ایک قفس جس میں ایک چڑیا بند ہے۔ دیوار پر ایک افریقہ کا نقشہ ٹنگا ہے جس کا بظاہر کوئی مصرف نہیں ہے۔ ایک بڑا صوفا جس پر امریکن چمڑہ چڑھا ہوا ہے۔ بائیں طرف ایک دروازہ جو اندر کے کمروں میں کھلتا ہے۔ داہنی طرف ایک دروازہ ہے جو ہال میں کھلتا ہے۔ دروازہ کے قریب، داہنی طرف ایک پائدان پڑا ہے تاکہ کسان اور دیہات سے آنیوالے لوگ کمرے کا فرش نہ خراب کریں۔ خزاں کی ایک شام۔ خاموشی۔

تلی گن اور ماریا آمنے سامنے بیٹھے اُون کات رہے ہیں۔

تلی گن: ماریا تھیونا! آؤ کام جلد ختم کردیں۔ ابھی خدا حافظ کہنے جانا ہوگا۔ گھوڑے جوتنے کو کہدیا گیا ہے۔

ماریا: (چرخہ کو اور زیادہ تیزی سے چلانیکی کوشش کرتی ہے) تھوڑی اُون رہ گئی ہے۔

تلی گن: وہ ہار کو جارہے ہیں۔ وہیں رہیں گے۔

ماریا: اچھا ہے۔

تلی گن: وہ یہاں ڈر گئے ہیں...... دونوں...... ییلنا اینڈریونا کہتی رہتی ہیں " میں ایک گھنٹہ یہاں نہیں ٹھہروں گی۔ یہاں سے چلدو۔ یہاں سے چلدو! " ہم ہار کو میں قیام کریں گے" وہ کہتی ہیں

"شہر کو ذرا گھوم پھر کے دیکھ لیں پھر اپنا سامان منگوائیں گے ......" وہ اپنے ساتھ بہت سامان نہیں لیے جا رہے ہیں۔ مارینا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قسمت میں نہیں ہے کہ یہاں رہیں۔ ان کی قسمت میں نہیں ہے ...... اللہ کی مرضی یہی ہے۔

مارینا: یہ اچھا ہے کہ وہ یہاں نہ رہیں۔ ذرا صبح کے جھگڑے اور بستیوں کی تباہی کا خیال کرو — خدا کی پناہ یہ حیوانیت سے بدتر ہے!

تلی گن: بے شک۔ ایک ایسا موضوع جس پر آئیوازوفسکی[1] کا قلم جادو رقم جولانیاں دکھائے۔

مارینا: وہ منظر نہیں بھولتا۔ وہ خوفناک منظر (ایک وقفہ) اب ہم پھر پرانی طرح رہیں گے' جیسے پہلے رہتے تھے۔ ہم آٹھ بجے ناشتہ کیا کریں گے' ایک بجے دوپہر کا کھانا کھائیں گے' اور سر شام شب کا کھانا کھا لیا کریں گے۔ ہر بات پرانے طریقے سے ہوگی جس طریقے سے ہونی چاہیے' جیسے اور لوگ کرتے ہیں ...... جو عیسائیوں کا دستور ہے۔ (ایک آہ سرد کے ساتھ) مدت ہوئی میں نے نوڈلس[2] نہیں چکھے۔ خدا مجھ پر رحم کرے!

تلی گن: ہاں! زمانہ ہو گیا کہ کھانے پر نوڈلس نہیں لائے گئے۔ (ایک وقفہ) ...... آج صبح میں گاؤں سے گزر رہا تھا کہ دوکاندار نے مجھے پکار کر کہا "ارے بے شرم' دوسروں کے ٹکڑوں پر کب تک پڑا رہے گا؟" یہ بات میرے دل پر تیر کی طرح لگی۔

مارینا: نہیں' پیارے' تم اس کا ذرا اثر نہ لو۔ ہم سب خدا کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔ اسی کا دیا کھاتے ہیں۔ اس میں چاہے میں ہوں' یا تم ہو یا سونیا' یا آئیوان پتروویچ' کوئی بے کار نہیں' ہم سب محنت کرتے ہیں' کام کرتے ہیں! سب ...... سونیا کہاں ہے؟

---

[1] ایک روسی مصنف۔ مترجم

[2] نوڈل ایک آبی پرندہ ہے جسے روسی شوق سے کھاتے ہیں۔ اس لفظ کے معنی احمق کے بھی ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ پرندہ نہایت آسانی سے پکڑا جاتا ہے جس سے بدنام ہو گیا۔ افسوس کہ مجھے اس پرندے کا اردو نام نہیں معلوم۔ مترجم

تلی گن: باغ میں اب تک بیچاری ڈاکٹر کے ساتھ آنورن پیٹرووچ کو ڈھونڈنے میں لگی ہے انہیں ڈر ہے کہ کہیں وہ خودکشی نہ کرلے۔

مارینا: اور اُس کا پستول کہاں ہے؟

تلی گن: (چپکے سے) میں نے اُسے کوٹھری میں چھپادیا ہے!

مارینا: (مسکراکر) خوب!

(باہر سے وانتسکی اور اشرف داخل ہوتے ہیں)

وانتسکی: مجھے اکیلا چھوڑ دو (مارینا اور تلی گن سے) جاؤ! مجھے اکیلا رہنے دو۔ خواہ ایک گھنٹہ کے لئے سہی! اپنی نگہبانی میں نہیں برداشت کرسکتا

تلی گن: ضرور، ضرور، وانیا (پنجوں کے بل باہر جاتا ہے)

مارینا: راج ہنس کہتاہے، قیں، قاں، قاں! (اپنا اون اکٹھا کرتی ہے اور باہر جاتی ہے)

وانتسکی: مجھے اکیلا چھوڑ دو!

اشرف: بڑی خوشی سے اکیلا چھوڑ دوں گا۔ میں تو کب کا چلا گیا ہوتا لیکن میں پھر کہتا ہوں جب تک میری چیز نہ واپس کردوگے میں نہیں جاؤں گا۔

وانتسکی: میں نے تم سے کوئی چیز نہیں لی۔

اشرف: میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں مجھے نہ روکو۔ مجھے کب کا چلا جانا چاہیئے تھا۔

وانتسکی: میں نے تم سے کوئی چیز نہیں لی (دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

اشرف: دیکھو، میں کچھ دیر اور توقف کرتا ہوں، اس کے بعد مجھے معاف کرنا میں زبردستی کروں گا۔ ہم تمہارے دونوں ہاتھ باندھ دیں گے اور تمہاری تلاشی لینگے۔ میں بالکل سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔

وانتسکی: تمہیں اختیار ہے (ایک وقفہ) میں بھی کیسا بیوقوف تھا: دو مرتبہ پستول چلایا اور دونوں مرتبہ وہ بچ گیا! میں اس کے لئے خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔

اشرف: اگر بندوق، گولی، بارود وغیرہ سے آپ کو کھیلنا ہے تو بہتر ہے کہ آپ خود اپنے کو نشانہ بنائیں

وانٹسکی: (اپنے کاندھے ہلاکر) یہ عجیب بات ہے۔ میں نے قتل کا ارادہ کیا اور میں گرفتار نہیں کیا گیا۔ کسی نے پولیس کو خبر نہیں کی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ مجھے پاگل سمجھا ہے (ایک حقارت کی ہنسی ہنس کے) میں پاگل ہوں لیکن وہ لوگ پاگل نہیں ہیں جو اپنی بھدی سوئی بے وقوفی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اپنی کھلی ہوئی بے حسی و بے ذوقی پر پروفیسری کا نقاب ڈالتے ہیں۔ وہ لوگ پاگل نہیں ہیں جو بڈھوں کے ساتھ شادی کرتے ہیں اور انہیں ہر شخص کے سامنے فریب دیتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں اس کا پیار لیتے ہوئے دیکھا! میں نے دیکھا!

اشروف: بے شک میں نے اس کا پیار لیا۔ لیکن اس سے زیادہ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔

وانٹسکی: (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) نہیں نہیں تمام دنیا پاگل ہے کہ تمہیں تمہارے کئے کی سزا نہیں دیتی!

اشروف: بس کرو۔ کیوں پاگل ہوئے ہو؟

وانٹسکی: اچھا پاگل ہوں۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے بیوقوفی کی باتیں کرنے کا حق ہے۔

اشروف: کیا بہانہ ڈھونڈا ہے! تم پاگل ہرگز نہیں۔ تم میں یہ کمزوری ہے کہ بہت جلد متاثر ہو جاتے ہو۔ پہلے میں ہر اس شخص کو جو کمزور قلب کا ہو اور جلد اثر لیتا ہو بیمار سمجھتی تھی لیکن اب میرا خیال ہے کہ انسان کے لئے یہ معمولی بات ہے کہ وہ کمزور قلب ہو۔ تم بالکل دوسرے انسانوں کی طرح ہو۔ پاگل نہیں ہو۔

وانٹسکی: (اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے) میں نادم ہوں۔ کاش تم اندازہ کر سکتے میں کس قدر نادم ہوں! اس سخت اور تکلیف دہ احساس ندامت سے کسی درد کو نسبت نہیں۔ (افسوس کے ساتھ) کیا کروں؟ کیا کروں؟ (میز پر جھک جاتا ہے) اسے کیسے برداشت کروں؟ میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟

اشروف: کچھ نہ کرو۔

وانٹسکی: میرے لئے کوئی دوا تجویز کر دو! ہائے میرے خدا! میں پینتالیس سال کا ہوں۔ اگر میں ساٹھ برس کا ہو کر مروں تو ابھی تیرہ برس مجھے اور زندہ رہنا ہے۔ اُف! اُف! یہ طویل حیات۔ ان تیرہ برسوں کو میں کس طرح گزاروں؟ اس طویل مدت میں کیا کروں؟ ان تیرہ برسوں کو میں کس طرح بسر کروں؟

آہ! جانتے ہو۔۔۔۔۔۔ (اشروف کے ہاتھ کو زور سے پکڑ کر) جانتے ہو! کاش یہ ممکن ہوتا کہ اپنی باقی زندگی کسی نئے طریقہ سے گزار سکتا۔ ایک خاموش سنہری صبح آنکھ کھلتی اور ایسا محسوس ہوتا جیسے مجھے ایک دوسری زندگی ملی جیسے میرا تمام ماضی فراموش ہے، صفحۂ یاد سے حرف غلط کی طرح متروک ہے۔ گویا میرا ماضی دھوئیں کی طرح پھیل کر غائب ہو گیا۔ (روتا ہے)۔ ایک نئی زندگی شروع کرنا۔۔۔۔۔ آہ! مجھے بتاؤ اسے کیسے شروع کروں۔۔۔۔۔۔ کیا شروع کروں۔۔۔۔۔۔

اشروف: (پریشان ہو کر) چپ رہو! خاموش ہو جاؤ! نئی زندگی! ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے کوئی اُمید نہیں۔

وانٹسکی: کیا؟

اشروف: مجھے یقین ہے کوئی امید نہیں۔

وانٹسکی: خدا کے لئے مجھے کوئی دوا دو۔ میرا علاج کرو (اپنے دل کی طرف اشارہ کر کے) اس جگہ میرے سخت درد ہو رہا ہے۔ میرا دل جل رہا ہے۔

اشروف: (زور سے) بس، بس! (آہستہ آہستہ) وہ جو ہم سے سَو یا دو سو برس بعد زندہ رہیں گے اور جو ہماری اس بے ذوقی، بے وقوفی اور بے لطفی سے زندگی گزارنے پر ہنسیں گے، ہم پر طعنہ زن ہونگے۔ وہ، وہ، ہاں وہ شاید خوش رہنے کا کوئی ذریعہ تلاش کرلیں! مگر ہم۔۔۔۔۔۔ میرے اور تمہارے لئے ایک اُمید ہے، صرف ایک، جب ہم اپنی اپنی قبروں میں سوتے ہوں گے تو شاید، شاید ہمیں کوئی اُمید افزا نہ خوش آیند خواب نظر آئے (ایک آہ کے ساتھ) اے ضعیف آدمی، سارے ضلع میں صرف دو پڑھے لکھے، دو باتمیز انسان تھے۔ دو انسان تھے جن کی ہر شخص عزت کرتا تھا۔ میں اور تم مگر دیکھتے ہو؟ کوئی دس سال کے اندر اندر اس زندگی کے طوفان نے اس مذاق اُڑانے والی ہنسنے والی فرومایہ زندگی کے بھنور نے ہماری کشتیٔ حیات کو الٹ دیا اور ہمارے وجود کو اپنے ناپاک و ناسعود چھینٹوں سے زہر آلود کر دیا اور ہمیں بھی اور لوگوں کی طرح قابلِ نفرت، قابلِ ملامت بنا دیا (زور سے) مگر مجھے اپنے مطلب سے باز رکھنے کی کوشش نہ کرو، میری چیز واپس دیدو۔

وائنٹسکی: میں نے تمہارے کوئی چیز نہیں لی۔

اشرف: تم نے میرے بکس سے مارفیا کی ایک شیشی نکالی ہے (ایک وقفہ) دیکھو۔ اگر تم اپنی زندگی ختم کرنے پر مصر ہو تو جنگل چلے جاؤ اور گولی مار لو۔ لیکن میرا مارفیا مجھے دیدو ورنہ چرچے ہوں گے اور چہ میگوئیاں ہوں گی۔ لوگ سمجھیں گے کہ میں نے تمہیں شیشی دی۔ میرے لئے یہ کیا کم ہے کہ میں تمہاری لاش کا معائنہ کروں گا۔ کیا تم سمجھتے ہو مجھے اس سے تکلیف نہ ہوگی۔

(سونیا آتی ہے)

وائنٹسکی: مجھے اکیلا چھوڑ دو۔

اشرف: (سونیا سے) سونیا اگر "تدریونا" تمہارے ماموں نے میرے دوا کے بکس سے مارفیا کی ایک شیشی نکال لی ہے اور واپس نہیں دیتے۔ ان سے کہو کہ یہ ...... واقعی بہت نازیبا حرکت ہے اور میرے پاس ضائع کرنے کو وقت نہیں ہے۔ مجھے جانا ہے۔

سونیا: ماموں جان، آپ نے مارفیا چرایا؟ (ایک وقفہ)

اشرف: انہوں نے ضرور نکالا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔

سونیا: اسے واپس دیدیجئے۔ آخر آپ نے ہم سب کو اس قدر خوفزدہ کیوں کر رکھا ہے؟ (پیار سے) ماموں جان دیدیجئے! میں بھی شاید آپ ہی کی طرح زندگی سے بیزار اور تنگ ہوں لیکن دیکھئے میں صبر کر رہی ہوں اور مایوسی کو راہ نہیں دیتی۔ میں اسے برداشت کر رہی ہوں اور اسے برداشت کروں گی یہاں تک کہ زندگی آپ ختم ہو جائے گی...... آپ کو بھی صبر کرنا چاہئے (ایک وقفہ) اسے واپس دیدیجئے (اس کے ہاتھ چومتی ہے) پیارے ماموں جان میرے اچھے ماموں جان اسے واپس دیدیجئے! (روتی ہے) آپ مہربان اور نیک دل ہیں۔ آپ ہم پر رحم کیجئے اور اسے واپس دیدیجئے صبر کیجئے ماموں جان! صبر کیجئے!

وائنٹسکی: (میز کی دراز سے شیشی نکالتا ہے اور اسے اشرف کو دیتا ہے) لو... سونیا سے لیکن ہمیں فوراً کام میں لگ جانا چاہئے۔ جلدی کرو کوئی کام ...... ورنہ مجھے سکیں.....

مجھے یہ نہیں برداشت ہوگا۔

سونیا: ہاں، ہاں، کام۔ اپنے لوگوں کو رخصت کرتے ہی ہم بیٹھ جائیں گے اور کام کریں گے ...... امیزیہ پڑے ہوئے کاغذات کو الٹ پلٹ کر) ہر چیز بے ترتیب ہو رہی ہے۔

اشرف: (شیشی کیس میں رکھتا ہے اور اس کا کھٹکا بند کرتا ہے) اب میں جا سکتا ہوں۔

(ییلنا داخل ہوتی ہے)

ییلنا: آئیون پیٹروچ! کیا تم یہاں ہو؟ ہم جا رہے ہیں۔ الکزنڈر کے پاس جاؤ۔ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

سونیا: چلے جاؤ، ماموں جان! (وانشکی کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے) آیئے چلیں۔ ابا کی اور آپ کی صلح ہو جانا چاہیئے۔ یہ ضروری ہے۔

(سونیا اور وانشکی جاتے ہیں)

ییلنا: میں جا رہی ہوں۔ (اشرف کو اپنا ہاتھ دیتی ہے) خدا حافظ۔

اشرف: ابھی سے؟

ییلنا: گاڑیاں تیار ہیں۔

اشرف: خدا حافظ۔

ییلنا: تم نے مجھ سے آج وعدہ کیا تھا کہ چلے جاؤ گے۔

اشرف: مجھے وعدہ یاد ہے۔ میں ابھی جا رہا ہوں (ایک وقفہ) تم یہاں سے ڈر گئی ہو؟ (اس کا ہاتھ لے لیتا ہے) ایسا بھی کیا ڈر؟

ییلنا: مجھے خوف معلوم ہوتا ہے۔

اشرف: بہتر تو یہ تھا کہ تم ٹھہرتیں! کیا کہتی ہو؟ کل میرے ہاں ——

ییلنا: نہیں، اب جانا طے ہے۔ اور میں تمہیں آزادانہ اور بے خطر اسی لیئے دیکھ رہی ہوں کہ یہ طے ہے۔ میں تم سے صرف ایک عنایت کی طلبگار رہوں: مجھے اچھے دل سے یاد کرنا۔ میں چاہتی ہوں

تم میری عزت کرو۔
اشرف: اُف! (بے صبری سے) ٹھہر جاؤ۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ٹھہر جاؤ۔ سمجھو تمہیں اس
دنیا میں کچھ نہیں آتا ہے۔ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ تمہارے دل و دماغ کو مشغول رکھنے
کے لئے کوئی کام نہیں ہے اور آج نہیں تو کل تم اپنے جذبات سے شکست کھاؤ گی۔ جذبات کے تابع
ہو گی، یہ ناگزیر ہے اور میں جانتا ہوں یہ شکست بجائے ہارکوو یا کرسک میں کہیں واقع ہونے کے یہاں
واقع ہوتی، یہاں، قدرت کی گود میں...... یہاں جہاں شعریت ہے، جہاں کی خزاں بھی دلنواز
اور خوبصورت ہے...... یہاں کھیت اور جنگل ہیں...... ترگنیف کے انداز میں کہوں تو یہاں

قصبات اور آبادیاں ہیں، سبزہ کی طراوت ہے اور نیم تباہ شدہ مکانات ہیں......
یلنا: تم بڑے احمق ہو...... میں تم سے خفا ہوں، تاہم میں...... تمہیں لطف کے ساتھ یاد
کروں گی۔ تم دلچسپ آدمی ہو، تم میں ایک جوہر ذاتی ہے۔ ہم اب کبھی نہ ملیں گے اس لئے ــــ کیوں
چھپاؤں؟ ــــ واقعی مجھے تم سے ذرا سی محبت ہو گئی ہے۔ آؤ ہاتھ ملاؤ اور دوستوں کی طرح جدا ہوں۔

میری طرف سے اپنا دل صاف رکھنا۔
اشرف: (اس کا ہاتھ دبا کر) ہاں بہتر ہے کہ تم جاؤ...... (خوش خیالی میں) تم ایک محبت کرنے
والی، نیک دل، سادہ خاتون ہو تاہم تمہارے پورے وجود کے ساتھ ایک عجیب تعطیل وابستہ ہے۔
تم اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آئیں اور ہم سب جو اس سے پہلے اپنا اپنا کام کرتے تھے، محنت کرتے تھے
اور چیزیں تخلیق کرتے تھے، اپنا کام چھوڑ کر اپنے فرائض کو بھول کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ گرمی بھر
ہمیں سوا تمہاری ملاقات اور تمہارے شوہر کے گنٹھیا کے علاج کے کوئی کام نہ تھا۔ تم دونوں کی کاہلی
ہم میں سے ہر ایک میں سرایت کر گئی ہے۔ مجھے تم نے لبھا لیا اور پورے ایک مہینے سے میں بیکار ہوں
اور اس عرصہ میں لوگ بیمار ہوئے اور کسانوں کے مویشی میرے چھوٹے نوخیز تربیت یافتہ پودوں والے
باغات میں گھسے اور انہیں پامال کر گئے...... اور اسی طرح جہاں جہاں تم اور تمہارے شوہر
جائیں گے اپنے ساتھ تباہی و بربادی لے جائیں گے...... میں مذاق کر رہا ہوں معاف کرنا......

مگر تاہم کیا میں غلط کہتا ہوں ؟ اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم یہاں ٹھہر جاتیں تو تباہی اور بدحالی اس سے بھی زیادہ ہوتی۔ میرا کہیں ٹھکانا نہ ہوتا...... اور یہ تمہارے لئے بھی کوئی بہتری کی صورت نہ ہوتی۔ خیر جاؤ۔ یہ کامیڈی اب ختم ہے، بہتر!

یلینا: (اس کی میز سے ایک پنسل لیکر اور جلدی سے اُسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے) میں یہ پنسل تمہاری نشانی کے طور پر لیجاؤں گی۔

اشرف: یہ عجیب راز ہے...... ہم دونوں دوست تھے اور یکدم نہ معلوم کس سبب سے .... اب ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملیں گے۔ یہی دنیا میں ہر چیز کے ساتھ ہے...... اس وقت جبکہ یہاں کوئی نہیں ہے ــــ اور قبل اس کے کہ ماموں جان گلاب لیکر آئیں ــــ مجھے اجازت دو کہ جدائی کے وقت تمہارا بوسہ لوں...... اجازت ہے؟ (اُس کے رخسار کا بوسہ لیتا ہے) شکریہ!

یلینا: خدا تمہیں خوش رکھے۔ (ادھر اُدھر دیکھتی ہے) اچھا آؤ! زندگی میں ایک مرتبہ تو تمہیں گلے لگالوں۔ (اُسے زور سے بھینچتی ہے اور دونوں باری باری جلدی سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں) اب جاتی ہوں ــــ جاتی ہوں!

اشرف: جلدی کرو اور جاؤ۔ اب جب گاڑی تیار ہے تو چلی ہی جاؤ۔

یلینا: میں سمجھتی ہوں کوئی آرہا ہے (دونوں آہٹ کو سنتے ہیں)

اشرف: خدا حافظ!

(سربریاکف، واننشکی اور ماریا واسلیو دنیا ایک کتاب لئے، داخل ہوتے ہیں۔ تلی گن اور سونیا بھی اُن کے پیچھے آتے ہیں)

سربریاکف: (واننشکی سے) گزشتہ را صلوٰۃ۔ جو کچھ گزرا ہے اُس کے بعد سے ان چند گھنٹوں میں میرے دل میں اس قدر خیالات آئے ہیں اور میں نے اس قدر سوچا ہے اور میرے خیالات ایسے بڑے ہیں کہ اگر میں لکھنے پر آؤں تو آئندہ نسلوں کے فائدے کے لئے زندہ رہنے کے فن پر ایک تصنیف تیار کر سکتا ہوں۔ میں خوشی سے تمہاری معذرت قبول کرتا ہوں اور معاف کرتا ہوں۔

ملی ئن: ابھی کہتا ہوں۔ (جاتا ہے)

(صرف اشرف اور وائنشکی رہ جاتے ہیں)

اشرف: (میز پر سے رنگوں کی شیشیاں اٹھا کے انہیں اپنے تھیلے میں رکھتے ہوئے) تم جا کے انہیں رخصت کیوں نہیں کر آتے؟

وائنشکی: انہیں بغیر میرے رخصت کئے ہی جانے دو۔ میں...... میں رخصت نہیں کر سکتا۔ میرے دل پر ایک غبار ہے۔ مجھے جلد ہی اپنے کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی چیز تلاش کرنا چاہئے......

کام! کام! (میز پر رکھے ہوئے کاغذ الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے)۔

(ایک وقفہ: گاڑی کی گھنٹیوں کی آواز آتی ہے)

اشرف: گئے۔ پروفیسر خوش ہے۔ اب وہ نہیں آئے گا۔

ماریا: (داخل ہوتی ہے) گئے (ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور موزہ بنتی ہے)

سونیا: (داخل ہوتی ہے) گئے۔ (اپنے آنسو پونچھتی ہے) خدا خیریت کے ساتھ پہنچائے (اپنے ماموں سے) اچھا ماموں جان ہمیں کام کرنا چاہئے۔

وائنشکی: کام، کام......

سونیا: ایک مدت ہوگئی کہ اس میز پر میں اور آپ ساتھ نہیں بیٹھے (میز پر رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کرتی ہے) مجھے یقین ہے کہ روشنائی نہیں ہوگی (قلم دان اٹھاتی ہے، کپ بورڈ کی طرف جاتی ہے اور اس میں روشنائی ڈالتی ہے) لیکن میرا دل دکھتا ہے کہ وہ چلے گئے۔

(ماریا واسلیونینا آہستہ آہستہ کمرے میں آتی ہے)

ماریا: گئے (بیٹھ جاتی ہے اور پڑھنے میں مشغول ہو جاتی ہے)

سونیا: (میز کے پاس بیٹھتی ہے اور حساب کے رجسٹروں کے ورق الٹتی ہے) سب سے پہلے، ماموں جان ہمیں حسابات درست کرنا چاہئے۔ ہم نے حسابات مرتب کرنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ آج پھر کوئی اپنا حساب مانگنے آیا تھا اور ہم اُسے نہیں بنا سکے۔ اُسے بنا دیجئے۔ اگر ایک حساب آپ تیار

کریں گے تو دوسرا انہیں تیار کر دوں گی۔

وانشکی: (لکھتا ہے) "خرچہ ...... بہ حساب جناب ......" (دونوں خاموشی سے لکھتے ہیں)

ماریںا: (انگڑائی لے کر) میں تو آرام کرنے جاتی ہوں۔

اشرف: کیسی خاموشی ہے! قلم چوں چوں اور جھینگر چر چر کرتا ہے۔ موسم خوشگوار اور پُرسکون ہے۔ میں نہیں جانا چاہتا (گھنٹیوں کی آواز آتی ہے) میرے گھوڑے تیار ہیں ...... میرے دوستو مجھے اب سوائے خدا حافظ کہنے کے کوئی کام نہیں ہے۔ خدا حافظ کہتا ہوں —— اپنی میز کو خدا حافظ کہتا ہوں —— اور چلتا ہوں! (اپنے نقشے تھیلے میں رکھتا ہے)

ماریںا: تمہیں جلدی کاہے کی ہے؟ تم ٹھہر کیوں نہیں جاتے؟

اشرف: جانا ہی بہتر ہے۔

وانشکی: (لکھتا ہے) "دیا گیا مبلغ دو روبل پچہتر کوپک"

(ایک مزدور داخل ہوتا ہے)

مزدور: مہائل لووچ! گھوڑے کس گئے۔

اشرف: میں نے سن لیا (مزدور کو دوائیوں کا بکس، تھیلا، بستہ وغیرہ دیتا ہے) لو یہ لیے چلو۔ دیکھو بکس الٹنے نہ پائے۔

مزدور: نہیں حضور۔

اشرف: اچھا اب (خدا حافظ کہنے جاتا ہے)

سونیا: اب کب آپ سے ملاقات ہوگی؟

اشرف: میرا خیال ہے اگلی گرمیوں سے پہلے نہیں۔ جاڑوں میں ملنے کی کوئی امید نہیں ...... اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدانخواستہ کوئی بات ہو، میری موجودگی کی ضرورت ہو تو مجھے فوراً اطلاع کرنا میں آجاؤں گا (ہاتھ ملاتا ہے) تمہاری مہمان نوازی، تمہاری مہربانی —— تمہاری تمام عنایتوں کا شکریہ (آیا کے پاس جاتا ہے اور اس کے سر کو چومتا ہے) خدا حافظ بڑی بی۔

ماریِنا: تم بغیر چائے پیے نہیں جا رہے ہو؟

اشرف: کوئی ضرورت نہیں، اَنّا۔

ماریِنا: شاید تم دودھ کا ایک گلاس پیو گے؟

اشرف: (غیرارادی طور پر) شاید۔

(ماریِنا باہر جاتی ہے)

اشرف: (ایک وقفہ کے بعد) میرا ایک گھوڑا لنگ کرنے لگا ہے۔ میں نے کل دیکھا جب اُسے پانی پلانے لئے جا رہا تھا۔

وانتسکی: اُس کے نال بدلوا دو۔

اشرف: گھر پہونچ کر لوہار کے ہاں جانا ہو گا۔ اس سے مفر نہیں (افریقہ کے نقشے تک جاتا ہے اور اسے غور سے دیکھتا ہے) میں سمجھتا ہوں کہ اس افریقہ کے اندر اس وقت بڑی خوفناک گرمی پڑ رہی ہو گی!

وانتسکی: ہاں غالباً۔

ماریِنا: (ایک کشتی لئے واپس آتی ہے جس پر دودھ کا ایک گلاس اور ایک روٹی کی قاش ہے) یہ لیجئے۔

(اشرف دودھ پیتا ہے)

ماریِنا: تمہاری تندرستی کے نام، میرے پیارے (کہ کر خم کرتی ہے) اس کے ساتھ کچھ روٹی بھی کھاؤ۔

اشرف: نہیں مجھے یوں ہی پسند ہے۔ اچھا اب، خدا حافظ۔ اللہ آپ سب کو اچھا رکھے (ماریِنا سے) اٹھیو، اَنّا، باہر آنے کی ضرورت نہیں۔

(باہر جاتا ہے؛ سونیا ایک موم بتی لئے اُسے رخصت کرنے جاتی ہے؛ ماریِنا اپنی آرام کرسی پر بیٹھتی ہے)

وانتسکی: (لکھتا ہے) "دوسری فروری، مٹی کا تیل بیس پاؤنڈ۔ سولہ فروری، مٹی کا تیل پھر

بیس پاؤنڈ گیہوں .... (ایک وقفہ)

(گھنٹیوں کی آواز)

مارینا: گیا (ایک وقفہ)

سونیا: (واپس آتی ہے اور موم بتی میز پر رکھتی ہے) گیا۔

وانتسکی: (گنتا ہے اور لکھتا ہے) جملہ میزان ...... پندرہ ...... پچیس ......

(سونیا بیٹھ جاتی ہے اور لکھتی ہے)

مارینا: (انگڑائی لیتی ہے) یا اللہ۔ رحم کر!

(تلی گن پنجوں کے بل کمرے میں آتا ہے، دروازے کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ستار کے تار درست کرتا ہے)

وانتسکی: (سونیا کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے) میری جان، میرا دل دکھ رہا ہے۔ آہ! تجھے کیسے دکھا دوں میرا دل کیسا دکھ رہا ہے!

سونیا: اس درد کی کوئی دوا نہیں۔ ہمیں یہ زندگی گزارنی پڑے گی! (ایک وقفہ) ہم زندگی گزارتے جائیں گے ماموں جان! نہ معلوم کتنی طوفانی شامیں اور نہ معلوم کتنے لمبے لمبے دن اسی طرح آئیں گے اور گزارنے پڑیں گے! ہم اپنی مصیبتوں کو صبر کے ساتھ برداشت کریں گے جو ہمارے مقدر میں ہے اس پر قناعت کر رہیں گے۔ ہم دوسروں کے لئے کام کریں گے آج اور آج کے بعد بھی اس وقت تک جبکہ ہم بوڑھے اور ناکارہ ہو جائیں گے اور ہمیں کوئی آرام نہ ملے گا اور جب ہمارا وقت آئیگا ہم کسی کی شکایت نہ کریں گے اور چپ چاپ چلے جائیں گے مر جائیں گے اور وہاں قبروں والی نگری میں ہم اپنی داستان سنائیں گے کہ ہم نے تکلیفیں اٹھائی ہیں آنسو بہائے ہیں اور زندگی ہمارے لئے ایک بار گراں تھی اور خدا ہم پر ترس کھائے گا اور آپ اور میں، میرے ماموں، پیارے ماموں جان، ایک زندگی عطا ہوگی جو روشن خوشگوار اور پر لطف ہوگی اور ہم خوشیاں منائیں گے اور اپنی ان مصیبتوں کو تبسم کے ساتھ [illegible] اور ہمیں [illegible] نصیب ہوگا

مجھے یقین ہے، ماموں جان مجھے پورا پورا یقین ہے۔ (گھٹنوں کے بل آہستہ آہستہ سرک کر اُس کی گود میں پڑ جاتی ہے اور اپنا سر اُس کے ہاتھوں میں رکھ دیتی ہے) ایک بڑے درد مند لہجہ میں) ہمیں آرام نصیب ہوگا!

(ٹلی گن آہستہ آہستہ ستار بجاتا ہے)

سونیا: ہمیں آرام نصیب ہوگا! ہمارے کانوں میں فرشتوں کی آوازیں آئیں گی! ہم ساری کائنات کو روشنی سے منور دیکھیں گے۔ ہم دنیاوی مصیبت، دنیاوی بدی کو ایک عالمگیر شفقت، ایک ہمہ گیر مرحمت میں غرق ہوتے دیکھیں گے! اور ہماری زندگی دغدغہ اور وسوسہ سے بَری اور خدشوں سے آزاد ہوگی۔ ایک بوسۂ محبت کے مثل آسودہ معصوم اور شیریں ہوگی۔ مجھے یقین ہے، مجھے یقین ہے (ماموں جان کے آنسو اپنے رومال سے پونچھتی ہے) بیچارے، مصیبت کے مارے ماموں جان! آپ رو رہے ہیں (روتی ہے) آپ کو زندگی میں کوئی راحت کوئی خوشی نصیب نہیں ہوئی لیکن صبر کیجیے، ماموں جان، کچھ دن صبر کیجیے ہمیں آرام نصیب ہوگا (اپنی بانہیں اُس کے گلے میں ڈال دیتی ہے) ہمیں آرام نصیب ہوگا! (چوکیدار دستک دیتا ہے) ہمیں آرام نصیب ہوگا!

(ٹلی گن آہستہ آہستہ ستار بجاتا ہے، ماریا واسلیونا اپنی کتاب کے حاشیہ پر نشان لگاتی ہے۔ مارینا موزہ بنتی ہے)

سونیا: ہمیں آرام نصیب ہوگا!

پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔

محنت، موت اور علالت

ایک روایت

مصنفہ

لیو ٹالسٹائے

۱۹۰۳ء

جنوبی امریکہ کے باشندوں میں ایک روایت عام ہے۔

وہ کہتے ہیں خدا نے انسانوں کو پہلے پہل ایسا بنایا کہ انہیں کام کی حاجت ہی نہ ہوتی تھی، نہ انہیں گھر چاہئے تھے، نہ کپڑے، نہ خوراک۔ سو برس کی عمر تک وہ جیا کرتے تھے، اور بیماری تو وہ جانتے ہی نہیں تھے کیا چیز ہوتی ہے۔

تھوڑی مدت بعد جو خدا نے توجہ کی اور دیکھنا چاہا کہ لوگ کیونکر زندگی بسر کر رہے ہیں تو اُس نے دیکھا کہ بجائے اپنی زندگی اطمینان و مسرت میں کاٹنے کے انہوں نے ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کرنا شروع کر دیا تھا، اور ہر شخص کے خود غرض ہونے کی وجہ سے معاملات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ بجائے زندگی سے خوش ہونے کے وہ سب اسے بُرا سمجھتے تھے۔

پھر خدا نے سوچا "یہ ان کے الگ الگ رہنے، سب کے سب اپنے اپنے ہی مطلب کے لئے زندہ رہنے کا نتیجہ ہے۔" اور اس صورت حالات کو بدلنے کے لئے خدا نے ایسا انتظام کر دیا کہ ہر ایک کے لئے ناممکن ہو گیا کہ بغیر کام کئے زندگی بسر کر سکے۔ سردی اور بھوک سے بچنے کے لئے اب ان کے لئے لازمی ہو گیا کہ گھر تعمیر کریں، اور زمین کھودیں، اناج اور پھل کاشت کریں اور انہیں جمع کریں۔

خدا کا خیال تھا "کام ان میں اتفاق پیدا کریگا، بے ایک دوسرے کی مدد کے نہ تو یہ کوئی اوزار بنا سکیں گے، نہ شہتیروں کو تیار کر کے کہیں لے جا سکیں گے، نہ گھر بنا سکیں گے، نہ فصل بو یا کاٹ سکیں گے، نہ ہی اپنے لئے کپڑا اُبن یا سی سکیں گے۔

"اسی طریقہ ہی سے اُن کو سمجھ آئے گی کہ جتنا ہی خلوص دل سے مل کر یہ کام کریں اتنا ہی زیادہ کما سکتے ہیں، اور اتنی ہی بہتر اُن کی زندگی بسر ہو سکتی ہے، اس سے ان میں اتفاق پیدا ہوگا"

ایک زمانہ اسی حالت میں گزر گیا، اور پھر خدا دیکھنے آیا کہ لوگ کس طرح سے رہ رہے ہیں، اور آیا خوش ہیں یا نہیں۔

لیکن اب کے اُن کی حالت پہلے سے بھی بُری تھی، کام تو وہ مل کے ہی کرتے تھے اسوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا، لیکن سارے مل کر نہیں، بلکہ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر، اور ہر ٹولی یہی چاہتی تھی کہ دوسری ٹولی سے کام چھین لے، اور وہ ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہوتے تھے، اور اپنی طاقت اور اپنا وقت لڑائی جھگڑوں میں کھو دیتے تھے، اور ہر ایک کی حالت بُری تھی۔

خدا نے جو دیکھا کہ یہ حالت بھی ٹھیک نہیں تو اُس نے ایسا انتظام کرنے کا فیصلہ کیا کہ انسان کو اپنی موت کا وقت کبھی معلوم نہ ہو، اور وہ اچانک ہی مر جایا کرے اور اُس نے یہ فیصلہ انسانوں کو سنا دیا۔

خدا کا خیال تھا کہ "ہر ایک جو سمجھے گا کہ موت مجھے اچانک آئے گی تو یہ چند روزہ نفع نقصانوں کی خاطر اپنی اُس زندگی کو جو ان کے حصے میں آئی ہے برباد نہیں کریں گے۔"

لیکن ایسا بھی نہ ہونے پایا، جب پھر خدا دیکھنے آیا کہ انسان اپنی زندگی کیونکر بسر کر رہے ہیں اُس نے دیکھا کہ جتنی خراب اُن کی زندگی پہلے تھی تنی ہی اب بھی ہے۔

جو سب سے زیادہ قوی اور توانا واقع ہوئے تھے، انھوں نے اس بات سے فائدہ اُٹھا کر کہ انسان اچانک مر جاتا ہے اُن لوگوں کو جو اُن سے مقابلتہً کمزور تھے دبا لیا تھا، بعض کو مار بھی ڈالا تھا، اور بعض کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دی تھیں، جو سب سے قوی اور توانا تھے بالکل کوئی کام نہ کرتے

تھے، اور سستی کی وجہ سے اُن کی طبیعتیں اُچاٹ گئی تھیں، اور جو کمزور تھے انہیں اپنی طاقت سے بڑھ کر
کام کرنا پڑتا تھا، اور آرام کبھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ انسانوں کا ہر گروہ دوسرے گروہوں سے ڈرتا تھا اور انہیں
نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اور انسانوں کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ خوشی سے خالی ہو چکی تھی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر، خدا نے حالات سدھارنے کی خاطر اب آخری طریقہ استعمال کرنے کا فیصلہ
کیا۔ اُس نے ہر قسم کی بیماریاں انسانوں کے ہاں بھیج دیں۔ خدا کا خیال تھا کہ جب انسان بیماری کی حالت
میں ہوں گے کہ ہر ایک کو بیماری لاحق ہو سکتی ہے تو یہ سمجھ جائیں گے کہ جو تندرست ہوں انہیں بیماروں
پر رحم کرنا چاہیئے اور اُن کی مدد کرنی چاہیئے تاکہ اگر وہ خود بھی بیمار ہو جائیں تو اور لوگ جو تندرست
ہیں انکی بیماری میں ان کی مدد کر سکیں۔

اور پھر خدا چلا گیا، لیکن پھر جب وہ دیکھنے کے لئے آیا کہ اب جبکہ انسانوں کو بیماریاں لاحق ہو سکتی
ہیں، یہ کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں، تو اُس نے دیکھا کہ اُن کی زندگی پہلے سے بھی بدتر تھی۔ وہ
بیماری جو کہ خدا کا مقصد تھا انسانوں کو ایک کر دے اُن کے مزید تفرقہ کا باعث ہوئی تھی۔ وہ لوگ جو
اتنے توانا تھے کہ دوسروں پر جبری حکومت کر سکیں، اب اپنی بیماریوں کے ایام میں بھی اُن دوسروں کو
اپنی خدمت پر مجبور کر رہے تھے، لیکن جب ان کی اپنی باری آتی تھی تو دوسروں کی بیماری پر اُن
کی خدمت نہ کرتے تھے، اور جن لوگوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ دوسروں کا کام کریں اور بیماری میں اُن کی
خدمت کریں کام کر کر کے اتنے تھک گئے تھے کہ اپنے بیماروں کی تیمارداری کے لئے بھی اُن کے پاس
کوئی وقت نہ تھا، اور اس لئے مجبوراً انہیں ویسے ہی چھوڑ دیتے تھے۔ اس مقصد سے کہ بیماروں
کا منظر دولتمند لوگوں کے عیش و عشرت میں مخل نہ ہو، ایسے گھروں کا انتظام کر دیا گیا تھا جہاں یہ نادار
مصیبتیں جھیل جھیل کے آخر مر جائیں، ان لوگوں کی بستیوں سے دور، [illegible] اُن کی ناخوشی کا باعث
ہو سکتی تھی، اور ایسے لوگوں کے بچے پڑے جو اُن کی تیمارداری میں مدد کو بمشکل میسر ہوتے تھے،
حکموں کے غلام تھے، اور اُن سے صرف نفرت کرتے تھے۔ [illegible] لوگ بیماروں کو [illegible]
سمجھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ یہ ہمیں بھی لاحق نہ ہو جائیں، اس لئے نہ صرف یہ، لوگوں سے بُرا

کرتے تھے بلکہ ان لوگوں سے بھی بچ بچ کر رہتے تھے جن کا کام بیماروں کی تیمارداری تھا۔

پھر خدا نے اپنے دل میں کہا "اگر اس طریقہ سے بھی انسان نہیں سمجھ سکتے کہ اطمینان اُن کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ تو وہ مصیبتیں جھیلنے ہی سے یہ بات سیکھیں" اور خدا نے انہیں چھوڑ دیا کہ جو چاہیں کریں۔

اور جب انسانوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو مدتیں صرف کرنے کے بعد اُن پر یہ بھید کھلا کہ انہیں خوشی حاصل ہو سکتی ہے اور انہیں اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ تھوڑی ہی مدت ہوئی ہے کہ ان میں سے بعض بعض کو سمجھ آنے لگی ہے کہ کام بعض کے لیے دن رات کی مصیبت اور بعض کے لیے جان جوکھوں کی غلامی نہیں ہونا چاہیے بلکہ ایک مشترکہ اور دل خوش کن مشغلہ ہونا چاہیے جو سب انسانوں میں اتحاد پیدا کرے، انہیں سمجھ آنے لگی ہے کہ جب موت ہر وقت ہمارے سر پر کھڑی رہتی ہے تو ہر ایک انسان کا مناسب مشغلہ یہی ہو سکتا ہے کہ زندگی کے جو سال اور گھنٹے اور منٹ اُس کے حصے میں آئے ہیں، اتحاد اور محبت سے گزارے، انکو سمجھ آنے لگی ہے کہ بیماری بجائے اس کے کہ وہ لوگوں میں تفرقہ پیدا کرے، اُن کے باہمی اتحاد کا ایک ذریعہ ہونی چاہیے۔

تنقید و تبصرہ

پیغام صلح۔ نورس۔ اجمل۔ مونس

رسائل

"پیغام صلح" کا آخری نبی نمبر | مدینہ کے تاجدار حضرت آقائے نامدار سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ تمام دنیا کے لئے ایک مستقل اور صحیح شاہراہِ عمل اور ہدایت کامل ہے، اس لئے اُسے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر انداز میں شائع کرنا مخلوقِ خدا کی زبردست خدمت ہے۔

جہاں خود اہلِ اسلام کے اسلام اور ایمان کی صحت و تقویت کے لئے وہ بے خطا نسخہ ہے، وہاں اُن ہٹ دھرموں اور بے دینوں کے لئے بھی تازیانۂ عبرت و بصیرت، جو اسلام کی بہتر سے بہتر حقانیت سے درگذر کر کے اپنی مخالفت اور اسلام سے اپنے عنادِ قلبی کا مرکز صرف حضرت ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر قائم کر چکے ہیں، اس لئے کہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ حضور کی سیرت ہی وہ چیز ہے جس نے بڑے بڑوں کے کفر توڑ کے رکھ دئے۔

روشن خیال یورپ اس حقیقت کی تہ بہت پہلے پا چکا تھا اور وہاں کے اہلِ قلم اور ہمارے دوست نما دشمنوں نے اس سیلِ رحمت کا بے سود دفاع شروع کر دیا تھا۔ ویسے بھی یورپ سے آج ہر جماعت اور ہر شخص غیر معلوم اور غیر محسوس طریقہ پر متاثر ہے۔ اور یورپ ہی کی تقلید میں یہی فتنہ اب ہندوستان میں۔ وہاں پا رہا ہے اور بڑے افسوس کی بات ہے اور ہمارا یہ قوم کی ایک کثیر جماعت سے ہمیں شکایت کا موقعہ ہے کہ وہ اپنے عقاید و خیالات کا پرچار خلافِ اصول و قاعدہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر گندے سے گندے حملے کرنا ہی سمجھے ہوئے ہیں۔

اس اعتبار سے بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے صاحبِ علم و فہم اہلِ قلم حضرات اس طرف خاص

توجہ فرمائیں اور قومی جرائد کا یہ مذہبی فرض ہے کہ اُن کے رشحات کو بہتر اسلوب اور کثیر تعداد میں شائع اور رائج کریں۔ اُس کے بعد "اللہ جسے چاہے ہدایت بخشے اور جسے چاہے گمراہ کرے"۔

بڑی خوشی کی بات ہے، ہمارے قومی صحیفوں نے اس طرف کافی توجہ شروع کی ہے، انہی میں سے ایک "پیغام صلح" بھی ہے، جو ویسے بھی عموماً اسلام اور پیغمبر اسلام کی سیرۃ پر نہایت مفید، کارآمد اور ہدایت وبصیرت افروز مقالات شائع کرتا رہتا ہے۔ اس کے "آخری نبی نمبر" کا تقریباً ہر مضمون پڑھنے اور بار بار پڑھنے کے لائق ہے جسے مسلمانوں کے علاوہ ہر اُس شخص کو پڑھنا چاہئے جسے حقیقت ومعرفت کی تلاش ہو۔

انجمن احمدیہ کی یہ خدمت جو خالص اسلام اور حضرت داعی اسلام خاتم انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کے متعلق ہے عرصہ سے جاری ہے اور یقیناً قابل توجہ ہے۔

سالانہ چندہ ۶؎، اس خاص نمبر کی قیمت درج نہیں، غالباً مفت مل جائیگا۔

ملنے کا پتہ :- منیجر "پیغام صلح" لاہور

(ا۔ ۱۰۔ م)

نورس | یہ اورنگ آباد کالج کا دوماہی رسالہ ہے جس کا جدید سلسلہ اب تقریباً ایک سال کے بعد پھر شروع ہوا ہے اور یہ دیکھکر بے انتہا مسرت ہوئی کہ رسالہ ٹائپ میں چھپتا ہے۔ مضامین کا معیار اچھا خاصا ہے۔ نومبر و دسمبر ۲۸ء کا رسالہ ہمارے پیش نظر ہے جسمیں مولوی احمد حسین صاحب کا مضمون "اسباب قحط ہندوستان" خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ سالانہ چندہ درج نہیں

ملنے کا پتہ :- اورنگ آباد کالج، اورنگ آباد (دکن)

اجمل | معین الدین حارث صاحب بی۔ اے (جامعہ) نے مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب مرحوم ومغفور کی یادگار میں دو مہینے ہوئے یہ روزنامہ بمبئی سے جاری کیا ہے۔ ۲۰ × ۲۶ / ۴ سائز کے ۴ صفحوں پر شائع ہوتا ہے۔ "اجمل" ایک کٹر قومی پرچہ ہے اور اس لئے وطن پرست طبقہ کی امداد کا مستحق ہے۔

ہم کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ دو ماہ کی قلیل مدت میں پرچہ کی اشاعت ایک ہزار سے متجاوز ہوگئی ہے حارث صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ چونکہ پرچہ صرف چار صفحوں پر شائع ہوتا ہے اس لئے زیادہ جلی اور کئی کئی سرخیاں نہ دیا کریں۔ اس سے اخبار میں کافی جگہ بیکار ضائع ہوتی ہے۔ نیز بمبئی کی مقامی خبریں اور دنیا کی خبروں کا نچوڑ جو وہ "ایک نظر میں سب کچھ" کے عنوان سے شائع کرتے ہیں ابھی کافی توجہ کا محتاج ہے۔ مقامی خبروں کے لئے نصف صفحہ اور "ایک نظر میں سب کچھ" کے لئے کم از کم پہلے صفحہ کا وہ تمام حصہ ہونا چاہئے جس پر خبریں دیجاتی ہیں۔

ہمارے خیال میں خبریں بھی بہت تفصیل سے دینا ضروری نہیں۔ اسوقت ۲ دسمبر کا پرچہ ہمارے سامنے ہے۔ لکھنؤ میں سائمن کمیشن کے جلوس کے سلسلہ میں پنڈت جواہر لال پر جو حملہ ہوا اس کی تفصیل اس پرچہ میں ۳ کالم سے زیادہ پر دی گئی ہے۔ لیڈنگ آرٹیکل عموماً ایک ڈیڑھ کالم کا ہوا کرتا ہے۔ اگر یہ بالکل بند کر دیا جائے یا کبھی کبھی بہت ضروری مسائل پر ہوا کرے تو بہتر ہوگا "اجمل" کا سائز چونکہ چھوٹا ہے اور تعداد صفحات صرف چار۔ اس لئے یہ ضروری باتیں نظر انداز کرنیکے لائق نہیں۔

حارث صاحب چونکہ جامعہ کے ایک عزیز طالب علم رہ چکے ہیں اس لئے انکے اخبار سے ہم کو خاص دلچسپی ہے اور اسی بنا پر بلا تکلف بعض تبدیلیاں تجویز کر دیگئیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ "اجمل" ترقی کرے اور حارث صاحب اس کے ذریعہ ملک کی بہترین خدمت کرکے "جامعہ" کا نام روشن کریں۔

مونس | ماہ دسمبر ۱۹۲۸ء سے یہ رسالہ زیر ادارت جناب حفیظ اللہ صاحب دانش گوجرانوالہ سے جاری ہوا ہے۔ جسکا افتتاحی نمبر ہمارے پیش نظر ہے۔ رسالہ نہایت خراب چھپا ہے۔ اور کاغذ بھی اچھا نہیں۔ البتہ ٹائٹل بہت خوبصورت ہے۔ اس رسالہ کے اجراء کا مقصد فنون کے ذریعہ ملک و قوم کی ذہنی۔ اخلاقی اور معاشرتی ترقی مقصود ہے۔ مضامین تمامتر عام دلچسپی کے ہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ "مونس" گوجرانوالہ (ج)

کتب

تذکارِ سلف۔ اُردو قاعدہ۔ جواہرِ سخن۔ سرکار کا دربار۔ وصلی ابجد

تذکارِ سلف | ضیاء احمد صاحب ضیا۔ ایم۔ اے۔ ناشر مجالس ادبیہ انٹرمیڈیٹ کالج علی گڈھ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۳۴ صفحے قیمت ۴؍

عہدِ اسلامی کے قرونِ اولیٰ میں ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں کہ ایک شخص نے عدل، صداقت، پاسِ عہد اور ایمانداری کے سامنے اپنا اور اپنے عزیز و اقارب کا خیال نہ کیا۔ روزانہ کی زندگی کے یہی وہ واقعات ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ پچھلے لوگ ہم سے کتنے بہتر تھے۔ ان واقعات کا محفوظ رکھنا اور انہیں بہتر سے بہتر طریقہ پر نمایاں اور بیان کرنا ہماری حیاتِ ملی کے لیے ازبس ضروری ہے جناب ضیا نے مولانا شبلی کے طرز میں بعض واقعات نظم کیے ہیں۔ جو ایک مفید کام ہے۔ "عہدِ سلف کا ایک زرّیں صفحہ" اور "اسوۂ حسین" اس مجموعہ کی نمایاں ترین نظمیں ہیں۔ جناب ضیا کا اگر یہ شوق جاری رہا تو توقع ہے کہ اُن کی نظموں میں دلکشی اور اسلوبِ بیان کی عمدگی بھی پیدا ہو جائیگی جو اس مجموعہ میں کمتر پائی جاتی ہے۔

اُردو کا قاعدہ | مرتبہ .... ناشر قومی کتب خانہ۔ ریلوے روڈ۔ لاہور۔ سائز ۲۰×۲۶/۱۶۔ حجم ۲۰ صفحے۔ قیمت ۱؍

یہ قاعدہ بہت دبیز کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ ا۔ خ، و۔ غ، ن۔ ے تک علیحدہ علیحدہ تین حصّوں میں اسباق ہیں۔ ہر سبق کے بعد حروف شناخت کرنے کی مشق ہے۔ قاعدہ کسی جدید اصول پر نہیں لکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ مرکبات کا بھی وہی پُرانا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جیسے آج کل سہل بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بہرحال جو قاعدے عموماً رائج ہیں اُن سے یہ قاعدہ اس لیے ضرور بہتر ہے کہ اس کا کاغذ ایسا نہیں ہے جسے بچے آسانی سے پھاڑ سکیں۔

جواہرِ سخن | از مولوی محمد عبدالمقیت صاحب شمس نیموی - ناشر جناب شمس نیموی - نیمی - ڈاکخانہ فتوحہ ضلع پٹنہ - سائز ۲۲×۱۸ حجم ۱۴۸ صفحے - قیمت ایکروپیہ -

قواعد تذکیر و تانیث پر یہ مفید کتاب ہے - الفاظ کے مذکر یا مؤنث ہونیکی سند مشاہیر شعراء کے کلام سے پیش کی ہے - کتاب کے ایک تہائی حصہ میں متروکات و محاورات کی بھی بحث ہے اور بعض شعراء کے کلام کا انتخاب مع مختصر حالات درج ہے - جواہر سخن ٹکسٹ بک کمیٹی صوبہ بہار و اڑیسہ کی منظور شدہ کتاب ہے - یقیناً شمس صاحب نے اسکی تالیف پر بڑی محنت کی ہے - جو قابلِ داد ہے - (ج)

سرکار کا دربار | مؤلفہ احمد الیاس مجیبی صاحب ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی - سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۵۲ صفحات - قیمت ایکروپیہ -

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات اُمتِ اسلامیہ کے لیئے اُسوۂ حسنہ ہیں جنکو تعلیمی نصاب کا لازمی جزو رکھنا اور بچپن ہی سے اسکی تعلیم دینا چاہیئے تھا - مگر مدت ہائے دراز سے مسلمانانِ ہند نے اس سے غفلت کی - اردو میں اس قسم کی پہلی کتاب جو تعلیمی غرض کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی وہ ہماری سیرۃ الرسول ہے جسکو ہندوستان کے طول و عرض میں بہت سے اسلامی مدارس نے اپنے نصاب میں داخل کیا - اور بعض صوبوں میں اسکے ترجمے کر لیئے گئے جو اسکولوں میں پڑھائے جانے لگے -

مگر یہ کتاب نویں اور دسویں جماعتوں کے طلبہ کے لیئے تھی - اور ضرورت یہ ہے کہ اس سے پہلے ہی سے اُن کو اس اُسوۂ حسنہ سے روشناس کیا جائے - اس غرض کے لیئے خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی نے ہمارے رسول نامی کتاب لکھی جو مکتبۂ جامعہ کی طرف سے شائع کی گئی - اب یہ کتاب یعنی "سرکار کا دربار" تعلیمی نقطۂ نظر سے ہمارے پُرجوش اور نشیط مکتبہ کے کارپرداز مولوی الیاس احمد صاحب مجیبی نے ترتیب دی ہے - بچوں کی ذہنیت کو

پیش نظر رکھ کر اُن کے مناسب حال واقعات لکھے ہیں۔ زبان سلیس رکھی ہے۔ اور چھپائی
لکھائی سب موزوں۔ اسمیں کہیں کہیں بعض بعض خامیاں تھیں۔ وہ بھی اب نکال دی گئی ہیں۔
اُمید ہے کہ اسکا آئندہ اڈیشن بالکل ٹھیک ہوگا۔ بچوں کی دلچسپی کے لیئے مسجد حرم اور مسجد نبوی
کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ اور سرورق خوبصورت رکھا گیا ہے۔ جامعہ کے نصاب تعلیم
میں ابتدائی چہارم میں یہ کتاب پڑھائی بھی جاتی ہے۔ دیگر اسلامی اسکولوں میں بھی چوتھی یا
پانچویں جماعتوں کے دینی نصاب میں اسکو رکھنا نہایت مفید ہوگا۔

وصلی امجد منشی عبد المجید صاحب پروین رقم لوہاری منڈی لاہور نے اب کی پوری وصلی
جلی اور خوشخط لکھ کر دبیز آرٹ پیپر پر چھپوا کر شائع کی ہے۔ حروف نہایت خوشنما۔ روشن۔ صاف
اور دیدہ زیب ہیں۔ اور چھپائی کی صفائی بھی نظر فریب۔ خاصکر جدول اور حاشیہ بہت دلکش
ہے۔ وسط میں خود پروین رقم صاحب کا فوٹو بھی ہے۔
یہ وصلی علاوہ اس کے کہ خوشخطی سیکھنے والوں کے لیئے نمونہ کا کام دے۔ کمرے کی زینت
اور آرائش کے لیئے بھی عمدہ چیز ہے۔ اور تصویروں سے کم دلکش نہیں ہے۔
اصول فن کے لحاظ سے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں مختلف اساتذہ کے خط کا
اتباع کیا جاتا ہے۔ دلی والے میر پنجہ کش، اور مولوی رضی الدین، اور منشی عبد الغنی کے پیرو
ہیں۔ لکھنؤ میں حافظ نور اللہ، محمد ابراہیم اور علی رضا، نیز آخری خطاط منشی شمس الدین صاحب
اعجاز رقم کا اسکول ہے۔ اور لاہور میں امام ویردی کی شاگردی ہے۔ منشی عبد المجید صاحب
کی یہ وصلی قیود سے آزاد ہے۔ اور کسی خاص اسکول کی نقل نہیں معلوم ہوتی۔ قیمت فی کاپی ۱۰
تعمیم فائدہ کے لحاظ سے اگر اسکی قیمت کم رکھی جاتی تو بہتر ہوتا۔

(ع ۔ ش)

شذرات

۱۹۲۷ء ختم ہوگیا ۔ ہم اس پرچہ میں اپنے ناظرین کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔ گزشتہ سال جامعہ اور اہلِ جامعہ کے لیئے بڑی مشکلوں اور پریشانیوں کا سال رہا ۔ مسیح الملک مرحوم کے انتقال سے گویا جامعہ کا اصلی بانی اور سرپرست دنیا سے اٹھ گیا ۔ اور ان کا یہ عزیز ترین روحانی بچہ یتیم ہوگیا ۔ اکابر قوم نے مسیح الملک کی یادگار رقائم کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اور قدرتاً جامعہ ملیہ ہی کو اپنے مرحوم قائد کی بہترین یادگار تسلیم کیا کہ اسی کے قیام و استحکام کی کوشش میں مرحوم نے اپنی عمر کے آخری ایام صرف کیئے تھے ۔ اور یہی وہ اہم تعمیری کام تھا جسکی تکمیل کی تمنا لیکر وہ اس دنیا سے سدھارے تھے ۔

مرحوم کو جو دلی تعلق جامعہ اور جامعہ والوں سے تھا اُسکا علم کچھ جامعہ کے کارکنوں کو ہی تھا ۔ لیکن اہلِ جامعہ کو اسکا اقرار ہے کہ قوم کے تمام ذمہ دار اشخاص ، اور ملک کے تمام ممتاز صحیفوں نے اس گہرے تعلق کو تسلیم کیا اور اس فیصلہ سے کہ جامعہ کو مسیح الملک کی یادگار بنایا جائے یقیناً مرحوم کے مقاصد اور ارادوں کے صحیح علم کا ثبوت دیا ۔ گاندھی جی اور ڈاکٹر انصاری نے جو اپیل جامعہ فنڈ کے لیئے دو بیل ملک سے کیا اُسکے مؤیدین کی فہرست اٹھا کر دیکھیے تو مشکل ہی سے ہندوستان کے مشہور قومی رسائل و اخبارات کے فائل دیکھیے ، شاید ہی کوئی ہو جس نے اس اپیل کی تائید میں ایک یا نہیں بار بار لکھا ہو ۔ لیکن یہ اپیل شروع ۱۹۲۷ء میں ہوا تھا ۔ اور اس سال کے ختم ہونے میں ایک مہینہ باقی تھا کہ اسوقت تک ہماری احسان ناشناس قوم نے اپنے اس محسن اور خادم اور قائد کی یادگار قائم کرنے کے لیئے بمشکل چار ہزار روپیے جمع کر پایا تھا ! ہماری قومی زندگی کے انتشار ، باتوں کی چاٹ اور اصلی کام سے بیزاری کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے ۔

لیکن وسط نومبر میں مولنا ابوالکلام صاحب آزاد اور ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سلسلہ میں مدراس کا سفر کریں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ ان کے ہمراہ تھے۔ کچھ عرصہ پہلے سے مدراس کے مشہور اہل دل سیٹھ جمال محمد صاحب سے خط و کتابت ہو رہی تھی۔ تجارت کی عام حالت خراب ہونے کے باعث سیٹھ صاحب کا خیال تھا کہ ابھی اس کام کو ملتوی کیا جائے۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ آخر دنیا کا کام کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا ہے انہوں نے جامعہ کے وفد کو دعوت دیدی۔ اور ۱۹ نومبر کو یہ وفد مدراس پہنچا۔

مدراس میں متعدد جلسے ہوئے جسمیں اراکین وفد نے جامعہ کے مقاصد سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ مدراس کے مسلمانوں نے کام کی اہمیت کو سمجھ کر اور جس نام کو قائم رکھنے کے لیے روپیہ جمع ہو رہا تھا اسکی عزت و اہمیت کا خیال کر کے خوب اچھی طرح دل کھول کر مدد کی۔ شہر کے معزز ہندو حضرات نے بھی چندہ میں شرکت فرمائی۔ اور وفد کو اس دورہ میں تقریباً ۵۰ ہزار روپیہ وصول ہو گیا۔

اہل جامعہ خصوصیت کے ساتھ مولنا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے شکر گزار ہیں کہ باوجود دیگر سیاسی مصروفیتوں کے انہوں نے جامعہ کے کام اور اپنے مرحوم رفیق کی یادگار قائم کرنے کے لیے وقت نکالا۔ مولانا نے تو باوجود ناسازی طبع کے یہ سفر اختیار فرمایا۔ اور سفر کی زحمتوں کے باعث سے ان کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ جسکی وجہ سے کئی روز تک مدراس میں رکنا پڑا۔ خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمارے ان دونوں مخدوموں کی صحت کو بحال فرمایا۔ کہ آپ چندہ اور اکابر امت بھی اس اہم تعمیری کام کے لیے کچھ وقت نکال سکیں۔

یہ سچ ہے کہ قومی ضرورتیں ہماری ایسی ہیں کہ ایک لمحہ کی فرصت نہیں دیتیں ... بڑ ... پہنچے

مسائل اپنے ساتھ لاتا اور ان مسائل کے حل کا فوراً طالب ہوتا ہے۔ ہر لمحہ کا کام بیشک اہمیت رکھتا ہے لیکن قومی زندگی کے معمار جہاں جزوی لیپ پوت کے فرائض سے غافل نہیں ہو سکتے وہاں یہ کب درست ہے کہ نئی تعمیروں کی بنیادوں کی استواری و استحکام کی طرف سے بیخبر ہو جائیں۔ سچ یہ ہے کہ وقتی کام فوراً اپنا وقتی انعام بھی پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن "عاجلہ" اور "آخرہ" کے فرق کو جاننے والے ان انعاموں کی حقیقت سے ناآشنا نہیں ہوتے۔ اور آنی و وقتی جلسوں اور جلوسوں کے سراب نظر کی خاطر "سعی مشکور" کے انعام ربانی کو کم حقیقت نہیں جانتے۔ اور جب فوری — لیکن ناپائدار اور وقتی — کامیابی کی پرستش کرنے والے ان صبر و استقامت سے کام کرنے والوں سے بھی فوری نتائج کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ شاعر کا یہ قول انہیں سنا دیتے ہیں کہ:-

"بستی بسانا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے"

اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ کاش ہماری قوم میں وقتی نتائج کے مقابلہ میں مستقل کامیابی کی زیادہ قدر ہو۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جو مستقبل کی پائدار بنیادیں رکھنے کے دشوار کام کے لیئے اپنے اندر کافی 'ایمان' بھی رکھتے ہوں۔ اور اسکے لیے "سعی" کرنے کو بھی آمادہ ہوں۔ "لیڈروں" کی ہم میں کمی نہیں، کچھ "بستی بسانے والے" درکار ہیں۔

مدراس کے وفد کی کامیابی کے سلسلہ میں ہمارا فرض ہے کہ سیٹھ جمال محمد صاحب کا اہل جامعہ کی طرف سے دلی شکریہ ادا کریں۔ سیٹھ صاحب موصوف مسیح الملک کے خاص احباب میں تھے۔ اور مرحوم کی زندگی ہی میں طویل خط و کتابت اور تبادلۂ خیالات کے بعد آپ جامعہ کے دل سے حامی ہو گئے تھے۔ آپ مسلمانان مدراس بلکہ مسلمانان ہند کے لیئے ایک مایۂ ناز ہستی ہیں۔ خدا نے دولت دی ہے اور وہ چیز جو اکثر دولت والوں کو نہیں ملتی۔ یعنی اچھا سمجھنے والا دماغ بھی عطا کیا ہے۔ اور پھر وہ چیز بھی ارزانی کی ہے جو ان دونوں سے کمیاب ہے۔ یعنی درد مند دل۔

صوبہ مدراس میں متعدد خیراتی کام آپ کی نگرانی سے چل رہے ہیں۔ جنمیں خصوصیت

کے ساتھ مدرسہ جمالیہ اور جمالیہ ہوسٹل قابل ذکر ہیں ۔ اول الذکر قدیم اور جدید علوم دونوں
سے کما حقہ واقفیت رکھنے والے علماء پیدا کرنے کے لیئے قائم ہے ۔ اور اپنے مقاصد میں جامعہ سے
بہت کچھ ملتا جلتا ہے ۔ مؤخر الذکر اس لیئے ہے کہ سرکاری کالجوں کے طلبہ کو یہاں وظیفہ دیکر رکھا
جائے ۔ اور انہیں اُن کے کالجوں کی تعلیم کے علاوہ علوم دین سے بھی واقف کیا جائے ۔ ان دونوں
کاموں پر یہی سیٹھ صاحب تقریباً ۳ ہزار روپے ماہوار صرف کر رہے ہیں ۔ جامعہ کے وفد کو آپ نے
فی الحال چار ہزار روپیہ عنایت فرمائے ۔ اور سو روپے ماہوار مستقلاً مقرر کیئے ۔ اور آئندہ بھی امداد
کے لیئے اپنی پوری آمادگی ظاہر فرمائی ۔ ہم سیٹھ جمال محمد صاحب ، سیٹھ سی عبدالکریم صاحب
اور دیگر مدراسی معاونین جامعہ کا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں ۔

شاید ناظرین کو معلوم ہوگا کہ گزشتہ سال شروع دسمبر میں دنیا کے عیسائی طلبہ کی جمعیۃ کا اجلاس
شہر میسور میں منعقد ہوا تھا ۔ اس جمعیۃ اجلاس میں دنیا کے تقریباً تمام ممالک سے طلبہ کی تحریکوں کے
نمائندے آئے تھے ۔ اجلاس کا افتتاح مہاراجہ صاحب میسور نے ایک نہایت ہی مؤثر تقریر سے کیا
اور پھر دو ہفتہ تک اسکی کارروائی جاری رہی ۔

اجلاس میں علاوہ مختلف ممالک کے نمائندوں کے ہندوستان کے مختلف مذاہب کے
نمائندے بھی بلائے گئے تھے ۔ ہندوؤں کی طرف سے کلکتہ یونیورسٹی کے استاد فلسفہ پروفیسر
رادھا کرشن کو بلایا گیا تھا جو عنقریب اکسفورڈ یونیورسٹی میں معلم فلسفہ کی حیثیت سے جانے والے ہیں
مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیئے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کو دعوت دی گئی تھی
ہمیں یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ شیخ الجامعہ کی تقریر کو اس کانفرنس میں بہت پسند کیا گیا اور
کانفرنس کے نمائندوں نے جنکے ذہن میں اسلام اور اسکی تعلیمات کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں
تھیں اپنے استعجاب اور تشکر کا اظہار کیا ۔ اور اکثر نے کہا کہ " اگر یہ اسلام ہے تو ہم بھی مسلمان
ہیں " البتہ یہ بات اکثر کی سمجھ میں نہ آئی کہ مسلمان آخر اپنے پیغمبر کو خدا کیوں نہیں مانتے !

کہ عیسائیت کی سب سے بڑی فضیلت انکی نظر میں یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام (نعوذ باللہ) خدا ہیں !!

اس اجلاس کے سلسلہ میں ہمیں جو کاغذات ملے ہیں ان سے بہت دلچسپ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں جو ہمارے لیئے عبرت کا سامان ہو۔ مختلف ممالک کے نمائندوں نے اپنے اپنے دیس کے طالبعلموں کی مذہبی و معاشرتی حالت پر رپورٹیں پیش کیں۔ اور طلبہ میں عیسائی تعلیم کے پھیلانے اور عیسائی اخلاق کی ترغیب دینے کے وسائل کی طرف توجہ دلائی۔ اس جمعیۃ کے اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دنیا کے تقریباً ۸ لاکھ اعلیٰ تعلیم پانے والوں میں سے تقریباً سوا دو لاکھ یعنی ۱۲½ فیصدی اس میں شامل ہو چکے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے تقریباً ۲½ لاکھ اعلیٰ تعلیم پانے والوں میں سے قریب ۴۲ فیصدی اس میں شامل ہیں۔ تیس ممالک میں اس جمعیۃ کی شاخیں ہیں۔ اور مختلف قومی شاخوں کے نمائندوں کا اجلاس ہر دوسرے سال ہوتا ہے۔ یہ دو سالہ جلسے مختلف ممالک میں ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ پہلا جلسہ تھا۔

اس جمعیۃ کے مختلف کاموں میں ہم ایک کام کی طرف اپنے ناظرین کی توجہ خاص طور پر منعطف کرانا چاہتے ہیں۔ یعنی پردیسی اور نادار طلبہ کو مدد پہنچانے اور انہیں اپنی مدد آپ کرنے کے مواقع فراہم کرنے کے متعلق انتظام کی طرف۔ انشاء اللہ ہم کسی آئندہ اشاعت میں ان انتظامات کے متعلق ایک مفصل مضمون ہدیۂ ناظرین کرینگے۔

نومبر کے رسالہ جامعہ میں ڈاکٹر برکت علی قریشی کے مضمون میں حضرت ابن عباسؓ کے متعلق دو ایک فقرے ایسے ہیں جنکی اشاعت عمداً اور دیانتاً جائز نہ تھی۔ چنانچہ مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے بھی اپنے اخبار سچ میں اسکا شکوہ لکھا۔

صورت یہ ہوئی کہ کارپردازان جامعہ نے بلا مجھ کو دکھائے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے اعتماد

پر یہ چھاپ دیا۔ چھپنے کے بعد جب رسالہ مجھ کو ملا اور میں نے پڑھا تو مجھے بہت قلق ہوا۔ میرا خیال تھا کہ اسکی معذرت لکھوں گا کہ اس اثنا میں دریا بادی صاحب نے بھی اسکی طرف توجہ مبذول کرائی جسکا میں شکرگزار ہوں۔

مولوی صاحب موصوف نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ ایسے مضامین شائع ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں نہیں ہیں جہاں لایسمعون فیھا لغوا ولا تاثیما الا قیلا سلاما سلاما کا دور ہو۔ بلکہ عالم ناسوت میں ہیں جہاں رحمانی کلام کے شیطانی آوازیں بھی سننی پڑتی ہیں۔ ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذی کثیرا۔ افراد کے لیئے گو یہ آواز کیسی ہی تلخ ہو لیکن قومی حافظہ کا تو ان سے خالی رہنا مناسب نہیں۔ رہی تردید تو اسکی تردید کرکے خود تردید کی اہمیت کھونی ہے۔

مولوی دریا بادی صاحب نے اپنے اس شکوہ میں قدیم طرز انداز میں میرے متعلق جو تعریف کی ہے وہ افسوس ہے کہ نہ اُن کی شان کے مطابق ہے نہ میری۔ مگر اس موقعہ پر رسالہ کے مدیر ہونے کی حیثیت سے اس غلطی پر خواہ وہ کسی کے تسامح سے ہوئی ہو اپنی مسئولیت کا احساس کرتے ہوئے میں درگزر سے کام لیتا ہوں۔

یہ معذرت میں لکھ چکا تھا کہ رسالہ معارف موصول ہوا۔ اسمیں بھی اس غلطی پر توجہ کی گئی ہے اور بسیط شذرہ لکھا گیا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ دونوں نقادوں نے اس سے دو مختلف فائدے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مُدیر سچ کو میرے ساتھ عناد ہے۔ اس لیئے انہوں نے اس موقعہ پر میرے عقیدہ کی تردید سے اپنے ایمان کی پختگی کا اظہار کرکے قلب کی تشفی فرمائی ہے۔ اور مدیر معارف نے اس ایک غلطی پر مغربی یونیورسٹی کے تمام عربی تعلیم یافتوں کے جملہ حقوق " " ضبط کرکے مشرقی مدارس کے طلبہ کے حوالے کردیئے ہیں۔

زیرادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲ | بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۲۹ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
۱۔ ایک تصویر	پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)	۲
۲۔ اگر میں واعظ ہوتا؟	یوسف حسن صاحب بی اے (جامعہ) مقیم پیرس	۸
۳۔ اشتراک	ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم اے پی ایچ۔ ڈی	۱۴
۴۔ عراق عرب	اسرائیل احمد خانصاحب	۲۵
۵۔ سائل	انتون چیخوف (ترجمہ)	۴۰
۶۔ غزل	از مولانا محوی صدیقی	۴۷
۷۔ دوشیزۂ سحر	از حضرت درد کاکوروی	۴۸
۸۔ دو عجیب کتابیں	مولانا سید سلیمان صاحب ندوی	۴۹
۹۔ فاؤسٹ کے چند ورق	ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ۔ ڈی	۵۴
۱۰۔ اقتباسات		۵۹
۱۱۔ گڑیا کا گھر (ریویو)	م-م	۶۷
۱۲۔ شذرات		۷۵

ایک تصویر

لیونارڈو دا ونچی (Leonardo da Vinci) نے اس زمانہ میں ایک تصویر بنائی تھی جب اطالیہ میں قدیم یونان کا اثر اپنے عروج پر تھا، ملک کے تمام روشن ضمیر لوگ یونانی جمالیات کے بادۂ کہنہ سے مست تھے، اور یونانی تخیل گہرے سے گہرے جذبات تک سرایت کر گیا تھا۔ لیونارڈو بھی انہیں روشن ضمیر لوگوں میں سے تھا، لیکن اس کی اپنی شخصیت اسقدر مضبوط اور تخلیقی تھی کہ وہ دوسروں کی طرح یونانی تہذیب میں فنا نہیں ہو گیا تھا، بلکہ اس کے اثرات کو اپنے جذبات کے قوی اور دل کے وسیع بنانے کے لئے استعمال کیا۔ دوسرے یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کے عشق میں کلیسا اور حضرت عیسیٰؑ اور دین عیسوی کو بھول گئے، لیونارڈو نے یونانی جمال کو عیسائی اطاعت اور ایثار کے رنگ میں رنگا، اور ایک تصویر بنائی جو صدائے مستانہ بھی ہے اور فلسفہ بھی، عشق بھی اور مذہب بھی۔

یہ تصویر حضرت یوحنا کی ہے، ایک ولی جو مسیح سے کچھ پہلے پیدا ہوئے۔ وہ جنگلوں اور ویرانوں میں بسر کرتے تھے، اور جو لوگ ان کے پاس جاتے ان سے کہتے تھے کہ "میں مسیح نہیں ہوں، میں اس کا پیش رو ہوں۔ میں مسیح کے قدم چھونے کے لائق بھی نہیں، میں صرف اس کا راستہ صاف کرنے کے لئے آیا ہوں۔ میرے نالہ کو ہوش سے سنو، اور بپتسمہ کے پانی سے اپنے گناہ پاک کر دو"۔ اعتقاد اور انکسار جوش اور خود فراموشی کا بہتر نمونہ عیسائی مذہبی تاریخ میں مشکل سے ملے گا۔ اسی واسطے لیونارڈو نے انھیں اپنی تصویر کے لئے سب سے مناسب سمجھا۔ انہیں صحرا میں دکھایا، ان کے چہرہ کو روشن کیا، ہاتھ میں صلیب دی۔ یہ سب عیسائی روایات کی پیروی تھی، باقی جو کچھ تصویر میں ہے وہ یونانی جمالیات کا جوہر ہے۔

یونانی تصور انسانیت کے حسن میں اس قدر مشغول اس کی عظمت کا اس قدر دلدادہ تھا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کی کماحقہ تعظیم اور توصیف نہ کر سکا۔ یونانی تہذیب یا ستوں کی طرح یونان کا عالم بالا

بھی مختلف دیوتاؤں میں تقسیم تھا۔ ہر دیوتا آزاد، خود مختار، بے نیاز انسان کے اُس جذبہ یا انسانی زندگی کے اُس پہلو پر حکومت کرتا تھا جو اُس کے سپرد تھا۔ منروا عقل و دانش کی دیوی تھی، وینس حسن کی، کیسٹر اور پولکس حیا زرانی کے، ڈایونیسس انگور اور شراب کا۔

ڈایونیسس اُس وقت یاد کیا جاتا تھا جب دنیاوی امور سے فراغت ہو، اور خوشی اور مستی مقصود ہو۔ ڈایونیسس کا مندر صحرا اور چشمے اور درختوں میں چھپی ہوئی وادیاں اور پہاڑیاں تھیں، وہیں اس کے پجاری جا کر اُسے یاد کرتے، اور اپنی مجلس اور شراب خواری میں شریک ہونے کی دعوت دیتے تھے۔ عوام کے تصور میں ڈایونیسس خوش مزاجی، موٹے ہونٹوں، مخمور آنکھوں اور نمایاں توند کا مجموعہ تھا اور اُسے پجاری بھی ایسے ہی ملتے تھے۔ مگر وہ قوم جو مشرقی شاعری میں ناصح اور واعظ کے نام سے مشہور ہے اسے کب روا رکھ سکتی تھی۔ اُس نے طے کیا کہ ڈایونیسس کی مستی شراب کی نہیں، شراب اور شراب خواری محض تمثیلیں ہیں۔ ڈایونیسس ایک سنجیدہ، خوش اخلاق بلکہ نہایت درجہ پارسا دیوتا ہے۔ اُس کا نشہ روحانی ہے اس لئے اس کی پرستش میں شراب خواری بغرض مستی و مدہوشی ہرگز جائز نہیں۔ یونانی آرٹسٹ کو نہ عوام کی پیروی منظور تھی نہ اخلاقی رہنماؤں کی۔ اُس نے ڈایونیسس کو ایک خوبصورت مرد کی شکل دی، ایسا جسے خوش مذاق اور سنجیدہ لوگ اپنی عیش و طرب کی مجلسوں میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اور اُسکی آنکھوں میں ایسا خمار پیدا کیا جو روحانیت اور شراب خواری دونوں کا حیرت انگیز مجموعہ تھا.......

یونانی تخیل کا نیا دور جس میں لیو نارڈو کی شخصیت نے نشوونما پائی تھی، نہ پرانے دیوتاؤں کو انکی دیرینہ شکل میں پیدا کر سکا، نہ ان کے پجاریوں میں صحیح اور فطری عقیدت۔ ظاہر تھا کہ اگر عیسائی عقیدت نے اُن کو اپنے زیر سایہ نہ لیا، یا وہ اپنی صورت دنیا اور تہذیب کی نئی شکل کے مطابق نہ بدل سکے، تو دونوں کو سخت نقصان ہوگا۔ عیسائی مذہب ایک خاص لحاظ سے لوگوں کی فطرت میں سرایت کر چکا تھا، لیکن اُس میں تعمیر اور تخلیق کی طاقت اتنی کم رہ گئی تھی کہ پرانے دیوتاؤں نے اُس کے قلعہ کو آسانی سے فتح کر لیا۔ ان دونوں میں مطابقت کرنا، اس مطابقت سے ایک نئے مذہب کا کام لینا

اس زمانہ کی تہذیب کا سب سے اہم مسئلہ تھا جس تصویر کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کوشش کا ایک
نہایت کامیاب نمونہ ہے۔

حضرت یوحنا ایک صحرا میں رونق افروز ہیں، ہاتھ میں صلیب، کندھے پر کملی ہے مگر صحرا پرستی
کالی گھٹا کی طرح چھائی ہے، یہاں تک کہ ان کی صلیب کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ان کے سامنے
ایک کھوہ ہے ویسا ہی جس میں ڈایونیسیس کے پجاری اپنی مجلسیں کیا کرتے تھے۔ حضرت یوحنا
کے بال لٹوں میں بندھے ہیں، انکا جسم ویسا ہی سفید اور نرم اور خوبصورت، ان کا انداز ویسا ہی
مستانہ، ان کی آنکھوں میں وہی ذومعنی خمار ہے جو ڈایونیسیس کے لیے مخصوص تھا، لیکن وہ صلیب
کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، گویا یہ ساری دنیا، یہ خمار، یہ حسن سب اسی کا کرشمہ ہیں۔ اسی اشارہ
میں تصویر کا سارا فلسفہ ہے۔

کلیسا نے شروع سے نفس کشی اور رہبانیت کو روحانی ترقی اور نجات کا اکیلا صحیح اور
سیدھا راستہ قرار دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کا جوہر یہی مانا گیا تھا کہ انسان جسمانی خواہشات، دنیا کی
مسرتوں سے دل کو ہٹالے اور نفس کو روح پر قربان کرے۔ صدیوں کی عادت سے لوگوں کی
ذہنیت میں پارسائی کے یہی معنی اور اس کی یہی صورت مقرر ہوگئی تھی لیکن صدیوں کے تجربہ نے
انہیں کچھ مایوس بھی کر دیا۔ رہبانیت اور زہد کی دشواریوں نے ان کی ہمت پست کر دی۔ جب
انہوں نے قدیم یونان کا رنگ دیکھا، یونانی انسانیت کی عظمت کا انہیں احساس ہوا تو وہ اپنے
مذہبی عقیدوں اور اصولوں سے منہ پھیر کر اس نئے دین کے معتقد ہوگئے۔ اس دین میں جذبات
اور نفسی خواہشات کے نشوونما کا موقعہ تو ضرور تھا لیکن اخلاق کی جڑ کٹ جاتی تھی۔ کچھ لوگ کلیسا
کے دھرے پر چلنا چاہتے تھے اور انہوں نے یونان اور یونانی تہذیب کو شیطان کا جال بتایا اور
قوم کو آگاہی دی کہ اگر فلاح کی خواہش ہو تو اس سے محفوظ رہیں۔ زیادہ تر بیچ اپنے عقیدوں کا
دامان کئے ہوئے دونوں تہذیبوں سے لطف یا فائدہ اٹھاتے رہے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے
مذہب کو بالائے طاق رکھا اور یونانی دیویوں پر عاشق ہو، نفس کی لگام ہاتھ سے چھوڑ دی۔

ان میں سے کوئی طریقہ بالکل صحیح نہیں تھا، مگر کسی فریق کی نظر میں اتنی وسعت نہ تھی کہ حضرت عیسیٰ اور قدیم یونان کو ایک ہی دل میں جگہ دے سکے۔ لیونارڈو دا ونچی نے علاوہ اور کارناموں کے یہ معجزہ بھی دکھایا۔ یوحنا کی تصویر میں صلیب پر فوراً نظر جمتی ہے، انکی ظاہری مستی پارسائی اور ایثار کا پیغام دیتی ہے، لیکن تصویر پر یہ بھی صاف لکھا ہے:

من ایں مے چوں مغان دو د پیشیں
زچشم مست ساقی وام کردم

حسن پرستی اور پارسائی کی عداوت صرف عیسائی مذہب کی خصوصیت نہیں۔ یہ عداوت ہر مذہب، ہر ادب، ہر دل میں پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جو اس زمانہ سے جب انسان میں اخلاق اور مذہب کا احساس پیدا ہوا ابھی تک جاری ہے، اور اس کا انجام ابھی تک کچھ نہیں نکلا۔ حسن پرستی نے عموماً لوگوں کو ورغلایا ہے، برباد کیا ہے، پارسائی نے اکثر اُن کی برسوں کی جفاکشی کا کوئی صلا نہیں دیا۔ دونوں فریق میں ایسے افراد ہیں جو اپنی تمناؤں کی بیکسی، اپنی آرزوؤں کی نااُمیدی کا اعتراف کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو مخالفین پر حملہ آور ہو کر عام توجہ انکی کمزوریوں کی طرف منتقل کراتے ہیں، کہ اُن کی اپنی خامیاں چھپی رہیں۔ اس جھگڑے کا فیصلہ ہر شخص صرف اپنے لئے کر سکتا ہے، اس لئے کہ اس کے سوا اور کوئی اُس کی طبیعت کو اسقدر نہیں سمجھ سکتا جتنا اس امر کے قطعی فیصلہ کے لئے ضروری ہے۔ ہمارا مقصد بھی واعظ اور رند کے درمیان صلح کرانا نہیں ہے بلکہ وہ سلسلۂ خیالات بیان کرنا جو لیونارڈو دا ونچی کی تصویر میں پوشیدہ ہے اور اس کو دیکھنے سے ہم پر ایکبارگی ایک عجیب سانشہ پیدا کر دیتا ہے۔

لیونارڈو نے براہ راست یہ نہیں ظاہر کیا ہے کہ حیاں یا جمالیات انسان کو منزل مقصود پر پہنچاتے ہیں۔ اُس کی تصویر ایک عاشقانہ یا صوفیانہ شعر نہیں ہے۔ حضرت یوحنا کو ڈایونیسس کا لباس پہنا کر اس نے ڈایونیسس یا اُس کے پجاریوں کی عزت افزائی نہیں کرنا چاہی ہے، اگر ہم اس کے مطلب کو تعلیمی شکل دینا چاہیں تو اُس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلے گا۔ دنیا عموماً سمجھتی ہے کہ زندگی

کالطف حسن اور نفس پرستی میں ملتا ہے، اور یار سا بننے کے لیے جو ایثار کرنا ہوتا ہے وہ زندگی کو بالکل بے لطف اور ویران کر دیتا ہے۔ لیو تالستائے نے ایسے لوگوں کو حقیقت سمجھانے کیلئے اپنا نظریہ پیش کیا ہے، اور اس کا دعویٰ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کا جوہر ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو ”مے مرد افگن“ کا حریف بننا چاہتا ہے، اور حسن لازوال کی دید کا آرزومند ہے، اُسے چاہئے کہ ایثار اور محبت میں حضرت عیسیٰ کا پیرو بنے، اسی طرح جیسے حضرت یوحنا تھے۔ جس قدر وہ اس راستہ پر سفر کریگا اُس کا ذوق بڑھتا رہیگا، ”ہمت رندانہ“ اپنے کرشمے دکھائیگی اور اس پر ایسی مستی چھا جائے گی جو صرف دار اور صلیب پر چڑھنے سے اتر سکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں ماہرین نفسیات نے یہ دریافت کیا ہے کہ تمام جذبات دراصل صرف جنس کی مختلف شکلیں ہیں، جن میں ظاہر ہے کہ روحانیت، مذہب بھی شامل ہیں۔ مذہبی جوش چاہے وہ زہد کی صورت اختیار کرے، چاہے قلندری کی، صرف جنسی ضبط اور [illegible] کا نتیجہ ہے، اور اس میں اور کوئی بڑا بھید نہیں۔ معمولی انسان شادی کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، اپنے پیشے اور دوسری دلچسپیوں میں اپنی قوت ضائع کرتے ہیں۔ اگر وہ بجائے اس کے زاہد یا قلندر یا مذہبی پیشوا بنیں اور جنسی جذبات کی پوری قوت محفوظ رکھیں تو وہ بھی عقیدت اور روحانیت کے وہی معجزے دکھا سکتے ہیں جنہوں نے چند شخصیتوں کو مشہور کر دیا ہے۔

سائنس کی تعلیم سے قطع نظر کرنا یا بڑا سائنس داں ہوتے اُس کے نظریوں کی تردید کرنا خطرناک ہے، لیکن اگر ہم اس نظریہ میں سے مادیت کی بو نکال دیں تو اُس کی صحت کا اقرار کرنے میں کوئی بے ادبی نہیں، اور بزرگوں کی بزرگی میں کوئی ذلت نہیں آتی۔ ضبط نفس کی ساری مصلحت یہی ہے کہ اُس سے انسان کی فطری قوت ضائع نہ ہو، اور ارادہ سے جس طرف حاجت ہو قوت منتقل کردی جائے۔ جو شخص اپنے جنسی جذبات حیوانی رغبتوں سے پاک رکھتا ہے وہ جب [illegible] نہیں ہو جاتا اسکے جذبات خودبخود یا تربیت کے بعد اپنے لئے کوئی اور راستہ نکال لیتے ہیں۔ شہوت محبت بن جاتی ہے

دیتی اور جب یہ ضبط بالکل فطری ہو جائے اور انسان اس نئی کیفیت میں نشو و نما پانے لگے تو حسن اُسے اپنا پوشیدہ راز بنا دیتا ہے عشق میں اُسے آزادی کی لذت ملتی ہے اور ہر تکلیف میں اُس کیلئے عیش کا سامان ہوتا ہے۔

یونانی تہذیب جمالیات کے اس پہلو اور ضبط نفس کی لذت سے بخوبی واقف تھی افلاطون نے جمال اور حق کو خدائی کا درجہ دیا ہے اور حسن پرستی کی جسکا ہر جگہ اور ہمیشہ چرچا رہتا ہے عین بدمذاقی بھی ثابت کی ہے۔ جمال کا احساس اور نفس پر قابو رکھنا اسکے نزدیک انسانیت کی شرط ہیں لیکن یہ کسی طرح سے نہیں کہا جا سکتا کہ یونانی دل اسقدر پاک تھے کہ وہ اس تعلیم کے تمام لوازمات پورے کر سکیں اور ایک فلسفیانہ نظریے سے یہ امید نہیں کیجا سکتی کہ وہ مذہبی عقیدے کا کام دے۔ یونانی انسانیت کا یہی ایک کرشمہ ہے کہ اسنے بغیر کسی پختہ مذہب کی مدد کے اخلاق اور تہذیب میں اسقدر بلند رتبہ حاصل کیا۔ بہرحال عیسائی رہنماؤں کیلئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اخلاق کی بنیاد صرف جمالیات کی صحیح تعلیم مقرر کریں۔ انکا تصور کمزور تھا وہ اسی منطق کے قائل تھے جس پر دنیا چلتی ہے۔ انھوں نے جسم کو بذات خود ہوس پرور پایا اور اُسے تکلیف پہونچانے کیلئے نئے نئے طریقے سوچے ضبط نفس کو ناکافی سمجھ کر روحانی نشو و نما کیلئے نفس کشی لازم کی گویا ارادہ کیا بلند پروازی کا اور شہپر کاٹ دئے۔ اسکا انجام یہ ہوا کہ ملت کے لئے اُن کی پیروی دشوار ہو گئی اور انکی آبرو اس لئے بچ رہی کہ انسان اپنے عیب کامیابی سے چھپا سکتا ہے۔

اس تنگ نظر "ہیچ مائے پر خود پیچیدہ" تہذیب میں جب یونانی انسانیت کے راز فاش ہوئے تو اودھم مچ گیا۔ عام زندگی میں کسی قسم کا توازن یا اعتدال ناممکن ہو گیا اور اسی جسم نے جو صدیوں سے ہلاک ہو رہا تھا روح پر بدلہ لیا۔ لیونارڈو دا ونچی نے یہ سمجھ لیا کہ انسانی زندگی میں ایک بہت عظیم الشان انقلاب ہونیوالا ہے اور اس نے اپنے طرز پر رہبری بھی کی۔ اُس کے تصورات نے اُسے ان تمام منزلوں کی سیر کرائی جو یونانی انسانیت طے کر چکی تھی، مگر اس نے ایک قدم آگے بھی رکھا۔ یونانی انسان کے پاس ضبط نفس کی رغبت دلانے کیلئے کوئی روحانی آرزو نہیں تھی، نہ کوئی رہنما جو اُس کی کیفیتوں سے واقف ہو۔ عیسائی تہذیب کا جوہر ایک صاحب دل کی سرگزشت تھی، ایک دل کا افسانہ جسکے سمجھنے کیلئے اُس میں کافی وسعت نہ تھی۔ لیونارڈو دا ونچی نے یہ دیکھ کر رند کے ہاتھ میں صلیب دی، مذہب میں نشہ پیدا کیا اور عشق کو پختہ کار بنا دیا۔

اگر میں واعظ ہوتا ؟

عنوان بالا سے ۴ جنوری سنہ [illegible] کے ڈیلی ٹیلیگراف میں برٹرنڈ رسل کا ایک مضمون شائع ہوا ہے
جس کا ترجمہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے ۔ برٹرنڈ رسل کے اس مضمون
میں ہندوستان کے قومی ماہرین تعلیم کے لئے غور و فکر کا کافی مواد موجود ہے جو بچوں کو
بید مار کر ڈرا دھمکا کر (اور یہ رسم ہمارے سارے ہی مدارس میں ہے) کچھ کرانا ، ان کی
آئندہ زندگی کے بعض خطرناک عیبوں کے پیدا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے ۔ اچھا ہو اگر ہماری
آزاد قومی تعلیم ایسے افراد پیدا کرنے کی کوشش کرے جو ان عیبوں سے بقدر [illegible]
کے زیادہ پاک ہوں۔

یوسف

اگر میری جان لی جا رہی ہو اور اس وقت مجھے صرف ۲ منٹ اپنی آخری الوداعی تقریر کے
لئے دئے جائیں تو میں کیا کہوں گا ؟

اس وقت ضرورت ہوگی کہ میں سادگی اور اختصار سے کام لوں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس
وقت ایک بات پر سب سے زیادہ زور دوں گا اور وہ بات ہوگی انسانی دل سے [illegible]
میرا خیال یہ نہیں کہ انسانیت اس طرح مکمل کیا جا سکتی ہے ۔ کچھ بھی کیوں نہ کیا جائے کوئی نہ کوئی خرابی ضرور
باقی رہے گی لیکن بہت سے عیب جو ہمارے نوجوانوں میں ہوتے ہیں کی وجہ وہ تعلیم کی غلطیاں ہیں
نتیجہ [illegible] ان غلطیوں میں سب سے [illegible] پیدا کرتا ہے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

انپر برا اثر اور وہ جو ڈرتے ہیں انپر۔ دونوں اہم ہیں اگرچہ آخرالذکر زیادہ اہم ہیں۔

شروع میں انہیں پیچھے جو ڈراتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بے رحم اور دوسروں کو دبانے کے خوگر ہو جائیں۔ ان میں اختلاف گوارا کرنے اور دلیل سننے کی تاب نہیں رہتی۔ ایسی کوئی محبت جو یہ باقی ہو کہ وہ اپنا رعب و داب غلط طریقہ پر استعمال کر رہے ہیں انہیں سننا گوارا نہیں۔ وہ ان لوگوں کو ترجیح دینے لگتے ہیں جو بے اصولے ہیں اور جن میں اپنی ذاتی عزت کا احساس نہیں (دراصل) وہ خود ڈر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ انہیں اسکا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں اپنے اسی رعب داب کو نہ کھو بیٹھیں جو بے انصافی پر مبنی ہے۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں انکے ماتحت واجبی طور پر اظہار خفگی نہ کریں۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں دنیا زیادہ سمجھدار نہ ہو جائے۔ ان خطروں کے باعث وہ اپنی بے رحمی کو بڑھاتے ہیں اور بیرحمی کی ہر زیادتی سے (انکے دلوں میں) بدلوں کا خوف بڑھتا ہے۔ غرضکہ اس طرح یہ ایک چکر ہے جو ظلم اور ڈر کی برائیوں کے تعلق کو اور زیادہ گہرا کر دیتا ہے۔

ڈر کا اثر ان پر جو ڈرتے ہیں اور بھی زیادہ برا پڑتا ہے۔ ڈروں کی مختلف قسمیں ہیں۔ ان میں جسمانی ڈر جسے روایتاً سب سے زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، سب سے کم نقصان دہ ہے۔ اخلاقی اور ذہنی ڈر بہت زیادہ برے ہیں۔ ہر ڈر تھوڑا یا بہت غصہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن چونکہ جس سے ڈر ہوتا ہے اس پر غصہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے اسکا اظہار ظلم کی صورت میں کمزور پر ہوتا ہے۔ جس طرح اہل قوت کے دل میں ظلم سے ڈر پیدا ہوتا ہے بالکل اسی طرح انکے غلاموں کے دلوں میں ڈر سے ظلم پیدا ہوتا ہے۔

اجتماعی ناپسندیدگی کا ڈر، موجودہ دنیا میں، کمینے پن اور ناحق بازی کے بڑے سببوں میں سے ہے۔ لوگ اس اجتماعی ناپسندیدگی کے اظہار سے اس لئے محفوظ ہوتے ہیں کہ وہ خود اس کے ڈر سے دب چکے ہیں۔ جب آدمی اپنے پڑوسیوں کی اچھی رائے حاصل کرنے کے لئے کچھ قربانی کرتا ہے تو اسے بڑا غصہ آتا ہے جب اور کوئی ویسی ہی قربانی کرنے سے انکار کرے۔ وہ ایک خوفناک اخلاقی بن جاتا ہے۔ اور یا ہمت گناہ گار کو سزا دینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ان گناہگاروں میں جو اجتماعی ناپسندیدگی کے سزا یافتہ ہیں، وہ سب شامل ہیں، جو ریاکار نہیں، وہ سب جن کے پاس نئے خیالات ہیں جو لازمی

طور پر خالص سائنٹفک نہ سہی، وہ سب جو اپنے گروہ سے زیادہ وسیع، کم سخت گیر اخلاق پر عمل کرتے ہیں، اس لئے اجتماعی ناپسندیدگی کا ڈر پیدا کرنا بڑی خطرناک بات ہے۔ اجتماعی تعاون خود اپنی خوشی اور عقل کے مطابق ہونا چاہیئے نہ کہ ہر فرد کی (جماعت کے آگے) ڈرپوک بننے سے تسلیم۔

ڈر کے برے اثرات میں سب سے زیادہ برا اثر یہ ہے کہ اس سے حماقت پیدا ہوتی ہے۔ عقل کے لئے ایک ذہنی بے خوفی ضروری ہے۔ اس کے لئے ذہنی آزادی درکار ہے اور ذہنی آزادی وہاں مشکل ہی سے ملے گی جہاں اجتماعی آزادی نہیں۔ اس لئے وہ جماعتیں جو اجتماعی ربط پر بہت زور دیتی ہیں، ضرور ہے کہ احمق انسانوں پر مشتمل ہوں۔ اس لئے وہ لازمی طور پر نہ اجتماعی ترقی کر سکیں گی نہ علمی۔ جوشیلے سے جوشیلا حقوق نسوان کا مدعی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ عورتوں نے اب تک بمقابلہ مردوں کے بہت کم ذہنی آزادی کا ثبوت دیا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ بمقابلہ مردوں کے "اخلاق خوف" کے تحت سختی سے رہی ہیں۔

میں ان سے کانپتا ہوں جن کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسانی روح اور انسانی ذہن کو زنجیروں میں رکھیں۔ میں اس (فہرست میں) پروہتوں، مدرسوں، ۹۰ فیصدی مجسٹریٹوں اور ججوں، اور ان میں سے اکثروں کو جنہوں نے سخت ظاہری اخلاقی معیاروں پر پابندی سے عمل پیرا ہو کر جماعت میں عزت حاصل کی ہے، شامل کرتا ہوں۔ یہ مختلف انسانی طبقے، الگ الگ طریقوں سے، اجتماعی ناپسندیدگی یا تعزیرات کے ذریعہ ان دعوؤں میں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں ہر صاف گو محقق مشتبہ سمجھتا ہے اور جنہیں اعداد و شمار کا ہر طالب علم اجتماعی طور پر نقصان دہ خیال کرتا ہو۔

میں جانتا ہوں کہ یہ کہا جائیگا کہ نوجوان اس وقت تک نیک نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ان غلط دعوؤں میں یقین نہ رکھیں۔ یہ عجیب انداز ہے اور یہ دو منطقی مغالطوں پر مبنی ہے پہلے یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ "عمل صالح" ایک ایسی بات ہے جس کی تائید میں کوئی عقلی دلیل نہیں دی جا سکتی دوسرے یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ خلاف عقل اور جھوٹی دلیلیں اس کے لئے کافی ہیں کہ ان کے ذریعہ

بہ تکلیف وہ اختیار کرایا جا سکے جس کی تائید میں مسلمہ طور پر کوئی عقلی وجہ نہیں۔

عقلی چلن سکھانا واقعی مشکل ہے۔ لیکن یقیناً وہ عقلی طریقہ سے سکھانا بمقابلہ خلاف عقل طریقوں کے سکھانے کے زیادہ آسان ہے۔ ایک بچے کو یہ بات فرض کرنے کا عادی بنا دیجئے کہ جو آپ اس سے کہتے ہیں اس کے لئے اچھی دلیلیں موجود ہیں۔ جہاں کہیں وہ اس امر کی تصدیق کر سکے اسے کرنے دیجئے۔ اسے اس وقت تک کچھ نہ کہئے جب تک آپ خود کسی بات کی سچائی میں یقین نہ رکھتے ہوں اس کی سائنٹفک اسپرٹ کی نشو و نما کیجئے تاکہ جب کبھی ہو سکے وہ آپ کے دعوؤں کی تصدیق کر سکے۔ اس طرح آپ ایک ایسا انسان پیدا کرینگے جو صاحب عقل ہو گا۔ یہ بات انکے لئے ناممکن ہے جن کی پرورش گناہ کے اس تخیل پر ہوتی ہے جو جبری مذہبی امتناع پر مبنی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عاقل انسان اس سارے اخلاقی آئین کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں جو کلیسا نے رائج کئے ہیں۔ تو اس آئین کی مٹی پلید ہے۔

ڈروں کی ایک اور قسم ہے جہاں خطرہ واقعی موجود ہے لیکن جسے کافی ہوشیاری سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی سیدھی سادی مثالیں جسمانی خطرے ہیں۔ مثلاً وہ خطرے جو پہاڑوں پر چڑھنے میں لاحق ہوتے ہیں۔ اور دوسرے بھی بہت سے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اجتماعی ناپسندیدگی کے ڈر کو لیجئے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ ایک آدمی گھوڑا اجڑا سکتا ہے حالانکہ دوسرا آدمی ٹٹی کیطرف بھی نظر نہیں ڈالے گا۔ اس فرق کیوجہ وہ خاص مزاجی رجحان ہے (شروع سے) دوسرے لوگوں کیطرف ہوا کرتا ہے وہ آدمی جو بھائی بندوں کے سامنے دوستانہ بے خوفی کے ساتھ آتا ہے وہ اپنے اس رویہ کی تصدیق نتائج سے کر سکے گا۔

وہ بچے جو کتوں سے ڈرتے ہیں اُن سے بھاگتے ہیں۔ اسی لئے کتا بھونکتا ہوا انکی ایڑیاں آلیتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ بچے جو کتوں سے محبت کرتے ہیں اُنکے کتے بھی انہیں چاہتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارے رویہ کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ اچھا نتیجہ مخالفت (ناپسندیدگی) کے مقابلہ میں ہمت کرنے سے نہیں نکلتا۔ وہ تو صرف خالص (سچی) دوستی اور اسی کی توقع سے پیدا

ہو سکتا ہے۔

خطروں کی ایک اور تیسری قسم ہے جس سے الگ نہیں رہا جا سکتا بلکہ جو آدمی کے نقطۂ نظر کے مطابق خوفناکی اختیار کر لیتے ہیں۔ مالی خسارہ اس کی ایک مثال ہے۔ اکثر انسانوں کی زندگی کا بیشتر حصہ غربت کے ڈر سے ڈھکا رہتا ہے۔ سخت غربت، اسی مزدور کی سی جس کے پاس کام نہیں، ایک خوفناک بلا ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ غربت ہے جس کا کھاتے پیتے تاجروں کو خوف رہتا ہے۔ اغراض اور مزاجوں کے غلط راستہ پر لیجانے سے یہ ایک بڑی بلا بن سکتی ہے۔

میں یہ کہنا ضروری نہیں سمجھتا کہ صرف ڈر کی عدم موجودگی ہی سے اچھا انسان پیدا ہو سکتا ہے بلا شبہ دوسری باتیں بھی ضروری ہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ڈر سے نجات حاصل کرنا اہم مقاصد میں سے ایک ہے۔ عقلمندی سے تعلیم دینے سے، بمقابلہ اور دوسری اچھی خصائل کے، یہ آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ڈر سے نجات ملنے سے جسمانی، اخلاقی اور ذہنی منافع حاصل ہوتے ہیں۔ مس مارگرٹ مک ملن اس بات کیطرف اشارہ کرتی ہیں کہ جن بچوں کو بار بار برا بھلا کہا جاتا ہے وہ ٹھیک طرح سے سانس نہیں لیتے۔ بمقابلہ دوسرے بچوں کے یہ بچے (adenoids) ناک کی بیماریوں کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سی مثالیں اس امر کے ثبوت میں دی جا سکتی ہیں کہ کس طرح ڈر سے تندرستی کو نقصان پہنچتا ہے۔ خصوصاً اسکا دخل ہاضمہ کے ساتھ مسلم ہے۔

ڈر سے جو اخلاقی نقصان پہونچتا ہے وہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ کچھ تو اس کی وجہ صحت کا نقص ہوتا ہے، جیسا کہ یہ اب مسلم ہے کہ اکثر خطرناک اخلاقی عیوب کا تعلق ہاضمہ کی حرکت سے ہے مثال کے طور پر لالچ کو لیجئے۔ لیکن ڈر سے جو سب سے زیادہ اہم برائی پیدا ہوتی ہے وہ دنیا کے خلاف غصہ کا انداز ہے۔ جب آدمی اپنے ہم جنسوں سے ڈرتا ہے تو مدافعت کے لئے ردعمل اس طرح کرتا ہے جس طرح وہ اسوقت کریگا جبکہ کوئی اس کی آزادئ نقل و حرکت میں دخل انداز ہو جہاں تک کہ بات کا تعلق ہے اس کے ردِعمل کی یہ حالت ہوتی ہے لیکن اس کے چھپے ہوئے غصہ کا اظہار کچھ حد تک اس کے ڈر ہی سے ہوتا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر کوئی محفوظ راستہ ڈھونڈھتا ہے۔ اسے یہ راستہ اکثر مذہبی اور

اخلاقی سزا دہندگی، جنگ و جدل کی محبت اپنے بچوں پر ظلم کرنے، یا ان تمام کے مجموعے میں ملجائے۔ یہ ساری نباشتقین، دس میں نو دفعہ، چھپے ہوئے ڈروں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

ذہنی طور پر بھی ڈر کے بڑے نقصان دہ نتائج ہیں۔ کسی غیر معمولی رائے کے ڈر سے انسان اپنے پڑوسیوں کی احمقانہ رایوں کے برخلاف نہیں سوچتا۔ پھر موت کا ڈر ہے جس کے باعث لوگ مذہبی معاملات پر سیدھا نہیں سوچتے۔ اور پھر اپنی راہ آپ ڈھونڈنے کا ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ اپنے فیصلہ کی تائید کے لئے کسی اور کی شش تلاش کرتے ہیں۔ ڈروں کی مختلف شکلیں دنیا کی آدھی حماقت کی ذمہ دار ہیں۔ ڈر کا بڑا حصہ، جس سے عورتوں اور مردوں کو عمر بھر سابقہ پڑتا ہے، انکے بچپن کے شروع کے چھ سالوں میں جاگزیں کیا جاتا ہے۔ یا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو "نیک" بنایا جائے یا وہ والدین کے ڈروں کا اثر ہوتا ہے۔ جہانتک میرا تعلق ہے میں اس نیکی کی مطلق پروا نہیں کرتا جو ڈر پر مبنی ہے۔ میں ہر جگہ یہ چاہتا ہوں اور خصوصاً بچپن کی تعلیم کے زمانہ میں، کہ ایسے انسان بنائے جائیں جو اجتماعی تعاون کی ضرورت کے مطابق اہل ہوں۔ اُن اسباب کی بنا پر جنکا ڈر سے کوئی تعلق نہیں۔ میری رائے میں اخلاقی تعلیم کا اصل مسئلہ یہ ہے۔ یہ مسئلہ ناقابل حل نہیں۔ صرف تعصبوں کے بوجھ اور بے رحم روایت کیوجہ سے مشکل ضرور ہے۔

اشتراک؟

انسان کی جماعتی زندگی پر نظر ڈالیے۔ ہر طرف دو متضاد قوتیں کارفرما دکھائی دیں گی۔ ایک قوت جوڑتی ہے دوسری توڑتی ہے۔ ایک باندھتی ہے دوسری کاٹتی ہے۔ ایک ملاتی دوسری جدا کرتی ہے۔ ایک وحدت و نظم کی طرف لیجاتی ہے دوسری کثرت و انتشار کی طرف۔ ایک محبت کی قوت ہے دوسری نفرت کی۔ ایک مثبت ہے دوسری منفی، ایک الٰہی ہے دوسری ابلیسی۔

ایک وہ ہے جس نے معنی و مفہوم سے خالی فرد کو جماعت میں لاکر بامعنی بنایا، فرد کے سینہ میں جماعتی زندگی کی لگن لگائی، آدمی کے بچہ کو اور سب جانداروں سے زیادہ اپنے والدین کا دست نگر بناکر زبان، روایات، تمدن کا سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرایا اور ماضی کو مستقبل سے مربوط کیا۔ خاندانوں سے قبیلے اور قبیلوں سے قومیں بنوائیں۔ اور جب ملکوں کی حدود بھی تنگ معلوم ہوئیں تو مختلف ملکوں کے ہم نسل باشندوں کی وحدت پیدا کی، پھر اس تفریق کو بھی ہٹایا اور عقائد کے اشتراک سے ملک و نسل کے امتیازات کو مٹایا۔ اور عقائد کے اختلافات کے باوجود ایک خالق اور ایک رب کو سب سے منوا کر بندوں کے انتشار کو آقا کی وحدت میں گم کر دیا اور انسانی برادری کا تصور قائم کیا۔

دوسری وہ ہے جس نے ایک ہی آقا کے چاکروں سے باہم ایک دوسرے کی گردنیں کٹوائیں، جس نے قرون وسطیٰ کی ایک عیسائی دنیا کو درجنوں وطن پرست قوموں میں بانٹا، جو آج ایک عالم اسلامی کو ترک و عرب، افغان اور ایرانی میں تقسیم کر رہی ہے۔ جس نے خود ان قوموں سے ہر ایک میں دو دو قومیں بنادیں، ایک امیر ایک غریب، ایک حاکم دوسری محکوم۔ ایک فاعل دوسری منفعل۔ جس نے خاندانی زندگی کے سکون اور وحدت کو عورت، مرد کے حقوق کے چکر میں ڈال کر فنا کیا۔ جس نے جماعت کو افراد میں تحلیل کر دیا، اور ایک قادر اور کافی بالذات فرد کا تصور پیدا کر کے جماعتی تعمیر کی تمام بنیادوں کو — ان کا نام مذہب ہو یا معیشت، فنون لطیفہ یا اخلاق — کھوکھلا کر دیا۔

سماجی زندگی کے مطالعہ کرنیوالے کے لئے بڑی دشواری یہ ہے کہ صرف دوسری قوت ہی نہیں بلکہ پہلی بھی اپنے کو اکثر چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے کہ کل انسانیت بہ حیثیت ایک جسم کے بہت کم عمل پیرا ہوسکتی ہے۔ البتہ پہلی قوت کی بنائی ہوئی اور دوسری قوت کی مظہر جماعتوں میں روح و ذہنیت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ پہلی اگر ٹولیاں بناتی ہے تو اس لئے کہ اتحاد ہو سکے، دوسری اتحاد بھی کراتی ہے تو اس لئے کہ اختلاف شدید ہنجائے۔ ایک کی ویرانیاں آبادی کی خاطر اور دوسرے کی آبادیاں بھی ویرانی کے لئے ہوتی ہیں۔

ان قوتوں کے اثر سے جو جماعتیں بنتی ہیں وہ اپنے لئے یا اپنی قدر مشترک کے لئے کوئی نہ کوئی نام تجویز کرتی ہیں۔ یہ نام رواج پکڑتے ہیں اور بہتیرے انہیں بے سمجھے استعمال کرتے اور انکو طلسموں پر لکھ کر اپنی پیشانیوں پر لگا لیتے ہیں۔ بہت کم ہوتے ہیں جو ان ناموں کی تہ میں جو قوت کارفرما ہے اُسے تلاش کریں اور سمجھنے کی تکلیف اُٹھائیں۔ نادانی سے اچھے اور نادانی سے بُرے بنجانیوالوں کی تعداد دنیا میں بہت ہے۔ بے سمجھی سے ان ناموں کو استعمال کرنیوالے، اُن کے لئے جینے اور اُن کے لئے مرنیوالے، ان ناموں میں متضاد معانی کو اسطرح یکجا کر دیتے ہیں کہ اگر کوئی طالب علم ان کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش بھی کرے تو بڑی دشواری ہوتی ہے۔ انسانوں کے سینے خیر و شر دونوں کے جولانگاہ ہیں۔ ان کے اعمال و افکار بُرے ناموں میں اچھے معانی اور اچھے ناموں میں بُرے معانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اُسی نام کو اچھے بھی لیتے ہیں بُرے بھی۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ابھی اس نام کی چھٹی اپنے ماتھے پر نہیں چپکائی ہے حیرت سے منہ تکتے ہیں کہ یہ ہے کیا؟

"سوشلزم" اسی قسم کا ایک نام ہے۔

یہ نام یوں تو نیا ہے۔ شاید سب سے پہلے اٹلی کے ایک مصنف گیوئیانی نے اسے ۱۸۰۳ء میں استعمال کیا تھا۔ لیکن اس سے مفہوم تھا پروٹسٹنٹ مذہب کے مقابلہ میں کیتھولک مذہب۔ پھر شاید سین سیموں کے ایک معتقد ترانسیئر نے ۱۸۳۲ء میں اسے استعمال کیا۔ لیکن نام نیا ہو اسکا اطلاق تو پُرانی چیزوں، پرانی شخصیتوں اور تحریکوں پر بھی ہوتا ہے۔ کوئی "سوشلزم" کی اس نیم سرکاری تاریخ

کو اٹھا کر دیکھیے جو کاؤٹسکی اور برن شٹائن نے شائع کی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ آخر اس نام میں کیا کیا شامل ہے؟ اگر اس میں سماجی زندگی کے ابتدائی اشتراک املاک کا ذکر ہے تو افلاطون کی ریاست کا بھی۔ اسپارٹا کے دستور اساسی پر بھی نظر کی گئی ہے تو قدیم مسیحی جماعتوں کے 'اشتراک' پر بھی۔ رہبانوں کے اشتراک کا بھی ذکر ہے اور پیراگوئے میں جیسوئیٹوں کی ریاست کا بھی۔ عہد جدید سوشلزم کی داستان بھی ہے جو انیسویں صدی میں اس نام سے دنیا میں ہوا۔ ان مختلف النوع مظاہر کو اس نام میں کیسے جمع کر دیا گیا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ محبت کا پیام لانے والا مسیح اور نفرت کا دین پھیلانے والا کارل مارکس دونوں 'اشتراکی'، 'سوشلسٹ' ہوں؟ افلاطون اور سنڈیکارسٹ دونوں پر ایک ہی نام کا اطلاق کیسے ہو گیا؟

سوشلزم کے مطالعہ کرنے والے کو سب سے پہلے یہی دشواری پیش آتی ہے۔ اس نام میں اسے خیر بھی ملتی ہے، شر بھی، نور بھی، تاریکی بھی، محبت بھی، نفرت بھی۔ اور متضاد طبائع کے انسان انہیں متضاد عناصر کی موجودگی کے دھوکہ میں اس نام کی چپی اپنے ماتھے پر لگا لیتے ہیں کوئی یہ چپی لگا کر اپنے کو مسیح اور افلاطون کے ساتھیوں میں سمجھتا ہے کوئی مارکس اور لینن کے ہمرکابوں میں۔

اس دشواری کو سوشلزم کے مستند مورخوں نے محسوس کیا ہے اور بڑے بڑے علماء نے اس کی ایک تعریف بتانے سے اپنے کو قاصر بتلایا ہے مثلاً مشہور جرمن مصنف اشٹاملر اس سے معذوری ظاہر کرتا ہے کہ ان متعدد اور مختلف مظاہر ذہنی و جماعتی کے لئے جنہوں نے اپنے لئے اس نام کا استعمال کیا ہے کسی ایک تصور کا تعین کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر مختلف سوشلسٹ نظریوں اور نظاموں کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے تو اشٹاملر کا یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم ان مادی نتائج اور تاریخی مقاصد کو پیش نظر رکھیں جو سوشلزم اور اس کی متعدد اقسام کی امتیازی خصوصیت ہیں تو شاید ہم کوئی تصور قائم کر سکیں۔

دنیا میں لوگوں نے جب سے سیاسیات پر لکھنا شروع کیا ہے اسی وقت سے یہ خیال پیش پیش

ہے کہ انسانوں کی سماجی زندگی کے لئے سب سے اچھی اور سب سے مفید شکل کیا ہے۔ انہیں سے اکثر کا یہ خیال رہا ہے کہ ہر معقول سماجی نظام کے لئے کسی نہ کسی قسم کی طاقت بالادست لازمی ہے۔ بلا کسی قسم کے آئینی جبر کے ان لوگوں کے نزدیک سماج کا منظم ہو سکنا ممکن ہی نہیں۔ اس کے مقابلہ میں ایک مذہب اور ہے جس کے نزدیک سماجی زندگی کی بہترین صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کسی قسم کا جبر آئینی نہ ہو نہ کوئی طاقت بالادست۔ آدمی بس اپنی مرضی سے باہم ملیں اور جب چاہیں سماج کے باہر ہو جائیں۔ اس مذہب کو نراج کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح سماجی زندگی کی دو ممکن بنیادی شکلیں ہوئیں: ایک وہ جس میں جبر ہو، ایک وہ جس میں کسی قسم کا جبر نہ ہو۔

سماج کے جن نظاموں میں جبر کی جگہ ہے اُن کی بھی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں لیکن ہم نے چونکہ مادی نتائج اور خارجی مقاصد کو پیش نظر رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اس لئے ان قسموں پر بھی اس نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے۔ مادی اشیاء کی فراہمی اور تقسیم کے لحاظ سے یعنی معاشی زندگی کے اعتبار سے ان جبری نظامہائے جماعت میں تفریق و تقسیم کی سب سے اہم وجہ مسئلہ املاک ہے۔ مختلف نظاموں نے بھی مختلف حل پیش کئے ہیں لیکن اصولاً دو تقسیمیں ہو سکتی ہیں: ایک تو وہ جبری نظام جنہیں املاک شخصی و انفرادی ہو، دوسرے وہ جنہیں املاک اجتماعی اور سماجی ہو۔

آج دنیا کے بڑے حصہ میں سماج کا جو نظام مقبول ہے وہ وہ ہے جس میں جبر آئینی کو تسلیم کیا جاتا ہے اور شخصی و انفرادی املاک کو سماج کی معاشی زندگی کی بہترین اساس مانا جاتا ہے۔ جبری نظام کی دوسری قسم یعنی وہ جسمیں ملکیت شخصی نہیں بلکہ اجتماعی ہو یا تو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں پائی جاتی ہے یا اب روسی انقلاب کے بعد سے بڑے پیمانہ پر روس میں اس کا تجربہ کیا گیا ہے۔ لیکن روس کے تجربہ ہی کو اجتماعی نظام کی ایک ممکن شکل سمجھنا غلطی ہوگی۔ اصولاً و تاریخاً ایسے نظاموں کی جنہیں معاشی زندگی کی بنیاد مشترک جماعتی ملکیت ہے تین قسمیں کیجا سکتی ہیں۔ جن لوگوں نے وقتاً فوقتاً رائج الوقت انفرادی شخصی ملکیت کے نظام کے خلاف آواز اٹھائی ہے انہوں نے مندرجہ ذیل تین شکلوں میں سے ہی ایک شکل کو اسکی قائم مقامی کے لئے پیش کیا ہے۔ وہ

تین قسمیں ان ناموں سے معروف ہیں: (۱) سوشلزم (۲) کمیونزم (۳) زرعی سوشلزم۔ ذیل کی سطور میں ہم انکی مختصر سی تعریف کریں گے۔[1]

(۱) سوشلزم تو وہ مذہب ہے جس کے نزدیک پیدائش دولت وثروت کے ذرائع و وسائل پر کسی شخص کی انفرادی ملکیت کا حق تسلیم نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ ایک تو یہ پسندیدہ نہیں اور دوسرے سماجی زندگی جس طرز اور رفتار سے ارتقاء کے منازل طے کررہی ہے اُس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہے کہ ان وسائل دولت آفرینی پر سے شخصی املاک کا حق مٹ جائے۔ ہر شخص جانتا ہوگا کہ وسائل و ذرائع دولت آفرینی سے مراد وہ مادی چیزیں ہیں جنسے انسانی ضروریات کو پورا کرنے کی دوسری مادی چیزیں تیار کرنےمیں مدد ملے۔ اسمیں تمام زمین آجاتی ہے، تمام صنعتی اوزار اور کلیں آجاتی ہیں، کارخانے، مشینیں، اجناس خام، اجناس نیم خام سب اس کے تحت میں آتے ہیں۔ ہمارے رائج الوقت نظام معاشی میں ان چیزوں پر افراد کا تصرف ہے۔ سوشلزم چاہتا ہے کہ یہ تصرف افراد سے لیکر جماعت کے سپرد کردیا جائے۔ جماعت میں کوئی فرد ایسا نہ ہونا چاہئے جو کہہ سکے کہ یہ کھیت میرا، وہ کارخانہ میرا۔ ان تمام وسائل دولت آفرینی پر ملکیت کا حق ہیئت اجتماعی کو منتقل ہوجانا چاہیے اس کا نام ریاست ہو یا اور کچھ۔ لیکن سوشلزم انفرادی و شخصی ملکیت کو صرف وسائل دولت آفرینی پر سے ہٹانا چاہتا ہے۔ شخصی صرف کی چیزوں پر سے نہیں۔ سوشلزم کے متعلق یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اس میں کسی قسم کی شخصی آمدنی کو روا نہ رکھا جائے گا۔ ہاں سوشلزم یہ نہیں گوارا کرتا کہ صرف بعض مادی اشیاء پر حق ملکیت رکھنے کی وجہ سے کسی فرد کو کوئی آمدنی حاصل ہو۔ لیکن وہ کام کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے اور اُسے اپنی مرضی کے مطابق اپنی ضروریات رفع کرنے کے لئے صرف کرنے کا مخالف نہیں۔

(۲) کمیونزم سوشلزم سے ایک قدم آگے جاتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ شخصی ملکیت

---

[1] ان تصورات کو جداجدا پیش کرنے اور واضح کرنے کی خدمت علم المعیشت کے لئے جرمنی کے مشہور استاذ کارل ڈیل نے انجام دی ہے۔

صرف وسائل دولت آفرینی ہی پر سے نہ ہٹ جائے بلکہ اشیاء استعمال و صرف پر بھی کسی کو شخصی و انفرادی ملک حاصل نہ ہو۔ سوشلزم کی رو سے تو ایک فرد اپنے کام کے معاوضہ میں جو آمدنی حاصل کرے اس پر خود تصرف رکھتا ہے اور اُسے اپنی حاجتیں رفع کرنے میں جسطرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ دن میں آٹھ گھنٹے کام کرنے کے معاوضہ میں اُسے جو مزدوری ملی ہے اُس سے وہ چاہے تو معمولی کھانا کھا کر اچھے اچھے کپڑے پہن سکتا ہے، یا زردہ پلاؤ کھا کر پھٹے پرانے کپڑوں پر اکتفا کر سکتا ہے۔ جو کچھ بچے اُس سے چاہے تو کتابیں خریدے، چاہے سگریٹ، اُس کا جی چاہے تو ٹکٹ خرید کر کسی بڑے عالم کا لکچر سنے چاہے ٹکٹ خرید کر بڑے سے بڑے سینما اور تھیٹر میں جا بیٹھے۔ غرض اپنی محنت کے معاوضہ کو جن چیزوں سے چاہے بدل لے۔ لیکن کمیونزم اس کو روا نہیں رکھتا۔ اس کے یہاں صرف کارخانے اور زمین مشینیں اور اوزار ہی شخصی تصرف سے نکال کر جماعت کے سپرد نہیں کئے جاتے بلکہ جماعت ہی کو یہ طے کرنے کا حق بھی ہے کہ افراد کو کھانے کے لئے کیا اور کتنا، پہننے کو کیا ملے، تفریح کے کیا سامان ہوں وغیرہ وغیرہ۔ یعنی سوشلزم اگر ذرائع کار پر سے شخصی ملکیت کو ہٹاتا ہے تو کمیونزم اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ "نتائج کار" پر سے بھی اسکو ہٹانا چاہتا ہے۔

(۳) زرعی اشتراک۔ جہاں کمیونزم شخصی ملکیت کو مٹانے کے بارے میں سوشلزم سے ایک قدم آگے جاتا ہے وہاں زرعی اشتراک سوشلزم سے ایک قدم پیچھے رہنا چاہتا ہے۔ سوشلزم اگر تمام ذرائع دولت آفرینی کو جماعت کے ہاتھ میں دینا اور افراد سے چھین لینے کا طالب ہے تو زرعی اشتراک تمام ذرائع دولت آفرینی میں سے صرف ایک کو یعنی زمین کو اس غرض کے لئے علیحدہ کر لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمین پر کسی فرد کو شخصی ملکیت کا حق تسلیم نہ کیا جائے۔ باقی دوسرے ذرائع دولت آفرینی خوشی سے شخصی ملکیت میں آ سکتے ہیں۔

خارجی نتائج اور مادی مقاصد کے اعتبار سے تو ہم نے ہیئت اجتماعی نعمیر نو کے متذکرہ بالا تین نظریوں کو پیش کر دیا۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں انہیں سے ہر ایک کے عالم وجود میں آنے اور فروغ پانے کے وجوہ ایک سے نہیں ہیں۔ یہ نہیں کہ اگر ہم نے سوشلزم کی ایک تعریف کر دی

بلا اس کے خاص قسم کی مذہبی زندگی ناممکن ہے۔ اسکے حامیوں کا خیال ہے کہ مذہبی زندگی کے کامل نشو و نما کے لئے ایسا نظام جماعتی ہی کام دے سکتا ہے جسمیں شخصی املاک نہ ہو۔ خصوصاً عیسائی مذہب میں اس قسم کے بہت سے عناصر ہیں جو اشتراکی زندگی کی طرف لیجاتے ہیں۔ تاریخ میں متعدد مثالیں ایسے عیسائی فرقوں کی موجود ہیں جنہوں نے چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر اشتراکی زندگی کا نظام قائم کیا۔ آج بھی امریکہ میں متعدد نوآبادیاں بعض عیسائی فرقوں کی موجود ہیں جنہیں اشتراک املاک پر عمل ہوتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اشتراکی تجربوں میں اگر کامیابی ہوئی ہے تو انہیں مذہبی جماعتوں کو۔

اخلاقی اشتراک وہ ہے جو کسی نہ کسی اخلاقی قدر کو دنیا میں مکمل اور رائج کرنے کے لئے اشتراک املاک کا نظام پیش کرے۔ یہ اخلاقی قدریں بہت مختلف ہوسکتی ہیں اور اس اعتبار سے اخلاقی اشتراک کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اصولاً یہ انہیں دو قسموں میں رکھہ سکتے ہیں۔ ایک وہ جسمیں جماعتی اصول پیش نظر ہو ایک وہ جسمیں انفرادی اصول کو سامنے رکھا جائے۔

جماعتی اصول سے مراد یہ ہے کہ نظام جماعت کی ترتیب میں فرد کو کل میں جزو کی۔ جسم میں عضو کی حیثیت دیجائے۔ مقصود کل کی فلاح ہو اور جسم کی صحت نہ کہ کسی فرد کی بہبودی یا کسی عضو کی ترقی۔ یہاں افراد کو بہت سے 'حقوق' دیکر خوش کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ افراد سے بالاتر 'جماعت' یا 'ریاست' کے نشو و نما اور ارتقا کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت فلاطون نے اپنی مشہور کتاب 'ریاست' لکھی ہے۔ یہی اصول اسکی دوسری تصنیف 'قوانین' میں اسکے سامنے ہے۔ ان تصانیف نیز دیگر یونانی فلسفہ کی تعلیمات کے اثر سے 'ریاست' یا 'جماعت' کو کائنات مفصل اور افراد کو کائنات مجمل سمجھا جانے لگا۔ افراد کی طرح 'ریاست' کی بھی ایک شخصیت تسلیم کیگئی اور افراد کو اس شخصیت کا خادم مانا گیا۔ اس نظریہ میں انسان کے حقوق کی جگہ اس کے فرائض سے پر ہوتی ہے اور یہ فرائض تمامتر جماعت کی خدمت گزاری سے عبارت ہوتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو فرد کو اس خدمتگزاری سے روکے اس نظریہ کی رو سے عیب ہے اس لئے یہ ایسی چیزوں کو مٹانا چاہتا ہے۔ شخصی ملکیت چونکہ اس خدمت گزاری کی راہ میں سب سے بڑا پتھر ہے اس لئے اسکا مٹانا بھی ضروری ہے۔

اسی نظریہ کے ماتحت لوگوں نے اشتراک ازدواج وغیرہ کی تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔ متاخرین میں اس مذہب کا مشہور سیاسی مدبر جرمن اشتراکی راڈبرٹس ہے۔

اس کے بالکل مخالف انفرادی اصول ہے۔ اسکی بنیاد افراد کے حقوق پر ہے۔ جماعت یہاں افراد کی بنائی ہوئی اور ان کے فائدہ کے لئے ہے۔ ان سے افضل اور اعلیٰ نہیں۔ یوں تو یہ اصول بھی شاید اتنا ہی پرانا ہو جتنا خود انسان لیکن اسکو ترقی ہوئی جدید آئین فطری کے نظریے جسکی بنیادیں سب سے پہلے گروشیس نے ۱۶۲۵ء میں استوار کیں۔ اسی نے انسان کے ازلی اور فطری حقوق کی صدا اٹھائی۔ روسو نے اس آئین فطری اور حقوق ازلی کے نظریہ کو اور آگے بڑھایا۔ اور جماعت کو افراد کے معاہدہ پر مبنی بتلایا۔ روسو نے انسانی حریت اور مساوات کے اس نظریہ سے مساوات سیاسی کے مطالبہ کو تقویت دی۔ اور بعد کو انفرادی اصول والے اشتراکیوں نے اسی کی بنا پر مساوات املاک کا مطالبہ پیش کیا۔ اس مذہب کے اشتراکی شخصی املاک کو اس لئے مٹانا چاہتے ہیں کہ ہر فرد کو املاک پر اپنا اپنا مساوی حق حاصل ہو جائے۔ اور تقسیم دولت کی موجودہ عدم مساوات مٹ جائے۔

اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر اشتراکی نظام کے مؤیدین کے مقابلہ میں ایک ارتقائی مذہب ہے۔ جو کسی قدر جماعتی کا دلدادہ نہیں۔ کسی اصول کا شیدائی نہیں۔ یہ محض ایک گروہ ہے جو دنیا کی رفتار اور جماعت کے ارتقاء کو سمجھنے کا مدعی ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ وہ [illegible] وں کے سراب سے نکل کر "حکمت اور علم" کی محکم چٹان پر پہونچ گیا ہے۔ یہ صرف یہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ جماعتی نشو و ارتقا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نظام اشتراکی قائم ہو جائے۔

اس مذہب میں بھی دو فرقے ہیں ایک ڈاروِنی فرقہ اور دوسرا مارکس و اینگلس والا۔ ڈاروِنی فرقہ تو جماعت انسانی پر ماحول فطری کے تمام قوانین کو عائد کرتا ہے وہ مدعی ہے کہ تمدن انسانی بھی اپنے ارتقا میں تطبیق، توارث، اور تنازع للبقا کے انہی قوانین کا اسی طرح پابند ہے جیسی کہ غیر انسانی دنیا۔ سرمایہ داری کا نظام دراصل اسی کشمکش حیات میں [illegible] جو

ترقی انسانی کے لئے ضروری ہے۔ یہ صرف تجارتی مقابلہ کا موقع دیکر بجائے ترقی کے جماعتی تنزل
پیدا کر رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پیدائش دولت میں مقابلہ کے مواقع پیدا کئے جائیں اور
یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہر کام کرنیوالے کے پاس پیدائش دولت کے ذرائع بھی موجود ہوں۔
اس کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع دولت آفرینی چند اشخاص کی ملک نہ ہوں بلکہ جماعت کے
تصرف میں ہوں جو سب افراد کو ان کے استعمال کا موقع دیسکے۔ اس مذہب کا ممتاز معلم
دولتمان ہے۔

دوسرا ارتقائی فرقہ مارکس اور اینگلس کا ہے۔ یہ لوگ ڈارون کے حیاتیاتی نظریہ ارتقا کو تو
جماعتی زندگی پر نہیں لگاتے، لیکن انہوں نے تمدن انسانی کے نشوو ارتقا کے بعض قوانین خود
بنائے ہیں۔ جو ان کے مادیاتی نظریہ تاریخ کی شکل میں علمی دنیا کے سامنے ہیں۔ علمی دنیا میں
سب سے زیادہ فروغ اسی آخری فرقہ کو ہوا ہے۔ اُس کے اشتراکی اسی فرقہ کے لوگ ہیں۔
یورپ کے ہر ملک میں مارکس کی ملت موجود ہے اور بڑھ رہی ہے۔ خود ہندوستان میں مارکس 'رشی'
کے نام لیوا پیدا ہونے لگے ہیں۔ اس مذہب کے پیدا ہونے کے اسباب، اس کی نشوو نما، اس
کے فلسفہ کے پیچ، اس کی حکمت کے فریب، انکی تاثیر کا راز یہ سب ایسے مباحث ہیں جنپر اسوقت
بحث ونظر ہمارے ملک کے لئے بہت ضروری ہے لیکن یہ تفصیل کے طالب ہیں اسلئے ہم اس مضمون
میں اس فرقہ پر زیادہ نہیں لکھتے۔ انشاء اللہ آیندہ مفصل بحث کرینگے۔

ذیل میں قارئین کرام کی سہولت کے لئے اس مضمون کے مطالب کا خلاصہ ایک نقشہ
کی شکل میں پیش کر دینا غالباً مفید ہوگا:۔

- نظامہائے جماعت
  - مع جبر آئینی
    - انفرادیت
    - اجتماعیت
      - سوشلزم
      - کمیونزم
      - زرعی اشتراک
  - بلا جبر آئینی
    - نراج

سوشلزم
تصوری سوشلزم
ارتقائی سوشلزم
مذہبی سوشلزم
اخلاقی سوشلزم
ڈارونی سوشلزم
مارکس اور اینگلز کا سوشلزم
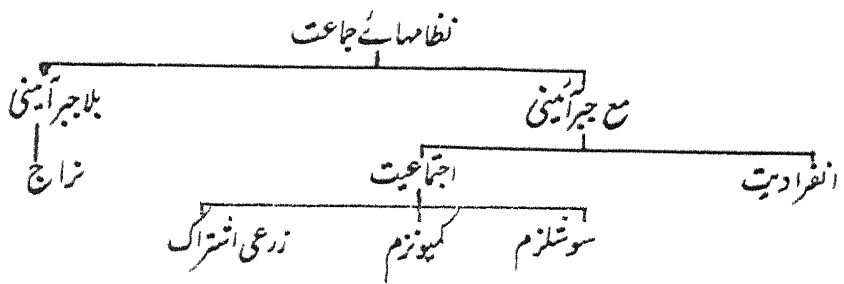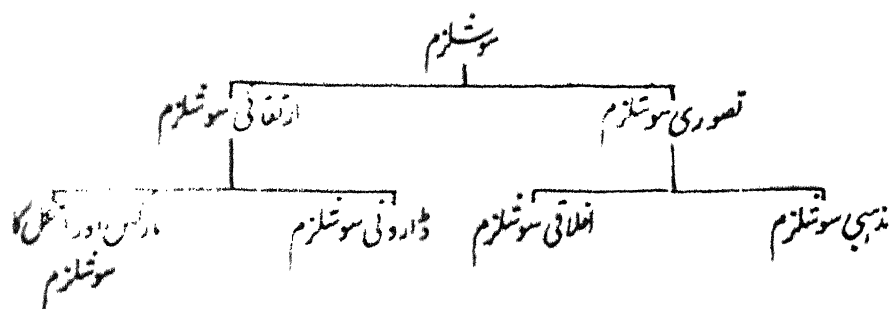
عراق عرب

مسٹر جے 'ایم' بالفور نے جو دولت ایران کے نائب مشیر مالیات رہ چکے ہیں اپنے قیام ایران کے زمانے کے مشاہدات، تجربات اور دیگر معلومات پر ایک کتاب ("تازہ شیون ایران") لکھی ہے۔ مسٹر موصوف کا زمانۂ ملازمت جنگ عظیم کے اواخر سے شروع ہوتا ہے۔ کتاب ۱۹۲۱ء کے اختتام کے ساتھ ختم ہوتی ہے اسلئے کہ اُس کا دیباچہ مسٹر بالفور کے قلم سے فروری ۱۹۲۲ء میں نکلا ہے۔ مسٹر بالفور، لارڈ بالفور کا ہمقوم ہے لیکن غالباً آخر الذکر بالفور کے نقطۂ نظر سے اول الذکر بالفور اپنے ملک و ملت کا ایک ناخلف فرزند ہوگا جسکی "اولین جنبش قلم" سے ایسی کتاب نکلی۔ بیچارے مسٹر بالفور کو خود بھی اپنے اس "ننگ قومی" کا احساس و اعتراف ہے، چنانچہ دیباچہ کے صفحات میں اس کا علانیہ اظہار ہے۔ لکھتا ہے:

ملک کے اندر اس عقیدۂ سیاسی کا ایک "مکتب" موجود ہے جس کا یہ خیال ہے کہ ارکان حکومت و اکابر سیاست کی غلطیوں کا اعلان کرنا ارتداد و الحاد سے کچھ ہی کم ہے۔ بڑے لوگوں کی غلطیاں اگرچہ "محفل خاص" کے اندر افسانۂ بزم و انجمن ہوا کرتی ہیں لیکن عوام الناس کے سامنے ان کو بے نقاب کرنا سخت مخدوش بات ہے۔ وہ واقفکار لوگوں کے درمیان ایک رازِ سربستہ کا احترام رکھتی ہیں اور ان پر ناگ تنقید مفاد عامہ کے خلاف ہے اور مصالح سلطنت کے منافی۔ لیکن میں اس "دستور زبان بندی" کا قائل نہیں ہوں۔ علاوہ ازیں میرا خیال یہ ہے کہ غلط کار لوگوں سے تعرض نہ کرنا ان کی ہمت افزائی کرنا ہے اور مزید مفاسد کی دعوت دینا۔ نہایت ضروری ہے کہ کلمۂ حق بلند کیا جائے تاکہ جو لوگ حکومت کی مسندوں پر قابض ہیں وہ ایک فریب خوردہ پبلک کی غلط پشت پناہی سے محروم ہوجائیں اور ملک کو ان

کی تاریخ سیاسیات اور بالخصوص مسائل مالیات کے تمام ضروری عنوانات سے بحث کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس صحبت میں اس کے آخری باب کے مطالب کا ایک حصہ ناظرین کے سامنے پیش کریں جسمیں مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک خصوصاً عراق عرب کے مطلع سیاسی کا "نظارۂ طائرہ" آگیا ہے۔

ہم نے بجائے لفظی "ترجمہ" کے مصنف کے مفہوم کی "ترجمانی" کا اصول پیش نظر رکھا ہے۔

عراق میں قدم رکھتے ہی میرا پہلا احساس یہ تحیر تھا (اور جیسا کہ واقعہ ہے کہ یہ احساس ہر ناظر کے ساتھ مشترک رہا ہے) کہ کسی سلطنت کو عراق جیسے ملک میں قدم رنجہ فرمانیکی روئے زمین پر کونسی چیز دعوت دیسکتی ہے! دوسری بات جس نے میرے تخیل کو مس کیا اُس نظر باز سپاہی کا قول تھا جس نے عراق کے منظر وحشت و ہلاکت کا مشاہدہ کرکے کہدیا تھا کہ "انگریزوں کو اُن کے اس مقبوضہ سے نکال باہر کرنیکے لئے کسی جوابی حملہ آور کی شمشیر آتشیں کی ضرورت نہ ہوگی!" عجیب تر یہ ہے کہ برطانیہ اس فضول کاری اور تباہ کاری پر بُری طرح مُصر ہے اور اس حماقت آمیز اور ناعاقبت اندیشانہ فعل کو شرف مُداومت عطا کرنے پر تُلی ہوئی ہے!

اوائل جنگ عظیم میں جن مقاصد نے عراق عرب کی پہلی فوجی مہم کو ضروری بنایا تھا اُن کی معقولیت کو بآسانی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایرانی چشمہائے روغنِ گل کی حفاظت اشد ضروری تھی، نیز خلیج فارس کی بحری کمینگاہ سے جرمنوں اور ترکوں کو محروم کردینا بھی ایک اہم جنگی پیش بینی پر مبنی تھا۔ مگر بصرہ اور اُس کے حوالی کے قبضہ نے ان ہر دو معلوم و مشہور مصالح کی کافی ضمانت کردی تھی۔ لیکن اس کے بعد "بڑھاؤ تام جہام" کے اصول پر بغداد کی تسخیر اور سارے ملک کی فتح اور تصرف کی جو غایت اور مصلحت تھی وہ ایک راز سربستہ ہے! کہا گیا تھا کہ بصرہ کے قبضہ نے دشمن کو چھیڑ دیا تھا اور اُسکی جوابی یورشوں کے سد باب کے لئے ضروری تھا کہ ہم ساحل سے ذرا آگے بڑھکر کسی ایسے عسکری مرکز پر گرفت حاصل کرلیں جہاں سے غنیم کے خطرات سے مامون ہوجائیں لیکن دنیا جانتی ہے اور برطانوی افواج کے ذاتی تلخ تجارب ہیں کہ ہم نے اس "علاج بالمثل" سے اپنے مصائب و افکار کو المضاعف کرلیا! اس راز کا اصلی حل میری تشخیص میں یہ ہے کہ ہمارے بعض نو آمیز اور شوقین اہل حرب اس بات کے بہت مشتاق تھے کہ اصل مرکز جنگ سے ہٹکر غیر اہم اطراف میں اپنے ہتھیاروں کی کچھ نظر فریب نمائش کردیں تاکہ قلب رزمگاہ میں ہمارے

سینہ پر جو ضربیں پڑی ہیں اُن کی قدرے اشک شوئی ہو جائے۔ پس بغداد کی فتح محض ایک "التفات توجہ" والی حرکت سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے دفتر جنگ کے "ناآشنائے جغرافیہ و تاریخ" ارکان کی اُن حسین خوابوں کے اندر عراقی مہم کا خاکہ کھینچا گیا ہو جنہیں بغداد کا [illegible] الف لیلہ کے افسانوں کو سنکر چشم تصور کے سامنے آیا ہو اور لندن کے رہنے والے "ہارون الرشید اعظم" کی عروس البلاد (بغداد) کا فاتحانہ نظارہ کرنا چاہتے ہوں اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر گئے ہوں کہ بغداد اور "بہشت شداد" کی بہاروں کو دست برد زمانہ کی خزانی ہواؤں نے ایک "عالم ہو" میں تبدیل کر دیا ہے!

سامراجی مقاصد کو اس معاملے سے کوئی تعلق نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس سلسلہ میں جو بندوبستی تحفظات تھے وہ بصرہ کے قبضے سے حاصل ہو گئے تھے۔ اس نواح میں زیادہ پاؤں پھیلانے کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ اس سے ہمارے لئے ایک آئندہ "فصل مشکلات" کی تخم ریزی ہو جائے۔ عراق عرب پر ہمارا دخل ترکی اور عرب باشندوں دونوں کے لئے ایک وجہ اشتعال تھا۔ اس میں ایک مذہبی [illegible] کا پہلو نکلتا تھا اور یہ چیز وسطی اور مغربی ایشیا کے ممالک میں جہاں مذہبی حسیات و جذبات بہت [illegible] ہیں ایک مخدوش مادہ آتش گیر ہو سکتی تھی۔

اس سمت میں برطانوی مصالح کبھی رونما نہیں ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عراق [illegible] کی سیاسی تفریح بازیوں کے لئے ایک دلچسپ بساط ہے۔ کم از کم وزیر ممدوح کی جدت طبع اور قدرت تخیل کا ثبوت یہ اسکیم ضرور ہے۔ لیکن جہاں اُس کی اس قابل داد خوبی سے انکار نہیں وہاں کچھ غیر مشتبہ علامات اس حقیقت مخفی کے بھی پائی جاتی ہیں کہ ان خوابوں کی "نقشہ بندی" میں مسٹر [illegible] کے دل و دماغ کو بھی کافی دخل رہا ہے۔

ہم کو یہ تاریخی حقیقت بتائی گئی ہے کہ دجلہ و فرات کا دوآبہ کسی وقت میں دنیا کا [illegible] تھا اور یہ کہ وہ بہت آسانی سے اپنی پہلی عالمگیر اقتصادی حیثیت دوبارہ [illegible] کے تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں لیکن [illegible] حل و عقد کی [illegible]

سکتا ہے لیکن یاد رہے کہ ساتھ ہی وہ ایک "کان زر" کا مطالبہ بھی کریگا! معلوم ہونا چاہئے کہ اقوام عالم میں برطانیہ ہی تنہا وہ ملک نہیں ہے جو عراق عرب کے زرعی امکانات کا "عرفان" رکھنے کا مدعی ہو۔ شاید لوگوں کو یہ سنکر کسی قدر غیر مطبوع قسم کا استعجاب لاحق ہو کہ ترک بھی اس مسئلہ میں پوری بیداری کا ثبوت دیکھے ہیں! چنانچہ قبل ازیں ترکی حکومت نے ایک ممتاز ماہر انجنیر کا تقرر اسی غرض سے کیا تھا کہ وہ عراق کے "احیاء ثانیہ" کے بارہ میں اپنی آراء و سفارشات پیش کرے۔ چنانچہ جو رپورٹ گذری وہ یہی تھی کہ یہ مہم بالکل معقول اور ممکن العمل ہے، بشرطیکہ اس کام کے لئے وہ ذخیرہ پہلے سے فراہم کر لیا جائے جو ناگزیر ہوگا۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو جو تخمینہ تیار کیا گیا تھا وہ قریب قریب چالیس ملین تھا اور اگر ان غیر متوقع ضروریات و اخراجات کو بھی محسوب کر لیا جائے جو ایسی عظیم الشان عزائم میں پیش آیا کرتی ہیں تو اصلی مصارف کی میزان کل پچاس ملین سے کم نہ ہوگی۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ کیا ضرور ہے کہ کل کام کو دفعۃً واحدۃً ہاتھ میں لے لیا جائے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ بالاقساط اسی کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کام کی عملی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ وہ اس تقسیم کے اصول کو قبول نہیں کریگی۔ ملک کے طول و عرض میں ریگستان اور دلدلیں پائی جاتی ہیں اس لئے آبپاشی اور اخراج آب کے مسائل کی بنا پر کام کا جزو اعظم بیک گردش عمل ہی انجام دینا پڑے گا۔ پھر آج جو تحت اخراجات بنیگا اس کے اعداد و شمار دیکھنا چاہئے کہ کیا ہونگے کم از کم ترکوں کے تخمینہ کو دو چند تو کر دینا چاہئے اور اس اندازہ میں قطعاً کسی مبالغہ کا شائبہ نہ سمجھنا چاہئے۔ تو اب مطلوبہ رقم وہ رقم ہے جس کی اس جیسے یکسوئی طبع اور فراغت معاش والے کام کیلئے نہ حکومت عراق اور انگلستان ہر دو کیلئے کا تب دارد کا مضمون ہے۔ بظاہر حالات اس مجموعی تعداد کی ایک کسر کی دستیابی کی بھی مستقبل قریب میں دور تک کوئی امید نظر نہیں آتی۔

بفرض محال اگر اس کو مان بھی لیا جائے کہ مالی مسئلہ حل ہو جائیگا تو آگے چلکر پھر یہ کام مشکلات کی بہت سی لاعلاج منزلیں رکھتا ہے مثلاً مصارف کے بعد دوسری کا مرحلہ آتا ہے۔ عراق کے اندر وہ آدمی کہاں مل سکینگے جو نئی آباد شدہ اراضیات کا تردد کر سکیں گے! ملک کی کل مردم شماری تین ملین نفوس پر مشتمل ہے اور اس آبادی کا وہ حصہ جو زراعت پر بسر اوقات کرتا ہے پورا کا پورا اسی پیشہ میں مشغول ہے۔ میرے کان اس تجویز سے بھی آشنا ہوئے ہیں کہ مذکورہ بالا مشکل کا یہ علاج کیا جا سکتا ہے کہ جزیرۃ العرب کے مختلف اقطاع کے خانہ بدوش اور بادیہ نشین قبائل کو

عراق جدید میں اقامت گزیں ہونے اور آئندہ فلاحین کی سی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دیجائے جسکو ممکن ہے
کہ وہ لبیک کہیں۔ لیکن میں صرف یہ کہوں گا کہ علی سہامت شیخ چلی کی ان خوابوں پر مبنی نہیں کیجاسکتیں!
قرینہ غالب ہے کہ آخری جواب میں ہندوستان کے فراہم شدہ قلیوں کی طرف دعوت نظر دیجائے لیکن اول
تو عراق کے اندر ہندوستانی عنصر روز بروز تقلیل کی طرف مائل ہے جس کے اسباب کا آئندہ بھی سد باب
نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ایک بڑے پیمانہ پر ہندی مزدوروں کی درآمد کی کوشش کی بھی گئی تو اول تو
خود عراق کی عرب آبادی اُن کو خوش آمدید کہنے میں سخت متامل ہوگی اور اس اقدام کو "بین النہرین"
کے اندر گنگا اور جمنا کے دوآبہ والے ایک نئے "وطن الہنود" کی بنیاد ڈالنے سے تعبیر کریگی اور ان
قومی خدشات کے ماتحت ہندوستانی تارکان وطن کیلئے اپنے ملک کی زمین حتی المقدور گرم کردیگی۔ دوسری
طرف خود ہندوستان میں اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا جائیگا اور یقیناً ایک شدید احتجاج کی لہر اٹھیگی۔
اس نکتہ کو محسوس کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے ارباب سیاست اور اصحاب معرفت جو بیرون ہند میں
اقامت رکھنے والے ہندی مزدوروں کی مظلومانہ حالت پر اس قدر شور و غوغا مچاتے ہیں انمیں حب وطن
اور ہمدردی نوع بشری کی گلبانگوں کے ساتھ غرض پرستی کے جذبات کی بھی کچھ صدائے بازگشت ہوتی
ہیں۔ ہندوستانی کارخانہ داروں کے لئے یہ سوچنا بالکل قدرتی ہے کہ [illegible] مزدوروں کو
روز بروز خشک کرتے رہنے کا ان پر براہ راست یہ اثر پڑیگا کہ یہ جنس پھر خود ہندوستان کے اندر نسبتہً
کم رہجائیگی اور مزدوروں کا یہ قحط خواہ مخواہ اُن کو گراں نرخ بنا دیگا! ان گوناگوں مشکلات و معاملات
کی بنا پر عراق کے اندر کوئی ایسی مہم نہیں کیجاسکتی جسکی امید پر [illegible] عراق عرب کو جب [illegible]
رکھے ہوئے ہے [illegible]
پیش کیا کرتی ہے۔

عراق عرب کی زرعی "حیثیت [illegible]" کی آمیزش [illegible]
ہیں جنکے اندر انگلستان بالکل [illegible]

کرنے کیلئے کافی ہیں اور برطانوی بیڑہ ابھی سالہا سال تک اُس پر اپنی اوقات بسری کرسکتا ہے۔ اب اگر عراق میں بھی تیل کے لئے "کوہ کندن" کیا جائے گا تو مصارف کی کثرت کے عدم تناسب کی وجہ سے اُس کا نتیجہ بھی "کاہ برآوردن" سے زیادہ نہ ہوگا۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ خزینۂ روغن تنہا برطانیہ کا اجارہ نہ ہوگا لیکن پھر بھی سارے اخراجات و خطرات کے لئے تو انگلستان بلاشرکت غیرے ماشاءاللہ سینہ سپر ہو گیا ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ یہ "نیلا نیل" کتنے زیادہ "سرخ انسانی خون" کے معاوضہ میں خریدا جائیگا اور ابھی کتنے اور "دینار سُرخ" خرچ ہوں گے جو بیعنامہ پر بحق برطانیہ مہر تصدیق و توثیق ثبت کرسکیں گے!

اصل یہ ہے کہ انگریزی سرمایہ داروں کی اندرونی ریشہ دوانیاں اور فرمانفرمائیاں اس پالیسی کے اختیار کرنے میں حقیقی کارفرما عنصر ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ جنگ عظیم سے قبل ہی ایک برٹش سنڈیکیٹ نے ترکی حکومت سے نواح موصل کے "چاہات روغن" کا ٹھیکہ لیا تھا۔ یہ سب حلقے اسوقت خاموش نہیں بیٹھ سکتے!

تیل کی یہ حقیقت، زرعی فتوحات کی وہ سرگزشت، اور امپیریل مقاصد کی وہ دوراز کاری، سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر سرزمین عراق میں بجز خرمے کے درختوں اور نینوا و بابل کے تاریخی آثار کے اور کیا رکھا ہے جس کے لئے انگلستان فوج دخل اور ایک دوعملی انگریزی عربی حکومت کے گراں مصارف کو برداشت کر رہا ہے۔ وہمی و فرضی اغراض و مصالح کیلئے کسی سلطنت نے کبھی اپنے کو اس طرح کی خود طلبیدہ مصائب و افکار کے لئے وقف نہ کیا ہوگا۔

اس راز سربستہ کے حل کی جستجو میں سارے گوشوں سے ناکام پھرنے کے بعد آدم زاد ان لوگوں پر تو ایک متجسسانہ اور مفتشانہ نظر ڈالیں جو بغداد کی سڑکوں پر سفید عبائیں اور سرخ طربوش پہنے ہوئے ادھر اُدھر ہشاش بشاش چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اور جنکی آنکھوں سے عیاری اور سارے سراپا سے مرفہ الحالی ٹپکتی ہے! یہ عراق کے یہودیوں کا حلیہ ہے۔ بنی اسرائیل کے مسئلہ نے آج بہت سے ارباب سیاست کو اس سے زیادہ پریشان بنا رکھا ہے جتنا کہ اُس قوم نے ماضی بعید میں انبیا و رسل کو

بنایا تھا! میرے لئے یہ امر بہت معنی خیز تھا کہ یہودی جوق جوق ملحقہ و بیرونی ممالک سے ترکِ اقامت کر کر کے
عراق میں آ رہے تھے اور اس ملک میں روز بروز اپنے عنصر کو تقویت پہنچاتے معلوم ہوتے تھے۔ یہ بات
خالی از علت نہ تھی۔ صرف بغداد شہر کے اندر یہ لوگ آبادی کے پورے ایک ثلث حصہ پر قابض ہیں اور
ان کے تمول کا تناسب انکے تعدادی شمار سے کہیں زیادہ ہے۔

اگر یہودیوں سے متعلق ہم نے اپنے کسی قسم کے مصالح کو عراق عرب کے قبضہ کے ساتھ
منسلک کیا ہے تو ان منصوبوں کی لاکیفیت محتاج تصریح نہیں۔ میں اس بارے میں پورا متیقن نہیں
ہوں اور مجھے یہ خیال ہے کہ ممکن ہے کہ ان خبروں اور افواہوں کے پیچھے کچھ بھی نہ ہو لیکن پھر بہت
سی علامات و قرائن ایسے ہیں جن کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ موجودہ برطانوی وزارت کے ساتھ
یہودی عمائد و اعیان کا جو تعلق رہا ہے اس کے متعلق ایک سے زیادہ موقعوں پر انکشاف
ہو چکا ہے۔ یہ تعلقات ہنوز روز افزوں ہیں اور یہ ان کی وسعت و نفوذ کا یہ حال ہے کہ مسٹر لائڈ جارج
اور شاہ فیصل دونوں کی سیاسی خلوتگاہیں بنی اسرائیل کے [illegible] کے رازدانوں سے
معمور ہیں!

یہودی ریشہ دوانیوں کے جال میں پورا فلسطین پھنس گیا ہے اور اس دام سخت کے حلقوں
میں مرغ بسمل کی طرح پھڑک رہا ہے۔ فلسطین کے قبضہ کی نوبت [illegible] نامعقول نہ تھے جتنے
کہ عراقی دخل کے اسباب تھے۔ اور اب اس قبضہ کے تسلسل کے جو تجارب و نتائج پیدا ہوئے ہیں
وہ عالم آشکارا ہو چکے ہیں۔ ہمارے لئے کسی فریب نظر کی گنجائش باقی نہیں۔ [illegible] تجویز یہ ہے
کہ ارض مقدس کو یہودیوں کا "قومی نشیمن" بنایا جائے گا۔ [illegible] یہ شرف
حاصل ہوگا کہ اس یہودی وطن کی تعمیر کے [illegible] ایک حصہ [illegible] ذاتی [illegible]
ٹیکس دہندوں کو شرکت کی سعادت نصیب ہوگی۔ [illegible]
امت بیت المقدس کی طرف [illegible] کشش و رغبت [illegible] معقول جواب
یہ ہے کہ قوم یہودی یہ متفقہ [illegible] ارض یہودی کے [illegible]۔ لیکن

عرض یہ ہے کہ اس لستی کے ساتھ موجودہ اہل خانہ کی جو خانہ ویرانی لازم و ملزوم نظر آتی ہے اُس کے لئے کیا سند جواز ہے؟ کسی ملک میں توطن پذیرانہ حیثیت سے قدم رنجہ فرمانیکی صرف آرزو اُس ملک کا "تملیک نامہ" تحریر نہیں کر سکتی! دنیا پوچھنا چاہتی ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کی دعوت کو حق بجانب قرار دینے کے لئے کونسے دلائل و براہین ہیں؟

قریباً تین ہزار برس ہوتے ہیں کہ ایک ایسے موقع پر جبکہ اپنی داخلی کمزوری سے معذور ہو کر سلطنت مصر نے اپنی قلعہ نشین افواج کو فلسطین سے ہٹا لیا تھا یہودیوں نے دریائے یردان کو عبور کیا اور ملک کے ایک حصہ پر قابض ہو گئے جس بربریت و سبعیت کا ثبوت انہوں نے ان معرکہ آرائیوں میں دیا اُس کے سامنے جرمنی کا حربی اسٹاف بھی اپنا سر نیاز معیہ کا دیگا اور کبھی ہمسری کی ہمت نہ کریگا! فلسطین دو قدیم عظیم الشان تمدنوں کی باہمی شاہراہ کی ایک منزل تھا اس لئے اس خطہ پر یہودیوں کا عرصہ دراز تک کوئی دخل ممکن نہ تھا، چنانچہ ایک وقت آیا کہ وہ یہاں سے نکالدئے گئے اور مختلف اقطاع و دیار میں جلا وطن کر دئے گئے۔ اور بعد ازاں جب سائرس اعظم کے عہد میں انکو واپسی کی اجازت دیگئی تو اس دعوت پر ان کے ایک قدر قلیل جزو نے لبیک کہی۔ ایرانیوں، سکندر اعظم کے جانشینوں اور رومیوں کے دور میں یہ لوگ ... ایک قسم کی غلامی اور مقہوریت کی حالت میں رہے اور موخر الذکر تاجداروں کے زمانہ میں تو انہوں نے شام و فلسطین کے اندر ایک گونہ آتش مسئلہ کی حیثیت اختیار کر لی اور اپنے مسلسل فسادات اور آتش افروزیوں سے شاہ وقت کو مجبور کر دیا کہ وہ ان سب کو ... ... سے خارج البلد کر دے!

یہ ہے یہود کی شاندار تاریخ فلسطین! ان یادگار تاریخی نظائر کو پیش کر کے وہ ارض مقدس کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں اور بعض دیگر دول بھی ان کی تائید و پشت پناہی میں برطانیہ کی ہمنوائی پر آمادہ کر لئے گئے ہیں۔ لیکن اگر اہل مغرب کو خدا نے ایمانی توفیق دی ہے تو وہ حق بجقدار رسانیدن کی اس مہم کو کسی دوسری جگہ سے شروع کرنا چاہئے۔ قبل اس کے کہ یہودی باب بیت المقدس میں داخل ہوں، فرانس کے مورش عربوں کو قرطبہ و غرناطہ میں اور امریکہ کے سرخ

خزینہ دار ذخائر ملکی، ڈائرکٹر تجارت و حرفت' او صیغۂ ہجرت کا افسر اعلیٰ سب یہودی ہیں اور صیہونی مشرب و مسلک کے یہودی! اسی طرح تمام دفاتر و محاکم میں نوآموز اور ناتجربہ کار یہودیوں کی یورش ہے! سارا دفتر تشریعی عرب کشی اور یہود نوازی کی روح سے معموری! خفگو صحائف و جرائد کی ناطقہ بندی کیجاتی ہے۔ حب وطن اور دلسوزی ملک کا نعرہ بلند کرنیوالے عرب قائدین ملت کو اس عذر پر طوق و سلاسل میں جکڑ بند کیا جاتا ہے کہ انکی سرگرمیاں امن عامہ کے لئے خطرہ ہیں! اُن مزارعین و فلاحین سے جو صحیح معنوں میں نسلاً بعد نسل' قرناً قرن سے "فرزندان زمین" بنے ہوئے ہیں' یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی اراضیات کا بیعنامہ حکومت کے نام کر دیں اس لئے کہ ترکی سلطنت کے جائز وارث کی حیثیت سے تمام حقوق زمین نئی حکومت کے حق میں منتقل ہوگئے ہیں۔ یہ بیع نامہ شدہ زمین بعد میں یہودی کاشتکاروں اور زمینداروں کے لئے عطیۂ جاگیرات بننے والی ہے!

شریعت اسلامیہ کے مسلمہ و اعلان کردہ آئین کو پامال کر کے صیہونیت مآب یہودی حکومت فلسطین کے اسلامی اوقاف کے نظم و نسق میں بیباکانہ مداخلت کے درپئے ہے! یونانی راسخ الاعتقاد (تقلید مسلک) کلیسے کے وہ تمام اوقاف جنکو ترکوں نے ملک خدا بخشکر کبھی ہاتھ نہ لگایا' آج بحق حکومت ایک ضبط شدہ جائداد قرار دیتے ہیں اور ایک سرکاری کمیشن کے زیراہتمام عمداً اتنی بڑی بڑی مقداروں میں دار نیلام کئے جاتے ہیں کہ بجز یہودی قارونوں کے کوئی دوسرا اُن سے عہدہ برآ نہ ہو سکے!

اور یہ محض ایک مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ عرب روزانہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی ایسی بے شمار کارستانیاں اور ریشہ دوانیاں دیکھتا ہے جس سے اُس کے قلب کے اندر خون اُبال کھاتا ہے!

عرب لوگ انگلستان اور ساری مہذب دنیا سے سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا انکی یہ ساری تلخ نوائیاں شکوہ ہائے بیجا ہی ہیں؟"

کو سخت مخدوش کرتا ہے۔ لارڈ سڈنہم نے اُس تقریر پیچ کے دوران میں جو فلسطینی وفد کی آمد کے وقت انہوں نے ارشاد فرمائی تھی کہا تھا کہ: "لارڈ بالفور نے صیہونی یہودیوں کے لئے اپنے مشہور اعلان میں جو گلدستہ پیش کیا ہے وہ اس جماعت کے لئے ایک ڈائنامیٹ کا گولہ ثابت ہوگا! فلسطین کے خرمن امن میں اس حرکت سے ہم جو شرارہ لگائیں گے وہ تمام مشرق میں آتش وسیع آتش جدال و قتال کو مشتعل کریگا کہ ہمارے سارے وسائل اُس کو سرد کرنے میں سوخت ہو جائیں گے!"

میں اسی قول فیصل پر فلسطینی مسئلہ کی بحث کو ختم کرتا ہوں، اور عراق کی طرف پھر بازگشت کرتا ہوں۔

عراق عرب کے اندر ۱۹۲۰ء میں جو بغاوت ظہور پذیر ہوئی اُس نے دو طرفہ اپنا زبردست خراج خون و زر وصول کرنے کے علاوہ اگر اور کچھ نہیں کیا تو کم از کم زبان آتشیں سے یہ اعلان تو کر دیا کہ ملک کی عام آبادی برطانوی دخل کو کسی طرح خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ لطف یہ ہے جیسا کہ مجھکو نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس ناکامیاب انقلاب کے اصل داعی شاہ فیصل کے عین ہواخواہوں میں سے ہیں! نیز یہ کہ اس مہم کے تغذیہ کیلئے جو روپیہ ملا تھا وہ اُس رقم نذرانہ کا ایک حصہ تھا جو برطانوی خزانہ ملک حجاز کو پیش کیا کرتا ہے! انگلستان کو دیکھنا چاہئے کہ کہانتک وہ اپنی کمائی "بجائے حرام رفت" کی قربانگاہ پر چڑھاتا رہے گا!

عراق اور شاہ عراق کیساتھ جو دوستانہ معاہدات اور خوشگوار تعلقات ہیں وہ دراصل ایک سوانگ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ فیصل کے تخت شاہی کے پائے برٹش سنگینیں ہیں، اور اگر انگریزی فوجیں خاک عراق سے مراجعت کر آئے تو برطانوی ہائی کمشنر کے نقوش قدم پر ہی جناب فیصل بھی زمین ناپتے ہوئے نظر آئیں گے!

فیصل کی تخت نشینی فی الحقیقتہ اُس "بل" کی ادائگی کی ایک قسط تھی جو دوران جنگ میں شریفی خاندان کی خدمات کی بنا پر برطانیہ کے ذمہ واجب الادا سمجھا جاتا تھا! ورنہ باستثنائے نوجوان عرب پارٹی کے عراق عرب کے تمام علماء رنجیدہ ہو گرد و اور دادی فرات کے جملہ قبائل فیصل کو اپنا سرتاج بنانے

کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھے۔

فیصل کی تائید میں عراق عرب کے اندر جو مصنوعی استصواب عامہ کرایا گیا وہ بھی ایک ناقابل رشک انتخاب تھا۔ عالم بالا سے تمام ہدایات پیشگی صادر کی گئی تھیں، اگر کسی نے کوئی کلمہ حق بر زبان جاری کیا تو سخت مؤاخذہ و محاسبہ کے شکنجے میں کسا گیا۔ انہی گناہوں کی پاداش کے سلسلے میں مشہور زعیم طالب پاشا کی جلا وطنی سیلون کافی تشہیر حاصل کر چکی ہے۔

اپنی محرومیٔ قسمت سے میں شاہ فیصل کی تاجپوشی کی تقریب سعید میں شریک ہونے کے لئے وقت پر بغداد نہ پہنچ سکا، حالانکہ تمام لوازم کے اعتبار سے یہ موقع قابل دید و قابل داد تھا۔ ادنیٰ کمال یہ ہے کہ اتنے عظیم الشان قومی جشن کو منانے کے لئے کوئی قومی ترانہ بجز "God save the King" کے نہ تھا!

عراقی حکومت کے اخراجات اپنی گرانباری کی بنا پر ضرب المثل ہو رہے ہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ملک کے سرچشمہائے آمدنی کے بعض حصے ابھی تک اغیار کے قبضوں میں جا پڑے ہیں۔ عراقی ریلویز اور بندرگاہ بصرہ (جو ملک کا تنہا بحری تجارت کا دروازہ ہے) ایک برطانوی کمپنی کے اجارے میں ہے جو اپنے حلقے کے اندر سیاہ و سفید کی مختار کل ہے اور حکومت کا اس پر کوئی اقتدار نہیں۔ حکومت کی جیب میں اتنے ٹکے نہیں جو وہ ریلوے کمپنی کی کل متاع حقوق کو خرید کر واپس لے سکے۔ یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی ذاتی اغراض و مصالح کو ملک کے مفاد کی خاطر قدرے نظر انداز کرے گی۔

برطانوی کابینہ وزارت کی اُن تمام حرکات مذبوحی پر جو وہ مشرق قریب اور ایشیائے وسطیٰ میں عمل پیرا ہے ہم ایک عمومی و مجمل نظر ڈالتے ہیں:

ہندوستان اور مصر کے اندر وہ انتہا پسند [illegible] میں باشندگان ملک کی بلند جذبات اور اغراض سیاست کی تبدیلی [illegible] افغانستان کے متعلق اُس کی روش کو شاید صورت حالات کا جائزہ [illegible] عمل سے نہایت افسوسناک طریقے سے پیش آ رہی ہے [illegible]

اصول پر مبنی نہیں۔ علاقہ قفقاز کی نوزائیدہ جماہیر کو ہم اس لئے درخور اعتنا نہیں سمجھتے کہ ہمارا خیال ہے کہ یہ حشرات الارض جیسی حکومتیں جلد یا بدیر روسی پاٹڑ کی میں جذب ہو جائینگی۔

برطانوی حکومت کی پالیسی پر ایک اصولی تنقید ان الفاظ میں کیجا سکتی ہے کہ جس جگہ مضبوط بننے کی ضرورت ہے وہاں وہ نہایت مضرت رساں نامردی کی نمائش کرتی ہے اور جس جگہ "سپر باید انداختن" کا مقتضا ہوتا ہے وہاں وہ ناعاقبت اندیشانہ مظاہرات طاقت برپا کر دیتی ہے۔ ایک دوسری لغویت یہ ہے کہ دنیا کے جس خطے میں سے ہو کر سلطنت کے مقاصد کے نکلنے کی کبھی ہوئی بعید ترین توقع بھی نہیں ہو سکتی وہاں وہ آدمیوں اور روپیہ کا دریا بہا دیتی ہے! سلطنت کے طول و عرض کے اندر مختلف و گوناگوں اقدامات کے مابین کوئی یکسوئی و یکجہتی اور مقصد واحد و مشترک نظر نہیں آتا! مخفی معاہدات اور خفیہ سیاست بازی ایک دوسرا بے سود اور مضر مشغلہ ہے جو برطانوی وزارت کو بہت مرغوب معلوم ہوتا ہے!

سائل

"حضور..... سرکار..... غریب پرور..... تین دن ہو گئے ہیں..... فاقہ سے ... [illegible]
کو گئی ہو۔ برف پڑ رہی ہے۔ دو آنے بھی نہیں کہ جا کر [illegible] رات بسر کروں [illegible] اب جانتا ہے [illegible] اس کی
مرضی...... آٹھ برس ایک دیہاتی مدرسہ میں پڑھا چکا ہوں۔ نہ کچھ خطا نہ قصور، انسپکٹر نے معائنہ پر نکال دیا۔
اب سال بھر سے دھکے کھاتا پھرتا ہوں......"

وکیل صاحب، اسکوروز نے سائل کے پرانے نیلے کوٹ پر نظر ڈالی۔ اس کی [illegible]
غمگین آنکھوں کو دیکھا، گالوں پر لال لال ٹیکے دیکھے اور نہ جانے کیوں اسے یقین سا ہو گیا کہ ہو نہ ہو
اس آدمی سے میں پہلے ضرور کہیں مل چکا ہوں۔

"اور حضور۔ ابھی جو ہو پہنچ سکوں تو [illegible] کے ضلع میں ابھی [illegible] مجھے ملازمت مل جائے۔ لیکن
کرایہ کے لئے بھی تو کوڑی پاس نہیں۔ سرکار، اللہ آپ کا بھلا کرے گا [illegible] کے نام پر میری کچھ مدد کیجئے۔
مجھے مانگتے شرم آتی ہے مگر کیا کروں، مصیبت بری بلا ہے۔"

وکیل صاحب نے سائل کے ربڑ کے جوتوں کی طرف ایک نگاہ ڈالی۔ ایک جوتا [illegible] تھا
ایک نیچا۔ نگاہ پڑنا تھی کہ کچھ یاد آ گیا۔

"سنئے مولوی میاں صاحب مجھے ایسا لگتا ہے کہ [illegible]
میں۔ مگر اس وقت تم دیہاتی مدرس نہیں تھے [illegible] کیوں
ٹھیک ہے نہ؟"

"نہ..... نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے [illegible] سائل نے [illegible] میں تو
مدرس ہوں۔ آپ کہئے تو [illegible]

[illegible]

بتایا تھا کہ کس وجہ سے مدرسہ سے علیحدہ کئے گئے۔ کیوں، یاد آیا کہ نہیں؟"

مخاطب نے سر ہلایا۔ وکیل کو کچھ غصہ سا آیا اور اُس نے اظہار نفرت کے طور پر اس مفلوک الحال سائل کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ اور غصہ سے کہا: "یہ تو پلے درجہ کا کمینہ پن ہے۔ کیوں جی تمہیں شرم نہیں آتی؟ تمہارا علاج تو بس یہ ہے کہ تمہیں گرفتار کرا دیا جائے۔ لاحول ولا۔ مانا کہ غریب ہو، بھوکے ہو لیکن اس وجہ سے یہ تھوڑی ہے کہ بےشرمی سے جو جی ہو جھوٹ بک دو۔"

سائل کچھ گھبرا کر اور پریشان ہو کر ذرا پیچھے کو ہٹا اور دروازہ میں جو موٹھ لگی تھی اُسے ہاتھ سے پکڑ لیا اور آہستہ سے کہا "میں نے ...... میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ آپ کہئے تو اپنے کاغذ دکھا دوں۔"

"تم کہے جاؤ، یقین کون کرتا ہے۔ لوگوں کو طالب علموں اور دیہاتی مدرسوں سے جو ہمدردی ہے اس سے اس طرح بیجا فائدہ اٹھانا بہت کمینہ پن ہے۔ ذلیل، قابل نفرت۔ شرماؤ جی شرماؤ۔"

اسکورزو کو غصہ آگیا اور اُس نے نہایت بے رحمی سے سائل کو جھڑک کر نیچے اُتار دیا۔ جھوٹ کی وجہ سے اسکورزو کے اندر اس سے نفرت اور حقارت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو انسانیت پر جو یقین تھا اُسے صدمہ پہنچا تھا اور وہ چڑھ سا گیا تھا کہ انسانی ہمدردی کے جذبہ سے اس طرح کمینہ پن کے ساتھ فائدہ اٹھا کر یہ شخص اس خیرات کو آلودہ کرنا چاہتا ہے جو یہ نہایت صدق دل اور خلوص کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ سائل نے اپنی بریت میں کچھ اور کہنا چاہا، قسمیں کھائیں۔ لیکن بالآخر خاموش ہو گیا، شرما کر گردن نیچی کر لی۔ اور سینہ پر ہاتھ رکھکر کہنے لگا۔ "ہاں حضور، سچ ہے۔ میں نے واقعی ...... واقعی جھوٹ بولا۔ میں نہ طالب علم ہوں نہ دیہاتی مدرس۔ یہ سب غلط تھا۔ میں گرجا میں گایا کرتا تھا۔ پھر پینے کی لت لگ گئی اس لئے مجھے نکالدیا گیا۔ لیکن میں کروں تو کیا کروں؟ بے جھوٹ کے کام بھی تو نہیں چلتا۔ سچ کہتا ہوں تو کام نہیں چلتا۔ سچ بولوں تو کوئی ایک دمڑی نہ دے۔ سچ بولوں تو بھوکوں مر جاؤں۔ آپ کا کہنا ٹھیک ہے۔ بالکل درست ہے لیکن آخر کروں کیا؟"

"کروں کیا؟ مرد آدمی، پھر مجھے پوچھتے ہو کہ کروں کیا؟" اسکورزو نے بہت نزدیک آ کر کہا "کرو کیا، کام کرو، کام۔

"کام کروں ــــ بہت ٹھیک - مگر کام پاؤں کہاں؟ مجھے کوئی کام نہیں دیتا۔"

"بکواس کرتے ہو - تم ابھی نوجوان ہو، تنگڑے ہو، تندرست ہو - کام کرنا چاہو تو کام کیوں نہ ملے۔ مگر نہیں - تم تو سست ہو گئے بیکار بن گئے ہو - عادت بگڑ گئی ہے - شراب میں مست رہتے ہو، شراب میں - دس قدم پر کھڑے ہو تو شراب کی بو آتی ہے - جھوٹ تمہارے گوشت پوست میں داخل ہو گیا ہے۔ اور تم بس اب جھوٹ بول سکتے ہو اور بھیک مانگ سکتے ہو - اور اگر کبھی کام پر آمادہ بھی ہوتے ہو گے تو ضرور ہے کہ کام ہلکا ہو اور مزدوری بھاری - کیوں ہے نہ؟ کسی گھر میں خدمتگاری یا کارخانہ میں مزدوری یہ تو آپ کو پسند نہ ہو گی؟ ٹھیک ہے، آخر اپنا اپنا مزاج بھی تو ہوتا ہے اور اپنی اپنی پسند!"

سائل کے لبوں پر نہایت تلخ تبسم رونما ہوا اور اُس نے کہا "آپ آخر ایسی باتیں کیوں فرماتے ہیں ...... مجھے کام کہاں مل سکتا ہے؟ Kommis کے لئے میری عمر زیادہ ہو گئی ہے، اب تو لڑکپن ہی میں شروع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے - صحیح عرض کرتا ہوں نہ؟ گھر میں خدمتگار مجھے کوئی بناتا نہیں - اس لئے کہ شکل صورت ایسی ہے کہ لوگ 'تو' 'تو' کہتے ذرا رکتے ہیں - یہی حال کارخانہ میں مزدوری کا ہے - اس کے لئے آدمی کو کوئی دستکاری آنی چاہئے - سو میں اس سے بھی نابلد ہوں ..... لیکن۔"

"جی - جی - عذروں کی تو تمہارے پاس کبھی کمی نہ ہو گی - لیکن یہ تو کہو لکڑیاں چیرنے کا کام کیسا ہے؟" "میں اس کے لئے بھی تیار ہوں - خوشی سے - لیکن آجکل تو خود پیشہ ور لکڑہاروں تک کے لئے کام نہیں ہے۔"

"اچکے اور نکمے ہمیشہ یہی کہتے ہیں - ابھی اگر میں تمہیں یہ کام دوں تو ظاہر ہے انکار کر دو گے۔ یا نہیں، لکڑی چیرنے پر تیار ہو؟"

"جی ہاں - خوشی سے۔"

"بہت اچھا - پھر کیا ہے۔"

اسکورزو نے کچھ شرارت آمیز طریقہ سے اپنے ہاتھ ملے اور گھر میں سے ماما کو بلایا۔

مدا ولگا۔ انکو باورچی خانہ میں لے جاؤ۔ یہ وہاں لکڑیاں چیریں گے"۔
سائل نے کندھے اچکائے۔ اُس کے چہرے سے شبہ سا ظاہر ہوتا تھا کہ کروں کیا۔ اسی شبہ کی
حالت میں باورچی خانہ کی طرف چلا۔ ظاہر تھا کہ اُس نے یہ کام صرف اس لئے قبول کرلیا تھا کہ پھر سے
وکیل صاحب اسے جھوٹا، کذاب نہ کہہ سکیں۔ ورنہ نہ کام کا شوق تھا، نہ بھوک کی وجہ سے وہ اس پر
آمادہ ہوا تھا۔ اس پر اسوقت شراب کا اسقدر اثر تھا اور اُس کے اعصاب اسقدر کمزور تھے کہ کام کی
طرف تو اسمیں ذرا بھی رغبت نہ تھی۔
اسکورزو جلدی جلدی اپنے کمرہ میں گیا۔ کھڑکی میں سے لکڑی کا گودام اور نیچے صحن کی تمام
کارروائیاں اُسے اچھی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ یہاں کھڑے کھڑے اس نے دیکھا کہ ماما اور سائل
صحن میں آئے اور میلے میلے برف پر سے چلکر باورچی خانہ کی طرف گئے۔ اولگا اپنے ساتھی پر عجیب بُری
نظریں ڈال رہی تھی اور اظہار نفرت کے لئے مڑ مڑ کر تھوکتی جاتی تھی۔ ماما نے گودام کا دروازہ کھولا اور
پھر زور سے کواڑ بند کئے۔ اسکورزو نے دل ہی دل میں کہا "شاید ماما بیگم چا پی رہی تھیں۔ سلوک
مخل ہوئے۔ اسپر بگڑی ہوئی ہیں۔ یہ بھی عجیب مخلوق ہے"۔
پھر اُس نے دیکھا کہ یہ سائل، جھوٹ موٹ کا طالبعلم اور مدرس، لکڑی کے ایک لوہلٹے پر
بیٹھ گیا، اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لیا اور نہ معلوم بیٹھ کر کیا سوچنے لگا۔ ماما نے زور سے لاکر کلہاڑی
اس کے پیروں کے پاس دے ماری اور پھر کچھ منہ بناکر تھو تھو کرنے لگی۔ سائل نے لکڑی کا ایک ٹکڑا
بڑی بے دلی سے اپنی طرف گھسیٹا اور پاؤں سے دباکر اُس پر کلہاڑی چلائی۔ کلہاڑی پھسل گئی اور
لکڑی ایک طرف اچھل کر گری۔ سائل نے اسے پھر ٹھیک ٹھیک رکھا اور پھر کلہاڑی چلائی۔ لیکن وار
پھر پورا نہ پڑا اور لکڑی اچھل کر ایک طرف کو گری۔
اسکورزو کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ بلکہ اُسے اب اپنے طرز عمل پر کچھ شرم سی آنے لگی تھی۔ بھلا یہ کونسی
انسانیت ہے کہ ایک تعلیمیافتہ، آرام طلب، اور شاید بیمار آدمی کو اس کڑاکے کی سردی میں اور ایسے
سخت کام پر مجبور کیا جائے۔ لیکن اُس نے سوچا "کہ خیر، یہ سب اسکے فائدہ ہی کے لئے ہے"۔

کوئی آدھ گھنٹہ میں اوڈگا آئی اور وکیل صاحب کو اطلاع دی کہ لکڑی سب چر گئی۔ "اچھا تو اسے ایک روپیہ دیدو اور اس سے کہدو کہ جی چاہے تو ہر مہینہ کی پہلی کو یہاں آکر لکڑیاں چیر جایا کرے۔ دنیا میں کام کی کمی نہیں ہے۔"

دوسرے مہینہ کی پہلی تاریخ کو سائل پھر موجود تھا۔ پیر لڑکھڑاتے تھے اور کھڑا ہونا مشکل تھا۔ مگر اس دفعہ بھی وہ ایک روپیہ کما کرلے گیا۔ اب تو یہ اکثر آنے لگا اور ہر مرتبہ اسے کچھ نہ کچھ کام مل ہی جاتا۔ کبھی راستہ سے برف ہٹانی ہوتی، کبھی صحن اور گودام میں جھاڑو دینی ہوتی، کبھی قالین اور دریاں جھاڑنی ہوتیں، اور ہر دفعہ اسے روپیہ بارہ آنے مل ہی جایا کرتے۔ اور ایک دفعہ تو کچھ پرانے کپڑے بھی مل گئے تھے۔

وکیل صاحب نے جب اپنا مکان بدلا تو اسی سے تمام سامان ٹھیک کراکے بھجوایا۔ اس دفعہ تو اس کے حواس بھی درست تھے۔ یہ پئے نہ تھا لیکن ذرا چپ چاپ اور کھنچا کھنچا ضرور تھا۔ جب سامان گاڑی پر لد گیا تو یہ سر جھکائے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گاڑی والوں نے اسکی کمزوری، اسکی سستی، اور اس کے پیوند لگے ہوئے کوٹ پر فقرے کسنے شروع کئے تو بیچارہ چپ رہا اور سردی میں سوں سوں کرتا سر جھکائے چلا گیا۔ جب اسکورزو دوسرے مکان میں پہونچ گیا تو اُس نے اسے اپنے کمرہ میں بُلایا اور اُس سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ میرے الفاظ کا تم پر اثر ہوا ہے یہ لو، یہ پانچ روپیہ کا نوٹ ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اب پیتے نہیں اور کام سے بھی جی نہیں چُراتے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"لُشکو۔"

"ٹھیک، میں اب تمہارے لئے ایک دوسرا بہتر کام تجویز کرتا ہوں۔ کیا تم لکھنا جانتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"تو یہ خط لیکر کل میرے دوست ــــ کے پاس جانا۔ وہ تمہیں نقل کے لئے کاغذات دیں گے۔ خوب جی لگا کر کام کرنا۔ پینا چھوڑ دو۔ اور میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے اس کا خیال رکھو۔ اچھا۔ خدا حافظ۔"

اس بات سے دل میں خوش ہو کر کہ اس نے ایک انسان کو کام کا خوگر بنایا، اسکوَرزو نے سائل کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور رخصت کے وقت اس سے ہاتھ تک ملایا۔ لشکو خط لیکر رخصت ہوا اور پھیر وکیل صاحب کے یہاں کبھی دکھائی نہ دیا۔

دو برس گزر گئے۔ ایک روز شام کے وقت اسکوَرزو ایک تھیٹر کے سامنے ٹکٹ خرید رہا تھا۔ اس کے بازو میں ایک شخص بالوں کا کوٹ پہنے اچھی سی ٹوپی لگائے کھڑا تھا۔ یہ آخری درجہ کا ٹکٹ مانگ رہا تھا اور قیمت میں تانبے کے ادھنّے دے رہا تھا۔

اسکوَرزو نے اپنے پُرانے لکڑی چیرنے والے کو پہچان لیا اور بول اٹھا "لشکو! کیا تم ہو؟ کہو، کیا کرتے ہو؟ کیا شغل ہے؟ کیا حال چال ہیں؟"

"شکریہ۔ بس گزرتی ہے۔ میں آجکل ایک مختار کے یہاں ملازم ہوں اور مہینہ میں ۳۵ روپیہ پاتا ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ لشکو! سچ کہتا ہوں مجھے یہ سنکر بہت ہی خوشی ہوئی کیونکہ میں نے ہی تمہیں کام سے لگایا۔ تمہیں یاد ہے کہ میں کیسا بگڑا تھا۔ تم مارے شرم کے زمین میں گڑے جاتے تھے۔ خیر، خدا کا شکر ہے کہ میری باتوں کا اثر ہوا۔"

لشکو نے کہا "میں آپ کا بہت ہی شکر گزار ہوں۔ اگر میں اس وقت آپ کے پاس نہ آیا ہوتا تو شاید اس وقت بھی اپنے کو طالبعلم یا مدرس بتاتا ہوتا۔ جی ہاں۔ آپ ہی نے میری اصلاح کی۔"

"میں سچ کہتا ہوں مجھے بہت ہی خوشی ہے۔"

"میں پھر آپ کے الفاظ اور آپ کی مہربانیوں کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے اسوقت خوب کہا تھا۔ میں آپ کا بہت ہی شکرگزار ہوں۔ لیکن آپ سے زیادہ آپ کی ماما کا۔ خدا اس نیک اور ایماندار عورت پر اپنی رحمتیں بھیجے۔ آپ نے اس وقت خوب باتیں کہیں اور میں مرتے مرتے آپکا ممنون رہونگا لیکن نجات دلائی مجھے اُسی آپ کی ماما اولگا نے۔"

"میری ماما اولگا نے؟ وہ کیسے؟"

"بہت معمولی طریقہ سے۔ جب میں آپ کے یہاں لکڑی پھاڑنے آتا، تو وہ شروع کرتی "ائے شرابی۔ بدقسمت آدمی۔ چلتا کیسے ہے، ابھی تک ختم کیوں نہیں ہو گیا؟" پھر وہ میرے سامنے بیٹھ جاتی، نہایت غمگین آنکھوں سے مجھے دیکھتی، روتی اور کہتی: "بدنصیب! کمبخت! تیرے لئے اس دنیا میں کوئی آرام نہیں کوئی خوشی نہیں اور شرابی ہے، اُس دنیا میں بھی جہنم میں جلیگا۔ ہے ہے غریب گناہگار"۔ غرض ہمیشہ اسی قسم کی باتیں کیا کرتی۔ اس نے میری وجہ سے کتنی کوفت نہیں اُٹھائی۔ کتنے آنسو میری ہمدردی میں نہیں بہائے۔ میں آپ سے کیا بیان کروں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ میری جگہ آپ کی لکڑیاں پھاڑیں۔ آپ کو معلوم بھی ہے، میں نے آپ کے مکان میں ایک چپپ لکڑی کی نہیں پھاڑی۔ وہ یہ سب کیوں کرتی تھی اور اس کے اثر سے میں کیسے بالکل بدل گیا اور پینا کیسے چھوڑ دیا۔ میں خود نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کی باتوں سے اور اس کے شریفانہ برتاؤ سے میری روح میں ایک انقلاب ہو گیا۔ میری اصلاح اُسی نے کی اور میں اُسے کبھی نہ بھولوں گا..... لیکن معاف فرمائیے۔ اب وقت ہو گیا ہے، وہ گھنٹی بج رہی ہے۔"

شکو نے سلام کیا اور اپنے درجہ میں جا داخل ہوا۔

(از مولانا محویؔ صدیقی)

اک ذرا بجلی سی چمکی تھی نقابِ یار سے
جگمگا اُٹھی ہے دنیا تابشِ انوار سے

بے خبر تھی بزمِ حسن و عشق کے اسرار سے
ہو گئیں سرگوشیاں دل اور نگاہِ یار سے

دل کی رنگیں حسرتیں تھیں خون کی بوندیں نہ تھیں
رات بالیں پر جو ٹپکیں دیدۂ بیدار سے

بیخودیٔ شوق کی اللہ رے سادہ دلی !
آرزوئے التفات اور وہ بھی چشمِ یار سے !

لڑکھڑا کر جب گرا تو پائے ساقی پر گرا
یہ ہوا ہے کام اک دیوانۂ ہشیار سے

اس قفس کی زندگی نے کر دیا ایسا اُداس
جی نہ بہلا پھر کبھی نظارۂ گلزار سے

ہیں وہی نا آشنائے لذتِ دیوانگی
جو نظر آتے ہیں اس محفل میں کچھ ہشیار سے

اک نظر میں ہو گیا دل بے نیازِ کائنات
نعمتِ دارین کیا پائی نگاہِ یار سے

تھا کچھ ایسے درد سے لبریز سوزِ دل کا حال
چھا گیا محشر میں سناٹا مری گفتار سے

دیدنی ہیں دستِ قدرت کی ستم آرائیاں
پھول ہم آغوشِ گلشن میں ہوئے ہیں خار سے

بن گیا ناسور وہ زخمِ جگر اے ضبطِ غم
آج تک جس کو چھپایا اپنے ہر غمخوار سے

جی بھر آیا آ گئی محویؔ جوانی اپنی یاد
جھوم کر اُٹھی گھٹا جب دامنِ کہسار سے

دوشیزۂ سحر

(از حضرت دردؔ کاکوروی)

دوشیزۂ سحر تو محبوبۂ فلک ہے   تیری جبینِ روشن فطرت کی اک جھلک ہے

آمد کے تیری ہر سو سب اگ گا رہے ہیں   جنگل کے بسنے والے تانیں اڑا رہے ہیں

کیفِ مجسم ایسا رقصاں طیور میں ہے   ہر طائرِ خوش الحاں گویا سرور میں ہے

اس درجہ خامشی سے دریا جو بہہ رہے ہیں   فطرت کے چپکے چپکے سب راز کہہ رہے ہیں

دوشیزۂ سحر کی آنے کو ہے سواری   کیوں چھوڑ دیں نہ رستہ تاریکیاں فضا کی

کر ہی چکی تھی فطرت ہر ایک شے پہ پالش   اک دم ہوئی ہوا کو پھر غیب سے جو جنبش

اتنے میں اک حسینہ رقصاں ہوئی فضا میں   خورشید کی کرن تھی ٹانکے ہوئے ردا میں

وہ دیکھو ظلمتوں کو پُر نور کر رہی ہے   عالم میں نام اپنا مشہور کر رہی ہے

ہر پتہ رقص میں ہے ہر ڈالی جھومتی ہے   دوشیزۂ سحر کے قدموں کو چومتی ہے

دوشیزۂ سحر تو جلوے دکھا رہی ہے   فطرت کی چلمنوں سے یا مسکرا رہی ہے

یہ تیری مسکراہٹ رنگینیوں کی ہیکل   عالم کا کھولتی ہے دروازۂ مقفل

وہ دیکھو لے رہی ہے دل میں نسیم موجیں   آغوش میں لئے ہے نورِ سحر کی فوجیں

شبنم کے برگِ گل پر قطرے پڑے ہوئے ہیں   فطرت کے یا چمن میں موتی جڑے ہوئے ہیں

کیا مست کر رہے ہیں طائر چہک چہک کر   کیا نغمے گا رہی ہیں چڑیاں پھدک پھدک کر

اے دردؔ ہو گیا ہوں دیوانہ سحر میں
ایلائے رنگ و بو ہے عالم مری نظر میں

"ہندو کُش" عالمگیر کے عہد

کی

دو عجیب ہندو کتابیں

(کتبخانۂ جامعہ میں)

جامعہ ملیہ کی پُراصرار دعوت پر مجھے ایک ہفتہ کے لئے جامعہ آنا پڑا، اور اسی تقریب سے اُس کے کتبخانہ کی سیر کرنی پڑی۔ ارباب جامعہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے آٹھ برس کی مختصر مدت میں اپنے دوسرے شعبوں کے ساتھ اپنے کتبخانہ کو بھی قابل قدر حد تک وسعت دی۔ اِس وقت اُس کے کتبخانہ میں کم وبیش آٹھ ہزار کتابیں ہیں جن میں عربی، فارسی، انگریزی اور اُردو کی کتابیں داخل ہیں، جو قرینہ کے ساتھ الماریوں میں رکھی ہیں اور مرتب ہیں۔ ان میں ڈھائی سو کے قریب عربی اور فارسی کی قلمی کتابیں ہیں جنکی ہنوز ترتیب کی نوبت نہیں آئی تھی میں نے اپنے مختصر قیام میں ان کتابوں کو دیکھا اور ان میں بعض ایسی کتابیں پائیں جو مختلف حیثیتوں سے قدر کے قابل تھیں منجملہ ان کے دو کتابیں مجھے نہایت عجیب معلوم ہوئیں کہ ان کا کوئی نسخہ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

اِن دونوں کتابوں کی ندرت اور قدر کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اُس اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی تصنیف ہیں جس کو اُس کے دشمن اور مخالف، ہندو کش، ہند وعلوم وفنون کا بربادکرنے والا، ہند، ومذہب کو تباہ کرنے والا، ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے والا مشہور کرتے رہے ہیں، لیکن دوسری شہادتوں اور دلیلوں کے ساتھ آج یہ دو مردہ خاموش کتابیں زندہ اور گویا شاہد ہیں جو علی الاعلان یہ گواہی دیتی ہیں کہ اُس مرحوم بادشاہ پر یہ تمام اِلزام تہمت ہیں۔

ان میں سے ایک کتاب کا نام "مت اچھرا" اور دوسری کا نام "ردّ کفر" ہے۔ یہ دونوں کتابیں اپنے عہد کی دو مخالف اور متضاد منظروں کو پیش کرتی ہیں۔ پہلی کتاب ایک پکے ہندو کی تالیف ہے اور دوسری

ایک نومسلم ہندو کی پہلی کتاب کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو اُن کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اور دوسری کا بت پرست ہندوؤں کو اسلام کا راستہ دکھانا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی زبان فارسی ہے، جو اُس زمانہ میں تمام ہندوستان کی ادبی اور علمی زبان تھی۔

۱۔ مت اچھرا

یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۲۱۴ صفحوں میں ہے۔ کتاب کا یہ نسخہ فرخ آباد میں ۱۴ فروری ۱۸۴۷ء مطابق ربیع الاول ۱۲۶۳ھ کو اختتام کو پہنچایا ہے۔ کاتب کا نام سید کلام الدین شاہ قادری ساکن فرخ آباد ہے، کاتب مذکور نے یہ نسخہ قاضی محمد غلام محی الدین خاں "سررشتہ دار محکمہ کچہری صدر امین اعلیٰ" کے لئے لکھا ہے، جیسا کہ اس کے آخر میں بیان ہے۔

کتاب کی فارسی زبان خاصی ہے، جا بجا اصطلاحات ہندی اور سنسکرت کے استعمال کئے ہیں، افسوس ہے کہ نسخہ بحد غلط ہے۔ دیباچہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جاک بلک (اور خاتمہ میں جاگ ولگ ہے) نام ایک رکھیسر (؟) نے بکرماجیت کے زمانہ میں اس کتاب کو اشلوک میں لکھا تھا۔ اس کا نام "مرت جاک بلک" مشہور ہو گیا تھا۔ چونکہ وہ بہت مشکل کتاب تھی اس لئے گوشائیں بکیانیر (؟) نے اس کو نئے سرے سے مرتب کیا اور اس کا خلاصہ کیا، اور "مت اچھرا" نام رکھا۔ اسی خلاصہ کا سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں لعل بہاری ولد رائے کاہید سنگھ نے جو بھوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا، اور جو اورنگ زیب کے درباری امیر اللہ وردی خاں کا متوسل تھا، ۱۰۹۶ھ میں سوبھاسکر پنڈت کی مدد سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ تاکہ سنسکرت سے ناواقف اس کو سمجھ سکیں اور فائدہ اٹھائیں۔ یہ سوبھاسکر پنڈت سنسکرت کے بڑے ماہر تھے، اسلام آباد عرف منجھولی واقع سرکار گورکھپور کے باشندہ تھے۔

کتاب کا موضوع جیسا کہ دیباچہ میں ہے "احکام و مذاہب (اوامر و مناہی (نواہی؟))ہنود" ہے۔ کتاب تین مقالوں پر منقسم ہے اور ہر مقالہ میں متعدد فصلیں ہیں۔

مقالہ اول "در آچار دھیائے کہ آنرا بزبان عرب عبادت گویند"۔ اسمیں ۹ فصلیں ہیں۔

مقالہ دوم " در بیو پار ادھیائے کہ عبادت از معاملات باشد" اسمیں ۵ ہم فصلیں ہیں۔

مقالہ سوم " در پرائشچت ادھیائے کہ آں را کفارت (کفارہ؟) خوانند" اسمیں ۔ فصلیں ہیں۔

فصلوں کی تفصیل تو مشکل ہے مگر اس ترتیب و تعبیر سے صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانہ کے "روشن خیال" ہندوؤں کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنے شاستر کو اسلامی فقہ کے نمونہ پر تیار کریں۔ جس طرح آج ہمارے محکوم روشن خیال اپنی اسلامی فقہ کو انگریزی قانون کی صورت میں ڈھالنے کے لئے بیقرار ہیں۔

اس کتاب کے دیباچہ میں "ہندوکش عالمگیر" کو جن آداب و القاب سے یاد کیا گیا ہے" وہ آج ہمارے ہندو بھائیوں کے پڑھنے کے لائق ہے:۔

"اکنوں کہ دریں عہد بادشاہ خلافت پناہ، عادل، مظفر، مؤید ظل اللہ، سلیماں بارگاہ، مظہر الطاف الٰہی، مطلع انوار بادشاہی، مجسم داد و کرم، قامع آثار جفا و ستم، برداشتہ حضرت منان، گماشتہ ایزد سبحان، خورشید برج خلافت، مشتری آسمان سلطنت، ظل ظلیل سبحانی، واسطہ انتظام انسی و جانی، شیرازہ نسخہ اسلام، ماحی بدعت کفر و ظلام، مالک ہفت اقلیم، زینت افزائے تخت و دیہیم، وارث ملک سلیمانی، فروغ دودمان صاحب قرانی، خسرو فلک اقتدار، بادشاہ خورشید اشتہار سلطان بن سلطان، خاقان زمین و زمان، محیب؟ فرمانروایان حال و ماضی ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ، کہ در عیش چوں دور قدح پُر نشاط، و زمانش مانند ایام شباب پر سرور و انبساط، روز بازار فضل و دانش است، مبتدی نژادان فارسی دولت دانظم و نثر ازحد بیشتر است۔"

غور کیجئے کہ یہ کتاب سرکاری حیثیت سے نہیں لکھی جارہی تھی اور نہ بادشاہ کے دربار میں پیش کئے جانے کی غرض سے ترجمہ کی جارہی تھی، مگر با ایں ہمہ ان جذبات کا ادا ہونا یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اُس عہد کے ہندو اسکو کیا سمجھ رہے تھے، اور آج اُس کو کیا سمجھ رہے ہیں۔

آگے چلکر وہ اپنا اور اپنے آقا کا کس محبت اور منت شناسی کے جذبہ کے ساتھ ذکر کرتا ہے:۔

" پیش نہاد خاطر احقر العباد لعل بہاری ولد رای پردای کاہید سنگھ متوطن بھوجپور من

مضافات سرکار شاہ آباد عرف قنوج متعلق بصوبہ اکبرآباد کہ رگ و پے ایں تربیت یافتہ یک خاندان والا دودمان عز و علا نواب سپہر جناب، خورشید القاب، عالیان تاب، رکن السلطنۃ العظمیٰ، اعتقاد الخلافۃ الکبریٰ، سزاوار است آں عیوقی، چراغ دودمان سلجوقی، مبسط الطاف بادشاہی، منظور انظار خلیفۂ الٰہی نواب اللہ وردی خاں عالمگیر شاہی است"

کیا یہ سطریں آج انقلاب روزگار کی تصویریں نہیں؟

۲۔ ردّ الکفر

دوسری کتاب کا نام "ردّ الکفر بحجت القوی" ہے۔ اس کتاب پر قاضی محمد ولد قاضی محمد باقر کی ملکیت کی مہر ہے۔ اور معلوم نہیں کہاں سے جامعہ میں آگئی ہے۔ اس کا مصنف نومسلم ہندو ہے۔ اس کا ہندو نام ہرکشن تھا اور اسلامی نام عبدالقوی ہے۔ وہ سامانہ کا رہنے والا تھا، جو پنجاب میں ایک مقام ہے۔ مقدمہ میں وہ عالمگیر کا ذکر اور اس کتاب کی کیفیت اس طرح لکھتا ہے:

"بندۂ فقیر حقیر عبدالقوی ساکن سامانہ بخدمت اہل اسلام التماس می دارد کہ قبل ازیں نام فقیر ہرکشن بود، ایمان آورد بر دین حضرت رسالت پناہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہ حق است، و کفر باطل، کفر را رد ساختہ، اسلام را حق شناختہ، نام خود را عبدالقوی نہاد ..... شوال ۱۰۸۳ھ از دور خلافت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی، بصدقہ کہ صدق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عدلہ کہ عدل حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ، حلمہ کہ حلم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، و شجاعتہ کہ شجاعت حضرت شاہ مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ خلد اللہ ملکہ و عمرہ و سلطنتہ در خاطر رسید مر رمان کہ در کتم اند ..... رعایات غصہ ست، رد کفر در قلم باید آورد تا کذب کفر و صدق [illegible] معلوم گردد۔ و اگر [illegible] ایمان است، اگر کافر بخواند در باب ایمان خدائے تعالیٰ توفیق [illegible] شود [illegible] ایں کتاب ردّ الکفر بحجت القوی (مصنف کے نام کی طرف [illegible]) [illegible] شد [illegible]

بندگان بدست مسلمان کہ برسد کیفیت ایں رسالہ منتشر گرداند، سعادت دارین یابد، بطرف دلائل وعقاید نظر کنند نہ بطرف املا وانشا نظر کنند، اگر خطا شدہ باشد اصلاح بدہد، ایں نیز ثواب ایشاں باشد"۔

اس رسالہ کی زبان معمولی ہے۔ ۲۹ حقیقتوں پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ آخر سے کچھ ناتمام ہے۔ ہر حقیقت کے تحت میں ہندوؤں کے مختلف عقائد و رسوم کو لیکر اس کی تفصیل کی ہے اور اسکی خرابیاں دکھائی ہیں اور اس کے مقابل میں اسلام کی خوبیاں بتائی ہیں۔

بہرحال اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ایسے نومسلم ہندو ہوتے تھے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عالمگیر کے زمانہ میں دلائل کے زور کے بجائے تلوار کے زور سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا جاتا تھا۔

سید سلیمان ندوی

فاؤسٹ کے چند ورق

فاؤسٹ جرمنی کے بادشاہ سخن گوئٹے کا مشہور ڈراما ہے۔ میں جناب مولوی عبدالحق صاحب قبلہ کی فرمائش سے اس کا ترجمہ کر رہا ہوں جو انشاء اللہ اکتوبر تک انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو جائے گا۔ اس کا ایک ٹکڑا نمونہ کے طور پر قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہ ایک دیباچہ ہے جس میں گوئٹے نے دکھایا ہے کہ ڈراما لکھنے والے کو کس طرح مختلف مذاق کے لوگوں کی خوشنودی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

(عابد)

تماشاگاہ کا تمہیدی سین

منیجر، شاعر، مسخرا۔

منیجر۔ تم دونوں نے بارہا مصیبت اور پریشانی میں میری مدد کی ہے، اب یہ تو کہو تمہارے خیال میں ہمارا کام جرمنی کی سرزمین میں چلے گا یا نہیں؟ مجھے تو عوام کو خوش کرنے کی فکر ہے کیونکہ ان کا عمل اس پر ہے "جیو اور جینے دو"۔ کھمبے کھڑے ہو چکے ہیں، تختے جڑے جا چکے ہیں۔ اب ہر شخص ہم سے روحانی ضیافت کی توقع رکھتا ہے۔ وہ دیکھو تماشائی پالتھی مارے، بھویں چڑھائے بیٹھے ہیں اور ایسی چیز دیکھنا چاہتے ہیں جس سے وہ حیران رہ جائیں۔ میں اُن کے مذاق کو خوب سمجھتا ہوں، لیکن اس بار میں ایسا پریشان ہوں کہ کبھی نہ تھا۔ یہ مانا کہ وہ اعلیٰ درجے کے تماشے دیکھنے کے عادی نہیں، لیکن کمبخت ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ آخر کیا کریں، کیا چیز دکھائیں جو نئی اور انوکھی ہو، معنی خیز ہو، مگر ساتھ ہی دلچسپ بھی ہو؟ کیونکہ سچ پوچھو تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے چھوٹے سے تھیٹر میں تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ وہ چیختے چلاتے داخلے کے تنگ دروازے پر یوں پلے پڑتے ہیں گویا وہ جنت کا دروازہ ہے۔ چار بجے دن ہی سے ٹکٹ گھر کے سامنے ان میں دھکم دھکا

ہونے لگتی ہے، اور ہر شخص ٹکٹ کے لئے جان لڑا دیتا ہے جیسے قحط کے زمانہ میں نان بائی کی دوکان پر۔ یہ معجزہ بس شاعر ہی دکھا سکتا ہے، تم بھی آج یہ دکھا دو تو کیا بات ہے۔

شاعر - میرے سامنے اس رنگ برنگ مجمع کا نام نہ لو، جسے دیکھکر رفعت خیال رخصت ہو جاتی ہے۔ مجھے اُٹھتی ہوئی لہروں کا یہ سیلاب نہ دکھاؤ جو ہمیں زبردستی اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ مجھے تو اُس گوشۂ تنہائی میں لیجاؤ جہاں بہشت کا سا سکون ہے۔ جہاں اُس خالص مسرت کے پھول کھلتے ہیں جس کا لطف بس شاعر ہی اُٹھا سکتا ہے، جہاں دل کو محبت اور دوستی کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ وہ باغ جسے خدا نے اپنے ہاتھ سے لگایا اور سنوارا ہے۔ ہائے کیا غضب ہے کہ وہ اچھوتے مضامین جو شاعر کے قلب کی گہرائی میں پیدا ہوتے ہیں، اور جنہیں اسکی زبان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں، بڑے بھلے انداز سے بیان کرتی ہے، موجودہ لمحے کی اشتہا کا لقمہ بن جاتے ہیں (حالانکہ اکثر شاعر کی افکار برسوں کی ریاضت کے بعد مکمل صورت میں ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ ملمع کی چیزیں موجودہ لمحے کی لئے ہیں، اور کھرا سونا آیندہ نسلوں کے لئے امانت رہتا ہے۔

مسخرا - آیندہ نسلیں! بخشئے حضرت، اگر میں آیندہ نسلوں کی فکر میں رہوں تو موجودہ نسلوں کو کون ہنسائے؟ یہ بھی تو ہنسنا چاہتی ہیں اور کیوں نہ ہنسیں؟ مانا کہ یہ لوگ بچے ہیں مگر بچے بھی تو آخر انسان ہیں، جسے اپنے خیالات دلچسپ پیرائے میں بیان کرنا آتا ہے وہ عوام کے تلون کا رونا نہیں روتا، اس کے لئے تو جتنا بڑا دائرہ ہو اتنا ہی اچھا۔ اس میں اُس کی اور بھی جیت ہے۔ تو سمجھے بھائی ذرا ہمت کر ڈالو، ہمیں وہ گیت سناؤ جس میں تخیل اپنے پورے طائفے کے ساتھ ہو اور حکمت بھی ہو، عقل سلیم بھی ہو، جذبات بھی ہوں، جوش بھی ہو، مگر یہ یاد رہے، مسخرا پن بھی ضرور ہو۔

منیجر - خصوصاً واقعات بہت سے ہوں۔ لوگ اس لئے آتے ہیں کہ کچھ ہوتا ہوا دیکھیں۔ اگر قصے میں بہت سے دلچسپ سین ہوں، کہ لوگ حیرت سے منہ پھیلائے دیکھا کریں تو بس سمجھ لو کہ تمہاری شہرت پھیل گئی، اور تم ہر دلعزیز ہو گئے۔ بہت لوگوں کو رجھانے کے لئے بہت سی چیزیں چاہئیں تاکہ ہر شخص کو کوئی چیز اپنے ڈھب کی ملجائے۔ جو بہت کچھ دیتا ہے وہ بہتوں کو کچھ دیتا ہے اور ہر شخص خوش خوش گھر جاتا ہے۔ اگر تم قصہ دکھاتے ہو تو ٹکڑے ٹکڑے کرکے دکھاؤ۔ ایسے سیندے لوگوں کو پسند آئیں گے۔ ایسا قصہ لکھنا بھی آسان ہے اور دکھانا

بھی آسان، اگر مسلسل تماشا دکھایا بھی تو کیا فائدہ، دیکھنے والے سلسلے کو توڑ ہی کے دیکھیں گے۔

شاعر - اور تماشا جو مٹی میں ملجائے گا! مگر تمہیں اس کا کیا احساس، تم کیا جانو اس میں شاعر کی کیسی ذلت ہے۔ تم تو بازی گر شاعروں کی تک بندی کا کلمہ پڑھتے ہو۔

منیجر - تم خوب اعتراض کرو، میں برا نہیں مانتا۔ جو کوئی اپنے کام میں کامیابی چاہتا ہے، وہ مناسب اوزار استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ اتنا تو سوچو تمہیں کن خامکاروں سے سابقہ ہے، جن کیلئے تم لکھتے ہو ذرا ان کو بھی تو دیکھو۔ کوئی (تماشے میں) بے شغلی سے اکتا کر آیا ہے۔ کوئی الوانِ نعمت سے سیر ہوکر، اور قیامت تو یہ ہے کہ اکثر لوگ اخبار چھوڑ کر آئے ہیں۔ بہتوں کو سوانگ دیکھنے کی امید، شوق کے پروں پر اڑا کر لائی ہے۔ خواتین بناؤ سنگار کئے ہوئے (بالانشین تماشائیوں کو) مفت کا تماشا دکھاتی ہیں۔ تم تو اپنے شاعری کی چوٹی پر تخیل کے مزے لیتے ہو، تمہاری بلا سے تھیٹر بھرا ہو یا خالی ہو۔ ذرا اپنے قدردانوں کو قریب سے دیکھو، آدھے بھس ہیں اور آدھے بے تمیز۔ ایک تو تماشے سے جاکر تاش کھیلے گا، اور دوسرا کسی بیوہ کے آغوش میں رات گزاریگا۔ ان بیچارے سادہ لوحوں کو کیوں ستاتے ہو، کہاں یہ اور کہاں آرٹ کی دیویاں! بس تم تو لکھتے جاؤ، اور لکھو، اور لکھو، پھر تمہاری کامیابی یقینی ہے۔ ایسی ترکیب کرو کہ لوگ چکر میں آجائیں، ان کو خوش کرنا تو بہت مشکل ہے۔ ہائیں یہ تمہیں کیا ہوا۔ خوش ہو گئے یا خفا ہو گئے؟

شاعر - جاؤ دور ہو یہاں سے، کسی اور غلام کو ڈھونڈ! کیا خوب! شاعر تیری خاطر اپنے عزیز ترین حق کو، فطرت کے عطا کئے ہوئے حقِ انسانیت کو، مسخرے پن میں برباد کردے! اس کے پاس کیا چیز ہے جس سے وہ دلوں کو ہلا دیتا ہے، اور سارے عناصر پر حکمرانی کرتا ہے؛ بجز اُس ہم آہنگی کے جو اُس کے دل کو ساری کائنات سے متحد کر دیتی ہے؟ جب فطرت ابدی رشتۂ تقدیر کو بے پروائی سے کات کر بل پر بل دئے جاتی ہے اور ربابِ زندگی کے اُلجھے ہوئے تاروں سے بے سُری صدائیں نکلکر سامعہ خراشی کرتی ہیں تو کون دیدہ ریزی سے ان تاروں کو سلجھاتا ہے اور اُن کو کس کر نغمۂ حیات میں روانی پیدا کرتا ہے؟ کون انفرادی روح کا سُر کائنات کے مہا سُر سے ملا کر ہم آہنگ، دلکش راگ سناتا ہے؟ کون جذباتِ قلب کی شورشوں سے طوفان کا منظر دکھاتا ہے؟ کون سنجیدہ تفکر سے شفق شام کا سماں باندھتا ہے؟ کون بہار کے سارے خوش رنگ پھولوں کو محبوب

کی رہ گزر میں بچھا دیتا ہے؟ کون بے حقیقت سبز پتوں سے عزت کے ہار بنا کر سورما کے گلے میں ڈالتا ہے؟ کون کوہ اولمپس[1] کی حفاظت کرتا ہے اور دیوتاؤں میں میل کراتا ہے؟ وہی قوت انسانی کا اعلیٰ مظہر جسے شاعر کہتے ہیں۔

مسخرا اچھا اب مجھ سے سنئے یہ قوت کیونکر ظاہر ہوتی ہے، شاعری کا دھندا اسی طرح چلتا ہے جیسے عاشقی کا سودا ہوا کرتا ہے۔ کوئی اچھی صورت نظر آئی دل پر چوٹ لگی قدم رک گئے اور رفتہ رفتہ ہم دام الفت میں اسیر ہو گئے، پہلے تو قسمت یاوری کرتی ہے پھر اُس سے لڑائی ٹھن جاتی ہے پہلے زمانے کے مسرت کی ایک جھلک دکھائی پھر ستم ظریفی شروع کر دی۔ بس چشم زدن میں ایک رومان تیار ہو گیا۔ آؤ ہم بھی ایک تماشا دکھائیں بس اپنا موضوع انسانی زندگی کو بنالو، اسے بسر سب کرتے ہیں مگر سمجھتے کم ہیں، اُس کا جو رخ کھلو وہی دلچسپ ہے۔ گوناگوں تصویریں ہوں مگر روشنی کم، غلطیوں کا انبار اور حقیقت کی ایک ذراسی چنگاری اس نسخے سے وہ نادر شراب بنتی ہے جس سے ساری دنیا کو سرور اور تقویت حاصل ہو۔ پھر دیکھنا تمہارے تماشہ میں کیسے کیسے حسین جوان آتے ہیں اور تمہاری لن ترانیوں کو کس شوق سے سنتے ہیں۔ پھر ہر درد آشنا دل تمہارے کلام سے حسرت و اندوہ کا لطف اُٹھائے گا، کوئی بات ایک کو تڑپائے گی، کوئی دوسرے کو اور ہر شخص کو وہی چیز نظر آئیگی جو اس کے دل میں ہے۔ یہ نوجوان اب تک ذراسی بات میں ہنسنے اور رونے لگتے ہیں۔ اب تک زور کلام کی قدر کرتے ہیں اور ظاہری خوبیوں پر سر دُھنتے ہیں پختہ مغزوں سے بیشک کوئی امید نہیں لیکن خام کار نوجوان تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

شاعر اچھا تو مجھے بھی وہ دن واپس لا دو جب میں انکی طرح جوان تھا، جب میرے سرچشمۂ فکر سے لگاتار نئے نئے نغمے اُبلتے تھے، جب دنیا میری نظروں میں ایک طلسم اسرار تھی اور ہر کلی ایک راز سربستہ۔ آہ اُس زمانے میں سب وادیاں پھولوں سے مالامال تھیں اور یہ سب پھول میرے دامن میں تھے۔ میرے پاس کچھ نہ تھا اور سب کچھ تھا۔ یعنی ایک دل جس میں حقیقت کی طلب تھی اور مجاز کا عشق لاؤ مجھے وہ دن

---

[1] یونانی علم الاصنام میں اولمپس اس پہاڑ کا نام ہے جہاں دیوتا رہتے ہیں۔

کی موجیں اسی اگلی سی وحشت کے ساتھ واپس دے دو۔ وہ گہری پُر درد لذتیں، وہ نفرت کی قوت اور
محبت کی طاقت، لاؤ پھر مجھے جوانی پھیر دو۔

مسخرا۔ میرے پیارے دوست تمہیں جوانی کی ضرورت جب ہوتی کہ تم میدان جنگ میں دشمنوں کے
نرغے میں گھرے ہوتے یا کوئی خوبصورت نازنین تمہارے گلے میں باہیں ڈالکر زور سے بھینچ لیتی، یا
تم دوڑ میں مقابلہ کرتے اور انتہا تک پہونچنے کی قوت نہ پاکر انعامی ہار کو دور سے دیکھ کر للچاتے، یا دیوانہ وار
رقص کرنے کے بعد رنگ رلیاں مناتے اور شراب وکباب میں رات بسر کرنے کے قصد سے بیٹھتے۔ مگر
بڑے میاں، تمہارا کام تو یہ ہے کہ ساز زندگی کے جانے بوجھے تاروں کو ہمت اور خوش اسلوبی کے
ساتھ بجاؤ اور جو منزل تمہارے پیش نظر ہے وہاں تک بھٹکتے بھٹکتے پہنچ جاؤ۔ یقین جانو کہ اس سے ہمارے
دل میں تمہارا احترام کم نہیں ہوتا۔ یہ غلط ہے کہ بڑھاپے میں بچپن لوٹ آتا ہے بلکہ بڑھاپے میں بھی بچپن
نہیں جاتا۔

منیجر۔ بس باتیں بہت ہو چکیں اب عمل کی باری ہے۔ جتنا وقت اس ہنیین وخیال میں ضائع ہوا اسمیں
کوئی مفید کام ہو سکتا تھا۔ یہ بیکار عذر ہے کہ طبیعت موزوں نہیں۔ جو ہچکچاتا ہے اُس کی طبیعت کبھی موزوں
نہیں ہوتی۔ جب تم شاعر بنتے ہو تو شاعری کی باگیں سنبھالو۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے،
ہمیں زوردار شراب معنوی چاہیئے، بس دیر نہ کرو جھٹ پٹ تیار کر دو۔ جو کام آج نہ ہوا وہ کل بھی نہ ہوگا۔
کوئی دن بیکار نہ کھونا چاہیئے۔ ہمت مردانہ وقت کو ایسا مضبوط پکڑتی ہے کہ وہ نکل کر جا نہیں سکتا تب
اُسے چارناچار کام کرنا پڑتا ہے۔

تم جانتے ہو کہ ہماری جرمن اسٹیج پر جس کا جو جی چاہے دکھا سکتا ہے اس لئے تم بھی پردوں اور
مشینوں سے دل کھول کر کام لو، ہلکی اور تیز روشنی دونوں کو استعمال کرو اور تاروں کی بھرمار کردو۔
ہمارے یہاں پانی، آگ، پہاڑ، چرند، پرند کی کمی نہیں۔ بس اسی لکڑی کے تنگ گھروندے کے اندر
ساری کائنات کا نقشہ دکھادو، آسمان سے زمین، زمین سے پاتال تک سیر کرو، تیزی سے مگر سنبھلے
ہوئے۔

اقتباسات

"یورپ کا فرض"

جو لوگ یورپ کو مذہب اور روح کا دشمن سمجھتے ہیں اور جن کیلئے روس اور امریکہ بھی اسیطرح 'یورپ' ہیں جیسے خود یورپ' وہ جرمنی کے مشہور فلسفی کاؤنٹ کیزرلنگ کی نئی کتاب 'یورپ' کو بڑی حیرت آمیز دلچسپی سے پڑھینگے ۔ وہ اس کتاب میں ایک جگہ کہتا ہے : "آج یورپ کے ذمہ جو فرض عاید ہوتا ہے اس سے بڑا فرض اسپر کبھی عاید نہیں ہوا تھا ۔ روح کی جو تاریک اور طولانی رات اس وقت انسانیت کے سامنے نظر آتی ہے اسمیں روح کے مقدس شعلہ کی حفاظت کرنا اور اسے بجھنے سے بچانا یورپ کے اور صرف یورپ کے سپرد کیا گیا ہے ۔" جدید یورپ کے اہل نظر میں اس وقت دو متضاد مذاہب کا پتہ چلتا ہے ' ایک وہ ہیں جو وضاحت اور عقلیت پر اصرار کرتے ہیں ' دوسرے وہ جو انسان کے وجدانِ ابتدائی پر مصر ہیں اور چاہتے ہیں کہ عقل کو جبلت و وجدان کے تاریک لیکن صحت بخش اور روح پرور چشمۂ حیات کے پانی سے بتپسمہ دیں ۔

جرمن مورخ اشپنگلر بتا چکا ہے کہ بربریت سے چلکر انحطاط تمدن تک کا چکر جو ہر تمدنی زندگی کو پورا کرنا ہوتا ہے وہ یورپ کیلئے بھی قریب الختم ہے ۔ اور اب کیزرلنگ بتاتا ہے کہ بالشوزم ایک نئے دور کا بربری آغاز ہے جس کا پہلا کام یہ ہے کہ مشرق کے انسانوں کو مادی تہذیب کی بلند ترسطح پر پہنچا دے ۔ امریکہ میں بھی اسے یہی چیز دکھائی دیتی ہے یعنی تمامتر توجہ کا مادی اور جماعتی مقاصد پر مرکوز ہونا اور شخصیت و امارت کی طرف سے ہٹا ہونا ۔ اس طرح امریکہ بھی اس کے نزدیک ایک نئے دور تہذیب کا بربری آغاز ہے اور یورپ ان دو عظیم الشان رقیبوں کے درمیان آ پھنسا ہے جن میں صدیوں تک روحانی مقاصد اور قدریں نظر انداز کیجائیں گی ۔ بعض جدید ماہرین نفسیات کا خصوصاً آدلر کا ذکر کرکے کیزرلنگ کہتا ہے کہ اس نئے فلسفہ اور اس نئی امریکی حقیقت دونوں کا

مطمح نظر دراصل وہی ہے جو روسی اشتراکیت کا ہے یعنی "انسان اپنی انفرادی شخصیت کو جماعت میں گروہ میں پھر گم کر دے۔

لیکن اگر امریکہ اور روس اس مقدس شعلہ کے صحیح وارث بننا چاہیں اور ایک نئی اور عظیم الشان تہذیب پیدا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں تو ان کے لئے لازمی ہے کہ وہ ابھی جماعتی جذبہ اور مادی تنظیم ہی پر توجہ کریں اور اس عرصہ میں بقول کیزرلنگ یورپ پر اس مقدس شعلہ کی حفاظت کا فرض عاید ہوتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ اگر اس شعلہ کے بجھنے کا اندیشہ اس وجہ سے ہے کہ کہیں یورپ بھی محض مادی قدروں کا بندہ نہ ہو جائے تو اس کا خطرہ یوں بھی ہے کہ کہیں یورپ اپنی خشک عقلیت اور ذہن پرستی سے اپنے کو تباہ نہ کرے۔ عقل و عشق تخلیق کے لئے دونوں لازمی ہیں۔ کوئی چیز بغیر ان دو متضاد عناصر کا صحیح توازن نہ ہو مؤثر نہیں ہو سکتی۔ لہذا یورپ کا کام یہی نہیں ہے کہ اس شعلہ کو جذبات اور مادیت کے سیلاب سے نہ بجھنے دے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس شعلہ کو عقلیت کے صحرا میں جلکر خاکستر مردہ نہ بن جانے دے۔

اگر یورپ ان جدید بربری قدروں کی مخالفت میں اپنی منطق اور عقلیت ہی پر زور دیتا رہا تو روح کا شعلہ یورپ میں بھی افسردہ ہو جائیگا اور روس اور امریکہ میں بھی روشن ہو پائیگا۔ یورپ والوں کو بھی ضرورت ہے کہ وہ اس زمین سے تعلق پیدا کریں۔ وجدانیت و جذبات کے حیات بخش چشمہ سے سیراب ہوں۔ جب وہ ان دونوں میں توازن پیدا کرلیں تب ہی اس مقدس شعلہ کے محافظ بن سکتے ہیں۔ رچارڈ ریس در ایڈلفی، لندن

حکومت ہند کی طرف سے ہر سال ہندوستان کے متعلق ایک رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیجاتی ہے جسمیں سال کے تمام اہم معاملات کا ذکر اور ان پر تنقید و تبصرہ ہوتا ہے۔ ۱۹۲۷ء-۲۸ء کی رپورٹ جسے مسٹر کوٹ مین نے مرتب کیا ہے ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ اس میں تعلیم پر جو حصہ ہے اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

تازہ ترین اطلاعات مظہر ہیں کہ کُل ملک میں ابتدائی تعلیم ۱۱۴ بلدیوں میں اور ۱۵۲۷ دیہی علاقوں میں جبری ہے۔ ذیل میں جو نقشہ درج ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ مختلف صوبوں میں جبریہ ابتدائی تعلیم کی تقسیم کیا ہے۔ اس تحریک میں پنجاب کا حصہ خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ٹھیک نصف تعداد بلدیوں کی اور ۲۸ چھوڑ کر سب کے سب وہ دیہی علاقے اس صوبہ میں ہیں جہاں ابتدائی تعلیم جبری ہے۔ نقشہ درج ذیل ہے:-

صوبہ	بلدیہ	دیہی علاقے	صوبہ	بلدیہ	دیہی علاقے
مدراس	۲۱	۳	برما	۰	۰
بمبئی	۷	۰	بہار و اڑیسہ	۱	۴
بنگال	۷	۰	صوبہ متوسط	۳	۲۱
صوبہ متحدہ	۲۵	۰	اسام		
پنجاب	۵۷	۱۴۹۹	میزان کل	۱۱۴	۱۵۲۷

پنچ ذاتوں کی تعلیم کے متعلق رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ برما اور آسام کو چھوڑ کر باقی ۷ صوبوں میں پنچ ذات کے طلبہ کی تعداد چھ لاکھ سرسٹھ ہزار ہے۔ یعنی پنچ ذات کی کل آبادی میں سے ۲٫۳ فی صدی۔ ان طلبہ کی زیادہ تر تعداد ابھی ابتدائی مدارج میں ہے اور ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں بہت ہی کم۔ مثلاً ۱۹۲۵-۲۶ء میں مدراس میں کل ۲۳۳ ایسے طلبہ کالجوں میں پڑھ رہے تھے، بمبئی میں کل ۱۴، صوبجات متحدہ میں صرف ۱۱، صوبہ متوسط میں ۸، بہار و اڑیسہ میں صرف ۱، اور پنجاب میں ایک بھی نہیں۔

”یہ احساس عام ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی حالت کمیت کے لحاظ سے چاہے کتنی ہی اطمینان بخش ہو، کیفیت کے اعتبار سے اس میں بہت ہی کمیاں ہیں۔ یہ خیال خاص طور پر ثانوی

تعلیم کی بابتہ درست ہے جو بہ حیثیت مجموعی مغربی معیار کے اعتبار سے بہت گھٹیا ہے اور بعض حصوں میں غیر منظم۔ طریق تعلیم ناقص ہے؛ اساتذہ اپنے کام میں دلچسپی نہیں لیتے؛ اور طلبہ کا مطمح نظر بس روپیہ کمانا ہے۔ گزشتہ زمانہ میں تعلیم کے اخلاقی، جماعتی اور جسمانی پہلو پر بہت کم توجہ کیگئی ہے اور ذہنی پہلو سب کچھ رہا ہے۔

ہر تعلیمی کام کرنے والا جانتا ہے کہ تعلیم عمر بھر کا دھندا ہے، اور اگر ملک میں جمہوری اداروں کو چلانا ہے تو عام بالغ لوگوں کی تعلیم کا انتظام لازمی ہے تاکہ وہ اپنے حق رائے کو مناسب طور پر استعمال کرسکیں۔ تعلیم گاہوں کے کام کو شہروں میں وسعت دینا تو دشوار نہیں البتہ دیہی آبادی کا معاملہ بہت نازک ہے۔ پچھلے زمانہ میں اس آبادی کے لئے مختلف تدبیریں ہندوستان میں اختیار کیگئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ صحت اور عام مفید باتوں پر تقریروں کا انتظام کیا گیا۔ دوسری تدبیر مدارس شبینہ کا قیام ہے۔ ایک اور صورت یہ کیگئی کہ طبی پیشہ کے لوگوں کو گاؤں میں رہنے کی ترغیب دیجائے۔ کہیں یہ کیا گیا کہ گاؤں میں کتب خانہ یا ابتدائی ادبی اور علمی انجمنیں قائم کی گئیں۔ ذیل میں ہم وہ اعداد نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ مختلف صوبوں میں مدارس شبینہ کی تعداد اور انمیں طلبہ کی تعداد کیا ہے۔ اسمیں بمبئی، پنجاب، برما اور صوبجات متوسط کے اعداد میں تو صرف بالغ شامل ہیں لیکن دوسرے اعداد میں بالغ اور نابالغ دونوں ہیں۔

صوبہ	تعداد مدارس شبینہ	تعداد طلبہ	صوبہ	تعداد مدارس شبینہ	تعداد طلبہ
مدراس	۵۲۸۷	۱۳۶۶۲۶	برما	۱۹	۱۰۶۵
بمبئی	۱۹۱	۷۷۳۰	بہار و اڑیسہ	۱۰۳۶	۲۲۷۰۱
بنگال	۱۴۴۵	۲۷۷۷۳	صوبجات متوسط	۴۱	۱۰۶۷
پنجاب	۳۲۰۸	۸۵۴۲۲	میزان کل	۱۱،۲۲۷	۲۸۲،۳۸۴

ذیل میں ہم اس رپورٹ سے چار نقشے نقل کرتے ہیں جو یقین ہے کہ ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

برطانوی ہند میں خواندہ اور ناخواندہ لوگوں کا تناسب
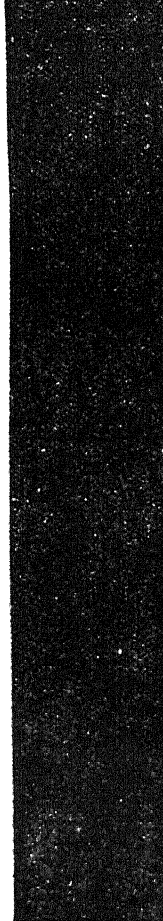
ہر مردم شماری پر نیز ۱۳ر مارچ سنہ ۱۹۲۶ء و ۱۳ر مارچ سنہ ۱۹۲۷ء کی تخمینی آبادی میں مرد اور عورتوں کا تناسب اور خواندہ و ناخواندہ مرد اور عورتوں کی تعداد

آبادی (ملین میں: ملین = ۱۰ لاکھ)

۱۸۷۲

مرد ۱۰۶ عورتیں ۱۰۰ کل ۲۰۶
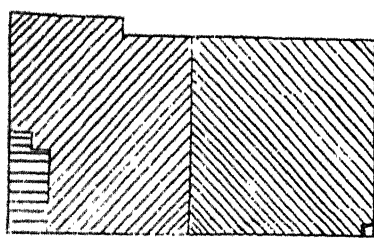
خواندہ: مرد ۹ ملین۔ عورتیں ۲ر۔ کل ۲ر۹

آبادی (ملین میں)

۱۸۸۱

مرد ۱۳۰ عورتیں ۱۲۴ کل ۲۵۴

خواندہ: مرد ۵ر۱۰۔ عورتیں ۴ر۔ کل ۹ر۱۰
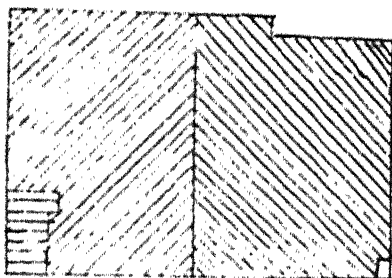
آبادی (ملین میں)

۱۸۹۱

مرد ۱۴۷ عورتیں ۱۴۰ کل ۲۸۷

خواندہ: مرد ۵ر۱۱۔ عورتیں ۵ر۔ کل ۱۲

آبادی (ملین میں)

مرد ۱۴۹ عورتیں ۱۴۴ کل ۲۹۳

خواندہ: مرد ۵ر۱۰۔ عورتیں ۱۔ کل ۷ر۵
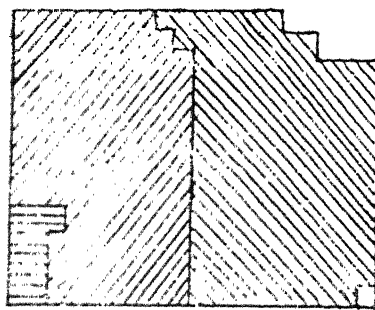
آبادی (ملین میں)

۱۹۱۱

مرد ۱۶۱ عورتیں ۱۵۴ کل ۳۱۵
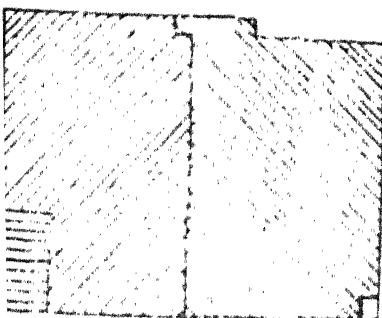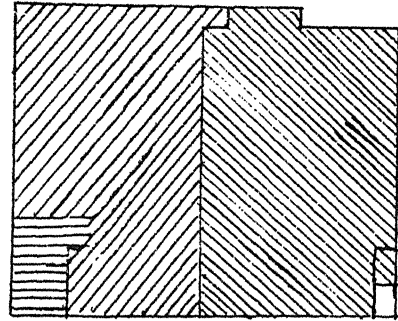
خواندہ مرد ۱۶٫۹ - عورتیں ۱٫۶ - کل ۱۸٫۵

آبادی (ملین میں)

۱۹۲۱

مرد ۱۶۴ عورتیں ۱۵۵ کل ۳۱۹

خواندہ مرد ۱۹٫۸ - عورتیں ۲٫۸ - کل ۲۲٫۶

آبادی (ملین میں)

۳۱ر مارچ سنہ ۱۹۲۶ء

مرد ۱۶۸ عورتیں ۱۵۸ کل ۳۲۶

خواندہ: مرد ۲۲ - عورتیں ۳٫۳ - کل ۲۵٫۳

آبادی (ملین میں)

۳۱ر مارچ سنہ ۱۹۲۷ء

مرد ۱۶۹ عورتیں ۱۵۹ کل ۳۲۸

خواندہ: مرد ۲۲٫۷ - عورتیں ۳٫۵ - کل ۲۶٫۲
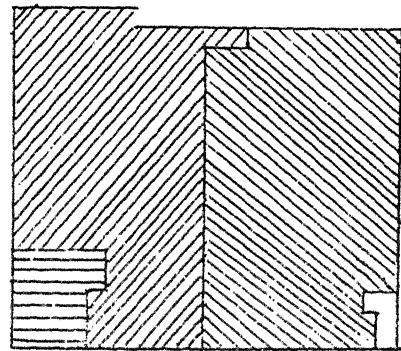
مردوں کی آبادی عورتوں کی آبادی خواندہ مرد خواندہ عورتیں

تعلیم پر کل ہندوستان کا خرچ اور اسکی تقسیم

سنہ ۱۹۱۷-۱۶ء تک ہر پانچویں سال کی رقم اور اس کے

بعد سے سالانہ

کل خرچ

پراونشل ریونیو سے

فیسوں سے

ڈسٹرکٹ اور لوکل بورڈوں سے

میونسپلٹیوں سے

۲۴۰۰
۲۲۰۰
۲۰۰۰
۱۸۰۰
۱۶۰۰
۱۴۰۰
۱۲۰۰
۱۰۰۰
۸۰۰
۶۰۰
۴۰۰
۲۰۰

۱۸۸۶-۸۷
۱۸۹۱-۹۲
۱۸۹۶-۹۷
۱۹۰۱-۰۲
۱۹۰۶-۰۷
۱۹۱۱-۱۲
۱۹۱۶-۱۷
۱۹۱۷-۱۸
۱۹۱۸-۱۹
۱۹۱۹-۲۰
۱۹۲۰-۲۱
۱۹۲۱-۲۲
۱۹۲۲-۲۳
۱۹۲۳-۲۴
۱۹۲۴-۲۵
۱۹۲۵-۲۶
۱۹۲۶-۲۷
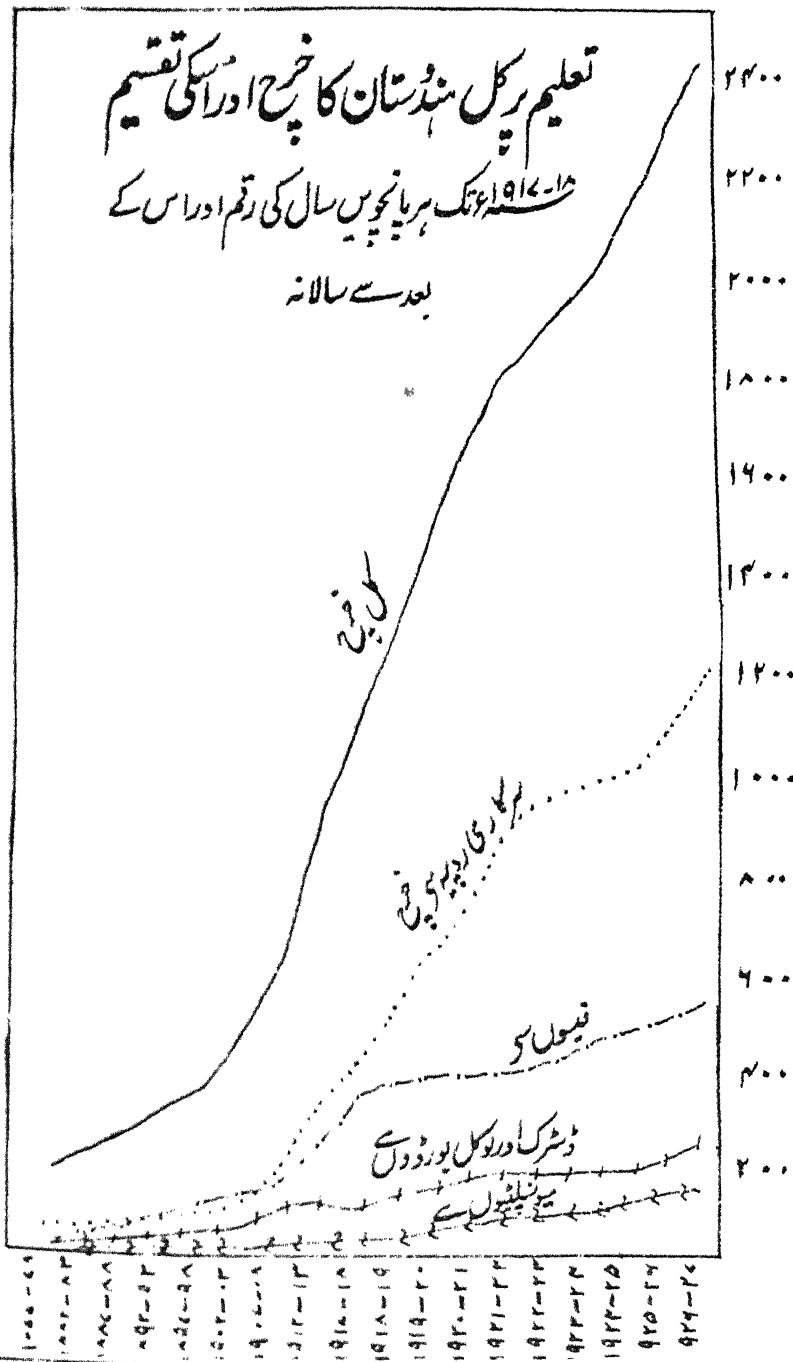
"گڑیا کا گھر"

قومی زندگی اور قومی مسائل کے مقابلۃً تنگ دائرہ سے گذرنا، دوسری سرزمین، دوسرے ماحول میں انسانی زندگی کا مشاہدہ کرنا ذہنیت کی صحیح تربیت کے لئے لازم ہے اسی طرح جیسے آب وہوا کی تبدیلی جسمانی صحت کی شرط ہے۔ ناواقفیت، جہالت اور محدود تجربہ تعصب اور بیہودہ خودستائی پیدا کرتے ہیں، اور جس قوم کو اپنی عظمت کا مغالطہ ہو جائے اُس کی نشوونما سمجھنا چاہیے ختم ہوگئی۔ ہندوستانی ذہنیت اس مہلک مرض میں مبتلا معلوم ہوتی ہے، اور اس وقت ہر روشن خیال ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی اخلاقی حالت پر غور کرکے اپنی قوم کی اصلاح کے لئے معیار اور نصب العین مقرر کرے۔ دوسروں کے تجربہ سے فائدہ اٹھائے۔ آئی آرزوؤں کا امتحان لے۔

یورپین تہذیب کے ہندوستان میں بہت سے دوست ہیں اور بہت سے دشمن، اُسے سمجھنے والے کم ہیں۔ یہ اندیشہ مگر سب کو ہے کہ ہم اس کے اثرات سے بالکل بچ نہیں سکتے، اور اسی وجہ سے دوستی اور دشمنی دونوں میں مبالغہ کیا جاتا ہے۔ اگر اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ ہم یوروپین تہذیب کی اصل صورت دیکھنے سے عموماً محروم رہتے ہیں، تو ہم اکثر غلط فہمیاں معاف بھی کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ہمارا فرض بھی ہو جاتا ہے کہ جس حد تک ہو سکے یوروپین تہذیب کی سیرت کو سمجھیں اور سمجھائیں اور نظر کے فریبوں سے گزر کر اس کی اصلیت تک پہونچیں۔

مشرقی زندگی ہمیشہ سے ایسے تخیلات کے ماتحت رہی ہے جو عام طور سے تسلیم کئے جاتے تھے، جن کے مطابق زندگی کے ہر پہلو کے لئے معیار اور قوانین مقرر ہوتے تھے۔ مغربی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلا دھکا اس بات سے پہنچتا ہے کہ وہ کوئی عام اخلاقی

اصول تسلیم نہیں کرتی، اور ریاست کے قانون کے حدود میں فرد کو کامل آزادی دیتی ہے۔
ہمارے یہاں عورتوں کے لباس تک کو مذہبی تعلیم کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یورپ میں لباس کیا اخلاق تک ہر عورت اپنے لئے طے کر سکتی ہے اور جب تک وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس کی قانوناً سزا مقرر ہے عام رائے بھی اس کی زندگی میں دخل نہیں دیتی۔ اس آزادی کے نتائج برے بھی ہوتے ہیں اور اچھے بھی، مگر برے ہوں یا بھلے، وہ انسانی تجربہ کا ایک ذخیرہ ہیں جس سے مستفید نہ ہونا سخت حماقت ہو گی۔ ہمارے پاس اپنے معیار موجود ہیں۔ ہماری تاریخ کا سلسلہ قائم ہے، پھر یورپین تہذیب کے ذہنوں سے ہمیں کیا اندیشہ۔ اس کے تجربہ کو کام میں لانے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے۔

افراد کی آزادی کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جس تنقید اور نکتہ چینی اور انصاف پسند سماجی ضمیر نے یہ آزادی رفتہ رفتہ قائم کی ہے اس کی اہمیت اور ضرورت کو ہمیں بلا تکلف تسلیم کر لینا چاہئے۔ افراد کی موجودہ آزادی کی عمارت کلیسا کے کھنڈروں پر تعمیر کی گئی ہے، اور یہ تخریب اور تعمیر دونوں اسی تنقید اور انصاف پسند سماجی ضمیر کے کارنامے ہیں۔ بیچ کی صدیوں میں مذہب اور خدا دونوں کلیسا کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے گویا انسان کی فلاح کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ مارٹن لوتھر نے یہ ٹھیکہ اس کے قبضہ سے چھین کر ریاست اور ملکی کلیسا کے سپرد کیا۔ اس لئے کہ اس کا ضمیر کیتھلک کلیسا کی تعلیم اور اس کے طرز عمل کی درستی کو نہیں تسلیم کر سکا وہ تین صدیوں بعد جو آگ لوتھر نے جلائی تھی، بجھنے لگی۔ تو پھر یوروپین ضمیر نے تنقید کے ذریعہ سے اس تخیل کی جڑ کاٹ دی جو لوتھر کے زمانے سے اس وقت تک غالب رہا تھا۔ کیتھلک کلیسا کا اصول "ایک خدا، ایک کلیسا، ایک قانون" تھا۔ لوتھر نے خدا کی وحدت تو قائم رکھی مگر کلیسا اور قانون میں اختلاف اور رنگا رنگی کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اٹھارہویں صدی کے انقلاب نے اس انتشار کو ایک درجہ اور بڑھا دیا، اور خدا کی وحدت بھی قائم نہ رہنے دی۔ ایک لحاظ سے تو یہ انقلاب برحق تھا، اس لئے کہ پرانے مذہبی اور اخلاقی اصول بالکل مردہ ہو گئے تھے، اور

اُن کے محافظوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُن میں دوبارہ جان پھونکنے کا حوصلہ کریں۔ مذہب اور اخلاق کی حفاظت یوں ہی ہو سکتی تھی کہ ہر شخص اپنے عقیدے کا ذمہ دار کر دیا جائے اور اُن کی درستی یا غلطی کا خود فیصلہ کرے۔ اس انقلاب کے پہلے رہنماؤں کی امیدیں کچھ بھی رہی ہوں، فتح اس میں عقل کو حاصل ہوئی، اور سب سے زیادہ نقصان مذہب کو پہنچا، اس لئے کہ اُسکی سماجی حیثیت بالکل جاتی رہی اور افراد کی ذہنیت پر عقل اور تجربہ کی خواہش اور مادی رجحان اس قدر غالب آگئے کہ مذہب کے لئے نہ دماغ میں گنجائش رہی نہ دل میں۔

مذہب کے ساتھ لازم تھا کہ اخلاقی معیار بھی شک اور تجربہ پر قربان کئے جائیں، اور ہر فرد اپنے لئے بہترین اخلاقی اصول دریافت کرنے کا بار اٹھائے۔ قانون نے شرط لگائی کہ جرم نہ سرزد ہوں، عام رائے نے شرط لگائی کہ کامیابی ہو، باقی افراد کو خود مختاری دیدی گئی۔ ہر انسان اپنی فلاح ہی چاہتا ہے، خواہ روحانی ہو یا جسمانی، موت سے پہلے یا موت کے بعد، اور چونکہ تجربہ کا میدان اسقدر وسیع تھا، اس لئے جو لگام مذہب نے چھوڑی وہ تنقید کے ہاتھ میں پہنچ گئی، اور یورپ میں تمام روشن خیال لوگ رہبری کے لئے اُن شخصیتوں کی طرف مڑے جو اُن کی زندگی میں نکتہ چینی کر سکتی تھیں، اور عوام کے ضمیر کے سامنے فیصلہ کرنے کے لئے مختلف اصول اور اُنکی عملی صورتیں پیش کر سکتی تھیں۔ ان نقادوں کے مشورے پر عمل کرنا کسی شخص پر لازم نہیں رہا ہے۔ لیکن یورپ کی موجودہ اخلاقی حالت بڑی حد تک انہیں کی بنائی اور بگاڑی ہوئی ہے۔

یورپ میں کوئی عام مذہبی یا اخلاقی نصب العین باقی نہیں رہا ہے لیکن اُس کی بجائے تہذیب اور تاریخ نے کامل انسانیت کی ایک آرزو پیدا کر دی ہے جو مذہب اور اخلاق کی جگہ پر محرک کا کام دیتی ہے۔ اسی انسانیت اور اسی کمال کی تمنا نے کیتھلک کلیسا کی بنیاد اکھاڑی مذہب سے جبر کی تعلیم اور تاثیر نکالدی اگرچہ اس کے ساتھ مذہب کے اڑ جانے کا بھی اندیشہ تھا اور اب یہی انسانیت یوروپین تہذیب کا مایۂ ناز ہے۔ اُس کی تلاش میں ہزارہا زندگیاں تباہ

ہوتی ہیں، اور ہو رہی ہیں، اور اس پر بھی جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ ممکن ہے بہت تھوڑا نظر
آئے، لیکن کچھ نہ کچھ حاصل ضرور ہوا ہے۔ اور ہر انسان کو اس کی قدر کرنا چاہیئے
ہم کو بہر حال اس حوصلہ اور ایثار کا مشاہدہ کر کے اپنی غلامی اور غفلت یاد کرنی
چاہیئے، ہمارے مذہب میں بے شمار خوبیاں ہیں، ہمارے اخلاقی اصول نہایت صحیح ہیں
لیکن ہم نہ اپنے مذہب کے اہل رہے ہیں نہ اپنی اخلاقی تعلیم کے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے
کہ ہم نے ہمیشہ سر تسلیم خم کیا ہے۔ بے سمجھ اور بے زبان جانوروں کی طرح جس طرف منہ موڑا
گیا اُدھر چل دئیے، اور کبھی یہ نہ سوچا کہ انسانیت کے فرائض کیا ہیں۔ مذہب کن صورتوں
میں قومی زندگی کا محرک ہوتا ہے، کن صورتوں میں نہیں۔ ہمارے ضمیروں پر غفلت طاری
ہو گئی، دل بے حس ہو گئے اور اخلاقی پستی نے ہم کو غلام بنا کر چھوڑا۔ اس پر طرفہ یہ ہے
کہ ہم اُن لوگوں کی بد اخلاقی پر افسوس کرتے ہیں جو اس وقت آسانی اور بے فکری سے
ہمارے ملک اور ہماری ذہنیت پر حکومت کر رہے ہیں۔ اب اگر ہمارے لئے انسانیت کے
اہل بننے کی کوئی صورت باقی ہے تو وہ یہی کہ ہم یورپ سے تنقید اور ذاتی تجربہ کی دعوت
کرنا سیکھیں، اپنے ضمیروں کو بیدار اور ذی حس بنائیں۔ قومی زندگی سے کنارہ کش اور
بیگانہ ہونے کی بجائے قوم کی ہر دشواری اپنی مصیبت سمجھیں، بُروں سے لڑیں، اچھوں
کی مدد کریں، اور اپنے ماحول کی حالت پر غور کر کے اپنی اور اپنے عقیدوں کی خامیاں
معلوم کرتے رہیں۔

ہم میں سے جو کوئی قومی اصلاح کی آرزو رکھتا ہے اسے ابسن کا کچھ دنوں شاگرد
رہنا چاہیئے۔ ابسن صرف ایک ایسا نقاد نہیں تھا جو قومی زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہو
اور ایسی باتیں بتائے جو اخبار اور پولیس کی نظروں سے باہر ہوں۔ وہ انسان کی فطرت سے
اس قدر واقف تھا کہ نظر اسے کبھی کوئی فریب نہ دے سکی، اور وہ مبالغہ اور مغالطہ دونوں
سے بچا رہا۔ اس نے صرف عام زندگی کو اپنا منظر بنایا ہے۔ مگر جن مسائل پر اس نے بحث

کی ہے وہ ہر انسان اور ہر ماحول کے لئے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ اسکا تصور بھی ایسا وسیع تھا کہ اس نے چند ڈراموں میں یورپین زندگی کے تقریباً تمام اہم مسائل پر رائے زنی کی ہے، اور ساتھ ہی فطرت انسانی کی بہت سی دلچسپ اور عبرت آموز خصوصیات ظاہر کی ہیں۔ وہ صرف ڈراما نویسی میں ایک نئے طرز کا موجد نہیں تھا، نہ آرام پسند اور مطمئن انسانوں کی بغل میں ایک نیا کانٹا۔ وہ ایک نئی زندگی کا پیغام بھی لایا، ایسی زندگی جس میں ایثار اور بلند اخلاقی حوصلہ قومی اور انفرادی زندگی کی سب سے عزیز دولت ہوں، جس میں ساری جماعت ہر فرد کی تکلیفیں محسوس کرے، اور ہر فرد اپنے فرض کو اپنا حق سمجھے۔ اس کے ہر ڈراما میں کسی نہ کسی شکل میں یہ پیغام سنایا گیا ہے، اور یہ پیغام ایسا ہی جسے سن کر ایشیا اور یورپ کا ہر باشندہ اپنے دل میں جوش پیدا کر سکتا ہے۔

تمدنوں کی ترقی اور تنزل، اُن کی زندگی اور موت ایسے قوانین کے ماتحت ہوتی ہے جو انسان کے قابو میں نہیں ہیں۔ لیکن جہانتک انسان کو اختیار ہے اُس اختیار میں مرد اور عورت یکساں شریک ہیں، اور شاعر نے اگر عورتوں کو آئین حیات کا محافظ تصور کیا تو بیجا نہیں۔ ایک نسل سے دوسری کا تعلق انہیں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور وہ اس تعلق کو جو حیثیت چاہیں دے سکتی ہیں۔ قوم کی اصلاح بھی اسی وجہ سے عورتوں کی اصلاح پر منحصر ہے کیوں کہ جو اثر وہ قبول کریں مشکل سے قوم میں دیرپا ہو سکتا ہے۔ انکی طبیعت میں قرار اور استقلال بھی مردوں سے زیادہ ہوتا ہے، اور برے اثرات اُن تک سرایت کر جائیں تو انکا دور کرنا بھی نسبتاً دشوار ہوتا ہے۔ یورپ میں مردوں اور عورتوں کی باہمی زندگی کی جو صورت ہے وہ کسی ڈراما نویس کے لئے عورتوں سے قطع نظر کرنا ناممکن بنا دیتی ہے، مگر ابسن نے انہیں اپنی تصانیف میں خاص اہمیت دی ہے، اور زندگی کے ان پہلوؤں پر جو عورتوں سے متعلق ہیں، بہت روشنی ڈالی ہے۔ "گڑیا کا گھر" ہمارے نزدیک ابسن کے سب سے کامیاب ڈراموں میں سے ہے، اور جو شخص اس کی تعلیم کو ذہن نشین نہ کرے وہ عورتوں کی کبھی عزت نہیں کر سکتا۔ اور اُس سے انکا حق کبھی ادا نہ ہوگا۔

عورت کو گڑیا تصور کرنا ابسن کے زمانہ یا یورپ ہی میں زندگی کی خصوصیت نہیں ہے "عورت"

کے کئی مفہوم ہیں، جن میں سے "گڑیا" بھی ایک ہے، اور ابسن نے اس کی طرف توجہ اس وجہ سے دلائی ہے کہ بہت سی عورتیں خود گڑیا بننا اور گڑیا کی زندگی بسر کرنا اپنی ہستی کا اصل مقصد سمجھتی ہیں، اور جو مرد اُن کی طبیعت پر تسلط کرنا چاہتے ہیں وہ انہیں بڑی آسانی سے اس وہم میں مبتلا رکھ سکتے ہیں۔ مگر انسانیت کا تقاضہ کچھ اور ہے، اور جس عورت نے اپنے فرائض محسوس نہ کئے وہ محض ایک گڑیا ہے اور اس کی ساری زندگی انسانیت کی تباہی کا ایک دردناک منظر۔ ابسن نے "گڑیا کے گھر" میں ایک ایسی عورت کی تصویر کھینچی ہے جو گڑیا بننے کے لئے بچپن سے تیار کی گئی تھی۔ شادی کے بعد وہ آٹھ برس تک گڑیا بنی رہی اور خوب شاد آباد رہی۔ پھر کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ اُسے تھوڑی دیر کے لئے انسان بننا اور انسانی فرائض ادا کرنے ہوئے مگر یہ تبدیلِ ماہیت اُس کے شوہر کو بہت ناگوار گذری، دونوں نے اپنا فلسفۂ زندگی واضح کر دیا، جس کا یہ انجام ہوا کہ گڑیا نے انسان بننے کے لئے گھر بار عیش و آرام، شوہر اور بچوں کو خیر باد کہا، اور اندھیری رات میں اپنی گذشتہ زندگی پر دروازہ بند کر دیا۔

"گڑیا" کے شوہر پر اُس کا اس طرح سے چلا جانا بہت شاق گذرتا ہے، اور ڈراما کے پڑھنے والے کو بھی تعجب ہوتا ہے کہ خیالات کی تبدیلی "گڑیا" کو ایسے سخت رویہ پر مجبور کرتی ہے۔ ابسن کا مطلب اصل گڑیا اور عورت کا فرق دکھانا ہے۔ حضرت عیسٰی نے کسی زمانہ میں اپنے پیرووں سے کہا تھا کہ "جب تک تم دوبارہ پیدا نہ ہو، تم جنت میں داخل ہونے کے لائق نہیں بن سکتے۔" ابسن ہر گڑیا کو بتانا چاہتا ہے کہ جب تک وہ غربت اور تنہائی کے مرحلے طے نہ کرلے، اور اپنی پچھلی زندگی کی یادگار، پرانی محبتیں، پرانے رشتہ بالکل مٹا نہ دے، وہ گڑیا رہے گی اور عورت نہیں بن سکتی۔ اس لئے جب اسے قطعی احساس ہو کہ وہ ایک گڑیا سمجھی جاتی ہے تو اُس کا فرض ہے کہ عورت بننے کے لئے وہ ہر چیز قربان کر دے کیونکہ انسانیت ایک ایسا بے بہا جوہر ہے کہ اس کے عوض میں جو دولت بھی قربان کی جائے کم ہے۔

ہماری زندگی میں عورتوں کا دخل اس قدر کم ہے کہ گڑیا اور عورت میں فرق کرنا یا عورت کو انسان بننے کی ترغیب دینا کچھ بے معنی، لاحاصل سا معلوم ہوتا ہے، اور اگر انسان بننے کی

شرط یہ ہے کہ عورت اپنے گھر بار کو چھوڑ کر تجربہ حاصل کرنے کے ارادہ سے نکل کھڑی ہو۔ تو وہ گڑیا، کے شوہر کی طرح ہم میں سے اکثر حیرت اور افسوس میں دیوانے ہو جائیں گے۔ اور عورتوں پر یہ الزام لگائیں گے کہ وہ انسان بننے کے بہانے سے اپنے فطری فرائض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔ مگر ابسن کی یہ ہرگز تعلیم نہیں ہے کہ عورتوں کو امور خانہ داری یا اولاد کی پرورش سے کنارہ کش ہو جانا چاہئے۔ ان فرائض کا پورا کرنا مرد اور عورت کی باہمی زندگی کی شرط ہے۔ مگر عورت کو یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اس نے گھر کا انتظام کر لیا اور بچے پیدا کر لئے تو اس نے اپنی انسانیت کا حق ادا کر دیا۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ مرد اور عورت کی باہمی زندگی کا ایک نصب العین ہو جس کی تمنا دونوں کے دلوں میں یکساں ہو۔ وہ تو ایک ہی کوشش میں مصروف ہوں اور ایک دوسرے کی ناگذیر ہونے کا اقرار کریں۔ دونوں کو اپنا ضمیر بیدار رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ انسانیت ایسی دولت ہے جو بہت آسانی سے گم ہو جاتی ہے۔ اور اس کا گم ہونا ہر مصیبت سے بدتر ہے۔ ابسن گڑیا کا گھر وندا صرف اس ارادہ سے توڑتا ہے کہ اس کی جگہ پر عورت اپنا گھر بنا سکے، اور اسے اپنی انسانیت کی رونق سے منور کرے۔

ابسن کے بلند حوصلہ کو دیکھ کر جب ہم اس کے ہندوستانی قدر دانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں کچھ مایوسی ہوتی ہے "گڑیا کا گھر" ایسی تصنیف ہے جسے قومی اصلاح کا محرک بنایا جا سکتا ہے، عورتوں کے لئے ایک آئینہ جس میں وہ اپنے اصل اور لازوال حسن کا مشاہدہ کریں، مردوں کے لئے ایک حقیقت نما تصویر جس سے وہ ساری زندگی کے لئے عبرت اور سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے ناشرین کو اس سے محض ادبی دلچسپی ہے، وہ اس کی اخلاقی تعلیم اور فلسفیانہ نظریوں میں نہیں الجھنا چاہتے۔ اسی خیال سے غالباً ڈراما کا "مشرقی چربا" بھی اتارا گیا یعنی اشخاص کے نام بدل دئے گئے کہ ہندوستانی پڑھنے والوں کو کسی طرح کی دشواری نہ ہو۔ اور وہ بحیثیت ڈراما اور ادبی کارنامے کے "گڑیا کے گھر" کا پورا لطف اٹھا سکیں۔ یہ طریقہ ہماری رائے میں غلط ہے۔ اگر ہندوستانی پبلک کی واقفیت بڑھانا مقصود ہے تو ہمیں چاہئے کہ یورپین ماحول کی خصوصیات سمجھائیں اسے

کسی طرح سے بدلنے یا اپنانے کی کوشش نہ کریں، اس لئے کہ ایسی تبدیلیوں سے اُس کی شخصیت جاتی رہتی ہے، اور شخصیت کے ساتھ تاثیر بھی۔

بہرحال ”گڑیا کے گھر“ کے مترجم نے ہندوستانی پبلک اور ابسن کی جو خدمت کی ہے اُسکا ہمیں شکرگذار ہونا چاہئے۔ یوروپین ادب کے جو نمونے ہماری پبلک تک ترجموں کے ذریعہ سے پہونچتے ہیں اُن سے کسی صاحب ذوق کو تسلی نہیں ہو سکتی، اور یہ نہایت قابل تعریف بات ہے کہ عبدالشکور صاحب نے ہماری پبلک کو مغربی ادب کی ایک واقعی بلند پایہ تصنیف سے مستفید ہونیکا موقع دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالج کی مجلس ادبیہ اس قسم کی مطبوعات کا سلسلہ جاری رکھے گی، اور اُن ہندوستانیوں کو جو یورپ نہیں جا سکتے ادبی تصانیف کے ذریعہ سے یورپین زندگی کی سچی اور پرمعنی تصویریں دکھاتی رہے گی۔

ناشر: شیخ عبدالرشید صاحب ایم۔ اے۔ ال ال بی۔ علیگڈھ

شذرات

ایک سال سے کچھ ہی زیادہ ہوا ایک نوجوان بادشاہ ہمارے ملک سے گذرا تھا۔ وہ جس ملک کا تھا وہ کچھ بہت بڑا ملک نہیں بہت مالدار ملک بھی نہیں اور چند سال پہلے تک اس کی کوئی سیاسی حیثیت بھی نہ تھی۔ صرف دو بڑی اور رقیب سلطنتوں کے بیچ میں ہونیکی وجہ سے وہ کبھی ایک کا سہارا لیتا تھا کبھی دوسری کا۔ اسے اپنے پڑوسیوں سے روپیہ ملتا تھا۔ اور اس روپیہ کے عوض وہ اپنی سیاسی خود مختاری کے اعلان سے باز رہتا تھا، اس چھوٹے سے غریب، کوہستانی ملک کے تخت پر ایک نوجوان متمکن ہوا، جس کا اس پر متمکن ہونا معمولی حالات میں ممکن نہ ہوتا۔ اس کے عہد میں اس غریب ملک نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سے ایک چھوٹی سی جنگ کی اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ملک میں جو تھوڑی بہت بے چینی پیدا ہوئی وہ بھی نہایت خوش اسلوبی سے رفع کر دی گئی۔ اور بالآخر حالات میں اس قدر یکسوئی پیدا ہوگئی کہ اس نوجوان بادشاہ نے اپنے ملک کو چھوڑ کر ساری دنیا کے سفر کی ٹھانی۔ اس سفر میں وہ ہمارے ملک سے بھی گذرا۔ یہاں اسکا استقبال جس خلوص سے کیا گیا بہت کم کسی کا کیا گیا ہوگا۔ اس سے زیادہ شان وشوکت کے استقبال تو اس ملک نے بہت دیکھے تھے۔ ایسے پرخلوص بہت کم۔ اس لئے کہ یہ نوجوان صرف بادشاہ نہ تھا، آدمی بھی تھا۔ لوگوں نے اسے لاکھوں کے مجمع میں راہ نکالنے کو اپنی کہنیاں استعمال کرتے بھی دیکھا۔ ایک لڑکے کو قرآن پڑھتے سنکر زار زار روتے بھی دیکھا۔ لاکھوں کے بے ترتیب وبے نظم مجمع میں لوگوں کے ایسے تہنیت نامے بھی قبول کرتے دیکھا جن کے مفہوم کی اطلاع تک اس کے بے خبر سفیر نے اسے نہ دی تھی۔ اپنے ایک ہمراہی سے پنسل مانگ کر کاغذ کے ایک پرزہ پر سب تہنیت ناموں کے نوٹ لکھتے بھی دیکھا اور فی البدیہہ تقریر کرتے بھی سنا۔ ایک مجمع میں جہاں لوگ کچھ چپ چپ تھے اس نے تکبیر کے نعرے بھی لگوائے۔ بمبئی کی جو پاٹی پر اس نے مہاتما گاندھی

مذہب کی فضا سے علیحدہ کر لیا تھا اور ابھی کسی دوسری تمدنی سرزمین میں انکی جڑیں مضبوطی سے قائم نہ تھیں۔ اور کیسے ہوتیں؟ تمدنی روایات نہ ایک دن میں بنتی ہیں اور نہ ایک دن میں منتقل ہوتی ہیں۔ کچھ ان مصاحبوں، اور مشیروں کا اثر، یہ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی یورپ کی مادی مرفہ الحالی نے اس نیک دل اور اپنی قوم کے عاشق بادشاہ پر یہ اثر ڈالا کہ میری قوم بھی اگر دنیا میں بڑھنا چاہتی ہے تو اسے اس قسم کی مادی ترقی کرنی چاہئے۔ اس کی رگوں میں جوان خون تھا اس نے ان مشیروں کی بات مان لی خود اپنے تاثرات سے مغلوب ہو گیا اور اپنے ملک کو ایک جنبش قلم سے ایک جدید، اور متمدن ملک بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ جدت کے اس شوق نے اس کی نظر کو قوموں کے عروج کی عمیق حقیقتوں اور اخلاقی و مذہبی قوتوں کی طرف سے ہٹا دیا اور ظاہری تبدیلیوں کو غیر ضروری اہمیت دلا دی۔ "تمنا کی بے تابی" میں وہ بھول گیا کہ "عاشقی" بہت "صبر طلب" چیز ہے۔ قوم میں قدامت پرستی کے جو عناصر تھے۔ اس میں بہت سے برے اور تھوڑے ہی سے اچھے سہی، لیکن وہ سب مجتمع ہو گئے اور انہوں نے جدت پسندی کی اس قوت کو ایک مرتبہ تو ضرور شکست دیدی اب یہ نوجوان بادشاہ اپنے پایہ تخت سے دور پڑا ہے اور دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کر رہا ہے۔

یہ ہمارے ہمسایہ ملک افغانستان کا قصہ ہے۔ قدامت پرست خوش ہیں کہ جدت پسندی نے منہ کی کھائی۔ لیکن ابھی یہ خوشی ذرا قبل از وقت ہو اس سے کچھ آگے ایک ملک ترکی بھی ہے جس میں قدامت پرستی ایسی ہی منہ کی کھا چکی ہے۔ اس لئے اس معرکہ کی فتح و شکست کو اتنی اہمیت اس وقت نہیں جتنی خود اس معرکہ کی حقیقت کو ہے۔ اس لئے کہ یہ معرکہ ترکی و افغانستان تک محدود نہیں۔ یہ تمام ایشیا اور افریقہ میں نہیں ساری دنیا میں ہو رہا ہے اور ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے تعجب اس پر ہے کہ دنیا نے اپنی ساری تاریخ سے اس کے متعلق دو ہی عملی سبق نہیں لیا۔ اور ہمیشہ پچھلی غلطیوں کی تکرار ہوئی۔

قوموں اور جماعتوں کی زندگی اور اجسام نامی کی حیات میں بڑی شابہت ہو۔ باشعور نامی اجسام کی زندگی سے ہمیں جماعتی زندگی کے اس معرکہ کے متعلق کچھ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ کوئی باشعور نامی جسم اپنی حالت پر ایک لمحہ بھی قائم نہیں رہتا۔ تغیرات کا جلوہ گاہ ہوتا ہے اور ہر لمحہ یہ جسم پہلے لمحہ سے مختلف ہوتا ہے لیکن کیا اس وجہ سے اس کی شعوری زندگی کا مسلسل اور اس کی توحید قائم نہیں رہتی۔ اس موخرالذکر تسلسل و توحید کے ختم ہوتے ہی زندگی ختم ہوجاتی ہے یا کم از کم صحت کی زندگی۔ ماضی کو حال سے مربوط رکھنے اور استقبال کے لئے ان دونوں سے کام لینے تک ہی صحیح زندگی کا قیام ہے۔ قومیں اور جماعتیں بھی اپنی زندگی کے لئے اس تسلسل کی دست نگر ہیں۔ یہ "نفسہائے رسیدہ" ہی سے زندہ اور حفظ ناموس کہن سے باقی رہتی ہیں۔ یہ رشتہ ٹوٹا اور ان کا شیرازہ بکھرا۔

حیاتیات اور تاریخ دونوں کا سبق یہی ہے کہ جس طرح تغیر انفرادی اور قومی زندگی کا لازمہ ہے اسی طرح قدامت پسندی بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ ان دونوں میں صحیح تناسب قائم رکھنا قاید کا کام ہے۔ جب قدامت پسندی پرانے اداروں، پرانے معیاروں، پرانی قدروں کو بے جان بنا دیتی ہے اور ان کو محض منوانے کی خاطر منواتی ہے اس وقت قاید کا کام یہی نہیں کہ وہ نئی قدریں، نئے معیار، نئے ادارے پیدا کر دے۔ اس لئے کہ نئی قدریں ہیں کہاں! کون معیار ہے جسے انسان نے استعمال نہ کیا ہو؟ کون ادارہ ہے جس کی آزمائش نہ ہو چکی ہو؟ قائد ان قدیم قدروں کو زندہ کر دیتا ہے۔ اپنے دل کی گرمی سے ان اداروں کے مردہ دل پجاریوں کے دل بھی گرما دیتا ہے اور اپنے سینہ کی آگ سے وہ روحانی اور اخلاقی عناصر تیار کرتا ہے جن کے بغیر قومی ترقی اور ملی فلاح کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتے

ترکی اور افغانستان دونوں کے بظاہر متضاد حالات میں ہمیں یہ مایوس کن حقیقت

دکھائی دیتی ہے کہ اگر ایک جگہ چند ظاہری تبدیلیاں کامیابی سے کر لینے کو حیات قومی کی تجدید سمجھا جا رہا ہے تو دوسری جگہ دنیاوی اور دینی رہزنوں کی کامیابی کو دین و مذہب کی فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نہ ترکی میں جدت پسندی کی فتح ہوئی ہے اور نہ افغانستان میں دین کی۔ نہ وہاں وہ ذہنی انقلاب ہوا ہے جس کے بغیر ساری جدت پسندی محض اتھلی نقالی ہے، نہ یہاں دین کی وہ سچی تعبیر ہے جو دنیا کی زندگی کے لئے بھی کافی ہو اور حیات قومی کے نشو و ارتقا کی راہ بتائے۔ وہاں تعیش کی فتح ہے، یہاں تعصب کی۔

یہی قوتیں ہمارے دروازوں پہ بھی معرکہ آرا ہیں۔ کیا یہاں بھی نتیجہ ایسا ہی یکطرفہ ہوگا جیسا ترکی میں ہوا، یا جیسا کہ افغانستان میں ؟ ربنا! اھدنا الصراط المستقیم۔

مطبوعات مکتبہ جامعہ

تاریخ الامت مصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ صحیح تاریخی اصول اور تحقیق و تنقید کے ساتھ اردو میں پہلی بار شائع ہوا ہے، اس کے مطالعہ سے ہر شخص نہایت آسانی سے مسلمانوں کے تاریخی کارناموں سے واقف ہو سکتا ہے۔ جامعہ ملیہ اور صوبہ متوسط و برار کے محکمہ تعلیم نے اسے اپنے مدارس کے لئے بھی پسند کیا ہے۔ اب تک ذیل کے حصے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) حصہ اول سیرۃ الرسول . . . . عہ
(۲) حصہ دوم خلافت راشدہ . . . . عا/
(۳) حصہ سوم خلافت بنی امیہ . . . . عہ
(۴) حصہ چہارم خلافت عباسیہ جلد اول . . . عا/
(۵) حصہ پنجم " جلد دوم عا/
(۶) حصہ ششم عباسیہ مصر عا/

تاریخ فلسفہ اسلام۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی (برلن) ہالینڈ کے مشہور فلسفی اور مستشرق ٹی۔ جے۔ ڈی بور کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ۔ تاریخ فلسفہ اسلام پر اردو میں یہ پہلی قابل قدر کتاب ہے قیمت عہ

ذکری۔ تفسیر پارہ عم۔ مصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاذ تفسیر جامعہ سلسلۂ تفسیر "الفرقان فی معارف القرآن" کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں پارہ عم کی تفسیر خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں امت اسلام کے سامنے پیش کی ہے قیمت ...

عبرت۔ تفسیر سورۂ یوسف سلسلۂ تفسیر کی دوسری اہم جلد جس میں احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نہایت خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ واقعات کی عبرت انگیز نتائج کو بہت موثر طریقہ پر پیش کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد . . . . . . عہ

برہان۔ سورۂ نور کی مکمل اور مبسوط تفسیر نہایت پر زور اور دلکش طرز تحریر۔ قیمت . . . . عہ

تاریخ الدولتین۔ اس کتاب میں خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے حالات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان کی تصنیف ہے جسے مولانا نیاز فتحپوری نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ دہلی

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۳	بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۹ء	جلد ۱۲

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
۱۔ گیارہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں علوم صحیحہ کی حالت	ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے پی ایچ ڈی	۲
۲۔ افسانہ نویسی	پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)	۲۰
۳۔ سلطان سلیمان اعظم قانونی	مولانا اسلم جیراجپوری	۳۲
۴۔ ترکی قوم پرستی اور اتحاد تورانی	خالدہ ادیب خانم مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ایم۔ اے پی ایچ ڈی	۴۱
۵۔ خانصاحب (افسانہ)	پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن)	۵۱
۶۔ اقتباسات		۶۵
۷۔ تنقید و تبصرہ		۷۲
۸۔ شذرات		۷۶

گیارہویں صدی عیسوی

کے نصف اوّل میں

علوم صحیحہ کی حالت

یہ عہد قرون وسطیٰ کی علمی ترقیوں کے لئے معراج کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں متعدد جیّد حکماء نظر آتے ہیں اور پہلے پہل مورخ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں سے کس کو افضل قرار دے' ابن یونس' 'ابن سینا' 'ابن الہیثم' 'البیرونی' 'علی ابن عیسےٰ الکرخی' ابن جابر الاندلسی' یہ سب اپنے اپنے فن کے امام ہیں۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام حکماء میں سب سے ممتاز 'البیرونی' اور 'ابن سینا' ہیں۔ انہیں دونوں کی بدولت یہ عہد علمی تاریخ کا زرین عہد بن گیا۔ ان دونوں حکما میں باہم ملاقات تھی مگر انکی طبیعتوں میں بے حد فرق تھا، البیرونی' منچلا آدمی تھا اور نقادانہ انداز رکھتا تھا اور ابن سینا' ترکیب و امتزاج کا بادشاہ تھا۔ 'البیرونی' میں نئے حقائق کی دریافت کا مادہ زیادہ تھا، اس لئے وہ ہمارے زمانے کے سائنس داں کے نصب العین سے زیادہ قریب ہے؛ ابن سینا' کا نمایاں جوہر ترتیب و تنظیم' قاموس نگاری اور فلسفیانہ غور و فکر ہے۔ مگر دونوں سائنس کی دیوی کے سچے پجاری تھے اس لئے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی کافی وجہ نہیں ہے۔ البتہ جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں 'البیرونی' کی عمر کا زیادہ حصہ گذرا ہے اس لئے ہم اس دور کو اس کے نام سے منسوب کر سکتے ہیں۔ ابن سینا کی عمر گیارہویں صدی کے پہلے سال میں بیس برس کی تھی اور اس

نے ۱۰۳۷ء میں وفات پائی۔ مگر البیرونی ۱۰۰۰ء میں ۲۷ برس کا تھا۔ اس کی پہلی اہم تصنیف آثار الباقیہ، اسی سال تکمیل کو پہنچی اور وہ ۱۰۴۸ء تک زندہ رہا اس لئے گیارہویں صدی کے نصف اول کو 'البیرونی' کا عہد کہنا ہر لحاظ سے مناسب ہے۔

فلسفیانہ بنیاد | اس زمانے میں علم کا مرکز لاطینی ممالک کے مغربی حصے سے ہٹ کر عرب اور اندلس، یا یوں کہئے کہ مسیحی دنیا سے سرک کر اسلامی دنیا میں قرار پا چکا تھا۔ اسکی صریحی دلیل یہ ہے کہ ان حکما کے مقابلے میں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے مسیحی دنیا میں صرف 'نوٹکر لیبیو (Notkar Labeo) نظر آتا ہے۔ یہ شخص 'سینٹ گال' کے علمی مذہب کا سب سے ممتاز نمائندہ تھا اور اس نے فلسفے کی بہت سی کتابوں کا لاطینی سے جرمن میں ترجمہ کیا۔ اگرچہ جو علوم اس کی بدولت جرمن زبان میں منتقل ہوئے انکی کسی نے علمی مذاق کی کمی کے سبب سے قدردانی نہ کی لیکن اس کی خدمات بہر حال قابل ستائش ہیں۔

یہودیوں کا علمی معیار مسیحیوں سے بہت بلند تھا کیونکہ انہیں مسلم حکما کی جید تصانیف سے براہ راست فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل تھا، سچ پوچھئے تو یہودیوں کے فلسفیانہ خیالات اس زمانے میں ہر لحاظ سے وہی تھے جو مسلمانوں کے؛ آزاد خیال یہودی معتزلہ کے اثر میں تھے اور قدامت پرست یہودی مسلم فقہا کی قدامت پرستی سے استفادہ کرتے تھے۔ اس میں انہیں بڑی سہولت یہ تھی کہ انکا تعلیم یافتہ طبقہ عبرانی کے ساتھ عربی زبان سے بھی واقف تھا بلکہ وہ خود عموماً اپنی کتابیں عربی ہی میں لکھتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے سب سے بڑے یہودی فلسفی ابن جابر الاندلسی نے جو یہودیوں کا افلاطون کہلاتا ہے، اپنی مشہور کتابیں ینبع الحیات وغیرہ عربی میں تصنیف کیں مسیحی سولاسطی جس حد تک اس اندلسی یہودی کے خیالات سے متاثر ہوئے خود اپنے ہم مذہبوں کے خیالات سے بھی نہیں ہوئے تھے۔ ابن جابر الاندلسی کی

تصانیف نے مخلوط یونانی اسلامی فلسفے کو مسیحی دنیا تک پہنچانے میں اہم ترین واسطے کا کام دیا ہے۔

ایران میں یہ دور ادبیات کی ترقی کا ہے۔ ۱۰۱۰ء میں فردوسی نے اپنا قومی رزمیہ "شاہنامہ" مکمل کر لیا تھا۔ اس عظیم الشان نظم کی اشاعت تاریخ تمدن میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

اس کا مطالعہ نہ صرف اس عہد کے ایران کے سمجھنے کے لئے بلکہ ایرانیوں کی آئندہ ذہنی نشوونما کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ بغیر شاہنامے کو پڑھے، ایران کی ذہنی زندگی کو سمجھنا اسی طرح ناممکن ہے جیسے بغیر "ہومر" کی "ایلیڈ" کو پڑھے ہوئے۔ یونانی تمدن کو سمجھنا یا بغیر ڈانٹے کی ڈوائن کامیڈی Divine Comedy کو پڑھے ہوئے اطالیہ کی تہذیب کو سمجھنا۔

اب تک ہم نے جن فلسفیانہ خیالات کا ذکر کیا ہے وہ بجائے خود کافی اہمیت رکھتے ہیں تاہم اسلامی فلسفے کے مقابلے میں ان کی حیثیت محض ایک دیباچے کی ہے۔ اسلامی ممالک میں فلسفے کا رواج ڈھائی سو سال سے تھا اور اب اس میں بڑی زبردست ترقی ہو چکی تھی۔

مسلمانوں میں اس عہد میں، چار حکیم تھے، جو وسعت معلومات کے لحاظ سے تمام دنیا میں اپنا مدمقابل نہ رکھتے تھے۔ مصر کا ابن الہیثم، ایران کے، البیرونی، اور ابن سینا، اور اندلس کا، ابن حزم، "ابن الہیثم" میں فلسفیانہ گہرائی ان سب سے کم تھی لیکن علمی تجربے میں جو سلیقہ اسے تھا، اس کی مثال سارے قرون وسطیٰ میں کہیں نہیں ملتی "البیرونی" اور "ابن سینا" کی اہمیت کا ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔ "البیرونی" کی وقعت قدردانان سائنس کے دل میں اس کی بے تعصبی، اس کی علمی تلاش وجستجو اور اسکی ہمت کے سبب سے ہے۔ مثلاً وہ پہلا مسلمان تھا، جس نے

ہند و فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اور دنیا کے دو بڑے تمدنی خطوں یعنی دنیائے اسلام اور ہندوستان کے درمیان واسطہ بنا۔ ابن سینا، ذہانت میں اُس سے کم نہ تھا، البتہ اُس میں باہر کے خیالات کو قبول کرنیکی صلاحیت کم تھی، کیونکہ اُس کا اصلی کام نئی معلومات حاصل کرنا نہ تھا بلکہ پرانی معلومات کو ترتیب دینا اور نظام بنانا۔ اُس کی تصانیف میں اسلامی فلسفہ، جو ارسطو کی روایات کا افلاطونیت اور مذہب اسلام سے امتزاج کرنا چاہتا تھا، معراج کمال کو پہنچ گیا۔ یہ یاد رہے کہ ابن سینا محض فلسفی نہ تھا بلکہ سائنس میں بھی ذہن خلاق رکھتا تھا اور اُس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ایک جامع قاموس یا معلم مرتب کرے۔ برخلاف اس کے اندلسی ابن حزم، محض فلسفی بلکہ عالم دین تھا۔ اس کا ذکر سائنس کی تاریخ میں محض اس بنا پر کرتے ہیں کہ اس کے خیالات نے مغربی دنیا پر بہت وسیع اثر ڈالا ہے۔

لاطینی، انگریزی، اسلامی اور ہندو ریاضی اور ہیئت

اس زمانے میں ہمیں لاطینی کتابوں میں ریاضی خیالات کا ایک چھوٹا سا چشمہ نظر آتا ہے جو روز بروز بڑھتا جاتا ہے لیکن اس میں دریا کی وسعت عرب کے سحاب کرم سے دو سو سال تک فیضیاب ہونیکے بعد تیرھویں صدی میں جا کر پیدا ہوتی ہے۔ زیر بحث عہد میں سوئٹزرلینڈ کے " نوٹکر لیبیو"، ہالینڈ کے اڈیبولڈ" Adebold اطالیہ کے گوئیڈو Guido اور انگلستان، کے بائرٹ فرتھ Byrhtferth کی کوششوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ انہوں نے جربرٹ، کی روایات کو زندہ رکھا۔

اسکے مقابلے میں جب ہم اسلامی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شب تاریک سے روز روشن میں یا عالم خواب سے عالم بیداری میں پہنچ گئے۔ آسانی کے لئے ہم مسلم ریاضی دانوں کی تقسیم تین طبقوں میں کرتے ہیں:- اندلسی، مصری، مشرقی۔ نفس امر کے لحاظ سے بھی یہ تقسیم صحیح ہے، کیونکہ باوجود اس کے کہ اسلام کی عالمگیری نے

آمد و رفت میں سہولت پیدا کردی تھی، مقامی حالات کے اثر سے ان خطوں کی ذہنی فضا میں اختلاف تھا۔

اندلس کے ریاضی دانوں میں کوئی اہم شخصیت نظر نہیں آتی۔ الکرمانی سے 'اخوان الصفا' کے ریاضی خیالات اندلس میں رائج کئے؛ 'ابن السمح' نے تجارتی ریاضی اور ہندسے وغیرہ پر رسائل لکھے۔ اُس نے اور 'ابن الصفار' نے 'اصطرلاب' کا استعمال سکھایا اور ہندی 'سدھانتا' کے اصول پر ہیئت کے نقشے ترتیب دیے۔ اس زمانے کا سب سے بڑا ہیئت داں اور ہندسہ مثلث کا سب سے بڑا ماہر قاہرہ کا 'ابن یونس' تھا، مجموعی حیثیت سے وہ مسلمان ہیئت دانوں میں سب سے ممتاز تھا اور فاطمیہ مصر کی قدردانی کی بدولت اُسے اپنے کام میں بڑی مدد ملی۔ دولت فاطمیہ کے چھٹے حکمراں 'الحاکم' کے زمانے میں قاہرہ میں ایک 'دار الحکمۃ' قائم ہوا تھا اور مامون کے عہد کی اکادمی طرح اس کے ساتھ ایک رصدگاہ بھی تھی۔ 'ابن یونس' نے ان سہولتوں سے بڑا فائدہ اٹھایا اور بعض ثوابت کی صحیح پیمائش کرکے بہت سے ہیئت کے نقشے ترتیب دئے جو اس کے مربی 'الحاکم' کی نسبت سے 'حاکمی نقشے' کہلاتے ہیں۔ اُس نے علم مثلث کی نشو و نما میں کافی حصہ لیا۔ کردی Spherisal مسائل کے نئے حل دریافت کئے اور پہلا Posthal seretical ضابطہ قائم کیا۔ ابن الہیثم، جو الحاکم کے 'دار الحکمۃ' میں اُس کا رفیق کار تھا ماہر طبعیات کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ایک جید ریاضی داں اور ہیئت داں بھی تھا۔ اُس نے یہ عجیب و غریب کوشش کی کہ ہیئتی انحراف اور شفق کی شعاعوں کے طول کی بنا پر کرہ ہوا کی پیمائش کرے اس نے 'الماتی' کی مساوات کو اور اُس مسئلے کو جو اُس کے نام سے مشہور ہے متقاطع مخروطات intersecting Conics کی مدد سے حل کیا۔

مشرق میں ریاضی دانوں کی بڑی کثرت تھی اور اگرچہ اُن میں ابن یونس

کے پائے کا کوئی شخص موجود نہ تھا لیکن اُن کی علمی خدمات کا عام معیار بہت بلند ہے اور
جدت طبع کا ثبوت دیتا ہے۔ ابن لبان کو علم مثلث سے خاص دلچسپی تھی، اُس نے
مماس کے وظیفے tangent function کا گہرا مطالعہ کیا اور ہیئت کے نقشے ترتیب
دئے جن کا تھوڑے ہی دن بعد فارسی میں ترجمہ ہوگیا۔ اُس نے علم نجوم اور علم حساب
پر بھی کئی کتابیں لکھیں۔ 'ابن الحسین' نے یونانی ہندسے کے قدیم مسائل پر غور کیا۔ (مثلاً
مکعب کی تضعیف duplication of acube اور انہیں محض ہندسے کی مدد
سے حل کرنے کی کوشش کی 'ابوالجود' بھی ہندسہ داں تھا۔ اُس نے سالم مسبع اور
متسع regular Pentagon and enneagon کا اور ان مسائل کا خاص طور سے
مطالعہ کیا جو محض مسطر اور پرکار کی مدد سے حل نہیں ہوسکتے؛ اس نے قطوع المخرو
طات Conic sections کے لحاظ سے مساواتوں کی باقاعدہ تقسیم کی کوشش کی
یہ شخص منجملہ ان ریاضی دانوں کے ہے جنہوں نے اس کام کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر
'عمر خیام' نے انجام دیا۔ ان سب میں سربرآوردہ 'الکرخی' تھا جس کا خاص فن حساب
اور جبر و مقابلہ تھا۔ اُس نے متعدد diophantine مسائل حل کئے اور اس کے نئے
سلسلے دریافت کئے۔ اس کی تصانیف میں کئی خصوصیتیں ہیں لیکن سب سے بڑی خصوصیت
یہ ہے کہ اُس نے ہندی ہندسوں کے استعمال سے جان بوجھ کر پرہیز کیا۔ جہاں ہندسوں
کی ضرورت تھی وہاں اُس نے اعداد کے پورے نام حرفوں میں لکھے۔ معلوم ہوتا ہے
کہ وہ ہندوستان کے ہندسے استعمال کرنا اہل علم کی شان کے خلاف سمجھتا تھا 'النسوی'
نے فارسی میں عملی حساب پر ایک کتاب لکھی اور کچھ دن کے بعد اسکا عربی میں ترجمہ
کیا۔ اُس نے ہندی قاعدوں کی تشریح کی اور ان سے مشکل حسابی مسائل میں کام لیا؛
اس میں اس نے ستونی کسور کی جگہ جو ہیئت کی پیمائش میں استعمال ہوتی تھیں کسور
عشاریہ استعمال کیں [illegible] نے بھی علم حساب پر کئی رسائل لکھے اور میراث کے

اُن پیچیدہ مسائل کے حل کرنے کا طریقہ بتایا جو اسلامی فقہ کی دقت پسندی کی بدولت پیدا ہوگئے تھے۔ البیرونی نے ہندوستان کے ہندسوں کی جو تشریح کی ہے وہ قرون وسطیٰ کی بہترین تشریح سمجھی جاتی ہے۔ اُس نے ہیئت کی ایک قاموس لکھی اور ریاضی ہیئت اور نجوم پر ایک عام رسالہ تصنیف کیا۔ وہ ریاضی کی پیچیدہ سے پیچیدہ شقوں سے ذرا بھی نہ گھبراتا تھا اور اس نے اپنے عہد کے سارے دقیق ہندسی مسئلے حل کر ڈالے جو اس کے نام پر " مسائل البیرونی " کہلاتے ہیں۔ اس نے رسم الاجسام (Stereography) کا بہت سہل قاعدہ دریافت کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ابن سینا کو ریاضی کے جزئیات سے ذوق نہ تھا، مگر اس کے فلسفیانہ پہلو سے بہت دلچسپی تھی۔ پھر بھی اُس نے بعض علمی مسائل کے متعلق مفید اشارات لکھے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اگر اُس کی تصانیف کا زیادہ گہرا مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ اس نے اور بھی قابل قدر باتیں دریافت کی ہیں۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ قاموس نگاروں کی تالیف و ترتیب کی خدمات پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ خود انھوں نے جو تھوڑی بہت علمی تحقیق کی ہے اس پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ بہرحال اتنا سب جانتے ہیں کہ ابن سینا نے باوجود کثیر مشاغل کے کسی طرح وقت نکال کر ہیئت کے متعلق متعدد مشاہدات کئے اور علم ہیئت کے فنی پہلو technique کی بہت کچھ اصلاح کی۔

ہم نے حتی الامکان ان مشرقی ریاضی دانوں کا ذکر ترتیب زمانی کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس سبب سے اُنکی علمی جدوجہد کی وسعت اور گوناگونی کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم نے کسی عالم نجوم کا ذکر نہیں کیا۔ علاوہ اس کے ہیئت کے عملی حصے یعنی ضروریات وغیرہ پورا کرنے کے لئے جو کام کیا گیا اس کا بیان بھی ہم نے ترک کر دیا ہے۔ ان چیزوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو مشرقی ممالک میں ریاضی کے دو علیحدہ مذہب ستھے۔ ایک وہ جن پر یونانی رنگ غالب تھا اور جن کے نمائندے

"ابن الحسین"، "ابوالجود"، اور "الکرخی" تھے۔ دوسرا وہ جو زیادہ تر علمی ذوق رکھتا تھا یعنی "النسوی"، اور "ابن طاہر" وغیرہ کا حلقہ۔ "البیرونی"، اور "ابن سینا" کو ہم ان میں سے کسی مذہب میں شامل نہیں کر سکتے اس لئے کہ انہیں دقیق سے دقیق نظری مسائل اور عملی چیزوں سے یکساں دلچسپی تھی اور وہ جزئیات کو نظر حقارت سے نہیں دیکھتے تھے کیوں کہ بڑے دماغ کسی بات کو چھوٹا نہیں سمجھتے۔

ہندوستان میں اس عہد میں صرف ایک ریاضی داں "سری دھر" کا نام ملتا ہے جس نے ریاضی پر ایک ابتدائی رسالہ لکھا۔ مگر اس میں صفر کے تمام حسابی قاعدوں کے متعلق ہندوستان کے ریاضی دانوں کے خیالات نہایت وضاحت سے لکھے ہیں۔ البتہ تقسیم کا ذکر نہیں۔ غالباً مساوات درجۂ ثانیہ quadratic equations کے حل کرنے کا ہندی طریقہ اُسی کا نکالا ہوا ہے۔

لاطینی، انگریزی، شامی، اسلامی چینی، طبیعیات کیمیا اور صنعتی علوم

اس عہد کے لاطینی مصنفوں کی کتابیں زیادہ تر موسیقی پر ہیں۔ مغرب میں اس زمانے میں موسیقی کی ترتیب کا بہت زور تھا۔ غالباً اس میں اسلامی اثر یا کم سے کم اسلامی تحریک کو بڑی حد تک دخل تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس عہد کی لاطینی کتابوں میں جو خیالات نظر آتے ہیں وہ اس سے پہلے مسلم حکماء مثلاً فارابی کے یہاں (دسویں صدی کے وسط میں) نظر آتے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی سائنس کا اثر دسویں صدی سے مغربی ممالک پر موسیقی کے پردے میں پڑنا شروع ہو گیا تھا۔

غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قدیم روایات کی بنا پر جو "فیثا غورث" کے زمانے سے چلی آتی تھیں موسیقی سائنس کا جزو سمجھی جاتی تھی اور جب آگے چل کر (پانچویں صدی کے نصف آخر میں) "مارٹیانس کاپیلا" نے اور (چھٹی صدی کے نصف اول میں) "بوئتھیس" نے اس فن کو علم اربعہ میں شامل کر لیا تو اس کو بڑی تعلیمی اہمیت حاصل

ہوگئی جو عہد جدید کے آغاز سے کچھ پہلے تک باقی رہی۔ اس لیے یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ ہم اپنے تبصرے میں قرون وسطیٰ کی موسیقی پر بھی ایک سرسری نظر ڈالیں۔

زمانہ زیر بحث میں، اڑیٹ کے اڈیبولڈ، نے موسیقی پر ایک رسالہ لکھا لیکن اس عہد کی سب سے اہم اور سب سے مقبول تصانیف ،اریزو کے گوئیڈو، کے قلم سے نکلی ہیں۔ ممکن ہے کہ اُس کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہو لیکن اس کی کتابوں سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی کے آغاز میں مغربی ممالک میں موسیقی خاص ترقی کر چکی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے انگریز نجومی اور عالم جر ثقیل ،مامسبری، کے ،اولیور، نے ایک مینار کی بلندی پر سے مصنوعی پروں کی مدد سے اُترنے کی کوشش کی تھی۔ خدا جانے یہ قصہ کہاں تک صحیح ہے مگر اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پرواز کی خواہش انسانوں کے دل میں ابتدا سے چلی آتی ہے۔

مشہور شامی مورخ ،الیاس بارثینیا، نے عربی زبان میں ایک رسالہ ترازو پہ لکھا۔ اس میں سکوں، وزنوں اور پیمانوں کا مفصل ذکر ہے۔ مختلف قسم کی ترازوؤں اور کانٹوں کا استعمال بتایا ہے۔ مسلمانوں کے [illegible] کا ذکر ،ابن ہیثم، سے شروع کرنا چاہیئے جو اس صدی کے آغاز میں قاہرہ میں رہتا تھا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں میں سب سے بڑا عالم طبیعیات گذرا ہے بلکہ تمام قرون وسطیٰ میں اس علم میں کوئی اسکا ہمسر نہیں تھا۔ ہندسی اور عضویاتی بصریات میں اس نے جو تحقیقات کی ہے وہ عہد قدیم اور سولھویں صدی کے درمیان اپنا مثل نہیں رکھتی۔ اس نے آنکھ کی تشریح اور نظر کی توجیہ میں کمال کیا ہے۔ مسلم سائنس دانوں نے [illegible] کی پیمائش [illegible] مذاق پیدا کر دیا تھا۔ البیرونی نے [illegible] اور دھاتوں کا صحیح وزن نوعی معلوم کیا [illegible] کی رفتار۔ آواز کی رفتار سے بدرجہا زیادہ ہے [illegible]

تمام مسائل کی تحقیقات کی جو اُس کے زمانے میں چھڑے ہوئے تھے، وہ اس نتیجے پر
پہنچا کہ روشنی کی رفتار خواہ کتنی ہی زیادہ ہو مگر محدود ہے۔ اُس کا علم موسیقی کا مطالعہ
خاص طور سے اہم ہے اور اُس زمانے کی لاطینی تحقیقات سے، جس کا ذکر اوپر آچکا
ہے، بہت آگے ہے۔

ماسویہ الماردینی نے جو قاہرہ کے "دار الحکمۃ" میں "ابن الہیثم" کا رفیق کار تھا،
اشیا کو آگ پر جوش دیکر تیل نکالنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ "ابن سینا" کے خیالات علم کیمیا کے
متعلق عام روش سے علیحدہ تھے۔ مسلم کیمیاگروں میں یہ عقیدہ عام تھا کہ دھاتوں پر رنگ
یا ملمع کرنے سے اُنکے خواص بدل جاتے ہیں لیکن "ابن سینا" اس کا قائل نہ تھا، اس
کا خیال تھا کہ دھاتوں کی ماہیت میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک دھات سے دوسری
دھات کا بننا ناممکن ہے۔ الکاثی نے ۱۰۳۴ء میں ایک رسالہ علم الکیمیا پر لکھا۔

چین میں ۱۰۴۱ اور ۱۰۵۰ کے درمیان پی شینگ نے ٹائپ کی چھپائی ایجاد
کی۔ سب سے پہلے مٹی کے ٹائپ بنائے گئے لیکن وہ ناقابل اطمینان ثابت ہوئے۔
پی شینگ نے لکڑی کے ٹائپ سے بھی تجربہ کیا۔

اسی عہد میں ایک چینی حکیم ٹونگ بھی تھا جس نے مختلف قسم کی شراب کشید کرنے
کے متعلق ایک رسالہ لکھا۔ مگر ہمیں اس واقعے کے متعلق پوری تحقیق نہیں، جو حضرات بہتر
معلومات رکھتے ہوں وہ اس کی تردید یا تائید فرمائیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ثابت ہو گا
کہ چین والوں کو شراب کشید کرنے کا طریقہ یورپ والوں سے پہلے معلوم تھا۔

اسلامی تاریخ موالید | البیرونی کی کتابوں میں علوم فطرت کے متعلق بہت سی قابل قدر
معلومات موجود ہے۔ مثلاً اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ پھولوں کی پتیوں میں ایک حد تک باقاعدگی
پائی جاتی ہے۔ نسطوری عالم طبعیات "ابن الطیب" نے علم نباتات کے ایک رسالے
کا عربی میں ترجمہ کیا جو "ارسطو" کی طرف منسوب ہے اور اس کے ساتھ اسی موضوع

کی بعض اور کتابوں کا خلاصہ بھی شامل کر دیا۔

آئس لینڈ والوں کا امریکہ کو دریافت کرنا لاطینی جغرافیہ، اسلامی جغرافیہ، معدنیات اور طبقات الارض

اس زمانے کا سب سے اہم جغرافی واقعہ یہ ہے کہ آئس لینڈ کے جہاز رانوں نے بحر اٹلانٹک کے بعض شمالی امریکی ساحلوں کو دریافت کیا۔

فرانس کے ایک سوانح نگار یعنی فلیوری کے ایموان (Aimoin) نے فرنیک قوم کی تاریخ لکھنا شروع کی جس کے ساتھ ایک جغرافی مقدمہ بھی تھا۔ یہ مقدمہ بجائے خود قابل ذکر نہیں لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس عہد کے مغربی مسیحی ممالک کی جغرافی دلچسپی کا تنہا نمونہ ہے۔

مسلم جغرافیہ دانوں نے نویں صدی میں، اور اس سے بھی زیادہ دسویں صدی میں اس قدر جد و جہد کی تھی کہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ گیارہویں صدی کے نصف اول میں جغرافی علوم کے بارے میں ان پر مقابلتاً جمود کی حالت طاری تھی۔ بیشک اس عہد میں البیرونی، موجود تھا، جس کا شمار دنیا کے سب سے بڑے جغرافیہ دانوں میں کیا جا سکتا ہے، لیکن سوائے اس کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اس نے مختلف پہلوؤں سے جغرافی علوم کی بڑی بڑی خدمات کیں۔ اول تو اس نے اس کے ریاضی عنصر کی نشو و نما میں بڑی مدد دی، علم ہندسہ اور مساحت کی مدد سے پیمائشیں کیں اور بہت سے مقامات کے طول البلد اور عرض البلد معلوم کئے۔ دوسرے اس نے رسم الاجسام کا بہت سہل طریقہ دریافت کیا۔ ہندوستان کے متعلق اس نے جو معلومات جمع کیں وہ علم جغرافیہ کا عظیم الشان کارنامہ ہیں۔ اس نے علم سکون سیالات کے قوانین کے مطابق قدرتی چشموں اور کنووں کے محل وقوع کی توجیہ کی۔ اس کا خیال تھا کہ دریائے سندھ کی وادی غالباً پہلے سمندر کی ایک کھاڑی تھی جو رفتہ رفتہ دریا برآمد مٹی سے بھر کر زمین بن گئی۔

ابن سینا نے معدنیات پر جو رسالہ لکھا تھا وہ یورپ کے مغربی ممالک میں نشأۃ ثانیہ Renaissance کے زمانے تک علم طبقات الارض کی سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی تھی۔

لاطینی، بازنطینی، اسلامی (یاعربی) اور چینی طب | اس عہد میں یورپ کے مسیحی ممالک میں سالیرنو کے طبی مذہب کا ظہور نہایت نتیجہ خیز واقعہ ہے۔ یہ اصل میں بہت پہلے قائم ہو چکا تھا لیکن محسوس نتائج گیارہویں صدی کے وسط کے قریب ظاہر ہوئے اس زمانے میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ عربی کتابوں سے بہت کم درجے کی تھیں، لیکن انکی اہمیت یہ ہے کہ ان سے فن طب کی ایک نئی ارتقاء کا آغاز ہوتا ہے۔

دو بازنطینی طبیب جن کا صحیح زمانہ معین نہیں کیا جا سکتا، غالباً اسی عہد میں تھے۔ ایک تو ڈیمیناسٹس جس نے حاملہ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے متعلق ایک رسالہ لکھا اور دوسرے اسٹیفانوس مگینیٹیس جو ایک قرابادین کا مصنف تھا۔

مگر طب کی اصلی ترقی دیکھنے کے لئے عالم اسلامی پر نظر ڈالنا چاہئے۔ اس عہد میں مسلم طبیب اس کثرت سے تھے کہ یہاں بھی ہمیں اندلسی، مصری اور مشرقی کی تقسیم سے کام لینا پڑے گا۔

اندلس | الکرمانی، کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، وہ ریاضی داں بھی تھا اور جراحی میں بھی کمال رکھتا تھا۔ ابن الوافد، نے ایک رسالہ مفردات پر لکھا، جس کے ایک حصے کا ترجمہ لاطینی میں ابتک موجود ہے۔

مصر | مصر میں چار طبیب خلفائے فاطمیہ کی قدردانی کو دعائیں دیتے تھے۔ ماسویہ المارِدینی نے ایک ضخیم قرابادین لکھی جس کی یورپ میں قرون وسطیٰ میں بہت اشاعت ہوئی۔ صدیوں تک یہ کتاب اس موضوع پر سند مانی جاتی تھی۔ آنکھ کا علاج کرنیوالے مسلم اطبا میں دعّار، جدت خیال کے لحاظ سے سب میں ممتاز تھا لیکن اس کے

مشرقی ہم عصر علی ابن عیسیٰ، کی تصانیف نے اس کی کتابوں کو منسوخ کر دیا، عمار نے آنکھ کے علاج پر جو رسالہ لکھا ہے۔ اسکا جراحیاتی حصہ خاص طور سے اہم ہے۔ تیسرے طبیب ابن الہیثم کا بار بار ذکر آچکا ہے، لیکن یہاں اسکا نام لینا اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس نے عضویاتی بصریات میں قابل قدر تحقیقات کی ہے۔ علی ابن رضوان نے یونانی طب پر متعدد رسائل لکھے جن میں اسکا وہ رسالہ سب سے زیادہ مشہور ہے جو اس نے جالینوس کی کتاب Arsparva پر لکھا تھا۔ اس نے ایک رسالہ مصر کے حفظان صحت پر لکھا، جس کا نام ہے "دفع مضار الابدان بارض مصر" ان میں سے ماسوا یہ عیسائی تھا اور باقی سب مسلمان تھے۔

مشرق | اپنے عصر کا سب سے بڑا طبیب اور دنیا کے بڑے بڑے طبیبوں کا ہمسر ابن سینا تھا۔ اس کی عظیم الشان طبی قاموس یعنی قانون چھ صدی تک نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ مسیحی ممالک میں بھی طب کی سب سے مستند کتاب مانی گئی۔ اسمیں بہت سے نئے مشاہدات بھی تھے، لیکن لوگوں پر اسکا اتنا اثر صرف اس کی ترتیب و تنظیم اور اذعانیت dog matism کے سبب سے تھا۔

ابن الطیب نے یونانی طب کی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ ابو سعید عبید اللہ نے جو بختیشوع کے مشہور خاندان سے تھا، مرض عشق پر ایک کتاب لکھی اور ان فلسفیانہ اصطلاحوں پر تبصرہ کیا جنہیں اطبا استعمال کرتے تھے۔ علی ابن عیسیٰ مسلم علاج العیون Opth almology کی کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس عہد کے تین جید طبیب ابن الطیب، ابو سعید عبید اللہ اور ابن بطلان عیسائی تھے اور بغداد میں رہتے تھے۔ اس سے بغداد کے عیسائیوں کی وفاداری اور مسلمانوں کی رواداری ثابت ہوتی ہے لیکن یہ یاد رہے کہ ان عیسائی طبیبوں سے مسلم طبیب کہیں زیادہ اہم تھے۔

چین میں ۱۰۲۷ء میں "وانگ وائی ٹے" نے جسم انسانی کے دو ڈھانچے تانبے سے تیار کئے تاکہ فن شوکۃ الابرۃ acupuncture یعنی سوئیاں چبھو کر علاج کرنے کا طریقہ سمجھائے۔

جرمن، عبرانی، شامی اور چینی لسانیات

نوٹکر نے لاطینی سے جرمن میں جو ترجمے کئے ہیں وہ لسانیات میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ترجمے جرمن زبان میں علمی اور فلسفیانہ تصانیف کے قدیم ترین نمونے ہیں۔ نوٹکر نے اپنی مادری زبان کو ترقی دینے کی جو کوششیں کی ہیں، اُنکا مقابلہ شاہ "الفریڈ" کی انگریزی کو رواج دینے کی کوششوں سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اُسے اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی الفریڈ کو ہوئی تھی۔ سراغوسہ کے "ابن جناح" نے جو قرون وسطیٰ میں عبرانی لسانیات کا سب سے بڑا ماہر تھا اُس کام کو انجام تک پہنچایا جو دسویں صدی کے نصف آخر میں اندلسی یہودیوں نے شروع کیا تھا۔ قرطبہ کے سموئیل نے بھی صرف و نحو پر کئی کتابیں لکھیں۔

"الیاس بارشینایا" نے، شامی زبان کی صرف و نحو اور ایک عربی شامی لغت لکھی، جو قرون وسطیٰ کی آخری شامی لغت ہے۔

اس دوران میں، چین میں، قاموس نگاری میں بہت ترقی ہوئی۔ چنگ ٹنگ تین نے لوفائن کی صوتی لغت اور کو یہ دانگ کی مفصل لغت پر نظر ثانی کی۔ اب یہ کتابیں جدید تحقیق کا ماخذ ہیں۔ سنگ چی اُس عظیم الشان صوتی لغت "چی یون" کے مدیروں کا صدر تھا۔ جس میں پچاس ہزار سے زیادہ حروف تہجی جمع کئے گئے تھے۔ سنگ چی کے رفیقوں میں ٹنگ ٹو نے اس قسم کی ایک چھوٹی لغت شائع کی۔ جس میں صرف دس ہزار حروف تہجی تھے۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

اختتامی تبصرہ

گیارہویں صدی کے نصف اول کی علمی جدوجہد کا جائزہ لیتے وقت پہلی ہی نظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں اہل جاپان نے کوئی حصہ نہیں لیا، ہندی

اور بازنطینی حصہ بھی قریب قریب صفر ہے، کیونکہ ہندوستان میں اس زمانے میں محض "سریدھر" تھا جو دوسرے درجے کا نحوی تھا اور بازنطینی ممالک میں صرف دو طبیب تھے۔ بلکہ انکا اس عہد میں ہونا بھی محقق نہیں۔ تاریخ علوم میں یہ ہوا ہی کرتا ہے کہ جب بعض قومیں کام کرتی ہیں تو اس وقت دوسری آرام کرتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوع انسانی اس اہم کام کو جو اس کے سپرد کیا گیا ہے، باری باری سے انجام دیتی ہے۔

اس عہد کا اہم کام اصل میں مسلمانوں نے انجام دیا۔ کیسے کیسے جید حکما اس دور میں گذرے ہیں، ابن یونس، ابن الہیثم، الکرخی، البیرونی، ابن سینا، عمار، علی ابن علیٰی، ابن حزم۔ یہی اقلیم علم کے بادشاہ تھے اور یہ سب کے سب مسلم تھے۔ اس زمانہ کا سب سے بڑا شاعر اور ہر زمانے کے بڑے شاعروں کا ہمسر، انسانی زندگی کا جلیل القدر مفسر فردوسی تھا۔

مسلمانوں کے بعد فلسفہ اور سائنس کے سب سے بڑے دو عالم یہودی ابن جابر الاندلسی اور ابن جباح تھے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ عربی زبان یہودیوں کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ بعض مسیحیوں نے بھی مسلمانوں کے علمی کاموں میں ہاتھ بٹایا ہے۔ یہ سب طبیب تھے۔ بغداد میں ابن الطیب، ابوسعید عبید اللہ اور ابن بطلان اور مصر میں ماسویہ الماردینی۔

مسلم حکما میں سے دو یعنی ابن سینا اور البیرونی جو سب کے سرخیل تھے۔ ایران کے رہنے والے تھے۔ ابن طاہر، کوشیا، ابن لبان، ابن الحسین (؟) ابو الجود اور النسوی بھی ایرانی تھے۔

فاطمیوں کی علم دوستی اور قدردانی کی بدولت قاہرہ اس عہد کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا تھا۔ ابن یونس، ابن الہیثم، عمار اور علی ابن رضوان کی جدوجہد کا مرکز یہی شہر تھا۔ بغداد بھی آل بویہ کے زیر حکومت علوم کی ترقی میں کافی حصہ لے رہا

تھا۔ نصر ابن یعقوب، الباقلانی، ابن الحسین (؟) الکرخی، الکاتی، اور علی ابن عیسی عباسیوں کے دار الخلافہ کی رونق کو بڑھا رہے تھے۔ اندلس میں بھی نبو امیہ کی سلطنت اور چھوٹی اسلامی حکومتوں کے سایہ عاطفت میں علمی اور ادبی ترقیاں ہو رہی تھیں مگر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اسلامی اندلس کے تین سب سے بڑے حکما میں سے دو، ابن جابر اور ابن جناح مسیحی تھے، اور صرف ایک ابن حزم مسلم تھا۔ سموئیل یہودی تھا لیکن اور متوسط درجے کے حکما، الکرمانی، ابن السمح، ابن ابی الرجال، ابن الصفّار ابن الوافد، ابن الفراضی اور ابن حیان سب کے سب مسلم تھے

اسلامی دنیا کے مقابلے میں مسیحی دنیا کی علمی خدمات بادی النظر میں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ کتابیں بجائے خود ادنے درجے کی ہوں لیکن انکے اثرات و نتائج بہت اہم تھے۔ ہم امریکہ کی دریافت اور وہاں نوآبادی قائم کرنے سے قطع نظر کرتے ہیں، کیونکہ یہ ایک اتفاقی اور عارضی چیز تھی۔ اور امریکہ کی آخری اور اصلی دریافت میں اس سے کوئی مدد نہیں ملی۔ لیکن سالیرنو کے طبی مذہب کا ظہور اور یورپ کی موسیقی کی ترتیب و تنظیم بہت اہم واقعات ہیں۔ یہ آغاز بالکل ادنے درجہ کا تھا، جیسا ہر آغاز ہوتا ہے۔ لیکن سالیرنو کے مذہب کو اس طویل سلسلے کی پہلی کڑی سمجھنا چاہئے، جو پاسچیور Pasteur پر آکر ختم ہوا۔ اسی طرح حسابی موسیقی کی بے حقیقت ابتدا اس مخصوص مسیحی اور مغربی ارتقائے موسیقی کا پہلا قدم تھا جس سے آگے چل کر بیتھوون Beethoven کے روح افزا نغمے پیدا ہوئے۔

مغربی علمی جدوجہد کے اور پہلو مقابلۃً بہت کم اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا مشاہدہ دلچسپ ہے کہ یورپ کی تدریجی بیداری کسی ایک مرکز تک محدود نہ تھی، بلکہ بہت سے مقامات میں پھیلی ہوئی تھی۔ نوٹکر سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا تھا، ریگمبولڈ کولون کا، تھیٹما ۔ میرسبرگ کا۔ یہ سب جرمن تھے۔ برینس پیرس کا تھا۔

ایموان فلیوری کا۔ یہ فرانسیسی تھے۔ میمبری کا اولیورا اور ریمزے کا بائرٹ فرٹ انگریز تھے۔ اٹرلیشٹ کا اڈیبولڈ اور لی ایچ کا راڈولف ولندیزی تھے۔ ہر ملک میں متعدد علمی مرکز تھے۔ اصل میں ہر خانقاہ، ہر کلیسائی مدرسہ ایک مرکز علم تھا۔ لیکن کوئی مرکز اسلامی مرکزوں بغداد، غرناطہ، قاہرہ، قرطبہ کی شان کا نہ تھا۔ سالیرنو کو آگے چل کر زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ لیکن ایک صدی بعد تک، جب قرون وسطیٰ کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، مسیحی ممالک میں یہی تنہا علمی مرکز تھا جو بین الاقوامی حیثیت رکھتا تھا۔

جاپان کے علمی نشوونما کے عارضی طور پر رک جانے کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ برخلاف اس کے چین میں سنگ خاندان کے بادشاہ چین کے ایک نئے زریں عہد کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے۔ ہم نے متعدد چینی علماء کا ذکر کیا ہے۔ سنگ خاندان کی شان و شوکت کا اثر جاپان میں کچھ دن کے بعد ظاہر ہوا اور وہاں بھی بڑی زبردست علمی جدوجہد شروع ہوئی۔

اگر مختلف علوم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس زمانے میں سب سے زیادہ ترقی ریاضی علوم، ہندسہ، جبرو مقابلہ اور حساب کو ہوئی جس کا سہرا تنہا مسلمانوں کے سر ہے۔ ہیئت میں ابن یونس کے مشاہدات، طبیعیات اور بصریات میں ابن الہیثم کی تحقیقات اور مسیحی ممالک میں حسابی موسیقی کا آغاز اہم ترین واقعات ہیں۔

اسی طرح صنعت میں چینی ٹائپ کی ایجاد، جغرافیے میں امریکہ کی دریافت طبقات الارض میں البیرونی اور ابن سینا کی تصانیف: طب میں سالیرنو کے طبی مذہب کا ظہور، عمار اور علی ابن عیسیٰ کے رسالے علاج العیون پر [illegible] اور ابن

سینا کا قانون۔ لسانیات میں عبرانی اور شامی صرف و نحو کی تکمیل اور چینی لغات۔ ان کے علاوہ تاریخ اور فلسفے پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن کی علمی قدر کا معین کرنا مشکل ہے۔

یہ ہے گیارہویں صدی کے نصف اول یعنی 'البیرونی' کے عہد کی علمی جدوجہد کا ماحصل۔

نوٹ :- یہ مضمون پہلے رسالہ "سائنس" جلد ۱ نمبر ۴ میں شائع ہو چکا ہے۔

افسانہ نویسی

مشہور تو یہ ہے کہ انسان حقیقت سے روپوش ہو کر افسانہ میں پناہ لیتا ہے، جیسے شترمرغ خطرہ دیکھ کر بالو میں اپنا سر چھپاتا ہے، افسانہ جھوٹ مانا گیا ہی، اس لئے کہ وہ حقیقت کو جھٹلاتا ہے، اور شاعری کی طرح افسانہ نویسی بھی ایک فن ہی جسکی خوبیاں یا فوائد مشکوک ہیں، اور برائیاں ایسی واضح کہ انکار کی گنجائش نہیں۔ انسانی زندگی کا مقصد ترقی ہی ایک ایسی حالت سی جب انسان میں غلط اور صحیح، سچ اور جھوٹ کا احساس کم یا کمزور ہو ایک فرضی ذہنی کیفیت کیطرف جو اس کی قوت ادراک اور عقل اور حقیقت بینی کو درجۂ کمال تک پہنچا دے۔ افسانوں کی تصنیف اُن خامیوں میں شمار ہوتی ہی جن پر مہذب انسانوں کو شرمانا چاہیے، جیسے سن رسیدہ لوگ شرماتے ہیں جب اُن سے کوئی بچپنے کی حرکت سرزد ہو۔ لیکن اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ آرٹ، اور اس کے ساتھ افسانہ نویسی بھی، انسان کو اپنی اصلیت سے جدا کرتی ہے، تو ہماری کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی، جس طبیعت میں ذرا بھی شک یا تلون ہو اُس کے لئے مذہبی اختلافات، عام اخلاقی تعلیم کی کوتاہیاں اور مذہبی رہنماؤں کی تنگ نظری اور تعصب میں گمراہی کا سامان موجود ہے، مذہبی، اخلاقی، اور تخیلی دنیا کو عظیم الشان شخصیتوں نے نئے نئے رنگ اور نئی نئی شکلیں دی ہیں، ہم کو اپنی راست بینی پر اتنا بھروسہ نہیں کہ شکل اور رنگ کی پردہ کو ہٹا کر اصلیت کا مشاہدہ کریں، اور یوں حقیقت کی ہر جستجو مخصوص صورت اختیار کرتے ہی خود ایک افسانہ بن گئی ہے، کہنے والا کہہ سکتا ہی کہ آرٹ کو بدنام کرنے والے خود اپنی نیک نامی نہیں ثابت کرسکتے۔

ہر تہذیب اپنی زندگی اور نشوونما کے لئے اصول بناتی ہے جنہیں ہم مذہبی یا اخلاقی

تعلیم کہتے ہیں۔ یہ اصول اپنا مقصد پورا کرتے رہتے ہیں، مگر اس کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ بجائے انسانیت کے مرکب ہونے کے خود اس پر بار نہ ہو جائیں، اور بجائے انسان کو نفس پرستی اور وہم سے آزاد کرنے کے خود اس کی ہتکڑیاں نہ بن جائیں آرٹ کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ تہذیب کی نسبتہً تنگ اور انفرادی ذہنیت میں وسعت اور عالم گیری پیدا کرے۔ اور مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی تاثیر کا امتحان لیتا رہے۔ آرٹ سے امید رکھنا کہ وہ مذہب یا اخلاق کی قائم مقامی کر سکتا ہے بالکل غلط ہے، مذہب اور اخلاق سے یہ توقع رکھنا بھی عبث ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک انسان اور تہذیب کے محرک کا کام انجام دے سکتے ہیں اگر ان میں آرٹ کا خمیر شامل نہ ہوتا رہے، مذہب اور آرٹ کے ادنے شیدائیوں میں ہمیشہ عداوت رہی ہے اور رہے گی، لیکن انکے اعلیٰ نمائندے انکے باہمی تعلق کے راز کو سمجھتے ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک حد سے گذر کر دونوں میں امتیاز کرنا ناممکن ہے۔

آرٹسٹ کو عموماً گمراہ اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ وہ کسی خاص مذہبی یا اخلاقی تعلیم کا پابند نہیں رہ سکتا، اور وہ دوسروں کو بھی ترغیب دلاتا ہے کہ مذہب اور اخلاق کی جائے پناہ سے نکل کر دنیائے جذبات کی سیر کریں، اور اس کے خطروں کا مقابلہ کریں۔ آرٹسٹ کے مشرب میں قطعی فیصلہ کی گنجائش نہیں، سچ اور جھوٹ، اچھے اور برے کا جو معیار مذہب اور اخلاق مقرر کرتے ہیں۔ اسے وہ تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ معیار مقرر کرنے کے لئے نظر کو محدود کرنا ہوتا ہے اور یہ اسے کسی طرح سے منظور نہیں۔ اپنے اصول کی صحت وہ ہمارے سامنے ایسے محل اور موقعے پیش کر کے ثابت کرتا ہے جب ہم اپنے عقیدوں کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور یہ بھی نہیں قبول کر سکتے کہ ہم نے غلط کیا یا برا کیا۔ عالم جذبات میں انسان کے لئے مذہب وہی کام دیتا ہے جو زمین پر اسکا گھر: دونوں کے بغیر اس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی، ہم میں سے

ہر ایک کو ایسے مرحلے نہیں طے کرنے ہوتے جہاں ایمان کی پختگی اور عقیدوں کی سچائی کا امتحان ہو، لیکن آرٹسٹ میں یہ قوت ہوتی کہ نہیں اپنا امتحان لینے پر آمادہ کرے اور اکثر نہیں اقرار بھی کرنا ہوتا ہے کہ جن عقیدوں میں ہم نے پناہ لی ہے، اس عالم بے پایاں میں جو اپنا گھر بنایا ہے اُس کے در و دیوار کمزور ہیں اور ہماری حفاظت نہیں کر سکتے۔

ضمیر کو بیدار، عقیدوں کو زندہ رکھنا آرٹ کا نصب العین ہے۔ اُسکے ہر شیدائی کا حوصلہ اس قدر بلند نہیں ہوتا لیکن آرٹ کے اعلیٰ اور ادنےٰ شیدائی میں فرق نہ کرنا گویا مذہبی معاملات میں پیغمبر اور مولوی کو ایک سا سمجھ لینا ہے، افسوس یہ ہے کہ آرٹ کے مخالفین ہمیشہ اسی بنا پر اپنی رائے قائم کرتے ہیں کہ آرٹسٹ خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے آرٹ کی طرف زیادہ توجہ کرنا اسے اپنی زندگی میں اہمیت دینا مضر ہے، اگر کوئی مولوی تعویذ لکھے، کوئی پنڈت ٹونے ٹوٹکے کی رسمیں سکھائے، کوئی پادری گناہ معاف کرسکنے کا مدعی ہو تو کسی کو اندیشہ نہیں ہوتا کہ قوم کے مذہب یا اخلاق کو نقصان پہنچے گا، لیکن اگر کوئی مصور ایک ننگی عورت کی تصویر بنائے تو سب کو اُس میں تمدنی تباہی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایسے بہت سے آرٹسٹ ہیں جو آرٹ کے نام سے لوگوں میں ہوس پرستی اور شہوت کا چرچا کرتے ہیں، وہ بیشک گمراہ ہیں۔ مگر اُن سے خفا ہو کر ہم کو آرٹ سے بے تعلق یا بدگمان نہ ہونا چاہئے، نہ مولوی پنڈت پادری کی وہم پرستی اور تنگ نظری سے بیزار ہو کر ملحد اور بے دین، ہماری دنیا، ہماری زندگی، ہم تو اعلیٰ اور ادنےٰ کا مجموعہ ہیں جو اعلیٰ اور ادنےٰ میں امتیاز نہ کرسکے وہ انسانیت اور انسانی زندگی کے [illegible]

قصہ کہانیاں سننا اور سنانا آرٹ کی دلچسپ شکلوں میں سے ہے۔ [illegible] عموماً اپنے سامعین کے اخلاق [illegible]

سے سناتے تھے کہ اُن سے عبرت حاصل کیجائے، ادبی اور تمدنی نشو و نما کے ساتھ اخلاقی تعلیم کو اس پیرایہ میں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہتی، داستانوں میں دلچسپی اور لطف کا عنصر بڑھ جاتا ہے، لوگ انہیں اس وجہ سے سُنتے ہیں کہ روزمرہ زندگی کی یکسانیت اور بے مزگی سے رہائی ملے۔ ایسی داستانوں کا کل سرمایہ عشق و عاشقی کے معاملات یا جواں مردی کے کارنامے ہیں، اور یہ منزل اسقدر دلفریب ہے کہ داستان گوئی کا قافلہ اکثر اس سے گذرنے کی آرزو نہیں کرتا۔ ایسی داستانوں سے لطف بھی حاصل ہوتا ہے اور ان میں فن بھی دکھایا جا سکتا ہے، لیکن وہ افسانے اور فن افسانہ نویسی جو یہاں زیر بحث ہیں بالکل اور ہی چیز ہیں، اگرچہ آرٹ کی اسی شاخ میں اُنکا بھی شمار ہوتا ہے۔

افسانہ ہو یا داستان یا ناول، اُسکا سنانے یا لکھنے والا زندگی کی ایک تصویر پیش کرتا ہے جس سے ہم سمجھ لیتے ہیں کہ اُسکا ارادہ عبرت دلانا، ہنسانا اور خوش کرنا یا غور و فکر میں مبتلا کرنا ہے۔ مشرقی ادب میں اس وقت تک ایسی تصویریں زمانہ تہذیب اور معاصر حالات سے بے نیاز رہی ہیں۔ یہانتک کہ اکثر دنیا کا نقشہ بھی بدل گیا ہے اور مشرقی مذاق نے اس بے تکے پن پر اعتراض نہیں کیا ہے، کیونکہ اُسے صرف دلچسپی مقصود رہی ہے اور دلچسپی کے لئے داستان کی تاریخی اور جغرافی صحت شرط نہیں، ہمارے یہاں اگر کسی کو روحانی غذا کی حاجت ہوتی ہے، یا ایسے فلسفۂ زندگی کی جو اُسے مہیا کرتا رہے تو وہ داستان اور افسانہ کیا خود آرٹ سے منہ پھیر کر مذہب یا تصوف کی طرف رُخ کرتا ہے اُسے بالکل توقع نہیں ہوتی کہ شاعر یا افسانہ نویس اُس کے دل میں وہ سکون یا اطمینان پیدا کر سکتا ہے، یا دوسری دنیا میں اُس کے لئے وہ انتظام کر سکتا ہے جس کا دعوےٰ مولوی پنڈت فلسفی اور صوفی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے بجز فن تعمیر کے ہماری تہذیب میں آرٹ کی

کسی شاخ نے وہ نشوونما نہیں پائی جو اُسے اپنے تمدنی مقاصد پورے کرنے کے لئے
درکار ہے۔ اور غالباً اسی وجہ سے کہ یورپ میں مذہب کا شعلہ جلد ٹھنڈا ہو گیا ہم
وہاں فنون لطیفہ کو عروج پر دیکھتے ہیں، مغربی انسان اپنے مذہب سے بدگمان ہو گیا
اس لئے کہ وہ اُس کا بنایا ہوا نہیں تھا، اور اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے دل سے
اُن سوالوں کے جواب پوچھے گا جو دوسرے انسان اپنے مذہب سے پوچھتے رہے
ہیں، مغربی آرٹ، اطالیہ کے پونر جنم سے اس وقت تک، یہی جواب دینے کی کوشش ہے۔
یورپ کے ناولوں اور افسانوں نے اس کوشش میں پوری طرح سے
حصہ لیا ہے۔ عشق کا عنصر حکایت کو لذیذ بنانے کے لئے اکثر ناولوں میں پایا جاتا ہے،
بہت سے اوچھے اور بازاری قسم کے ناول لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے ہیں جن میں
کوئی ادبی یا اخلاقی خوبی نہیں، مگر باوجود اس کے ناول یورپ میں ایک آئینہ کا کام
دیتا ہے جس میں سوسائٹی ہر وقت اپنی کیفیت دیکھ کر اصلاح کی جدوجہد کر سکتی ہے
افراد بھی دوسرے کے تجربے سے سبق حاصل کر سکتے ہیں اور افسانہ ہستی کے مختلف
بیانات سنکر اپنے انجام پر غور کر سکتے ہیں، جب تک افراد تلاش معاش میں مصروف
رہیں اور اُنہیں ایسے لوگوں سے سابقہ نہ پڑے جن کی زندگی نے دوسرا رنگ اختیار
کیا ہے، اُنہیں دوسروں کی تکلیفوں اور جذباتی اور اخلاقی کشمکش کا بھی کوئی احساس
نہیں ہو سکتا۔ یورپ کے ناول، ڈراما اور افسانے ہر صاحب ادراک کو اُس کی
سوسائٹی کی حالت سے آگاہ رکھتے ہیں، اُس کی طبیعت میں بیقراری اور آرزوئیں
اُس کی روحانی زندگی میں وہ ہیجان پیدا کرتے رہتے ہیں جس کے بغیر صحیح معنوں
میں وہ نہ سوسائٹی کا ایک جزو بن سکتا ہے نہ ذی حس اور ذی روح انسان۔ انگلستان
کے پہلے ناول نویس فیلڈنگ نے اپنی قوم کو اُس کے اسکولوں طالبعلموں اور
استادوں کی طرف متوجہ کیا، اور اس کے بعد ناول نویسی کا جو سلسلہ شروع ہوا

اس میں غریبوں کی مصیبتوں، امیروں کی بے پروائی اور ناانصافی، انسان کی اخلاقی و روحانی امنگوں کی کیفیتیں بیان کی گئیں۔ میدان بہت وسیع تھا، اس میں ہر حوصلہ مند نے اپنی صلاحیت کے مطابق مشق کی اور کارنامے دکھائے، اور ہر تعلیم یافتہ اور سنجیدہ شخص نے اس ادبی ذخیرہ سے لطف اٹھایا، عبرت حاصل کی تخیل اور عقیدے تعمیر کیے
افسانہ ناول کی ادبی اولاد کہا جاتا ہے، زیادہ تر اس لحاظ سے کہ ناول لکھتے لکھتے لوگ افسانے لکھنے لگے، اور دونوں میں کوئی ایسا فرق نہیں جو انکے ظاہری رشتہ کے منافی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور ضرورت تھی جس نے افسانہ کی ایجاد لازم کر دی جب مصور ایک وسیع لوح پر متعدد شکلیں اور صورتیں بنانے لگے تو وہ ہر شکل کیطرف کافی توجہ نہیں کر سکتا اور اگر کرے بھی تو دیکھنے والے کی نظر میں تصویر کا مجموعی اثر مختلف شکلوں کی انفرادی حیثیت پر غالب آجاتا ہے۔ ناول نویسوں نے روسی مصنف چیخوف کی رہبری میں یہ جدت کی زندگی کے عام "نقشہ" کو دھندلا کر دیا اور افراد اور انفرادیت کو بہت زیادہ شوخ اور نمایاں رکھا۔ روس میں انفرادیت کا بہت چرچا ہے روسی مصنفوں نے جو طرز اختیار کیا وہ انکے ملکی حالات کا تقاضا تھا ان سے یورپ نے یہ معلوم کیا کہ سوسائٹی اور اس کے مسائل کے علاوہ فرد اور انفرادی کیفیات بھی قابل غور ہیں، کیونکہ جماعت کی خوبیاں اور خرابیاں افراد ہی سے شروع ہوتی ہیں۔ مختصر ناول یا افسانہ کا منشا یہی ہے کہ افراد اور انفرادی جذبات، جو بڑے ناولوں میں گم ہو جاتے ہیں، یا صحیح رنگ میں نہیں نظر آتے، اپنی پوری اہمیت کے ساتھ دکھائے جائیں اسکا موضوع عموماً ایک انسان کی طبیعت، ایک جذبہ کا کھیل ہوتا ہے، یا کسی واقعہ کا ایک شخص یا جماعت پر اثر، اگر ہم چیخوف کے معمول کو مستند قرار دیں، تو ہر افسانہ کو ایسے شخص یا اشخاص کی زندگی کا سب سے پر معنی لمحہ ہونا چاہئیے جس میں انکی ساری سرگزشت بغیر بتائے معلوم ہو جائے، یا ایک آدمی کی ہوئی بات جو دل کا سارا راز افشا

کردے۔

یوں افسانہ نویسی کا فن ناول نویسی سے ہرگز آسان نہیں، جو فطرت انسانی کا
راز داں نہ ہو اُسے اس فن کے پاس نہ پھٹکنا چاہئے۔ ناولوں میں خیالات کا پرچار
کیا جا سکتا ہے، اور یہ مقصد ایسی کیرکٹر ایجاد کر سکتا ہے جن میں مطلق تصنع نہ ہو، مگر وہ اپنی
شخصیت انہیں خیالات کے بحث مباحثہ کے لئے وقف کردیں جو مصنف کو پیش کرنا
منظور ہوں۔ خیالات کا پرچار ناول کے مسلمہ مقاصد میں سے ہے اس طریقے پر کوئی
اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ جو خیالات کا پرچار نہ کرنا چاہے اور صرف زندگی کی
دلکش تصویریں بنانا چاہے، اُسے بھی ناول میں آسانیاں ہیں۔ اگر وہ کیرکٹر کا اعلیٰ
مصور نہیں تو دلچسپ یا عبرت انگیز واقعات بیان کرے، یا ایک داستان بس کے
اشخاص کی انفرادی ہستی قصہ میں اُسی طرح گم ہو جائے جیسے قطرہ دریا میں۔ افسانہ
کے لئے اختصار لازم ہے۔ افسانہ نویس اپنے قلم یا تصویر کو وہ آزادی نہیں دے سکتا
جو ناول نویس کو ہوتی ہے۔ اُس کے لئے پہلی شرط ضبط ہے۔ اُسے ایک پوری زندگی کے
تجربات و تاثرات کو ایک مختصر بیان میں مجتمع کرنا ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ لکھتا ہے اپنی سرگذشت
بنا کر لکھتا ہے۔ اُسکا دل ہزارہا جذبات کی جولانگاہ بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی ٹکڑے
ٹکڑے ہو جاتی ہے: اُسے اپنے فن میں کمال صرف کمال ایثار سے حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر افسانہ نویس اپنے لئے اتنا بلند معیار نہیں قائم کرتا، اور یہی
وجہ ہے اس فن میں ہر کس و ناکس کو ماہر کامل نہ سمجھنا چاہئے۔ یورپ میں ادبی
شہرت کے حوصلہ مند اکثر افسانہ نویسی سے ابتدا کرتے ہیں اور یوں یورپ کے ہر ملک
کے ادب میں افسانوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ لیکن اس فن میں ماہر صرف
دو مانے گئے ہیں، فرانسیسی مصنف موپساں اور روسی چیخوف۔ ان دونوں میں بھی
موپساں کی عام مقبولیت اس کی ذہانت اور دلکش اسلوب کی بنا پر ہے۔ [illegible] سے افسانہ

دلچسپ ضرور ہو جاتا ہے، لیکن اُن خوبیوں سے محروم رہتا ہے جو بلند پایہ تصانیف کے لئے لازم ہیں، موپساں کے اکثر پلاٹ حقیر ہیں، اُس کے تصور میں کافی پاکیزگی نہیں، کبھی کبھی ہمیں ایسے افسانے ملتے ہیں جو صریحًا فحش ہیں، اور مہذب لوگوں کے پڑھنے کے لائق نہیں، چیخوف پر اگر کوئی الزام لگایا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اُس نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کا کوئی خاص مطلب نہیں، جو انسانی جذبات کے سمجھنے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے، یا بالکل فضول ہیں، لیکن اچھے مصنف بھی ہمیشہ وجد کی حالت میں نہیں رہتے اُنکی طبیعت بھی کبھی موزوں ہوتی ہے اور کبھی نہیں، اور وہ فن کے احترام کے علاوہ اور فرائض کے بھی پابند ہوتے ہیں۔ چیخوف پر یہ الزام ضرور لگتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اُس کی نیت کسقدر پاک ہے، انسانی ہمدردی اُس کے دل میں کیسی موجیں مارتی ہے، اُس کی نگاہ کس قدر روشن اور تیز ہے۔ اگر ہم اُسے افسانہ نویسوں کا بادشاہ قرار دیتے ہیں تو اسی وجہ سے کہ اُس کی تصانیف کا بہت بڑا حصہ ہمارے بلند سے بلند نصب العین اور مشکل سے مشکل معیار کے تمام شرائط پورے کرتا ہے۔

چیخوف نے جس ادبی ماحول میں تربیت پائی اُس نے چند اور خصوصیات پیدا کی تھیں جو یورپ میں ایک ذہنی انقلاب کا باعث ہوئیں۔ ان میں سب سے نمایاں واقعیت کا وہ پہلو ہے جو انسانی فطرت سے متعلق ہے۔ روس کے باہر اور روسی مصنفین سے پہلے بھی یورپین ادب میں واقعیت کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ پرانا طرز چھوڑا جا رہا تھا جو "پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے" کی اجازت نہیں دیتا تھا، جس کا عقیدہ تھا کہ اوہام زندگی کی ذہنی بنیاد ہیں، اسلئے انہیں قائم رکھنا چاہیئے، اور جو کوئی اُن کی اصلیت سے واقف ہو جائے اُسکا بھی فرض ہے کہ اپنے علم کو ایک بھید بنا کر دل میں چھپالے، کیونکہ یہ وہ علم ہے جو بنی نوع انسان کو راحت نہیں پہنچا سکتا۔ واقعیت کی

تحریک نے اوہام پرستوں کی چیخ پکار کے باوجود اوہام کا طلسم توڑ دیا۔ قومی اور انسانی زندگی، اخلاقی، تمدنی، روحانی، اپنے اصل رنگ و روپ میں نظر آنے لگی، اور جب لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں تو انہوں نے صرف اپنی ذہنیت کو ان اوہام سے رہا نہیں کر لیا جو اس پر ایک بار ہو گئے تھے بلکہ عام زندگی کو راہ راست پر لانے کی جد و جہد شروع کی۔ لیکن اس تحریک میں ایک کمی تھی۔ خارجی حالات سے واقف ہونا حقیقت بینی کے لئے کافی نہیں۔ انسان کو اپنی طبیعت اور فطرت سے بھی بخوبی آگاہ ہونا چاہئے۔ واقفیت کی یہ کمی روسی مصنفوں نے پوری کی، روسی طبیعت کچھ ایسی "پر خود پیچیدہ" اور مشاہدۂ نفس میں مشغول رہتی ہے کہ اسے اپنے افعال کے اصل اسباب تلاش کرنے میں نہ دشواری ہوتی ہے اور نہ غلط فہمی، اور روسی مصنفوں نے خوش قسمتی سے فطرت اور جذبات کی مصوری میں وہ قدرتی استعداد پائی ہے کہ بہت جلد وہ گہری معلومات جو روسیوں نے اپنے غیر علمی طریقہ پر حاصل کی تھی تمام مہذب قوموں کی ملکیت بن گئی اور ہر طرف اس کی سچائی اور بصیرت افروزی کا اعتراف ہونے لگا۔ انسان حفاظت نفس کیلئے اکثر اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، بہت سی خواہشیں ہوتی ہیں اور بہت سے افعال جن کی اصل نیت کی تعبیر وہ اپنے فائدے کے مطابق کرتا ہے اور سچ اور جھوٹ کا خیال نہیں کرتا، یہ ایک فطری خاصیت ہے جو کم و بیش ہر انسان میں پائی جاتی ہے، لیکن اسکا وجود ہم ایک دوسرے پر الزام لگا کر نہیں ثابت کر سکتے۔ اسی لئے طبیعت کے اندرونی معاملات کا راز داں خدا ہی کو مانا گیا ہے۔ اقتباسات راز کی حالت میں ممکن ہے جب انسان خود اس کی ہمت کرے اپنا دل دوسروں کے سامنے کھول کر رکھ دے، اور انہیں اپنی پیروی کرنے کی ترغیب [illegible]"

---

۵ برنارڈ شا اپنے پیرو مرشد ابسن کی تقلید میں انہیں لوگوں کو idealists کہتا ہے

انسان عام نگاہوں کا مرکز بننے کی رسوائی برداشت نہیں کرسکتا لیکن نفس انسانی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ناگزیر ہے، روسی انسان یہ رسوائی برداشت کرگیا، اور اس کے ایثار سے فطرت انسانی کے جو راز معلوم ہوئے ہیں وہ ہمارے زمانہ کی واقعیت کی جان ہیں۔

روسی افسانوں اور ناولوں میں ہر طرف یہی بے باک پردہ دری نظر آتی ہے۔ یوں ممکن ہے یہ ہمیں ایک ادنےٰ سی بات معلوم ہو، لیکن جب ہم اس کے تمام نتائج پر غور کرتے ہیں تو اس کی پوری اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ یورپ میں ایک وہم تھا کہ انسان ہمیشہ منطق کے اصولوں پر چلتا ہے، اس سے اگر کوئی غلطی ہوتی ہے تو صرف اسوجہ سے کہ اُس کی منطق میں کوئی خامی رہ جاتی ہے، یعنی اگر انسان کو اسقدر تعلیم دیجائے کہ وہ اپنے دماغ کو عقل و دانش سے پوری طرح روشن کرسکے، تو عقل اُس کی کامل رہبری کرسکے گی اور وہ کبھی نہ ٹھوکر کھائے گا نہ گریگا۔ نفسیات کی سب سے جدید دریافت یہ ہے کہ انسان منطق کیا معمولی سمجھ سے بھی بہت کام لیتا ہے اور لے سکتا ہے، عادات، جذبات فطری رجحان، ضد، یہ سب مل کر اس کے اختیار کو بالکل محدود کردیتے ہیں اور اگر عقل نے کبھی دخل بھی دیا یا رہبر بننے کی آرزو کی تو انسان یا تو اپنی بے کسی پر ہنستا ہے۔ یا قوت ارادہ کے زور سے اپنے جذبات، عادات اور فطری رجحان پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ نفسیات کی یہ جدید دریافت دستئفسکی اور چیخوف کی تصانیف میں ہو بہو پائی جاتی ہے بلکہ اکثر خیال ہوتا ہے کہ نفسیات کے عالموں نے اسے روسی مصنفوں کے یہاں پڑا پایا اور اُسے علمی جامہ پہنا کر اپنی چیز بنائی، مشرق میں ہم عقل اور دل، قال اور حال کے مناظرے صدیوں سے سن رہے ہیں، اور ہم نے دونو طرف کی دلیلوں میں دل ہی کی دلائل زیادہ قوی مانی ہیں۔ نفسیات کی یہ دریافت یا فطرت انسانی کی یہ راز عقدہ کشائی ہمکو نئی یا عجیب نہ معلوم ہوگی، لیکن انسان کو منطق یا حساب لگانے کی مشین سمجھنے کے علاوہ

ایک اور زبردست وہم ہے جس میں مشرق اور مغرب یکساں مبتلا ہیں۔ یہ وہم صنفی جذبات نے پیدا کیا ہے اور اسے عشق کہتے ہیں۔ یورپ میں اسکی اور شکل تھی، مشرق میں اور۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں شکلیں بہت ملتی جلتی ہیں۔ یورپ میں نوجوان مرد نوجوان عورتوں پر عاشق ہوتے تھے، اور عاشق ہونے کے بعد وہ اپنا حق سمجھتے تھے کہ اپنی اور دوسروں کی زندگی جس طرح سے چاہے بنائیں اور بگاڑیں۔ اپنا حق وہ اس بنا پر تسلیم کراتے تھے کہ عشق کا جذبہ بہت بلند ہے، جس کسی میں یہ جذبہ جلوہ افروز ہوئے سوسائٹی میں ایک خاص امتیاز حاصل ہو جاتا ہے اور اس سے انکار کرنا انسانیت کے جوہر کی قیمت گرانا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک ناولیں اور افسانے اس تخیل کی تبلیغ کرتے رہے، ہزارہا عشق کی داستانیں سنائیں، عاشق نوجوانوں کے دلوں کی کیفیتیں سنگدل والدین اور بے رحم آسمان کی شکایتیں بیان کیں۔ انیسویں صدی کے وسط سے جب واقعیت کی تحریک شروع ہوئی تو عشق کا طلسم بھی کچھ کمزور پڑا۔ تجربے اور عام زندگی کے مشاہدہ نے بتایا کہ عاشق ہو جانا محض رئیسوں اور خوش حال لوگوں کی ایک دلچسپی ہے اور عشق کا جذبہ محض شہوت یا ڈھکوسلا۔ اس احساس نے عشق کی داستانوں کی وقعت تو بہت کم کردی، مگر ناول اور افسانے پھر بھی اسی بنیاد پر تعمیر ہوتے رہے۔ عشق کو فسانہ کی لوازمات میں سے خارج کرنے کی جرأت بھی سب سے پہلے روسی مصنفوں نے کی۔ بجائے ایک جذبہ کے جس کی کوئی اصلیت نہ تھی انہوں نے فطرت انسانی کے اور رنگ نمایاں کئے جنہیں عشق کی شوخی نے دبا دیا تھا۔ اس جدت نے انہیں ناول اور افسانہ کے بہت سے قدردانوں کی توجہ اور تعریف سے محروم رکھا لیکن اس کے عوض میں سنجیدہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت جو ناولوں اور افسانوں کو ادبی لغویات میں شمار کرتی تھی، ان کی شیدائی بن گئی۔ ایک حد تک یہ تفرقہ ناگزیر بھی تھا۔ عشق کے عنصر کے بغیر ناول اور افسانوں میں داستان یا قصے کی خصوصیت نہیں رہتی اُنکے عام قدردان جنہیں انسانیت کے اعلی

مسئلوں سے کوئی نسبت نہیں ہوتی، جو صرف اپنے فرصت کے گھنٹوں میں ایک دلچسپ
شغل یا بھونڈے مگر بیچے الفاظ میں اپنے جنسی جذبات کے لئے گدگدی چاہتے ہیں، انہیں
اس صورت میں کسی طرح سے نہیں پسند کرسکتے۔ پڑھنے والوں کی زیادہ تر تعداد ایسے ہی
لوگوں کی ہوتی ہے، اور ناول اور افسانہ نویسوں کے لئے انکی سرپرستی سے بے نیاز ہونا
بہت جرأت کا کام ہے۔ لیکن اگر ہم افسانوں میں واقعات کی دلچسپی پر زیادہ اصرار کریں
تو انکی تہذیبی اور فلسفیانہ حیثیت بالکل مٹ جاتی ہے، اور اُن میں کچھ یک رنگی سی آجاتی
ہے جو ہماری زندگی کا صحیح عکس نہیں ہم میں صرف شاذونادر ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں
جن کی سرگذشت ایک داستان کی صورت اختیار کرتی ہے اگر ہم محض اُنکی زندگی کے
واقعات پر نظر رکھیں عاشق بھی ہر شہر میں فقط دو چار ہوتے ہیں، وہ بھی مختلف ارادوں
سے، اور عشق جو کیفیت انکے دلوں میں پیدا کرتا ہے وہ اُس حالت سے کوئی مناسبت نہیں
رکھتی جو شاعر اور پرانے طرز کے ناول اور افسانہ نویس تصور کرتے ہیں، لیکن اگر ہم ذرا اپنی
نظر پاک کریں، اور ذاتی لطف اٹھانیکی خود غرضانہ نیت کو چھوڑ کر انسانی ہمدردی کو اپنا
محرک بنائیں تو معمولی سے معمولی شخص کی زندگی ہمارے لئے ایک پرکیف داستان ہوجائیگی
واقعیت کی تحریک کا جوہر یہی ہے کہ وہ عام انسانی زندگی سے گریز کرنا، بے معنی اور خلاف
واقعہ یا غیر معمولی داستانوں میں پناہ لینا صرف بدمذاقی نہیں بلکہ بزدلی اور کفر قرار دیتی ہے
زندگی نام ہے زندہ دلی کا، زندہ دل وہی ہے جو حقیقت کے نظارہ کی آرزو اور جرأت
رکھتا ہو، اور دوسروں کی نظر بھی صحیح مرکز کیطرف مائل کرسکے، وہم اور ادنےٰ جذبات
کا شکار بننے کی ہوس تو ان کے خمیر میں شامل ہے، رہبری کی شرط اُسے آزاد اور
بلند حوصلہ بناتا ہے۔

سلطان سلیمان اعظم قانونی[۵۱]

سلیمان کی ولادت سنہ ۹۰۰ھ میں ہوئی تھی - اپنے باپ سلطان سلیم کی وفات کے وقت یہ مقام صاروخاں میں تھا - ۱۷ر شوال سنہ ۹۲۶ھ کو قسطنطنیہ میں پہنچکر تخت پر بیٹھا - اس کے جلوس کے بعد ہی غزالی نے جو قانصوہ غوری کے امراء میں سے تھا اور جس کو سلطان سلیم نے شام کا والی مقرر کر دیا تھا بغاوت کر دی اور خیر بک والی مصر کو لکھا کہ ہم قسطنطنیہ سے بہت دور ہیں - سلطان کی دسترس یہاں تک مشکل سے ہو سکتی ہے اس لئے تم بھی میرا ساتھ دو - اس نے جواب دیا کہ تم اگر حلب فتح کر لو گے تو میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جاؤں گا -

سلطان نے فرہاد پاشا کو نظامیہ فوج کے ساتھ بھیجا - غزالی اس وقت حلب کا محاصرہ کئے ہوئے تھا - فرہاد پاشا نے اس کو شکست دی اور اسکا سر کاٹکر سلطان کے پاس بھیجدیا -

فتوحات دولت علیہ کیطرف سے شاہ ہنگری کے پاس جزیہ کے مطالبہ کے لئے سفیر بھیجا گیا - اس نے سفیر کو قتل کر ڈالا - اس وجہ سے سلطان نے فوجیں لیکر چڑھائی کی - اور ۲۵ر رمضان سنہ ۹۲۷ھ کو بلغراد فتح کر لیا -

چونکہ سارے بلغان میں یہی ایک ایسا قلعہ تھا جو عثمانیوں کے قبضہ سے باہر تھا اور جنگی اہمیت کے لحاظ سے نہایت وقیع تھا - اس لئے اس کی فتح کی خوشخبری تمام ممالک میں پہنچ گئی - بادشاہ روس اور رئیس جمہوریہ وینس نے سلطان کو اس کامیابی پر تہنیت کے پیغامات بھیجے -

---

[۵۱] یہ مضمون تاریخ دولت عثمانیہ حصہ ہشتم کا ایک ٹکڑا ہے جو اس وقت زیر تالیف ہے - مؤلف

رودس یوحنا اور صلیبی کی جماعت جو بزور تیغ ارض مقدس سے نکالی گئی تھی رودس میں آکر مقیم ہو گئی تھی۔ اور مسلمانوں کے خلاف جنگ اور غارتگری کرتی تھی۔ سلاطین عثمانیہ مدت سے خواہشمند تھے کہ اس جزیرہ پر قبضہ کرلیں تاکہ انکا خطرہ مٹ جائے اور غنیم کے بیڑوں کو وہاں تباہ نہ مل سکے۔ فتح مصر کے بعد سے مصر کے ساتھ بحری سلسلہ مواصلات قائم کرنے کے لئے اس کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہونے لگی۔ سلطان نے وہاں کے صلیبی جنگ آور رہبانیوں کو لکھا کہ جزیرہ خالی کر کے چلے جاؤ تمہارے جان و مال سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ لیکن وہ جنگ پر آمادہ ہوگئے۔ اس لئے بیڑہ لیکر سلطان نے چڑھائی کی۔ آخر میں مجبور ہو کر انہوں نے جزیرہ چھوڑنا منظور کیا۔ سلطان نے اپنی فوجیں قلعے کے دروازہ سے ایک میل دور ہٹالیں اور بارہ دن کی انکو مہلت دی کہ اپنا مال و اسباب لیکر چلے جائیں۔ شاہ شارلکان نے جزیرہ مالطہ انکے لئے خالی کر دیا تھا۔ وہیں منتقل ہوگئے۔

کریمیا سنہ ۹۲۹ھ میں کریمیا کے فرمانروا محمد گرائی خاں کو اس کے دونوں بیٹوں غازی اور بابا نے ملکر قتل کر ڈالا جس کی وجہ سے وہاں فتنہ برپا ہوگیا۔ دولت علیہ نے جس کی سیادت اس پر برائے نام تھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قبضہ کرلیا اور اس کو ایک عثمانی ولایت بنالیا۔

ہنگری اس زمانہ میں شارلکان یورپ میں سب سے بڑا بادشاہ تھا جو اسپین کیساتھ جرمنی اور ہالینڈ کا بھی مالک تھا اور اطالیہ کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ رکھتا تھا جمہوریہ فلارنس اور جنوا اس کی تابع تھیں اور جزائر سارکا اور سسلی بھی۔ فرانس کے بادشاہ فرنسیس اول نے اطالیہ کے صوبہ میلان کے لئے اس کے ساتھ جنگ کی اور شکست کھائی۔ باوجود اس کے کہ یورپ کے درباروں میں فرانس سب سے اہم کیتھولک سلطنت تھی۔ جس نے یورپ میں اسلامی پیش قدمی کو رد کرنے کا حلف اٹھایا تھا لیکن اس موقع

سلیمان پاشا نے عدن کے بعد رفتہ رفتہ پورے یمن پر قبضہ کر کے اس کو عثمانی املاک میں شامل کر دیا۔

جزائر بحر روم فرانس اور دولت علیہ میں فتح اطالیہ کے لئے باہم یہ معاہدہ ہوا کہ عثمانی بیڑہ نیپل سسلی اور اسپین کیطرف سے حملہ آور ہو اور فرانس شمالی سمت سے۔ اس کے مطابق سلطان ایک لاکھ فوج لیکر بلاد ارناؤط کیطرف آیا اور اپنے بیڑہ کو بھی روانہ کیا۔ لیکن جمہوریہ وینس نے اس مخالفت کی مخالفت کی۔ نیز عام مسیحی رائے بھی فرنسیس اول کے خلاف ہو گئی کہ اس نے اپنے ہم مذہبوں سے لڑنے کے لئے اسلامی سلطنت کو اپنا حلیف و مددگار بنایا۔ اس وجہ سے فرنسیس رک گیا اور جو منصوبہ تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ ورنہ سارا اطالیہ دولت علیہ کے قبضہ میں آ گیا ہوتا۔

باربروسہ نے جزیرہ کارفو کا محاصرہ کر رکھا تھا مگر سفیر فرانس نے جس کو سلطان کے دربار میں بہت درخور حاصل تھا بیچ میں پڑ کر انکی طرف سے حربی ضمانت دیدی اس لئے محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ واپسی میں باربروسہ نے کریٹ وغیرہ بحر روم کے اکثر جزیرے فتح کر لئے۔ آندرہ دوریا ۱۶۷ جہاز لیکر اس کے مقابلہ میں آیا مگر شکست کھا کر واپس گیا۔

ان فتوحات سے اسپینی بیڑہ کا اقتدار جاتا رہا اور بحری سیادت ترکی بیڑہ نے لی جس کی شہرت اقطاع عالم میں پھیل گئی۔

۹۴۲ھ میں فرانس کے ساتھ جدید عہد نامہ ہوا جس میں سلطان نے بوجہ حلیف ہونے کے فرنچ تاجروں کے لئے عثمانی قلمرو میں خاص مراعات منظور فرمائیں ٹھیک اسی زمانہ میں شاہ طہماسپ شارلکان کے ساتھ دوستی اور مخالفت کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہ ہو سکا

فرانس کی مدد ۹۵۲ھ میں فرنسیس اول اور شاہ شارلکان میں پھر جنگ شروع ہوئی اس وقت فرانس کیطرف سے موسیو پولان نامی سفیر سلطان کے پاس آکر امداد کا طالب ہوا۔ اس نے باربروسہ کو ایک بیڑہ کے ساتھ بھیجا جس نے پہنچکر نیس

کا محاصرہ کیا لیکن فرنچ اور ترکی فوجوں میں اختلاف ہو جانے کے باعث فتح نہ کر سکا۔ ادھر کلیا نے فرنسیس کو اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے مسلمانوں کی مدد لینے پر مطعون کرنا شروع کیا جس سے عام عیسائیوں نے اس کو ملحد اور بے دین قرار دیا اس وجہ سے مجبور ہو کر اس نے عثمانی بیڑہ کو رخصت کر دیا۔ واپس آنے کے بعد ۹۵۳ھ میں باربروسہ قسطنطنیہ میں انتقال کر گیا۔ اس کی جگہ پر طورغود پاشا عثمانی بیڑہ کا امیر مقرر ہوا۔

اسی سال شارلکان نے تحفے اور ہدیے بھیجکر سلطان سے مصالحت کی درخواست کی۔ سلطان نے منظور کیا۔ معاہدہ یہ ہوا کہ پانچ سال تک جنگ نہ ہوگی بشرطیکہ آسٹریا کیطرف سے سالانہ تیس ہزار اشرفی خراج موصول ہوتا رہے۔

۹۶۰ھ میں شاہ طہماسپ نے پھر تعدی اختیار کی۔ سلطان نے فوج کشی کی اور قرہ باغ کے متصل اس کو شکست دی۔ شاہ مذکور نے آخر میں قلعہ قرس دولت علیہ کے حوالہ کر کے صلح کر لی۔

طورغود پاشا نے اس درمیان میں جزیرہ مالطہ کا محاصرہ کیا۔ اسی میں اس نے شہادت پائی جس کے بعد عثمانی بیڑہ بے نیل مرام واپس آ گیا۔

وفات

۹۷۳ھ میں میکسیملین پسر فرڈیننڈ شاہ آسٹریا نے ہنگری کے شہر توکائے پر قبضہ کر لیا۔ سلیمان نے باوجود نقرس کی تکلیف کے خود فوج لیکر چڑھائی کی اور آسٹریا کے قلعہ سکتوار کا محاصرہ کیا۔ فتح سے چند روز پیشتر ۳۰ صفر ۹۷۴ھ میں انتقال کر گیا وفات کے وقت اس کی عمر ۷۴ سال کی تھی۔

سلطان سلیمان ۴۸ سال تک تخت خلافت و سلطنت پر متمکن رہا۔ اس کے زمانہ میں چونکہ حکومت کے قوانین نئے سرے سے وضع کئے گئے اور فوج کی تقسیم اور اس کے مناصب کی ترتیب ہوئی اس وجہ سے وہ قانونی کے لقب سے مشہور ہوا۔

اسکا عہد دولت عثمانیہ کی تاریخ میں منتہائے اقبال اور کمال کا عہد تھا جس میں

مشرق اور مغرب میں فتوحات ہوئیں اور دولت علیہ کا نفوذ اور اس کے اقتدار کا غلبہ دور دور تک پہنچ گیا یہانتک کہ وہ اس زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی بحری و بری طاقت بن گئی تین لاکھ جنگ آور فوجیں تھیں جن میں پچاس ہزار نظامی تھی اور تین سو جنگی کشتیاں تھیں جو اسوقت کے بڑے بڑے بیڑہ کو شکست دے چکی تھیں اور مشرق سے لیکر مغرب تک سمندروں پر انکی سطوت قائم ہو گئی تھی۔

سلیمان کے بعد سے سلطنت عثمانیہ کا زوال شروع ہو گیا جو سلسلہ وار چلا آرہا ہے یہانتک کہ وہ اس حالت کو پہنچ گئی جس میں اب ہے۔ اس زوال کے مختلف اسباب ہوئے۔

(۱) رقبۂ سلطنت اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ دولت اور ثروت کی زیادتی ہوئی جس کی وجہ سے سادگی اور سپہگری کے بجائے عیش پرستی اور آرام طلبی آگئی جس کا لازمی نتیجہ زوال ہوتا ہے۔

(۲) انکشاریہ کا سپہ سالار اعظم خود سلطان ہوتا تھا۔ اس لئے انکا دستور یہ تھا کہ وہ بلا سلطان کو لئے ہوئے جنگ کیلئے نہیں نکلتے تھے۔ سلیمان کے عہد سے یہ قانون بن گیا کہ وہ اپنے امراء کے ماتحت جنگ کے لئے جایا کریں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانۂ مابعد میں اکثر سلاطین نے عیش پرستی کی وجہ سے جنگ و جہاد میں جانا چھوڑ دیا۔

علاوہ بریں انکشاریہ کو جو سلطنت کے عمود تھے شادیاں کرنے اور گھر بنا کر رہنے کی بھی اجازت دیدی گئی جس سے انکی جنگی حمیت میں فتور پڑ گیا۔

(۳) پہلے سلطنت کے تمام مہمات دیوان وزراء میں بریاست و مشورۂ سلطانی انجام پاتے تھے لیکن سلیمان نے اس دستور کو توڑ دیا اور یہ قاعدہ مقرر کیا کہ صدر اعظم کی ماتحتی میں جملہ امور طے ہوا کریں۔ اس وجہ سے خود سلطان اکثر معاملات کی حقیقت سے ناواقف رہنے لگا اور وزراء اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے حرم اور بیگمات سے بھی امداد لینے لگے۔ اس طرح پر سلطان کے گرد دسیسہ کاریوں کا ایک جال بچھگیا جس میں وہ اکثر شکار ہونے لگا

اور سلطنت کے کام بگڑنے لگے ۔ خاصکر اس وجہ سے اور بھی کہ وزرا قومیت میں بھی بالعموم مغائر ہونے تھے ۔ کیونکہ اکثر نو مسلم نصاریٰ جو سلطان کے خادم یا مقرب ہوتے تھے وہی صدارت عظمیٰ کے منصب پر مقرر کردیئے جاتے تھے ۔

(۴) سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ ترکوں کا حریف یورپ دور جہالت اور وحشت سے نکلکر علم اور تمدن کیطرف آرہا تھا ۔ بجائے انتشار اور طوائف الملوکی کے ان میں وحدت اور ملوکیت کا اقتدار پیدا ہو رہا تھا ۔ ملکی اور ملی مقاصد کے لئے بڑی بڑی قربانیاں اور مصائب برداشت کرنیکی قوت آرہی تھی ۔ اندلس کے مسلمانوں پر مکمل تسلط کرلینے کے بعد اس کے فاتحانہ جذبات بڑھ گئے تھے ۔ مطابع کی ایجاد علوم وفنون کی اشاعت اور آتشیں اسلحہ کی ساخت اور انکے استعمال سے نوجوان یورپ اسی قدر دن بدن آگے بڑھ رہا تھا جس قدر پرانا ترک پیچھے ہٹ رہا تھا ۔

سلطان سلیمان اعظم اپنی بے مثل شجاعت اور عالی حوصلگی اور بے نظیر تدبر اور فرزانگی کی بدولت دنیا کا نہایت ممتاز سلطان ہوتا اگر اس کی زندگی پر قتل اولاد کا بدنما دھبہ نہ پڑتا ۔

صورت یہ ہوئی کہ اس کی ایک روسی بیوی روکسلان (فرحانہ) نامی تھی جو بوجہ اپنے حسن وجمال کے شروع سے آخر تک اس کے قلب کی مالک رہی ۔ وہ خواہاں تھی کہ شاہزادہ سلیم جو اس کے بطن سے پیدا ہوا ہے ولیعہد ہو ۔ اسلئے اس نے اپنے داماد رستم پاشا کو صدر بنوایا اور اس کے ساتھ ملکر اس کے لئے کوشش شروع کی ۔ ان دونوں نے شاہزادہ مصطفےٰ کیطرف سے جو ولیعہد تھا سلطان کو بدظن کرانا شروع کیا ۔

ایران کے آخری حملہ کے موقع پر مقام ارکلی میں ایک دن رستم پاشا نے سلطان کو مطلع کیا کہ مصطفےٰ نے انکشاریہ کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے ۔ وہ موقع دیکھ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی ہی میں اس کو تخت پر بٹھا دیں ۔ چونکہ مصطفےٰ بوجہ اپنی سپہگری اور شجاعت کے انکشاریہ میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھا ۔ اس وجہ سے سلطان کو یقین آگیا ۔ اس نے

کوئی تفتیش نہیں کی اور مصطفےٰ کو بلا کر حاجبوں سے قتل کرا دیا۔ انکشاریہ نے اس پر سخت شورش مچائی اور صدر اعظم کے قتل کے درپے ہوئے سلطان نے انکی تسکین خاطر کے لئے رستم پاشا کو معزول کر دیا۔ مصطفےٰ کے بھائی جہانگیر نے باپ کے سامنے جا کر اس قتل پر سخت جذبہ کا اظہار کیا سلطان نے اس کو توبیخ کی جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کر لی۔ فرخ نے اپنے ایک خاص آدمی کو بھیجکر مصطفےٰ کے شیر خوار بچہ کو بھی مروا ڈالا۔ اور اس فکر میں پڑی کہ شاہزادہ بایزید جو باقی رہگیا ہے اسکا بھی خاتمہ کرا دے تاکہ اس کے بیٹے سلیم کے سوا اور کوئی تخت و تاج کا وارث نہ رہجائے مگر اسی اثنا رمیں وہ خود مر گئی۔ اس کے بعد لالہ مصطفےٰ نے جس کو وہ سلیم کا مربی بنا گئی تھی اپنی پر فریب دراندازیوں سے سلیمان کو بایزید کا بھی مخالف بنا دیا۔ یہانتک کہ اس نے بایزید کی گرفتاری کے لئے فوج بھیجی۔ وہ مقابلہ میں شکست کھا کر بھاگا اور معہ اپنے چاروں بیٹوں کے والی ایران شاہ طہماسپ کے یہاں پناہگزیں ہوا۔ اس نے نہایت گرمجوشی سے لیکر اپنے پاس رکھا اور حمایت کا وعدہ کیا مگر در پردہ سلطان کو اطلاع دیدی اور جب اس کے آدمی آئے تو انکے حوالہ کر دیا۔ انہوں نے قزدین پہنچکر سلطان کے حکم سے بایزید کو معہ اسکے چاروں بیٹوں کے قتل کر ڈالا بروصہ میں اسکا ایک شیر خوار بچہ تھا اسکا بھی گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس طرح پر بجز سلیم کے سلطان نے خود اپنی ساری اولاد کا خاتمہ کرا دیا۔

ترکی قوم پرستی اور اتحاد تورانی

کوئی دو سال ہوئے مشہور ترکی ادیب خالدہ خانم نے اپنے حالات زندگی لکھے تھے جو امریکہ میں شائع ہوئے ہیں۔ ہم ذیل میں اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ جس سے ترکی قوم پرستی کی تاریخ پر نہایت دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک کا زمانہ میرے لئے اس قوم پرستی کے دریا میں جست کرنے کا پیش خیمہ تھا۔ اور اس قوم پرستی نے جنگ بلقان کی ہزیمت کے بعد بڑی شدید شکل اختیار کر لی تھی۔ جو قومی رجحانات پہلے کچھ بے شکل اور غیر متعین سے تھے انہیں طرابلس کی معرکہ آرائی اور اسکی شجاعانہ روح سے تقویت پہونچی تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر جنگ کے مصائب کے بعد پردیسیوں کے غیر منصفانہ برتاؤ سے ہمیں اتنا سخت دھکا نہ لگا ہوتا تو شاید ہم کبھی نہ چونکتے نہ اس درجہ جوشیلے قوم پرست بن سکتے۔

شروع شروع میں تو یوسف اکچورہ اور گیوک الپ ضیا سے واقفیت نے مجھے اپنی نسلی ماضی سے قریب اور عثمانی ماضی سے دور کیا۔ مجھے ہمیشہ سے عوام کے قصہ کہانیوں اور عام ادب کے بسیط اور سادہ حسن سے لگاؤ تھا۔ اس لئے اپنی نسل کے قدیم ایام نے قوم کی ان لکھی شاعری اور اس کے بے لکھے قصے کہانیوں کے ماخذ کی حیثیت سے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ تمدنی تجسس اور واقعات خارجی کا ظلم یہ دونوں چیزیں اکثر ذہین ترکوں کو اپنی نسل کے ابتدائی حالات کے گہرے مطالعہ پر مجبور کر رہی تھیں۔

ترکی میں قوم پرستی کے مختلف دور رہے ہیں، مختلف نام اور مختلف تعریفیں۔ پھر مجموعی حیثیت سے یہی جدید ترکی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات کے فہم کی کنجی ہے اس لئے اس

تحریک کے مختلف دوروں کا ذکر ضروری ہے۔

ترکی قوم پرستی کی ابتدا غیر شعوری تمدنی حیثیت سے ۱۹۰۸ء سے پہلے ہوئی اور وہ زبان کو سادہ بنانے کی شکل میں لیکن یہ تحریک صاف طور پر عثمانی ترکوں کی تحریک تھی۔ رضا توفیق اور محمد امین نے پہلے پہل ترکی بحریں اور اناطولی ترکوں کی سادہ زبان استعمال کی اور انکی تحریروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ عثمانی اور دوسرے ترکوں کے فرق کو صاف صاف محسوس کرتے تھے قومی حیثیت سے دیکھیے تو عثمانی ترک بالکل ہی مختلف معلوم ہوتا ہے۔ وہ مشرق قریب اور یورپ میں آیا اور وہاں اس نے اپنے خون اپنی زبان، بلکہ اپنے نفس کے ہر ہر ذرہ میں کوئی نئی کوئی مخصوص چیز حاصل کر لی۔ اس کی نسل کی ابتدائی قوت اور ماہیت پر کتنی ہی گہری نظر ڈالنے کی کوشش کیجیے لیکن آپ یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ اس کی روح اور اس کے جسم میں ایسی چیزوں کا اضافہ ہوا ہے جنہوں نے اسے اس وقت سے بہت مختلف بنا دیا ہے جب وہ پہلے اس ملک میں آیا تھا جسے ترکی کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ عثمانی ترک ہے اور اس پر اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہیے اور جاننا چاہیے کہ ہر وہ چیز جو لسانی و تمدنی اعتبار سے اس کی اس مخصوص حیثیت کے خلاف ہو گی لازماً زیادہ پائدار نہیں ہو سکتی۔ اس کی زبان کو پھر چغتائی ملک میں واپس بھیجنے کیلئے مجبور کرنا ایسی ہی مصنوعی بات ہو گی جیسا اسے ایرانی یا فرانسیسی کے سانچے میں ڈھالنا، لہذا اسکی سادگی اور اسکی قوم پرستی خود اسکی قومی روح کے مطابق چلیگی دوسری طرح نہیں۔

گذشتہ پچیس سال میں عثمانی ترک برابر اپنی زبان پر نظر ثانی کرتا اور اسے زیادہ لطیف اور زیادہ وسیع بناتا رہا ہے اس میں ایک ترقی یافتہ زبان کی اصطلاحیں اور امکانات پیدا کرتا رہا ہے اور ایسی زبان بنانے میں کوشاں رہا ہے جس میں سائنس اور فلسفہ پیدا ہو سکے اور انکی تلقین و اشاعت ممکن ہو۔ شمس الدین سمیع بے اور پروفیسر ناجی نے ترکی لغت کو اسی سے بالارادہ سادہ بنایا تھا۔ ۱۹۱۰ء سے ترکی اہل قلم نے بھی پھر اسی قسم کی ایک بالارادہ کوشش شروع کی، انہوں نے علمی اصطلاحات کو مقرر کرنے کی کوشش کی۔ ترکی قواعد کو سادہ بنایا

اور اس سے عربی اور فارسی کو علیحدہ کیا علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات معلوم کرنے والوں میں خاص طور پر کیوک الپ ضیا نعیم اور رضا توفیق بے کے نام لینے چاہئیں اور حسین جاہد نے وہ جدید ترکی قواعد لکھی جواب نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک زبان کی تحقیق تھی۔ ایک قومی روح کا پیدا کرنا تھا اور عثمانی ترکوں کے تمدن کو سمجھنے کی کوشش تھی . . . . . .

اتحاد تورانی اس قوم پرستی کی وسیع تر تعبیر و تعریف تھی جس کا اظہار کیوک الپ ضیا اور بعض مشہور روسی ترک اہل قلم مثلاً احمد آغایف اور یوسف اکخورا بے نے کیا پہلے تو یہ خالص تمدنی چیز تھی لیکن انجمن اتحاد و ترقی کے بعض رہنماؤں نے اسے ایک سیاسی مطمح نظر بنا دیا خصوصاً اس زمانہ میں جب جنگ عظیم کے وقت ترکی افواج قدیم روس کے علاقہ میں پہنچ گئی تھیں لیکن سیاسی اعتبار سے اتحاد تورانی کی نہ کبھی کوئی متعین حدود تھیں، نہ اس کی کوئی تشریح تھی نہ کوئی واضح اظہار اس پر جب کبھی کوئی اعتراض کرتا تو طلعت پاشا خوش مذاقی سے ہنسکر فرمایا کرتے "کیوں کیا ہے ممکن ہے یہ ہمیں بحر اصفر تک پہنچا دے!" لیکن آخر اس اتحاد تورانی کی اصلی بنیاد کیا تھی؟ کیا یہ سب تورانیوں کا سیاسی اتحاد تھا؟ عثمانی ترک جس اتحاد تورانی کے خواہاں تھے کیا اس میں مسیحی ترک کے لئے بھی کوئی جگہ تھی؟ یا یہ صرف مسلمان ترکوں کے لئے تھا جو دراصل انور بے کے اتحاد اسلامی کی ایک شکل ہوتی جس میں اس اتحاد مذہب کے ساتھ اتحاد نسل کو بھی شامل کر دیا جاتا جس کے پیدا کرنے کا ایک دھندلا سا تخیل انور پاشا کے ذہن میں تھا لیکن جس کے قیام میں وہ ناکام رہے —

میں ترکوں کو متحد کرنے کے سیاسی تخیل میں کیوک الپ ضیا کی مخالف تھی۔ مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ ترکی میں قوم پرستی تمدنی اور جغرافی ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ہمیں اور روسی ترکوں کو اس طرح متحد کیا جا سکے جس طرح کہ اس وقت لوگ ممکن سمجھتے تھے۔ روسی ترک خود اپنی مخصوص قومی روش رکھتے ہیں اور ہم سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ وہ ہمارے ادب کے کتنے ہی دلدادہ ہوں لیکن عثمانی ترکوں کی مداخلت وہ کبھی گوارا نہ کریں گے۔ جو عناصر اور اثرات ان کے تمدن کی تعمیر میں صرف ہو رہے ہیں وہ بالکل روسی ہیں۔ عثمانی ترکوں کے عناصر تمام تر مغربی ہیں۔ مستقبل بعید میں

عثمانی ترکوں اور بحر کیسپین تک کے ترکوں میں زیادہ سے زیادہ جو سیاسی تعلق ممکن ہے اور جو واقعی سب سے پسندیدہ بھی ہے وہ یہ خود مختار ریاستوں کا اتحادی جن میں دونوں عناصر کو پورا پورا آزادانہ موقع ہو کہ وہ اپنی مخصوص تمدن اور اپنی مخصوص ترقی کو پیش نظر رکھ سکیں لیکن اگر ایسا وقت کبھی آیا تو میں تو سمجھتی ہوں کہ اس وقت آرمینیا، جیارجیا، اور ایران بھی ترکی ریاستہائے متحدہ میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو چکے ہونگے تاکہ روس اور یورپ کے حملوں اور انکے تسلط سے اپنے کو محفوظ رکھ سکیں۔

کیوک الپ ضیا در اصل اتحادی عہد کا ایک بڑا صاحب فکر تھا یہ تبلانا تو مشکل ہے کہ اتحاد تورانی کے تخیل کو پہلے کس نے سیاسی رنگ دیا، خود ضیا نے یا اس کی جماعت کے بڑے سیاست دانوں نے لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ ضیا نے اسے شروع ایک خالص تمدنی حیثیت سے کیا تھا۔ وہ ایک نئی ترکی بنانا چاہتا تھا جو عثمانی ترکوں اور انکے تورانی اجداد کے درمیان کی خلیج کو پُر کر سکے اس نے بچوں کے لئے بہت سی مزید انظمیں اور بہت سے قصے لکھے۔ اس نے ترکوں کی اصل کے متعلق اپنے علم کو اور زندگی کے اس تصور کو ہر دلعزیز کرنے کی بہت کوشش کی جسے یہ خود عالم وجود میں لانا چاہتا تھا۔ اپنے بعض ابتدائی تصنیفوں میں وہ اس غرض سے نہایت قدیم ترکی الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن یہ بالکل مردہ اور بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے جلد ہی اپنی غلطی محسوس کر لی اور اپنی آخری تصانیف میں یہ ملک کی معمولی ترکی زبان لکھنے لگا۔ . . .

سنہ ۱۹۱۱ء کے اوائل میں ضیا سالونکا سے قسطنطنیہ آیا اور اپنے ساتھ اپنے ادبی و فلسفیانہ مشاغل بھی لایا۔ سالونکا میں اس نے ایک ذہنی تحریک کی ابتدا کی تھی۔ جس کا ایک رسالہ بھی تھا: "نوجوان قلم" اور اس کے ساتھ کام کرنے والوں کی نہایت قابل جماعت تھی۔ . . . یہ دیار بکر کے ایک مشہور خاندان سے تھا جس میں علما اور شعرا پیدا ہو چکے تھے۔ شروع جوانی میں اس نے کردی زبان کی اصل اور اس کی قواعد پر کام کیا تھا اور اس وجہ سے بعض حلقوں میں اسے کردی قوم پرست سمجھا جانے لگا تھا۔ لیکن یہ اعلی تعلیم کے لئے عبدالحمید کے زمانہ میں قسطنطنیہ آیا۔ جہاں وہ نہایت جوشیلا "نوجوان

ترک، بنگیا اور طالبعلمی کے زمانہ میں متعدد بار اس وجہ سے گرفتار ہوا کہ نامق کمال کی تصانیف پڑھا کرتا تھا۔ جب انجمن اتحاد و ترقی تنظیم ہوئی ہے تو یہ سالونکا میں تھا اور اس سیاسی انجمن کا نہایت معزز رکن بنا۔

یہ ایک پستہ قد، موٹا سا، سیاہ فام آدمی تھا، پیشانی پر صلیب کا سا ایک عجیب نشان تھا جس پر ہر ایک کی نظر پڑتی تھی۔ جب بیس برس کا تھا تو اس نے اپنے سر میں گولی ماری تھی، یہ نشان اسی گولی کا تھا۔ اس کے مزید اثر سے یہ جیسے تیسے بچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں عجیب سی تھیں اور ہمیشہ معلوم ہوتا تھا کہ جو اشخاص اور جو چیزیں اس کے ارد گرد ہیں ان سے دور دیکھتی ہیں اسکا انداز اس اجنبی کا سا تھا جو ایک غیر مانوس ماحول کو صبر کے ساتھ برداشت کر رہا ہو۔ لیکن پھر بھی یہ جاذبِ نظر ہو جاتا تھا۔ اور بات چیت یا مطالعہ سے اپنے خیالات ان لوگوں کی نسبت آسانی سے بدل دیتا تھا جو بظاہر اپنے ماحول میں بالکل منہمک نظر آتے ہیں۔ اسے فلسفہ اور اجتماعیات سے خاص دلچسپی تھی۔ یہ ترکوں کی جماعتی اصلاح کی رہنمائی کو سیاسی اصلاح سے زیادہ اپنا مقصد زندگی جانتا تھا جماعتی اصلاح اس مواد کی بنا پر کرنا چاہتا تھا جو اس نے ترکوں کے قبل اسلام سیاسی و جماعتی اداروں کے متعلق جمع کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ عربوں کا قائم کیا ہوا اسلام ہمارے مناسب حال نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہم اپنے عہد "جہالت" کیطرف رجعت نہ کریں تو پھر ہمیں ایک مذہبی اصلاح کی ضرورت ہے جو ہماری طبائع سے مطابقت رکھتی ہو۔ یہ پروٹسٹنٹ اصلاح مذہب کا بڑا مداح تھا کہ اسی سے یورپ میں صحیح قوم پرستی شروع ہوئی۔ یہ ایک رسالہ "اسلامک ریویو" شائع کرتا تھا جس میں قرآن کا نہایت اچھا ترکی ترجمہ نکلتا رہا۔ اس کے مذہبی خیالات پر کازان کے مشہور تاتار مسلم مصلح موسےٰ بکییف کا بڑا اثر تھا۔

اس زمانہ میں اسکا سب سے دلچسپ کام ایک رسالہ تھا "بچوں کی دنیا" جو یہ ترکی بچوں کے لئے نکالتا تھا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی سیدھی سادی کوشش تھی۔ اس میں کامیابی کے ساتھ انگریزی سے جانوروں اور پریوں کے قصے ترجمہ ہوئے۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنی سادہ

ترکی کہانیاں بھی شائع کیں جو قوم کی غیر نوشتہ روایات سے ماخوذ تھیں اور جنہیں اس نے بہت دلپسند ترکی نظم کا لباس دیدیا تھا۔

میں جب اس وقت کو یاد کرتی ہوں کہ وہ میرے ہرے لمپ کی روشنی میں بیٹھا یوسف اکچورہ کی کٹیلی اور طعن آمیز باتوں پر نرمی اور مہربانی سے مسکرا رہا ہے اور مذہب، ادب، اخلاق، ترکی عورتوں اور ترک بچوں کے لئے ایک بہتر حالت کا خواب دیکھ رہا ہے تو مجھے یقین نہیں آتا کہ اسی شخص نے جنگ عظیم کے آخر سالوں میں اتحاد و ترقی کو مادی فلسفہ کو مانا بلکہ اس کے نشو و نما میں مدد تک دی . . . .

اس پر جرمن فلسفہ کا بہت اثر تھا خصوصاً رکھائیم کا۔ لیکن اس کا آخری پیغمبر برگسان تھا البتہ ایک بات میں اسکا خیال ہمیشہ ایک تھا یعنی ترکوں کی ترقی کی سمت کیا ہو۔ اس کا یقین تھا کہ ترکوں میں کسی نہ کسی طرح مغربیت پیدا کرنی چاہئے . . . . اس کا قول ہے:- "میں نسل سے ترک ہوں، مذہب میں مسلمان ہوں، تہذیب و تمدن میں مغربی" اس کی کتاب "ترکیت، اسلامیت، مغربیت" میں اس کے فلسفیانہ اور جماعتی خیالات ہیں۔

کیوک الپ ضیا کے اتحاد تورانی کے ساتھ ساتھ انور پاشا اور انکے ساتھیوں کا اتحاد اسلامی تھا۔ جنگ کے آخری زمانہ میں اگر یہ لوگ بھی اتحاد تورانی کے حامی معلوم ہوتے تھے تو اس لئے کہ یہ تورانیوں کو ترکی سے متحد کرنا چاہتے تھے وہ مسلمان تھے۔ لیکن سیاسی اعتبار سے انکے اتحاد اسلامی کا بھی اتنا ہی خفیف اثر تھا جتنا اتحاد تورانی کا۔ مسلمان عربوں اور مسلمان البانیوں کیطرف سے علیحدگی کی کوششوں نے اس اتحاد اسلامی کا سارا کھیل بگاڑ دیا۔ علاوہ ازیں نوجوان اصلاحی عناصر، قدامت پسندی اور جنون مذہبی جانکر اس سے خائف تھے۔ اگر مسلمان اقلیتوں کے مقاصد اور انکی ضرورتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش ہوتی تو شاید انور پاشا کے اتحاد اسلامی کو حق بجانب ثابت کرنے میں مدد ملتی۔ لیکن کچھ ایسا ہوا کہ اس میں دلچسپی بس ترکی کے باہر والے مسلمانوں ہی نے لی۔ اتحاد اسلامی کی نسبت دوں اتحادی کا خوف بالکل بے بنیاد تھا اور اپنی

رعایا میں حقوق طلبی کی تمام تحریکوں کو ترکی اثر کا نتیجہ سمجھنا بالکل بے اصل تھا اور ہے۔ مجھے تو بڑی تفریح ہوئی جب میں نے لندن ٹائمس میں پڑھا کہ حجاز میں ابن سعود کی تحریک کو انگورا سے مدد مل رہی ہے! انور کی روح کو تو اس خبر سے یقیناً خوشی ہوگی لیکن موجودہ لامذہب ترکی حکومت کے لئے تو یہ طعن سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتی۔

قوم پرستی کی پہلی خارجی تنظیم 'ترک یوردو' میں ہوئی جو جنیوا کے ترک طلبہ نے بطور ایک ادبی و تمدنی کلب کے ۱۹۱۰ء میں قائم کیا تھا۔ اس میں چونکہ چند نہایت اچھے روسی ترک طالب علم شامل تھے اس لئے اس کی ذہنیت کم از کم تمدنی لحاظ سے تورانی تھی۔ اس کیطرف سے غیر موقت رسالے شائع ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں جن میں سے بعض میں نہایت عمدہ ادبی مضامین اور ترکیات پر نئی تحقیق شائع ہوتی ہے۔ اس کلب نے ایک تجویز منظور کی جس میں مجھے "ام الاتراک" کا لقب دیا گیا تھا یہ ترک نوجوانوں کیطرف سے ایسی تحسین تھی جس نے میرے دل پر صرف اثر ہی نہیں کیا بلکہ مجھ میں اپنی قوم کی ماں ہونے کے فرائض کا احساس بھی پیدا کر دیا۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آج میں اس نام کے دینے والوں کا پتہ دے رہی ہوں جو ترکی دنیا میں عام طور پر میرے ساتھ وابستہ ہوگیا ہے۔ یہی وہ بڑے سے بڑا معاوضہ ہے اور جو اگر مجھ سے پوچھا جاتا تو میں اپنی حقیر قومی خدمات کے لئے طلب کر سکتی۔

سال بھر بعد ذرا بڑی عمر کے محقق طلبہ نے ایک اور ترک یوردو قائم کیا جس میں مشہور مقنن و مدبر یوسف کمال بھی شریک تھے۔ دار السلطنتہ نے بھی تقلید کی۔ استمبول میں ترک یوردو کا قیام منجملہ ان بہت سے ذہنی کاموں کے تھا جو انجمن اتحاد و ترقی نے شروع کئے تھے لیکن جو لوگ انجمن میں تھے وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم نے اس کی مالی مدد کی لیکن اسے کبھی اپنا سیاسی آلہ کار نہیں بنایا۔ اس کلب کیطرف سے ایک ہفتہ وار پرچہ شائع ہوتا تھا جو اب بھی نکلتا ہے۔ اسکا مدیر یوسف اکچورا تھا جو بالاعلان اتحاد و ترقی کا مخالف تھا اگرچہ بڑا پکا تورانی تھا۔ اس نے اس پرچہ کو بہت کامیاب بنایا اور غالباً ترکی سے زیادہ اس کے پڑھنے والے روسی ترکوں میں تھے۔ اکچورا عثمانی

ترکوں کے مقابلہ میں روسی ترک کی فضیلت کا قائل تھا اور اس لئے دونوں کے اتحاد کا بڑا حامی۔ اس نے اس موضوع پر بڑے دلچسپ مضامین لکھے اور یہ بڑا لطیفہ ہے کہ جو ترکی زبان استعمال کرتا تھا وہ قدیم زمانہ کے عثمانیوں کی زبان تھی نہ کہ جدید قوم پرست ترکوں کی۔ اس پرچہ میں کیوک الپ ضیا، محمد امین، احمد حکمت، رضا توفیق اور دوسرے نوجوان قوم پرست مضامین لکھتے تھے۔

قوم پرستی کے خارجی مظاہر ایک درجہ اور گہرے ہوئے اور نئی نسل میں خصوصاً طلبہ میں پھیلے پہلے یہ چیز طبی طلبہ میں شروع ہوئی۔ شعبہ طب کو تقریباً ہر جدید تحریک کے آغاز کا فخر حاصل ہے خصوصاً جب یہ تحریک استبداد شخصی یا استبداد جہل و قدامت پرستی کے خلاف ہو۔ عبدالحمید کے ظلم کو یہیں سب سے زیادہ سکار ملے۔ لیکن اس ضمن میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ترک طالب علم اپنے کو سلطنت کے دوسرے عثمانی طلبہ سے مختلف اور علیحدہ کیوں سمجھتے تھے۔

۱۹۰۸ء کے بعد سے ترکی کے تمام غیر ترکی عناصر نے عیسائی ہوں یا مسلم اپنے اپنے قومی اور سیاسی کلب قائم کرلئے تھے۔ جب ترک طلبہ نے دیکھا کہ ہمارے ساتھی جنہیں ہم اب تک بالکل اپنا سمجھتے تھے علیحدہ علیحدہ نظاموں سے تعلق رکھتے ہیں جن کے نام جدا جدا جن کے مقاصد علیحدہ علیحدہ ہیں تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ غیر ترکی نوجوانوں میں اپنے قومی معاملات کے متعلق بڑی سرگرمیاں تھیں اور وہ انہیں ترکوں کے معاملات سے جدا سمجھتے تھے۔

عثمانی ترک اب تک ایک مجموعی ہستی تھا بس اوروں کی طرح عثمانی رعایا۔ اس کے بہترین مصنف سلطنت کے سب تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے لکھتے تھے۔ اس کے قصے کہانیاں اس کا عام ادب ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہتا تھا۔ تعلیم یافتہ اسے لکھتے نہ تھے لیکن تمام سادے ترکی بولنے والے عثمانیوں کے ذہن اور حافظہ میں بڑی قوت رکھتا تھا اب پہلی مرتبہ عثمانی ترک اپنے عنصر میں آیا اور ترکی میں نسلوں کے مجموعہ سے علیحدہ ہوا اور اس نے اس امکان کو دھندلے طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنے کو دوسرے سے مختلف حیثیت سے تلاش کرے، اور پائے۔ وہ اوروں سے مختلف کس طرح تھا؟ دوسروں کی آرزوؤں اور مقاصد کے انبوہ میں وہ کدھر چلا جا رہا تھا؟ خود اس نے

اپنے ملک میں تنہا اور بڑے مونس نکریپی تھیں دیکھا کہ وہ اوروں سے مختلف ہے بلکہ اس میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ اس اختلاف کی نوعیت کا پتہ چلائے۔

اس معنی میں ترک نوجوانوں کی پہلی تنظیم "ترک اوجک" میں ہوئی۔ یعنی پہلا قومی کلب ۱۹۱۲ء میں قائم ہوا۔ اس کے بانی چند طبی طلبہ تھے جنہوں نے اپنے نام ظاہر نہیں کئے۔ مساوات و اخوت کی روح "اوجک" میں مسلمہ روایت بنگئی۔ کوئی رکن دوسرے پر فوقیت نہ رکھتا تھا۔ اس کلب کی مدد بعض مشہور اہل قلم اور نامور ڈاکٹروں نے کی اور انجمن اتحاد و ترقی نے بھی۔

اس کے دستور کے دو اہم دفعات جنہیں عام کانگریس نے بھی کبھی نہ بدلا اور جن سے "اوجک" کی ذہنیت اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے یہ تھے:- (۱) اوجک ترکوں کی تمدنی ترقی میں مدد دیگا (۲) اوجک کوئی سیاسی ادارہ نہیں ان دونوں دفعات پر اوجک کے پرانے رکن ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء تک بڑی سختی سے قائم رہے۔ اتحاد و ترقی کے تسلط کے زمانہ میں نہ انتہا پسند اتحادی ان دفعات کو بدلوا سکے اور نہ ۱۹۱۸ء میں انکے تسلط کے مٹ جانے کے بعد انکے مخالف اسے فرقہ وارانہ سیاست میں گھسیٹ سکے۔

اوجک کا سب سے کارآمد زمانہ اس وقت شروع ہوا جب حمد اللہ صبحی بے اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اپنی بے مثل خطابت سے انہوں نے نوجوانوں پر بہت گہرا اثر قائم کرلیا اور انکے استقلال اور ہوشیاری نے تمام بڑے آدمیوں اور سب حکومتوں کو اس پر آمادہ کردیا کہ اوجک کی مدد کریں، روپیہ سے یا اور کسی طرح۔ نوجوان طلبہ کے علاوہ ترکی اہل قلم اور اکابر کی بڑی تعداد اس میں شامل ہوگئی اور قابل تعریف شغف کے ساتھ ترکوں کی تمدنی ترقی میں کوشاں رہی۔ بڑے بڑے آدمی بلا معاوضہ عوام کے لئے لکچر اور سبق دیتے تھے جن میں خاص طور پر کیوک الپ ضیا قابل ذکر ہیں۔ ہر سیاسی مذہب کا آدمی اور مختلف مقاصد رکھنے والے سب اس کی چھت تلے خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔

یہ کلب ان طلبہ کی مدد کرتے تھے جو ساری ترکی دنیا سے تعلیم پانے کیلئے استنبول آتے

ہیں۔ اوجک میں تمدنی لحاظ سے اتحاد تورانی کا رجحان تھا اور یہ اتحاد اسلامی کے مخالف تھے
کچھ سال بعد اتحاد تورانی کا خیال بھی مٹ گیا اور جغرافی قوم پرستی شروع ہوگئی جسکا حلقہ ترکی خاص اور
اس کے باشندوں تک محدود ہے۔

میں پہلی عورت تھی جسے ۱۹۱۲ء میں اُنکی عام کانگریس نے اپنا رکن منتخب کیا۔ ۱۹۱۸ء میں
عام کانگریس نے ۱۱ اشخاص کی ایک کمیٹی دستور اساسی کی ترمیم کے لئے مقرر کی۔ میں بھی اس کمیٹی
میں تھی اور ہم نے دستور میں دوسری تبدیلیوں کے علاوہ اس دفعہ کا اضافہ بھی کیا کہ عورتیں رکن
ہوسکتی ہیں۔ اس زمانہ میں متعدد اوجک تمام ملک میں قائم ہوگئے ہیں۔ آج کل خصوصاً ۱۹۲۴ء میں
انگورا میں جو تغیر دستور ہوا اس کے بعد سے ان اوجکوں کی حالت پر علیحدہ بحث کی ضرورت ہے۔

جن لوگوں کے پیش نظر کل انسانیت کی فلاح ہے اور جو اس کے ذریعہ بین الاقوامیت
پیدا کرنا چاہتے ہیں انہیں قوم پرستی ایک تنگ سطح نظر معلوم ہوتا ہے۔ مجھے میرے بین الاقوامی دوست
اکثر اس پر ملامت کرتے ہیں اور چونکہ میں نے اپنے بنی نوع کی خوشی کے لئے سعی کرنا چھوڑا نہیں ہے
خصوصاً انکے لئے جو مجھ سے قریب تر ہیں اس لئے میں نے دیانت داری سے کوشش کی ہے کہ اپنی قوم
پرستی کے حقیقی معنی کی جانچ کروں۔ آیا اس سے دوسروں کو جو ترک نہیں نقصان پہنچتا ہے اور آیا
اس سے آگے چلکر قوموں کے اس خاندان کو نقصان پہنچتا ہے جس میں ترکی بھی شامل ہے۔

ہر فرد یا قوم اگر وہ اپنے بنی نوع یا دوسری قوموں کو سمجھنا چاہتے۔ اپنی انفرادی یا اجتماعی
شخصیت کا اظہار کرنا چاہے، حسن و جمال کی تخلیق کی آرزومند ہو، تو اسے اپنے وجود کی جڑوں تک
پہنچنا اور اپنے کو خلوص کے ساتھ دیکھنا چاہیے۔ مطالعہ ذات یہ عمیق عمل اور اس کے نتائج بس یہی
قوم پرستی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس قسم کا قومی مطالعہ ذات اور اس کے نتائج کا تبادلہ بین الاقوامی
مفاہمت و محبت کا پہلا اور صحیح قدم ہے۔ جب میں اپنی قوم سے محبت کرلوں اور انکی خوبیوں اور
خامیوں کو کھلے دل سے سمجھنے کی کوشش کرلوں تب کہیں میں دوسروں کی خوشیوں اور تکلیفوں کو
اور انکی قومی زندگی میں انکی قومی شخصیت کے مظاہر کو سمجھ سکتی ہوں۔

خاں صاحب

ہمارے محلہ میں ایک خانصاحب رہتے تھے۔ میں نے جب اُنہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو اُن کی عمر قریب پینتالیس سال کے تھی، مگر روایات سے معلوم ہوا کہ اُنکے بال ہمیشہ سے ایسے ہی سیاہ و سپید کی آمیزش رہے ہیں، آنکھیں ایسی ہی خونی، مزاج ترش اور تو پی میلی۔ بواسیر کی شکایت بھی اُن کی ہستی سے وابستہ تھی، مدتوں سے وہ شہر کے تمام طبیبوں اور ہندوستان کی تمام درسگاہوں کی برائی کرتے چلے آئے تھے۔ ہمارے محلہ میں کسی کو بھی وہ دن یاد نہ تھے جب خانصاحب کی کریہہ اور دل لرزانے والی آواز گلی کوچہ میں نہیں گونجتی تھی۔ یا اُنکا سیاہ چہرہ قوی ہیکل جسم اور لمبا لٹھ خوف اور نفرت سے لوگوں کی نگاہیں نیچی نہیں کر دیتے تھے۔ خانصاحب کے پیشہ کا کسی کو علم نہ تھا، سوا اُن کمبختوں کے جنہیں کسی ناگہانی مصیبت میں روپیہ کی ضرورت ہوئی اور انہوں نے خانصاحب سے مدد مانگی۔ مگر انکی کیا مجال تھی کہ گالیاں سن کر اور سود در سود ادا کر کے بھی خانصاحب کے پیشہ کا کسی سے ذکر کریں۔ خاں صاحب سویرے جا کر مؤذن کو جگاتے تھے، مسجد کا امام اُن کے ڈر سے نماز میں لمبی لمبی سورتیں پڑھتا تھا۔ دیر تک دعا مانگتا، اور دعا مانگتے مانگتے کثرت گناہ کا احساس اُسے اکثر رلا بھی دیتا تھا۔ خانصاحب کی ذات نے اس مسجد کو جو علاوہ جمعہ کے ویران پڑی رہتی تھی اجتماع مسلمین کا مرکز بنا دیا تھا، جہاں پنج وقتہ نماز باجماعت ہوا کرتی تھی۔ خانصاحب کی داڑھی دیکھ کر شریفوں کیا گنڈوں میں بھی داڑھی مونڈنے کی ہمت نہ رہی۔ خانصاحب کا چہرہ سیاہ اور آنکھیں خونی تھیں تو کیا انہوں نے سینکڑوں مسلمانوں کی صورتیں منور کر دی تھیں، اُنکا مزاج ترش تھا تو کونسی شکایت کی بات، جب اس کی وجہ سے اتنے گمراہ بندے اپنے خدا کے قہر سے پناہ مانگنے لگے۔

ہمارے محلہ کے بنیے تو مستقل اختلاج کے مریض ہو گئے تھے۔ مگر بنیوں کا کیا۔ ان کا تو پیشہ ہی ہے۔ اگر دہلوتی میل سے کالی اور قلب میں اختلاج نہ ہو تو وہ سود کا نرخ کیسے

بڑھا ہیں۔ خانصاحب شریعت کے ایسے عالم تھے کہ بغیر کفر کا الزام اپنے سر لئے دنیاوی معاملات میں بھی کوئی اُن کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ منطقی ایسے کہ جوشِ گفتار سے دوسرے کا دماغ پھرا دیں، اور فلسفی اس پایہ کے کہ جب بیان شروع کریں تو کسی سے بغیر ہاں میں ہاں ملائے نہ بن پڑے۔ خانصاحب نہایت فصاحت و بلاغت سے دینِ اسلام کی خوبیاں اپنے پست اندیشہ ہمجنسوں پر روشن کرتے تنگ نظروں کو خدا کی مصلحت سمجھاتے، اور مناظر کائنات کی تعریف میں سرد آہیں بھرتے تھے۔ ہمارا محلہ غریبوں کا تھا۔ کسی بیچارے کو اتنی مہلت کہاں ملتی تھی کہ شریعت، فلسفہ، منطق اور جمالیات میں یہ امتیاز حاصل کرے۔ خانصاحب نے اپنی عقل و دانش اور مہیب شخصیت کے اثر سے محلہ والوں کے دل و دماغ اور قوتِ ارادہ کو معطل کر دیا تھا، اور محلے والے غلامی کے ایسی عادی ہو گئے تھے کہ انہیں اپنی آزادی کے دن یاد تک نہ رہے۔

خانصاحب جب ہمارے محلہ میں آکر بسے تو اپنی بیوی کو ساتھ لائے تھے۔ مدتوں تک نہ کسی نے انکی بیوی کی صورت دیکھی نہ کسی کو اُنکے گھر کا حال معلوم ہوا۔ بہت دن ہوئے ایک بچہ اُنکے دروازہ کے سامنے کھیلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سال دو سال بعد ایک بچی بھی اُس کے ساتھ کھیل میں شریک ہونے لگی مگر لوگ خانصاحب کے مکان کیطرف سے بغیر کسی ضرورت کے گذرنا پسند نہیں کرتے تھے اور جب بچہ کسی بیماری میں مر گیا تو لوگ بھول گئے کہ خانصاحب کے ایک لڑکی بھی ہے۔ میری خالہ کو یہ معلوم تھا، اس لئے کہ وہ بچہ کی تعزیت میں ہمت کر کے خاں صاحب کے یہاں جا پہونچی تھیں وہاں سے واپس آنیکے بعد وہ مہینہ بھر تک بخار میں مبتلا رہیں۔ مزاج پرسی کے سلسلہ میں خانصاحب کی بیوی کا بھی میری خالہ کے یہاں کئی دفعہ آنا ہوا، اور یوں دونوں بیویوں کے تعلقات بڑھ گئے مگر خانصاحب کی بیوی کی کیا مجال تھی کہ انسانیت کے فرائض ادا کریں اور میری خالہ کے گھر میں قدم رکھیں۔ اگر میری خالہ کو انکی سخاوت، دینداری اور غریب پروری نے محلہ کیا تمام شہر میں مشہور نہ کر دیا ہوتا۔ بیوہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے سامنے مرتے دیکھا تھا۔ اس صدمہ نے دنیا سے انکی طبیعت ایسی ہٹا دی کہ انہوں نے اپنی عمر عبادت کے لئے وقف کر دی، اور

جائداد کی ساری آمدنی غریب بچوں کی تربیت اور حاجت مندوں کی امداد میں صرف کرتی تھیں، ہر مولوی، ملا، امام، حافظ، عالم کو اُنکے یہاں سے وظیفہ ملتا تھا جن لوگوں کو خانصاحب سود پر روپیہ دیتے تھے وہ انکے یہاں اکثر آچکے تھے اور خانصاحب۔کہتے تھے اسوجہ سے چڑھے کہ مستقل وظیفوں میں میری خالہ کی آمدنی صرف ہو جاتی تھی اور وہ خود کبھی کبھی فاقہ سے رہتی تھیں۔خانصاحب نے شریعت کی پابندی اور ٹکے کے زور سے جو اقتدار حاصل کیا تھا وہ میری خالہ کے اثر سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اسی وجہ سے جب کبھی اُنکی بیوی میری خالہ سے ملنے آتیں تو وہ اپنا سلام بھی کہلا بھیجتے۔میری خالہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ خانصاحب کو ڈولی کا کرایہ دینا ناگوار گذرتا ہے، اور انہوں نے خانصاحب کی بیوی کو بہشتی کرایہ بھیجنے کا قاعدہ بنا لیا۔اس پر بھی خادمہ کو سخت تاکید تھی کہ خانصاحب اُسے دیکھنہ پائیں ورنہ وہ کرایہ وصول کرلیتے، اور کہلا بھیجتے کہ بیوی کی طبیعت بہت خراب ہے۔

خانصاحب کی بیوی کو جب میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ ادھیڑ عمر کی تھیں۔مگر اس سن پر بھی انہیں جوانی کے حسن کی جھلک نظر آتی تھی جسے دیکھکر تعجب ہوتا تھا کہ وہ خاں صاحب کے پنجہ میں کیسے پھنسیں اونچا قد، سڈول جسم، بڑی بڑی پر اسرار آنکھیں، لہجہ میں متانت، ہر شخص امیر ہو یا غریب جوان ہو یا بوڑھا، انہیں دیکھتے ہی اپنے دل میں اُنکی عزت کرنے لگتا۔برتاؤ میں ایسی ہمدردی، ایسا خلوص کہ دل سے ہزار پریشانیوں کی کدورت دور کردے۔طبیعت کی شریف ہونے کے علاوہ وہ اتنی تعلیم یافتہ اور مہذب تھیں کہ میری خالہ کو یقین ہو گیا کہ خانصاحب کے ساتھ اُنکی شادی سوچ سمجھ کر نہیں کی گئی۔غالباً اُنکے ماں باپ پر کوئی ایسی مصیبت آئی کہ اُن بیچاروں کو ایسی لڑکی ایسے آدمی کے سپرد کر دینا بھی غنیمت معلوم ہوا۔اصل واقعہ میری خالہ باوجود کثرت ملاقات کے دریافت نہ کر سکیں ایک دو بار انہوں نے پوچھا تو ضرور لیکن خانصاحب کی بیوی نے سرد آہیں بھر کر ٹال دیا اور اُن کا تکلف دیکھکر میری خالہ نے پوچھنا چھوڑ دیا، اس ناواقفیت سے ان دونوں کی گہری دوستی اور سچی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔اور جب خانصاحب کی بیوی نے ایکدن میری خالہ سے درخواست

کی کہ انکی بچی کی پرورش وہ اپنے ذمہ لیں تو انکی محبت اور پختہ ہوگئی۔

خانصاحب کی بچی سکینہ اس زمانہ میں دس بارہ برس کی تھی۔ میری خالہ کی بہت پہلے سے خواہش تھی کہ اُسے اپنے ساتھ رکھیں۔ لیکن ایک ستم زدہ ماں سے اُس کی اکلوتی بچی مانگنا انہیں کسی صورت سے گوارا نہ ہوا۔ خانصاحب کی بیوی نے شریفوں کے یہاں تربیت پائی تھی اور گو انہیں یقین تھا کہ میری خالہ کو انکی بچی سے بہت محبت ہے مگر انہوں نے اپنی طرف سے کبھی کوئی اشارہ نہیں کیا۔ سکینہ جب میری خالہ کے یہاں آتی تو بہت خوش ہوتی کھیلتی کودتی، خالہ کی خدمت بھی کرتی۔ جب جاتی تو ہمیشہ آنکھوں میں آنسو لیکر جاتی، اور خالہ سے وعدہ لیکر کہ وہ اسے پھر جلد یاد کریں گی۔ مگر دونوں بیویوں کے تکلف میں پانچ چھ سال گذر گئے۔ خالہ کے یہاں وہ مستقل طور پر یوں آگئی کہ وہ بڑی ہوگئی تھی، کہاروں نے اُسے ان کے ساتھ نہیں بیٹھنے دیا۔ خانصاحب نے اعلان کیا کہ اگر انہوں نے کبھی اسے رستہ میں چلتے دیکھا تو اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔ خالہ پر کہاروں کا کرایہ ویسے بھی بڑھ گیا تھا۔ ایک اور ڈولی کی درخواست اُن سے کیسے کیجاتی۔ پھر بھی یہ انتظام زیادہ تر سکینہ کی تحریک سے ہوا۔ وہ ابھی اپنی ماں کی مجبوریاں اور باپ کی فطرت نہیں سمجھی تھی۔ اس نے ایک دن کہا کہ وہ خالہ کے ساتھ رہنا چاہتی ہے، اور ماں نے خود ہمت کرکے اپنی طرف سے یہ درخواست کردی اس خوف سے کہ وہ کہیں واقعی کہہ نہ دے۔ اور میری خالہ کو گمان ہو کہ وہ براہ راست نہیں کہنا چاہتی تھیں اس لئے لڑکی سے کہلوایا۔ جب سکینہ کا میری خالہ کے ساتھ رہنا طے ہوگیا تو انہیں اور بھی مصلحتیں سوجھیں۔ خانصاحب سکینہ کو میلے چیتھڑوں میں رکھتے تھے اب وہ ایسی بچی نہیں رہی تھی کہ میلے ہونے کا الزام اُسی پر لگا دیا جائے۔ مگر وہ خانصاحب کو اپنی گرہ سے کچھ خرچ کرنے پر آمادہ نہ کرسکیں۔ خانصاحب سے یہ امید کرنا بھی فضول تھا کہ وہ اس کی آئندہ زندگی کے لئے سامان کریں گے۔ میری خالہ کے جو تعلقات تھے انہیں دیکھتے ہوئے سکینہ کے لئے ایک ہونہار شریف زادہ تلاش کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

یہ سب تدبیریں تھیں۔ پھر یکایک تقدیر نے اپنی صورت دکھائی۔ جب سکینہ میری خالہ

کے پاس ایک مہینہ کے قریب رہ چکی تھی تو خانصاحب نے اپنی بیوی سے پوچھا:

"کیوں ری، سکینہ کی تنخواہ تونے کاہے میں خرچ کر ڈالی ؟"

خانصاحب کی بیوی سہم گئیں۔

"کیسی تنخواہ ؟"

"ہونہہ! کیا کوئی اپنی پلی پلائی لڑکی کسی کو مفت میں دیتا ہے ؟"

خانصاحب کی بیوی نے بجائے جواب دینے کے اپنا منہ چادر میں لپیٹ لیا اور روتے روتے سو گئیں۔ اپنے شوہر کی بے حیائی پر انہیں ہر دوسرے تیسرے روز شرمندہ ہونا پڑتا تھا اس کی وہ عادی ہو گئی تھیں، لیکن اب تو انہیں خود بھی ذلیل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ اگر بچے کی کوئی امید ہوتی تو وہ اُس کی فکر کرتیں۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ خانصاحب بغیر اپنے ٹکے وصول کئے نہ مانیں گے۔ وہ اسی کشمکش میں تھیں کہ بات کیسے بنائی جائے کہ ایک روز جب وہ میری خالہ کی ڈیوڑھی میں ڈولی پر سے اتریں تو خانصاحب نکلتے ہوئے دکھائی دئے۔ اندر پہنچیں تو خالہ کو بہت برہم پایا، اور وہ بیچاری اپنا سا منہ لیکر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ خالہ کو سلام کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

جب مغرب کے بعد سکینہ کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ خالہ کا غصہ اتر گیا ہے تو روتی ہوئی انکے سامنے آئیں۔ خالہ نے انہیں گلے لگایا۔ ہمدردی کے کچھ آنسو ٹپکائے۔ مگر بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہیں، کہتیں تو کیا کہتیں ؟ خانصاحب نے اپنے افلاس کا دکھڑا رو دیا تھا۔ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ نوٹس دے گئے تھے کہ میری لڑکی مجھے واپس ملجائے یا میری بھی پرورش ہو

" ماں بوڑھی ہے، اُس سے کچھ کام کاج ہوتا ہوتا نہیں، اُسے خود سہارے کی ضرورت ہے میں جو کچھ کر سکتا ہوں کرتا ہوں، لیکن میں روٹی تو نہیں پکا سکتا! اتنی میری حیثیت نہیں کہ کسی کو نوکر رکھوں۔ اب حضور خود ہی سمجھ لیں۔ آدمی اولاد کی پرورش اسی لئے کرتا ہے کہ بڑھاپے میں آرام ملے۔" میری خالہ سمجھ گئیں۔ اگر ہو سکتا تو وہ کچھ نقدی خانصاحب کے حوالے کرتیں، مگر انہیں خود اُن دنوں روپیہ کی بہت سخت ضرورت تھی۔ زیادہ غصہ انہیں اپنی بے بسی پر آیا۔ مگر جس طرح سے خانصاحب

نے اپنی بیوی کے ضعف پیری اور اُنکی حاجتوں کو گفتگو میں پیش بیش رکھا وہ بھی انہیں بہت ناگوار گذرا۔ خانصاحب کی بیوی نہ بوڑھی تھیں نہ ضعیف، گھر کا کام کر کے وہ اکثر میری خالہ کے یہاں پکانے میں مدد کرتی تھیں۔ خانصاحب جس کفایت شعاری سے رہتے تھے اس کے لحاظ سے امور خانہ داری کوئی بار نہیں ہو سکتے تھے، نہ کسی کا قرض، نہ کہیں سے تقاضا، نہ کوئی بحث مباحثہ، اور پیٹ بھی کتنے بھرنے تھے۔ جب سے سکینہ چلی گئی تو چار روٹی، ذرا سی بھاجی، ہفتہ عشرہ دو چار بوٹی گوشت، اور جب وہ بھی تو بھی ماں اپنے حصہ میں سے اُسے کھلاتی تھی، خاں صاحب کو کبھی یہ محسوس تک نہ ہوا کہ وہ اولاد کی پرورش کر رہے ہیں۔

یہ سب ماجرا خانصاحب کی بیوی نے میری خالہ کو سنایا، مگر اس متانت اور ضبط سے کہ خاں صاحب پر کسی طرح کا صریح الزام نہ آئے۔

"یہ تو سب کچھ ہے، مگر بیوی میں شکایت کس منہ سے کروں۔ خانصاحب ایسے متقی پرہیزگار روزہ نماز کے پابند ہیں جس کسی سے بھی پوچھو وہ بتادے گا کہ انکی ذات سے کتنوں کو فائدہ پہونچا کتنے مسلمان اپنے فرائض سے آگاہ ہوئے، مسجد ویران پڑی رہتی تھی، اب وہاں پنج وقتہ نماز باجماعت ہوتی ہے، ہزاروں کے لبوں پر اللہ کا نام ہے، سیکڑوں اُن کی دلیلوں سے قائل ہو کر شریعت کے احکام پورے کرنے لگے ہیں"

"ہاں بہن، اس میں تو کوئی کلام نہیں"

"اور پھر بیوی وہ معاملے کے ایسے صاف سچے ہیں، جھوٹے وعدے سے زیادہ انہیں کوئی بات ناگوار نہیں ہوتی، مجھ سے خود ہی کہہ رہے تھے کہ سکینہ کو اس طرح آپ کے متھے تھوپ دینا بیجا ہے"

"تم بھی بہن کیسی باتیں کرتی ہو . . . . سکینہ کو تو میں اپنی بیٹی سمجھتی ہوں"

"یہ تو بیوی میں جانتی ہوں، میرا دل جانتا ہے . . . . مگر ہم لوگ غریب ہیں۔ آپ کو چاہے جتنی محبت ہو، خانصاحب کو تو ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں اُس کا دماغ نہ پھر جائے . . .

اُسے آخر غریبوں ہی کے گھر میں زندگی بسر کرنا ہے"
"واہ بہن، تم نے بیٹھے بیٹھے مجھے رئیس خوب بنا دیا، میں بھلا اس کی کون سی خاطر کر سکتی ہوں کہ اُسکا دماغ پھر جائے۔ تم خود ہی روز دیکھتی ہو کہ میں کیسے رہتی ہوں اور وہ کیسے رہتی ہے"
"بیوی آپ کو تو سخاوت اور دینداری نے غریب کر دیا ہے، ہماری نظروں میں تو آپ رئیس ہی ہیں"
"اچھا بہن، اگر ایسا ہی ہے تو اپنی لڑکی لیجاؤ۔ میں کوئی اور سہارا ڈھونڈھ لوں گی۔ تمہاری بیٹی کی عادتیں تو نہ بگڑنے پائیں" میری خالہ نے ٹھنڈی سانس لی اور منہ پھیر لیا۔
خانصاحب کی بیوی چونکی ہو گئیں۔ وہ خانصاحب کی صفائی تو ضرور کرنا چاہتی تھیں لیکن سکینہ کو اپنے گھر واپس بلا لینا بھی انہیں کسی صورت سے منظور نہ تھا۔
"بیوی آپ خفا نہ ہوں، خانصاحب تو بات کے دھنی ہیں، جو بات جی میں ٹھان لیتے ہیں اُسے چاہتے ہیں کہ فوراً کر بھی دکھائیں۔ میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ ابھی آپ کے پاس نہ حاضر ہوں، مجھے پہلے آپ کو سارا ماجرا سنا لینے دیں۔ سکینہ آپ کی لونڈی ہے۔ بھلا ہمیں کب یہ گوارا ہو گا کہ اُس کی وجہ سے آپ کو کسی طرح کی تکلیف پہونچے۔ اُس کی پرورش منظور ہے تو بڑی خوشی سے اپنے پاس رکھئے۔ وہ بھی سدھر جائے گی، ہم بھی آپ کو دعا دیں گے۔ آپ جیسا سرپرست اس دنیا میں اُسے کہاں ملے گا۔۔۔"
"مگر بہن" خالہ نے بات کاٹ کر کہا "میں اُسے تنخواہ تو نہیں دے سکتی۔ میرے پاس جو کچھ ہے اُس کا حساب کتاب تم خود جانتی ہو"
بیوی خدا کا شکر ہے اُس نے ہم کو کھانے کو دیا ہے۔ خانصاحب کا تو یہ منشا بھی نہیں تھا کہ اُس کے نام سے ہماری پرورش کریں۔ ہاں وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ سکینہ اپنی حیثیت نہ بھول جائے، وہ آپ کی لونڈی ہے کبھی اپنے آپ کو بیٹی نہ سمجھنے لگے۔ یہی انہیں اندیشہ تھا۔ مگر وہ بات کہنا نہیں جانتے، خدا جانے آپ سے کیا کہہ بیٹھے۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ میں انہیں سمجھا لوں گی"

"ہاں بہت تم انہیں سمجھا دو۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ حاضر ہے۔ تنخواہ دینا میرے بس کی بات نہیں"

خانصاحب کی بیوی کچھ ادہر ادہر کی باتیں کر کے گھر چلی گئیں، وہاں پہنچکر میاں بیوی میں کچھ جھگڑا ہوا، مگر روپیٹ کر بھی خانصاحب کو انکی بیوی اس پر آمادہ نہ کر سکیں کہ وہ تنخواہ سے دستبردار ہوں۔ خالہ سے جو گفتگو ہوئی تھی اُسے نکرا نہیں، ایک اور قوی دلیل مل گئی

"ہم غریب آدمی ہیں" انہوں نے اپنی بیوی سے کہا "اگر سکینہ کے سامنے ہر مہینہ اُسکی تنخواہ وصول نہ کی گئی تو وہ خود کو رئیس زادی سمجھنے لگے گی، ہماری صورتیں دیکھکر ناک بھوں چڑھانے لگے گی"

"ارے واہ" خانصاحب کی بیوی نے بگڑ کر کہا "تم میری لڑکی کو سمجھے کیا ہو۔ ایسی شریف طبیعت کی لڑکی شہر شہر تلاش کرو تو نہ ملے۔ تم اپنے ٹکے وصول کرنے کے لئے چاہے جو کچھ کہا کرو"

خانصاحب نے اپنی بیوی کو گھور کر دیکھا۔ انکی آواز معمول سے زیادہ بلند ہو گئی تھی، اور خانصاحب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی محلہ والا انکی باتیں نہ سن لے۔ خانصاحب کی بیوی نے جب خالہ کے سامنے بھی اپنے شوہر کی رسوائی منظور نہیں کی تھی تو اب کیسے بے لگام ہو جاتیں۔ یہ سوال نیا تھا، ایک بار اور ضبط کر گئیں۔

"خیر کچھ بھی ہو" انہوں نے دبی آواز سے کہا "میں سکینہ کی تنخواہ نہ مانگوں گی نہ تمہیں مانگنے دوں گی"

"تو میری لڑکی واپس کرو"

"واپس بلا لو۔ میرا کیا جاتا ہے۔ مگر روٹی کپڑا نہ ملا تو گھر گھر دکھڑا روتی پھروں گی"

اس دھمکی کا خانصاحب پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ لیکن چاہے جتنی کفایت کیجائے، آخر نہ کچھ تو سکینہ کی وجہ سے اخراجات میں اضافہ ہونا ضروری تھا۔ خرچ کا نام سنکر انکے کان کھڑے ہو گئے۔

"اچھا ری، اگر تنخواہ نہیں لیتی تو کچھ غلہ، روٹی، کپڑا تو مانگ لایا کر"

خانصاحب کی بیوی چپ ہو گئیں۔ خانصاحب سمجھے کہ وہ راضی ہیں۔

یہ گفتگو رات کے وقت مکان کے چھوٹے سے صحن میں ہوئی تھی۔ گرمی کا موسم تھا، خانصاحب شام ہی سے دو پلنگڑیاں صحن میں بچھوا لیتے تھے۔ مغرب کی نماز سے واپس آتے ہی وہ ٹانگیں پھیلا کر پیٹھ کے بل لیٹ جاتے، اللہ ہو اللہ ہو کرتے یا حمد و نعت کی سنی سنائی غلط سلط نظمیں اپنے کریہہ لہجے میں گاتے۔ یہ عبادت کا سلسلہ کھانے تک جاری رہتا، اگر کھانے کے بعد نیند فوراً نہ آئی تو پھر اسے شروع کر دیتے، یا بیوی کو اپنا فلسفہ سناتے اس روز کے بحث و مباحثہ کے غبار سے اپنی اور اپنی بیوی کی طبیعت صاف کرنے کے لئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ کچھ بیان کیا جائے۔ انکی بیوی کئی بار پلنگ سے اٹھ کر اندر چلی گئیں، یا چادر میں منہ لپیٹ لیا اور کہا کہ انکو نیند لگی ہے۔ لیکن خانصاحب کی تقریر کی طوالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اطاعت اور تابعداری کی خو بیان کر رہے تھے، اور یہ باب لا انتہا ہے۔

خانصاحب نے سوچا تھا کہ انکی بیوی تنخواہ کی بجائے روٹی دال چاول مانگ لائیں گی اور اولاد کی "پرورش" پر انکا جو خرچ ہوتا تھا اس کی یوں تلافی ہو جائیگی۔ مگر انکی بیوی نے کچھ بھی مانگنے سے صاف انکار کر دیا۔ تھوڑے دن خانصاحب نے انتظار کیا، اور جب انکو یقین ہو گیا کہ بیوی کے ذریعہ سے ایک دانہ چاول تک نہ ملیگا، تو انہوں نے دوسری ترکیبیں اختیار کیں۔ کبھی بے بلائے خالہ کے یہاں مہمان ہو جاتے کبھی کہتے کہ بازار [illegible] اگر اجازت ہو تو سکینہ کے لئے دو چار گز خرید لاؤں، اور معمولی [illegible] کرتے۔ ہر دوسرے تیسرے دن خالہ سے ایک مختار رکھنے کی درخواست کرتے، اور [illegible] بیان کرتے جو ایک مختار رکھنے کے نہ ہونے سے پیش آ سکتی تھیں۔ [illegible] کہ یہ سب سکینہ کی تنخواہ منظور نہ کرنے کی سزا ہے۔ اور ممکن ہے وہ تنگ آ کر سکینہ کو اس کے گھر واپس روانہ کر دیتیں۔ اس مصیبت سے سکینہ کو اس کی ماں نے بچایا، وہ بیچاری ہر طرح سے خالہ کو

خوش رکھنے کی تدبیریں سوچتی رہتیں۔ جس دن خانصاحب خالہ کے یہاں مہمان ہوتے وہ آکر کھانا پکا جاتیں۔ اگر کبھی موقعہ ملتا تو خانصاحب کی آنکھ بچا کر خیرات کے لئے کچھ نہ کچھ خالہ کے پاس لے آتیں۔ خالہ اگر اُن سے کسی بات پر خوش ہوتیں تو وہ یہ کوشش کرتیں کہ خانصاحب کے بارے میں انہیں جو بدگمانی ہے وہ کم ہوجائے۔ یا کوئی عملی صورت نہ اختیار کرے۔ خالہ کو خانصاحب کی سیرت پسند تو کبھی بھی نہ ہوسکتی تھی۔ لیکن ان کی بیوی کے ایثار اور جانفشانی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ خانصاحب کی بے تمیزیوں اور کمینی حرکتوں سے درگذر کرتی رہیں۔

یوں ہی دو سال گزر گئے۔ خانصاحب کی بیوی نے جس امید میں پچھلے دو تین سال کاٹے تھے اُس کے پورے ہونے کا وقت آگیا۔ سکینہ جوان ہوگئی تھی۔ اور خالہ یہ دیکھکر اُس کے لئے شوہر تلاش کرنے لگیں۔ اسی سلسلہ میں انہیں میرے بچپن کا ایک ساتھی یاد آیا جو صورت اور سیرت کے لحاظ سے خوبیوں اور نیکیوں کا مجموعہ تھا۔ لیکن ابھی تک افلاس کی وجہ سے اس کی شادی نہیں ہوسکی تھی۔ خالہ نے اسے اپنے یہاں بلوایا۔ بڑی جدوجہد سے اُسے کسی دفتر میں نوکر رکھا یا اور شادی کے لئے سامان جمع کرنے لگیں۔ انہوں نے ابھی اپنا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ لیکن سکینہ کو وہ اس نوجوان سے پردہ کراتی تھیں۔ اور کوئی رشتہ کی لڑکی نہیں تھی جس کی شادی کا سامان مہیا کرنا ضروری تھا اور یوں خانصاحب کی بیوی سمجھ گئیں کہ یہ سب سکینہ کے لئے ہو رہا ہے۔ لڑکا بھی انہیں بہت پسند تھا، اور وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہونے لگیں کہ اب انکی تقدیر پلٹی ہے اور برسوں کی جفاکشی کا اب کچھ اجر ملیگا۔

خالہ نے اُن سے ابھی تک شادی کے معاملہ میں کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھیں کہ لڑکے کی آمدنی کا کوئی ذریعہ ہوجائے اور جب اس میں کامیابی ہوئی تو جہیز کی فکر میں پڑ گئیں۔ اسی وجہ سے خانصاحب کی بیوی نے خانصاحب سے بھی کچھ نہیں کہا۔ لیکن خانصاحب کی نظر بہت تیز تھی۔ ایک مرتبہ رات کو جب انکی بیوی بیٹی محبت کے خواب دیکھ رہی تھیں انہوں نے کہا:۔

"کیوں ری ، یہ بی بی کہیں اس لڑکے سے سکینہ کی شادی تو نہ کر بیٹھیں گی ؟ "
خانصاحب کی بیوی چونک پڑیں۔
"کیوں ؟ "
" میں تو اپنی لڑکی ایسی سستی دینے والا نہیں ۔ ۔ ۔ اُس کنگال کے پاس ہے کیا "
"سکینہ کے پاس کیا ہے "
"سکینہ کے پاس کچھ نہ سہی ، ہمیں تو حوصلہ ہے "
" کاہے کا حوصلہ ؟ "
" وہ حوصلہ جو ہر ماں باپ کو ہوتا ہے ، کچھ نقد ملے ، کچھ مہر ملے ، ہمارے پاس بھی بڑھاپا کاٹنے کے لئے کچھ روپیہ ہو ، لڑکی کا کیا ، وہ اپنے گھر جاکر بیٹھ رہے گی ، ہم کو پوچھے گی بھی نہیں ، اُس کی شادی کر کے کیا ہم فاقے کریں گے ؟ "
خانصاحب نے اپنی بیوی کو عمر بھر یہ بتایا تھا کہ اُنکی گذر اوقات کا ذریعہ کیا ہے ، خرچ کے لئے روز کے روز اپنی گرہ سے نکال کر کچھ دیدیتے ، یا بازار سے خود خرید لاتے ، اس لئے جب وہ فاقہ کی دھمکی سناتے تو انکی بیوی کچھ جواب نہ دے سکتیں ۔ اب بھی وہ خاموش ہوگئیں ، اور دیکھا تو دل کو بھی امیدوں سے خالی پایا۔
انہیں یقین تھا کہ خانصاحب نے اپنے حوصلے پورے کرنے چاہے تو سکینہ کی زندگی برباد ہوگی ، اور اسے بچانے کی یہی صورت تھی کہ خانصاحب کا منہ روپیہ سے بند کیا جائے ۔ روپیہ نہ اُنکے پاس تھا نہ میری خالہ کے پاس اور خانصاحب سے جھوٹے وعدے کرنا خطرناک بھی تھا اور مشکل بھی ، مگر جو ڈوب رہا ہو وہ تنکے کا بھی سہارا لیتا ہے ۔ انہوں نے دوسرے دن میری خالہ سے آکر کہا :۔
" بیوی سکینہ اب ماشاءاللہ جوان ہوگئی ہے ۔ آپ ہی کی عنایت سے اُس نے پرورش پائی ، اب خدا کا نام لیکر ایک اور احسان بھی اُس پر کر دیجئے "

میری خالہ سمجھ گئیں۔

"بہن میں اسی فکر میں مبتلا ہوں۔ لڑکا ڈھونڈھا ہے، اسے نوکری دلوائی ہے۔ اب جہیز کی فکر میں ہوں۔ دیکھو کب تک شادی کی نوبت آتی ہے۔"

"ہاں بی بی لڑکا تو آپ نے بہت اچھا پسند کیا ہے۔ خانصاحب نے اُسے اس نظر سے تو نہیں دیکھا، مگر تعریف بہت کر رہے تھے۔ یہ بھی کہا تھا کہ سکینہ کی اس سے نسبت ٹھہر جائے تو بہت اچھا ہوگا" پھر سوچ کر۔ "مگر بی بی نوکری کتنے کی ہے"

"ابھی تو تیس روپیہ ملیں گے، سال دو سال بعد شاید کچھ ترقی ہو جائے"

"بی بی میں تو دل و جان سے آپ کی شکر گذار ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بہن میرے بس کی کیا بات تھی، یہ تو سب خدا کی دین ہے۔"

"ہاں بی بی یہ سب ٹھیک ہے جو کچھ کرتا ہے خدا ہی کرتا ہے۔"

میری خالہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"مگر بی بی اب ہم بھی بوڑھے ہو چلے ہیں، ہمارے پاس کوئی اور سہارا نہیں ۔ ۔ ۔ خانصاحب تو کہتے ہیں کہ خدا کی مرضی ہے تو ہم کو کہیں نہ کہیں سے کھانے کو ملتا رہے گا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تیس روپیہ میں ہمارا گذر کیسے ہوگا۔"

"اچھا بہن" میری خالہ نے کچھ طنز سے کہا "تم نے ابھی سے پورا حساب بھی لگا لیا"

"بی بی حاجت ہوتی ہے تو آدمی ہر وقت اپنے ٹکے گنتا رہتا ہے"

میری خالہ سے خانصاحب کی بیوی نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ انہیں یہ تو کسی صورت سے معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ خانصاحب کی بیوی اپنے شوہر کی بے حیائی چھپانے کے لئے گندہ کے اخلاقی جرموں کا الزام ابھی سے اپنے سر لے رہی ہیں، اور وہ بہت خفا ہوئیں۔

"سنو بہن میرے بس کا جو کچھ ہے وہ میں کر رہی ہوں۔ اگر تمہاری ہوس اسے کم سمجھتی ہے تو جو جی چاہے کرو، میں اس سے دست بردار ہوتی ہوں۔"

خانصاحب کی بیوی تھوڑی دیر تک روتی رہیں اُس کے بعد اُٹھ کر چلی گئیں۔ رات کو
انہوں نے خانصاحب سے کہا :۔

"بی بی سو روپیہ نقد دینے اور ایکہزار کا مہر باندھنے پر تیار ہیں۔ مگر نکاح کے بعد

خانصاحب نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"شادی پر سو روپیہ دے تو کیا دے۔ اور ہزار کا مہر کون شریف زادی قبول کرے گی۔"

خانصاحب کی بیوی نے ہمت کر کے جھوٹ بولا تھا، سو وہ بھی بے سود رہا۔ اب وہ چادر
میں منہ لپیٹ کر رونے لگیں اور روتے روتے سو گئیں۔

دوسرے دن انہوں نے میری خالہ سے جا کر کہا کہ خانصاحب نے انہیں قائل کر دیا ہے،
اور جو خالہ مناسب سمجھیں وہی کریں۔ میری خالہ کو بہت تعجب ہوا کہ خانصاحب ایکبارگی اس تمہ۔
راضی برضا ہو گئے اور بیوی ہوس کے پھیر میں پڑ گئیں۔ لیکن انہوں نے اس مسئلے پر زیادہ غور۔
نہیں کیا، خالہ سے گفتگو میں خانصاحب کی بیوی نے بہت دنوں تک سکینہ کی شادی کا سوال
نہیں چھیڑا، مگر خانصاحب سے انکی روزمرہ لڑائی ہوتی رہی۔ خانصاحب خوشی سے تو کبھی اپنی
لڑکی تیس روپیہ کے نوکر سے نہ بیاہتے۔ لیکن یہ ممکن تھا کہ انکے ہاتھ بندھ جائیں اور عین موقعہ پر
وہ کچھ نہ کر سکیں۔ اسی کی خانصاحب کی بیوی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک دن انہوں نے خانصاحب
سے کہہ دیا کہ وہ سب کچھ طے کر چکی ہیں اور عنقریب شادی کی تاریخ مقرر ہونے والی ہے۔ اب اگر
خانصاحب نے دخل دیا تو بڑا فضیحتا ہو گی۔ خانصاحب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ بھی
غافل نہیں بیٹھے رہے تھے۔ انہیں ایک نواب کی خبر ملی تھی جو عیاشی کرتے تھے اور قرض بھی لیتے
تھے خانصاحب اُنکے مصاحب بن گئے۔ موقعہ پا کر بہت اچھے نرخ پر کچھ قرض بھی دیدیا۔ جب بیوی
سے یہ اطلاع ملی کہ سکینہ کی شادی ہونیوالی ہے تو اُس بیچاری کا بھی انہوں نے فیصلہ کر دیا۔ ایک
روز شام کو جب انکی بیوی گھر پر مصروف تھیں تو وہ میری خالہ کے یہاں پہونچے، سکینہ کو رات بھر
کے لئے گھر لیجانے کی اجازت چاہی اور اُسے یکہ پر بٹھا کر لے گئے۔

رات کو وہ اکیلے گھر پہنچے تو کھانے میں کچھ دیر ہوگئی تھی۔ بیوی نے انہیں دیکھتے ہی جلدی جلدی کھانا نکالنا شروع کیا، مگر بجائے کھانے کے لئے بیٹھنے کے وہ دیا اندر اٹھالے گئے، اور گرہ سے نوٹ نکال کر گننے لگے۔ جب گن چکے تو بیوی سے کہا۔

"دیکھ تو کہہ رہی تھی کہ سکینہ کی شادی سے ہم کو کیا مل سکتا ہے۔ پانسو روپیہ نقد اور دس ہزار کا مہر لکھوالایا ہوں۔ اور کسی کی کیا مجال ہے کہ کچھ کہے۔ اپنے سامنے نکاح کرایا، اور چار گواہوں کے دستخط ہیں"

بیوی کے ہاتھ سے کفگیر گر پڑا۔ انکا سر چکر کھانے لگا، اور وہ وہیں تپلیوں کے بیچ میں لیٹ گئیں۔ خانصاحب نے نہایت اطمینان سے کھانا نکالا، کھایا اور حسب معمول ٹانگیں پھیلا کر پیٹھ کے بل لیٹ گئے اور حمد و نعت کی نظمیں پڑھنے لگے۔ آج وہ معمول سے زیادہ مطمئن تھے۔ خدا کی نعمتوں کا بہت شکریہ ادا کیا، کائنات کی گل کاریوں کی بہت تعریف کی، اور جب نیند نے انکی آنکھیں بند کیں تو ان کی زبان پر یہ شعر تھا ؎

ترا نام قہار جبار ہے مرا نام خاکی گنہگار ہے

مجھے یہ نہیں معلوم کہ انکی بیوی کا اس کے بعد کیا انجام ہوا۔ میری خالہ کو انہوں نے پھر کبھی اپنی صورت نہیں دکھائی، اور اس کے تھوڑے دن بعد ہی میری خالہ کا انتقال بھی ہوگیا۔ مگر خانصاحب اسی طرح سے محلہ پر حاوی رہے۔ انکے آخری کارنامے نے انکے وقار کو بہت بڑھا دیا تھا، لوگ انہیں زیادہ جھک کر سلام کرتے تھے۔ مسجد میں اور زیادہ پابندی سے نماز ہوتی تھی۔

اقتباسات

جرمن مستشرقین کی ایک کانفرنس ہر دو سال بعد اپنا اجلاس کرتی ہے۔ چنانچہ پانچواں اجلاس گذشتہ سال اواخر اگست میں شہر بان میں منعقد ہوا جس کی کارروائی کی مفصل رپورٹ انجمن مستشرقین المانی کے رسالہ (Z. D. M. G.) کے نمبر ۳ و ۴ جلد ۷ میں شائع ہوئی ہے۔

شہر بان مشہور جرمن ماہر موسیقی بے تھوون کا مولد ہے۔ اسی رعایت سے کانفرنس کا اجلاس بے تھوون کی موسیقی سے کیا گیا۔ ہز ایکسلنسی فریڈرش روزن نے صدارتی تقریر فرمائی اور بان یونیورسٹی کے شیخ نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ پردیسی علما میں سے پروفیسر مارگن اسٹرن (سنسناٹی) پروفیسر لان من (ہارورڈ یونیورسٹی)؛ اور پروفیسر ادنیک موجود تھے۔ انگلستان کی طرف سے گلاسگو کے پروفیسر اسٹی ونسن نے تقریر کی۔ اس روز خاص مقالہ برلن یونیورسٹی کے پروفیسر لوڈرس نے پڑھا جو حال میں ہندوستان کا دورہ کر کے واپس گئے ہیں۔ ان کا موضوع تھا "ہندوستان میں لسانیات، تاریخ اور اثریات"۔

دوسرے روز بلدیہ بان نے مستشرقین کی دعوت کی اور اپنے شہریوں کی طرف سے خیر مقدم کیا۔ اسی دن جرمن فلسطینی انجمن نے اپنے ۵۰ سال ختم کرنے کی تقریب میں ایک جلسہ کیا جس میں پروفیسر آلٹ نے "فلسطین کے متعلق تحقیقات کی موجودہ حالت اور اس کے حل طلب مسائل" پر نہایت محققانہ مضمون سنایا۔ اسی سلسلہ میں دوسرے دلچسپ مضامین بھی سنائے گئے۔

تیسرے روز مسٹر ہرتس فلڈ (طہران) نے جدید ایرانی تحقیقات، پر ایک عالمانہ مقالہ سنایا رات میں پروفیسر شیفر نے "مصری فن لطیف" پر ایک مضمون پڑھا۔ اور اس کے بعد ڈاکٹر راٹ ہنس (ہامبرگ) نے پہلی مرتبہ وہ دو فلم دکھائے جو انہوں نے عرب کے متعلق تیار کئے ہیں۔ ایک کا نام ہے "مقدس عرب" جس میں حج کے مراسم دکھائے گئے ہیں اور دوسری کا نام ہے

، خینگ آزاعرب ، اس میں یمن اور سفر صنعار کی تصویریں ہیں ۔

اس موقع پر یونیورسٹی کیطرف سے شعبہ مشرقیات نے تین نمائشیں کی تھیں ۔ایک تو مشرقی مسیحی کلیساؤں کی دعاؤں کی اور دوسری مذہبی کتابوں کی نمائش تھی جس میں بڑا حصہ پروفیسر گوسین آنجہانی کے نادر مجموعہ کتب سے حاصل کیا گیا تھا - دوسری نمائش نہایت قدیم عبرانی کتابوں کی تصاویر عکسی پر مشتمل تھی ۔

تیسری نمائش میں مصر، چین ، جاوا ، ترکی اور شمالی افریقہ کی پرچھائیں کی تصویریں دکھائی گئی تھیں جن میں علاوہ علما ، کے دوسرے لوگوں نے بھی بہت دلچسپی لی ۔

کانفرنس کے مختلف شعبوں نے اس سال کے اجلاؤں میں کل چار قرار دادیں منظور کیں جنہیں پھر کل کانفرنس نے بھی منظور کرلیا - ان تجاویز میں سے دو ہندی - ایرانی شعبہ نے پیش کی تھیں یعنی یہ کہ جرمن یونیورسٹیوں میں جدید ہندوستانی زبانوں خصوصاً غیر آری زبانوں کی تعلیم اپنی علمی حیثیت نیز عملی وجوہ سے بہت ضروری ہے چنانچہ کانفرنس توقع کرتی ہے کہ مختلف علاقوں کی حکومتیں اپنی اعلی التعلیم گاہوں میں انکی تعلیم وتحقیق کا انتظام کریں گی ۔ دوسری یہ کہ اس کانفرنس کی رائے میں ہندوستانی اور اس سے وابستہ دوسری تہذیبوں کو سمجھنے کے لئے بدھ مت کا سمجھنا بہت ضروری ہے اس لئے اس کے مطالعہ کے لئے ایک تحقیقی ادارہ کا قیام ضروری ہے ۔

تیسری تجویز ترکی - اسلامی شعبہ کی طرف سے تھی یعنی یہ کہ فریڈرک بول کی مشہور کتاب "سیرت محمدی" ، کا ترجمہ جسے عرصہ ہوا ڈاکٹر شیڈر نے تیار کیا تھا جلد سے جلد طبع کرا دیا جائے چوتھی تجویز جاوجیا کے متعلق تحقیقات کی ضرورت اور اہمیت پر تھی یہ چار قراردادیں اس کانفرنس نے منظور کیں جس کے مختلف شعبوں میں ۸۰ علماء نے تحقیقاتی مضامین پڑھے !

ترکی اسلامی شعبہ میں بھی بہت سے دلچسپ اور مفید مضامین پڑھے گئے ۔جن میں سے بعض غالباً انجمن کے رسالہ کی آئندہ اشاعتوں میں طبع ہو جائیں گے بعض کے خلاصے اسی پرچہ میں درج کر دئیے گئے ہیں ۔بعض عنوانات درج ذیل ہیں ۔

۱- بارم استارک : پیغمبر اسلام اور عیسائیت۔
۲- برتھولڈ : مصر میں بازنطینی۔ عربی معیشت اور انتظام ملکی۔
۳- فشر : اسم محمد۔
۴- گوتیس : ہندی اسلامی تاریخ تمدن کے لئے نیا مواد۔
۵- مٹ دو نخ : جنوبی عرب کے نئے کتبے
۶- رسکا : جابر کے متعلق تحقیقات کی تاریخ

گوتیس کا مضمون بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ہندوستانی تصویروں کی تشریح و توضیح کر کے مسلمانوں کے زمانہ کے ہندوستانی تمدن کے متعلق مفید باتیں معلوم کی ہیں۔

جرمن مستشرقین کا آئندہ اجلاس ۱۹۳۰ء میں شہر ویَن (اسٹریا) میں منعقد ہوگا۔

انگلستان میں ۱۹۲۶ء کے اندر جو کتابیں شائع ہوئیں انکی مضمون وار تقسیم سے پڑھنے والوں کے مذاق کا پتہ چلتا ہے اس سال کے اعداد بھی گذشتہ اعداد کی تصدیق کرتے ہیں۔ قصے اور ناول سب سے زیادہ طبع ہوئے یعنی کل ۳۵۲۹ کتابیں۔ اس مضمون میں گذشتہ سال کے مقابلہ میں ۱۶۱ کتابوں کا اضافہ ہوا۔ دوسرا نمبر بچوں کی کتابوں کا ہے۔ اس میں ۱۴۳۹ یعنی گذشتہ سال ۴۰ کتابیں زیادہ شائع ہوئیں، مذہب پر ۹۰۱ یعنی گذشتہ سال سے ۹۱ کتابیں کم شائع ہوئیں، اسکا نمبر تیسرا ہے۔ اس کے بعد سوانح عمریاں آتی ہیں جن کی تعداد ۷۶۶ ہے، پھر سفرنامے ۶۱۸؛ اس کے بعد فلسفہ ۳۱۷، پھر کھیل پر کتابیں ۲۱۷۔ پچھلے ۲ سال میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں انکی تعداد کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہوسکتا ہے:۔

سال	نئی کتابیں	نئے ایڈیشن	کل
۱۹۲۲ء	۸۷۵۴	۲۰۸۸	۱۰۸۴۲
۱۹۲۳ء	۹۲۴۶	۳۰۲۸	۱۲۲۷۴

سال	نئی کتابیں	نئے ایڈیشن	کل
سنہ ۱۹۲۴	۹۰۱۳	۳۱۹۳	۱۲۷۰۶
سنہ ۱۹۲۵	۹۹۷۷	۳۲۲۵	۱۳۲۰۲
سنہ ۱۹۲۶	۹۹۸۹	۲۸۱۰	۱۲۷۹۹
سنہ ۱۹۲۷	۱۰۳۳۴	۳۴۷۶	۱۳۸۱۰
سنہ ۱۹۲۸ء	۱۰۶۱۲	۳۷۸۷	۱۴۳۹۹

پچھلے دنوں تعلیمی انجمنوں کی ایک کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کے صدر لارڈ لٹن تھے۔ لارڈ لٹن نے اپنے خطبہ صدارت میں ہندوستان میں تعلیم کے بعض پہلوؤں پر نظر ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ "میرا ہندوستانی تجربہ صرف ایک صوبہ یعنی بنگال تک محدود ہے کیونکہ میں اسی صوبہ میں سنہ ۱۹۲۲ سے سنہ ۱۹۲۶ء تک گورنر رہا۔ اس لئے قبل اس کے کہ میرے ملاحظات تمام ہندوستان پر عائد کئے جائیں ان میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔ تعلیم کا مقصد جس معنی میں میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہوں یہ ہے کہ آدمی زندگی کو سمجھے، اس کو پہچانے اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ مختصراً اس کا مقصد ہے فرد کی مکمل نشوونما ہندوستانی تعلیم کے متعلق سب سے پہلی چیز جو اپنی طرف توجہ کو جذب کرتی ہے وہ مسئلہ کی وسعت ہے اور اس میدان کی بے پایانی جس میں ابھی کام کرنا باقی ہے۔ عام تعلیم یعنی مدارس میں سب کی لازمی تعلیم تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی ہے۔ ۳۵ کروڑ کی آبادی میں صرف ۲ فیصدی ادنی تعلیم کے اس معیار کو پہنچے ہیں جہاں لکھنا پڑھنا ممکن ہو۔ ہندوستان میں مدارس کی تعلیم ان لوگوں کے لئے ہے جو اس کا صرف برداشت کرنے کے لائق ہیں۔ مزید ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جبتک لوگ مزید ٹکس دینے پر آمادہ نہ ہوں جس سے غریبوں کے مدرسہ کھولے جاسکیں"۔

آپ نے آگے چلکر فرمایا کہ "ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کیطرف سے کامل غفلت برتی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مردوں کی تعلیم نے جماعتی زندگی، رسم و رواج اور ملک کے عام خیالات پر اس کم اثر

کیاہے۔ ہندوستانی اب کوئی دو تین نسل سے ہماری تعلیم گاہوں میں پڑھنے آرہے ہیں، باقی ہندوستان میں کچھ نہ کچھ تعلیم پاتے ہی ہیں، اس کا کچھ تو اثر ہونا چاہیئے تھا لیکن کیا ہوا؟ آپ میں سے اکثر نے مس میو کی کتاب "مادر ہند" پڑھی ہوگی جس سے مغربی پڑھنے والے رنجیدہ ہوئے اور ہندوستانی غضبناک۔ اس کتاب میں بہت سی اختلافی باتیں ہیں اور میں انپر بحث کرنا نہیں چاہتا لیکن ایک بات اس میں ہے جس سے ہندوستان کا ہر جاننے والا اتفاق کرے گا اور وہ بات یہ ہے کہ جن واقعات سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے، چاہے اچھی طرح یا بری طرح، صحت کے ساتھ یا غلط طریق پر، وہ واقعات عورتوں کی تعلیم کی ضرورت کی نہایت قوی شہادت ہیں۔" آگے چلکر آپنے فرمایا "اگر شمالی ہند کی آبادی میں پردہ لازمی چیز ہے اور جہاں یہ موجود ہے وہاں اسے قائم رکھنا ہے تو قدامت پسند جماعت کا فرض ہے کہ پس پردہ تعلیم دینے کے موثر ذرائع نکالے ..... ہندوستانی گھروں میں عورت کا اثر بیحد ہے۔ اس سے کہیں زیادہ جتنا کہ ہمارے گھروں میں ہماری عورتوں کا۔ یہ اثر ہندوستان کے بچوں ہی تک محدود نہیں، گھروں میں مردوں پر بھی انکا بہت اثر ہے۔ ہم لوگ اکثر ہندوستان کے متعلق ان لوگوں سے ملکر رائے قائم کرتے ہیں جو ہمارے ملک میں آتے ہیں، جن سے ہم طالب علم، عہدہ دار، یا مہمان کی حیثیت سے ملتے ہیں اور جن کی واپسی کے بعد انکی تقریریں اخباروں میں شائع ہوتی ہیں لیکن جو ہندوستان میں رہ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے گھروں پر بہت ہی کم اثر ڈالا ہے اور اس سے بھی کم اپنے ملک کے رسم و رواج اور جماعتی زندگی پر۔ یہ چیزیں ابھی اس حال میں ہیں جس میں عورتیں انہیں رکھنا چاہتی ہیں۔ جسم جماعتی میں عورتوں کا اثر ایسا ہی ہے جیسا جسم انسانی میں خون کا۔ یہ دکھائی نہیں دیتا، لیکن جسم کا کوئی حصہ، کوئی عضو، اس کا کوئی عمل اس کے اثر سے باہر نہیں۔ کل جسم کی صحت کا مدار اسی پر ہے۔ یہی حال ہندوستانی گھروں میں عورتوں کے اثر کا ہے۔"

گذشتہ مہینہ کے جامعہ میں ہم نے ہندوستان کے بعض تعلیمی اعداد شائع کئے تھے۔ ان

سے معلوم ہوتا تھا کہ دیہی تعلیم کے باب میں پنجاب دوسرے صوبوں سے کتنا آگے ہے۔ پنجاب نے اپنے دیہاتی علاقوں میں تعلیمی جدوجہد کی اسکیم بنانے کے لئے دو ماہرین تعلیم کو مقرر کیا تھا۔ اس اسکیم کی تیاری سے قبل یہ دونوں تعلیمی عہدہ دار انگلستان گئے تھے تاکہ وہاں دیہی تعلیم کے نظام کا مطالعہ کریں۔ وہاں انہوں نے مشہور تعلیمی ماہر سر میکائیل سیڈلر سے مشورہ کیا۔ سر میکائیل نے ان سے کہا کہ انگلستان کی دیہی تعلیم میں عورتوں کے کلب سب سے اہم چیز ہیں، ان دونوں عہدہ داروں نے معائنہ کے بعد جو رائے قائم کی وہ یہ تھی کہ برطانیہ میں اس صدی کی سب سے اہم جماعتی اور تعلیمی تحریک ہے!

ایک بنگالی خاتون مسز سروج نلینی دت آنجہانی نے آج سے کوئی ۱۶ سال قبل بنگال میں اس قسم کے کلب قائم کرنیکا کام شروع کیا تھا۔ انہوں نے بھی انگلستان کے نسائی کلب دیکھے تھے اور انکا خیال تھا کہ باوجود اہم جماعتی اختلافات کے اس طریقہ سے ہندوستان کے دیہاتوں میں بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ انکا عقیدہ تھا کہ انکی جاہل ہم وطن عورتوں کو ابھارنے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ خود ان عورتوں کو منظم کیا جائے چنانچہ انہوں نے محل سمیتیوں کے قیام کی کوشش کی۔ آج ۴ سال کی کوشش سے بنگال کے دیہاتوں اور قصبوں میں ۲۰۰ کے قریب سمیتیاں قائم ہو چکی ہیں۔ جس میں ہر طبقہ، مذہب اور ذات کی عورتیں شامل ہیں۔

اس کی مرکزی جماعت نئی سمیتیوں کے قیام کے لئے کوشش کرتی ہے۔ انکے کام میں ربط و تعلق پیدا کرتی ہے، گھریلو صنعتیں سکھانے کے لئے استانیاں بھیجتی ہے، ایک ماہوار رسالہ شائع کرتی ہے، کلکتہ میں ایک مرکزی صنعتی اسکول چلاتی ہے، اور عورتوں کی تعلیم و ترقی کے سلسلہ میں تقریروں کا انتظام کرتی ہے۔ سمیتیوں کی خاص غرض یہ ہے کہ اراکین میں باہمی ربط پیدا کریں، اور امداد باہمی کے جذبہ کو تقویت پہنچائیں۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بہت سی تدابیر اختیار کیجاتی ہیں جیسا کہ گذشتہ سال کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے مثلاً عوام کی درستی کے لئے بہت کچھ کام کیا گیا۔ بچوں اور زچوں کے لئے علحدہ شفاخانے کھولے گئے۔ دائیاں تیار

کی گئیں۔ تقریروں، تعلیمی حلقوں اور عام تبلیغ کے ذریعہ صفائی اور صحت کے متعلق معلومات کی اشاعت کی گئی۔ بیوہ اور غریب عورتوں کی مدد کے لئے گھریلو صنعتوں کو رواج دیا گیا اور ان صنعتوں کو امداد باہمی کے اصول پر چلایا گیا۔ اس رپورٹ کا مطالعہ تعلیمی کام کرنے والوں کے لئے دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلوص اور محنت دشوار کاموں کو کس طرح آسان کر دیتے ہیں۔

لندن ٹائمس۔ تعلیمی ضمیمہ

تنقید و تبصرہ

کتب:-

الصلوٰۃ للّٰہ والصیام للرحمٰن - مقابلہ اسلام و یورپ

الصلوٰۃ للّٰہ والصیام للرحمٰن | یہ کتاب مولوی سید محمد رفیع الدین صاحب نے مقام کالاباغ ضلع میانوالی سے ہمارے پاس رائے زنی کے لئے ارسال کی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے خیال کے مطابق قرآنی نماز و روزہ کی تشریح فرمائی ہے اور اپنا مذہبی نام "مسلم اہل البیت" لکھا ہے جس کے متعلق ہم کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ بوجہ سید ہونے کے اختیار کیا گیا ہے۔ یا جملہ مسلمانوں کو اہل بیت رسول سمجھکر۔

غالباً یہ مسلم اہل البیت اہل قرآن کی چوتھی قسم ہے۔ پہلا فرقہ "اہل قرآن" مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی والا لاہور میں تھا جس میں کچھ شائبہ حدیث کا بھی تھا۔ کیونکہ مولوی صاحب مذکور ایک مدت تک اہل حدیث رہ چکے تھے۔ دوسرا فرقہ گوجرانوالہ کا "اہل الذکر" نامی ہے۔ تیسرا امرتسر کا "امت مسلمہ" لیکن یہ چوتھا فرقہ سب پر فوقیت رکھتا ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کی قرآن فہمی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ بلا مبالغہ جس آیت سے جو مطلب چاہتا ہے سمجھ لیتا ہے۔

ابھی فرقہائے اہل قرآن میں یہی بحث تھی کہ نماز پانچ وقت کی ہے یا تین وقت کی۔ مسلم اہل البیت کہتا ہے کہ نہ تین نہ پانچ بلکہ متوسطاً چار وقت کی فرض ہے جس میں تہجد بھی داخل ہے۔ ان چاروں میں سے تہجد اور فجر کے لئے قبلہ مشرق ہے اور ظہر اور غسق اللیل کے لئے مغرب یعنی سمت قبلہ کے واسطے سورج کے رخ کا زیادہ لحاظ ہے۔

ہر نماز کے لئے رکعتوں کی تعداد دو ہی دو رکھی ہے۔ رکعت کا نام بھی بدلکر قصر اولی اور قصر آخر اے کر دیا ہے۔ اور آیت " سبعًا من المثانی" سے دونوں رکعتوں یعنی قصروں کے لئے سات سات ارکان بنائے ہیں۔ انکی ادائیگی کے جو طریقے لکھے ہیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہر ہر قصر میں دو دو قیام ہیں اور دو دو قعدے، جن کے نام الگ الگ ہیں۔

روزوں کی فرضیت بخلاف اپنے ہمنام عرف خالو دہلی کے مشہور اہل قران کے جو " ایامًا معدودات" سے صرف تین دن مانتے ہیں تیس دن کی رکھی ہے۔ مگر قمری مہینہ کے قائل نہیں۔ شمسی حساب سے ہر سال ۲۲ اکتوبر سے ۲۰ نومبر تک رمضان قرار دیتے ہیں۔

اس نماز اور روزے کے بیان میں جابجا جزئیات کی تفصیل کے لئے قرانی آیات سے جو دلیلیں پیش کی ہیں انکے متعلق وہی کہا جاسکتا ہے جو جنت کے وصف میں کہا گیا ہے " مالا عین رأت - ولا اُذنٌ سَمعتُ ولا خطر علٰی قلب بشر"

آخر میں مجھے نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اہل قرآن نے جو اپنا کل دینی سرمایہ اور راس المال صرف قرآن ہی کو گردانتے ہیں آجتک اس کی کوئی صحیح خدمت نہیں کی۔ بلکہ بیشتر اس کی روشن آیات کو اپنی جدت طرازی اور تاریک نظری سے چیستان کی طرح حل کر کرکے دین الہی کو ملعبہ اور اپنے آپ کو مستوجب عقاب اور اضحوکۂ دہر ہی بناتے رہے۔ حافظ محب الحق عظیم آبادی نے شرعۃ الحق اور منہاج الحق لکھکر پھر بھی ایک کام کیا لیکن اس جماعت نے اپنے علم - دین - دماغ اور عقل اور قرآن فہمی اور مسلمانوں کی دینی رہبری کے ادعا کا ابھی تک کوئی ثبوت نہیں دیا۔

مقابلۂ اسلام و یورپ۔ اسلام و یورپ کی تہذیب و تمدن کا تاریخی موازنہ۔

(مرتبہ ظفر تاباں ایچ پی) جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے مؤلف نے اس میں اسلام اور یورپ کی تہذیب و تمدن کا تاریخی موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے آج کل یہ موضوع اس قدر مرغوب ہو گیا ہے کہ جس کا جی چاہتا ہے بلا پس و پیش اس پر خامہ فرسائی کرنے لگتا ہے۔ عباسیوں کے کچھ علمی کارنامے۔ اندلس کی تہذیب کے دو چار مرقعے۔ یورپ کے عہد ظلمہ کی جہالت کے دو ایک واقعات لکھ دئے گئے اور تاریخی موازنہ مکمل ہو گیا، اسلامی تہذیب کی برتری ثابت ہو گئی یورپ کی بہیمیت اور بربریت مسلم ہو گئی اور مؤلف نے اسلام اور علم کی وہ خدمت کر دی جس کا جواب ملنا مشکل ہے۔ کاش حضرات مؤلفین علمی مباحث پر اس قدر غیر ذمہ داری سے قلم نہ اٹھاتے۔ اس رسالے کے مؤلف نے معلوم ہوتا ہے کہ محنت بہت کی ہے لیکن ہم کسی طرح اس کوشش کو کامیاب نہیں کہہ سکتے۔ مباحث ایک دوسرے سے اس قدر دست و گریباں ہیں کہ انکو الگ کرنا ناممکن نہیں تو از حد دشوار ضرور ہے، انداز بیان تاریخی نہیں بلکہ بیشتر تبلیغی ہے۔ زبان میں بھی الجھاؤ بہت ہے۔ نادر ترکیبوں کے استعمال کا شوق بہت غالب نظر آتا ہے۔ زبان کی غلطیاں بھی شاذ نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر بعض فقرے درج کئے جاتے ہیں:۔

صفحہ ۱ (پہلا جملہ) "مذہب اس تجلی روحانی کا نام ہے جو اپنی تنویر نوازیوں سے انسانی قلب کو شمع زار بنا دے"

صفحہ ۳ (سطر ۱) "اُن کا دار و مدار محض وہم پرستی پر موقوف تھا"

صفحہ ۱۱ (سطر ۶) اول اول قرآن ادب و انتشار حکمت و فلسفہ کا مزاحم تھا۔ آنحضرت نے اسے تمام تصانیف کا گل سرسبد ظاہر کرکے اس کی بے مثل فصاحت و بلاغت کو اپنی ماموریت من اللہی کے ثبوت میں پیش کیا" کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

صفحہ ۲۰ (سطر ۱۹) "یورپ کی فضا پر جہالت کی تاریکیاں ظلمت بار تھیں اور شاید اس کا انتظا

تھا کہ افق مشرق سے ایک نور برساتا ہوا آفتاب طلوع ہو "

صفحہ ۳۹ (سطر ۹) "عیسائیت کو تعلیم مسیح نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا "

صفحہ ۶۰ (سطر ۱۶) " اسپین میں مسلمانوں کے خانگی طریقے " غالبًا طرز بود و باش مراد ہے۔

صفحہ ۷۰ (سطر ۱۹) "معتصم ایک جانسوز جوش میں ڈوب گیا "

صفحہ ۷۶ (سطر ۷) ایک عالمگیر ہنگامہ زاری میں حق کی سچی صدا نے عرب کے کھنڈرات میں جب سامعہ نوازی کی تو کسی کو کیا خبر تھی کہ یہی وہی صدا دشکدہ عالم پر محیط ہو جائیگی"

یہ نمونہ مشتے از خروارے ہے ورنہ کتاب کے ہر صفحہ میں دو چار ایسے سامحات ضرور ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے معلومات میں کچھ اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن ترتیب و استدلال کا جہاں تک تعلق ہے وہ سرے سے ناپید ہے۔ بہت ممکن ہے کہ عام طور پر یہ کتاب مقبول ہو اس لئے کہ یورپ اور اس کے تمدن کو جا و بیجا خوب گالیاں دی گئی ہیں لیکن اسے کسی طرح موازنہ نہیں کہہ سکتے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی برتری معلوم یورپ کا اندلس سے کسب کمال مسلم لیکن اسے جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ علمی شان کے منافی ہے۔

بہر حال مولف کی کوشش اور انکے جذبے کی داد ضرور دینی چاہیے۔ حجم اس رسالہ کا ۱۰۴ صفحہ ہے اور قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ غالبًا بزم اخلاق مچھلی والان دہلی ہے۔

شذرات

ہمارے رسالے کا یہ نمبر مقررہ وقت کے بہت بعد شائع ہو رہا ہے۔ اسکا بڑا سبب یہ ہے کہ ایک مدیر طویل رخصت پر گیا ہوا تھا۔ اب وہ واپس آگیا ہے۔ اس لئے انشاء اللہ دو تین مہینے میں رفتہ رفتہ اشاعت وقت پر آجائے گی۔

رسالے کی ادارت غور کر رہی ہے کہ اسے زیادہ مفید اور دلچسپ بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کیجائیں۔ اس معاملے میں قارئین کرام کا مشورہ بہت ضروری ہے۔ مشورہ میں اسکا لحاظ رکھنا مناسب ہے کہ رسالے کا علمی معیار کسی طرح کم نہ ہونے پائے بلکہ جہانتک ممکن ہو اور بڑھے۔

اکادمی کیطرف سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں انکے بارے میں بھی یہ کوشش ہے کہ اب کی سال گذشتہ سال سے بہتر کتابیں قارئین کرام کی خدمت میں بھیجی جاسکیں۔

علمی پودوں کا سرسبز ہونا یوں بھی مدتوں کا کام ہے اور ہمارے ملک میں تو اب تک آب و ہوا اس قدر ناموافق ہے کہ نمو کی رفتار اور بھی کم ہے۔ پھر بھی محنت اور استقلال شرط ہے۔ جو بیج بویا جاچکا ہے اور بونے والے جفاکشی اور عرقریزی سے کام لے کر اس کی آبیاری کرتے رہتے ہیں وہ کسی دن ضرور پل کر اور بڑھ کر مضبوط درخت بنے گا اور پھول پھل سے مالامال ہو جائے گا۔

یہ سال جامعہ ملیہ کے کارکنوں کے لئے بڑی آزمائش اور ابتلاء کا سال تھا۔ اس کے آغاز میں انہیں پریشانی اور مایوسی نے ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ اگر انکے قدم ذرا بھی ڈگمگاتے تو جس بوجھ کو برسوں سے اٹھائے ہوئے تھے وہ سر سے گر جاتا اور پھر شاید اٹھائے نہ اٹھتا۔ مگر خدا نے انہیں اتنی توفیق دی کہ انکے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی اور وہ ساری کڑیاں جھیل لے گئے۔ ملت اسلامی کے چند سچے حامیوں نے فیاضی سے کام لیکر اس کی فوری مشکلات کو دور کر دیا اور آئندہ کے لئے بھی بہت کچھ اطمینان دلا دیا۔ اب وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انشاء اللہ چند سال میں جامعہ اپنی مالی ضروریات کی طرف سے، جن کے لئے اسے فی الحال نسبتاً تھوڑی رقم درکار رہے، مطمئن ہو جائے گی اور زیادہ یکسوئی سے مسلمانوں کی علمی اور تعلیمی خدمت انجام دے سکے گی۔

آجکل مسلمانوں کا سیاسی انتشار انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور اس کے اثر سے ساری قومی زندگی منتشر ہو گئی ہے۔ شاید ہی کوئی دو آدمی ایسے ہوں جو اصولاً متفق ہوں اور عملاً مل کر کام بھی کر سکتے ہوں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ باہمی اختلاف اکثر مخالفت بلکہ عداوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ذاتی مناقشات کے مقابلے میں ہمارے ذمہ دار افراد قومی مفاد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

آخر اس بدبختی کا سبب کیا ہے؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خود پرستی میں مبتلا ہیں، اور انکے دل مذہب و ملت اور ملک و قوم کی محبت سے خالی ہیں لیکن غور کیجئے تو یہ خیال صحیح نہیں ٹھہرتا۔ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ بہت سے مسلمانوں نے انہیں چند سال کے عرصہ میں مذہب کے نام پر جان و مال کی قربانی کی، ملک کی

آزادی کے لئے دولت اور ثروت سے منہ نہ موڑا، اور قید فرنگ کی سختیاں جھیلیں۔ پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انکے دل میں اسلام کا اور ہندوستان کا درد نہیں۔

بات یہ ہے کہ صرف جوش اور محبت کسی کام کو انجام تک پہنچانے کے لئے کافی نہیں۔ جوش ناپائدار چیز ہے اور محبت اندھی ہوتی ہے۔ جوش کی تکمیل کے لئے استقلال ضروری ہے اور محبت کی پختگی کے لئے علم و بصیرت ناگزیر ہے۔

ہمارے سامنے جو نصب العین ہے وہ بدقسمتی سے تاروں کی طرح روشن نہیں ہے بلکہ شہاب ثاقب کی طرح ایک چمک دکھا کر چھپ جاتا ہے۔ ہمیں ایسی شمع ہدایت چاہئے جو ہر قدم پر ہمیں راستہ دکھائے اور ہمیشہ منزل کو ہمارے پیش نظر رکھے۔ یہ چیز سوائے علم، مطالعے، تجربے، غور و فکر کے اور کچھ نہیں۔ جب تک ہم اپنے ماضی کے محرم نہ ہوں گے اپنے عہد کے حالات سے آشنا نہ ہوں گے اور آنے والے زمانے کو دور سے دیکھنے کی قابلیت نہ رکھتے ہوں گے، ہمیشہ اسی طرح بھٹکتے رہیں گے۔

ہمارے دل میں جو درد ہے اس میں کبھی کبھی ٹیس اٹھتی ہے اور ہمیں تڑپا دیتی ہے مگر پھر بے حسی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذوق درد کے لئے بھی تربیت کی ضرورت ہے، جوش جنوں بھی پرداخت کا محتاج ہے، قومی خدمت کے لئے قومی جذبے کو اس طرح نشو و نما دینا ضروری ہے کہ وہ ہماری سیرت کا جزو ہو جائے۔ ہمارے رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

مختصر یہ کہ ہمیں اعلیٰ اور بلند تعلیم، گہری اور راسخ تربیت کی ضرورت ہے۔ مگر

ان دونوں چیزوں کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی ہے جس کی اہمیت ہمیں نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ مالی فراغت اور خوش حالی جس سے ہم من حیث القوم محروم ہیں، بام ترقی پر پہنچنے کے لئے پہلا زینہ ہے۔ مسلمانوں کی پچھلی نصف صدی کی ساری اصلاحی کوشش اسی لئے ناکام رہی کہ انہوں نے اقتصادی مسئلے کا کوئی معقول حل تلاش نہیں کیا افلاس کے سبب سے جو مایوسی اور افسردگی پیدا ہوتی ہے وہ قوت عمل اور قوت فکر کو بیکار کر دیتی ہے بلکہ اخلاق کو بھی بگاڑ دیتی ہے۔

افلاس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہم کسب معاش کو کوئی ضروری فرض نہیں سمجھتے اور اس کے ذرائع تلاش کرنے میں کما حقہ کوشش نہیں کرتے۔ ہم میں صاحبان ثروت بھی ہیں مگر بہت تھوڑے۔ ہمارے اکثر افراد دوسروں کے دست نگر ہیں اور اسے قابل شرم نہیں سمجھتے۔ البتہ مزدوری، دستکاری کرنا انکے خیال میں بڑی ذلت کی بات ہے۔ ہماری ترقی بلکہ ہماری زندگی کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ یہ خیال ہمارے دل سے نکلے ہم سرکاری نوکری، وکالت اور گداگری کے تنگ دائرے سے نکل کر کسب معاش کے کھلے میدان میں ہاتھ پیر ماریں اور مجموعی حیثیت سے اپنی مالی حالت کو درست کریں۔

صحیح تعلیم، صحیح تربیت اور کسب معاش کیلئے نئے راستے تلاش کرنا۔ یہی مقاصد جامعہ ملیہ کے پیش نظر ہیں۔ حیات قومی کی شیرازہ بندی اور استحکام کی یہی ایک صورت نظر آتی ہے کہ یہ درسگاہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو اور دوسرے مدارس کے لئے ایک نمونہ بنے۔ ہماری قوم کے اکثر سربرآوردہ افراد اس وقت سیاست حاضرہ کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور غالباً کبھی اس سے نکل نہ سکیں گے لیکن

کیا ہم میں معدودے چند افراد بھی ایسے نہیں جو ذرا دوربین نظر رکھتے ہوں اور موجودہ سیاست کے موہوم فوائد پر ملت اسلامی کی اندرونی تعمیر و تہذیب کو ترجیح دیں اور اسے اپنی توجہ کا مرکز بنائیں؟

ہم نے اس مسئلے کو خاص کر کے چھیڑا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قلمی معاونین مسلمانوں کے موجودہ جمود و انتشار اور اس کے دور کرنے کی تدابیر پر اپنے خیالات کا اظہار کریں، بیشک یہ بحث محض کاغذی ہوگی لیکن اسے بیکار سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ صحیح عمل کے لئے صحیح رائے کی ضرورت ہے اور صحیح رائے قائم کرنے کا عمدہ ذریعہ تبادلۂ خیالات ہے۔

البتہ ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس بحث میں حتی الامکان افراد یا جماعتوں پر بیجا حملے کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ نکتہ چینی بہت مفید چیز ہے۔ لیکن اس میں اگر سلامت روی اور متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پھر سوقیانہ گالی گلوچ تک نوبت پہنچتی ہے جس میں اصل مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ جانبین کی بدنامی سے دوسروں کی نظر میں ملت اسلامیہ کی سبکی ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم ۔ اے، پی ایچ ۔ ڈی

جلد ۱۲ | ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۹ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
۱ ۔ سیرت نبوی اور مستشرقین	عبدالعلیم صاحب احراری ۔ بی ۔ اے (جامعہ)	۲۴۳
۲ ۔ رائنر ماریا رلکے	ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب صدیقی ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی	۲۶۳
۳ ۔ شخصیت اور تاریخ	پروفیسر فریڈرش ماینکے (برلن) (مترجمہ محمد مجیب صاحب بی ۔ اے (آکسن))	۲۷۱
۴ ۔ "اشتراک"	ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب	۲۷۶
۵ ۔ نئی دہلی	جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب	۲۸۶
۶ ۔ دلاری	سجاد ظہیر صاحب بی ۔ اے متعلم آکسفورڈ	۳۰۰
۷ ۔ غزل	مولانا آزاد سبحانی	۳۰۵
۸ ۔ نوائے محوی	محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی	۳۰۶
۹ ۔ غزل	مولانا صفی لکھنوی مدظلہ العالی	۳۰۷
۱۰ ۔ اقتباسات	... ...	۳۰۸
۱۱ ۔ تنقید و تبصرہ	... ...	۳۱۲
۱۲ ۔ شذرات	... ...	۳۱۵

سیرت نبوی اور مستشرقین

مقدمہ

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔ کتاب جسکا یہ مقدمہ ہے مشہور مستشرق ولہاوزن کے اس مضمون کا ترجمہ ہے جو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی طبع نہم میں محمڈنزم کے عنوان سے چھپا ہے۔ اس مضمون میں سے بھی صرف اس حصہ کا ترجمہ کیا گیا ہے جو رسول اللہ صلعم سے متعلق ہے۔ مستشرقین نے اسلام اور بانی اسلام سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے اردو داں طبقہ اور خصوصًا علمائے کرام بہت کم واقف ہیں۔ یہ زہر انگریزی کے ذریعہ سے جدید تعلیمیافتہ جماعت میں پھیلتا جاتا ہے اور جن لوگوں پر دینی ہدایت کی ذمہ داری ہے ان کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مستشرقین کے صحیح خیالات سے اور انکی حقیقت سے لوگ واقف ہو جائیں تاکہ ایک طرف تو علماء کو مسئلے کی اہمیت کا احساس ہو اور دوسری طرف جو لوگ اس قسم کے مضامین پڑھتے ہیں انہیں حقیقت حال کا علم ہو جائے۔ بعض حضرات کا ممکن ہے یہ خیال ہو کہ مستشرقین کے اعتراضات ابتک اردو داں طبقہ تک نہیں پہنچے ہیں اور ان اعتراضات کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا قرین مصلحت نہیں۔ اسمیں تو شک نہیں کہ ابتک اس قسم کے خیالات کا مرکز صرف انگریزی داں طبقہ رہا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جدید ماحول کے اثر سے یہ زہر تجاوز کرکے نیم انگریزی داں طبقہ تک پہنچ گیا ہے اور یہاں پہنچکر اس کی نزاکت اور بڑھ جاتی ہے۔ اول تو یہ کہ وہ اعتراضات کی حقیقت سے واقف

نہیں ہوتے بلکہ سنی سنائی باتوں سے انکی طبیعت میں ایک ہیجان پیدا ہوجاتا ہے اور دوسرے اگر
شاذونادر کبھی انگریزی میں ان اعتراضات کے رد کرنیکی کوشش بھی کیجاتی ہے تو یہ لوگ اس سے
بھی ناواقف رہتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کے لئے اور خصوصاً علمائے کرام کے لئے جن میں سے بیشتر
السنہ مغربیہ سے نابلد ہیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اُردو زبان میں پہلے ان اعتراضات
کو صحیح طور پر بلا کسی مبالغے کے پیش کیا جائے اور پھر انکی حقیقت بے نقاب کیجائے اس طرح ممکن
ہے ہمارے علما محسوس کریں کہ وقت کی ضرورت اب کیا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ طہارت
کے طویل الذیل مسائل اور آمین و رفع یدین پر مناظرہ، دینی خدمت تسلیم کیا جائے بلکہ آجکل
تو اصول اسلام اور خود شارع اسلام پر ہر طرف سے اعتراضات کی بارش ہورہی ہے اور اہل نظر
کا فرض اور شدید ہوجاتا ہے کہ وہ اسلام کو دنیا کے سامنے پھر اسی رنگ میں پیش کریں جس
میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ یہ ترجمہ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے اور
حواشی میں اعتراضات کا جواب دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ مترجم کو اپنی خامیوں کا کامل
احساس ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جواب کا پورا حق ادا نہ ہوسکا لیکن اسکا یہ مقصد بھی نہ تھا کہ ہر مسئلے پر
آخری فیصلہ صادر کردے۔ اس تالیف کی غرض تو یہ تھی کہ اعتراضات بہ تمام و کمال سامنے
آجائیں اور جو لوگ جواب دینے کے اہل ہیں لیکن خواب غفلت میں یا کسی غیر ضروری کام میں
پڑے ہوئے ہیں ذرا چونکیں۔ اگر یہ تالیف علما کرام کے جمود کو توڑ سکے اور جدید تعلیم یافتہ حضرات
کو جن کے قلوب تشکیک کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں غور و فکر کے لئے کچھ مسالہ فراہم کرسکے تو اسکا
مقصد حاصل ہوگیا۔ ولہاوزن کے اس مضمون کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اس نے اس میں نہایت اختصار
کے ساتھ ان تمام اعتراضات کو جمع کردیا ہے جو مستشرقین عام طور پر سیرت نبوی پر وارد کرتے ہیں
اور اس کے مطالعہ کے بعد شاید ہی کوئی اعتراض چھوٹ جائے۔ ایسا مضمون کوئی اور نظر سے نہیں
گذرا جس میں مستشرقین کے تمام نظریات بیک وقت موجود ہوں۔ انکے خیالات کا صحیح اندازہ کرنے کے
لئے یہ مضمون بہت موزوں ہے۔ اس کے علاوہ ولہاوزن کا شمار مستشرقین کے مقتداؤں میں ہوتا ہے

اور اس نے جو کچھ لکھا ہے اسے یورپ کے اہل علم بہت مستند اور قابل وثوق سمجھتے ہیں اس لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے لئے خاص طور پر اس سے یہ مضمون لکھوایا گیا تھا اور غالباً جرمن سے ترجمہ کرا کے اس میں شائع کیا گیا۔

مستشرقین کے اعتراضات سے بحث کرنے سے پہلے اگر ہم ایک سرسری نظر ان خیالات پر ڈالیں جو اہل یورپ کے رسول اللہ صلعم سے متعلق ابتدائے اسلام سے لیکر عہد حاضر تک رہے ہیں تو ہمیں اسکا اندازہ ہو گا کہ آہستہ آہستہ انکے خیالات میں تبدیلی ہو رہی ہے اور وہ لوگ رسول اللہ صلعم کی ذات اور اصول اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ باسورتھ اسمتھ نے اپنی کتاب "محمڈ اینڈ محمڈنزم" میں جو پہلی دفعہ ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی تھی ایک خاکہ اس وقت تک کی خیالات کا کھینچا ہے۔ اسکا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ لفظی ترجمہ طوالت کے خیال سے نہیں کیا گیا۔ اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ "اسلام کی ابتدائی چند صدیوں میں دنیائے عیسائیت کو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ تنقید یا توضیح کر سکتی اس کا کام تو صرف لرزنا اور اطاعت کرنا تھا لیکن جب وسط فرانس میں پہلی دفعہ مسلمانوں کا قدم رکا تو ان قوموں نے جو بھاگ رہی تھیں مڑ کر دیکھا۔ اب بھی اگرچہ انکی ہمت جنگ کرنیکی نہ تھی لیکن وہ پیچھے ہٹنے والے دشمن کو گالیاں تو دے سکتی تھیں ٹرین کے رومان میں محمد (صلعم) کو جو بت پرستی کے شدید ترین مخالف تھے، خود ایک سونے کا بت کہا گیا ہے جس کی پرستش کاڈز میں ہوتی تھی اور جس کا نام "ماہامٹ" تھا۔ رولان کے گیت میں جو فرانس کا قومی رزمیہ گیت ہے دکھایا گیا ہے کہ قرطبہ کا خلیفہ مارشل اسی بت کی پرستش کرتا ہے اور اس کی مرغوب قسم یہ ہے "عطارد کی قسم، محمد (صلعم) کی قسم اور اپولو کی قسم"[۵۱]۔ عجیب قلب ماہیت اور عجیب افترا! اس بت کے سامنے انسانی قربانیاں کیجاتی ہیں اگر اور کہیں نہیں تو کم از کم دسویں

۵۱؎ رولان کے گیت کے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ جامعہ جلد نمبر ۹ جس میں یوسف حسین خاں صاحب کا ایک سلسلہ مضامین "عربی فرانسیسی ادبیات میں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

اور گیارہویں صدی کے مصنفین کے تخیل ہی میں ہے اور اسکا نام کبھی بافوم ہوتا ہے اور کبھی ماہومٹ۔ یہ
کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں اب تک عام غلط فہمی کی حامل ہیں۔ فرانسیسی
میں لفظ Mahomerie اور انگریزی میں Mummery اب تک لغو اور مہمل رسوم کے لئے استعمال ہوتا ہے
بارہویں صدی میں بجائے معبود کے محمد (صلعم) کو ایک مرتد اور بے دین کہا جاتا تھا اور اسی وجہ
سے دانتے نے انہیں جہنم کے نویں حلقے میں ان لوگوں کے ساتھ رکھا ہے جو مذہبی تفرقے کے بانی
ہیں۔ بانیان اصلاح (Reformation) نے بھی محمد (صلعم) کی طرف جو سب سے بڑے نبی تھے
کوئی توجہ نہ کی اور انکی نفرت بھی انکے علم کی مقدار کے ساتھ ساتھ قائم رہی۔ مصلحین غالباً یہ نہ سمجھے تھے
کہ پاپائی جماعت دونوں کو عیسائیت کا دشمن ٹھہرائے گی اس لئے کہ پادریت اور رسوم پرستی کی
مخالفت میں اسلام اور پروٹسٹنٹزم دونوں مشترک ہیں۔ اسی زمانے میں یہ حکایت بھی ایجاد ہوئی
کہ ایک کبوتر کو محمد (صلعم) نے سکھایا تھا کہ انکے کان میں سے دانے چنے اس سے مویدین کے خبث
سے زیادہ ان کی حماقت کا ثبوت ملتا ہے مگر یہ روایت بھی عام طور پر صحیح تسلیم کی جاتی تھی۔ اس وقت
بھی حالت کچھ بہتر نہیں ہوئی جب یہ محسوس کیا گیا کہ رائے قائم کرنے سے قبل جہاں تک ممکن ہو مذہب
کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ فرانسیسی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ۱۶۴۹ء میں اور دوسرا ۱۶۶۵ء میں
ہوا اسی کے بعد ایک شخص الکزنڈر راس نے فرانسیسی سے انگریزی میں اسکا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں
کے ساتھ جو مقدمے درج تھے ان میں طرح طرح کی غلط بیانیوں سے کام لیا گیا تھا اس لئے اس کا
بھی کوئی اچھا اثر نہ پڑا پھر بھی باوجود ان غلط فہمیوں کے جو اب تک عوام میں رائج ہیں انگلستان اور
فرانس ہی کے سر عربی ادب اور عربی تاریخ کو تاریخی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے کی ابتدا [illegible]
اسی ابتدا کی وجہ سے گبن اور میور، کاسین دی پرسیوال اور سینٹ ہلیر، واٹس اور اشپرنگر کے ہاتھوں
اب ایسا مسالہ فراہم ہو گیا ہے کہ ہر شخص معقول اور غیر جانبدارانہ رائے قائم کر سکتا ہے۔ اس تحریک کا
بانی گیگنیر ہے جو پیدائش کے لحاظ سے تو فرانسیسی تھا لیکن انگلستان کو اس نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔
آکسفورڈ میں عربی کا پروفیسر مقرر ہونے کے بعد اس نے محمد (صلعم) کی تاریخ لکھنی شروع کی جس کی

میا دا ابوالفدا کی تصنیف پر تھی ۔ اسکے بعد ہی سیل اور سیوآرے نے دو مختلف یورپی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کیا ۔ انہی تصانیف سے اور خصوصاً سیل کے "تمہیدی مباحث" سے گبن کو جو خود عربی نہ جانتا تھا وہ مسالہ ملا جس سے اس نے وہ باب محمد کی زندگی پر باندھا جس کا جواب سیرت نگاری میں نہیں ملتا ۔ لیکن انگریزوں کے خیالات میں جو کچھ بھی تبدیلی ہوئی وہ گبن کی وجہ سے نہیں بلکہ کارلائل کی وجہ سے ۔ ہم میں سے کتنے اس تعجب انگیز اور علمی و مذہبی زندگی کے اس یادگار واقعے کو بھول سکتے ہیں کہ کارلائل نے "بطل بصورت رسول" کے لئے نہ موسےٰ کا انتخاب کیا نہ ایلیا کیا اور نہ عیسیٰ کا بلکہ محمد (صلعم) کو لیا جنہیں عام طور پر لوگ فریبی سمجھتے تھے "

یہ تھا باسورتھ اسمتھ کی تحریر کا خلاصہ جس سے اس زمانے تک کے خیالات کا ایک دھندلا سا خاکہ دماغ میں قائم ہوسکتا ہے اس میں بہت سے خیالات ایسے ہیں جنہیں نقل کرتے وقت ایک مسلمان کا قلم کانپ اٹھتا ہے مگر تسکین اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ "نقل کفر کفر نہ باشد" اس کے بعد مستشرقین کا دور شروع ہوتا ہے جن کا ایک نمائندہ ہمارا مضمون نگار رولینا وزن ہے اور جس کے خیالات اگلے صفحات میں مرقوم ہیں ۔ مستشرقین نے بھی باوجود کوشش کے رسول صلعم کی شخصیت اور انکی تعلیمات کو کما حقہ نہیں سمجھا ، یا اگر سمجھا تو اسے تحریر میں لانے سے گریز کرتے ہیں ۔ اس مقدمہ میں بعض ان اصولی مسائل سے بحث کی گئی ہے جن کے سمجھنے کے بعد اعتراضات کی حقیقت کھل جائیگی اور جنہیں یا تو مستشرقین سمجھے نہیں ہیں یا دیدہ و دانستہ ان سے چشم پوشی کرتے ہیں ۔

سب سے پہلا مسئلہ وحی کا ہے ۔ مستشرقین اسے تسلیم نہیں کرتے کہ رسول اللہ صلعم حامل وحی خداوندی تھے اور خود رسول اللہ صلعم نے صاحب وحی ہونیکا جو دعوے کیا ہے اس کی طرح طرح سے تاویل کرتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ سراسر فریب ہے اور انہیں خود بھی یہ یقین نہ تھا کہ ان پر نزول وحی ہوتا ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ انہیں صرع کی قسم کا ایک دماغی دورہ ہوتا تھا اور اس دورے کی حالت میں جو خیالات انکے ذہن میں آتے تھے انہی کو وہ منزل من اللہ سمجھ لیتے تھے ۔ پھر ان میں بھی دو طبقے ہیں ایک کا خیال ہے کہ وہ آخری وقت تک اسی خود فریبی میں مبتلا رہے

اور دوسرا کہتا ہے کہ مکی زندگی میں تو واقعی انہیں اپنی نبوت کا خود یقین تھا لیکن مدینہ پہنچکر وہ صرف اپنی کامیابی کے لئے ایسا ظاہر کرتے تھے دراصل اب یقین انہیں بھی نہ تھا کہ وہ نبی ہیں۔ لیکن یہاں پرسوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر تمام علم انہیں کہاں سے حاصل ہوا اس لئے کہ وہ تو امی تھے۔ اس کے جواب میں طرح طرح کی خیال آرائیاں کی گئی ہیں جن میں سے اکثر صد درجہ مضحکہ خیز ہیں۔ اسی سوال کے جواب کے لئے بحیرا راہب کے قصے کو اسقدر شہرت دی گئی اور ذراسی بات کو ایک افسانہ بناکر پیش کیا گیا۔ اسکے علاوہ جیسا خود ولہاوزن نے لکھا ہے یہ بھی کہا گیا کہ یہودیوں سے شروع شروع میں رسول اللہ صلعم کے تعلقات اچھے تھے اور انہیں یہ سب علم انہی سے حاصل ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ماخذ اسلام کے نام سے من چلوں نے ضخیم رسالے لکھ ڈالے اور کس لئے محض اس نظریہ کے ثبوت کے لئے کہ رسول اللہ صاحب وحی نہیں تھے حالانکہ کوئی قطعی ثبوت اب تک یہ لوگ پیش نہ کرسکے۔ محض یہ ثابت کردینے سے کہ اسلام کا فلاں رکن فلاں مذہب سے ماخوذ ہے یا اس کے مطابق ہے وحی کا انکار لازم نہیں آتا اس لئے کہ اسلام نے کبھی جدت کا دعوی نہیں کیا قرآن تو پکار پکار کر کہتا ہے کہ اسلام تمام انبیاء کا مذہب ہے۔ یہ وہی اصل الاصول ہے جسے تمام مذاہب نے اپنا سنگ بنیاد قرار دیا ہے البتہ زمانے کے لحاظ سے ہر مذہب کچھ اپنی خصوصیات رکھتا ہے اور اسی وجہ سے فروعات میں تمام مذاہب مختلف ہیں۔ ثابت تو یہ کرنا چاہیے کہ رسول اللہ صلعم نے جس دین کی تبلیغ کی اسے انہوں نے کسی انسانی ذریعے سے حاصل کیا تھا اور اسی کو مستشرقین باوجود کوشش کے ثابت نہ کرسکے۔ انہوں نے دور از کار قیاسات اور غلط استنباطات کو تحقیق علمی کی صورت میں پیش کیا حالانکہ اہل نظر پر انکی مضحکہ انگیزی بالکل عیاں ہے۔

رسول اللہ صلعم کے صاحب وحی ہونے سے جو لوگ انکار کرتے ہیں انکی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو عیسائی مشنری یا دوسرے مذاہب کے مبلغین ہیں جو اپنے نبی یا پیغمبر کو تو صاحب وحی سمجھتے ہیں مگر رسول اللہ صلعم سے متعلق اسی چیز کا انکار کرتے ہیں۔ انکے لئے تو تمام دلائل بیکار رہیں اس لئے کہ ان کی رائے کا انحصار دلائل پر نہیں بلکہ جذبات پر ہے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ دوسرا

طبقہ وہ ہے جو وحی کے امکان ہی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسکے لئے تمام انبیاء اور تمام مذاہب یکساں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ عقلاً ایسا ہونا ناممکن ہی نہیں۔ دلائل کی ضرورت اس طبقہ کے لئے ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وحی کا مسئلہ مابعد الطبیعات کے تمام مسائل کی طرح ظنی ہے۔ اس کے ثبوت میں کوئی ایسی قطعی دلیل نہیں پیش کیجا سکتی جیسی طبعی علوم سے متعلق کہ مخالف کو انکار کی گنجائش نہ رہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ طبعی علوم میں بھی چند ہی ایسے مسئلے ہونگے جسے بلا استثنا تمام علماء تسلیم کرتے ہوں اس لئے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ نزول وحی کو اس طرح ثابت کر دیا جائے جس طرح ریاضی کا یہ مسئلہ کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ منکرین وحی کے پاس انکار کی کوئی وجہ بجز اس کے نہیں کہ سائنس یا عقل کی روسے ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اگر ذرا سا بھی غور کیا جائے تو اس استدلال کی کمزوری نمایاں ہوجاتی ہے۔ علوم و فنون میں آئے دن جو ترقی اور نظریات میں جو تغیر و تبدل ہو رہا ہے اس سے یہ حقیقت ناقابل انکار ہوتی جاتی ہے کہ عقل انسانی نہایت درجہ ناقص ہے اور انسانی معلومات یکسر محدود ہیں۔ ہر روز ایک نہ ایک چیز ایسی دریافت ہوتی رہتی ہے جس سے نظریات کی پرانی دیوار مسمار ہوجاتی ہے اور نئی دیوار تعمیر کرنی پڑتی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد کوئی ذی فہم انسان کسی نظریے کی بابت یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ قطعی ہے اور نہ یہ کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ جب طبعی علوم کا کوئی ایسا میدان نہیں جس کی انتہا تک انسان کا قدم پہنچ چکا ہو تو مابعد الطبیعات میں اس کا قطعی حکم لگانا کہاں تک مناسب ہے آج سے پچاس برس پہلے کون یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوتا کہ نباتات میں بھی احساس رنج وغم موجود ہے اور وہ بھی حیوانات کی طرح متاثر ہوتے ہیں لیکن سرجے۔ سی بوس کی تحقیقات سے آج یہ تقریباً یقینی ہوگیا ہے پھر ہمارے سے لئے کیا ایسی مجبوری ہے کہ ہم حواس انسانی کو محض پانچ تک محدود سمجھ لیں اور قطعی حکم لگا دیں کہ اس کے علاوہ کوئی حاسہ کسی انسان میں موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ نزول وحی پر ایمان رکھتے ہیں وہ یہی تو کہتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام میں عام انسانوں کے خلاف یا ان سے بڑھ کر ایک طاقت یا حاسہ موجود ہوتا تھا جس کی مدد سے وہ ایسی چیزیں دیکھتے تھے جو عام انسان نہیں دیکھتے یا ایسی باتیں سنتے تھے جو عوام الناس نہیں سنتے

انسانی حواس اور قویٰ میں اس قدر فرق اور تدریج نظر آتی ہے کہ اس کا تو منطقی نتیجہ ہی یہی ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہو جس کے حواس اعلیٰ ترین درجے پر پہنچ گئے ہوں یا جس میں فطری طور پر کوئی ایسا حاسہ موجود ہو جو عوام الناس میں موجود نہیں ہوتا اور خصوصاً ایسی حالت میں جب ہم روز دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جس میں حواس خمسہ میں سے کوئی حاسہ بہت کم یا یکسر ناپید ہے۔ ہمیں اس وقت تو تعجب نہیں ہوتا جب ہم ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو عام انسانوں کی طرح دیکھ نہیں سکتا یا سن نہیں سکتا لیکن اس وقت تعجب ہوتا ہے اور ہم اسے ناممکن بھی کہنے لگتے ہیں جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان نے وہ دیکھا جو ہمیں نظر نہیں آتا یا وہ سنا جو ہمیں سنائی نہیں دیتا۔ تعجب یا شک تو ہو سکتا ہے اس لئے کہ پہلی صورت عامۃ الورود ہے اور دوسری صورت بالکل نادر لیکن اس کے کیا معنی ہیں کہ ہم اسے ناممکن قرار دیں اور قابل التفات ہی نہ سمجھیں مناسب طریقہ تو یہ ہے جہاں تک ممکن ہو صحیح معلومات حاصل کرنے کے بعد نئی صورت حالات پر غور کریں اور ضرورت ہو تو اپنے پرانے نظریہ میں تبدیلی کریں۔ رسول اللہ صلعم کی ابتدائی زندگی کے حالات، انکی صداقت و راست بازی، پھر وہ کیفیات جو پہلے پہلے نزول وحی کے سلسلے میں ان پر طاری ہوئیں اور حدیث کی مستند کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں اور آخر میں وہ نتائج جو نزول وحی سے مترتب ہوئے ان سب کا مطالعہ کرنے کے بعد بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وحی کے امکان کو تسلیم کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی خداوندی کا نزول ہوتا تھا۔ اس مختصر رسالے میں اتنی گنجایش نہیں ہے کہ وحی کے تمام دلائل پیش کئے جائیں اور اس کی تمام صورتوں سے بحث کی جائے اس لئے صرف اشارے سے کام لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر عربی کی بہت سی تصانیف میں مفصل بحث موجود ہے۔ انگریزی میں بھی کوئی کتابیں ملتی ہیں اور اردو میں بھی باوجود قلت کے اتنا مسالہ مل سکتا ہے کہ طلب صادق رکھنے والے کو تسکین قلب کا سامان فراہم ہو سکے[۵]

---

۵ - نوٹ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱ اصل کتاب کا

دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد اسلام کی معنویت فنا ہو گئی اور اس میں سیاسی رنگ زیادہ غالب نظر آنے لگا اور شروع شروع میں لوگوں پر جو اثر پڑا تھا اس سے فائدہ اٹھا کر سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے بعد رسول اللہ صلعم نے جو کارروائیاں کی وہ دراصل سیاسی اقتدار کو مستحکم کرنیکی غرض سے تھیں۔ ولہاوزن نے رسول اللہ صلعم کی مدنی زندگی کے تمام اہم واقعات کو اسی رنگ میں پیش کیا ہے اور ہر جگہ یہی ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ ہجرت کے بعد رسول نے مذہبی اثر سے فائدہ اٹھا کر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسی وجہ سے انہیں تلوار اٹھانی پڑی اور خفیہ قتل کا موجب ہونا پڑا۔

غائر نظر سے دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ تعصب کے جس کی ہر جگہ کارفرمائی نظر آتی ہے اس قسم کے اعتراض کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ مذہب کا وہ ناقص تخیل ہے جو معترضین کے ذہن میں جاگزیں ہے۔ عیسائی معترضین اسلام کو بھی عیسائیت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ انکی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ دین کو سیاسی یا معاشی مسائل سے کیا سروکار ہے۔ انکا خیال ہے کہ اس میں صرف عبادات اور عقائد سے بحث ہونی چاہئے اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے اسے بے تعلق رہنا چاہئے۔ خیر اگر عیسائی یہ اعتراض کریں تو سمجھ میں آنیکی بات ہے اس لئے کہ انکا مذہب دنیا سے قطع تعلق اور سیاست اور حکومت سے بے پروائی کی تعلیم دیتا ہے لیکن ہمارا مضمون نگار جو خود یہودی ہے کس طرح یہ اعتراض کرسکتا ہے۔ یہود کے مذہب میں تو سراسر حکومت اور ریاست سے متعلق احکام ہیں اور حضرت موسیٰ کا تو مقصد ہی۔ جہانتک انکی تعلیمات اور ابتدائی حالات سے معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل کو فراعنہ مصر کی سیاسی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ

وحی کی تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو:۔

۱۔ کتاب دین و دانش ۔ مولوی محمود علی   ۲۔ الکلام ۔ مولانا شبلی نعمانی

۳۔ سیرۃ النبی جلد سوم ۔ مولانا سید سلیمان ندوی   ۴۔ اسرار شریعت جلد سوم ۔ مولوی محمد مفضل خاں

ان کی تعلیمات میں بھی عبادات اور عقائد کا کافی ذکر ہے لیکن یہودیت کا اصل الاصول تو قواعدو احکام دنیوی ہی ہیں۔

اسلام کے علاوہ تاریخ سے جتنے مذاہب کا پتہ چلتا ہے انکی دو قسمیں ہوسکتی ہیں ایک کو ہم قومی کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو نزوانی۔ قومی مذاہب سے مراد وہ مذاہب ہیں جن میں زیادہ تر سیاسی معاشی اور معاشرتی زندگی سے متعلق احکام ہیں یوں تو کوئی مذہب بھی ایسا نہ ہوگا جس میں عقائد اور عبادات کا ذکر نہ ہو لیکن مذاہب کی تقسیم یہاں انکے غالب رنگ کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اس تقسیم میں عہد عتیق کے تمام مذاہب، یہودیت اور زرتشتی مذہب داخل ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مذاہب ہیں جو عام طور پر مشہور نہیں ہیں۔ دوسری قسم یعنی نزوانی مذاہب سے وہ مذاہب مراد ہیں جن میں سراسر ترک دنیا اور تعبد و تقشف کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں دنیا کے تین بڑے مذاہب یعنی ہندومت، بدھ مت اور عیسائیت داخل ہیں۔ جن لوگوں نے ان مذاہب کی تعلیم کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ انکا غالب عنصر ترک لذات، قطع تعلقات دنیوی، فلسفیانہ غور و فکر اور عبادت و رہبانیت میں انہماک ہے۔ یہ تمام مذاہب اپنی قدر و قیمت رکھتے ہیں اور اپنے مخصوص عہد اور مخصوص حالات کے لئے بہترین مذاہب تھے لیکن نظر غائر سے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک بھی کامل مذہب نہیں ہے انسانیت کے ابتدائی دور میں اس میں تشخصیت پیدا کرنے کے لئے اور بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات کو واضح کرنے کے لئے ایسے مذاہب کی ضرورت تھی جن میں زیادہ زور انہی عناصر پر دیا گیا ہو۔ لیکن انسان تو عجیب قسم کی مخلوق ہے وہ جس طرف جھکتا ہے ادھر اتنا منہمک ہو جاتا ہے کہ دوسرے رخ کو بالکل بھول ہی جاتا ہے چنانچہ ان تعلقات کی دیکھ بھال میں اس میں اتنی خود غرضی پیدا ہوگئی اور دنیاوی معاملات سے اس قدر شغف اسے ہوگیا کہ اس کی تخلیق کا مقصد ہی فوت ہونے لگا۔ اب ایسے مذاہب کی ضرورت پیش آئی جن میں زیادہ زور ان تعلقات کے قطع کرنے اپنی ہستی کو گم کرنے اور روحانی ترقی حاصل کرنے پر دیا گیا ہو۔ اس

سے ردعمل ہوا۔ اور انسان نے روحانیت کیطرف توجہ کی لیکن ایک عرصہ گذرنے کے بعد اس میں بھی وہی یک طرفہ شدت پیدا ہوگئی اور جائز دنیادی تعلقات سے بے نیازی کے باعث پھر شیرازہ عالم درہم و برہم ہونے لگا۔ اب زندگی کے دونوں پہلو انسان کے سامنے تھے لیکن علیحدہ علیحدہ ایک طرف کچھ لوگ تھے جو سراسر دنیا میں محو تھے اور روحانیت سے بے نیاز۔ دوسری طرف ایک طبقہ تھا جو دنیا کی طرف رخ کرنا بھی حرام سمجھتا تھا اور یکسر تقشف و رہبانیت کی زندگی کو مقصد حیات سمجھتا تھا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو انسان کی تخلیق نہ اس کے لئے ہوئی تھی اور نہ اُس کے لئے۔ اس وقت ایک ایسی طاقت کی ضرورت ہوئی جو دونوں عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر سکے اور انسان کے لئے ایسا لائحہ عمل پیش کر سکے جس کی پابندی سے اسکی تخلیق کا مقصد حاصل ہو۔ اسلام اسی طاقت کا نام ہے۔ اور اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ سے یہی مراد ہے۔ تمام دوسرے مذاہب نے اسی دین کے لئے زمین تیار کی تھی اور یہی اصل الاصول تھا جس کے لئے انسانی دماغ کی پرداخت کیجا رہی تھی۔ اسلام نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھا کہ نہ صرف دنیا سے کام چل سکتا ہے اور نہ صرف دین سے بلکہ دین و دنیا باہم آمیز کہ اکسیر شود۔ اور جبتک مسلمان اس اصل الاصول کو نہیں بھولے وہ خود بھی کامیاب رہے اور تمام دنیا کو ان سے فائدہ بھی پہنچا۔ اور جیسے ہی انہوں نے اس مرکزی حقیقت کو فراموش کیا انکی ترقی تنزل سے بدل گئی۔ اور اب انکا وجود صفحہ عالم پر حرف غلط کی طرح رہ گیا ہے۔ اگر معترضین ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں اور تعصب کی عینک اتار ڈالیں تو انپر یہ امر اچھی طرح واضح ہوسکتا ہے کہ اسلام نے قدم قدم پر اس ہم آہنگی کے قائم رکھنے کی تائید کی ہے۔ اگر ایک طرف اس نے جائز دنیوی تعلقات کے قائم رکھنے کی تعلیم دی ہے اور ایسے اصول بتائے ہیں جن کی پیروی سے انسان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کی تمام پیچیدگیاں رفع ہو جاتی ہیں تو دوسری طرف اتنے ہی زور سے روحانی زندگی کو قائم رکھنے کی بھی ہدایت کی ہے اور ایسے سامان فراہم کئے ہیں جن سے انسان کی روحانی احتیاج پوری ہو اور اسے ابدی مسرت اور دائمی خوشی حاصل ہو۔ قرآن کا ہر صفحہ اس دعوے کی دلیل ہے اور رسول کی زندگی کا ہر واقعہ اس حقیقت کا شاہد

دلائل وشواہد کی یہ کثرت ہے کہ انکار کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی۔

حیرت کا مقام ہے کہ معترضین کو رسول اللہ صلعم کی مکی اور مدنی زندگی میں کوئی ربط نہیں نظر آتا اور وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مدینہ میں آکر ان کی زندگی میں کوئی تغیر رونما ہوگیا تھا۔ مکے کا کام دراصل بنیاد کا حکم رکھتا تھا جس پر مدنی زندگی کی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک ایسی قوم کو جو ضلالت وگمراہی کے عمیق ترین غار میں گری [illegible] راستے پر لگا دیا جائے اس میں دینی احساس پیدا کیا جائے۔ اسے سمجھایا جائے کہ ایک ایسی [illegible] ہستی بھی ہے جس کے سامنے اسے جواب دینا پڑے گا۔ جب یہ حقیقت ایک گروہ کے ذہن نشین ہوگئی تو انہیں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تمام مسائل کی تعلیم دی گئی اور یہ بتایا گیا کہ انسان کو دنیا میں کس طرح بسر کرنا چاہیے۔ اگر رسول اللہ صرف عقائد وعبادات کی تعلیم دینے پر اکتفا کرتے اور [illegible] زندگی کے لئے ایک مکمل لائحہ عمل نہ تیار فرماتے تو اس کا نتیجہ [illegible] معاشرت کو دین سے علیحدہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے اس شعبے میں انسان کو [illegible] کی طرح چھوڑ دیا جائے اور اس کے جذبات وعواطف کی ہدایت کے لئے کوئی شمع روشن نہ کی جائے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاملات اور باہمی تعلقات میں انسان انتہائی خود غرضی اور [illegible] سے کام لے گا اور صورت حالات وہ پیدا ہوگی جو آج کل یورپ میں ہے۔ [illegible] یہ ہے کہ اگر کوئی تمہیں ایک طمانچہ مارے تو دوسرے کے لئے بھی اپنے رخسار پیش کر دو اور اگر کوئی تمہاری چادر چھین لے تو تم اسے اپنا کرتا بھی اتار کر دیدو لیکن آج عیسائی اقوام کا طرز عمل کیا ہے۔ بالکل اس کے خلاف۔ اگر انکا حق ایک گز زمین پر ہوتا ہے تو وہ اس وقت تک [illegible] ہوتیں جبتک ایک میل زمین حاصل نہ کرلیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ انکے نزدیک دین کو [illegible] یا معاشرت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ خصوصیت صرف اسلام کی ہے کہ اس نے اپنے ابتدائی دور میں ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو اپنے تمام معاملات کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی یا معاشرتی دین کی روشنی میں دیکھتی تھی اور جس کے باہمی تعلقات میں مساوات واخوت کا ایسا نقشہ نظر آتا [illegible]

تھا جو اب تک صفحات تاریخ کی زیب و زینت ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ہدایات موجود ہیں اور کوئی ایک گوشہ نہیں ہے جو تاریک رہ گیا ہو۔ کامل دین وہی ہے جو انسان کی ہر دشواری میں خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ کام آئے۔ حالات کچھ بھی ہوں۔ ماحول کتنا ہی بدل جائے لیکن انسان کے پاس ایسے اصل الاصول موجود ہوں جن سے سیدھا راستہ معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اسلام اس ضرورت کو پورا کرتا ہے اور بدرجہ اتم پورا کرتا ہے۔ وہ ایسی شاہ راہ بتا دیتا ہے جس پر چل کر انسان منزل مقصود تک بہ آسانی پہنچ سکتا ہے۔ اور کمال تو یہ ہے کہ باوجود تمام پہلوؤں پر حاوی ہونے کے کہیں انسانی فکر کو پابند اور محدود نہیں کرتا۔ ہر جگہ انسان کو مناسب آزادی عطا کرتا ہے اور اسے اختیار دیتا ہے کہ مخصوص حالات اور واقعات کی مناسبت سے فروع میں تغیر و تبدل کر سکے اور ظاہر ہے کہ اصول کے تغیر کی تو کوئی دین اجازت دے ہی نہیں سکتا۔

ان سطور کے ملاحظہ سے ایک حد تک واضح ہو گیا ہوگا کہ اسلام میں اتنی معنویت موجود ہے جتنی انسان کے لئے ضروری ہے اور رسول اللہ صلعم کی مدنی زندگی کی تعلیمات عین منشائے تخلیق انسانیت کے موافق ہیں اور معترضین کے اعتراضات مذہب کے ناقص تخیل پر مبنی ہیں۔

تیسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم اور کفار مکہ اور یہود کے درمیان جو جنگیں ہوئیں ان کی ذمہ داری رسول پر ہے اور ہمیشہ پیش قدمی انہیں کی طرف سے ہوئی۔ اسی سلسلے میں یہ الزام بھی ہے کہ بعض یہودیوں کو رسول اللہ صلعم نے خفیہ طور پر قتل کرا دیا۔ ان اعتراضات میں حقیقت کا ذرا سا شائبہ بھی نہیں۔ مندرجہ ذیل سطور کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ قرآن نے صرف دفاعی جنگ کی اجازت دی ہے اور یہ بھی کہ رسول اللہ صلعم کو مجبوراً اپنی حفاظت اور تبلیغ دین کی آزادی کے لئے ہتھیار اٹھانا پڑا تھا۔

آیت جہاد جس میں مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی اس قدر واضح ہے کہ شک اور شبہے کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی:۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى | انہیں اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ کی گئی اس لئے کہ ان پر

نصرھم لقدیرہ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ط ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز

سورۃ الحج (۲۲) آیت ۴۰ و ۴۱

ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ انکی مدد کرنے پر قادر ہے۔ جو صرف اتنا کہنے پر کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے اور اگر اللہ بعض لوگوں کو دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے نہ روکتا تو صومعے، گرجا، عبادتگاہیں اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے مسمار ہو چکی ہوتیں اور اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں۔ بیشک اللہ قوی اور غالب ہے۔

ان آیات کے پڑھنے کے بعد کیا یہ صاف نہیں ہو جاتا کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت محض اس وجہ سے دی گئی تھی کہ ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے تھے۔ ناحق انہیں گھروں سے نکال دیا گیا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ ان سے جنگ بھی کیجاتی تھی اور اگر اس کی اجازت نہ ملتی تو اللہ کے نام لیوا دنیا سے مٹ جاتے۔ یہانتک تو اجازت جنگ کی وجہ بتائی گئی تھی اب اسکا مقصد ملاحظہ ہو:۔

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظالمین

البقرہ۔ ۲۵۔ آیت ۱۸۹

اور ان سے لڑو یہانتک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے۔ اور اگر وہ رک جائیں تو زیادتی ظالموں کے سوا کسی پر نہیں ہو سکتی۔

اس سے ایک طرف تو یہ صاف ہو گیا کہ جنگ کا مقصد یہ ہے کہ فتنہ دور ہو جائے اور دین میں سوا اللہ کے خیال کے دوسرے کا خوف یا ڈر باقی نہ رہے اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو گیا کہ فساد کرنے والے اگر باز آجائیں تو پھر جنگ خود بخود ختم ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کو لڑائی جاری رکھنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ یہ بھی ملاحظہ ہو کہ کن لوگوں سے جنگ کی اجازت ہے:۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین

(۲۔ ۱۸۶)

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

کیا اب بھی کوئی شبہ باقی رہجاتا ہے کہ صرف دفاعی جنگ کی اجازت دی گئی ہے اور دفاع سے بسر مو تجاوز کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ قرآن میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں جن میں اسی خیال کی تکرار ہے اور اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ دین کے معاملے میں نہ تو خود مسلمانوں کو جبر واکراہ سے کام لینا چاہئے اور نہ جبر واکراہ برداشت کرنا چاہئے۔ جنگ کی اجازت انتہائی مجبوری کی حالت میں دی گئی ہے جب دنیا سے اللہ کے نام لیواؤں کے مٹنے کا خوف ہو۔ جب خدا کے دین کی تبلیغ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جاتی ہوں تو خدا کے رسول کے لئے بجز اس کے کیا چارہ ہے کہ کمر ہمت باندھ کر کھڑا ہو جائے اور راہ حق سے تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ ہاں اگر اس مقصد کے حاصل ہوجانیکے بعد محض حصول اقتدار یا جلب منفعت کی خاطر رسول لوگوں سے جنگ کرے تو البتہ وہ مورد الزام ہو سکتا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایسا کیا۔ یا کوئی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے بالکل آخری تدبیر کی صورت میں ہتھیار اٹھایا۔ مکے میں ان پر اور انکے متبعین پر کیا کیا تکلیفوں کے پہاڑ نہ گرائے گئے۔ کونسا ایسا ظلم باقی رہگیا جو دین حق کے ماننے والوں پر نہ ڈھایا گیا۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ جب بے خانماں مسلمان اپنا گھر بار چھوڑ کر پردیس میں جابسے تو وہاں بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ مدینے کے قرب و جوار میں برابر انپر چھوٹے چھوٹے حملے ہوتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑے حملے کی تیاری بھی جاری رہی۔ حواشی میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ جنگ بدر کے کیا اسباب تھے اور یہ کیسا بے بنیاد الزام ہے کہ رسول اللہ صلعم اور انکے ساتھی قافلے کو لوٹنے کی غرض سے نکلے تھے یہیں سے باقاعدہ جنگ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پھر جنگ احد اور جنگ احزاب کہاں ہوئی تھی۔ کیا اسمیں بھی رسول نے ہی پیش قدمی کی تھی کیا بار بار قریش مکہ اور انکے حلفا نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ مدینہ پر حملہ نہیں کیا اور کیا مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے کوئی دقیقہ انہوں نے اٹھا رکھا۔ اگر خدا کی مدد مسلمانوں کے شامل حال نہ ہوتی تو انکا نام دنیا سے خارج ہو گیا ہوتا اور اللہ کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہتا حواشی میں ہر واقعے کے ضمن میں یہ بھی اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہے کہ رسول اللہ کی کوئی جنگ جارحانہ

نہیں تھی - ابتدا میں تو انہر پے در پے حملے ہوتے رہے اور انہیں دم لینے کی فرصت ہی نہ ملی اس کے بعد یہ ضرور ہوا کہ انہیں دشمنوں کی تیاریوں کی خبر پہلے سے ملجاتی تھی اور وہ بسلسلہ تقدم بحفظ انکو جڑ ہی سے کاٹ دینے میں کامیاب ہوجاتے تھے - یہ جنگوں کا ایک سلسلہ تھا - ایک سے دوسرے کا سامان پیدا ہوتا تھا اور ہر جنگ کو علحدہ علحدہ نہیں دیکھا جا سکتا - کفار قریش نے جبتک ان میں کچھ بھی دم باقی رہا اپنی تمام کوششیں رسول اللہ صلعم کی مخالفت میں صرف کردیں - تو کیا رسول اللہ صلعم کو یہ حق نہ تھا کہ ان کی تدابیر کا توڑ کرتے اور اپنی ہستی کو برقرار رکھنے اور اس دین کی تبلیغ کی آزادی کے لئے جس کے وہ حامل تھے کوئی صورت پیدا کرتے - یہ ہے حقیقت اس اعتراض کی کہ اسلام تلوار کے ذریعے سے پھیلا - اب اہل انصاف خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ اس میں کہاںتک صحت کو دخل ہے رہا بعض اکابر یہود کے خفیہ قتل کا سوال جسکا الزام رسول اللہ صلعم پر لگایا جاتا ہے - اسکی حقیقت بھی ایک افسانے سے زیادہ نہیں - حواشی میں ہر اس واقعے کے سلسلے میں جہاں یہ الزام لگایا جاتا ہے الگ الگ تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور سب کے مطالعے کے بعد یہ صاف ظاہر ہوجائیگا کہ اس اعتراض کی بھی کوئی اصلیت نہیں -

چوتھا اور آخری اعتراض جس سے یہاں بحث کرنی منظور ہے یورپ کی نگاہ میں سب سے بڑا اعتراض ہے - کہا جاتا ہے کہ باوجود نہایت سادہ زندگی بسر کرنے اور لذات سے ترک کردینے کے رسول اللہ صلعم میں ایک کمزوری باقی رہگئی تھی جس کا اظہار یوں ہوا کہ عام مسلمانوں کو انہوں نے صرف چار بیبیوں کی اجازت دی لیکن اپنی ذات کو اس کلیئے سے مستثنیٰ کرلیا - معترضین کو اس میں خواہشات نفسانی کی کارفرمائی نظر آتی ہے - نعوذ باللہ من ذلک - واقعہ یہ ہے کہ دوسرے اعتراضات کی طرح اسکا انحصار بھی تعصب پر ہے اور کسی معترض نے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنیکی کوشش نہیں کی ہے - اگر ازواج رسول اللہ صلعم کی فہرست پر ہم نظر کریں تو یہ اعتراض حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے بجز حضرت عائشہؓ کے تمام ازواج پہلے کسی نہ کسی کے عقد میں رہ چکی تھیں اور جب رسول اللہ صلعم نے ان

سے نکاح کیا تو ان کی عمریں شباب سے متجاوز ہو چکی تھیں دوسری طرف حضرت عائشہؓ کی عمر عقد کے وقت اتنی کم تھی کہ ایک عرصے تک وہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکیں اگر رسول اللہ صلعم واقعی نفسانی جذبے سے متاثر ہوتے تو ان کو جوان اور حسین خواتین عقد کے لئے نہ مل سکتی تھیں؟ عرب میں اس وقت کونسی عورت اس شرف سے انکار کرسکتی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کے خلاف بیوہ اور مسن عورتوں سے شادی کی۔ اس کے بعد اگر ہم ان تعلقات پر نگاہ کریں جو رسول اللہ صلعم کے ازواج کے ساتھ تھے تو یہ مسئلہ اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نفس پرست انسان آزادی فکر اور آزادی عمل کھو بیٹھتا ہے اور عورتوں کی خواہشات کا پابند ہو جاتا ہے وہ جو کچھ حکم دیتی ہیں اس کی تعمیل اسے اپنی فطری کمزوری کی بنا پر لازمی طور پر کرنی پڑتی ہے۔ برخلاف اس کے رسول اللہ صلعم کی شخصیت کا اثر ان کی ازواج پر بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان خاتونوں کو جن میں سے اکثر ناز و نعم کی خوگر تھیں آپ نے سادہ اور بے لذت زندگی کا عادی بنایا اور جب انہیں سے بعض نے زیادہ آرام سے زندگی بسر کرنے کی خواہش کی تو آپ نے ان سے سخت بیزاری کا اظہار کیا۔ کیا وہ انسان بھی جو اپنے جذبات نفسانی سے مغلوب ہو کبھی ایسا کرسکتا ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اتنی تعداد میں عقد کیوں کئے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ عرب میں تعدد ازدواج عام طور پر رائج تھا اور اسے بالکل معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ خاندانی تعلقات کی توسیع اور حلفا پیدا کرنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ دوسرے خاندان میں شادی کیجائے۔ بعض اوقات اگر کسی بیوہ کی کفالت منظور ہوتی تھی تو اس سے عقد کر لیتے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے جو عقد کئے ان میں یہی مصالح پیش نظر تھے اور آپ کی اکثر ازواج ایسی خاتونیں تھیں جو اپنے سابق شوہروں کے انتقال کے بعد کفالت کی مستحق تھیں اور ان کی دلجوئی کی بہترین صورت یہی تھی کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں خود اپنے عقد میں لے لیں۔ کبھی مغلوب قبیلے کا درجہ بلند کرنے کے لئے بھی رسول اللہ نے اس قبیلے میں عقد کیا ہے۔ چنانچہ ام المومنین جویریہ سے اسی مصلحت سے عقد کیا تھا اور اس کا نتیجہ ہوا کہ انکا تمام خاندان آزاد ہو گیا۔ اسی طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعثت کے بعد جتنے نکاح کئے ان میں کوئی نہ کوئی اجتماعی مصلحت ضرور تھی اور ان کا محرک ہرگز کوئی ادنےٰ جذبہ نہیں ہو سکتا۔

اب رہا یہ امر کہ جب تحدید تعداد کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ صلعم اس سے مستثنیٰ کیوں ٹھیرے اس میں بھی بے شمار مصالح ہیں اور ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس لئے کہ اگر ایک طرف آپ کے لئے یہ رخصت تھی کہ چار سے زائد بیبیوں کو علیحدہ نہ کریں تو دوسری طرف یہ سخت قید تھی کہ آپ کسی صورت میں اس کے بعد کوئی دوسرا نکاح بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عام مسلمانوں کو تو یہ اجازت تھی کہ اگر چار کی تعداد میں کمی ہو اور وہ چاہیں تو شرائط کی پابندی کے ساتھ اس تعداد کو پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلعم کسی حالت میں بھی کوئی عقد نہ کر سکتے تھے خواہ تعداد میں کتنی ہی کمی نہ واقع ہو۔ جدید عقد کی اجازت ختم ہو جانے کی تو یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جن مصالح کی بنا پر آپ عقد کرتے تھے وہ اب مکمل ہو چکے تھے یعنی اسلامی جماعت کی بنیاد خدا کے فضل و کرم سے بہت مستحکم ہو گئی تھی اور مصاہرت کے ذریعے سے کسی نئے قبیلے کو اپنا حلیف بنانے کی ضرورت نہ رہی تھی اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ باقی ازواج کو علیحدہ نہ کرنے میں بھی کوئی اعلےٰ مصلحت ہو گی اور اس میں ذاتی جذبے کو بالکل دخل نہیں ہے۔ اس موقعہ پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اسی زمانے میں یہ حکم نازل ہوا تھا کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات سے کوئی اور شخص عقد نہیں کر سکتا تھا اور انہیں امہات المومنین کا درجہ دیا گیا تھا۔ ظاہر ہیں معترض

اس پر بھی اعتراض کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ حکم بھی رسول اللہ کے کسی ذاتی جذبہ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس میں یہ مصلحت تھی کہ ازواج مطہرات رسول اللہ صلعم کے اخلاق، عادات اور انکی تعلیمات کی حامل اور انکا صحیح نمونہ تھیں۔ پھر آپ کے بعد ان کو کسی دوسری ہستی کا پابند نہ ہونا چاہئے تھا بلکہ آزاد رہکر اس فیض کو جو رسول اللہ صلعم کی صحبت سے انہیں حاصل ہوا تھا عامۃ المسلمین تک پہنچانا چاہئے تھا اور اسی لئے ان کے متعلق یہ حکم نازل ہوا تھا۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ اس حکم کی موجودگی میں اگر رسول اللہ صلعم علاوہ چار کے باقی ازواج کو علیحدہ کر دیتے تو ان کی کسقدر حق تلفی ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ رسول اللہ صلعم کے فیض صحبت سے محرومی ان کے لئے کس قدر باعث تکلیف ہوتی۔ یہ تھی مصلحت اس استثنا کی ورنہ حقیقتہً معترضین کے باطل توہمات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ بھلا وہ انسان جو ترک لذات دنیوی کی بہترین مثال ہو اور جسے خلق خدا کی ہدایت تفویض ہوئی ہو کبھی ایسے جذبات سے مغلوب ہو سکتا ہے جو تمام انسانی خوبیوں پر پانی پھیر دینے کو کافی ہیں۔

یہ چار بڑے اعتراضات تھے جو مستشرقین عام طور پر سیرۃ رسول اللہ صلعم پر وارد کرتے ہیں اور انہی سے اس مقدمے میں مختصر طور پر بحث کی گئی ہے۔ ارادتاً تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے اس لئے کہ مقدمے کے از حد طویل ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ہر بحث میں اصولی مسائل کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ مقدمہ نگار کو اپنی خامیوں کا کما حقہ علم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ترجمے، مقدمے اور حواشی میں بہت سے نقائص ہوں گے۔ اہل نظر سے امید ہے کہ وہ ان سے ہرگز چشم پوشی نہ کریں گے بلکہ ان کو ظاہر کر دیں گے اس لئے کہ اس طرح قارئین بھی غلط فہمیوں سے محفوظ رہیں گے اور خود مولف کو بھی اپنی غلطیوں کا علم ہو جائے گا۔ صحیح تنقید علم کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

یہاں پر میں اپنے مکرم استاذ مولنا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے کہ مجھے جو کچھ تھوڑا سا علم عربی ادب اور اسلامیات کا حاصل ہوا ہے وہ انہیں کے فیض سے حاصل ہوا ہے اور یہ تالیف بھی اگر وہ پوری مدد نہ کرتے تو کبھی تکمیل کو نہ پہنچتی۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں اپنے تمام ان بزرگوں اور دوستوں کا شکر گذار ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنی ہدایتوں اور مشوروں سے مجھے سرفراز فرمایا۔

عبدالعلیم

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

۲۴ر اپریل ۱۹۲۹ء

رائنر میریا رِلکے[1]

رائنر میریا رِلکے ایک سال سے اوپر ہوئے آیا دنیا سے اُٹھ گیا۔ ہندوستان میں اس نام سے آج کون واقف ہے؟ کوئی نہیں۔ لیکن رِلکے جرمنی کے غنائی شعراء کا بادشاہ تھا اور گو آجکل کے نقادانِ سخن میں سے اکثر شٹفان گیارگے[2] کو شوکت کلام اور پختگیٔ سخن کی بنا پر رِلکے سے بہتر جانتے ہیں لیکن وہ زمانہ آئے گا اور ضرور آئے گا جبکہ ذوق و غالب کی طرح اِن دونو کے مراتب بھی اپنی صحیح روشنی میں نمایاں ہونگے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ گیارگے حقیقی معنوں میں جرمن شاعر ہے اور گوئٹے کا وارث اگر کوئی قرار پاسکتا ہے تو وہ گیارگے ہے۔ چنانچہ یہی ہوا بھی کہ گزشتہ سال گیارگے کو جرمنی کے بہترین شاعر کی حیثیت سے ایک کثیر رقم نذر کی گئی۔ رِلکے کا کلام قومی طرزِ ادا سے الگ اور بالاتر ہے۔ اِس کی ایک وجہ یہ ہے کہ رِلکے یورپ کا پہلا شاعر ہے جس نے تصوّف کے راز کو سمجھا ہے اور اس طرح پر نہیں کہ اس پر فارسی یا عام طور پر مشرقی شاعری کا اثر ہوا ہو یا زمانۂ متوسط کی شاعری میں جو کوششیں اکثر نصرانی شعراء نے تصوّف کے میدان میں کی ہیں اُن کا اِس پر کوئی صریحی اثر پڑا ہو۔ مادیّت کے آخری زینوں پر پہنچکر انسان کی روح اپنی خود شکستی و خود فراموشی سے پراگندہ و پریشان ہو جاتی ہے اور بے قرار ہوکر رِلکے کے قلم و زبان سے آشکار ہوتی ہے۔ اور یہی راز ہے رِلکے کی روحانی شاعری کی کامیابی کا۔ انسان غلامانہ تقلید سے کوئی بڑی چیز کبھی حاصل نہیں کرسکتا آدھی صدی کی مسلسل کوششوں کے باوجود ہندوستان کی کسی زبان نے ایک ناول بھی

---

[1] Rainer Maria Rilke

[2] Stefan George

ایسا پیدا نہیں کیا جس پر کوئی سخن سنج فخر کر سکتا - وجہ اس کی یہ ہے کہ ناول نویسی ہندوستان کے ادبیات کے ارتقا کا منطقی تقاضا نہیں اور انگریز ناول نویسوں کے غیر آہنگ تتبع سے ایک ایسی دوغلی چیز پیدا ہوئی ہے جس کو نہ ناول کہہ سکتے ہیں نہ فسانہ اور نہ جس کی ان دونو حیثیتوں سے جداگانہ طور پر بھی بین الاقوامی معیار نظر سے کوئی وقعت ہو سکتی ہے محض ارتقائے فطری سے جو شے دستیاب ہوتی ہے وہ ایک واقعی اور حقیقی قدر و قیمت رکھتی ہے - گوئٹے کے دیوانِ مغربی[ؔ] نے جو اُس نے فارسی دواوین کے تتبع میں نظم کیا ہے بہت کچھ شہرت حاصل کی - گو ہم اُس کو ادبی تجربہ کی حیثیت سے ایک دلچسپ چیز مان لیں لیکن نہ تو اس میں سعدی و حافظ کے تغزل کا پتہ ہے نہ اُن کے تصوف کی شان اور ان کی چاشنیٔ کلام سے اِس کو کوئی واسطہ - ہائنے[ؔ] اکثر ہندوستان کے جذبہ فروش[ؔ] طبائع کو بہت بھاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہائنے کے یہاں ہم کو مشرقی تغزل کی بہت کچھ جھلک نظر آتی ہے لیکن اس بنا پر کر انسان اس طرزِ تغزل کا مقابلہ فارسی تغزل سے کئے بغیر نہیں رہتا ہائنے کا کلام اُس شخص کی نظروں میں بہت کم جچتا ہے جو فارسی تغزل کی نیرنگیوں سے آشنا ہے - برخلاف ا نکے رلکے کی شاعری اور شعریت کو فارسی اثرات سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا طرز ادا فارسی اور اُردو کے شعرا سے اس قدر جداگانہ ہے کہ موازنہ کا اصلا خیال نہیں گزرتا - لیکن باوجود طرز ادا میں انتہائی اختلاف کے ہم رلکے کے یہاں میر کا درد پائینگے، تو درد کا تصوف، انیس کے نوحے کی شان تو غالب کا علو خیال - اور جہاں تک شیرینیٔ زبان کا تعلق ہے حافظ شیرازی کے سوا اس کا کوئی ہم پلہ نہیں - اس کا ایک ایک لفظ سرچشمۂ نبات ہے لیکن اس کے لفظوں میں

ؔ West-Östlicher Diwan

ؔ Heine

ؔ جذبہ فروش سے میری مراد Sentimental ہے -

نبات کی سی ارزانی نہیں - اس کا علوِ خیال اس کے الفاظ کی شیرینی کو بے وقار ہونے نہیں
دیتا اور اس کو ارزانی احساسات سے محفوظ رکھتا ہے - افسوس یہ ہے کہ اس کے کلام کا
ترجمہ اردو میں اُسی قدر ناممکن ہے جس قدر حافظ یا سعدی کا ترجمہ جرمن یا انگریزی میں -
لیکن میں حتی الامکان اس کے کلام کی ایک تھوڑی سی جھلک دکھانے کی خاطر اس کی دو
مختصر نظموں کا ترجمہ کرنے کی جرأت کرتا ہوں - کوشش میری یہ رہی ہے کہ اس کے الفاظ
کا اگر کہیں ترجمہ ممکن نہ ہو تو نہ سہی لیکن اس کے خیال اور طرز ادا کی ترجمانی ہو جائے اور
اس کی نظم کی نوعیت میں حتی الوسع فرق نہ آنے پائے - اُمید ہے کہ ناظرین پر ترجمہ کا
طرز اگر گراں گزرے تو میری ناداری سمجھیں اور شاعر کے کلام کی پستی پر محمول نہ کریں -

ان ترجموں کو پیش کرنے سے پیشتر رلکے کے متعلق چند ایسی باتیں بتلا دینا ضروری سمجھتا
ہوں جن سے کلام کو پوری طرح سمجھنے اور اُس سے لطف اندوز ہونے میں آسانی ہو - رلکے
صریحاً یورپ کے دورِ جدید کا شاعر ہے اور نیچر پرستی[5] کے خلاف جو ردِ عمل اواخر اُنیسویں صدی
عیسوی سے وہاں کے فنونِ لطیفہ میں اکسپرشنزم[6] کی تحریک کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اُسکا
اس پر نہایت درجہ اثر ہوا ہے، گو ہم اس کو مخصوص طور پر اکسپرشنی شاعر نہیں کہہ سکتے - وہ ذرّے
ذرّے اور قطرے قطرے میں انسان کی روح کا متلاشی ہے اور خود انسان کی روح کا
اظہار ہمیشہ سلجھے ہوئے جملوں اور صاف الفاظ میں نہیں کرتا بلکہ اکثر اپنی کج مج زبانی سے وہ
کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جو الفاظ ناطق و صریح سے ممکن نہیں - رلکے روحِ انسان کے رنگ و
روپ کو حتی الامکان بے نقاب پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے - عام فہم الفاظ میں ایک بات
کہتے کہتے کچھ کھو سا جاتا ہے اور دماغ بلا ارادہ جہاں اس کو لے جاتا ہے وہاں جاتا ہے لیکن

---

[5] Naturalism

[6] Expressionism.

حسن کلام کو کہیں ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اکثر نظموں میں وہ ایک شخص خاص کی ایک وقت خاص میں
پوری پوری دماغی کیفیت کا خاکہ کھینچتا ہے جو اس طور پر ہرگز ممکن نہیں کہ شاعر اُس کے جذبۂ
مرکزی اور خیالات ارادی کو نظم کر دے۔ کچھ تو وہ جان بوجھ کر کرتا ہے اور کچھ بے خبری کے
عالم میں اور دوران کیف میں جو اکثر متعلق و غیر متعلق احساسات و اُتلافات دماغ میں گزرتے
ہیں اُن کو بھی قلمبند کر دیتا ہے۔ اس کے کلام کی یہ نفسیاتی پیچیدگیاں ہی اس امر کا باعث
ہیں کہ وہ غالب کی طرح مقبول عام ہونے سے قاصر ہے اور رہیگا گو جہاں تک زبان کا تعلق
ہے ٹیگور کا کلام نہایت سادہ اور سہل ہے۔ ایک بات اور قابل غور ہے کہ ٹیگور کی شاعری
نہایت درجہ انفرادی ہے۔ اس کا "ترانۂ گدا" ہر گداگر کی فریاد نہیں بلکہ اسکے "گدا" میں
خود اسی کا سراپا نظر آتا ہے یعنی اگر ٹیگور خود محتاج ہو کر در در بھیک مانگتا تو اُس کے احساسات وہی
ہوتے جو اُس نے اس ترانے میں نظم کئے ہیں۔ اسی طرح اس کی "فریاد" ہر نااُمید کی
فریاد نہیں بلکہ خود اُس کی نااُمیدی کی فریاد ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہو گا کہ اس کے چشموں میں،
اس کے نالیوں میں، اس کے پرندوں میں، اس کے پردہ ہائے ساز میں، اس کے مسیح
میں، اس کی ام المسیح میں، اس کے ہر ہر ذرہ اور ہر ہر آفتاب میں ہم اسی کی روح متحرک
پائیں گے۔

کس قدر انوکھی معلوم ہوگی یہ شخصیت ہندوستان کے رہنے والوں کو جو سالہا سال سے
ورڈس ورتھ، ٹے نی سن، اور انگلستان کے اور بے شمار شاعروں کی فطرت پرست ہستیوں
سے دوچار رہے ہیں اور اُن کے اتباع میں کوشاں ہیں۔

بڑی چیز تھا ٹیگور۔ افسوس دنیا سے چل بسا گو ابھی اُس کے مرنے کے دن نہ تھے۔
یورپ کے باشندوں کے لئے پچاس برس کی عمر کیا ہوتی ہے؛ کچھ بھی نہیں۔ خدا مغفرت کرے

ترانۂ گدا[1]

دروازے دروازے پھرنا۔
صدائیں دینا۔
آندھی ہیں، پانی ہیں، چلچلاتی دھوپ میں۔
اکبارگی تھک کر کہیں بیٹھ جانا۔
کسی کونے میں، کسی چوکھٹ پر۔
اپنا داہنا کان اپنے داہنے ہاتھ پر رکھ لینا، اور چلّانا۔
چلّانا، چلّانا، چلّانا۔

اور پھر۔
مجھکو خود اپنی آواز ایک غیر کی سی آواز لگتی ہے۔
پھر مجھکو نہیں معلوم ہوتا کہ یا الٰہی یہ کون حلق پھاڑ پھاڑ کر چلّاتا ہے۔
میں یا کوئی اور۔

---

[1] Das Lied des Bettlers کا ترجمہ "فقیر کی صدا" یا "سائیں کی صدا" میں نے اس لئے نہیں کیا کہ اوّل تو یورپ میں صدا دیکر بھیک مانگنے کا طریقہ نہیں دوسرے شاعر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا گدا گر اپنے ان شاعرانہ خیالات کو چند فلوس سیاہ کے بدلے در در فروخت کرتا پھرتا ہے بلکہ جب وہ تھک کر کسی کونے میں کسی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا ہے اور چلاتے چلاتے اپنی بے خودی فریاد سے ذرا بیدار ہوتا ہے تو اُس کے خیالات و احساسات وہ کچھ ہوتے ہیں جو اس ترانے میں ادا کئے گئے ہیں۔

ماخوذ از "دس بوخ در بلدر" (تصویروں کی کتاب)۔ ان نظموں کو نثر منظوم (Prose poem) کے قبیل سے سمجھنا چاہئے اور بلینک ورس کی طرح پڑھنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے۔

میں چلاتا ہوں تو ایک ذراسی چیز کے لئے۔
لیکن شاعر۔
ایک جلوۂ عالمِ خیال کی خاطر۔
اور، آخرکار۔
میں اپنا چہرہ اپنی دونو آنکھوں سے ڈھانپ لیتا ہوں۔
اور اپنے سر کا سارا بوجھ دونوں ہاتھوں پر ٹیک دیتا ہوں۔
جس میں اُسکی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے آرام کی۔
ہاں!
یہ نہ سمجھیں راہ گزرنے والے۔
کہ مجھ آفت نصیب کے سر کو۔
تکیہ تک نصیب نہ تھا۔

فریاد

کیسی ہر چیز دور اور بے بود سی ہے۔
اور مدت کی گزری ہوئی سی ——
شاید وہ ستارہ
جس پر میرے کسب نور کا انحصار ہے
ہزارہا سال ہوئے مر چکا ہے ——
شاید اس کشتی میں
جو ابھی ادھر سے گزری
کسی نے کسی سے کان میں ڈر کر کچھ بات کہی ——

گھر میں ایک گھڑی ٹن ٹن بجی......

کس گھر میں؟......

الٰہی توبہ!

جی چاہتا ہے کہ دل کے اندر سے نکلکر کہیں بھاگ جاتا

فضائے آسمان میں قرار لیتا۔

جی چاہتا ہے کہ سجدے کرتا۔

اور!

ستاروں میں سے ایک

شاید اب تک برقرار ہو،

جی کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے

(ان میں سے) کون، یکہ و تنہا،

ہنوز آشنائے حیات ہے،

کون ایک شہر نور کی طرح

شعاعوں کی منزل پر آسمانوں میں روشن ہے۔

اقبال کا شعر ہے ؎

کبھی او حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

یہاں ہم ایک آشنائے سجود کی جبین سجدہ خو کو شوق شہود میں مبتلا پاتے ہیں۔ رلکے کی اس نظم میں جس کا ترجمے نے صریحاً خون کر دیا ہے ہم کو ایک مغربی شاعر جسے معشوق ازلی کی بے نیاز یہائے بیجا کا دماغ نہیں، نشۂ الست سے لاچار، تلاش حق میں آلام نفسی سے مجبور، اپنے مادی ماحول سے پراگندہ و پریشان ہو کر انتہائی اضطراب اور اضطرار کے

ساتھ یک بیک شوق سجود سے مغلوب نظر آتا ہے۔

"جی چاہتا ہے کہ سجدے کرتا"

اب خدا جانے اس پردۂ زنگار کے پیچھے 'نہیں' کے سوا اگر کوئی ہے تو اس کو ان دو تو چیزوں میں سے کون سی زیادہ بھاتی ہے، جبینِ سجدہ خو یا جبینِ سجدہ جو۔
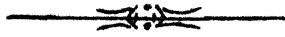
شخصیت اور تاریخ

پروفیسر فریڈرش مائینکے آج کل جرمنی میں تاریخ اور فلسفۂ سیاسیات کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ مضمون اُن کے ایک مشہور خطبے سے ماخوذ ہے جس کا محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن) نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اصل میں یہ خطبہ پروفیسر مائینکے نے مرکزی ادارہ تعلیمات برلن کے ایک جلسے میں دیا تھا۔ اُس کے بعد یہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا۔

جب میں نے آج کے خطبے کے لئے یہ مضمون منتخب کیا تو یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اسے فنِ تعلیم کے عملی مسائل پر منطبق کرنے میں، جو اس کا اصلی مقصد سمجھا جاتا ہے، مجھے توقع سے کم کامیابی ہوگی۔ لیکن یہ موضوع بجائے خود ایسا ہے کہ اس کا سلسلہ اُن مسائل تک پہنچتا ہے جو نہ صرف مورخوں کے لئے بلکہ شخصیت کے سبھی قدردانوں کے لئے دلچسپ ہیں۔ مجھے آپ کے سامنے اس موضوع پر تقریر کرنے کی تجویز اس لئے اور بھی پسند آئی کہ اِس پرآشوب زمانے میں ہمیں جس شدید کشمکش اور سخت تشویش کا سامنا کرنا پڑا اُس کے سبب سے یقیناً ہمارے دلوں میں مشاہدۂ نفس اور ضبطِ نفس کی گہری آرزو تازہ ہوگئی ہوگی۔

اصل مسئلہ جس پر ہم غور کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ تاریخ شخصیت کی تشکیل میں کیا اہمیت رکھتی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے بعد آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ کی تعلیم دینے کے اصول اور طریقہ پر اس بحث کا کیا اثر پڑتا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں اپنے دل میں سوچنا چاہئے کہ آخر یہ شخصیت کیا چیز ہے اور اس کا مقصد اور منشا کیا ہے؟ گوئٹے کا قول اب تک ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے کہ شخصیت ہم ابنائے ارض کے لئے خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور جب ہم مکروہات زندگی سے پریشان ہو جاتے ہیں تو یہ الفاظ مژدۂ جانفزا بنکر چپکے سے ہمارے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ مگر یہ مژدہ ایک طرح کا

مطالبہ بھی ہے۔ یہ ہم سے اس کا طالب ہے کہ باہر سے جتنے اثرات ہمارے جذبات اور ہماری قوتِ عمل پر پڑتے ہوں اُن سب کے نرغے میں ہم اپنی اندرونی سیرت کو استوار رکھیں اور خارجی اور داخلی زندگی کے درمیان ایک حد قائم رکھیں جس کی حفاظت کرنا ہمارا حق اور ہمارا فرض ہے۔ اس حدبندی سے یہ مراد نہیں کہ داخلی زندگی کسی آہنی کٹہرے میں مقید کر دی جائے بلکہ یہ منشا ہے کہ خارجی دنیا سے اس کے تعلقات ضابطے اور اصول کے ماتحت رکھے جائیں۔ اس حریم باطن میں آنے جانے کی راہیں ہوں لیکن وہ بیرونی زندگی کے شور و شر سے محفوظ ایسی جگہ ہو جہاں ہم دلجمعی سے اپنے نفس کا مشاہدہ کر سکیں، اپنی قوتوں کو مجتمع کر سکیں اور ان سے خارجی زندگی میں کام لے سکیں۔ مختصر یہ کہ یہ بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا ہو لیکن بڑی دنیا سے وابستہ ہو، اپنا الگ اور مخصوص رنگ رکھتی ہو لیکن اس کی ترکیب انہیں زندگی کی عام قوتوں سے ہوئی ہو؛ سب سے آزاد بھی ہو اور کل کی پابند بھی۔ علاوہ ان باتوں کے یہ ان سب حقیقی اور زندہ کیفیات پر حاوی ہو جن کے وجود میں علمیاتی تنقید سے کسی طرح کا شبہ نہ پیدا ہو سکے۔ یہ چیز کیا ہے؟ ایک نفس جسے اپنے آپ کا پتا دیو جیتی جاگتی کرامت ہمیں مبدا فیاض نے عطا کی ہے۔ دوسری کرامت یہ ہے کہ ہم [illegible] شخصیت کی تعمیر کریں اور یوں اپنی ذات کو فطرتِ محض کی سطح سے بلند کریں لیکن اس کرامت کے لئے خود ہماری سعی کی ضرورت ہے۔ جب انسان کو اس دُہری کرامت کا شعور ہوتا ہے تب اُس کی سمجھ میں آتا ہے کہ واقعی شخصیت زمین والوں کے لیے سب سے بڑی سعادت ہے۔ فطرت نے زندگی کی اور جتنی صورتیں پیدا کی ہیں اُن سب کو ایک معینہ سلسلۂ نشو و نما کا پابند کر دیا ہے مگر صرف انسان کے لئے اُس نے یہ امکان رکھا ہے کہ اس زنجیر کو ڈھیلا کر دے، روحانی آزادی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرے اور اس دنیا میں آزادی کا سب سے برتر ثمرہ یعنی ایک مخصوص اور ناقابلِ تقلید [illegible] حاصل کرے مگر اس طرح کہ عمومی زندگی سے اُس کا رابطہ ٹوٹنے نہ پائے۔ انسان نہ تو بالکل تنہائی میں خوش رہ سکتا ہے اور نہ

اپنے آپ کو اپنے ماحول میں محو کر کے۔ اگر انسان حقیقی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُس پر لازم ہے کہ انفرادی آزادی میں مجموعی تمدنی زندگی کا پابند رہے اور اجتماعی پابندی میں اپنی شخصی آزادی اور اپنی مخصوص سیرت کو محفوظ رکھے۔ یہی شخصیت اور عالم خارجی کا تعلق ہر معقول اور قابل زندگی سیاسی اور سماجی دستور کی بنیاد ہے۔ یہی فرد اور جماعت نفس اور ماحول کا باہمی تعامل اور اُن کی باہمی کشمکش تاریخی زندگی کا لبِّ لُباب ہے۔

یہی دونوں مسائل ہیں جن پر ہمیں غور کرنا ہے: ایک تو یہ کہ شخصیت کی اہمیت عالم تاریخ کے لئے کیا ہے اور دوسرے یہ کہ عالم تاریخ کا اثر شخصیت کی تشکیل پر کیا پڑتا ہے۔ پہلی ہی نظر میں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اب تک دوسرے مسئلے کے مقابلے میں پہلے مسئلے پر زیادہ کثرت سے اور زیادہ دلچسپ طریقے پر بحث کی گئی ہے۔ کیا اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا مسئلہ دوسرے سے زیادہ اہم ہے؟ کیا اس میں یہ اعتراف پنہاں ہے کہ کل قدر و قیمت کا حامل فرد ہے؟ کیا ہمارا اصل کام یہ ہے کہ ہم عالم تاریخ کا اس نظر سے مطالعہ کریں کہ اُس میں اشخاص کی جد و جہد کو کہاں تک دخل ہے؟ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے لوگوں میں جو تاریخی روح سرایت کر گئی تھی اور اِس دور کی تاریخی زندگی کے موضوع کو جو وسعت حاصل ہوئی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے مسئلے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ عین پسند فلسفہ کی تحریک میں ابتدا سے انتہا تک شخصیت ہی مدنظر رہی اور کانٹ اور فشٹے کی تصانیف میں فرد کی اخلاقی آزادی کے مسئلہ پر زیادہ زور دیا گیا۔ لیکن ہیگل کی تصانیف میں مجموعی تاریخی زندگی کو جو افراد کو چار و ناچار اپنے دھارے میں بہائے جاتی ہے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی پھر جب جدید علم تاریخ کی بنیاد پڑی اور جمہور کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی تو اجتماعیت اور انفرادیت میں از سر نو جنگ چھڑ گئی۔ اجتماعیت اُس کی رفیق ثبوتیت اور نئے علم اجتماعیات کی بنیاد اِس پر تھی کہ جماعت فرد سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ تاریخی انفرادیت اور اُس کی مؤید فلسفیانہ تحریک نے بجائے جارحانہ طرزِ عمل کے مدافعت اختیار کی اور اسی کے ساتھ ایمانداری

سے یہ کوشش کی کہ اجتماعیت پسندوں کے اصولوں میں جو معقول باتیں ہوں اُن کی سچائی کا اعتراف کرے۔ اس طرح تاریخ پر اجتماعیت چھاگئی اور چونکہ مجموعی تاریخی زندگی کے اثرات نے فرد کو ہر طرف سے دبالیا اس لیے یہ سوال آہستہ آہستہ سرد پڑتا گیا کہ عالم تاریخ کا فرد کی آزاد اور مخصوص سیرت کی تربیت میں کیا منشا او رمقصد ہے۔ اس کا اندیشہ تھا کہ فرد کی اہمیت بالکل نہ رہے گی اور وہ بجائے ایک مستقل مقصد ہونے کے مجموعی زندگی کا ایک ذریعہ بن کے رہ جائے گا۔ اس طرح شخصیت اور عالم تاریخ میں جو تعلقات پیدا ہوئے اُن پر بھی ہم نظر ڈالیں گے۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ یہ دونوں سوال یعنی تاریخ کے لیے شخصیت کی اہمیت اور شخصیت کے لیے تاریخ کی اہمیت کیا ہے، ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں اور جو ایک سوال کا جواب ہوگا اُس کا اثر دوسرے سوال کے جواب پر بھی پڑے گا۔ جو لوگ تاریخ میں شخصیت کی اہمیت پر زور دیتے تھے وہ زیادہ تر اس وجہ سے ایسا کرتے تھے کہ انہیں تاریخی زندگی کا بہت گہرا اثر خود اپنی ذات پر محسوس ہوتا تھا۔ انہیں اس مسئلہ سے عملی اور اخلاقی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے شرم آتی تھی اسلئے انہوں نے اسے بالکل نظری رنگ دے دیا۔ اب ہمارا یہ کام ہے کہ اس سوال کو اس کی اصلی صورت میں پیش کریں اور یہ دکھائیں کہ اجتماعیت اور انفرادیت سے ہمارے موضوع بحث کے لیے کیا نتائج اخذ ہو سکتے ہیں۔

اجتماعیت کی انتہائی شکل اصل میں فرد کو محض مختلف اجتماعی قوتوں کا جولانگاہ سمجھتی ہے۔ اُس کے خیال میں جماعتوں کے عظیم الشان مستقل نظام، اُن کے رسوم اور اُن کے خیالات فرد پر حاوی ہوتے ہیں جو فطری طور پر قدامت پسند اور سست ہوتا ہے اور جسے فطرت نے گلوں میں رہنے والے جانوروں کی سی طبیعت عطا کی ہے۔ اس لیے ترقی اور تجدید اشخاص کی بدولت نہیں ہوتی بلکہ حالات زندگی کے بدل جانے سے خود بخود ہوتی ہے۔ افراد جو نظام تجدید کے بانی ہوتے ہیں اصل میں محض ... اور

رجحانات کے مظہر ہوتے ہیں اس لئے عالم تاریخ جو قدیم آئین و دستور اور زندگی کی قوتوں کا حامل ہے، عملی حیثیت سے بیشک افراد پر بہت بڑا اثر ڈالتا ہے بلکہ اُن پر بالکل چھا جاتا ہے لیکن انہیں اس کا موقع نہیں دیتا کہ ان کی مخصوص سیرتیں نشو و نما پا سکیں۔ جو چیز بظاہر آزاد اور جداگانہ شخصیت معلوم ہوتی ہے وہ اصل میں ماحول کے اثرات سے تعمیر پاتی ہے اور اس کی تعمیر میں جتنا مسالہ لگتا ہے سب کا سب خارجی دنیا سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر فرد کے یہاں اس مسالہ کی ترتیب مخصوص اور انوکھی ہوتی ہے لیکن محض اس حد تک جیسے "کلائڈ اسکوپ" یا نیرنگی شیشے میں ہر لمحے رنگوں کا ایک نیا نقشہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح عالم تاریخ کا نظری مطالعہ یعنی زمانہ ماضی کی تحقیق اور مشاہدہ اجتماعیت پسندوں کے نزدیک ارباب فکر پر یہ حقیقت ثابت کر دیتا ہے کہ انسان اسی معمولی آب و گل سے بنا ہے اور اس نے عادت کی گود میں پرورش پائی ہے۔

"اشتراک"

کسی گزشتہ اشاعت میں ہم نے اشتراک اور اسکی مختلف قسموں کی تعریف کی تھی۔ لیکن ناظرین کو یاد ہوگا کہ یہ تعریفیں صرف اشتراک کے معاشی مقاصد کو خصوصاً املاک کے مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر کی گئی تھیں۔ اور یہ اس لیے کہ قیاس و رائے کی بے ترتیبیوں میں کچھ ترتیب پیدا کی جاسکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے وسیع معنوں میں اشتراک محض نظام املاک کی کسی مخصوص شکل سے عبارت نہیں۔ یہ تو حیات اجتماعی کے سب شعبوں اور تمام اداروں پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ یہ ایک بنیادی اصول ہے جس پر جماعت کی زندگی کی ساری عمارت کھڑی کرنی ہے، ایک ذہنیت جو مذہب و اخلاق، معیشت و آئین، فنون و صنعت، غرض تمدنی زندگی کے ہر گوشہ میں جلوہ گری کے لئے بیتاب ہے۔

جماعتی زندگی پر نظر ڈالیے تو جماعت بندی کی مختلف شکلیں نظر آئینگی۔ کہیں اسکی بنیاد معاہدہ پر ہوگی، کہیں باہمی ہمدردی پر، کہیں روایات پر، کہیں قانون پر، کہیں آزادی پر، کہیں جبر پر، لیکن ان مختلف شکلوں کی تہ میں ہمیشہ تین اصولوں میں سے کسی ایک یا کئی کی کارفرمائی دکھلائی دیگی ـــ یعنی طاقت، محبت، عقل ـــ جب جماعتی زندگی میں انسان کے فطری رجحانات، اور قدرتی محرکات کو اپنا اثر پیدا کرنے کا موقع ہوتا ہے اور حیاتِ اجتماعی میں مدارج و مراتب کی تقسیم افراد یا گروہوں کی جسمانی یا ذہنی یا روحانی بلندی و پستی کی بنا پر ہوتی ہے تو اُس وقت طاقت کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ یہ طاقت چاہے جسمانی ہو، چاہے عقلی و ذہنی۔ "جسکی لاٹھی اُس کی بھینس"، یا "جس کی بدھی اُس کی بھینس"، یہ دونوں اصول طاقت کی شکلیں ہیں۔ اس اصول کے ماتحت

جماعت میں پستی و بلندی کی ترتیب طاقت کی تقسیم کی بنا پر ہوتی ہے۔

لیکن جب فطری و قدرتی طاقتوں یا صلاحیتوں کو من مانی شکلیں اختیار کرنے سے روکا جائے اور جماعت کی شیرازہ بندی افراد سے بالاتر اصولوں کے ماتحت کی جائے تو اُس وقت جماعت بندی کو عقلی اصول کا پابند کہیں گے۔ اِس میں یہ نہ ہوگا کہ جس کے پاس طاقت ہے وہ کمزور پر حاوی ہو جائے، یا جس کے پاس دولت ہے وہ مفلس پر، جس کے پاس علم ہے وہ جاہل پر تفوق حاصل کرے۔ بلکہ مثلاً اس قدرتی فرق مراتب سے قطع نظر یہ اصول بنایا جائے کہ دولت سب کے پاس برابر ہونی چاہیے، علم سے سب کو بہرہ یاب ہونا چاہیے، توانا اور ناتوان کا فرق مٹانا چاہیے وغیرہ وغیرہ تو اُس وقت حیاتِ اجتماعی مقررہ اصولوں کے تحت میں آجاتی ہے اور اس پر عقل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

پھر انسانوں کی بعض جماعتیں ایسی بھی بنتی ہیں کہ نہ اُن میں طاقت کا تفوق ہوتا ہے نہ اصولوں کی فرمانروائی بلکہ دوست، دوست کو "رشتہ در گردن" جدھر چاہتا ہے لیجاتا ہے۔ عقل یہاں لاچار ہوتی ہے اور طاقت بے بس۔ عقل اور اس کے خود ساختہ اصول یہاں دفترِ بے معنی بن جاتے ہیں، یہاں توانا ناتوان کے آگے اور عالم اُمّی کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اور سب شاید اپنے مشترک خالق کی رحمت کے پرتو سے ہزار قالب لیکن یک جان ہو جاتے ہیں۔ ان جماعتوں کا اصول بنیادی محبت ہوتا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اشتراک کا مجوزہ نظامِ جماعتی موجودہ نظامِ سرمایہ داری کی مخالفت میں پیدا ہوا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں عجیب بات یہ ہے کہ اِس میں جماعت بندی کے مذکورہ بالا تینوں اصول کارفرما ہیں۔ اِس میں زیادہ تر تو وہی طاقت کا اصول ہے، وہی جس کی لاٹھی اُس کی بھینس یا جس کی دولت اُس کی بھینس۔ یہی وہ اصول ہے جو چند ہزار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کروڑوں محنت کش مزدوروں کے جسم اور انکی

روحیں!) دیدیتا ہے۔ اور دولت و اقتدار کے سامنے اسی کی وجہ سے اخلاق و مذہب، انصاف و عدل کے تمام اصول ماند پڑ جاتے ہیں لیکن ہرچند کہ زیادہ تر اس نظام میں طاقت کے فطری اصول ہی کا ہے تاہم یہ نہیں کہ دوسرے اصول بالکل کارفرما ہوں، سرمایہ داری نے اپنے نظام کا ایک گوشہ کو تمامتر اصول عقلی کے زیر فرمان بھی کر دیا ہے اور وہ کاروباری زندگی کا گوشہ ہے۔ سرمایہ دار اپنا تسلط بھی قائم کرنا چاہتا ہے؛ غیر عقلی آرزوؤں کا شکار بھی ہوتا ہے لیکن منافع کے اصول سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا۔ معاشی زندگی کے اس شعبہ میں بہی کھاتہ اس کی کتاب مقدس ہے۔ پھر زندگی کے بعض حصے سرمایہ داری کے نظام میں محبت کے اصول کے لئے بھی وقف ہیں مثلاً خاندانی زندگی سے ابھی اس مقدس اصول کو خارج نہیں کیا گیا ہے۔ یا قومی جنگوں کے وقت اب بھی اس کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔

سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں اور محرکات کی اس بوقلمونی کے مقابلہ میں اشتراک صرف ایک اصول کی حکومت چاہتا ہے۔ عقل کی! سرمایہ داری نے کاروباری زندگی کے جس گوشہ میں عقل کو فرمانروا بنایا تھا اشتراک اس پر قانع نہیں اور وہ زندگی کے سب شعبوں کو اس کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ طاقت و اقتدار کے اصول کو حرام جانتا ہے اور محبت کے دعاوی کو حرف غلط سمجھتا ہے۔ اسکی صدا ہے عقل، عقل، عقل!

∴

یہ اصول اعلیٰ جس کے مطابق معاشرتی زندگی کو ترتیب دیا جاتا ہے مختلف لوگ جدا جدا طریق پر نکالتے اور بناتے ہیں۔ کسی کے لئے ان کا مخرج وحی و تنزیل کا سرچشمہ ہوتا ہے، کوئی فلسفہ سے یہ اصول نکالتا ہے، کوئی تجربہ سے۔ چنانچہ ان اختلافات کی وجہ سے اشتراک بھی ایک قسم کا نہیں ہے بلکہ اس کی متعدد اقسام ذہنی اور عملی دنیا کے سامنے پیش ہو چکی ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں جس مذہب اشتراک نے فروغ پایا ہے وہ وہ اشتراک

ہے جس کی تعلیم مدون شکل میں مارکس اور اُس کے دوست اینگلس نے دنیا کے سامنے پیش کی۔ زمانۂ حال میں سرمایہ داری کے خلاف جو ردِ عمل ہوا اور ہر ملک میں مزدوروں اور ناداروں کی جو تحریکیں اٹھیں اُس کی ذہنی ترجمانی اِس جدید اشتراک نے کی۔ اور چونکہ یہ تحریکیں خود موجودہ نظامِ جماعت کی بنیادی خامیوں کے باعث ناگزیر تھیں اِسلئے اِس ذہنی تعلیم نے بھی جس کا نام ہم "اشتراکِ جدید" رکھتے ہیں بہت فروغ پایا اور اشتراکی زندگی کے دوسرے نظام بالکل پس پشت پڑ گئے۔ ان دوسرے نظاموں کو سمجھنا اِس وقت محض تاریخی یا علمی دلچسپی کی چیز ہے۔ لیکن "اشتراکِ جدید" کا فہم تو موجودہ دنیا کے اہم ترین مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ ہم اس سلسلۂ مضامین میں اسی "اشتراک جدید" کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

ؔ

کسی چیز کو "سمجھنے" کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ آپ اِس کے معنی و مفہوم کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں اور متعلقات و زوائد کی الجھنوں میں سے اِس کے بنیادی اصولوں کو نکالکر اس کی اصلی غرض و غایت کو اپنے سامنے لاسکتے ہیں۔ یا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اُس کے منبع و مخرج کو معلوم کریں اور اُس کے عالمِ وجود میں آنے کے اسباب و علل کو دیکھکر اس کی ہیئت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یا ایک صورت سمجھنے کی یہ بھی ہے کہ اِس چیز کے معنی اور اس کے اسباب کو جانکر آپ اسے بعض مقررہ معیاروں پر پرکھیں یعنی تنقیدی طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

اس مضمون میں ہم اشتراک کو اس کی اصل کے اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کرینگے۔ ہم اس جگہ اس ماحول کا مختصر سا ذکر ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں اشتراک کے مسلک نے جنم پایا۔ اس کے بعد ان شخصیتوں کا حال بیان کریں گے جنکی کاوشوں نے اس ذہنی پودے کی آبیاری کی اور ان رائج الوقت تصورات و خیالات کا جنھوں

نے اس کی نشو و نما میں حصہ لیا۔ اور اس طرح مذہب اشتراک کی موجودہ شکل میں رونما ہونے کے اسباب تین حصوں میں ہمارے سامنے آجائیں گے یعنی جماعتی حالات، رائج الوقت تصورات اور بانیوں کی ذہنی کیفیات۔

جماعتی حالات

اشتراک جدید کا سلک مغربی تاریخ کے اُس عہد کی پیداوار ہے جبکہ قرون وسطیٰ کے قائم کردہ تمام جماعتی بندھن کٹ رہے تھے، تمام وہ جماعتی ادارے جن میں فرد پناہ لیتا تھا منتشر ہو رہے تھے، تمدنی زندگی کے معیار بدل رہے تھے، ایمان جا رہا تھا، علم آ رہا تھا، بندشوں کی جگہ آزادیوں اور یقین کی جگہ شک کو مل رہی تھی لیکن اس عام انتشار اور بند کشائی کے عہد میں خاص طور پر سنہ ۱۸۳۰ء سے سنہ ۱۸۴۰ء تک کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب مسلک اشتراکیت کے تیج یورپ کی ذہنی زمین میں بوئے گئے۔ جن کی آبیاری نہایت کاوش کے ساتھ دو شخصوں نے سنہ ۱۸۴۰ء سے سنہ ۱۸۴۷ء تک کی یعنی مارکس اور انگلس نے۔ سنہ ۱۸۴۷ء میں جبکہ کمیونسٹ منی فسٹو شائع ہوا ہے اشتراک کی کشت زار تیار تھی۔ اور اس سال کے بعد کوئی نیا ذہنی پودا اس میں نہیں اگا۔ صرف چمن بندی کے سلسلہ میں کچھ کانٹ چھانٹ ہوتی رہی اس لئے ہمیں سنہ ۱۸۳۰ء اور سنہ ۱۸۵۰ء کے درمیان کے زمانہ کے حالات پر نظر ڈالنی چاہیے۔

معاشی حالات

اس زمانہ کی معاشی حالت میں سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ سرمایہ داری کا نظام کچھ عرصہ سے اپنے مدارج عروج پر پہونچ چکا تھا۔ اس کی اچھائیاں اور برائیاں سب کے

سامنے آچکی تھیں۔ دنیا اس نئے دیو سے سہمی ہوئی تھی۔ اس کی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں پر ہر ایک کی نظر پڑ رہی تھی۔ اس کی ریل پیل سے ہر کہ و مہ پریشان تھا اب یہ نہ تھا کہ معاشی اور جماعتی مسائل پر صرف ایوانِ حکومت میں بحث مباحثہ ہوتا ہو۔ ہر راہ چلتا اس نئی مصیبت کا احساس رکھتا تھا اور اس کا حل سوچتا تھا۔ اس زمانہ کی تصانیف کی فہرست اُٹھا کر دیکھو مغربی یورپ کے ہر ملک میں بے شمار سرکاری تحقیقاتوں کی رپورٹیں ملیں گی جس میں مزدوروں کی حالت پر بحث ہے۔ ہر ملک میں اسی موضوع پر اچھی بُری بے تعداد کتابیں ملیں گی۔ انگلستان میں ۱۸۳۹ء میں کارلائل نے اپنی کتاب Chartism لکھی اور ۱۸۴۳ء میں Past & Present۔ ۱۸۴۴ء میں کنگسلے نے Village Sermons شائع کی؛ ۱۸۴۵ء میں دسرائیلی نے Sybill or the two Nations۔ فرانس اور جرمنی میں بھی کثرت سے تصانیف نکلیں۔ اس مسئلہ پر غور و بحث کے لئے ہر طرف انجمنیں قائم ہوئیں۔

دیکھنے والے دیکھتے تھے اور لکھتے تھے کہ نئی صنعت نے خصوصاً ریل اور تار نے سارے جماعتی نظام کی شکل ہی بدل دی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ سرمایہ دار کے وجود اور اس کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ روز تغیر ہو روز تبدل۔ لوگوں نے پیدائش دولت کے طریقوں کی نت نئی تبدیلیوں کو محسوس کیا، ہر وقت دھڑکے کے عدم تیقّن و گھبراہٹ سے پریشان ہوئے، آدمی آدمی کے درمیان تمام قدیم رشتوں کے کٹنے اور صرف خودغرضی کے رشتہ کے باقی رہ جانے پر مرثیہ خوانی کی، نودولتیوں کی بدتمیزیوں پر چلا اُٹھے۔ لیکن سب سے زیادہ یہ زمانہ متاثر تھا افلاس و فلاکت کے اس منظر سے جو روز افزوں دولت و مرفہ الحالی کے دوش بدوش ابرِ غم کی طرح ملکوں کے ملکوں پر چھایا جا رہا تھا۔ اگر دیہاتوں میں زراعتی مزدوروں کی مصیبت تھی، تو صنعتی کام کرنے والوں پر بھی آبنی تھی۔ کھیت بھی روتا تھا اور جولاہا بھی۔ کانوں کے علاقوں میں صنعت کو فروغ

تھا لیکن بے گھر بے در مزدوروں کی فوج میں انسانوں کے غول کے غول داخل ہوتے جاتے تھے، شہروں میں سر بفلک عمارتیں بن رہی تھیں، لیکن جن کے خون کو پسینہ کرنے سے یہ سب کچھ ممکن ہوا تھا ان کی جسمانی و روحانی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سختی سے کام لینے کی شرمناک سے شرمناک صورتیں موجود تھیں۔ لوگ یہ سب کچھ دیکھتے تھے اور یہ بھی کہ خود کام کی نوعیت بدل گئی، پہلے کام ہر مزدور کی شخصیت سے ایک گہرا تعلق رکھتا تھا، اب مشینوں کی ایجاد اور تقسیم عمل کے اصول نے اسے ایک غیر دلچسپ اور بے روح مشغلہ بنا دیا تھا۔

ایک طرف دولت بڑھ رہی تھی دوسری طرف افلاس، ایک طرف مرفہ الحالی کی حکومت تھی دوسری جانب فلاکت و ادبار کی۔ صنعت ترقی کر رہی تھی لیکن لوگ اور بھی غریب ہوتے جاتے تھے، مشینیں اتنا مال بنا دیتی تھیں کہ خریدنے والے نہ ملتے تھے۔ کارلائل نے لکھا ہے: "تمہارے بنے ہوئے قمیص کس کام کے؟ اُدھر دو کانوں میں دیکھو لاکھوں کی تعداد میں رکھے ہیں اور اِدھر لاکھوں محنت کش برہنہ تن ان کے انتظار میں ہیں لیکن یہ انہیں نہیں ملتیں۔" ضرورت سے زیادہ اشیاء کے پیدا ہونے سے جلد جلد کاروباری دنیا میں بحرانی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ وبائی مرض کی طرح یہ مصیبت نہایت پابندی سے کچھ کچھ سال بعد رونما ہوئی تھی۔ چنانچہ ۱۸۱۵ء میں آئی پھر ۱۸۲۵ء میں، ۱۸۳۶ء میں ظاہر ہوئی پھر ۱۸۴۷ء میں۔ مال بہت، خریدنے والے ندارد۔ کارخانے بند کیے جاتے تھے، مزدور کے لئے مزد نہ تھی۔ محنت کش کے لئے محنت کا دروازہ بند اور فاقہ اور موت کی راہ کھلی ہوئی۔

سیاسی حالات

سیاسی حالات میں سب سے اہم چیز یہ تھی کہ نپولیانی جنگوں کے بعد سے لوگ امن میں بسر کر رہے تھے۔ اور امن کی زندگی نے امن پسندی کا جذبہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ قوموں

اور ریاستوں کی نظر اپنے رعب و داب، فتوحات و جنگ آزمائی کی طرف سے ہٹی ہوئی تھی بجائے اس کے کہ ریاستیں اپنے اپنے اغراض کی فکر میں پڑی ہوں اور اپنی ہی غرض کو فلسفہ سیاسی کا اصول اعلیٰ قرار دیتی ہوں اب اغراض ملکی و سیاسی سے بالاتر اصولوں کی حمایت شروع ہو گئی تھی مثلاً آزاد تجارت کا اصول۔ غرض اس عہد کی خصوصیت یہ تھی کہ ملکی اور خارجی سیاست کا صحیح احساس بہت کم ہو گیا تھا اور اس عہد کو "غیر سیاسی عہد" کہہ سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ قومیت کے اصول پر اس زمانہ میں خاصہ زور دیا گیا لیکن یہ ہمیشہ ملکوں کے داخلی اور اندرونی مسئلہ کی حیثیت سے اور انقلابی خیالات کے ساتھ ساتھ۔ اصول قومیت اور انقلاب کا تعلق یونان، پولینڈ، بلجیم کے معاملوں میں نظر آتا ہے۔ اُدھر انگلستان میں چارٹسٹ تحریک سراسر انقلابی تحریک تھی۔ فرانس میں بھی دنیا بھر کے خارج البلد انقلابی اور خود فرانس کے اشتراکی اور کمیونسٹ انتہا پسند انقلابی تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے کافی تھے۔ اٹلی میں اسی انقلاب کا مجسمہ میزینی تھا۔ جرمنی میں بھی انقلابی پارٹی موجود تھی اور اگرچہ بہت قوی نہ سہی لیکن پروشیا کی احمق حکومت اس سے اس درجہ خائف تھی کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ بس دو چار ہی مہینہ میں کمیونسٹ حکومت قایم ہو جائے گی۔

سرمایہ داری نظام سے بے اطمینانی و بیزاری، فکر سیاسی کے انحطاط اور انقلاب و تغیر کی خواہش کی فضا میں اشتراک کے مسلک نے نشو و نما پائی۔ ذہنی اعتبار سے مختلف تصوراتِ رائج کا اس پر اثر پڑا۔ لیکن اس کا صحیح تعین کہ کن خیالات اور کس فلسفہ نے اس پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ظاہر ہے کہ بہت مشکل کام ہے۔ کسی نے اسے پروٹسٹنٹ ذہنیت کا نتیجہ قرار دیا ہے[۱] کسی نے کیتھولک خصوصاً فرانسیسی کیتھولک مذہب کا[۲] اکثر مورخین

---

۱ Felix — Cathrein — Masaryk

۲ Dostojewski

نے غلطی سے اسے جرمن کلاسکی فلسفہ سے مشتق گردانا ہے اور مارکس و انگلس کی تعلیمات اور کانٹ، فشتے اور ہیگل کے فلسفہ میں نہایت گہرا تعلق جتلایا ہے۔ یہ آخری رائے اب تک بہت عام تھی لیکن جرمنی کے مشہور معاشی ورنر زومبارٹ نے حال میں اسے غلط ثابت کردیا ہے اور واضح طور پر بتلا دیا ہے کہ اشتراک جدید، کو جرمن کلاسکی فلسفہ سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اس مصنف کی رائے میں اشتراکِ جدید کا ذہنی شجرۂ نسب یہ ہے:۔

اشتراک جدید

مارکس اور انگلس کی تعلیم

سابقہ انگریزی اور فرانسیسی اشتراکی
دموریٔ، گاڈون، اوون، مین سیمول
فوریے، پرودھان وغیرہ

سابقہ جرمن اشتراکی اسوسی ہس
وائٹلنگ وغیرہ
مادہ پرست والفی نائر باخ

اٹھارویں صدی کا فرانسیسی فلسفہ

۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی کا انگریزی فلسفہ
دیعنی ہابس، لاک، شیفٹس بری،
مینڈول کی تعلیمات

کاتیزیت

جیسوئیٹ

یہودی ذہنیت

یونان کے دورِ انحطاط کا فلسفہ

ہم نے سطور بالا میں ان عام جماعتی حالات کا ایک خاکہ پیش کردیا ہے جن میں اشتراک کی تدوین ہوئی اور ان ذہنی تحریکوں اور تعلیموں کا ذکر جن سے یہ مشتق ہے۔ لیکن اشتراک

کے تاریخی فہم کے لئے ماحول مادی وذہنی کا یہ بیان کافی نہیں - خیالات و مذاہب بیشک اپنے ماحول سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن باوجود اس تمام تاثر کے وہ پھر بھی اپنے بانیوں کی نفسی کیفیت اور اُنکی ذہنیت سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں - شاید بڑے سے بڑا آدمی اپنے خیالات میں ماحول سے غیر متاثر نہ رہتا ہو لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ کسی بڑے آدمی کی تعلیم محض ماحول کے اثرات کا مکانیکی نتیجہ نہیں قرار دی جا سکتی - اس لئے ان حالات گردوپیش کے علاوہ ہمیں اشتراک جدید کی اصل کو سمجھنے کے لئے اس کے بانیوں کی کیفیات نفسی پر بھی نظر ڈالنی چاہئے - یہ کام ہم انشاءاللہ کسی آیندہ مضمون میں انجام دینے کی کوشش کرینگے -

---

نے غلطی سے اسے جرمن کلاسکی فلسفہ سے مشتق گردانا ہے اور مارکس وانگلس کی تعلیمات اور کانٹ، فشٹے اور ہیگل کے فلسفہ میں نہایت گہرا تعلق جتلایا ہے۔ یہ آخری رائے اب تک بہت عام تھی لیکن جرمنی کے مشہور معاشی ورنرزومبارٹ نے حال میں اسے غلط ثابت کردیا ہے اور واضح طور پر بتلادیا ہے کہ اشتراک جدید، کو جرمن کلاسکی فلسفہ سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اس مصنف کی رائے میں اشتراکِ جدید کا ذہنی شجرۂ نسب یہ ہے:-

اشتراک جدید

مارکس اور انگلس کی تعلیم

سابقہ انگریزی اور فرانسیسی اشتراکی
دموری، گاڈون، اووِن، سین سیمون
فوریے، پرودھاں وغیرہ

سابقہ جرمن اشتراکی اسوسی ہس
وائٹلنگ وغیرہ
اور پیسٹ والفی فائر باخ

اٹھارویں صدی کا فرانسیسی فلسفہ

۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی کا انگریزی فلسفہ
(یعنی ہابس، لاک، شیفٹس بری،
مینڈول کی تعلیمات

کابیت

بیسونیقہ

یہودی ذہنیت

یونان [illegible] کا فلسفہ

ہم نے سطور بالا میں ان عام جماعتی حالات کا ایک خاکہ پیش کردیا ہے جن میں اشتراک کی تدوین ہوئی اور ان ذہنی تحریکوں اور تعلیموں کا ذکر بھی جن سے یہ مشتق ہے۔ لیکن اشتراک

کے تاریخی فہم کے لئے ماحول مادی و ذہنی کا یہ بیان کافی نہیں۔ خیالات و مذاہب بیشک اپنے ماحول سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن باوجود اس تمام تاثر کے وہ پھر بھی اپنے بانیوں کی نفسی کیفیت اور اُنکی ذہنیت سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ شاید بڑے سے بڑا آدمی اپنے خیالات میں ماحول سے غیر متاثر نہ رہتا ہو لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ کسی بڑے آدمی کی تعلیم محض ماحول کے اثرات کا مکانیکی نتیجہ نہیں قرار دی جاسکتی۔ اس لئے اِن حالات گرد و پیش کے علاوہ ہمیں اشتراکِ جدیدہ کی اصل کو سمجھنے کے لئے اِس کے بانیوں کی کیفیات نفسی پر بھی نظر ڈالنی چاہئے۔ یہ کام ہم انشاء اللہ کسی آئندہ مضمون میں انجام دینے کی کوشش کرینگے۔
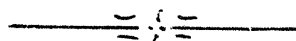
نئی دہلی

رہتے رہتے حیدرآباد اب ہمارا وطن نہیں تو مسافر کا گھر ضرور ہو گیا ہے۔ پھر بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی ضرورت سے دہلی جانا ہو ہی جاتا ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے اپریل میں کچھ دنوں کے لیے دہلی گیا تھا۔ گرمی کا پورا زور تو نہ تھا، ہاں مزا آنے لگا تھا۔ لاٹ صاحب کے کچھ دفتر شملہ جا چکے تھے۔ کچھ جا رہے تھے۔ نئی دہلی چوپٹ تھی۔ مگر اصلی دلّی میں وہی چہل پہل تھی۔ دس دن پھیرا۔ عزیزوں سے ملا، دوستوں سے ملا۔ بنواری لال کا مکان دیکھا۔ نانک چند کی کوٹھی دیکھی۔ لالہ سری رام کا حال دیکھا۔ واحدی صاحب کے ہاں دعوت کھائی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے دہلی کے اہل قلم سے ملاقات کرائی۔ ہر چیز دیکھتا اور خوش ہوتا۔ ہر شخص سے ملتا اور لطف اٹھاتا۔ دل باغ باغ تھا کہ دلّی پھر نئے سرے سے دلّی ہو رہی تھی۔ مگر چلنے سے ایک دن پہلے مرزا قمر دسے جو باتیں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہوئیں اُس سے سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ دل بیٹھ گیا اور اس وقت سمجھ میں آیا کہ دلی کیا تھی اور کیا ہو گئی۔

مرزا قمر د کو مرزا قمر د کہوں تو دلی والا تو کوئی نہ سمجھے۔ ہاں مرزا جھگڑا کہوں تو سب سمجھ جائیں۔ ان کو بھی پرانی دلی کا ایک کھنڈر سمجھو۔ چند روز کی ہوا کھا رہے ہیں۔ زمانہ کا ایک آدھ تھپیڑا پڑا اور ان کا خاتمہ ہے۔ پہلے اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں تھے — ساٹھ ستر ہزار کی جائداد تو دو ہزار کے تمسک میں برابر ہو گئی۔ کچھ بچی کھچی رہ گئی ہے وہ ٹوٹ پھوٹ کر ٹھیکرا ہے۔ انھوں نے اپنے خرچ کم نہیں کیے۔ زمانے نے سوا، ان کی جائداد کے ہر چیز کی قیمت بڑھا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جائداد کو بھی گردی ڈالنا پڑا۔ نالش ہوئی ہے۔ کوئی دن میں وہ بھی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ہی یہ مرجائیں تو

اچھا ہے۔

نام تو ان کا مرزا قمرالدین ہے مگر ان کی وضع قطع' ان کے بھاری بھرکم جسم اور ان کی ٹھمک چال کی وجہ سے ساری دلی ان کو مرزا جھکڑا کہتی ہے۔ پڑھے لکھے خاک نہیں۔ پھر بھی اپنے کو شاعر سمجھتے ہیں اور ایک چھوڑ دو دو تخلص خیال اور دِل رکھ لیے ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی استعمال میں تو آتا نہیں۔ ہاں یونہی شوق میں ایک نام کے تین نام کر لئے ہیں۔ خیر یہ جتنے چاہیں نام رکھ لیں دلی والے تو ان کو مرزا جھکڑا کہتے ہیں اور یہی کہیں گے۔ تمام دلی کی وضع بدل گئی اور نہ بدلی تو ان کی اور بدلنے کیوں لگی۔ دلی کے جو جھکڑے پہلے تھے وہ اب بھی ہیں۔ رتی برابر فرق نہیں ہوا جب وہ نہ بدلے تو یہ کیوں بدلنے لگے۔ پُرانی وضع پر جان دیتے ہیں' نئی وضع پر لعنت بھیجتے ہیں۔ آج کل کی کسی بات کی تعریف سنی اور پیچھے پڑ گئے۔ لوگوں کو مذاق ہاتھ آگیا ہے۔ ایک آیا لاٹ صاحب کی کوٹھی کی تعریف کر گیا' انھوں نے مذمت شروع کی۔ ابھی یہ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ دوسرے نے آکر کسی اور چیز کی تعریف کر دی۔ یہ پہلا سلسلہ چھوڑ دوسرے کے پیچھے پڑ گئے۔ لوگ بیچارے کو بہت ستانے لگے ہیں ہیں نے دس برس پہلے بھی ان کو دیکھا تھا اس وقت یہ حالت نہ تھی۔ اب کچھ باؤلے سے ہو گئے ہیں۔ اسّی برس کی عمر ہے آخر دماغ کہاں تک کام دے۔ یہ دوسروں پر بگڑتے ہیں دماغ ان سے بگڑ بیٹھا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ نئی دلی کے یہ ایسے دشمن ہیں۔ اگر معلوم ہوتا تو بیچارے کو ناحق کیوں پریشان کرتا۔ چلنے سے ایک دن پہلے شام کو کوئی ساڑھے پانچ بجے گھر سے ٹہلنے نکلا۔ جامع مسجد قریب ہی ہے خود بخود پاؤں اِدھر اُٹھ گیا دیکھتا ہوں کہ شربت والے کی دوکان کے قریب رومال بچھائے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر مرزا صاحب بیٹھے ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا' پہلے تو آنکھوں کو چندھیا کر ذرا شست لگائی۔ جب یوں کام نہ چلا تو آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا چھجہ بنا کر غور سے

دیکھا اور ایک دفعہ ہی گھبرا کر کھڑے ہو گئے "اوہو! میاں فرحت ہیں۔ کہو بیٹا تم یہاں کہاں۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تم حیدر آباد ہی کے ہو لیے۔ آخر آئے مگر بھئی بہت دنوں میں آئے۔" میں نے کہا "مرزا صاحب کیوں نہ آتا دلی کہیں ہم سے چھوٹ سکتی ہے۔" کہنے لگے "دلی۔ بیٹا! دلی تو بہت دن ہوئے جنت کو سدھاری۔ اب یہ دلی تھوڑی ہے یہ تو لاہور کی اماں ہے۔ جاؤ جائداد بیچ کر کہیں اور جا بسو۔ اب یہ تمہاری دلی نہیں رہی یہ دوسروں کی دلی ہو گئی۔" مجھے کیا معلوم تھا کہ نئی دہلی کی تعریف سن کر ان کے آگ لگ جاتی ہے۔ میرے منہ سے نکل گیا "واہ مرزا صاحب واہ۔ دلی تو اب دلہن بن گئی ہے اور ابھی کیا۔ تھوڑے دنوں میں دیکھنا کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ کبھی بڑے سینما بھی گئے ہو یا یونہی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے نئی دہلی کو صلواتیں سناتے ہو۔" میرا اتنا کہنا تھا کہ بپھر گئے۔ ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا۔ کہا "آ۔ بیٹھ۔ میں تجھے تیری دلی کی تعریف سناؤں۔ تجھے معلوم بھی ہے کہ دلی کا دل کیا تھا۔" میں نے کہا "چاندنی چوک۔" کہنے لگے "ہٹ تیرے چھوٹے کی۔ شرماتا کیوں ہے۔ چاوڑی کیوں نہیں کہتا۔ کہیں بڑی جگہ نوکر ہو گیا ہے جو چاوڑی کو چھوڑ چاندنی چوک کی تعریف پر اُتر آیا ہے۔ بیٹا دلی کا دل چاوڑی ہے۔ اب تو جا کر چاوڑی کو دیکھ کیا رنگ ہے۔ جب دل ہی بگڑ گیا تو شہر کیا رہا۔ اب جامع مسجد سے لگا کر اجمیری دروازہ تک چلا جا۔ وہ وہ شکلیں نظر آئیں گی کہ خدا کی پناہ۔ نہ وہ اللہ دی غازی آباد والی رہیں، نہ نور جہاں، نہ وہ حشمت ہے، نہ وہ میرٹھ والی زہین۔ زہین تو تجھے یاد ہو گی۔ اب اُس کے قاضی حوض والے کوٹھے کو جا کر دیکھ ایک پہلوان بیٹھے ہیں، تھوبڑا سا منہ، بیل کے سے دیدے، یہ موٹی کھال۔ ڈھیلا ڈھالا لنپوزوں کا سا لباس۔ منہ کے سامنے بجلی کا لیمپ رکھا ہے۔ یہ ہیں بی صاحبہ اور کس جگہ آ کر بیٹھی ہیں کہ بی زہین جان کی جگہ۔ اوپر جائیے تو نہ سلام مزاج پرسی۔ نہ پان ہے نہ چھالیہ۔ جاتے ہی مطلب کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں اور

ماشاء اللہ گفتگو ایسی شستہ زبان میں کی کہ منہ سے پھول جھڑنے لگے - گالی بغیر تو بات ہی نہیں ہوتی - بھلا ان کے ہاں پان کہاں - یہ نہ پان کھائیں نہ پان بنانا جانیں - کسی نے بے حیا بنکر پان مانگا تو دو پیسے نکال پھینکدئے - نیچے پنواڑی کے ہاں سے پان آگئے - ہاں حقہ بہت پیتی ہیں - حقہ آیا تو وہ آیا کہ گنوار بھی اس کو منہ لگاتے ذرا گھبرائیں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سارے کا سارا مل کر کوئی دس سیر کا ہوگا - نیچہ پر بان لپٹا ہوا - نَے اتنی موٹی جیسے پھکنی - چلم ایسی کہ سوا پا تمباکو آئے - لیجئے حقہ حاضر ہے - حقہ کا پانی ٹپکا چلا آرہا ہے - یہ بھی کوئی نہیں دیکھتا کہ چاندنی پر رکھا گیا تو دھبہ پڑجائے گا - اب ہے کوئی ہمت والا جو اس حقہ کا ایک دم بھی لگائے - کھانستے کھانستے دم نہ نکل جائے تو میرا ذمہ - اب فرمارہی ہیں پیجئے - پیجئے - امبرسر کا تمباکو ہے - کل ہی سردار صاحب نے لاکر دیا ہے، بھلا کس کی شامت آئی ہے جو اس حقہ کا دم لگاکر مفت میں اپنی جان کو مصیبت میں ڈالے اور خود لی جان نے جو دم لگایا تو حقہ بھی چیخ اُٹھا - منہ اوپر کرکے جو دھواں چھوڑا تو معلوم ہوا کہ قطب کی لاٹ کمرہ میں آکر کھڑی ہوگئی - یہ مَیں نے اُس رنڈی کا ذکر کیا ہے جو اس وقت چاوڑی کی ناک کہی جاتی ہے - دوسروں کی کچھ نہ پوچھو - ان کے ہاں تو دروازہ ہی پر ٹکٹ بٹتا ہے - پہلے زمانہ کی چاوڑی تو تجھے یاد ہوگی گرمی کا موسم ہے - ادہر شام ہوئی اُدہر سب کمرے روشن ہوگئے - یہاں گانا ہورہا ہے، وہاں گانا ہورہا ہے، شوقین بیٹھے سن رہے ہیں - شریف لوگ سفید براق کپڑے پہنے، موتیا کے گجرے گلے میں ڈالے، مولسری کی لڑیاں ہاتھوں میں لپیٹے سڑک پر ٹہل رہے ہیں، چہل قدمی بھی ہورہی ہے، گانے کا لطف بھی آرہا ہے - بارہ ایک بجے تک یہی گھما گھمی رہی - اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو جا آرام سے سورہے - اب چاوڑی میں رات کو جائیے تو دوسرا ہی رنگ نظر آتا ہے - برآمدوں میں کھمبوں سے لگی رنڈیاں بیٹھی ہیں - ابھی اندر گئیں، ابھی باہر آئیں، پھر گئیں، پھر آئیں - ایک

آدھ کوٹھے پر رُوں رُوں رُوں رُوں بھی ہو رہی ہے ۔ مگر گانا گیا ہے ۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بی جان اپنی اماں کو یاد کر کے رو رہی ہیں ۔ سنتا ہوں اب سب کی سب چاؤڑی سے نکالی جانے والی ہیں ۔ اچھا ہو گا خس کم جہاں پاک ۔"

مَیں نے کہا " مرزا صاحب ، بھلا رنڈیوں سے اور دلی کے اچھے بُرے ہونے سے کیا واسطہ ۔" کہنے لگے " واہ ۔ بیٹا ۔ واہ ۔ خوب سمجھے ۔ اور ننھے بن جاؤ ۔ یار عزیز انہیں سے تو دلّی دلّی تھی نہیں تو دلّی میں رکھا ہی کیا تھا ۔ ذرا حکیموں کے مطب میں جا کر دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ دلی کی زبان کا سنبھالنے والا کون ہے ۔ کبھی کسی کوٹھے پر گئے ہوتے تو کھلتا کہ آدابِ مجلس کس کو کہتے ہیں ۔ ذرا ان کے بننے سنورنے کو دیکھتے تو پتہ چلتا کہ لباس کس کو کہتے ہیں ۔ ذرا ان کے کمروں کو دیکھا ہوتا تو سمجھتے کہ سلیقہ کس کو کہتے ہیں ۔ میاں ۔ رنڈیاں دلّی کی تہذیب کا نمونہ تھیں ۔ لاکھ عورتوں میں سے الگ نکال لوں کہ یہ دلّی کی رنڈی ہے ۔ اب جیسی روح ہے ویسے فرشتے ہیں ۔ خیر تم بڑے متقی پرہیزگار سہی ۔ رنڈیوں کو چھوڑو ۔ ۔ ۔ ۔ شہر والوں کو لو ۔ لعنت ہے ان کی شکل پر ۔ یہ دلی والے ہیں ۔ خدا کے لئے سچ کہنا ۔ کیا ان کو کوئی دِلّی والا کہیگا ۔ بال دیکھو تو جھاڑ جھنکار ، منہ دیکھو تو ہیجڑوں کا سا ۔ لباس دیکھو تو سبحان اللہ ۔ نیچے قمیص ہے اوپر کرشتا نوں جیسا چھوٹا کوٹ ، ٹانگوں میں دو تھیلے چڑھائے گٹ پٹ گٹ پٹ کرتے چلے آرہے ہیں ۔ لیجئے یہ ہیں آپ کے دلی والے ۔ یہ تو یہ کمبخت عورتوں نے بھی کچھ اپنی عجیب وضع بنالی ہے ۔ انگیا ، کرتی اور ڈھیلے پیجامے تو غدر کے ساتھ گئے ۔ چوڑی دار تنگ پیجامے اور کرتے دربار کے ساتھ رخصت ہوئے ۔ اب لباس کیا ہے بس یہ سمجھ لو کہ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا ۔ سلیقہ کا یہ حال ہے کہ بچوں کی مالک آیا ، باورچی خانہ کی مالک ماما ، سینے پرونے کے ذمہ دار درزی ، درزی نہیں ماسٹر ٹیلر ۔ اب ان کو گھر والیاں کون کہے گا ۔ شام ہوئی اور بیگم صاحبہ ہوا خوری کو نکلیں

صاحب ایک طرف گئے میم صاحب دوسری طرف گئیں۔ اب نہ اُن کو اِن کی خبر اور نہ اِن کو اُن کی۔ سمجھئے یہ آپ کی دلی کی حیا و شرم رہ گئی ہے۔ بلکہ بچے کھچے گھرانے اپنی پرانی چال پر چل رہے ہیں لیکن کب تک۔ خربوزہ کو دیکھکر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ وہ بھی یا اسی بھیڑیا چال کو اختیار کریں گے یا نکو بن جائینگے۔" میں نے کہا "مرزا صاحب یہ تو نہ کہو۔ پردہ تو اب بھی دلی میں خاصہ ہے۔" کہنے لگے "اوہو۔ تو ماشاءاللہ آپکے ہیاں کچھ اس سے بھی زیادہ تیز رنگ ہے۔ بندۂ خدا۔ یہ کوئی پردہ میں پردہ ہے۔ پہلے باہر پھرنے والیاں بھی نکلتی تھیں تو اوڑھے پہنے، برقع اوڑھتی تھیں تو اس طرح کہ صرف ایک آنکھ باہر رہے، نہ اس طرح جیسے اب پھرتی ہیں۔ برقع تو اب بھی اِن کے سر پر ہے لیکن پلو ہیں کہ ہوا میں اِدھر اُدھر اڑ رہے ہیں۔ خود ہیں کہ برقع سے دو قدم آگے مردمیدان بنی چلی آ رہی ہیں۔ اب برقع کو برقع سمجھ کر تھوڑی اوڑھا جاتا ہے۔ صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ رسم چلی آتی ہے اس کو پورا کر رہے ہیں۔ جب اپنے ہی بُرے ہو گئے تو دوسری قوم والوں کو میں کیا کہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ پہلے جن کی انگلی نہیں دکھائی دیتی تھی اب اُن کی پنڈلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ارے بھئی یہ تو جو کچھ تھا سو تھا۔ اب دل بھی تو صاف نہیں رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو کھائے جاتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں سے بیزار، مسلمان ہندوؤں سے بیزار۔ بات بات پر کٹے مرتے ہیں۔ ذرا کلو نے ملو کو گالی دی یا ملو نے کلو کو مارا تو سمجھ لو کہ قیامت آگئی۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ میاں معاملہ کیا ہے۔ آخر لڑنے کا سبب کیا تھا۔ مسلمانوں سے پوچھو تو کہتے ہیں ہم کچھ نہیں جانتے مسلمان کو ہندو نے کیوں مارا۔ ہندوؤں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں میاں پرے ہٹو۔ ہم کو اس سے غرض نہیں کہ کیا ہوا۔ ہندو کو مسلمان نے کیوں گالی دی۔ جو ہے آپے سے باہر ہوا جاتا ہے۔ جس کو دیکھو بھوکے شیر کی طرح پھیر رہا ہے۔ آج اس کا سر پھوٹا۔ کل اُس کا خاتمہ ہوا۔ اسپتال

بھرے چلے جا رہے ہیں۔ ولایت سے دواؤں پر دوائیں چلی آ رہی ہیں۔ ڈاکٹروں کی فیسیں بھرتے بھرتے دیوالہ نکلا چلا جاتا ہے۔ اور ہے کیا؟ کہ کلو نے ملو کو مارا۔ گوروں سے بھری موٹریں اِدھر سے اُدھر یوں یوں کرتی چلی جا رہی ہیں۔ توپیں کھڑکھڑ کرتی ادھر سے اُدھر دوڑ رہی ہیں۔ ہوائی جہاز چیلوں کی طرح سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ فوجیں پرا باندھے یہاں کھڑی ہیں وہاں کھڑی ہیں۔ تلاشیاں ہو رہی ہیں۔ لوگ پکڑے جا رہے ہیں۔ جیل خانے بھر رہے ہیں۔ مقدمہ بازی ہو رہی ہے۔ کسی کو جنم قید ہوتی ہے۔ کوئی پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے اور یہ سب کس لئے کہ ملو نے کلو کو گالی دی تھی۔ لیجئے یہ آپ کی دلی ہے اور یہ آپ کے دلی والے ہیں۔ کل ہی کا قصہ ہے میں بڑیوں کے کٹرہ سے قاضی کے حوض آ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پنڈت کے کوچہ کے قریب دو بجار[له] لڑ رہے ہیں۔ سب راستے ہیں کہ بند ہیں۔ موٹریں، گاڑیاں، تانگے، ٹرام، پیدل غرض سارا راستہ کا راستہ رکا کھڑا ہے اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ آگے بڑھ کر اور دو لٹھ مار کر انکو علیحدہ کرے۔ آخر جب لڑتے لڑتے خود ہی تھک گئے اس وقت ایک بھاگا۔ دوسرا اُس کے پیچھے بھاگا۔ دو تین آدمی جھپیٹ میں آ گئے۔ جب کہیں جا کر راستہ کھلا۔" میں نے کہا "مرزا صاحب آخر مار کر بھگا دینے میں کیا حرج تھا۔" کہنے لگے "میاں۔ ابھی تم نے دلّی دیکھی کیا ہے۔ ہٹانے میں حرج۔ ارے بھائی خون خرابے ہو جاتے وہ کیا لفظ ہے تصادم۔ ہاں تصادم ہو جاتا۔ بین الاقوامی تصادم ہو جاتا۔" میں نے کہا "ہیں ...... بین الاقوامی تصادم۔ یہ بھی آپ نے خوب کہی۔" کہنے لگے "ہاں۔ میاں۔ تم پڑھے لکھے ہو۔ ہماری زبان میں مین میخ نکالتے ہو۔ ہم تو

له دلی میں اُن بیلوں کو بجار کہتے ہیں جو کسی دیوتا کے نام پر چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ اُن کو سانڈ بھی کہتے ہیں مگر بجار (ب۔ ج۔ ا۔ ر) کا لفظ زیادہ مستعمل ہے۔

اب یہی سنتے ہیں کہ جب دو قومیں لڑتی ہیں تو اخبار والے اِس کو بین الاقوامی تصادم کہتے ہیں۔ اب جانے ہماری بلا۔ وہ صحیح کہتے ہیں یا غلط۔ انہی سے جاکر پوچھو کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ ہمارے زمانہ میں تو بڑے بڑے واقعات ہو جاتے تھے تو بین الاقوامی تصادم نہیں ہوتا تھا۔ کوئی پچیس تیس برس کی بات ہے کہ ہم پھول والوں کی سیر کو جارہے تھے۔ تمکو یاد ہوگا سیدھی سڑک قطب کو جاتی تھی۔ اب بھی کبھی اِدھر گئے ہو۔ خدا نہ لیجائے۔ قطب جانا مشکل ہوگیا ہے۔ چاروں طرف سڑکیں ہی سڑکیں ہیں۔ بے لکھا پڑھا آدمی صبح کو چلے تو کہیں شام کو جاکر قطب پہنچے۔ اب اِدھر چلو۔ اب اِدھر مڑو۔ اب ادھر گھومو۔ اب ادھر جاؤ۔ ہر موڑ پر تختی لگی ہوئی ہے۔ پڑھنے والے پڑھ لیتے ہوں گے ہمارے تو خاک سمجھ میں نہیں آتا۔ جہاں دیکھو تختی پر ہاتھ بنا ہے۔ ایک انگلی آگے کو نکلی ہے یعنی ادھر جاؤ۔ آخر ادھر جاؤ تو کہاں جاؤ۔ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ اِدھر بھی سڑک ہے کہیں جاتی ہی ہوگی لیکن جاتی کہاں ہے یہ کیونکر معلوم ہو۔ اگر ہاتھ کی جگہ قطب کی لاٹھ بنا دیتے تو سب سمجھ جاتے کہ یہ سڑک قطب جاتی ہے۔ مقبرہ بنا دیتے تو جان جاتے کہ یہ سڑک مدرسہ[1] کو جاتی ہے۔ سڑکیں کیا ہیں خاصی بھول بھلیاں ہوگئی ہیں۔ سڑک پر یہاں، وہاں جہاں دیکھو سپاہی کھڑے تھرک رہے ہیں۔ کبھی یہ ہاتھ اونچا کرتے ہیں کبھی وہ۔ کبھی ادھر پھیر جاتے ہیں کبھی اُدھر۔ غرض کیا کہوں دلی کی سڑکیں بھی تماشہ ہوگئی ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک دفعہ ہم قطب جارہے تھے منصور کے مقبرہ کے پاس جو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اونٹ گاڑی چلی آرہی ہے۔ اندر بیسیوں آدمی ٹھنسا ٹھس بھرے ہیں۔ چھت پر بوریاں لدی ہیں۔ ان کے بیچ میں بھی پانچ چھ گنوار دبکے دبکائے بیٹھے ہیں۔ میاں میواتی اونٹ کی نکیل تھامے سامنے کے تختے پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔

---

[1] ہمایوں اور منصور کے مقبروں کو مدرسہ بھی کہتے ہیں۔

خدا کی قدرت دیکھو دوسری طرف سے ایک یکہ آرہا تھا یکہ میں تین سیلانی ایک بیچ میں دو اِدھر اُدھر، ایک ہاتھ سے چھتری کے ڈنڈے پکڑے دوسرا ہاتھ ٹوپی سنبھالنے کے لئے سر پر دھرے صاف ستھرے کپڑے پہنے چلے آرہے ہیں۔ یکہ والے نے ہری گھاس چھتری کے اندر باندھ رکھی تھی کہ قطب میں کام آئے گی۔ یکہ جو اونٹ گاڑی کے پاس سے گزرا تو میاں اونٹ کی نظر گھاس پر پڑی۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے اپنی گردن بڑھا چھتری میں داخل کر دی۔ سیلانیوں نے ہشت ہشت کی۔ اونٹ نے جو گھبرا کر گردن سیدھی کی تو یکہ گردن میں لٹک گیا۔ بھئی مزہ آگیا۔ اونٹ کے گلے میں بلّی تو سنی تھی یہ اونٹ کے گلے میں یکہ اسی دن دیکھا۔ خیر ادھر ٹٹوانی نے ہاتھ پاؤں مارے، اِدھر یکہ والے نے غل مچایا، کچھ راہگیروں نے گڑبڑ کی۔ اونٹ نے جو گردن کو جھٹکا دیا تو یکہ، ٹٹو، سیلانی سب وہ جا کر گرے، چوٹیں بھی آئیں، کپڑے بھی خاک میں ملے، نقصان بھی ہوا، مگر نہ کچھ جھگڑا ہوا نہ ٹنٹا۔ یکہ والے نے کچھ گڑبڑ شروع کی تھی اس کو لوگوں نے ڈانٹ دیا کہ چل بے یہ ہوتا ہی ہے، نہ چھتری میں گھاس باندھ کر لاتا، نہ اونٹ گردن ڈالتا، نہ یہ تماشہ ہوتا۔ لیجئے معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ خدانخواستہ اگر آجکل یہ واقعہ پیش آجاتا تو بات کہیں کی کہیں پہنچتی، خوب کُٹم کٹا ہوتی، لکڑی چلتی، نالشا نالشی ہوتی اور کیوں نہ ہوتی؟ کسی مسلمان کے اونٹ کا کسی ہندو کے ٹٹو کو زخمی کرنا کوئی معمولی بات ہے؟" میں نے کہا "تو مرزا صاحب آپ دلّی کی عورتوں سے تو خفا تھے ہی، مردوں سے بھی صاف نہیں؟" کہنے لگے "مرد عورت کیا میں تو دلّی کی ہر بات سے خفا ہوں۔ اب اس گدڑی ہی کو دیکھ لو۔ اب یہ گدڑی تھوڑی رہی ہے خاصہ بزازہ ہوگیا ہے جو ململ شہر میں نہ ملے یہاں سے لو۔ سودے والے ہیں وہ نئی نئی آوازیں نکالتے ہیں۔ اب جو یہ تی۔ ای۔ تی۔ ای پکار رہا ہے۔ جانتے ہو کیا بیچ رہا ہے۔ میاں کھیر بیچ رہا

ہے۔ بھلا اس آواز پر کوئی کیا آئے گا۔ کا چھی سب گونگے ہو گئے۔ یا کسی زمانہ میں گرمی کا موسم ہے تو آوازیں آ رہی ہیں کالے اودے لگا دئے ہیں شربت کو، سانولے سلونے لگا دئے ہیں شربت کو۔ جاڑا ہے تو آوازیں آ رہی ہیں گھونگٹ والی نے توڑے ہیں بیر۔ لاڈو پیاری نے توڑے ہیں بیر۔ اب کا چھی تو دلی سے ناپید ہو گئے۔ ہاں فتحپوری کے نیچے کچھ میوہ والے بیٹھے ہیں۔ وہ ٹھیرے کابلی۔ اُردو بھی کچھ یوں ہی سی جانتے ہیں۔ آوازیں کیا لگائیں گے اور لگائیں بھی تو لوگ ڈر کر بھاگ جائیں۔ پہلے چاندنی چوک میں یہاں سے وہاں تک میوہ والوں کی دوکانیں تھیں۔ نیچے نہر، اوپر درختوں کا سایہ، جا بجا فالودے والوں کی دوکانیں۔ دوکانوں کے سامنے کہیں بنچ بچھے ہیں کہیں مونڈھے پڑے ہیں۔ لوگ آئے، بیٹھے، اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، پیسے دو پیسے کا شربت پیا، اُٹھے، چلے گئے۔ اب نہ وہ نہر ہے نہ درخت۔ فتح پوری سے لگا قلعہ تک صفاچٹ میدان ہے۔ گرمی میں یہاں سے وہاں جاؤ تو فشار ہو جائے یا وہ زمانہ تھا کہ دوپہر کو بھی اس سڑک پر بہار رہتی تھی، گھر میں وہ آرام نہ ملتا تھا جو یہاں ملتا تھا۔ اور اس چاندنی چوک کی سڑک تو دیکھو، کیا کالی بھٹ ہوئی ہے ایک چکر لگا کر جاؤ تو یہ معلوم ہو کہ ابھی کوئلے بیچ کر آ رہے ہو اور گرم ایسی کہ تنور بھی کیا ہو گا۔ دوپہر کو روٹیاں پکا لو۔ کہتے ہیں سب سے زیادہ قیمتی سڑک یہی ہوتی ہے۔ ہاں بھائی ہو گی، ولایت کا مال لگا ہے، قیمتی کیوں نہ ہو گی۔ ایک دن رام لیلا دیکھنے نکلا تھا رات کے بارہ بجے تک تو یہ سڑک ٹھنڈی ہوئی نہ تھی۔ اور ہاں میاں فرحت، کبھی تم رام لیلا کے زمانہ میں بھی دلی آئے ہو۔" میں نے کہا "جی نہیں۔" کہنے لگے "ارے بھئی کیا کہوں۔ اس میلہ کے ٹوٹنے کا جتنا رنج کیا جائے کم ہے۔ پہلے جو سواری نکلتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے بادشاہ کا جلوس جا رہا ہے۔ ہندو، مسلمان، امیر، غریب، شریف، رذیل سب کے سب کھاتا وانا کھا، سفید کپڑے پہن چادر ہی

میں شام ہی سے نکل آتے۔ کوٹھے ہیں کہ روشنی سے پڑے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ رنڈیاں ہیں کہ بنی سنوری گاؤ تکیوں سے لگی برآمدوں میں بیٹھی ہیں۔ نیچے سے کیہ بات ہوتی ہے اُوپر سے جواب ملتا ہے۔ اُدھر سے پان آرہے ہیں اِدھر سے روپئے جارہے ہیں۔ بھیڑ کا یہ عالم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے، روشنی کا یہ عالم ہے جیسے دن نکلا ہو۔ سواری اس شان سے آتی کہ کیا کہوں۔ ہنسی خوشی چار پانچ گھنٹے گزار گھروں میں جا پڑے۔ اور اب کی سواری دیکھو تو واہ۔ واہ۔ واہ آگے توپ ہے، پیچھے توپ ہے۔ سامنے فوج ہے، پیچھے فوج ہے۔ سپاہی ہیں کہ ڈنڈے بجا رہے ہیں۔ ایک غل مچ رہا ہے کہ بڑھے چلو بڑھے چلو۔ کوٹھے بند ہیں اور ان کا بند ہونا ہی اچھا۔ بھلا آجکل کی کوٹھے والیوں سے میلے کی کیا شان بڑھ سکتی ہے۔ کوٹھوں کی چھتوں پر پولیس والے چڑھے ہوئے ہیں۔ جہاں چار آدمی جمع ہوئے اور سپاہی نے ڈانٹا کہ آگے بڑھو۔ ذرا ہچر مچر کی تو پکڑ تھانہ میں لیگئے۔ بھلا اس مصیبت میں کون پڑے۔ بھلے آدمیوں نے تو جانا ہی چھوڑ دیا۔ اب ایک مذہبی رسم ہے، وہ پوری ہو جاتی ہے۔ اس میں بھی کبھی کبھی مار کٹائی کی نوبت آجاتی ہے اور ہم سے پوچھو تو نہ اب وہ رام لیلا ہے اور نہ رام لیلا کا مزا۔ اس سے بدتر حال پھول والوں کی سیر کا ہے۔ بس یہی دو میلے دلّی کے ایسے تھے کہ سارے جہان میں لاجواب تھے۔ اب نہ رام لیلا وہ رام لیلا ہے اور نہ پھول والوں کی سیر وہ پھول والوں کی سیر ہے۔ پہلے بھادوں آیا، سیر کی تاریخ مقرر ہوئی، نفیری بج گئی، مہرولی آباد ہونی شروع ہوگئی۔ مکانوں میں سفیدی ہو رہی ہے، کمرے سجائے جا رہے ہیں۔ کرایہ کا یہ حال ہے کہ پہلے جو کمرہ دو روپئے مہینہ کو ملے وہ سو روپئے روز پر ملنا مشکل ہے۔ رنڈیاں رتھوں میں بیٹھی جا رہی ہیں، امیر فینسیں اڑائے چلے جاتے ہیں۔ غریب غربا مٹکے سروں پر اوندھائے، لنگوٹ کسے، چنگیں اڑاتے، گاتے، بجاتے چلے جا رہے ہیں قطب

کی لاٹھہ تک آدمی ہی آدمی ہوتا تھا - بڑے لوگ تو اپنے کمروں پر جا، نہا، دھو، کپڑے بدل نکل آئے، غریبوں نے جھرنے پر جا دو تین غوطے مارے، مٹکے میں سے تحفہ کپڑے نکالے، کارچوبی ٹوپی، ٹاٹ بافی جوتی، شربتی ململ کا کرتا انگرکھا، نٹ مار لٹھے کا پیجامہ پہن ایسے نکلے جیسے چاند گہن سے نکلتا ہے - بھلا دیکھہ کر کوئی کہہ تو دے کہ یہ میاں قادر سقہ ہیں اور یہ نھتو کہار - مہرولی میں اس سرے سے اُس سرے تک دوکانیں لگی ہیں، لوگ بیٹھے ہیں، کھا رہے ہیں، باتیں ہو رہی ہیں، ادھر گانا ہو رہا ہے، ادھر دف بج رہا ہے - باریک باریک پھوار پڑ رہی ہے کہ ایک دفعہ ہی نفیری کی آواز آئی لیجئے جوگ مایا جی کا پنکھا آگیا، سب کے سب اس میں جا شریک ہوئے، عبدالوہاب کٹورہ بجا رہا ہے، نفیری کے کمال دکھا رہا ہے، بیلیں مل رہی ہیں، کوئی روپیہ دیتا ہے، کوئی دوشالہ - رات کے ایک دو بجے تک یہی چہل پہل رہی - دوسرے دن درگاہ شریف میں پنکھا چڑھا، وہاں اس سے زیادہ دھوم دھام رہی - چار پانچ روز آنکھہ سیند کرتے گزر گئے، ہنسی خوشی گھر آئے، قطب کے پراٹھے لائے، چاندی کے چھلے لائے، اب گھر گھر پراٹھے اور چھلے بٹ رہے ہیں - اور اب کی پھول والوں کی سیر خدا نہ دکھائے - شریف لوگ تو وہاں کیوں جانے لگے - جاتے ڈرتے ہیں کہ کہیں بین الاقوامی تصادم نہ ہو جائے"۔ میں نے کہا "مرزا صاحب بین الاقوامی تصادم نہیں فرقہ واری جنگ"۔ کہنے لگے "چل ہٹ - جو بین الاقوامی تصادم وہی فرقہ واری جنگ، نہ اس کے کچھ معنی، نہ اُس کے کچھ معنی - خواہ مخواہ اخبار والوں نے نئے نئے لفظ گھڑ ڈالے ہیں اور تو نے یہاں کی زبان بھی سنی - سبحان اللہ کیا زبان ہے اور اسی پر مرے جاتے ہیں کہ اُردو ہماری زبان ہے - لکھنؤ کا حال تو مجھے معلوم نہیں، ہاں دلی کی زبان تو اب کچھہ نئی زبان ہو گئی ہے، وہ وہ لفظ سننے میں آتے ہیں کہ کیا کہوں - اور ان پڑھے لکھے لوگوں نے تو زبان کو اور بھی غارت کر دیا ہے - ایک

لفظ اردو کا بولینگے تو دو لفظ انگریزی کے۔ بھئی مجھے تو یہاں کی زبان سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔ پرسوں ہی جمعہ کو جامع مسجد میں ایک مولوی صاحب وعظ بیان کر رہے تھے ماشاءاللہ کیوں نہ ہو مولوی تھے۔ چھانٹ چھانٹ کر وہ وہ لفظ حلق سے نکالے ہیں کہ سبحان اللہ۔ میری تو خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں۔ یہ تو رہے مسلمان۔ اب ہندوؤں کی گفتگو سنو تو وہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم ہندی بولتے ہیں۔ جو وہ بولتے ہیں اگر اسی کا نام ہندی ہے تو میاں ہم تو مرتے جائیں گے یہ زبان نہ آئیگی اچھا بھئی ہم عربی بولیں، تم ہندی بولو مگر اسطرح کہ جو لفظ ہماری تمہاری اُردو میں نہیں ہے اُس کے لیے مولوی صاحب عربی کا لفظ استعمال کریں، پنڈت جی سنسکرت کا لفظ بولیں۔ یہ کیا ہے کہ اردو میں لفظ موجود ہے اور اس کی جگہ ایک صاحب سنسکرت کا یہ موٹا لفظ لائیں اور دوسرے صاحب عربی کا یہ بڑا لفظ قاموس میں سے نکالکر استعمال کریں۔ ارے بھئی سنتا ہوں تمہارے ہاں بھی تو اُردو کا کوئی بڑا مدرسہ کُھلا ہے۔ سب علم اُردو ہی میں پڑھایا جاتا ہے"۔ میں نے کہا "جی ہاں۔ کلیہ جامعۂ عثمانیہ"۔ مرزا صاحب بڑے زور سے قہقہہ مار کر کہنے لگے "ادہو! یہ نام اور اُردو کا مدرسہ۔ معلوم ہوتا ہے، وہاں بھی مولویوں کا زور ہے۔ خیر جامعہ تو یہ جیسے جامع مسجد، عثمانیہ تمہارے بادشاہ کا نام ہوا اور میاں یہ کلیہ کیا بلا ہوئی"۔ میں نے کہا "آپ اس بحث کو چھوڑئیے۔ دلی کی کہیے اور سنائیے۔ جب دلی کی ہر چیز سے آپ کو نفرت ہے تو گزرتی کیسے ہو گی"۔ کہنے لگے "میاں بہت ہو گئی تھوڑی رہی ہے۔ صبح ہی اُٹھتا ہوں۔ نماز پڑھ کبھی مہندیوں[1] میں چلا جاتا ہوں کبھی کلو کے تکیہ۔ پُرانی دلی والے وہاں آرام کر رہے ہیں۔ اُنکی قبروں پر جا بیٹھتا ہوں، اُن کو اور اُن کی دلی کو یاد کر کے دو آنسو بہا لیتا ہوں، جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ شام

---

[1] مہندیاں اور کلو کا تکیہ دلی کے دو بڑے قبرستان ہیں۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر آبیٹھتا ہوں اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھتا ہوں کہ پہلے دلّی کیا تھی اور اب کیا ہو گئی۔" اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی مرزا صاحب رومال جھاڑ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "میاں فرحت! یہاں بس اس لئے آتا ہوں۔ اگر دلی میں کچھ لطف رہ گیا ہے تو جامع مسجد میں مغرب اور عشار کی نماز میں رہ گیا ہے۔ یہ بھی نہ ہوتا تو کچھ کھا کر سو رہتا۔"

دوسرے دن میں حیدرآباد چلا آیا۔ سارے راستے مرزا صاحب کی باتوں کا خیال رہا۔ جو خوشی دلّی جا کر ہوئی تھی وہ مرزا صاحب کی باتوں نے خاک میں ملا دی۔ یہ تو میں بھی کہوں گا کہ دلی مجھ کو بھی کچھ نئی نئی معلوم ہونے لگی ہے اور شاید اسی وجہ سے اس کا نام نئی دہلی رکھا گیا ہے۔ جو دلی ہمارے زمانہ میں تھی وہ تو اب نہیں رہی۔ اب چاہے دلی والے اس کو مانیں یا نہ مانیں۔

دلاری

گو وہ لونڈی بچپن سے اس گھر میں رہی اور پلی مگر سولہ سترہ برس کی عمر میں بھاگ گئی۔ اس کی ماں کا پتہ نہ تھا، اس کی ساری دنیا یہی گھر تھا اور اس گھر والے۔ شیخ ناظم علی صاحب خوشحال آدمی تھے، خاندان میں کئی بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ بیگم صاحب بھی زندہ تھیں اور زنانہ میں ان کا پورا راج تھا۔ دلاری خاص ان کی لونڈی تھی۔ گھر میں اور نوکرانیاں مامائیں آئیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال کام کریں، اس کے بعد چھوڑ کر چلی جائیں۔ اس کی وجہ ہمیشہ یہ نہیں ہوتی تھی کہ ان کے ساتھ سلوک برا ہوتا یا دوسری جگہ انہیں تنخواہیں اچھی ملتیں، بلکہ غالباً یہ وجہ تھی کہ وہ ایک جگہ رہتے رہتے گھبرا جاتیں اور آخرکار کسی معمولی سی بات پر جھگڑ کر نوکری چھوڑ دیتیں۔ مگر دلاری کے لئے ہمیشہ ایک ہی ٹھکانا تھا۔ اس سے گھر والے کافی مہربانی سے پیش آتے۔ اسے کھانے اور کپڑے کی کوئی شکایت نہ تھی، دوسری نوکرانیوں کے مقابلہ میں اس کی حالت اچھی تھی مگر باوجود اس کے کبھی کبھی جب کسی ماما سے اور اس سے جھگڑا ہوتا تو وہ یہ طنز ہمیشہ سنتی "میں تیری طرح کوئی لونڈی تھوڑئی ہوں۔" اس کا دلاری کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اس کا بچپن بے فکری میں گزرا۔ اس کا مرتبہ گھر کی بیبیوں سے پست تھا۔ وہ پیدا ہی اس درجہ میں ہوئی تھی۔ خدا جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ اس کا رونا کیا! دلاری کو اپنی پستی کی کوئی شکایت نہ تھی مگر جب اس کی عمر کا وہ زمانہ آیا جب لڑکپن ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے، دل کی گہری اور اندھیری بے چینیاں زندگی کو کبھی تلخ اور کبھی میٹھی بناتی ہیں، تو وہ اکثر مغموم سی رہنے لگی لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جس کی اسے نہ تو وجہ معلوم تھی نہ دوا۔ چھوٹی صاحبزادی حسینہ بیگم

اور دلاری دونوں قریب قریب ہم سن تھیں اور ساتھ کھیلتیں۔ مگر جوں جوں ان کا سن بڑھتا تھا توں توں دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا۔ صاحبزادی کا وقت سینے پرونے، پڑھنے لکھنے میں صرف ہونے لگا۔ دلاری کمروں کی خاک صاف کرتی، گھڑوں میں پانی بھرتی، چھوٹے برتن دھوتی۔ وہ خوبصورت تھی لمبے لمبے ہاتھ پیر، بھرا جسم، مگر عام طور سے اس کے کپڑے میلے کچیلے ہوتے اور اس کے بدن سے بو آتی۔ تیوہار کے دنوں البتہ وہ اپنے اُجلے کپڑے نکال کر پہنتی اور سنگار کرتی۔ یا اگر کبھی شاذ و نادر اسے بیگم صاحب یا صاحبزادی کے ساتھ کہیں جانا ہوتا تب بھی اسے صاف کپڑے پہننا ہوتے۔

شب برات تھی، دلاری گڑیا بنی تھی، زنانے کے صحن میں آتش بازی چھوٹ رہی تھی۔ سب گھر والے، نوکر چاکر، کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے بچے غل مچا رہے تھے، بڑے صاحبزادے کاظم بھی موجود تھے جن کا سن بیس اکیس برس کا تھا۔ یہ اپنی کالج کی تعلیم ختم ہی کرنے والے تھے۔ بیگم صاحب انہیں بہت چاہتی تھیں، مگر یہ ہمیشہ گھر والوں سے بیزار رہتے انہیں تنگ خیال اور جاہل سمجھتے۔ جب چھٹیوں میں گھر آتے تو ان کی بحث ہی کرتے گزر جاتی۔ یہ قریب قریب ہر پُرانی رسم کے "خلاف" تھے۔ مگر اظہار ناراضی کر کے سب کچھ برداشت کر لیتے۔ آخر کرتے کیا! انہیں پیاس لگی اور انہوں نے اپنی ماں کے کاندھے پر سر رکھکر کہا "امی جان! پیاس لگی ہے"۔

بیگم صاحب نے محبت بھرے لہجہ میں جواب دیا "بیٹا شربت پیو، میں ابھی بنواتی ہوں"۔ اور یہ کہکر دلاری کو پکار کر کہا کہ شربت تیار کرے۔

کاظم بولے "جی نہیں امی، اسے تماشہ دیکھنے دیجیے، میں خود اندر جا کر پانی پی لونگا"۔

مگر دلاری حکم سنتے ہی اندر کی طرف چل دی۔ کاظم بھی پیچھے پیچھے دوڑے۔ دلاری ایک تنگ، اندھیری سی کوٹھری میں شربت کی بوتل اُٹھا رہی تھی۔ کاظم بھی وہیں پہونچکر

رکے۔ دلاری نے مڑ کر پوچھا "آپ کے لئے کونسا شربت تیار کروں"؛ مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ کاظم نے اسے ایک نظر دیکھکر گردن جھکالی۔ دلاری کا سارا جسم تھرتھرانے لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ایک بوتل اٹھالی اور دروازہ کی طرف بڑھی کاظم نے بڑھکر بوتل اس کے ہاتھ سے لیکر الگ رکھدی اور اسے گلے سے لگا لیا۔ لڑکی نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے تن من کو اُس کی گود میں دیدیا۔ اُمڈی ہوئی گھٹائیں آخر برس پڑیں۔ دوہستیوں نے جن کی ذہنی حالت میں زمین و آسمان کا فرق تھا یکایک یہ محسوس کیا کہ وہ آرزوؤں کے ساحل پر آگئیں۔ دراصل وہ تنکوں کی طرح تاریک طاقتوں کے سمندر میں بہی چلی جارہی تھیں۔ اکثر پریم کا میٹھا گیت دیپک راگ میں گایا جاتا ہے۔

ایک سال گزر گیا۔ کاظم کی شادی ٹھیر گئی۔ شادی کے دن آگئے۔ چار پانچ دن میں گھر میں دلہن آجائیگی۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم ہے۔ ایک جشن ہے۔ کام کی کثرت ہے۔ دلاری ایک دن رات کو غائب ہوگئی، بہت چھان بین ہوئی؛ پولیس کو اطلاع دی گئی، مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک نوکر پر سیب کا شبہ تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اسی کی مدد سے دلاری بھاگی، اور وہی اسے چھپائے ہوئے ہے۔ وہ نوکر نکال دیا گیا۔ درحقیقت دلاری اسی کے پاس نکلی مگر اُس نے واپس جانے سے صاف انکار کردیا۔

تین چار مہینہ بعد شیخ ناظم علی صاحب کے ایک بڈھے نوکر نے دلاری کو شہر کی غریب رنڈیوں کے محلہ میں دیکھا۔ بڈھا بیچارا بچپن سے دلاری کو جانتا تھا۔ وہ اُس کے پاس گیا اور گھنٹوں تک دلاری کو سمجھایا کہ واپس چلے۔ وہ راضی ہوگئی۔ بڈھا سمجھتا تھا کہ اسے انعام ملے گا اور یہ لڑکی مصیبت سے بچیگی۔

دلاری کی واپسی نے سارے گھر میں کھلبلی ڈال دی۔ وہ گردن جھکائے

ایک سفید چادر سر سے پیر تک اوڑھے، پریشان صورت اندر داخل ہوئی اور سائبان کے کونے میں زمین پہ جاکر بیٹھ گئی۔ پہلے تو نوکرانیاں آئیں، وہ دور سے کھڑی ہو کر اسے دیکھتیں اور افسوس کرکے چلی جاتیں۔ اتنے میں ناظم علی صاحب زنانہ میں تشریف لائے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ دلاری واپس آگئی ہے تو وہ باہر نکلے جہاں دلاری بیٹھی تھی۔ وہ کام کاجی آدمی تھے، گھر کے معاملات میں بہت کم حصہ لیتے تھے، انہیں ان باتوں کی فرصت ہی نہیں تھی۔ دلاری کو دور سے پکار کر کہا "بے وقوف! اب ایسی حرکت نہ کرنا" اور یہ کہکر اپنے کام پر چلے گئے۔ اس کے بعد چھوٹی صاحبزادی، دبے قدم، اندر سے برآمد ہوئیں اور دلاری کے پاس پہونچیں، مگر بہت قریب نہیں۔ اس وقت وہاں اور کوئی نہ تھا۔ وہ دلاری کے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھیں۔ دلاری کے بھاگنے کا انہیں بہت افسوس تھا۔ شریف، پاکباز، باعصمت حسینہ بیگم کو اس غریب بیچاری پر بہت ترس آرہا تھا مگر اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کوئی لڑکی کیسے ایک گھر کا سہارا چھوڑ کر جہاں اُس کی ساری زندگی بسر ہوئی ہو باہر قدم تک رکھ سکتی ہے۔ اور پھر نتیجہ کیا ہوا؟ عصمت فروشی، غربت، ذلت۔ یہ سچ ہے کہ وہ لونڈی تھی مگر بھاگنے سے اس کی حالت بہتر کیسے ہوئی۔ دلاری گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ حسینہ بیگم نے خیال کیا کہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہے۔ اس گھر سے بھاگنا جس میں وہ پلی، احسان فراموشی تھی۔ مگر اسے اس کی کافی سزا مل گئی۔ خدا بھی گنہگاروں کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔ گو کہ اس کی آبرو خاک میں مل گئی مگر ایک لونڈی کے لئے یہ اتنی اہم چیز نہیں جتنی ایک شریف زادی کے لئے۔ کسی نوکر سے اس کی شادی کردی جائے گی۔ سب پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ انہوں نے آہستہ سے نرم لہجے میں کہا "دلاری یہ تو نے کیا کیا؟" دلاری نے گردن اُٹھائی، ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک لمحہ کے لئے اپنی بچپن کی ہمجولی کو دیکھا اور پھر اسی طرح سے سر جھکا لیا

حسینہ بیگم واپس جا ہی رہی تھیں کہ خود بیگم صاحب آگئیں۔ اُن کے چہرہ پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، وہ دُلاری کے بالکل پاس آکر کھڑی ہوگئیں۔ دلاری اسی طرح چپ، گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ بیگم صاحب نے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔

"بے حیا، آخر جہاں سے گئی تھی وہیں واپس آئی نہ۔ مگر منہ کالا کرکے۔ سارا زمانہ تجھ پر تھڑی تھڑی کرتا ہے۔ بُرے فعل کا یہی انجام ہے......" مگر باوجود ان سب باتوں کے بیگم صاحب اس کے لوٹ آنے سے خوش تھیں۔ جب سے دلاری بھاگی تھی گھر کا کام اتنی اچھی طرح نہیں ہوتا تھا۔

اس لعن طعن کا تماشہ دیکھنے سب گھر والے بیگم صاحب اور دلاری کے چاروں طرف جمع ہوگئے تھے۔ ایک نجس، ناچیز ہستی کو اس طرح ذلیل دیکھکر سب کے سب اپنی بڑائی اور بہتری محسوس کر رہے تھے۔

یکایک ایک بغل کے کمرے سے کاظم اپنی خوبصورت دلہن کے ساتھ نکلے اور اپنی ماں کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دلاری پر نظر نہیں ڈالی۔ ان کے چہرے سے غصہ نمایاں تھا۔ انہوں نے اپنی والدہ سے درشت لہجے میں کہا: "اے خدا کے لئے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجئے۔ وہ کافی سزا پا چکی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں اس کی حالت کیا ہو رہی ہے۔" یہ کہکر وہ فوراً واپس چلے گئے۔

لڑکی اس آواز کو سنکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کرکے سب نے ہٹنا شروع کیا۔ مگر یہ ایک مجروح، پر شکستہ چڑیا کی پرواز کی آخری کوشش تھی۔ اُس دن رات کو وہ پھر غائب ہوگئی۔

غزل

(مولانا آزاد سبحانی صاحب)

تمہاری زلف مشکیں سے بندھی ہے زندگی اپنی — نہ مرنا ہے خوشی اپنی نہ جینا ہے خوشی اپنی

سبھی پژمردہ بیٹھے رہ گئے حتیٰ کہ ساقی بھی — کچھ ایسی چھا گئی اس انجمن میں بیدلی اپنی

دلِ بے ظرف نے بے ظرفیاں کیں وائے نادانی — اُڑائی طبقۂ عشاق میں اس نے ہنسی اپنی

کہانتک کہتے پھرئے قصۂ بیچارگی اپنا — کہانتک اپنے ہاتھوں کیجئے پردہ دری اپنی

خوشا تقدیر جو رہزن مسلّم ہیں زمانہ کے — انہیں کے ہاتھ میں سونپی گئی ہے رہبری اپنی

کہاں زورِ جنوں میں رہ سکے بخیہ گری باقی — محض دیوانگی تھی کوشش بخیہ گری اپنی

خدا کے نام پر ہم نے بہت سے بُت تراشے ہیں — حَرَم کو بھی لئے ہے دائرہ میں بُت گری اپنی

کسی کا کیا ہے کل سامان حسن و عشق اپنے ہیں — دل اپنا، حسن دلبر اپنا، طرز دلبری اپنی

دلِ پُر حوصلہ نے کر لیا خود راستہ پیدا — نہ چھوڑی چرخ کج رفتار نے گو کجروی اپنی

بہت مشہور ہے تو سنگدل اے آسماں لیکن — ہلا دیگی تجھے بھی داستانِ بے کسی اپنی

ہے رازِ زندگی پوشیدہ قربانی میں سبحانی
اگر تم چاہتے ہو زندگی دو زندگی اپنی

نوائے محوی

(از حضرت محوی صدیقی لکھنوی)

اُف مرے چارہ گردوں کا یہ ہراساں ہونا
آج دشوار ہے صبح شب ہجراں ہونا

قیس کا جوشِ جنوں مفت میں بدنام ہوا
اُس کی تقدیر میں تھا خاکِ بیاباں ہونا

تجھ سے رنگین ہے افسانۂ حسرت میرا
میرے دل سے نہ جدا اے غم جاناں ہونا

ہے پشیمان اجل، روح پریشاں میری
ہائے اُس شوخ کا انگشت بدنداں ہونا

غیرتِ دل کو نہیں منتِ خنجر منظور
ورنہ مشکل نہیں مشکل مری آساں ہونا

نگہِ دوست کا ہدیہ ہے یہ ناسورِ جگر
ہم نہیں چاہتے شرمندۂ درماں ہونا

گر کے دامن پہ ترے بن گیا افسانۂ شوق
ورنہ اس خون کے آنسو کو تھا طوفاں ہونا

چپ ہی بیمار، سحر دور، ہی غمخوار اُداس
مفت بدنام نہ تو اے شب ہجراں ہونا

دل کے اِک جذبۂ پنہاں کا مرقع سمجھو!
شمع کا پردۂ فانوس میں عریاں ہونا

دیکھ لو گریۂ خونیں اُنکی چمن آرائی
دیکھ لو گوشۂ دامن کا گلستاں ہونا

جان لے کر ہی غم دوست نے چھوڑا آخر
دل کی تقدیر میں تھا کشتۂ مہماں ہونا

اپنی تقدیر ہے ورنہ کوئی دشوار نہ تھا
دل کے ہر داغ کا اک شمع فروزاں ہونا

میں نہیں تو مری تربت ہے ٹھکانا تیرا
بیکسی! تو نہ مرے بعد ہراساں ہونا

دل میں روشن ہے جو تو اے مری شمع اُمید
غیر ممکن ہے مرا کشتۂ حرماں ہونا

ہو نہ ہو خونِ تمنا کا پتہ دیتا ہے
اشک خونیں کا نمایاں سر مژگاں ہونا

دیکھ کر حسن کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو
عشق کا خاک بسر، چاک گریباں ہونا

دیدۂ شوق ہے اور جلوۂ فردوس جمال
اب کسے چاہئے منت کش رضواں ہونا

ہو الگ سب سے ترا طرز سخن اے محوی
تو نہ دلدادۂ انداز حریفاں ہونا

(مولانا صفی لکھنوی مدظلہ العالی)

کچھ نہ تھا اور، وعظ کے سلسلۂ دراز میں
نہر شراب موجزن، جنت خانہ ساز میں

یارب اثر تھا کون سا، آہ جگر گداز میں
کوند رہی ہیں بجلیاں، ایک حریم ناز میں

سنگ درِ حبیب کے جذب کی، کوئی حد نہیں
پھر نہ اٹھا جو سر جھکا، سجدہ گہِ نیاز میں

ہجر وطن ہے اک عذاب، کیوں نہ تڑپ کے جان دے
صید حقیقت آشنا، دامگہ مجاز میں

جہل ہے منتہائے علم، عقل ہے اسکی معترف
عبدِ ذلیل! شک نہ کر، قدرتِ کارساز میں

عمر دوروزہ کاٹ دی، شیب میں اٹھتے بیٹھتے
فرض ہیں دو ہی رکعتیں، وقت سحر نماز میں

پی لیا آبِ زندگی آپ نے کیوں جناب خضر!
قید حیات الجھ گئی، سلسلۂ دراز میں

ایسے محل پہ دوستو! رخنہ گری ہے، خودکشی
ہم بھی اسی جہاز میں، تم بھی اسی جہاز میں

مستِ صبوحیٔ الست تھے جو صفیؔ، بہک گئے
کیفِ شراب دیکھکر، نرگسِ نیم باز میں

اقتباسات

رُوس کی تعلیمی ترقی | جنگ عظیم کے بعد روس کی سیاسی اور معاشی نظام میں جو انقلاب ہوا ہے اور جو تجربات ہو رہے ہیں اُس کے متعلق کوئی رائے ابھی آسانی کے ساتھ نہیں قائم کی جا سکتی۔ البتہ وہاں کی تعلیمی حالت میں جو عظیم الشان ترقی ہو رہی ہے وہ ضرور قابل لحاظ ہے خصوصاً ہندوستان کیلئے ۱۹۲۰ء کی مردم شماری کے مطابق اُس مُلک میں پڑھے لکھے مرد اور عورتوں کی تعداد کا اوسط فی ہزار ۳۶۵ تھا، لیکن اشترا کی جمہوریت کے قیام کے بعد سے جو اصلاح وہاں کے نظام تعلیم میں کی گئی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب پڑھے لکھوں کی تعداد میں تقریباً ۴ فی صدی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اتنی قلیل مدت میں اتنی ترقی یقیناً حیرت انگیز اور قابل داد ہے۔

روسی جمہوریت کے تمام تعلیمی امور جس جماعت کے متعلق ہیں اُسکو People's Commissariat کہتے ہیں اور اس کے سات شعبہ ہیں۔ ایک شعبہ کے متعلق انتظامی امور ہیں مثلاً تعمیرات اور مصارف وغیرہ۔ دوسرے شعبہ کے متعلق ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی نگرانی ہے۔ تیسرے شعبہ کے متعلق فوقانی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ چوتھے کے متعلق غیر روسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ چونکہ روس میں تقریباً سو سے زائد مختلف اقوام کے لوگ بستے ہیں اور ان کی زبانیں بھی مختلف ہیں اس لئے ان کی مادری زبان میں تعلیم کے انتظام کے لئے اس شعبہ کی شدت کے ساتھ ضرورت تھی۔ یہ شعبہ مختلف اقوام کی معاشرتی اور تمدنی ضروریات کا تحفظ کر کے ہر ایک کی مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کرتا ہے۔ پانچواں شعبہ ایک علمی جماعت ہے جو طریق تعلیم کا مطالعہ اور تحقیق کرتی ہے اور تمام تعلیمی اور صنعتی مدارس کے لئے نصاب تعلیم تیار کرتی ہے۔ چھٹا

شعبہ وہ ادارہ ہے جو اکیڈمی اور تحقیقی کام کرنے والی جماعتوں کی نگرانی کرتا ہے۔ یہی شعبہ جمہوریت کے اندر تمام آثار قدیمہ، فنون لطیفہ کے عجائب خانوں، موسیقی کی درسگاہوں اور سرکاری تھیٹروں کی نگرانی بھی کرتا ہے۔ ساتویں شعبہ کے متعلق اشاعت علوم کا کام ہے چاہے وہ کتب کے ذریعہ سے ہو یا رسائل کے ذریعہ یا سینما کے ذریعہ سے۔

ابتدائی تعلیم کی مدت چار سال رکھی گئی ہے اور ثانوی کی پانچ سال، اس کے بعد یونیورسٹی کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ جو لوگ عمر کی زیادتی کی وجہ سے یا کاروبار زندگی کی مشغولیت کی وجہ سے، یا غربت کی وجہ سے مدارس میں باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کر سکتے، اُن کے لئے مدارس شبینہ، صنعتی مدارس، مدرسہ بالغین قائم کئے گئے ہیں۔ روس میں سب سے زیادہ قابل تعریف اُن کے وہ مکتب ہیں جہاں ۳ برس سے ۷ برس تک کی عمر کے بچوں کی تعلیم و تربیت کنڈرگارٹن کے اصول پر کیجاتی ہے۔ حکومت نے غریب، لاوارث، اور یتیم بچوں کے لئے جگہ جگہ دارالاقامہ قائم کئے ہیں، اور سرکار کی طرف سے اِن کی تعلیم اور تربیت کا معقول انتظام کیا جاتا ہے۔ طلبا کے اخلاق کی نگرانی کے لئے انسپکٹر مقرر ہیں جو بازاروں میں، ریلوے اسٹیشن پر اور دیگر مقامات پر نوجوانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں ۱۹۲۷ء میں ابتدائی مدارس کی تعداد ۱۱۴۵۰۴ تھی اور طلبا کی تعداد ۱۱۰۰۰۰۰ تھی۔

مدارس بالغین تین قسم کے ہیں، دن کے مدرسے، مدارس حرفہ، اور سیاسی مدرسے۔ دن کے مدرسے یا تو صنعتی ہوتے ہیں یا زراعتی جیسی ضرورت مقامی حالات کے لحاظ سے ہو، مدت تعلیم ۴ سال عام طور پر ہوتی ہے لیکن اگر کسی خاص فن کے کسی خاص شعبہ میں مہارت تامہ پیدا کرنا ہو تو ایک سال تعلیمی مدت میں اور بڑھ جاتا ہے۔

مدارس حرفہ میں حرفہ کی تعلیم کے ساتھ ادبی تعلیم بھی رکھی گئی ہے۔ بے پڑھے لکھوں کے لئے خاص مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ لیکن اِن مدارس کی تعداد اب روز بروز کم

ہوتی جاتی ہے اس لئے کہ لوگ پڑھنا لکھنا سیکھتے جاتے ہیں۔ سیاسی تعلیم کے لئے مدارس روس کے تعلیمی نظام کی ایک خصوصیت ہیں اور ان مدارس کا مقصد ایسے اشخاص پیدا کرنا ہے جو بالشویک اصول کی تبلیغ و اشاعت کا کام کریں۔ ۱۹۲۳ء میں اس قسم کے سیاسی مدارس کی تعداد ۲۳۴۲ تھی جن میں ۱۶۰۰۰ طالبعلم تھے۔ ان کے علاوہ کمیونسٹ جماعت کی یونیورسٹیاں ہیں جنکی تعداد ۱۹۲۶ء میں کل پندرہ تھی اور طالب علموں کی تعداد چھ ہزار سے زائد تھی۔ ملک کی عام تمدنی و معاشرتی اصلاح اور باشندوں میں شہریت کا احساس اور عام بیداری پیدا کرنے کے لئے انجمنیں قائم کیگئی ہیں جن کی تعداد ۱۹۲۶ء میں ۲۷ ہزار سے زیادہ تھی۔

روس میں یونیورسٹیاں دو قسم کی ہیں ایک کا مقصد جدید امریکی طریقہ پر کسانوں اور مزدوروں کی تعلیم ہے اس لئے ٹریڈ یونین اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ان یونیورسٹیوں کی امداد میں صرف کرتی ہے۔ اِن یونیورسٹیوں کی طرف سے شام کے وقت مختلف علمی، ادبی اور فنی مضامین پر قابل اساتذہ تقریر کے ذریعہ درس دیتے ہیں۔ اس طریقہ سے صرف ماسکو میں اِس وقت تقریباً دس ہزار طلبا ۱۶ مختلف مضامین کے درس میں شریک ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کی یونیورسٹیاں جو باقاعدہ مختلف علوم و فنون کی اور مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتی ہیں ان کی تعداد اس وقت سوا سو کے قریب ہے اور طلباء کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہے۔ ان یونیورسٹیوں کے علاوہ سائنس کی تعلیم اور تحقیقی کام کے لئے معمل گاہیں قائم کی گئی ہیں جن کی تعداد ۳۵ ہے۔ ان میں مختلف کیمیائی، طبیعی اور برقی تجربات کئے جاتے ہیں جن سے ملک کی صنعت، حرفت اور تجارت کی ترقی کی راہیں نکلیں۔

یونیورسٹی، مدرسہ اور معمل گاہوں اور انجمنوں کے ذریعہ جو تعلیم ہوتی ہے اُس کے علاوہ کتب خانہ، سنما، عجائب خانہ بھی تعلیم کے لئے بہت مفید ذریعہ ثابت

ہوئے ہیں چنانچہ اس وقت جمہوریت روس میں ۲۰ ہزار مستقل کتب خانے ہیں اور ۵۰ ہزار سفری کتب خانے جو روس کے ساڑھے پانچ لاکھ دیہاتوں میں وقتاً فوقتاً دورہ کرتے رہتے ہیں، پھر ۳½ ہزار مستقل سنما اور ۱½ ہزار سفری سنما بھی تعلیمی کام کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ Broad Casting کے ذریعہ سے بھی تعلیم دینے کا کام اب حکومت نے شروع کیا ہے۔

سطور بالا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دس سال کے اندر روسی جمہوریت نے اپنی قوم کی تعلیم میں کس قدر سرگرمی سے کام کیا اور کیسی حیرت انگیز ترقی حاصل کی ہے۔ اس دس سال کی مدت میں ہندوستان نے جو ترقی کی ہے اُس کا ثبوت بھی عنقریب ہارٹوگ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہو جانے کے بعد ملجائے گا۔

تنقید و تبصرہ

کتب

آرٹسٹ ۔ مخزن نجات ۔ مہمات الصرف و النحو ۔ مبادی [illegible]

آرٹسٹ ! (مصنفہ آسکر وائلڈ مترجمہ مولوی سید تمکین کاظمی صاحب و مولوی عبدالمسلم صاحب
حجم ۱۰۹ صفحہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ لکھائی معمولی چھپائی اوسط درجے کی کاغذ اچھا ۔ قیمت عمر
ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن)

آسکر وائلڈ کا یہ ڈراما اُس کی تصانیف میں معنوی خوبیوں کے لحاظ سے سب سے ہلکا مگر اسلوب بیان کی شوخی اور ظرافت کے چٹخارے کے اعتبار سے سب پر بھاری ہے ۔ اس کا ترجمہ اُسی صورت میں جائز تھا کہ جو دلچسپی اصل میں ہے وہی ترجمے میں پیدا کر دی جائے ۔ افسوس ہے کہ ترجمہ کرنے والوں کو اس میں کامیابی نصیب نہ ہوئی ۔ ترجمہ صحیح ہے مگر یہ کافی نہیں ۔

کتاب میں پہلے [illegible] ”تقدیم“ ہے ۔ پھر مصنف کی اور [illegible] تصویریں [illegible] پھر سلطان حیدر صاحب جوش کا ”پیش لفظ“ ۔ پھر شبیہ حسن صاحب [illegible] پھر مسعود حسن صاحب ذوقی کا ”تعارف“ ۔ پھر انہیں مجتبےٰ صاحب کا ”اعلام“ ۔ پھر تمکین کاظمی صاحب کی ”تقریب“ ۔ ان چیزوں سے علاوہ مصنف کی صورت اور حیثیت کے ناظرین مترجموں کی شکل سے اُن کے لباس سے اُن کی زندگی کے حالات سے اور کتاب کی طباعت کی مختصر روداد سے بھی واقف ہو جائیں گے اور [illegible] [illegible] معلوم ہو سکتی ہیں ۔

ترجمے میں طباعت کی غلطیاں کثرت سے ہیں جن میں سے بعض کا لمبی چوڑی "تصحیح" میں بھی ذکر نہیں مثلاً صفحہ ۴۷، سطر ۱۱ اور ۱۳ میں "شکر" کی جگہ "شکریہ"۔ چند غیر مانوس انگریزی الفاظ بجنسہ رکھدئے گئے ہیں اور ان کے معنی حاشیے میں بھی نہیں بتائے گئے مثلاً "کرمپٹ" "مفن"۔ بعض انگریزی الفاظ ایسے ہیں جو غیر مانوس تو نہیں مگر ان کا ترجمہ اُردو میں ہو سکتا تھا مثلاً "میڈم" "کمپنی" بمعنی صحبت۔ خیر یہ بھی سہی مگر خدا جانے Handle کا تلفظ "ہانڈل"، Hand-bag کا "ہانڈ بیاگ" اور Cloak Room کا "کلاک روم" کیوں ہو گیا۔

باوجود اِن باتوں کے کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔

مخزن نجات (پہلا حصّہ) | (مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ۔ حجم ۱۶ صفحے۔ تقطیع $\frac{20 \times 26}{16}$۔ لکھائی، چھپائی کاغذ خوشنما۔ قیمت ۴ر

عرب کے معجز بیان کی چالیس حدیثیں مولانا جامی کی منتخب کی ہوئی اور اُن کے منظوم ترجمے کے ساتھ۔ ایسا دینی تبرک اور ایسی ازلی دولت ہر مسلمان اور ہر شائق ادب کے لئے زر و جواہر سے زیادہ قیمتی ہے۔ شرف الدین احمد خاں صاحب نے اُردو میں بہت عمدہ ترجمہ کر کے اس کے فیض کے دائرے کو اور وسیع کر دیا ہے۔

مہمات الصرف والنحو | (مؤلفہ حکیم شیخ عبدالوحید صاحب ندوی شائع کردہ شبلی بک ڈپو، لکھنؤ۔ حجم ۳۰ صفحے۔ تقطیع $\frac{20 \times 26}{16}$، لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت ۲ر)۔

افعال کی خاصیتیں خوبی اور اختصار سے سمجھائی گئی ہیں۔ آخر میں نحو کی اصطلاحات کی ایک فرہنگ ہے۔ عربی کے طلبہ کے لئے مفید چیز ہے۔

مبادی نباتات | (از جگموہن لال صاحب چترویدی ۔ حجم ۱۰۴ صفحہ ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ لکھائی چھپائی معمولی، کاغذ اوسط درجے کا قیمت عمر ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی۔ اسٹیشن روڈ۔ لاہور)۔

نباتیات کے ابتدائی مسائل سہل اور سلیس عبارت میں سمجھائے گئے ہیں مطالب کو واضح کرنے کے لئے سادی تصویریں بھی دی گئی ہیں ۔ نہ صرف طلبہ کے لئے بلکہ تمام شایقین علم کے لئے مفید چیز ہے ۔

کتاب کا نام مبادی علم نباتات یا مبادی نباتیات ہوتا تو اچھا تھا ۔

شذرات

افسوس ہے کہ رسالہ کو وقت پر لانے میں اتنی جلدی نہیں ہوسکتی جتنی ہم چاہتے ہیں۔ پھر بھی اُمید ہے کہ اگست سے ہر مہینہ کا رسالہ اُسی مہینہ میں شائع ہونے لگے گا۔ انشاءاللہ

کارکنان جامعہ ملیہ کی تجویز ہے کہ آیندہ سال اپنے معلمین کی دلچسپی اور فائدے کے لئے ماہرین تعلیم کے لکچروں کا انتظام کریں۔ مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے پرنسپل صاحب اور دوسرے اساتذہ نے ازراہ عنایت وعدہ کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً خود تشریف لاکر لکچر دیا کریں گے اور ہر طرح سے اس تجویز کو کامیاب بنانے میں مدد دیں گے۔ ابھی پروگرام مرتب نہیں ہوا جب ہو جائے گا تو جامعہ اور پیام تعلیم میں شائع کر دیا جائے گا۔

امیر امان اللہ خاں کا افغانستان کے تخت سے دست بردار ہو کر یورپ چلا جانا نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام ایشیا والوں کے لئے صدمے اور عبرت کا باعث ہے۔ امیر صاحب کی نسبت بد قسمتی سے پچھلے دنوں یہ خیال قائم ہوگیا ہے اور قائم کرایا گیا ہے کہ اُن کی زندگی کے سارے کارنامے مغربی تہذیب کی اوچھی تقلید تک محدود ہیں اور اب کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ افغان قوم نے دینی جوش اور قومی غیرت سے کام لے کر اُس شخص کو جو اُن کے دین کو ضعیف اور اُن کے شعار قومی کو معدوم کرنا چاہتا تھا ملک بدر کر دیا ہے اور اب وہ امیر حبیب اللہ کے زیر حکومت سچی اسلامی زندگی بسر کریگی۔

جو لوگ یہ خیالات رکھتے ہیں اور دوسروں میں پھیلاتے ہیں اُن کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض جان بوجھ کر اپنے ذاتی فائدے یا ملکی مصالح کی خاطر سچائی کا خون کرتے ہیں۔

بعض نیک نیتی اور سادہ لوحی سے سنی سنائی باتوں پر بے سمجھے بوجھے ایمان لے آتے ہیں اور بعض صحیح واقعات کا علم رکھنے کے باوجود اپنی تنگ نظری اور تاریک خیالی سے نتیجے اُلٹے نکالتے ہیں۔

... ...

لیکن جو شخص ذاتی اغراض سے پاک ہے اور تھوڑی سی سمجھ اور وسعت نظر رکھتا ہے وہ افغانستان کے حالات پر نظرِ انصاف ڈالتے ہوئے یہ رائے قائم کرے گا کہ امان اللہ خاں کی ذات اُن کی قوم کے لئے بہت بڑی نعمت تھی جسے کھو کر وہ بہت جلد پچھتانے لگی۔ امیر صاحب کا یورپ کی ظاہری زندگی کی تقلید پر اس قدر زور دینا بجائے خود قابلِ اعتراض ہو لیکن اس کی وجہ سے اُن کی گراں قدر قومی اور ملکی خدمت کو یک قلم فراموش کردینا انتہائی بے ایمانی، یا تعصب، یا جہالت ہے۔

... ...

یورپ کی تقلید کا مسئلہ بہت طویل بحث کا محتاج ہے۔ اس وقت ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔ ہمیں اس وقت دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ہے۔ ایک تو یہ کہ یورپ کے لباس وغیرہ کا رائج کرنا امیر امان اللہ خاں کے کام کا صرف ایک پہلو ہے جس سے اُن کی مجموعی خدمات پر حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ دوسرے یہ کہ جو قومیں اُنکی مخالف ہیں انہیں دینی جوش یا قومی غیرت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان کی مخالفت کی وجوہ بالکل دوسری ہیں۔

... ...

امیر امان اللہ خاں نے جو مفید اصلاحات اپنے ملک میں کیں اُنکی مختصر فہرست حسب ذیل ہے:۔

(۱) صنعت و حرفت کو فروغ دینا۔

(۲) لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیمی ترقی میں انتہائی کوشش کرنا اور طلبہ کو وظیفے دیکر مغربی ممالک اور ٹرکی بھیجنا۔

(۳) باضابطہ اور منظم فوج تیار کرنا۔

(۴) امرا کی قوت کو کم کر کے بادشاہ کی مرکزی حکومت کو مضبوط کرنا اور اس طرح افغانوں کو مختلف جرگوں کے مجموعے کی جگہ ایک قوم بنانے کی کوشش کرنا۔

(۵) اصلاح معاشرت خصوصاً عورتوں کی اصلاح و ترقی کی تدابیر اختیار کرنا۔

... ...

ان میں سے نمبر ۵ کو مابہ النزاع سمجھکر چھوڑ دیا جائے تب بھی ایسی چیزیں باقی رہتی ہیں جن کی بنا پر تاریخ امان اللہ خاں کا شمار افغانستان کے سچے خادموں اور محسنوں اور دنیا کے قابل ترین حکمرانوں میں کریگی۔

... ...

اب رہے ناکامی کے اسباب تو اُن میں سب سے بڑا سبب اُمرا کی غداری ہے جب انہوں نے اپنی دولت اور حکومت کو خطرے میں دیکھا تو ہر جائز اور ناجائز طریقے سے امیر صاحب کی مخالفت شروع کی اور بھولی بھالی رعایا کو اُن کے خلاف اُبھارنا شروع کیا۔ انہوں نے ایک طرف تو افغانستان کے بیرونی دشمنوں سے اور دوسری طرف اُسکے اندرونی دشمنوں یعنی ملاؤں سے ساز باز کر کے اپنی قوت کو اور مضبوط کر لیا۔

... ...

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کو اپنی کوششوں میں خود امیر صاحب کی ناعاقبت اندیشی سے بڑی مدد ملی۔ امیر صاحب نے اصلاحات کے معاملہ میں عجلت اور بیصبری سے کام لیا۔ ملک کی اقتصادی حالت سنبھلنے سے پہلے انہوں نے اس پر اتنا مالی بوجھ ڈال دیا جسے وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یورپ کی تقلید میں سب سے بڑی غلطی جس کے

ایشیائی مرتکب ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ اختلاف حالات پر غور کئے بغیر وہ یورپ والوں کی طرح فضول خرچی پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم کی ترقی کے لئے شاندار مدرسے، روشن خیالی کیلئے بجلی کی روشنی، ذہنی ترقی کے لئے قیمتی ساز و سامان ضروری ہے کیونکہ یورپ میں یہ چیزیں موجود ہیں۔ وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ یورپ نے یہ مرفہ الحالی دوسری قوموں کو لوٹ کر اور غلام بنا کر حاصل کی ہے۔ اس لئے ہم لوگ اس معاملہ میں اسکی ریس نہیں کر سکتے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ مادی فلاح کا موجودہ معیار ذہنی ترقی کا آئینہ نہیں ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ یورپ میں بھی جو قومیں ذہنی دولت سے مالامال ہیں انہیں دولت دنیا میں دوسروں سے کم حصہ ملا ہے۔

... ...

یہی غلطی امیر امان اللہ خاں سے بھی سرزد ہوئی۔ انہوں نے اپنے اور اپنی قوم کے معیار زندگی کو بڑھانے کی کوشش میں بھاری محصول لگائے اور اُن کے وصول کرنے میں سختی کی۔ اس سے ملک میں ایک عام بے چینی پیدا ہوئی جس سے امرا اور ملاؤں نے فائدہ اُٹھایا اور چونکہ امیر صاحب نے یورپ سے واپسی کے بعد اصلاحِ معاشرت میں بہت شدت شروع کر دی تھی اس لئے ان لوگوں نے حامئ دین بن کر جہلا کے قدامت پرستانہ جذبات کو اُبھارنا شروع کیا۔

... ...

ان سب باتوں کے ملجانے سے ملک میں ایسی آگ لگ گئی جسے امیر امان اللہ خاں نہ بجھا سکے اور آخر انہیں اپنے ملک کو طوائف الملوکی کی حالت میں چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی۔ کوئی نہیں کہ سکتا کہ انہیں پھر افغانستان کے تخت پر بیٹھنا نصیب ہوگا یا نہیں۔ افغانستان کے بہی خواہ سوائے اس کے کیا کر سکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ سے امیر صاحب کی واپسی اُن کی اصلاح اور انکی کامیابی کی دعا کریں۔

سیرۃ نبوی پر مستند و مفید کتابیں

سیرۃ النبی علامہ شبلی مرحوم کی شہرۂ آفاق اور مقتدر تصنیف :-
حصہ اول للعہ ؎ حصہ دوم ؎ حصہ سوم ؎

خطبات مدراس سیرۃ نبوی پر مولنا سید سلیمان ندوی کے گرانقدر، بصیرت افروز اور پرکیف آٹھ مفید و موثر لیکچر۔ قیمت عہ

رحمۃ للعالمین قاضی محمد سلیمان صاحب منصورپوری کی مشہور اور مقبول ترین کتاب
حصہ اول ؎ حصہ دوم للعہ

سیرۃ خیر البشر۔ از مولنا محمد علی امیر شریعت احمدیہ لاہور۔ قیمت ؎

اسوۂ حسنہ علامہ ابن قیم شاگرد رشید امام ابن تیمیہؒ کی مشہور کتاب زاد المعاد کے اختصار کتاب ہدی الرسول کا اردو ترجمہ از مولنا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ ؎

تذکرۃ المصطفٰے۔ از پروفیسر سید نواب علی صاحب پرنسپل جوناگڈھ کالج قیمت عہ

نشر الطیب۔ از مولنا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی۔ قیمت عہ

لڑکے، لڑکیوں، عورتوں اور عام مطالعہ کے لئے

ہمارے نبیؐ
از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے قیمت ؎

ہمارے رسولؐ
از مولنا خواجہ عبدالحی استاذ جامعہ ملیہ قیمت ؎

سرکار کا دربار
از احمد الیاس صاحب مجیبی قیمت عہ

سیرۃ الرسولؐ
از مولنا محمد اسلم جیراجپوری استاذ جامعہ ؎

مکتبہ جامعہ ملیہ - دہلی

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲	بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۲۹ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

۱۔ آزادی کی راہیں	برٹرینڈ رسل ترجمہ حامد علیخاں صاحب بی۔اے (جامعہ)	۳۲۲
۲۔ عربوں کا تمدن	سید نذیر نیازی صاحب بی۔اے (جامعہ)	۳۳۱
۳۔ مجذوب کی بڑ	ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب	۳۵۱
۴ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے	شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ)	۳۵۹
۵۔ سید قاسم آذر بائیجانی	حضرت درد کاکوروی	۳۶۴
۶۔ غزل	حضرت اثر ردولوی	۳۷۶
۷۔ محبت کی جیت (افسانہ)	ترجمہ مولوی محمد حسین صاحب محوی	۳۷۷
۸۔ خمسہ بر غزل حکیم سنائی	حضرت شاپور کرمانی	۳۸۶
۹۔ غزل	حضرت درد کاکوروی	۳۸۸
۱۰۔ اقتباسات ۳۸۹	۱۱۔ شذرات	۳۹۵

آزادی کی راہیں

(۱)

تمہید

تباہی اور بے رحمی کے جس انتشار میں نوع انسانی نے اب تک دن گزارے ہیں تخیل میں جماعت انسانی کے اس سے بہتر نظام کے تصور کی کوشش کچھ نئی چیز نہیں ہے۔ یہ کم سے کم اتنی ہی قدیم ہے جتنا فلاطون جس کی "ریاست" نے بعد میں آنے والے فلسفیوں کی خیالی یوٹوپیا کے لئے نمونہ کا کام دیا۔ جو شخص بھی دنیا کو ایک نصب العین کی روشنی میں دیکھتا ہے ـــ خواہ اُسے جس چیز کی تلاش ہے وہ ذہنیت ہو یا فن، محبت ہو یا سیدھی سادی خوشی و مسرت یا ان سب کا مجموعہ ـــ اُس کے دل کو ان بُرائیوں سے ضرور دُکھ پہنچنا چاہئے جنھیں انسان بلا ضرورت جاری رہنے دیتا ہے اور اگر یہ زوردار آدمی ہے اور قوت حیات اپنے اندر رکھتا ہے تو ضرور اُس میں یہ شدید آرزو پیدا ہوگی کہ وہ انسانوں کو اس خیر کی تکمیل کی طرف لے جائے جو اُس کے تخلیقی تصور میں ساری ہے۔ یہی آرزو وہ اصلی قوت ہے جس نے اشتراک اور نراج کے ہمراہیوں کو تحریک دی ہے، جیسے کہ اس سے قبل اسی لئے گزشتہ خیالی نظامہائے ریاست کے مخترعین کے لئے محرک کا کام دیا تھا۔ اس میں کوئی بات نئی نہیں۔ اشتراک اور نراج میں جو بات نئی ہے وہ نصب العین کا وہ قریبی تعلق ہے موجودہ مصائب انسانی سے جس نے تنہا فلسفیوں کی اُمیدوں سے طاقتور سیاسی تحریکوں کی پیدائش ممکن کردی۔ یہ ہے جو اشتراک اور نراج کو اس قدر اہم بناتا ہے اور یہی بات ہے جو انہیں ان لوگوں کے لئے خطرناک بناتی ہے جو جان کر یا بے جانے موجودہ نظام جماعت کی بُرائیوں پر پل رہے ہیں۔

معمولاً مرد عورتوں کی بڑی اکثریت زندگی سے خود اپنے حالات یا اور ساری دنیا کی حالت پر بہ حیثیت کلی غور یا تنقید کئے بغیر گزر جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ جماعت میں کسی خاص جگہ پر پیدا ہوئے ہیں اور ہر نیا دن اپنے ساتھ جو کچھ لاتا ہے اُسے قبول کر لیتے ہیں بلا اس کے کہ محض وقتی ضرورت سے آگے اپنے خیال کو ذرا بھی کام میں لائیں۔ کم و بیش کھیت کے مویشیوں کی طرح جبلی طور پر یہ بس آنی ضروریات کی تسکین چاہتے ہیں، بلا پیش بینی اور بلا اس بات پر دھیان دئے ہوئے کہ کافی کوشش سے ان کی زندگی کے سارے حالات بدل سکتے ہیں۔ ان میں سے فی صدی چند ذاتی حوصلہ کے اثر سے خیال اور ارادہ کی وہ سعی گوارا کرتے ہیں جو انہیں جماعت کے زیادہ خوش نصیب اراکین میں شامل ہونے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ان میں سے بہت ہی کم کو اس سے سروکار ہوتا ہے کہ جو فائدے یہ خود اپنے لئے ڈھونڈتے ہیں وہ دوسروں کے لئے بھی مہیا کریں۔ بس چند ہی کمیاب اور غیر معمولی آدمی ایسے ہوتے ہیں جنھیں ساری نوع انسانی سے وہ محبت ہوتی ہے جو انہیں بُرائی اور فلاکت کے مجموعہ کو صبر سے برداشت نہیں کرنے دیتی بلا لحاظ اس کے کہ اس کو خود ان کی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ یہ چند لوگ ہمدردانہ دکھ کے اثر سے پہلے اپنے خیال میں اور پھر عمل میں رہائی کی کوئی راہ ڈھونڈتے ہیں، جماعت کا کوئی ایسا نظام جس سے زندگی زیادہ مالا مال، خوشیوں سے زیادہ پُر، اور بہ مقابلہ حال قابل اصلاح بُرائیوں سے کم مملو ہو۔ لیکن زمانہ گزشتہ میں یہ حضرات خود اُن لوگوں میں اپنے خیالات سے دلچسپی نہیں پیدا کرا سکے جو ان ناانصافیوں کا شکار رہتے جنکی اصلاح کی انہیں خواہش تھی۔

آبادی کے زیادہ بدنصیب حصے جاہل تھے، مشقت اور تکان کی زیادتی سے بے حس، ارباب قوت کے ہاتھوں فوری سزا پانیکے ڈر سے بزدل اور دبو، اور اپنی تذلیل کے باعث احساس نفس کھو کر اخلاقاً ناقابل اعتماد۔ ان طبقوں میں عام بہبودی کے لئے کسی جانی بوجھی بالارادہ کوشش کا پیدا کرنا ایک ناممکن کام معلوم ہوتا ہوگا اور واقعاً پچھلے زمانہ میں عموماً ایسا ہی

ثابت بھی ہوا۔ لیکن تعلیم کی فراوانی اور مزدوروں میں معیار آرام کے بلند ہو جانے سے موجودہ دنیا میں ایسے نئے حالات پیدا ہو گئے ہیں جو بالکل بنیادی تعمیر نو کے مطالبہ کے لئے پہلے سے بہت زیادہ موافق ہیں۔ سب سے زیادہ تو اشتراکی اور ان سے کم درجہ پر نراجی (خصوصاً وہ لوگ جو پیشہ وارانہ پنچائت بندی کے حامی ہیں) اس مطالبہ کے حامل بن گئے ہیں۔

اشتراک اور نراج دونوں کے متعلق سب سے زیادہ قابل غور بات شاید یہ ہے کہ ایک بہتر دنیا کے نصب العین کے ساتھ وسیع عام تحریکیں منسوب ہیں۔ یہ نصب العین اوّل اوّل کتابوں کے گوشہ نشین مصنفوں نے ترتیب دئے اور تاہم مزدور طبقہ کے طاقتور حصوں نے دنیا کے عملی معاملات میں انھیں اپنا راہنما تسلیم کیا۔ اشتراک کے بارہ میں تو یہ صورت بالکل ظاہر ہے، البتہ نراج کا جہاں تک تعلق ہے یہ بات صرف کچھ تبدیلی کے بعد صحیح کہی جا سکتی ہے۔ نراج بجائے خود کبھی زیادہ پھیلا ہوا مذہب نہیں رہا صرف پنچائت بندی کی تبدیل شدہ شکل میں اسے ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہے۔ برخلاف اشتراک اور نراج کے پنچائت بندی اصلاً کسی نصب العین کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک نظام کا۔ اہل حرفہ کی جماعت بندی کا نظام پہلے قائم ہوا اور پنچائت بندی کے خیالات دراصل وہ خیالات ہیں جو زیادہ ترقی یافتہ فرانسیسی جماعتوں کے نزدیک اس نظام کے لئے مناسب تھے۔ لیکن زیادہ تر یہ خیالات نراج سے لئے گئے ہیں، وہ لوگ جنہوں نے ان خیالات کے لئے قبولیت حاصل کی زیادہ تر نراجی تھے چنانچہ ہم پنچائت بندی کو بازاری نراج خیال کر سکتے ہیں جو ان مختلف تنہا افراد کے نراج سے الگ ہے جس نے پچھلے زمانہ میں بڑی غیر یقینی اور ڈانواڈول زندگی گزاری تھی۔ اس خیال کی رو سے ہم نراجی پنچائت نسبی میں بھی نصب العین اور تنظیم کا ویسا ہی مجموعہ پاتے ہیں جیسا کہ اشتراکی سیاسی جماعتوں میں۔ چنانچہ ہم اسی نقطۂ نظر سے ان تحریکوں کا مطالعہ کرینگے۔

اپنی موجودہ شکل میں اشتراک اور نراج دو مجددوں سے شروع ہوتے ہیں یعنی مارکس اور باکونین جو ساری عمر باہم برسرپیکار رہے اور جن کا انجام بالآخر پہلی بین الملی کانفرنس کا مناقشہ ہوا

ہم اپنا مطالعہ انہیں دو شخصوں سے شروع کرینگے! پہلے اِن کی تعلیم اور پھر وہ جماعتیں جو انہوں نے قائم کیں یا جن پر ان کا اثر تھا۔ اسکے بعد ہم زمانۂ حال میں اشتراک کی اشاعت کا ذکر کریں گے اور پھر اشتراک نے ریاست اور سیاسی کارروائی پر جو زور دیا تھا اُس کے خلاف پنچایت بندی کی بغاوت کا اور نیز بعض ان تحریکوں کا جو فرانس کے باہر رونما ہوئیں لیکن جنہیں پنچایت بندی کی تحریک سے کچھ تعلق ہے ۔ خصوصاً امریکہ کی تحریک "صنعتی کارکنانِ عالم" (I. W. W.) اور انگلستان کا پیشہ وارانہ اشتراک ۔ اس تاریخی تبصرہ کے بعد ہم مستقبل کے بعض ضروری مسائل پر نظر ڈالیں گے اور فیصلہ کرنے کی کوشش کرینگے کہ اگر اشتراکی یا پنچایت بندی کے مقاصد حاصل ہوجائیں تو دنیا کو کن کن باتوں کے اعتبار سے خوشی نصیب ہوگی ۔

میری ذاتی رائے ۔ جس کا اظہار بہتر ہے کہ میں شروع ہی میں کردوں ۔ یہ ہے کہ اگرچہ خالص نراج ہمارا آخری نصب العین ہونا چاہیے جس سے قریب تر ہونے کی کوشش جماعت انسانی کو دائمی طور پر جاری رکھنی چاہیے تاہم یہ فی الحال ناممکن ہے اور اگر اسے اختیار کیا گیا تو زیادہ سے زیادہ ایک یا دو سال سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتا ۔ برخلاف اس کے میرے نزدیک باوجود بہت سے نقائص کے اشتراک اور پنچایت بندی سے ایک ایسی دنیا کے پیدا ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے جو اس دنیا سے بہتر اور خوشتر ہوگی جس میں ہم لوگ زندگی گزار رہے ہیں ۔ لیکن میں ان میں سے کسی کو بھی بہترین قابل عمل نظام نہیں مانتا ۔ مارکسی اشتراک سے مجھے ڈر ہے کہ یہ ریاست کو بہت زیادہ قوت دیدیگا اور پنچایت بندی جو ریاست کو مٹانا چاہتی ہے یہ میں سمجھتا ہوں کہ مختلف پیشہ وار گروہوں کی رقابت کو ختم کرنے کے لئے ایک مرکزی قوت (یا اختیار) کی از سرنو ترتیب پر مجبور ہوگی ۔ بہترین قابل عمل طریقہ میرے نزدیک پیشہ وارانہ اشتراک کا ہی جو ریاست والے اشتراکیوں کے مطالبات اور پنچایت بندی کے حامیوں کے خوف ریاست دونوں کی معقول بات کو یوں تسلیم کرتا ہے کہ مختلف حرفوں میں ایک نظام اتحادی اختیار کرتا ہے ۔ حرفوں کے مابین اس نظام اتحادی کی موافقت بس وہی وجوہ ہیں جو قوموں کے مابین اس تحریک کو پیش پیش کررہے ہیں ۔ ان

نتائج کے وجوہ جوں جوں ہم آگے بڑھینگے واضح ہوتے جائیں گے۔

بنیادی تعمیر نو کی جدید تحریکوں کی تاریخ شروع کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان خصوصیات سیرت پر نظر ڈالی جائے جو اکثر سیاسی عینیت پسندوں کو ممتاز کرتی ہیں اور جن کے متعلق علاوہ تعصب کے اور بعض دیگر وجوہ سے بھی بڑی غلط فہمی ہوتی ہے۔ میں ان وجوہ کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہوں تاکہ یوں اور بھی مؤثر طور پر بتا سکوں کہ انہیں کیوں اس معاملہ میں دخل نہ ہونا چاہیئے۔

زیادہ ترقی یافتہ تحریکوں کے پیشوا اکثر نہایت غیر معمولی بے نفسی کے لوگ ہوتے ہیں، جیسا کہ اُن کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ ان میں اتنی ہی قابلیت ہوتی ہے جتنی کہ اکثر ان لوگوں میں جو بڑے اقتدار کی جگہیں حاصل کر لیتے ہیں تاہم یہ خود واقعات عصر کے حکم نہیں بنتے، نہ دولت حاصل کرتے ہیں اور نہ اپنے انبوہ معاصرین کی مدح سرائی۔ یہ لوگ جنہیں ان انعامات کے حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اور جو کم از کم اتنا ہی کام کرتے ہیں جتنا کہ ان انعاموں کے حاصل کرنے والے لیکن پھر بھی جان بوجھکر ایسی راہ اختیار کرتے ہیں جس سے ان کا حصول ناممکن ہو جائے ان کے متعلق ضرور یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ اپنی زندگی کے لیئے ذاتی ترقی کے علاوہ کوئی اور مقصد رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انکی زندگی کی جزویات میں نفس پرستی کا بھی کچھ میل ہو مگر اس زندگی کا محرک اصلی یقیناً ان کے نفس سے باہر کوئی چیز ہے۔ اشتراک، سوراج اور پنچایت بندی کے ہراولوں نے قید، جلاوطنی اور افلاس کی تکلیفیں سہی ہیں اور جان بوجھ کر کیونکہ یہ اپنی تبلیغ سے باز نہیں آنا چاہتے تھے۔ اپنے اس رویہ سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ جو امید انہیں سہارا دیتی تھی وہ خود اُن کی ذات کے لیئے نہ تھی بلکہ نوع انسانی کے لیئے۔

ہر چند ان لوگوں کی زندگی کی تہ میں زیادہ تر انسانی فلاح کی خواہش ہی کیوں نہ ہو اکثر یہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریر و تقریر کی جزویات میں محبت کے مقابلہ میں نفرت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ بے صبر عینیت پسند — اور بلا تھوڑی سی بے صبری کے انسان مشکل ہی سے مؤثر ثابت ہو سکتا ہے — جب دنیا کو مسرت و خوشی دینے کی کوشش میں مخالفت اور مایوسیوں سے دوچار ہوتا

ہے تو یہ چیزیں تقریباً یقینی طور پر اسے نفرت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اسے اپنی خلوص نیت اور اپنی تعلیم کے حق ہونے کا جس قدر یقین ہوتا ہے اُسی قدر اس غلط تعلیم پر یہ برافروختہ ہوگا۔ عوام کی بے توجہی اور حالات موجودہ کے حامیوں کی دلی مخالفت کی طرف سے تو یہ اکثر کامیابی کے ساتھ ایک فلسفیانہ رواداری کا رویہ اختیار کرے گا۔ لیکن اُن لوگوں کو وہ ہرگز معاف نہیں کر سکتا جو اجتماعی بہبود کی خواہش کے اسی طرح دعویدار ہیں جیسے یہ خود لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے اس کے طریقہ کو قبول نہیں کرتے۔ اس کا وہ شدید یقین جو اُسے اپنے عقاید کی خاطر تکلیفیں برداشت کرنے کے قابل بناتا ہے وہی اس کی نظر میں ان عقاید کو اس درجہ روشن و بین ثابت کر دیتا ہے کہ اس کے خیال میں ہر سمجھدار آدمی جو انہیں رد کرے لازماً بے ایمان ہو اور بدنیتی سے مقصد کے خلاف دغا کرنا چاہتا ہے۔ یہاں سے تراوش کرتی ہے فرقہ بندی کی روح، وہ تلخ و تنگ اذعانیت جو غیر ہر دلعزیز عقیدے میں غلو کرنے والوں پر ایک عذاب کیطرح مسلط ہو جاتی ہے۔ دغابازی کے لئے واقعی اتنی لالچیں موجود ہوتی ہیں کہ شبہ کرنا بالکل فطری بات ہے۔ اور قاید جن جاہ پرستی کو اپنی راہ زندگی کے انتخاب میں دبا دیتے ہیں وہ ضرور دوسری شکل میں رونما ہوتی ہے یعنی فرقہ کے اندر ذہنی اقتدار اور استبدادی طاقت کی خواہش کی شکل میں۔ ان اسباب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنیادی اصلاح کے حامی مختلف مخالف گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، جن میں باہم نہایت تلخ نفرت ہوتی ہے، جو ایک دوسرے پر اس قسم کے الزام لگاتے ہیں کہ یہ پولیس کا تنخواہ دار ہے، جس مقرر یا مصنف کی یہ تعریف کریں اُس سے مطالبہ ہوتا ہے کہ ان کے تعصبات کی من وعن مطابقت کرے اور اپنی ساری تعلیم کو اُن کے اس عقیدہ کا معین بنائے کہ اصلی حقیقت صرف ان کے مذہب کی حدود ہی میں مل سکتی ہے۔ اس کیفیت دماغی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے کے لئے سب سے زیادہ قربانی کی ہے محبت سے زیادہ نفرت کے بندے ہیں۔ اور اذعانیت کا مطالبہ ذہن کے آزاد فعل کے لئے گویا موت

ہی۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ معاشی تعصبات کے باعث ارباب فکر کے لئے یہ بات مشکل ہے کہ وہ ان انتہا پسند مصلحین کا عملاً ساتھ دے سکیں چاہے انہیں ان کے خاص مقاصد سے اور خود اُن کے لائحۂ عمل کے دس میں نو حصوں سے کتنی ہی ہمدردی کیوں نہ ہو۔

ایک اور سبب جس کی وجہ سے عام لوگ ان بنیادی مصلحوں پر غلط حکم لگاتے ہیں یہ ہے کہ یہ موجودہ نظام جماعت کو باہر سے دیکھتے اور اس کی رسوم کی طرف مخالفانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ اکثر انہیں اپنے ہمسایوں کے مقابلہ میں اصلاح و ترقی کے لئے فطرت انسانی کی واقعی صلاحیت پر زیادہ یقین ہوتا ہے تاہم یہ موجودہ رسوم سے پیدا ہونے والی بے رحمی اور تشدد کا اس درجہ احساس رکھتے ہیں کہ دوسرے پر یہ بالکل غلط اثر پڑتا ہے کہ یہ لوگ دنیا سے بیزار ہیں۔ اکثر انسان عام رویہ کے دو مختلف قانون رکھتے ہیں۔ ایک اُن کے لئے جنھیں یہ ساتھی یا ہمعصر یا دوست یا اور کسی طرح "اپنے گلہ" سے متعلق سمجھتے ہوں اور دوسرا اُن کے لئے جنہیں یہ دشمن یا ذات باہر یا جماعت کے لئے خطرہ جانتے ہوں۔ بنیادی مصلح اکثر اپنی تمامتر توجہ جماعت کے اس رویہ پر مجتمع کر دیتے ہیں جو یہ موخرالذکر طبقہ کے ساتھ رکھتی ہے یعنی وہ طبقہ جس کے ساتھ "گلہ" بدظنی رکھتا ہے۔ اس طبقہ میں جنگ کرنیوالے دشمن بھی شامل ہوتے ہیں اور مجرم بھی، ان لوگوں کے ذہن میں، جو موجودہ نظام کا قیام اپنی سلامتی اور اپنے ذاتی حقوق کے لئے لازمی جانتے ہیں، اس طبقہ میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو کسی بڑی معاشی یا سیاسی تبدیلی کے حامی ہوں نیز وہ ساری جماعتیں جن میں اپنے افلاس یا کسی اور وجہ سے خطرناک درجہ تک بے چینی کے احساس کا احتمال ہو۔ معمولی شہری غالباً شاذ و نادر ہی ایسے افراد یا طبقوں پر دھیان کرتا ہے اور زندگی بھر یہ یقین کرتے گزار دیتا ہے کہ وہ خود اور اس کے احباب بھلے آدمی ہیں کیونکہ یہ کسی کو جس سے جماعت کو مخالفت نہ ہو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ لیکن جس شخص کے پیش نظر ان لوگوں کی مصیبتیں ہیں جن سے یہ گروہ نفرت کرتا اور ڈرتا ہے وہ تو بالکل دوسرا حکم لگائے گا۔ ان تعلقات سے حیرت خیز سفاکی پیدا ہو سکتی ہے اور فطرت انسانی کا ایک نہایت بدنما پہلو نمودار ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کے مخالف بعض تاریخی واقعات

کے مطالعہ سے دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داروں اور ریاست نے مزدوروں کے طبقہ کے ساتھ اکثر یہ سفاکی برتی ہے خصوصاً جب کبھی انہوں نے اس ناقابل بیان مصیبت کے احتجاج کی جرأت کی ہے جسمیں موجودہ نظام صنعتی نے انھیں عموماً ڈالدیا ہے۔ چنانچہ معمولی کھاتے پیتے شہری کا جو رویہ موجودہ نظام جماعت کی طرف ہے اُس سے بالکل مختلف صورت یہاں پیدا ہوتی ہے۔ یہ رویہ اتنا ہی صحیح ہوتا ہے جتنا کہ اول الذکر کا، شاید اُسی قدر غلط بھی لیکن اسی طرح واقعات پر مبنی۔ البتہ اس کی بنا اُن واقعات پر ہوتی ہے جن میں جماعت کے تعلقات دوستوں کے ساتھ نہیں بلکہ دشمنوں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

قوم کے طبقوں کی جنگ خود قوموں کی جنگ کی طرح دو مخالف خیال پیدا کرتی ہے اور یہ دونوں یکساں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ ایک مشغول جنگ قوم کا شہری جب اپنے ہموطنوں کا خیال کرتا ہے تو زیادہ تر اس حیثیت سے خیال کرتا ہے جس میں اسے ان کا تجربہ ہوا ہے یعنی دوستوں سے برتاؤ، خاندان سے تعلقات وغیرہ کے اعتبار سے۔ یہ اسے مجموعی طور پر نیک اور بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن جب قوم سے اس کا ملک برسر جنگ ہے وہ اس کے ہموطنوں کو بالکل مختلف تجربوں کی روشنی میں دیکھتی ہے: جیسے یہ جنگ کی سفاکی، مخالف علاقوں پر حملہ وتسلط، یا سیاسی بازیگری کے ہتھکنڈوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ جن انسانوں کے متعلق یہ باتیں صحیح ہیں وہ وہی لوگ ہیں جنھیں ان کے ہموطن شوہر، باپ یا دوست کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن اسکے متعلق بالکل دوسری رائے اس لئے قائم کی جاتی ہے کہ حکم لگانے کی بنیاد بالکل دوسری ہے چنانچہ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو سرمایہ دار کو انقلاب جو مزدور کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ سرمایہ دار کے خلاف بے حد سخت اور غلط حکم لگاتے ہیں کیوں کہ جن واقعات پر انہوں نے اس کے متعلق اپنی رائے قائم کی ہے وہ ایسے واقعات ہیں جنھیں یہ یا تو جانتا نہیں یا عادتہً نظر انداز کر دیتا ہے۔ تاہم یہ رائے جو باہر سے قائم کی جاتی ہے اتنی ہی صحیح ہے جتنی وہ رائے جو اندر سے قائم کی جائے۔ کامل حق کے لئے دونوں ضروری ہیں۔ اور وہ اشتراکی جو خارجی رائے پر زور دیتا ہے دنیا سے بیزار نہیں محض

مزدوروں کا دوست ہے جو اس غیر ضروری مصیبت کے منظر سے پراگندہ دماغ ہو گیا ہے جو سرمایہ داری کی بدولت ان مزدوروں پر پڑتی ہے۔

میں نے یہ عام ملاحظات اپنے مطالعہ کے شروع میں اس لئے رکھدئے ہیں تاکہ پڑھنے والے پر واضح کردوں کہ ہم جن تحریکوں کی تحقیق کرنے والے ہیں ان میں کتنی ہی تلخی اور نفرت کیوں نہ پائی جائے ان کا اصلی سرچشمہ تلخی و نفرت نہیں بلکہ محبت ہے۔ اپنے محبوب کو عذاب و تکلیف پہنچانے والے سے نفرت نہ کرنا بہت دشوار ہے لیکن دشوار ہی ہے، ناممکن نہیں، البتہ اس کے لئے ضرورت ہے ایک ایسی وسعت نظر اور ذہن کی ایسی ہمہ گیری کی جس کا قائم رکھنا شدید مقابلہ و مجادلہ کی حالت میں آسان کام نہیں۔ اگر اشتراکی اور نراجی معقولیت تام قائم نہیں رکھ سکے ہیں تو وہ اس بارہ میں اپنے مخالفوں سے کچھ مختلف نہیں اور اپنے خیالات کے سرچشمہ کے اعتبار سے انہوں نے اپنے کو ان لوگوں سے افضل ثابت کیا ہے جو لاعلمی یا کاہلی کے باعث ان ناانصافیوں اور ظلموں کو تسلیم کرتے ہیں جن سے موجودہ نظام قائم ہے۔

(باقی آئندہ)

عربوں کا تمدن

رسالہ "معارف" کی پچھلی اشاعت میں ڈاکٹر تہیل کی کتاب "عربوں کا تمدن" کا ایک طویل معائب نامہ شائع ہوا ہے۔ سترہ اٹھارہ صفحے کا مضمون، شروع سے لیکر آخر تک نکتہ چینیوں سے پُر۔ تعجب ہوا کہ ایک معمولی سی بات کے لیئے جناب "تنقید نگار" نے اس قدر زحمت کیوں اُٹھائی۔ "عربوں کا تمدن" کوئی محققانہ یا تنقیدی تصنیف تو تھی نہیں۔ اس کے متعلق شروع ہی میں عرض کر دیا گیا تھا کہ یہ عربی تمدن پر ایک مختصر مگر دلچسپ رسالہ ہے جس میں بہت کم باتیں قابل اعتراض ہیں۔ "تنقید نگار" صاحب اگر اس بات کو سمجھ لیتے تو معاملہ اس قدر طول نہ کھینچتا۔

لیکن تنقید نگار صاحب مصنف اور مترجم دونوں سے خفا ہیں۔ مصنف سے اس لئے کہ اس نے دیدہ و دانستہ غلط بیانیوں سے کام لیا اور مترجم سے اس لئے کہ اُس نے مصنف کو ان غلط بیانیوں پر مناسب تنبیہ نہیں کی بلکہ اپنے جوش خوش اعتقادی میں یہاں تک لکھدیا کہ "سوائے ایک آدھ بات کے ساری کتاب مصنف کی دقت نظر، اصابت رائے اور وسیع الخیالی کا ثبوت ہے" حالانکہ مصنف نے جابجا واقعات میں رنگ آمیزی کی ہے، غلط قیاسات اور تدلیس سے کام لیا ہے حتیٰ کہ کتاب کے دوسرے باب کی تو ایک ایک سطر میں "زہر" بھرا ہے۔ بدقسمتی سے مترجم کو نہ تو تنبیہ و تہدید کا کوئی خاص شوق تھا نہ یہ مناسب معلوم ہوتا تھا کہ جناب ناقد کی طرح مصنف کے ہر بیان کی جائز و ناجائز تاویل سے خواہ مخواہ تنبیہ کا موقع پیدا کیا جائے۔ ہماری رائے میں یہ طرز عمل کچھ بہت زیادہ مستحسن نہیں اس لئے کہ جو لوگ دوسروں کی عیب جوئی کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں وہ اکثر اپنی ہی تنگ نظری اور خوئے اعتراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے غلط نہیں۔ جناب ناقد کے تمام اعتراضات پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انہوں نے محض نکتہ چینی کی خاطر نکتہ چینی کی ہے۔ البتہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے ان کا مطلب کیا تھا۔ سلئے

کہ ایسا کرنے میں نہ تو انہوں نے کوئی علمی خدمت سرانجام دی ہے اور نہ اپنی معارف پروری کا کوئی بہتر ثبوت پیش کیا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں تھی لیکن ہمارے تنقید نگار صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو "مستشرقانہ فضیلت" کے سرے ہی سے قائل نہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"کتاب کے پہلے باب میں جغرافیۂ عرب، عرب کی قدیم مشہور حکومتوں ...... کا تذکرہ ہے ...... عربوں کی ان مختلف حکومتوں کے زمانۂ عروج کی تعیین ارباب تاریخ و ماہرین کتبات کا ایک مستقل موضوع رہا ہے اور اس کے متعلق اہل علم کے مختلف نظریے معروف ہیں۔ اس موقع پر اگر مصنف نے اپنے دیگر ہم وطن جرمن ماہرین آثار وکتبات کے نظریوں کو اختیار کیا ہے تو کوئی حیرت انگیز امر نہیں (حیرت انگیز امر یہ ہے کہ آپ نے اپنے نظریوں کا اظہار نہیں فرمایا۔ نیازی) لیکن اس موقع پر مصنف کے اس نظریے پر خاص توجہ کی ضرورت تھی کہ عربوں میں فقدان وحدت اور ایک قوم ہونے کے نہ (!) احساس رکھنے سے یہ نتیجہ کیونکر اخذ ہوتا ہے کہ ان میں اطاعت و فرمانبرداری کا مادہ موجود نہ تھا (محض اس لئے کہ یہ ایک مستشرق کا خیال ہے۔ نیازی) یہاں تک کہ وہ اپنے سرداروں کی اطاعت بھی نہیں کرتے (مصنف نے کہیں یہ نہیں لکھا۔ نیازی) پھر مصنف نے اپنے اسی نظریے سے (جناب ناقد کے نزدیک۔ نیازی) آگے چلکر (یعنی دوسرے باب میں۔ نیازی) یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے ان میں اسی وصف کو پیدا کر کے اپنی شاعت کی (گویا یہ خیال غلط ہے کہ اسلام نے عربوں میں اطاعت و فرمانبرداری کی روح پیدا کی۔ نیازی) حالانکہ عربوں کا اپنے سرداروں کی اطاعت ایک نمایاں وصف کے طور پر مخصوص شیوہ سمجھا جاتا ہے۔ عہد جاہلیت کا وہ زمانہ جو اسلام سے قریب تر تھا اس میں ان کے فقدان وحدت اور ایک قوم ہونے کے نہ (!) احساس رکھنے سے اگر کوئی نقص تھا تو یہ تھا کہ حکومت کے فرائض کسی مرکزی شخصیت یا جماعت کے سپرد ہونے کی بجائے قبائل کے سرداروں کے ہاتھ میں تھے اور اس وقت حکومت کی کوئی تشکیل نہیں تھی

(بہت خوب ! حکومت کی کوئی تشکیل ہی نہیں تھی اور حکومت کے فرائض سرداران قبائل کے ہاتھ میں تھے۔ نیازی) ورنہ جہاں تک سرداروں کے اقتدار کا تعلق ہے وہ اپنے قبائل کے ایک ایک فرد پر مطلق العنان حاکم تھے اور بچہ بچہ ان کی اطاعت پر تیار رہتا۔ اسلئے اگر واقعی آنحضرت صلعم کے پیش نظر دعوت اسلام پیش کرتے وقت بقول مصنف کسی متحدہ حکومت کا خاکہ ہوتا (نہ مصنف نے کہیں یہ کہا ہے کہ دعوت اسلام پیش کرتے وقت آنحضرت صلعم کا یہ مقصد تھا نہ وہ تنقید نگار صاحب کی "متحدہ حکومت" کا مطلب سمجھتا ہے۔ نیازی) تو آنحضرت صلعم غلاموں، لاوارثوں اور غربا میں دعوت اسلام پیش فرمانے کی بجائے (آنحضرت صلعم نے امیر و غریب کسی کو اپنی دعوت سے محروم نہیں رکھا۔ نیازی) سرداران عرب کو اتحاد باہمی کی دعوت دے کر کسی ایک نقطے پر جمع فرماتے (یہ "کوئی ایک نقطہ" خود بخود کہاں سے آ گیا؟ نیازی) اور نہایت آسانی سے متحدہ عربی حکومت کی بنا ڈال سکتے تھے خصوصاً جبکہ قبائل عرب پر خاندان عبدالمطلب کو ایک عام تفوق حاصل تھا اور عبدالمطلب واقعہ فیل میں عرب کی (عرب کی؟ نیازی) رہنمائی کر چکے تھے (تنقید نگار صاحب کو یقین ہے کہ سرداران عرب بغیر کسی مزاحمت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کو قبول کر لیتے اور چونکہ ہر سردار اپنے قبیلے کا مطلق العنان حاکم تھا اس لئے بغیر کسی سیاسی اور ذہنی انقلاب کے تمام عرب میں "متحدہ عربی حکومت" قائم ہو جاتی۔ نیازی)۔

یہ نتائج صرف تنقید نگار صاحب کے قائم کردہ ہیں۔ مصنف کی تحریر سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ ہم قارئین کرام کی توجہ کتاب کی اصلی عبارت کی طرف منعطف کرائیں گے:۔

"عربوں میں جس چیز کی کمی تھی وہ وحدت قومی کا خیال ہے۔ ان کو خاندان اور قبیلے کا وجود تو نظر آتا تھا لیکن ایک قوم ہونے کا احساس نہ تھا۔ اس کے علاوہ ان میں یہ نقص تھا کہ ان میں اطاعت کا مادہ موجود نہیں تھا (یعنی اسی ایک قوم ہونے کے سلسلے میں۔ نیازی) ان کے اندر کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ اطاعت ضروری ہے بلکہ بعض موقعوں پر ایک طرح کی

خوبی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا تھا جس کی وہ عزت و احترام بھی کرتے تھے لیکن نہ کسی سردار کو حکومت کرنے کا حق حاصل تھا نہ ان کی اطاعت کرنا کسی کا فرض تھا؟ (صفحہ ۲۰)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف کو صرف عربوں کی سیاسی پستی کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر فرد قبیلہ کو اپنے سردار سے جو تعلق تھا وہ کسی سیاسی مفاہمت پر مبنی نہیں تھا۔ نہ وہ اس وسیع مفہوم میں انضباط جماعت اور اطاعت کی خوبیوں سے آشنا تھے۔ مگر تنقید نگار صاحب کے نزدیک ان میں یہ سب اوصاف موجود تھے البتہ "ایک قوم ہونے کے نہ احساس رکھنے سے ان میں کوئی نقص تھا تو یہ تھا کہ حکومت کے فرائض کسی مرکزی شخصیت یا جماعت کے سپرد ہونے کی بجائے سرداران قبائل کے ہاتھ میں تھے" حقیقت تو یہ ہے کہ عربوں کو اس قسم کے سیاسی اور اجتماعی ادارات کا احساس ہی نہیں تھا ورنہ ظاہر ہے کہ جہاں تک قبائلی عصبیت کا تعلق ہے مصنف کو اس سے انکار نہیں۔ مصنف نے لکھا ہے "ان میں ایک ناقابل علاج مخصوصیت پیدا ہوگئی تھی جس کے ماتحت ہر قبیلہ اپنے آپ کو کافی بالذات سمجھتا تھا صفحہ ۱۵" اور "ابتک وہاں جو عصبیت پائی جاتی تھی اس کا تعلق صرف خاندان سے تھا۔ صفحہ ۲۶"۔ چنانچہ آگے چل کر جہاں مصنف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے (دوسرے باب میں۔ نیازی) کہ نماز کے اخلاقی اثرات سے مسلمانوں میں مساوات انسانی کا احساس پیدا ہوا اور اس سے عرب اطاعت و فرمانبرداری کی خوبیوں سے واقف ہوئے اور اس طرح اس نے اسلام کے مقاصد عالیہ کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اسلام کی ابتدا ہی سے یہ خواہش تھی کہ وہ خاندان اور قبائل کے تنگ رشتوں کو توڑ ڈالے" تو اس سے ناقد صاحب نے محض اس لئے انکار کر دیا کہ یہ خیالات ایک مستشرق نے ظاہر کئے ہیں اور اگر انہوں نے خدانخواستہ یہ تسلیم کر لیا کہ اسلام نے عربوں کو اطاعت و فرمانبرداری سکھائی، ان میں نظم و انضباط کا مادہ پیدا کیا تو اس سے غالباً یہ یقین کر لینا لازم آجائیگا کہ "دعوت اسلام پیش کرتے وقت آنحضرت صلعم کے پیش نظر متحدہ عربی حکومت"

کا خاکہ تھا۔ ان کی رائے میں اگر آگے چلکر "متحدہ عربی حکومت" قائم ہوئی تو اس میں رسول اللہ صلعم کو کوئی دخل نہیں تھا۔ بہرحال مصنف نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ "دعوت اسلام پیش کرتے وقت آنحضرت صلعم کے سامنے "متحدہ عربی حکومت" کا خاکہ موجود تھا" لیکن جس طرح اس "متحدہ عربی حکومت کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی اسی طرح یہ بھی پتہ نہ چلا کہ اگر اسلام کی بدولت عربوں میں اطاعت و فرمانبرداری کے اوصاف پیدا ہوئے اور ان سے اسلام کی اشاعت میں بھی ترقی ہوئی تو اس میں کونسی عیب کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے تنقید نگار صاحب جہاد بالقلم پر آمادہ تھے اور بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ اسلام کی حمایت و مدافعت کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔ انہیں اس امر کا مطلق خیال نہیں تھا کہ اپنے استدلالات پر تھوڑا سا غور بھی فرما لیتے۔

تقریباً یہی کیفیت ان اعتراضات کی ہے جو جناب ناقد صاحب نے "عہد رسالت کے مستشرقانہ تبصرے" پر فرمائے ہیں۔ افسوس ہے انہوں نے مصنف کی "زہر چکانی" اور مترجم کی "خموشی" پر تو اظہار افسوس فرمایا لیکن اپنی مناظرانہ شان کا مطلق خیال نہیں کیا۔ مصنف نے لکھا ہے "چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں وسطی عرب اور اس کے مرکزی علاقہ حجاز میں جہاں اس سے بیشتر مذہب پر کوئی غور نہیں کرتا تھا لوگوں کے اندر ایک بہتر مذہب کی جستجو کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ وہ نہ صرف یہودیت اور عیسائیت سے واقف تھے بلکہ ان میں سے بعض ان مذاہب کو قبول بھی کر چکے تھے" صفحہ ۲۴ "عرب اور بالخصوص مکہ کے کچھ لوگ اس وقت کے مذہب سے غیر مطمئن ہو کر یہودیت اور عیسائیت میں ہدایت ڈھونڈتے تھے۔ انہوں نے ایک قسم کا انتخابی مذہب قائم کر لیا تھا...... یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلعم کا ظہور ہوا اور لوگوں نے آپ کا شمار انہیں متلاشیان حق میں کیا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی" صفحہ ۲۱۔ مصنف کے نزدیک نماز کی انضباطی اور تعلیمی قدر کا اندازہ اس امر سے کرنا چاہیئے کہ "اس کا آغاز ان معروف لوگوں میں ہوا...... جن کو اطاعت اور فرمانبرداری کا مطلق احساس نہیں تھا۔ اگر ہم اتنا خیال کر لیں تو اس سے یہ بات سمجھ میں آجائیگی کہ ضوابط کے احساس اور ان کے قیام میں اس طریق

عبادت کو کیا اہمیت حاصل ہے ...... نماز باجماعت سے ..... مسلمانوں میں عصبیت پیدا ہوئی ..... ان میں مساوات انسانی کا احساس قائم ہوا" صفحہ ۲۶۔ اس کی رائے میں اہل مکہ نے آنحضرت صلعم کی مخالفت کی تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ "مکہ کے حکمران قبائل کو آنحضرت صلعم کی تعلیمات کی مخالفت کا اس قدر خیال نہیں تھا جس قدر وہ ان معاشرتی اور سیاسی انقلابات سے خائف تھے جو ان سے مترتب ہو رہے تھے" صفحہ ۲۷۔ آنحضرتؐ کی ہجرت کا حال بیان کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے "آنحضرت صلعم تبلیغ اسلام کی خاطر کئی سال سے عکاظ کے میلے میں شریک ہو رہے تھے ..... یہ درست ہے کہ آنحضرتؐ کو اس قدر کامیابی نہیں ہوئی جیسی کہ آپ کو توقع تھی۔ بایں ہمہ ان میں سے بعض کو رفتہ رفتہ آپ کی تعلیمات سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ یہ اہل یثرب تھے ...... ان لوگوں نے آنحضرت صلعم کی باتوں کو بڑی ہمدردی اور توجہ سے سنا۔ ۶۲۰ء میں ان کے چند آدمی آنحضرتؐ کے مقاصد کے حامی بن گئے" صفحہ ۲۸۔ لیکن جناب تنقید نگار صاحب نے اس سے جو نتائج مرتب کئے ہیں ان سے ان کی دیانت تنقید کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"مصنف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عربوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اختلاط سے ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو دین حق کی جستجو میں سرگرداں تھا۔ آنحضرت صلعم اسی گروہ میں پیدا ہوئے اور آپ حالات وقت کے مناسب ایک مذہب کی دعوت دیتے ہیں (تنقید نگار صاحب اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ مصنف کے نزدیک دعوت اسلام پیش کرتے وقت آنحضرتؐ کے پیش نظر "متحدہ عربی حکومت" کا خاکہ تھا۔ نیازی) عربوں میں اطاعت و انضباط کی کمی تھی۔ آپ اپنی دوراندیشی سے اس کمی کو نماز باجماعت سے پورا کرتے ہیں جس سے امام کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ مساوات انسانی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور مکہ میں ایک مضبوط جماعت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی دین اسلام کی اساس ہوتی ہے لیکن شرفائے مکہ اس تحریک کو پھولنے پھلنے نہیں دیتے۔ آپ حج کے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر یثرب کی خانہ جنگیوں کو

(نعوذ باللہ) بھانپتے ہیں اور ایک "داعی امن" کی حیثیت سے اپنی جماعت کے ساتھ مدینہ میں
پہنچتے ہیں۔"

یہ صحیح ہے کہ آنحضرت صلعم کی مدنی زندگی پر مصنف نے چند ناروا الزامات قائم کئے ہیں۔ بایں ہمہ اسے اعتراف کرنا پڑا ہے کہ "عرب کے ہر حصے سے سفارتیں آئیں تاکہ وہ سیاسی نقطہ نظر سے قبولیت اسلام کے مسئلے پر غور کریں لیکن آنحضرت نے اپنے اصلی مذہبی مقصد کو نہیں چھوڑا..... آپ چاہتے تھے کہ لوگ صرف ان اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس کریں جو خدا کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں..... آپ نے خدا کے نام پر شرک کو مٹایا....." صفحہ ۴۴۔ بہر حال مترجم نے مصنف کے ان تمام غلط خیالات کی نفی کر دی تھی جو اس نے آنحضرت صلعم کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ مگر تنقید نگار صاحب اس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ غالباً وہ یہ چاہتے تھے کہ مترجم حواشی کی بجائے مصنف کے اعتراضات کی تردید میں ترجمے کے ساتھ ساتھ ایک جدید تصنیف کا آغاز کر دیتا چنانچہ انہوں نے مصنف کے ان الزامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"انگریزی مترجم نے اس موقع پر گبن اور جسٹس امیر علی کی تاریخ کے مختلف اقتباسات جا بجا درج کئے ہیں جو مصنف کے بیانات سے مختلف ہیں (تنقید نگار صاحب کا خیال غلط ہے۔ گبن اور جسٹس امیر علی کی تاریخ کے اقتباسات بھی "نیازی صاحب" ہی کے پیش کردہ ہیں۔ نیازی) اور نیازی صاحب نے اپنے حاشیہ میں سلسلۂ غزوات کے وجوہ مولینا شبلی کی سیرت النبی سے اخذ کر کے پیش کر دئے۔ پھر مصنف کے چند فقروں اور خیالات کو نقل کر کے اپنی ان سے برأت کر دی جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض تھے لیکن اول تو جس قدر فقرے نقل کئے گئے ہیں اُن کے ماسوا اس باب میں جا بجا زہر موجود ہے۔ اس کے علاوہ جو فقرے نقل کئے گئے ہیں وہ تو محض واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں (اگر فقروں سے تنقید نگار صاحب کی مراد وہ فقرے ہیں جو مترجم نے مصنف کے غلط بیانات کی تردید میں اس کی تحریر سے اقتباس کئے ہیں تو اس سے بہتر مصنف کی غلط بیانی کے ازالہ کی اور

کی صورت ہو سکتی تھی۔ تنقید نگار صاحب کو اس امر پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ اگر بقول ان کے "یہ فقرے واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں" ۔۔ ہم تنقید نگار صاحب کی عبارت بعینہٖ نقل کر رہے ہیں ۔۔ تو ظاہر ہے کہ مصنف کو آنحضرت صلعم کی صداقت کا اعتراف ہے ۔ نیازی) ہمارا ان نتائج سے انکار کرنا اس وقت تک قطعی بے سود ہے جبتک ہم نفس واقعات کی تصدیق یا تکذیب نہ کرلیں (عبارت کی ترتیب مدنظر رہے ۔ ایک ہی جملے میں پہلے مصنف کے فقروں کی حیثیت نتائج کی سی تھی ۔ ایسے نتائج جو مترجم نے تسلیم کئے اور ان کو مصنف کی غلط بیانی کے جواب میں نقل کیا لیکن اب دفعتہً اس کے معنی ان نتائج کے ہو جاتے ہیں جو واقعات سے پیدا کردہ ہیں اور جن سے مترجم انکار کر رہا ہے پوری عبارت ملاحظہ ہو" <u>اس کے علاوہ جو فقرے نقل کئے گئے ہیں وہ تو محض واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں ہمارا ان نتائج سے انکار کرنا اُس وقت تک قطعی بے سود ہے</u>"۔ نیازی) جن سے وہ نتائج اخذ کئے گئے ہیں اس لئے نیازی صاحب کو صرف ان چند فقروں سے (وہی جو واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں اور جن سے ہم انکار بھی کر رہے ہیں مگر جن کو ہم نے نقل بھی کیا ہے ۔ نیازی) محض اسلامی نقطۂ نظر کی بنا پر بے زاری ظاہر کرنا ان کے پہلو کو اور بھی کمزور کر دیتا ہے (یہ کیسے؟ اور وہ گبن، جسٹس امیر علی مرحوم اور سلسلۂ غزوات کے وجوہ جو مولینا شبلی کی سیرت النبی سے ماخوذ ہیں کیا بیکار ہی ثابت ہوئے ۔ کیا گبن، امیر علی اور شبلی کو واقعات کی تصدیق و تکذیب سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس ہیچمدان کی طرح ان کا پہلو بھی کمزور ہو گیا ہے؟ پھر یہ فقروں کا گورکھ دھندا ہماری سمجھ میں نہ آیا ۔ یہ پتہ نہ چلا کہ ان سے تنقید نگار صاحب کا مطلب آیا ان فقروں سے ہے جن سے ہم انکار کر رہے ہیں یا جن کو ہم مصنف کی غلط بیانی کی تردید میں نقل کر رہے ہیں ۔ بہرکیف ہماری حیثیت ظاہر ہے ۔ ہم نے کہیں بھی مصنف کے ایسے فقرے نقل نہیں کئے جو قابل اعتراض ہوں ۔ ہم نے صرف دو حاشیوں میں مصنف کے وہ "فقرے" نقل کئے ہیں جن سے خود اُس کے قائم کردہ اتہامات کی تردید ہوتی ہے ۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۳ حاشیہ (۳)

"مصنف نے ابھی یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آنحضرتؐ صرف یہ چاہتے تھے کہ اپنے آپ کو اور اپنے پیرؤوں کو اہل مکہ کے تشدد سے محفوظ رکھیں۔ اس حالت میں یہ کہنا کہ آنحضرت مکہ پر فوج کشی کرنا چاہتے تھے کس قدر ناانصافی ہے" اور صفحہ ۴۴ حاشیہ (۱) "یہاں مصنف نے خود سے یعنی یہ لکھکر کہ آنحضرت نے اپنے اصلی مذہبی مقصد کو نہیں چھوڑا ــــ اپنے سابقہ بیان کی کہ وہ شخص جس نے مکہ سے ہجرت کی اور وہ شخص جواب مدینہ میں داخل ہوا دو بالکل مختلف آدمی معلوم ہوتے ہیں ..... کی تردید کی ہے"۔ نیازی) ضرورت تو اس کی تھی کہ نفس (؟)، اِن واقعات کی صحت، ترتیب وقوع اور اُن کے اسباب وعلل پر اپنے ذاتی مذہبی جذبہ سے علیحدہ ہو کر محض تحقیقی نقطہ نظر سے غور کرتے اور پھر اسی معیار پر مصنف کے قائم کردہ نظریوں اور پیش کردہ نتائج کو جانچتے (اب اس تحقیقی نقطہ نظر اور واقعات کی جانچ کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ نیازی) مثلاً مصنف نے مکہ میں اسلام کی کامیابی اور پھر عام عربوں میں قبولِ اسلام کا راز نماز باجماعت کو قرار دیا ہے اور لکھتا ہے :۔"

"نماز باجماعت ..... ایسی ہی قدیم ہے جیسا کہ خود اسلام ...... اس کا آغاز ان معزز (متن میں معزز کی بجائے مغرور ہے۔ نیازی) لوگوں میں ہوا جنہوں نے آج تک کسی اجنبی کے سامنے گردن نہیں جھکائی ..... اگر ہم اتنا خیال کرلیں تو یہ بات سمجھ میں آجائیگی کہ ضوابط کے احساس اور اُن کے قیام میں اس طریق عبادت کو کیا اہمیت حاصل ہے ... ... نماز باجماعت میں باقاعدہ اجتماع سے مسلمانوں کے اندر عصبیت پیدا ہوئی اور ان میں مساوات انسانی کا احساس ہوا ...... اور اس سے خاندان اور قبائل کے تنگ اتحاد پر ایک کاری ضرب پڑی (کیا اس سے ہم یہ نتیجہ مترتب کریں کہ اس طرح اسلام کی اشاعت ہوئی ؟ نیازی)۔

"آخر نماز باجماعت کا نتیجہ مصنف کے خیال کے مطابق یہ ہوا کہ :۔

"مکہ کی اس جماعت میں نہ صرف قبیلہ وارانہ اختلافات مٹ چکے تھے بلکہ آقا و غلام

کا قدیم امتیاز بھی خطرے میں تھا" (شاید ان الفاظ سے یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ نماز با جماعت
کی بدولت عام عربوں میں اسلام پھیلا۔ نیازی)

مترجم کا خیال تھا کہ اب عنقریب تنقید نگار صاحب کی تحقیق و اجتہاد کے طفیل ایک ایسے نکتے کا انکشاف ہوگا جس سے اس کا پہلو مضبوط ہو جائے گا لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ یہی ایک عبارت ہے جس کے جزوی اقتباسات سے تنقید نگار صاحب بار بار نئے نتائج مترتب کرتے ہیں۔ پہلے انہوں نے اس کا جوڑ "عربوں کے ایک قوم ہونے کے احساس نہ رکھنے" سے مترتب شدہ نتائج سے ملایا تھا۔ اب ان کے نزدیک اس عبارت کے معنی یہ ہیں :۔

"اب دیکھئے مصنف نے یہ تمام قیاسات و نتائج صرف اس پر استنباط کئے کہ آنحضرت صلعم نے مکہ میں نماز باجماعت قائم کی اور اسی سے اسلام نے ترقی کا راستہ دیکھا....... حالانکہ.... نماز باجماعت کا حکم..... اُس وقت ہوا..... جب آپ مکہ سے مدینہ تشریف لا چکے تھے...... یہ صحیح ہے کہ نماز باجماعت سے عبادت کے ماسوا انسان کی اخلاقی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے اور اس سے عصبیت کے دائرے کو توڑنے اور مساوات انسانی کا احساس پیدا کرنے کے اثرات بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن نماز باجماعت کے یہ اثرات مدینہ کی زندگی کے واقعات ہیں نہ مکہ کی (گویا جب تک مسلمانوں نے ہجرت نہیں کی تھی جب تک ان میں یہ اوصاف موجود نہیں تھے ؟ نیازی) وہاں تو ایک آدمی کا بھی تنہا نماز پڑھنا مشکل تھا چہ جائیکہ ایک جماعت (کیا تنقید نگار صاحب کا یہ مطلب ہے کہ مکہ میں لوگ نماز نہیں پڑھتے تھے اور اگر پڑھتے تھے تو اس کا ان کی اخلاقی زندگی پر کوئی گہرا اثر نہیں پڑتا تھا ؟ نیازی) لیکن مصنف نے اس موقع پر تدلیس سے کام لے کر نماز باجماعت کو مدنی احکام میں شمار کرنے کی بجائے اُسی قدر قدیم بتایا ہے جس قدر اسلام..... اس کے خیال کے مطابق آپ چاہتے تھے کہ مدینہ کی جماعت کو اپنا ہمدرد بنالیں (کیا تنقید نگار

صاحب کے نزدیک آنحضرت صلعم ایسا نہیں چاہتے تھے؟ نیازی) ان حالات میں مصنف سے سوال ہوسکتا ہے ایسی حالت میں مدینہ میں آکر غلاموں کا آقا سے آزاد کرنا۔ قبائل کو اپنی عصبیت سے روکنا کیا نعوذ باللہ آپ کے مدنی اصول سیاست کے برخلاف ثابت نہ ہوگا؟ کیا آپ اپنے اس طرز عمل سے مدینہ کی تمام جماعت کو اپنا ہمنوا بنا سکتے تھے..... کیا آپ کو اسے ملتوی کر دینا نہ تھا۔ لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ میں جہاں مصنف کے خیال کے مطابق اس کی ضرورت تھی آپ اس کو قائم کرنے کا موقع نہیں پاتے اور مدینہ میں جہاں مصنف کے نظریوں کے مطابق اس کو روکنے کی ضرورت تھی آپ جاری فرماتے ہیں۔"

اس عبارت کا مطلب تو کچھ تنقید نگار صاحب ہی خوب سمجھتے ہونگے البتہ یہ امر غور طلب ہے کہ اگر ایک لحظے کے لئے مصنف کے انہی "نظریوں" کو صحیح مان لیا جائے جو تنقید نگار صاحب کے ذہن میں ہیں تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ مدنی زندگی میں نماز باجماعت معہ اپنے تمام اخلاقی اثرات کے آنحضرت صلعم کے اصول سیاست کے برخلاف ثابت ہوتی۔ نماز کا مسلمانوں میں عصبیت، مساوات انسانی کا احساس اور نظم و انضباط پیدا کرنا اُسی طرح آنحضرت صلعم کے مقصد سیاست کے لئے مفید ثابت ہوتا جس طرح (نعوذ باللہ) "نبوت سے آپ کی شان ریاست میں اضافہ ہو رہا تھا۔" بہر کیف مصنف کی اصلی عبارت یہ ہے:۔

"نماز یا نماز باجماعت..... ایسی ہی قدیم ہے جیسا کہ خود اسلام۔ غالباً اس طریق عبادت کا خیال یہودیت اور عیسائیت کا پیدا کردہ ہے لیکن اس کی اصلیت کچھ بھی ہو مسلمانوں میں اسے خاص قوت اور اہمیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کی اس خواہش سے کہ مفروضہ رکوع و سجود ٹھیک طور سے ادا ہوں نماز باجماعت کا آغاز ہوا..... جس کسی نے مسلمانوں کو باقاعدہ صفوں میں...... نماز ادا کرتے دیکھا ہے وہ اس انضباطی عبادت کی تعلیمی قدر کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے...... اس کا آغاز ان مغرور لوگوں میں ہوا...... جن کو اطاعت و فرمانبرداری کا مطلق احساس نہیں تھا۔ اگر ہم اتنا خیال کرلیں تو یہ بات سمجھ....

میں آجائیگی کہ ضوابط کے احساس اور ان کے قیام میں اس طریق عبادت کو کیا اہمیت حاصل ہے ...... نماز باجماعت سے ...... مسلمانوں میں عصبیت پیدا ہوئی اور ان میں مساوات انسانی کا احساس قائم ہوا۔ عرب میں یہ خیالات نہایت عجیب تھے۔ اب تک وہاں جو عصبیت تھی اس کا تعلق صرف خاندان سے تھا ہر شخص کو اپنی دولت و قوت پر ناز تھا ...... اپنے سے کم رتبہ لوگوں سے نفرت کرتا تھا۔ عربوں کی زندگی کے یہ دو نمایاں پہلو تھے۔ لہذا جب آنحضرت صلعم نے ایک ایسا اتحاد قائم کر دیا جس میں امیر و غریب سب کو مساویانہ حیثیت حاصل تھی تو اس سے متفرق و منتشر عربوں کے اتحاد و اتفاق کا دروازہ کھل گیا۔ اسلام کی ابتدا ہی سے یہ خواہش تھی کہ وہ خاندان اور قبائل کے تنگ رشتوں کو توڑ ڈالے ......

نماز باجماعت کے علاوہ معاشرتی مساوات کا احساس بھی اسلام کا پیدا کردہ ہے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ غربا کی امداد اور اُن کی کفالت نے ایک مذہبی فریضہ کی شکل اختیار کر لی ...... بلکہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہر مسلمان پر فرض قرار پائی" صفحہ ۲۶

سطور بالا سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے کہیں بھی نماز و زکوٰۃ کی تاریخ لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف اس اخلاقی انقلاب کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اسلام کا مرہون منت ہے۔ آنحضرت صلعم کی مکی زندگی کے حالات مصنف نے آگے چلکر بیان کرنا شروع کئے ہیں جیسا کہ صفحہ ۲۰ کے آخری پیراگراف کے ابتدائی الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے "بدقسمتی سے آنحضرت صلعم کے پہلے دس سال کی زندگی ...... کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں" اسی سلسلے میں اس نے قریش کی مخالفت کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ " اہل مکہ ان معاشرتی اور سیاسی انقلابات سے خائف تھے جو آنحضرت صلعم کی تعلیمات سے مترتب ہو رہے تھے ...... مکہ کی اس جدید جماعت میں نہ صرف قبیلہ وارانہ اختلافات مٹ چکے تھے بلکہ آقا و غلام کا قدیم امتیاز بھی خطرے میں تھا" صفحہ ۲۷۔ مصنف نے اس دوران میں کہیں نماز باجماعت کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تنقید نگار نے اس موقع پر "تدلیس" سے کام لیکر موضوع بحث

کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

اس کے بعد جناب ناقد صاحب آنحضرت صلعم کی سادہ زندگی اور بنائے منبر کی بحث چھیڑتے ہوئے مصنف کو ناجائز تاویلات کا ملزم ٹھہراتے ہیں حالانکہ مصنف کے الفاظ صرف اس قدر ہیں "لوگوں سے ملنے جلنے میں آنحضرت صلعم نے یہاں تک سادگی اور انکسار سے کام لیا کہ آپ نے نماز میں بھی اپنے لئے کوئی خاص جگہ معین نہیں کی۔ جب آپ مسلمانوں سے خطاب کرتے تو کھجور کے تنوں میں سے کسی ایک سے ٹیک لگا لیتے۔ البتہ وفات سے دو برس پہلے آپ نے اپنے لئے ایک اونچی نشست تعمیر کرائی جس پر آپ اُس وقت بیٹھتے جب آپ کو کسی ایلچی یا سفیر سے ملنا ہوتا تھا یا جب آپ جماعتی امور پر غور فرماتے یا مقدمات کا فیصلہ کرتے۔ یہ منبر ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا......اس نہایت سادہ نشست سے رفتہ رفتہ عیسائی اثر کی بنا پر منبر کی بنا پڑی۔" صفحہ ۱۳۱۔ تنقید نگار صاحب کہتے ہیں کہ مصنف کو اس میں ترفع اور تفوق کی جھلک نظر آتی ہے اور پھر اس مفروضہ الزام کی تردید میں مختلف روایات کا اقتباس پیش کرتے ہوئے بیکار اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہے جناب ناقد صاحب کا باب التقریظ والانتقاد؟

اسی طرح مصنف کے دوسرے بیانات کے متعلق تنقید نگار صاحب نے جس بدگمانی اور سوئے ظن سے کام لیا ہے اس سے ہمیں نہایت افسوس ہُوا۔ اختصار بیان کی کوشش میں کہیں کہیں مصنف سے کچھ فروگزاشتیں ہوگئی ہیں۔ پانچویں باب میں بہت سی بحثیں تشنہ رہ گئی ہیں۔ بہت سی باتوں میں سلسلہ تحقیق و تفتیش مکمل نہیں ہوا۔ کلیسائے یوحنا اور ہیکل سلیمانی کے متعلق بھی مصنف کی روایات صحیح نہیں۔ حضرت عمرؓ کے متعلق اگرچہ مصنف کا یہ خیال صحیح ہے کہ "آپ کسی غیر عرب کو عرب کے برابر نہیں سمجھتے تھے" لیکن یہ صحیح نہیں کہ "آپ بالقصد عربیت کو فروغ دینا چاہتے تھے یا آپ نے اُن معاہدوں کا خیال نہیں کیا جو یہود و نصاریٰ سے ہوئے"۔ بایں ہمہ مترجم نے مصنف کی ان لغزشوں کو کچھ بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بعض ضروری فروگزاشتوں پر حواشی میں گرفت کر دی گئی ہے لیکن بعض غلطیوں کو محض اس لئے نظرانداز کر دیا کہ ان کی

حیثیت جزوی اور ضمنی باتوں کی سی تھی اور کتاب کے اصلی مباحث پر ان کا چنداں اثر نہیں پڑتا تھا لیکن تنقید نگار صاحب مترجم کے اس انداز سے خوش نہیں ہوئے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ مترجم ذرا ذرا سی بات پر مصنف سے دست و گریباں ہو جاتا۔ اتفاق سے ان کو بعض فتوحات کے سنین میں اختلاف ہے۔ ان کی رائے میں:-

"بیت المقدس کی فتح سنہ ۱۵ھ میں بتائی گئی ہے حالانکہ صحیح روایت رجب سنہ ۱۶ھ ہے۔ قادسیہ کی جنگ کو سنہ ۱۶ھ میں بتایا ہے حالانکہ وہ محرم سنہ ۱۴ھ میں پیش آئی...... برقہ کی فتح کو سنہ ۲۲ھ میں قرار دیا ہے حالانکہ سنہ ۲۱ھ میں واقع ہوئی۔ سب سے پرلطف قبرس کی فتح کا سنہ ہے صفحہ ۵۶ پر ہے سنہ ۲۸ھ میں...... قبرس فتح کرلیا آگے چلکر یہی سنہ ۳۴ھ ہو جاتا ہے ...... سنہ ۳۴ھ میں قبرس فتح ہو گیا تھا۔ ہم دونوں واقعات میں تطبیق دینے کے لئے اس کی توجیہ میں اس تاریخی حقیقت کی طرف رجوع کریں کہ سنہ ۲۸ھ میں قبرس فتح ہوا...... چند سال کے بعد بدعہدی کی...... امیر معاویہ نے دوبارہ فوج کشی کی...... یہ واقعہ سنہ ۳۴ھ کی بجائے سنہ ۳۳ھ کا ہے......"

اس ذرا سی بات پر تنقید نگار صاحب بے قابو ہو گئے اور بڑے مزے لیکر یہ کہنا شروع کیا کہ "کیا ہم ان غلط بیانیوں کو اس لئے تسلیم کرلیں کہ یہ ایک مستشرق کی شان تحقیق ہے"۔ جناب ناقد صاحب سے بادب گزارش ہے کہ مستشرقانہ شان تحقیق کی بنیادیں اس قدر ناپائدار نہیں جس قدر وہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ اُن کو شاید خیال ہو گا کہ ایسی فاحش غلطیوں کے ہوتے ہوئے مصنف کے مبلغ علم پر کس کو ہنسی نہیں آئیگی لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اول تو ترتیب سنین کے متعلق ہم کو ڈاکٹر حِلّی کے دلائل کا علم نہیں پھر سنین کے بارے میں اختلاف کی بہت کافی گنجائش موجود ہے۔ ابو الفدا نے بیت المقدس اور جنگ قادسیہ دونوں کا سنہ ۱۵ھ بتایا ہے۔ برقہ اس کے نزدیک سنہ ۲۲ھ میں فتح ہوا۔ اس کو بھی جانے دیجئے تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر تنقید نگار صاحب اس قدر مسرت کا اظہار کرتے۔ کیا وہ محسوس نہیں کرتے کہ اس قسم کے معمولی گناہ کبھی کبھی اُن کے شہر میں

بھی سرزد ہو جایا کرتے ہیں۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

بہرکیف یہ امر غور طلب ہے کہ مصنف نے کہیں مسلمانوں پر کلیسائے یوحنا سے تعارض کرنے کا الزام قائم نہیں کیا۔ مصنف لکھتا ہے "خلافت راشدہ کے آخری عہد میں مکہ و مدینہ عربی نغمہ و ساز کا گہوارہ بن گئے" تنقید نگار صاحب ان باتوں کو مزخرفات قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں "خلافت راشدہ اور عہد نبوی میں جو کچھ موسیقی تھی وہ اس قدر تھی جو شاعری کا لازمہ ہوتی ہے .... اس عہد کے چند مغنیوں کے نام بھی ملتے ہیں ......" اور اس طرح خود ہی ان "مزخرفات" کی تصدیق کر دیتے ہیں۔ مصنف نے آدیزش خلافت کی تاریخ میں مکی اور مدنی گروہوں کی تقسیم قائم کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "اہل مدینہ کا فریق جمہوری نصب العین رکھتا تھا اور اہل مکہ خاندان اور قبیلوں کی حمایت پر قائم رہے"۔ تنقید نگار صاحب خفا ہیں کہ مصنف نے اس عہد کی تاریخ کو مکی اور مدنی تفریق سے ملوث کیوں کیا۔ ان کی رائے میں یہ سب کچھ قبائلی عصبیت کا نتیجہ تھا۔ تنقید نگار صاحب اگر غور کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ ان کا یہ خیال صحیح نہیں بہرکیف مصنف کا مطلب تو صرف اس قدر تھا کہ مدینہ اور اہل مدینہ سے اسلامی اور جمہوری روح کا اظہار ہوتا رہا یہ مکہ کی ذہنیت تھی جو پادشاہت اور سلطنت کی صورت میں خلافت پر حاوی ہو ئی۔ اسی طرح تنقید نگار صاحب کو مصنف کے اس بیان پر بھی اظہار تعجب کی ضرورت نہیں تھی کہ "امویوں کے زمانۂ حکومت کے وسط ہی میں عباسیوں نے ..... راسخ الاعتقاد مسلمانوں میں عزت و اعتماد حاصل کر لیا تھا" اس لئے کہ اگر لوگوں میں عباس اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اولاد کا احترام موجود تھا تو یہ کوئی ایسی ناممکن بات نہیں تھی جس پر جناب ناقد صاحب اظہار تعجب فرماتے۔ ان کا یہ کہنا کہ مصنف کی تاریخ دانی پر حملہ کرنا کہ "بنوامیہ کے مقابلہ خلافت کا دعویدار جو گروہ تھا وہ علوی اور شیعان علی کی جماعت تھی ...... اتفاقی واقعات کی بنا پر زمام حکومت عباسیوں کے ہاتھ میں چلی گئی" کچھ بہت زیادہ ٹھیک نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بنوامیہ کے مقابلے پر علوی اور

شیعان علی کی جماعت موجود تھی لیکن بنو امیہ کے زوال میں محمد عباسی کا جو حصہ ہے اسے کوئی اہل نظر فراموش نہیں کرسکتا۔ ابراہیم عباسی بھی جسے بعد میں اموی حکومت نے قتل کی سزا دی ائمہ عباسیہ ہی سے تھا۔ سلیمان اور ابو مسلم بھی محمد ہی کے داعیوں میں سے تھے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جسے تاریخ دانی سے ذرا بھی بہرہ ملا ہے ان باتوں سے بے خبر نہیں۔

تنقید نگار صاحب کو شکایت ہے کہ مصنف نے اسلامی فن تعمیر کے سلسلے میں صقلیہ کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مصنف کو عربی تعمیرات کے صرف بڑے بڑے اسالیب اور ان کے نمونوں کا تذکرہ کرنا مقصود تھا اور ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے صقلیہ کی عمارات کو کوئی اہمیت حاصل نہیں البتہ تنقید نگار صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ نوکدار محرابوں وغیرہ کے زمانے کی تعین میں مصنف سے تسامح ہوا ہے۔ بارھویں صدی سے مصنف کا مطلب بارھویں صدی مسیحی ہے۔ تنقید نگار صاحب نے دائرۃ المعارف برطانیہ کے حوالے سے ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری بتایا ہے یعنی گیارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی۔ صفحہ ۱۷۴ پر مصنف نے لکھا ہے "المرابطین کے عہد میں جامع تمسان تعمیر ہوئی (۱۱۳۵ - ۳۸) جس سے عربوں کی اس ترقی کا پتہ چلتا ہے جو انھوں نے فن تعمیر میں حاصل کرلی تھی...... اب ...... اور بیضاوی محرابوں کی بجائے نوکدار محرابیں وجود میں آئیں"۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں اول تو یہ کہ مصنف محض نوکدار محرابوں کی ابتدا سے بحث نہیں کررہا ہے ثانیاً (۱۱۳۵ — ۳۸) جامع تلمسان کی تعمیر کی تاریخ ہے جو اس کے نزدیک فن تعمیر کے اس بدلے ہوئے اسلوب کا ایک نمونہ ہے۔

قرطبہ کی علمی ترقیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے اتفاق سے لکھ دیا تھا "سرزمین قرطبہ نے علم کا خیر مقدم بڑی گرمجوشی سے کیا...... ہر شخص کو کتابوں کی فراہمی...... کا شوق تھا...... قیصر روم کو بھی..... عبدالرحمن ثالث کے لئے دیا سقوریداس کی کتاب دواسازی کے ایک [illegible]

[illegible] تنقید نگار صاحب بگڑ بیٹھے سب سے پہلے انہوں

نے مغربی اور مشرقی فضیلت کی تقسیم قائم کی۔ پھر مغربی فضیلت کو مبالغہ آمیزی کا طعنہ دیتے ہوئے فرمایا "دیاسقوریدیس کی تصنیف عربوں کے لئے کوئی نایاب کتاب نہیں تھی ...... اس کا ترجمہ متوکل کے عہد میں ہوا ...... حسن اتفاق سے قیصر روم نے دوسرے تحائف کے ساتھ کتاب دیاسقوریدیس بھیجدی ...... اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تصاویر سے مزین تھی ...... نکولس نے اس کا ترجمہ لاطینی میں کیا عربی میں نہیں کیا" تنقید نگار صاحب غور کریں کہ مصنف نے عربوں کی شان میں کوئی ایسی گستاخی نہیں کی۔ نہ اس نے کتاب کے متعلق ان جزوی بحثوں کو چھیڑا جنمیں ناحق آپ الجھ گئے۔ ممکن ہے کسی لاطینی کتاب میں یہی مذکور ہو کہ نکولس نے کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا۔ بہرکیف مصنف کا مطلب تو صرف قرطبہ کے ذوق علم کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

یہاں تک تو مصنف کے جرائم کی بحث تھی۔ اب مترجم کے گناہوں کی فہرست شروع ہوتی ہے۔ تنقید نگار صاحب نے مارک انٹنی کی طرح جو جولیس سیزر کی لاش کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہوئے اُس کے اُن احسانات کا تذکرہ کرتا جاتا تھا جو اُس نے اہل روما پر کئے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا جاتا تھا کہ اسے بروٹس کی شرافت کا اعتراف ہے مصنف کی غلط بیانیوں اور ان سے مترجم کی بے اعتنائی کی شکایت کرتے ہوئے بین السطور میں کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ ہم تنقید نگار صاحب کو اس حسن بیان پر مبارکباد دیتے ہیں۔

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

تنقید نگار صاحب کا خیال ہے کہ مترجم کا ضمیمہ بیشتر مستشرقین کی تحریروں کا رہین منت ہے۔ صحیح ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے میں ہم نے کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا اس لئے کہ مترجم کی حیثیت میں ہمارے پیش نظر ایک مستشرق کی تصنیف تھی اور اس لحاظ سے یہی مناسب معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس پر کچھ اضافہ کیا جائے تو مستشرقین ہی کی تحریروں سے کیا جائے۔ البتہ تنقید نگار صاحب ہمارے اس "مستشرقانہ انداز" سے خفا ہو گئے جس میں ہم نے بغاوت فقہا پر تبصرہ کیا ہے

لیکن انہوں نے یہ نہیں بیان کیا کہ ان کی خفگی کے کیا وجوہ ہیں۔ بہر کیف ہم اس کے لیے ان سے معافی کے خواستگار ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ آیندہ مترجم سے فقہا کی شان میں اس قسم کی کوئی گستاخی نہیں ہوگی (انشاءاللہ)۔ اس خیال کی تردید میں کہ تصوف ویدانت کا مرہون منت ہے یا یہ کہ اسے خالص ایرانی چیز سمجھنا چاہیئے مترجم نے لکھا تھا کہ "بیرونی سے قبل ہندوستان اور عالم اسلامی میں کوئی علمی تعلق قائم نہیں تھا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ تصوف محض ایرانیوں کی پیداوار ہے اس لئے کہ اس میں ابن عربی اور ابن فارض ایسے خالص عرب شامل تھے" تنقید نگار صاحب نے اسے مترجم کی ذاتی تحقیق ٹھہرا کر اس کی اس طرح تغلیط شروع کی "منصور.... ہارون مامون...... خصوصاً برامکہ کے دور اقتدار میں بہت سے اہل علم ہندوستان آئے اور ہندوستان کے اطبا، فلاسفر اور پنڈت بغداد بلائے گئے...... ابن عربی اور ابن فارض تو اس وقت پیدا ہوئے جب تصوف کی نشو و نما کامل طور پر ہو چکی تھی"۔ تنقید نگار صاحب مترجم کی جس عبارت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ پروفیسر براؤن کے بیان سے ماخوذ ہے۔ اس لحاظ سے یہ اجتہاد مترجم کا نہیں ہے بلکہ پروفیسر براؤن کا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمیں تنقید نگار صاحب کا اجتہاد کچھ بہت زیادہ پسند نہیں آیا اس لئے کہ ان کی طرح پروفیسر براؤن کو بھی معلوم تھا کہ "برامکہ کے دور اقتدار میں بہت سے...... پنڈت بغداد آئے" بایں ہمہ ان کو اپنے اجتہاد پر اصرار تھا۔ تنقید نگار صاحب اگر ان کے دلائل کو قبول نہیں کرتے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ براؤن مرحوم کو خوب معلوم تھا کہ ہندوستان کے پنڈتوں کے ورود بغداد کے باوجود تحریک تصوف پر اس زمانے میں ان کا کوئی اثر نہیں پڑا اسی طرح وہ تصوف کے نشو و نما میں ابن عربی کی زبردست شخصیت کو بھی فراموش نہیں کر سکتے تھے۔

افسوس ہے ہمیں جناب ناقد صاحب کے انداز تنقید سے کوئی خاص مسرت نہیں ہوئی۔ ہمارا خیال تھا کہ اٹھارہ صفحوں کی نکتہ چینیوں کے بعد دس بیس نہیں تو کم از کم دو صفحے مصنف کی ... حروف ... بھی ... لیکن معلوم ہوا کہ ان کے پیش نظر

کوئی علمی مقصد نہ تھا۔ انہوں نے کمال مہربانی سے مترجم کی چند غلطیوں پر گرفت کی ہے اور بعض خامیوں کی تصحیح میں اسے غیر معمولی مدد دی ہے۔ کتابوں کی عدم موجودگی اور کتابت و طباعت کی دشواریوں سے خود مترجم کو اس بارے میں بے حد دقتیں پیش آچکی تھیں اور اس کا دل کسی طرح بھی کتاب کی ترتیب سے مطمئن نہیں تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ تنقید نگار صاحب اسی طرح ہماری بعض فروگذاشتوں کے متعلق بھی ہمیں قابلِ قدر مشورہ دینگے۔ بدقسمتی سے اُن کی ساری توجہ کتاب کی خامیوں پر رہی یہاں تک کہ وہ اپنی غلط فہمی میں کتاب کے اصلی اور جزوی مباحث میں بھی کوئی امتیاز قائم نہیں کرسکے۔ تنقید نگار صاحب کا یہ انداز نہایت مایوس کن ہے۔ انہوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ دنیا کا ہر مصنف جسدِ اسلامی میں زہر رسانی کی کوشش کرتا ہے اور یہ خدمت انہیں کے حصے میں آئی ہے کہ وہ اس کے ازالہ کی کوشش کریں۔ اس سے پہلے ان کو اس امر کا فیصلہ کرلینا چاہیئے کہ ان کی حیثیت کیا ہے۔ اگر تنقید کی انتہا یہی ہے کہ ہم مستشرقین کے ہر بیان کی تردید کردیں اور کسی طرح بھی تاریخ کے اُس اعلیٰ نصب العین کی طرف قدم نہ اُٹھائیں جس کے ماتحت ہمیں اقوام و ملل کی صحیح زندگی کا علم حاصل ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا دماغ ایک ناقابلِ علاج مرض کا شکار ہوچکا ہے اور ہم خواہ مخواہ اپنی نادانی اور پستی کے احساس سے دوسروں کے تفوق پر حملہ کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے منفیانہ رویے سے ہماری علمی زندگی پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا۔ ہمیں اس کا خیال نہ کرنا چاہیئے کہ مصنف ڈریپر ہے یا شبلی، امیر علی ہے یا ڈیل یا ڈزئی۔ ہمارے پاس اگر واقعی کوئی چیز موجود ہے تو ہمیں نہایت جسارت کے ساتھ اسے پیش کردینا چاہیئے تحقیق و اجتہاد کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہے۔ ہمارے یہ کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا کہ مستشرقین کو آنحضرت صلعم کی فلاں حیثیت کا علم نہیں۔ اُن کی سمجھ میں اسلام کی یہ خصوصیت نہیں آتی اور وہ خصوصیت نہیں آتی۔ کتابوں کی قدر و قیمت کا اندازہ اُن کی مجموعی خوبیوں اور اُن کی علمی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ کیا تنقید نگار صاحب اتنا نہیں سمجھتے کہ دنیا کے بہتر سے بہتر اداروں سے بھی جو کتابیں شائع ہوتی ہیں اُن کا مطالعہ اس لئے نہیں کیا جاتا کہ ان کی ایک ایک سطر صحیح ہوتی ہے یا اسلئے

کہ وہ ہماری ہر علمی ضرورت کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ ان کی خوبیاں بھی ان کے مجموعی محاسن میں مضمر ہیں۔ ہماری رائے میں علم کا منتہا مغربی اور مشرقی فضیلتوں کی تقسیم سے کہیں زیادہ بالاتر ہے اور اگر کسی مستشرق کی تصنیف میں تھوڑی بہت خامیوں کے باوجود عالمانہ شان موجود ہے تو ہمیں اس سے استفادہ حاصل کرنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔

مجذوب کی بڑ

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف + آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس مرتبہ گرمیوں کی چھٹیوں میں مجھے کئی سال بعد وطن جانے کا اتفاق ہوا کہتے ہوئے شرم آتی ہے مگر کہنا پڑتا ہے کہ نہ مجھے اپنا گاؤں ملک سلیمان سے بہتر معلوم ہوا اور نہ وہاں کے کانٹوں میں سنبل و ریحان سے زیادہ دلکشی محسوس ہوئی۔ شاید اس کا یہ سبب ہو کہ میں بچپن سے اپنے والد کے ساتھ رہا اور وہ ملازمت کے سلسلے میں شہر شہر پھرتے رہے اس لئے میرے دل میں حب وطن کا جذبہ دب کر رہ گیا یا یہ ہو کہ مجھے خلیل آباد میں کبھی وہ محبت نصیب نہیں ہوئی جس کا پرتو مٹی پتھر اور درختوں کو زندگی اور کشش بخشتا ہے اور وطن کو وطن بناتا ہے۔ یہ دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ میرے دل میں حب وطن نہ سہی مگر اس سے ملتی جلتی ایک چیز ضرور موجود ہے۔ میں جس کالج میں تعلیم پاتا ہوں اس سے مجھے عزیز دوستوں اور شفیق استادوں کی بدولت بید انس ہے۔ جب میں وہاں سے کہیں جاتا ہوں تو دل میں درد جدائی کی کسک لئے ہوئے اور جب لوٹ کر آتا ہوں تو جوش مسرت میں ڈوبا ہوا مگر خلیل آباد سے مجھے کوئی قلبی رشتہ محسوس نہیں ہوتا۔ میں دو برس کا تھا کہ میری والدہ اور پھوپھی کا انتقال ہو گیا اور اسی سال میرے چچا وطن کی سکونت ترک کر کے بمبئی چلے گئے۔ خلیل آباد میں چند دور کے عزیزوں کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ اس لئے میں کبھی تعطیل کے دنوں میں وہاں جاتا ہوں تو محض ایک فرض سمجھ کر۔ جب تک وہاں رہتا ہوں صبر کی نیکی روزانہ میرے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے اور جب وہاں سے رخصت ہوتا ہوں تو میرا شمار شکر گزاروں میں ہوتا ہے۔

اس بار خلیل آباد میں میرے ہمسنوں میں سے کوئی موجود نہ تھا اس لئے مجھے وہاں کا قیام اور بھی کھل گیا۔ صبح سے شام تک میرا وقت اس طرح گزرتا تھا کہ کبھی اپنے خاندانی کنجانے

میں جاکر کرم خوردہ کتابوں کی گرد جھاڑی اور ورق گردانی کی، کبھی زنانے مکان میں جاکر عورتوں کے آپس کے جھگڑے اور ہمسایوں کی شکایتیں سنیں، کبھی کھیتوں کی طرف چلا گیا، کبھی آم کے باغ میں جاکر بیٹھ گیا۔ ممکن ہے کہ فلسفیانہ طبیعت والوں کو تنہائی کی زندگی میں غور و فکر کا بہت اچھا موقع ملتا ہو اور نظر ہوشیار کو درختوں کے پتوں میں معرفت کردگار کے دفتر نظر آتے ہوں لیکن میرے جیسے لوگ جو تنہائی میں اونگھتے ہیں اور پتوں کی دفتری زبان سے ناواقف ہیں اس موقعے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مجھے تو پہلے ہی دن سے فکر تھی کہ کوئی انسان ملے جس سے باتیں کرکے دو گھڑی دل بہلا سکوں مگر ہمارے گھر میں کیا سارے گاؤں میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے سوائے کھیتی، مویشی، پٹواری وغیرہ کے کسی چیز سے دلچسپی ہو۔ مجھی گاؤں کے ہر آدمی سے وحشت تھی خصوصاً ایک صاحب سے تو ڈر سا لگتا تھا۔ ان بزرگ کا نام مجھے معلوم نہیں مگر یہ مجذوب کہلاتے ہیں اور ہمارے گھر کے قریب ایک مسجد میں رہتے ہیں۔ یہ مجھے اکثر راہ میں ملا کرتے تھے کبھی مسجد میں جھاڑو دیتے ہوئے، کبھی کسی درخت کے تلے بیٹھے ہوئے کبھی کھیتوں کے بیچ میں منڈیر پر لیٹے ہوئے۔ مگر ان کی بےتصنع ہیئت اور ان کا بے تکلف لباس دیکھ کر میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان کے قریب جاؤں یا ان سے بات کروں۔ ایک دن کیا اتفاق ہوا کہ میں سیر کرنے نکلا اور بستی سے باہر جاکر ریل کی پٹری کے پاس ایک آم کے باغ میں تالاب کے کنارے جا بیٹھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے قریب ہی ایک بڑے سے پیڑ کی آڑ میں حضرت مجذوب سو رہے ہیں۔ میں سر جھکائے تالاب کی موجوں کا شمار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سر جو اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میاں مجذوب پاس کھڑے ہیں۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ اٹھ کر غیر معمولی تیزی سے قطع مسافت کرتا ہوا چلدوں لیکن خیال ہوا کہ شاید کوئی دیکھ لے اور اس فعل کو بھاگنا سمجھے اس لیے میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا مگر دل میں دعا مانگتا جاتا تھا کہ خدا کرے خود ان حضرت کے دل میں اس وقت ذوق سفر لطف مقام پر غالب آجائے۔

مگر دعا کا اثر الٹا ہوا۔ مجذوب صاحب اور قریب آئے اور مجھ سے کوئی ایک گز کے فاصلے پر منڈیر پر پیر پھیلا کر بیٹھ گئے۔ میں سہم کر تھوڑا سا پیچھے کھسکا۔ اس حرکت سے وہ میری طرف متوجہ ہو گئے اور غصے کے لہجے میں پوچھنے لگے "تو تیرنا جانتا ہے؟" مجھے واحد حاضر کی ضمیر زیادہ مرغوب نہیں مگر اس وقت مصلحتاً میں نے اسے سہہ لیا اور آہستہ سے جواب دیا "جی نہیں"۔ کہنے لگے "تو پھر تو اس تالاب میں کیوں نہیں کود پڑتا؟" یہ مجذوبانہ منطق مجھے بہت مہلک معلوم ہوئی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اس خوف سے کہ کہیں یہ اس سلسلے میں کوئی عملی دلیل نہ دے بیٹھیں میں سنبھل کر بیٹھ گیا کہ ضرورت ہو تو بے اجازت رخصت ہو کر گھر کی راہ لوں۔

مجذوب صاحب نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھا۔ "کیا تو دنیا سے نرالا ہے، سب یہی کرتے ہیں، ہر مسلمان یہی کرتا ہے۔ مسلمان، مسلمان سب برابر ہیں۔ کوئی غریب ہے کوئی امیر ہے، کوئی عالم ہے کوئی جاہل ہے، مگر ہیں سب مسلمان، سب بے صبر، سب غافل، سب ناعاقبت اندیش، سب من کے موجی، سب جذبات کے غلام۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ مسلمان جو اپنے نفس پر، اپنے دل پر، اپنی زبان پر، اپنے ارادوں پر، اپنی خواہشات پر، اپنے خیالات پر قابو نہیں رکھتے رہنما بن کر قوم کی رہنمائی کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں؛ وہ مسلمان جو بیچے علم و فضل سے، مطالعہ فطرت سے، مشاہدۂ زندگی سے، حق کی محبت سے بیگانۂ محض ہوتے ہیں عالم دین بن کر تعلیم و تلقین کے مسند پر بیٹھ جاتے ہیں، وہ مسلمان جو لذت بے خودی سے، کیف تسلیم سے، ذوق درد سے، ہمدردی اور خدمت کے جذبات سے ناآشنا ہوتے ہیں پیر روشن ضمیر بن کر رشد و ہدایت کا باب کھولدیتے ہیں؟ اگر تو نے اس کا مشاہدہ کیا ہے تو پھر تو جو تیرنا نہیں جانتا اس تالاب میں کیوں نہیں کود پڑتا؟ ...... کیا تو نہیں جانتا کہ مسلمان مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر ذرائع سے بے نیاز ہیں، سفر کرنا چاہتے ہیں لیکن زاد سفر سے مستغنی ہیں، فصل کاٹنا چاہتے ہیں لیکن بونے جوتنے سے بے پرواہ ہیں؟ کیا تجھے معلوم

نہیں کہ مسلمان ایک طلسمی دنیا میں رہتے ہیں جہاں قول کے معنی فعل، ارادے کے معنی عمل، دعوے کے معنی دلیل، خواہش کے معنی واقعہ سمجھے جاتے ہیں جہاں آنکھ صرف اُن چیزوں کو دیکھتی ہے جو اُسے پسند آئیں، کان صرف ان باتوں کو سنتا ہے جو اُسے مرغوب ہوں اور ذہن صرف ان معروضات کا ادراک کرتا ہے جو اُسے گوارا ہوں؟ اگر تجھے یہ علم ہے تو پھر تو کیوں بیکار عقل سے کام لیتا ہے اور کیوں اس تالاب میں کود نہیں پڑتا؟ ...... معلوم ہوتا ہے تو باوجود مسلمان ہونے کے مسلمانوں کی اصلی حالت سے واقف نہیں۔ سُن میں تجھے سناتا ہوں؛ دیکھ، میں تجھے دکھاتا ہوں۔ یہ پیکر خیالی جو تیری چشم باطن کے سامنے ہے ہندوستان کا مسلمان ہے۔ اس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو دیکھا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے اور سنا کہ اس کے بزرگوں کے پاس سب کچھ تھا۔ اس کے بزرگ ہندوستان پر حکومت کرتے تھے، قوت وسطوت، جاہ وحشمت، مال ودولت کے مالک تھے۔ زراعت، تجارت، لین دین یہ چیزیں ان کے پاس نہ تھیں اور انکی انھیں ضرورت بھی نہ تھی۔ سلامت روی، مسکنت، تحمل، جفاکشی کی صفات یہ لوگ نہیں رکھتے تھے اور یہ اُن کے شایان شان بھی نہ تھیں۔ دفعتہً ہوا بدلی، زمانہ پلٹا، ہندوستان میں انقلاب ہو گیا۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہی اور اس کے ساتھ وہ باتیں بھی جو حکومت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ قصر زندگی کی بنیادیں پہلے ہی سے ان کی نہ تھیں؛ اب اُسکی دیواریں، اُسکی چھتیں، اُس کے کنگرے، اُس کے گنبد بھی چھن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیچارے مسلمان کا کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ سر پر سائے کا تو کیا ذکر ہے پیر تلے سے زمین بھی نکل گئی۔ اب یہ اللہ کا بندہ ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ اُس کی زندگی خیالی دنیا میں بسر ہونے لگی۔ کون سی خیالی دنیا؟ وہ نہیں جو ایمان ویقین، وسعت نظر اور قوت عمل بخشتی ہے بلکہ وہ جو حواس ظاہری و باطنی کو نیم بیداری کی حالت میں رکھتی ہے، جو جسم وجان پر ایک کابوس مسلط کر دیتی ہے۔ وہ نہیں جو انسان کو اُبھار کر مشاہدۂ وعرفان کی بلندی پر لے جاتی ہے بلکہ وہ جو اُسے گرا کر جمود وغفلت کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ اُسے زندگی کی حقیقتوں سے وحشت ہونے لگی وہ واہمہ کی

بنائی ہوئی تصویروں سے دل بہلانے لگا۔ کاہلی کا نام اُس نے قناعت رکھ لیا، بے عملی کا توکل، بے بسی کا صبر، بے حسی کا زہد...... یہ غنودگی، یہ غفلت اس پر ہمیشہ طاری نہیں رہتی بلکہ اکثر وہ چونکتا ہے، سر اُٹھاتا ہے، اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، کبھی کبھی وہ اُٹھتا ہے، دوڑتا ہے اور اتنا دوڑتا ہے کہ تھک کر گر پڑتا ہے۔ لیکن کیا چونکنے کے بعد اُسے زندگی کی حقیقتیں نظر آتی ہیں، کیا دوڑنے کے بعد وہ منزل مقصود سے قریب تر ہو جاتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ چونکنا محض خواب پریشاں کا نتیجہ ہے اور یہ دوڑنا محض وحشت کی دلیل...... یہ حقیقت سے بیخودی، یہ واہمہ کی غلامی، یہ غفلت اور وحشت کا تضاد مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ سے نمایاں ہے۔ مذہب کو اُس نے زندگی کے واقعات سے، دنیا کے حالات سے، زمانے کی رفتار سے جدا کر لیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دینداری نام ہے ہر زندہ قوت سے ڈرنے کا، ہر تغیر کی طرف سے آنکھ بند کر لینے کا، ہر نئی چیز سے نفرت کرنے کا۔ وہ خود نا تمام اور نیم گرم عقیدہ رکھتا ہے، بے توجہی اور بے دلی سے عبادت کرتا ہے مگر جب کسی دوسرا عقیدہ رکھنے والے یا دوسرے طریقے سے عبادت کرنیوالے کو دیکھتا ہے تو بادل کی طرح اُٹھتا ہے، گرجتا ہے اور برس پڑتا ہے۔ شاعری کو اُس نے سچے مشاہدات، واردات اور جذبات سے بے تعلق کر کے بیرنگ حسن، بے کیف عشق، بے ثمر وصل اور بے تمکین ہجر کے دائرے میں گھیر لیا ہے۔ اُس کے نزدیک شاعری حقیقت کو تخیل کی آنکھ سے دیکھنے اور جذبات میں خوشنما حرکت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کو نہیں کہتے بلکہ خارجی اور عینی دنیا سے منہ موڑ کر اپنے نفس کی اندھیری کوٹھری میں بھٹکنے، اِدھر اُدھر ٹٹولنے اور کچھ نہ پا کر کف افسوس ملنے کو۔ اُس کے خیال میں شاعر وہ نہیں جس کا دل کائنات کے درد سے دکھتا ہے اور جس کا ذہن حسن ازلی اور عشق ابدی کی رہنمائی میں اس درد کی دوا ڈھونڈھتا ہے بلکہ وہ ہے جو اپنے ہاتھوں ادنیٰ خواہشات اور جذبات کے دلدل میں پھنس جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ باہر نکلنے کی کوشش کرے روتا ہے، چلاتا ہے، تڑپتا ہے۔ اُس نے اقتصاد و سیاست کی طرف سے ابتدا میں ایسی غفلت

برتی کہ وہ مال وزر سے بالکل خالی اور قوت وسطوت سے قطعاً محروم ہوگیا اور اب جو ذرا چیتا
ہے تو اُس نے اُن چیزوں کو جن میں فکر وعمل کی ضرورت ہے جذبات کا کھیل بنا دیا ہے۔
اپنے بوتے کھڑا نہیں ہو سکتا دوسروں کا سہارا ڈھونڈھتا ہے، آج ایک کا کل دوسرے کا
پھر جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں تو طیش میں اپنے آپ سے لڑتا ہے،
جھنجھلاہٹ میں اپنی بوٹیاں چباتا ہے .... اگر اس خیالی تصویر پہ تیری نظر نہ جمتی ہو تو
مجھے دیکھ میں تیرے سامنے کھڑا ہوں۔ ایک دن تھا کہ میں بھی انسان تھا، میں بھی مسلمان
تھا۔ میں نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اس عرصۂ جد وجہد سے اس جہان گیر و دار
سے الگ ایک طلسمی دنیا میں پرورش پائی تھی: مذہب کے پردے میں کاہلی، بے عملی، بے بسی،
بے حسی سیکھی تھی: شاعری کے نام سے نفس پرستی، حقیقت فراموشی، جذبات فراموشی کی تعلیم پائی
تھی، سیاست واقتصاد کے دھوکے میں شیخ چلی کے سے منصوبے باندھنے اور آخر میں مایوس
ہوکر تقدیر سے، دنیا سے، اور اپنے آپ سے لڑنے کی مشق کی تھی۔ میری زندگی بھی غفلت
اور وحشت، جمود اور اضطراب کا تضاد تھی۔ مگر میرا تخیل دوسروں سے زیادہ قوی تھا اور
میرا دل ودماغ دوسروں سے زیادہ کمزور۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے قوائے ذہنی میں باہمی ربط
کے رشتے ٹوٹ گئے، میری محدود خیالی زندگی کا سلسلہ بھی میری آنکھوں کے سامنے الگ
الگ کڑیوں میں بکھر گیا جن کو ملانے کی میں کوشش کیا کرتا ہوں مگر بہت کم کامیاب ہوتا
ہوں۔ لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں مگر چونکہ میری پچھلی زندگی میں مذہبیت غالب تھی اور اب بھی
اس کا شائبہ موجود ہے اس لئے اخلاقاً مجذوب کہتے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مجھ پر
حقیقت کے بھید اور معرفت کے اسرار کھل گئے ہیں مگر میں انہیں برداشت کرنے کی تاب
نہیں رکھتا۔ آہ انہیں کیا معلوم کہ راز حقیقت اور اسرار معرفت تو درکنار میں معمولی ذی فہم
انسانوں کے مربوط ادراک، احساس اور عمل کے لئے تڑپتا ہوں۔ مگر کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ
مسلمانوں کی حالت مجھ سے کچھ بہتر ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ سب میری

طرح مجذوب ہیں۔ اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ میں کھلا ہوا مجذوب ہوں، وہ چھپے ہوئے مجذوب ہیں، میں نے زندگی کی بازی میں ہار مان لی اور وہ ہاری ہوئی بازی کھیل رہے ہیں ...... خیر مجھے اس وقت سب سے غرض نہیں، میں تو تجھ سے وہ بھید کہنا چاہتا ہوں جو میں نے سب کچھ کھو کے پایا ہے۔ میرے ذہن کی تاریکی میں اس وقت جو عارضی روشنی آگئی ہے اُسے غنیمت سمجھ اور میری بات غور سے سُن۔ تو ابھی نوجوان ہے اور زندگی کے گھنے اور تاریک جنگل میں قدم رکھ رہا ہے جس میں میں سیدھی راہ چھوڑ کر بھٹک گیا ہوں۔ تیرے پاس ابھی عقل کا چراغ موجود ہے جس میں عقیدے کا تیل جلتا ہے۔ تیری رگوں میں ابھی شوق اور ولولے کا خون دوڑ رہا ہے اور تیرے پیروں میں رہ نوردی کی قوت موج زن ہے۔ اگر تو منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے تو پہلے اُس منزل کو متعین کرے۔ پہلا قدم اُٹھانے سے پہلے بیٹھ کر اچھی طرح سوچ لے کہ تجھے کہاں جانا ہے۔ اُس آسمانی چراغ کی روشنی میں جو تیرے پاس ہے اس جنگل کے مالک کے بھیجے ہوئے نقشہ کا خوب مطالعہ کرے اور منزل رسیدہ مسافروں کے سفرناموں کو غور سے پڑھ لے۔ جب یہ کر چکے تو استقلال اور استقامت کو اپنا رفیقِ راہ بنا اور خدا کا نام لے کر اس اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں داخل ہو جا۔ اگر راہ میں تیرے پیر تھک جائیں تو قدم اور تیزی سے بڑھا، اگر تجھ پر نیند غالب ہو تو آنکھیں اور اچھی طرح کھول لے، اگر روشنی چھپ جائے اور اندھیرا چھا جائے تو اپنے چراغ کی بتی کو اور اُکسا لے۔ جب تجھے دوسرے رہ نورد نظر آئیں تو ان سے گریز نہ کر کیونکہ وہ تیرے رفیقِ سفر ہیں، ان کی مدد کرنا تیرا فرض ہے اور اُن سے مدد لینا تیرا حق ہے۔ لیکن سہارا لینا ہو تو اُس کا لے جو سیدھے راستہ پر چل رہا ہے، سہارا دینا ہو تو اُسے دے جو سیدھے راستہ پر چلنا چاہتا ہے ...... اگر تجھے یہ باتیں منظور ہیں تو جا خدا تیرا حافظ ورنہ اُٹھ اور اس تالاب میں کود پڑ۔ اگر تیرا بھی وہی انجام ہونا ہے جو میرا ہوا تو بہتر ہے کہ تو اپنے وجود سے دنیا کو پاک کر دے۔"

میں تصویرِ حیرت بنا ہوا مجذوب صاحب کی گفتگو سن رہا تھا۔ اُن کے آخری الفاظ

سن کر میں چونک پڑا مگر قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں وہ اُٹھے اور بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔

خدا جانے انھیں مجھ پر رحم آگیا یا اُن کے دل میں میری طرف سے کچھ امید پیدا ہو گئی۔
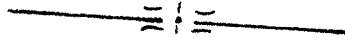
جادو وہ جو سر چڑھکے بولے

ہندوستان میں برطانوی راج کی برکات و انعامات، انصاف اور حسن انتظام کی داستانیں سنتے سنتے کئی نسلیں گزر چکی ہیں، اگر کبھی کسی غریب ہندوستانی نے ان خداوندان ارضی کی حکومت کے برکات سے انکار کیا تو اس کفران نعمت پر قوم نے اُسے مجنون اور شوریدہ سر کا لقب دیا اور ارباب حکومت کی طرف سے کبھی حبس دوام، کبھی عبور دریائے شور اور کبھی سولی کی سزا دی گئی! ظلم و ستم کی انتہا کہئے یا زمانہ کا انقلاب کہ ہندوستان کے طول و عرض میں اب سوائے چند کاسہ لیسان حکومت کے کوئی نہیں جو برطانوی حکومت کو ظلم و استبداد کا مرادف نہ سمجھتا ہو یا حکومت کے "حسن انتظام" کا قائل ہو، لیکن مظلوم اور دل جلے ہندوستانیوں کی زبان سے نہیں بلکہ خود انگریزوں کی زبان اور قلم نے ہندوستان میں اپنی حکومت کے متعلق جو کچھ کہا ہے یا لکھا ہے اُس کا کچھ نمونہ بلا کسی اضافہ، ترمیم یا حاشیہ کے نذر کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین بھی اس کو پڑھکر یہی کہنے پر مجبور ہونگے کہ "جادو وہ جو سر چڑھکے بولے!"

۱۔ ہندوستان کے ایک سابق وائسرائے لارڈ لٹن ۱۸۷۸ء میں بصیغۂ راز اپنے ایک مراسلہ میں وزیر ہند کو تحریر فرماتے ہیں:-

"ایک طرف یہ ایکٹ (انڈیا ایکٹ بابتہ ۱۸۳۳ء) منظور ہوا اور دوسری طرف حکومت نے ایسی تدابیر سوچنا شروع کر دیں کہ جس سے عملاً اس ایکٹ کا نفاذ کسی طرح ٹل جائے! اس ایکٹ کے ایک ایک لفظ کو تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے بغور مطالعہ کرکے ذہن نشین کر لیا ہے۔ یہ تعلیم یافتہ طبقہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور خود حکومت اس کو ترقی دینے کی کوشش کرتی ہے حالانکہ حکومت اس طبقہ کے موجودہ افراد کے حوصلوں اور ان کے مطالبات کے پورا کرنے کی بھی گنجائش نہیں رکھتی ہے۔ ہر ہندوستانی جو ایک مرتبہ سرکاری ملازمت میں کسی ایسی

جگہ پر مقرر ہو جائے جو پہلے صرف انگریزوں کے لئے مخصوص ہوتی تھیں تو اس کو حق ہے کہ وہ یہ توقع رکھے اور اس کا مطالبہ کرے کہ قاعدہ کے مطابق ترقی کرتے کرتے اس کو اس صیغہ کی سب سے بڑی ملازمت ملجائیگی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ توقعات اور مطالبات نہ کبھی پورے ہو سکتے ہیں اور نہ ہونے پائینگے۔ ہمارے سامنے دو راستے تھے یا تو صاف طور پر بڑی بڑی ملازمتوں پر ترقی دینے سے ان کو روک دیں یا ان کو دھوکہ دیں۔ ان دونوں طریقوں میں سے ہم نے وہی پسند کیا جو سب سے زیادہ نامناسب تھا۔ امتحان مقابلہ کا جو طریقہ انگلستان میں رائج ہے اُس کا ہندوستانیوں پر عمل درآمد یا جس عمر تک امیدوار مقابلہ میں شریک ہو سکتے ہیں اُس میں جو تخفیف حال ہی میں کیگئی ہے یہ سب دانستہ اور کھُلی ہوئی دھوکہ بازی ہے تاکہ اس ایکٹ کو بے معنی اور حرف غلط بنا دیا جائے۔ چونکہ میری یہ تحریر راز کی ہے اس لئے مجھے یہ لکھنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ میرے نزدیک حکومت انگلستان اور حکومت ہند اس وقت تک اُس الزام کا قابل اطمینان جواب دینے سے قاصر ہیں کہ انہوں نے اپنے مواعید کو توڑنے کے لئے کوئی دقیقہ جو اُن کے اختیار میں تھا نہیں اُٹھا رکھا۔"

۲۔ مارکوئس آف سیلسبری سابق وزیراعظم انگلستان ۲۹ اپریل ۱۸۷۵ء کو اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرماتے ہیں:۔

"اگر ہندوستان کا خون چوسنا ہی ہے تو نشتر ایسی جگہ لگایا جائے جہاں خون جمع ہو گیا ہے یا کم از کم موجود تو ہے نہ کہ ایسے حصوں میں جو خون کی کمی کی وجہ سے پہلے ہی سے کمزور ہو چکے ہیں۔"

۳۔ آنریبل ٹی۔ آئی۔ شور اپنی تصنیف مسمی "معاملات ہند پر حاشیہ" کی دوسری جلد کے صفحہ ۵۱۶ پر لکھتے ہیں:۔

"انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے اور ہر حیثیت سے پوری ہندوستانی قوم کو اپنے مفاد کا تابع اور محکوم بنائے۔ ان پر زیادہ سے زیادہ ٹکس لگایا جائے۔

چنانچہ جو صوبہ یکے بعد دیگرے ہمارے قبضہ میں آیا ہے وہ اضافہ محصولات کے لئے ایک نیا میدان سمجھا گیا۔ اس کے بعد ہم اس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ ہم نے محاصل کی رقم اس سے کئی گنی زیادہ کر دی جتنی دیسی راجہ وصول کیا کرتے تھے۔ پھر ہندوستانیوں کو ہر اُس اعزاز اور جائے شرف اور عہدہ سے محروم کر دیا گیا جس کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو قبول کرنے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔"

۴۔ اڈمنڈ برک نے ۱۷۸۳ء میں فاکس کے ایسٹ انڈیا بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

"........لیکن برطانوی حکومت کے ماتحت یہ ترتیب بالکل بدل جاتی ہے۔ تاتاریوں کا حملہ تباہ کن تھا لیکن اب یہ ہمارا سایۂ عاطفت ہے جو ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے، ان کی دشمنی نے جو نہ کیا تھا وہ اب ہماری دوستی سے ہو رہا ہے۔ آج بیس برس بعد ہمارا قبضہ اُسی طرح بے آئین ہے جیسے اول روز تھا، ہندوستانی لوگ مشکل ہی سے کبھی کسی انگریز کی صورت دیکھنا جانتے ہونگے۔ نوجوان بلکہ لونڈے ان پر حکومت کرنے کے لئے جاتے ہیں جنہیں نہ ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ کوئی ہمدردی ہوتی ہے نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا میل جول۔ گویا وہ اب بھی انگلستان ہی میں رہتے ہیں۔ اگر کچھ تعلقات ہیں تو اس قدر کہ جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لی جائے تاکہ یہ دولت آئندہ کسی دور دراز ملک میں جا کر کام آئے۔ جوانی میں جو دولت کی حرص اور جو تیز مزاجی ہوتی ہے اُس سے بھرے ہوئے نوجوان حکمراں یکے بعد دیگرے اُمڈے چلے جاتے ہیں اور ہندوستانیوں کی نظروں میں ان کی حیثیت سوا اس کے کچھ نہیں کہ چڑیوں اور چیلوں کا ایک جھنڈ ہے جو بھوک کی شدت میں اُڑ اُڑ کر برابر چارہ گھاس کی تلاش میں آتا ہے اور پیٹ بھر کرلے جاتا ہے۔"

۵۔ سر طامس منرو اپنی سوانح حیات کی تیسری جلد میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"بادشاہی راج میں ایک طبقہ امرا اور روسا کا تھا جس میں جاگیر دار، انعام دار، اور اعلیٰ حکام عدالت اور افسران فوج شامل ہوتے تھے۔ یہ لوگ اور دوسرے بڑے بڑے تاجر

اور کاشتکار ملکر ایک ایسی جماعت بنجاتی تھی جو دولت مند کہے جاسکتے ہیں یا کم از کم خوش حال اور فارغ البال ضرور تھے .... یہ تمام فوائد ہماری حکومت میں جاتے رہے۔ تمام فوجی اور عدالتی عہدے انگریزوں کے ہاتھ ہیں جن کی اندوختہ رقوم خود اُن کے ملک میں چلی جاتی ہیں ...... پھر ایسے نظام حکومت کو جاری رکھتے ہوئے جس کا رجحان ساری قوم کی سیرت کو ارذول بنانا ہے ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تعلیم کے ذریعہ ان کی سیرت کو بہتر اور اعلیٰ بنانے کی ہم کو بڑی فکر ہے۔"

۶۔ سر ہنری کاٹن اپنی تصنیف "نیو انڈیا" کے صفحہ ۱۱۳ اور ۱۱۵ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے روزافزوں افلاس اور غربت کے بہت سے اسباب ہیں لیکن اصلی سبب جو میں نے تلاش کیا ہے وہ دیسی صنعتوں کی تباہی اور اُن کی بجائے بدیسی صنعتوں کا فروغ پانا ہے۔ ایک اور سبب ہندوستان کی غربت کا وہ 'خراج' بھی ہے جو ہر سال یہاں سے جاتا رہتا ہے۔ 'مطالبات وطن' سال بہ سال بڑھتے جاتے ہیں۔ سب باتوں کا لحاظ رکھ کر اگر اُس رقم کا اندازہ لگایا جائے جو سالانہ ہندوستان سے برطانیہ عظمیٰ کو (مختلف صورتوں اور مختلف ناموں سے) جاتی ہے تو اُس کی میزان کم از کم ۵۴ کروڑ روپیہ ہوگی۔"

۷۔ دارالعوام میں معاملات ہند پر ایک مباحثہ کے دوران میں جان برائٹ نے ۱۸۵۳ء میں کہا تھا کہ:۔

"دیسی تعلیم کا جو نظام ہمارے ملک میں عام طور پر رائج تھا کہ ہر گاؤں میں ایک مدرسہ ہونا اُسی طرح ضروری تھا جیسے ایک پٹیل یا ایک مکھیا کا ہونا۔ اس نظام تعلیم کو حکومت نے تباہ کر دیا لیکن اس کے بدلے میں اچھی یا بُری کسی تعلیم کا بھی انتظام نہیں کیا گیا کہ اس کمی کو پورا کیا جاتا۔"

۸۔ 'دامن مشرق پر ایک سیاہ دھبہ' کے دیباچہ میں سر والٹر اسٹرک لینڈ لکھتے ہیں:۔

"راقم الحروف نے دو سال تک سیلون، اسٹریٹ سٹلمنٹ اور جنوبی ہند میں صرف

ایشیائی اور یوروشین لوگوں کے ساتھ بود و باش رکھی لیکن جو تجربات اس طرح حاصل ہوئے ان سے میرے اس عقیدہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی کہ مشرق میں برطانوی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت برطانوی حرص و آز اور بدنظمی حکومت ہے جو عمداً اس قوم کو تباہ کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہے جس کے مفاد کا خیال رکھنے کا بظاہر دعویٰ کیا جاتا ہے۔"

۹۔ اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ مصنف مذکور تحریر فرماتے ہیں :۔

"جو انگریز ان سطور کا مطالعہ کرے اس کو غور کرنا چاہیے کہ جب وہ سیلون کی سستی چائے کا کوئی گھونٹ پیتا ہے تو وہ اس حد تک انسان کا خون پیتا ہے۔ واقعۃً یہ چائے نہیں ہے جو پی جاتی ہے بلکہ غریب اور مفلس غلاموں کا خون ہے جس میں سے زندگی اور حیات کا سرخ رنگ اُڑ گیا ہے! اگر خدا انصاف کرتا تو ہر قطرہ جو ان کے حلق سے اُترتا ہے وہ ایک زہر بنکر اس ساری قوم کے جسم سے قوت اور مردانگی کو زائل کرکے اس کو ارذل نامرد اور ناکارہ قوم بنا دیتا۔"

سیّد قاسم آذربائیجانی رح

قاسم انوار نام، قاسم تخلص، آذربائیجان کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے دو مرتبہ پیادہ پا حج کیا ہے۔ ہرات میں بسلسلہ تلقین ارباب یقین کچھ عرصہ تک قیام رہا، پھر سمرقند چلے آئے اور ۸۳۷ھ میں بمقام جام انتقال کیا۔ مجھے اپنے والد کے کتب خانے میں ان کا قلمی دیوان ملا ہے جو کسی خوش نویس کا قلمی ہے جس کو اُس نے ۱۱۰۳ھ میں گویا سید قاسم کے انتقال کے ۲۶۶ سال بعد لکھا تھا۔ باقی صحیح حالات تاریکی میں ہیں۔ کلام میں نہ صرف زور اور مستی پائی جاتی ہے بلکہ سوز و گداز سے بھی بھرا ہوا ہے۔ بعض غزلیں خواجہ حافظ کی غزلوں کے جواب میں ہیں۔ خواجہ حافظ کی غزل ہے ؎ تا زمیخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود۔ سید قاسم نے اس زمین میں دو غزلہ لکھا ہے اس کے علاوہ قافیہ بدل کے بھی دو غزلیں لکھی ہیں۔ خواجہ حافظ کا شعر ہے ؎

تا زمیخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

پہلی غزل میں سید قاسم نے حافظ کے مصرعہ پر یہ گرہ لگائی ہے ؎

ما دریں دیرِ مغاں بہرِ نیاز آمدہ ایم سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

دوسری غزل میں "پیرِ مغاں" کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

عاشقانِ تو منِ و ایمان شہادت آنکہ ایں ہم از دولتِ آں پیرِ مغاں خواہد بود

اس میں "من" کے بعد "و" ہے اس وجہ سے مصرعہ موزوں نہیں ہوتا اس کے علاوہ مضمون میں بھی کوئی خوبی نہیں ہے۔

نہاں ، خواجہ صاحب نے یہ قافیہ اس طرح باندھا ہے ؎

برو اے زاہد خود بیں کہ ز چشمِ من و تو رازِ ایں پردہ نہان است نہاں خواہد بود

سید قاسم نے اس کو صوفیانہ رنگ میں اس طرح نظم کیا ہے ؎

من رآنی وانا الحق چہ سخن می گویم تا تو پیدا نشوی یار نہاں خواہد بود

اس کے بعد سید قاسم نے حافظ کے قافیوں میں کوئی شعر نہیں لکھا ہے بلکہ طبع زاد قافیوں میں غزل کو پورا کیا ہے۔ وحشت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے ؎

تا تو از خلوتِ غیر عازمِ خلوت نشوی دل ما نعرہ زناں جامہ دراں خواہد بود

مگر پہلے مصرعہ میں لفظ "غیر" کی "ر" یا لفظ "عازم" کا "ع" گرتا ہے۔

دوسری غزل میں اسی مضمون کو کسی تبدیلی کے ساتھ باندھا ہے۔ کہتے ہیں ؎

دل اگر روئے ترا باز نہ بیند ہیہات دائما نعرہ زناں جامہ دراں خواہد بود

خفقان کی تصویر ملاحظہ ہو ؎

تا نہ بینم رخِ زیبائے تو شاداں نشوم سینہ پُر سوز، دلم پُر خفقاں خواہد بود

"سر بار گراں ہے" اس مضمون کو اس طرح باندھا ہے ؎

قاسمی سر بفدائے تو کند روزِ وصال سرِ ما بر تنِ ما بارِ گراں خواہد بود

نگراں۔ خواجہ حافظ نے یہ قافیہ اس طرح لکھا ہے ؎

چشمم آں دم کہ ز شوق تو نہد سر بہ لحد تا دمِ صبحِ قیامت نگراں خواہد بود

سید قاسم نے اپنی دوسری غزل کے مقطع میں نگراں کا قافیہ اس طرح نظم کیا ہے لیکن مضمون کچھ دلچسپ اور شگفتہ نہیں ہے ؎

عشق می گفت کہ قاسم بچہ کارست دریغ خبرِ خیر کہ خاطر نگراں خواہد بود

دوائے دارد۔ اس میں خواجہ حافظ کے دو شعر قابل ذکر ہیں ؎

اشک خونیں بطبیباں بنمودم گفتند دردِ عشق ست و جگر سوز دوائے دارد

نغز گفت آں بت ترسا بچہ بادہ فروش شادی روئے کسے خور کہ صفائے دارد

سید قاسم نے بھی اس زمین میں غزل لکھی ہے اور نہایت خوبی سے انہیں قافیوں کو اس طرح نظم کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

جانم از دولت درد تو دوائے دارد　　دلم از صیقل ذکر تو صفائے دارد

خواجہ حافظ نے "شادی روئے کسے" کو "صفائے دارد" سے ممتاز کیا تھا لیکن سید قاسم نے "صیقل ذکر" سے مصرعہ کو بلند کر دیا۔ شاہ تراب علی قلندر کاکوروی نے بھی اس زمین دو غزلہ لکھا ہے۔ مطلع خوب ہی کہا ہے ؎

عشق دردیست کہ ہرگز نہ دوائے دارد　　ہرکہ دارد دلِ پُر درد بلائے دارد

دلبری داند۔ اس میں خواجہ حافظ کی مشہور غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

نہ ہرکہ چہرہ برافروخت دلبری داند　　نہ ہرکہ آئینہ سازد سکندری داند

سید قاسم نے دلبری کا قافیہ ایک نئے انداز سے باندھا ہے ؎

چنانکہ چشم تو در غمزہ دلبری داند　　سواد زلف سیاہت ستمگری داند

خواجہ حافظ کا مقطع ہے ؎

ز شعرِ دلکش حافظ کسے شود آگاہ　　کہ لطف طبع و سخن گفتن دری داند

سید قاسم مقطع ہی میں اس کا جواب دیتے ہیں ؎

حدیث وصف لخت بجز قاسمی گوید　　بوجہ احسن اگر کس سخنوری داند

پروانہ قافیہ۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ آگ وہ نہیں ہے کہ جس کے شعلہ پر شمع ہنسے بلکہ آگ وہ ہے جو بھڑک کر پروانہ کے خرمن میں جا لگی ؎

آتش آں نیست کہ بر شعلۂ او خندد شمع　　آتش آں ست کہ بر خرمن پروانہ زدند

سید قاسم نے اسی مضمون کو نہایت دلکش انداز میں اسطرح لکھا ہے کہتے ہیں کہ ساقی نے عشاق کو میخانہ کی دعوت (نہیں) دی بلکہ پروانہ کے دل میں آگ لگا دی ؎

عاشقاں را چو صلا جانب میخانہ زدند　　آتشے بود کہ اندر دل پروانہ زدند

میرا جہاں تک خیال ہے سید قاسم کا شعر خواجہ حافظ سے بڑھ گیا ہے۔

پیمانہ زدند۔ خواجہ حافظ لکھتے ہیں ؎

دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند　　گلِ آدم بسرشتند بہ پیمانہ زدند

سید قاسم کہتے ہیں ؎

عکسِ ساقی چو دریں بادۂ صافی افتاد　　عاشقاں از ہوسش ساغر و پیمانہ زدند

بکام ست امروز۔ اس میں خواجہ حافظ کا شعر ہے ؎

روزِ عیش و طرب و ماہِ صیام است امروز　　کامِ دل حاصل ایام بکام ست امروز

سید قاسم جواب میں مطلع لکھتے ہیں ؎

از لبِ لعلِ تو ام کار بکام ست امروز　　فلکم بندۂ و خورشید غلام ست امروز

دوسرے مصرعہ نے شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔

خواجہ حافظ کا شعر ہے ؎

گو عروسِ فلکی رخ منما از مشرق　　کہ مرا دیدن آں ماہ تمام ست امروز

سید قاسم کہتے ہیں ؎

ہر کہ قانونِ شفائے دلِ خود می طلبد　　ز اشاراتِ نفس کار تمام ست امروز

غماز قافیہ۔ اس میں خواجہ حافظ لکھتے ہیں ؎

چہ گویمت کہ زسوزِ دروں چہ می بینم　　ز اشکِ پرس حکایت کہ من نیم غماز

سید قاسم نے "غماز" کا قافیہ اس طرح لکھا ہے ؎

ز چشمِ مست تو مستم کہ اہلِ صومعہ را　　دریدہ پردۂ تقویٰ بغمزۂ غماز

ایاز۔ اس قافیہ میں خواجہ حافظ نے زلفِ ایاز کو کرشمۂ حسن کی غرض ثابت کیا ہے ؎

غرض کرشمۂ حسن ست ورنہ حاجت نیست　　جمالِ دولتِ محمود را بزلفِ ایاز

مگر سید قاسم نے بجائے زلفِ ایاز کے، حسنِ ایاز نظم کر کے "لیلیٰ را بچشمِ مجنوں باید دید" کا کلیہ یاد دلایا ہے ؎

بنورِ دیدۂ محمود می تواں دیدن　　اشعۂ لمعاتِ جمالِ حسنِ ایاز

دوسرے مصرعہ میں لمعات سے پہلے جو لفظ ہے اُس مصرعہ میں باعتبار موزونیت ایک قسم کی ثقالت پائی جاتی ہے کیونکہ بغیر مشدد کئے مصرعہ موزوں نہیں ہوتا ممکن ہے کہ سہو کتابت ہو اور اس جگہ کوئی اور لفظ ہو۔

چاک ۔ خواجہ حافظ معشوق کی خوشبو سونگھ کر گریبان چاک کرتے ہیں ؎

نفس نفس اگر از باد نشنوم بویت ‌ ‌ ‌ ‌ زماں زماں کنم از غم چو گل گریباں چاک

دونوں مصرعوں میں تکرار نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ سید قاسم نے چاک کا قافیہ لکھا ہے لیکن نہایت کمزور ؎

چہ بود قصہ لیلیٰ دریں نشین خاک ‌ ‌ ‌ ‌ چہ بود حالت مجنوں ست دامن چاک

حاشاک ۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں اگر تیرے خیال میں دونوں آنکھیں سو جائیں یا تیرے فراق میں دل کو صبر آجائے کیا ایسا ممکن ہے ؟ ہرگز نہیں۔

رود بخواب دو چشم از خیال تو ہیہات ‌ ‌ ‌ ‌ بود صبور دل اندر فراق تو حاشاک

سید قاسم معشوق سے کہتے ہیں کہ تو اس درجہ لطیف و ظریف ہے کہ لطافت حسن کی وجہ سے تیرا کلبۂ احزاں میں قدم رکھنا ہی دور از قیاس ہے ؎

چناں لطیف و ظریفی کہ از لطافت حسن ‌ ‌ ‌ ‌ قدم بکلبۂ احزان من نہی حاشاک

" حاشاک " کے قافیہ کا سید قاسم نے ایک شعر اور بھی لکھا ہے مگر اس کا پہلا مصرعہ موزوں نہیں معلوم ہوتا ممکن ہے کہ کوئی لفظ چھوٹ گیا ہو ؎

ولی مظہر انساں کہ مظہر خاص ست ‌ ‌ ‌ ‌ قیاس مظہر دیگر مکن مگو حاشاک

ادراک ۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ ہر شخص کی نظر اپنی عقل و ادراک کے موافق تجھ کو دیکھتی ہے لیکن جیسا کہ تو ہے ویسا کہاں دیکھ سکتی ہے ؎

ترا چنانکہ توئی ہر نظر کجا بیند ‌ ‌ ‌ ‌ بقدر بینش خود ہر کسے کند ادراک

[illegible] اس کا کیسے ادراک

کر سکتی ہیں ؎

جہاں پرست ز نور خدائے عز و جل ولیک دیدۂ اعمش نمی کند ادراک

سید قاسم نے فقر و شاہی کا نہایت دلچسپ مکالمہ لکھا ہے۔ ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں

مکالمۂ فقر و شاہی

فقر می گفت کہ من اکسیر جاویدانم شاہ می گفت کہ من سایۂ آں سلطانم
فقر می گفت بہر جائے منم شمس منیر شاہ می گفت چنیں ست ولے تو دانم
شاہ می گفت کہ من حاکم بر و بحرم فقر می گفت کہ ہر دو بجوے نستانم
شاہ می گفت کہ من ملک جہانی دارم فقر می گفت کہ من جنت جاویدانم
فقر می گفت کہ فردا کہ قیامت گردد نہ غم از پل صراط ست نہ از میزانم
شاہ می گفت کہ صد درد و دریغیست مرا آں زمانے کہ بہ بدکردۂ خود درمانم
شاہ را گفتم چو نے بقیامت گفتہ ایں سخن از دگرے پرس کہ من حیرانم

اس میں پہلا مصرعہ غیر موزوں ہے۔

اندراں روز من محنت و غم آزادم ہر کجا بانگ لیسر کوسہ شد برانی رانم

اس مکالمہ کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ شاہ نہایت عاجزی سے شہنشاہ حقیقی کی بارگاہ میں سر بسجدہ

ہے اور اس طرح عرض پرداز ہے۔

بادشاہا بسر کوے نیاز آمدہ ام سر بکوے تو کہ عیدے و گہ قربانم
شہریارا بکرم عذر دل من بپذیر کہ بدرگاہ تو ہم بندہ و ہم سلطانم
قاسمی عمر گرامیست بغفلت مگذار عمر برباد شدہ اکنوں چہ بود درمانم

ایک بہت مشہور غزل ہے جس کا پہلا مطلع یہ ہے ؎ قصر جنت چہ کنم کوچۂ یارے دارم

ترس دوزخ نکنم روے نگارے دارم۔ سید قاسم نے اس طرح پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ منتخب دو شعر یہ ہیں:-

چشم گریان و دل زار و نزارے دارم　　در نہاں خانۂ دل نقش و نگارے دارم

ہمچو بلبل کہ بنالد بہ ہوائے گل مست　　با خیالش ہمہ شب نالہ زارے دارم

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ جن کا کلام "دیوان شمس تبریز" کے نام سے چھپا ہے ان کے دیوان کے صفحہ ۲۰۰ میں ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

با روے تو ز گلشن و گلزار فارغیم　　با چشم تو ز بادۂ و خمار فارغیم

سید قاسم نے اس زمین جو غزل لکھی ہے اُس میں ہو بہو یہی مطلع موجود ہے۔ صرف دو لفظوں "بادہ" اور "خانہ" کا فرق ہے بس دیکھئے ؎

با روے تو ز بادۂ و گلزار فارغیم　　با چشم تو ز خانۂ خمار فارغیم

اسی طرح مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے کہ

ما لاف می زنی و تو انکار می کنی　　ز اقرار جملہ عالم و انکار فارغیم

سید قاسم کی غزل میں یہ شعر بھی موجود ہے لیکن کسی قدر تبدیلی سے ؎

ما درد دوست را بدو عالم نمی دہیم　　ز اقرار ہر دو عالم و انکار فارغیم

حقیقت یہ ہے کہ پہلے مصرعہ نے مضمون بہت بلند کر دیا ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے "غمخوار" قافیہ اس طرح لکھا ہے اور خوب ہی لکھا ہے ؎

غم را چہ زہرہ باشد تا نام ما برد　　دستے بزن کہ از غم و غمخوار فارغیم

سید قاسم اسی قافیہ کو ایک دوسرے عنوان سے اس طرح باندھتے ہیں ؎

اے جان من اسیر مشو در طریق غم　　رقصے بکن کہ از غم و غمخوار فارغیم

اب ہم سید قاسم کے کچھ منتخب شعر لکھتے ہیں۔

حمد

من بیچارۂ سودا زدہ سرگردانم — کہ باوصاف خداوند سخن چون رانم
من و توحید تو ہیہات دلم می لرزد — اینقدر بس کہ حدیثت بزبان می رانم
من بسامان صفات تو کجا رہ یابم — عاجزم، خستہ دلم، بے سر و بے سامانم

نعت

علیہ الصّلٰوۃ و علیہ السّلامی — امینی زمینی امانی زمانی

ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

ای صبح سعادت زجبین تو ہویدا — این حسن چہ حسن ست تقدس تعالیٰ

نعت میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے دو شعر قابل ذکر ہیں۔ ایک مطلع ہے جسمیں تنہائی اور سوز و گداز کی تصویر کھینچی ہے ؎

جگر پر درد، دل پرخون، جان سرمست، تن رسوا — درین حالت نمی آید دو عالم در نظر ما را

دوسرا شعر یہ ہے ؎

محمد را الہیائی کنار خوان احسان بر — شراب از جام سبحان بر کہ سبحان الذی اسریٰ

۸۳۷ھ میں سید قاسم نے انتقال اور مولانا جامیؒ نے ۸۹۸ھ میں وفات پائی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا جامیؒ نے اسی قصیدہ پر وہ غزل لکھی ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

ز روح سینہ اش جامی الم نشرح لک برخوان — ز معراجش چہ میخوانی کہ سبحان الذی اسریٰ

مولانا جامیؒ نے جس خوبی سے "سبحان الذی اسریٰ" نظم کیا ہے سید قاسم اس عمدگی سے نظم نہ کر سکے۔ سچ ہے "ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء"۔ اب سید قاسم کے قصیدہ کے کچھ شعر اور سن لیجئے، جو دلچسپی اور خوبی سے خالی نہیں ہیں۔

تو بہار روے میموں را برافشاں جعد شبگوں را — کہ می یابم ز بوئے او نسیم جنت الماویٰ

اگر از اسم قہاری تجلی می کند ما را — بگو کر مرد اقراری نشان طامۃ الکبریٰ
پس آنگہ عالم افعال و آثار ست پیوستہ — زہے حکمت زہے قدرت تعالیٰ ربنا الاعلیٰ
زخورشید جمال او بہر وصفے می گویم — ہمہ ذرات می گویند شہدنا بعد آمنا
بباید رفتن و خفتن حدیث عشق بنہفتن — سخن گفتن ز اوصاف گر اوصاف لا تخفیٰ
بیا اے جان خوش سودا ببیں نور تجلی را — خطاب مستطاب را بگو لبیک ما اوحیٰ
توئی مومن توئی ایماں توئی سرچشمۂ حیواں — توئی سلطان جاویداں توئی مقصد توئی ملجا
شریعت از تو روشن شد طریقتہا مبرہن شد — حقیقتہا معین شد زہے یٰس زہے طٰہٰ
الا اے احمدؐ مرسل چراغ مسجد و منبر — توئی سید توئی سرور توئی از مسجد اقصیٰ

ایک موقع پر عاشقانہ انداز میں اپنی بیقراری اس طرح دکھاتے ہیں ؎

از حد گذشت قصۂ درد نہان ما — ترسم کہ نالہ فاش کند راز نہان ما

معشوق کے بغیر زندگی تلخ ہے اس کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

بے جمالت بوستان عشق ما را نور نیست — بیوصالت خاطر مہجور ما مسرور نیست

ہجر میں معشوق کا تصور ہے پھر اس سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ؎

اے دل و دلدار من راہ بوصل آنچہ روست — اے بت عیار من راہ بوصل آنچہ روست

توحید وجودی میں کہتے ہیں ؎

بچشم وحدت مطلق بدیدم روئے جاناں را — دریں حالت نمی آید دو عالم در نظر ما را

ایک عاشقانہ سلام لکھا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ہے جس کے نمونتاً چار شعر لکھے جاتے ہیں۔

نور ولایت توئی شاہ سلامٌ علیک — شمع ہدایت توئی شاہ سلامٌ علیک
لحمک لحمی ز نبی گفت ترا اے ولی — سرور مردان علی شاہ سلامٌ علیک

درج ویلائی برج مہ ھل اتیٰ   انت ولی الولا شاہ سلامٌ علیک

شیر ولایت توئی حسن ملاحت توئی   غایت غایت توئی شاہ سلامٌ علیک

مذکورالصدر شعر قافیہ کی قید سے آزاد ہے - اسی طرح یہ شعر ہے ؎

حیدر صفدر توئی ساقی کوثر توئی   خواجہ قنبر توئی شاہ سلامٌ علیک

ایک ایک شعر سے عقیدت ٹپک رہی ہے - کیوں نہ ہو آخر صوفی مشرب ہیں - ایک سلام اور لکھا ہے جس کے دو شعر نہایت ہی دلکش ہیں -

اے زلف و رخت سیگوں ای دوست سلام علیک   وے شیوۂ تو موزوں ای دوست سلام علیک

دریا ہمہ ہاموں شد دلہا ہمگی خوں شد   جاں جانب بیچوں شد ای دوست سلام علیک

طالب و مطلوب دونوں کا کمال اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

عشق بفرخندہ فال داد بوجہ کمال   عشق مرا لم یزل - حسن ترا لا زوال

جوش میں آ کے کہتے ہیں ؎

مائیم کہ چوں بادۂ گلرنگ بجوشیم   گہ بادہ بنوشیم گہے بادہ فروشیم

پھر ایک جگہ دیدار میں انتہائی شغف کی حالت اس طرح دکھاتے ہیں ؎

دینار نمی خواہم من عاشق دیدارم   اغیار نمی خواہم من شیفتۂ یارم

ہجر و فراق میں بحالت تنہائی معشوق سے اس طرح کہ رہے ہیں ؎

از نائرۂ شوقت در دل شررے دارم   با طلعت خورشیدت عشق و نظرے دارم

معشوق کے تصور میں مگن ہیں - اس کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

از دولت او شادم وز بند غم آزادم   در خلوت جان و دل زیبا قمرے دارم

نفی و اثبات کے شغل کی اس طرح تعلیم دیتے ہیں ؎

لا دم الا الا دم لا برسر الا دم   من ہیچ لا یا بکنم ہیچ ندارم الا الاستان

کہتے ہیں اگر میرے دل پہ معشوق غمزوں کے تیر مارتا ہے تو کیا پروا - ابھی وہ اس سے بھی زیادہ

جفا کرے تب بھی میرا کام صدق و صفا رہنا چاہیئے ؎

ناوک غمزہ می زند بر دل من نگار من
صدرہ اگر جفا کند صدق و صفاست کار من

انسان میں تجلی الٰہی موجود ہے اس کو نہایت مدلل طریقہ سے بیان کرتے ہیں ؎

کے بدے ادراک در سمع و بصر
گر نبودے نور حق در ما و طین

حقائق میں اپنا تحیر دکھاتے ہیں ؎

بچہ نسبت کنند جاں کہ شدست در تو حیراں
تو بہیچ کس نہ ماند تو بہ ہیچ کس نمانی

رباعیاں

اشتیاقم بملاقات تو چنداں کہ مپرس
افتیاجم بمراعات تو چنداں کہ مپرس
دارم اُمید عنایات تو چنداں کہ مپرس
شادم از ذوق مناجات تو چنداں کہ مپرس

من بندۂ شیوہ ہائے شیریں تو ام
آشفتۂ طرہ ہائے مشکین تو ام
گفتی کہ بگو تا چہ کسی در رہ ما
مسکین تو مسکین تو مسکین تو ام

اے دلبر دلدار طلب گار تو ایم
اے منبع انوار طلب گار تو ایم
اے سالک اطوار طلب گار تو ایم
اے واقف اسرار طلب گار تو ایم

ہر چند کہ در زمانہ یک محرم نیست
بنیاد اساس دوستی محکم نیست
ما در ہمہ حال در غمش دلشادیم
چوں غم بسلامت ست دیگر غم نیست

دل عاشق چشم مست ترکانهٔ تست — تو شمعی و عالم همه پروانهٔ تست
جان و دل ما عاشق و دیوانهٔ تست — تو خانهٔ دل شدی و دل خانهٔ تست

خوں باری
در دیدهٔ چون سحاب من رحمت کن — بر فقر و نکو ساریٔ من رحمت کن
بر گریهٔ بیداریٔ من رحمت کن — بر مفلسی و خواریٔ من رحمت کن

تا بر سر کوی عاشقی منزل ماست — سرّی و ابدی و ازلی منزل ماست
تا نشأهٔ عشق تو ز آسایش ماست — سرنامهٔ نامها بنام دل ماست

یادگار اساتذہ حضرت اثر ردولوی

فصل بہار آئی مسرت کا جوش ہے — ہنگامہ ساز انجمن نای و نوش ہے

کیا خوش نوائی قلقل مینا گوش ہے — بے بادہ مست خاطر ہر بادہ نوش ہے

مر کر بھی پردہ داری سوز نہاں ہے — گو شمع ہے مزار پہ لیکن خموش ہے

اے چشم خونفشاں کوئی رنگ اپنا تو دکھا — سنتے ہیں اب فسانۂ غم بار گوش ہے

اے شوق بےخبر نگہ ناز فتنہ زا — صد برق خرمن خرد و عقل و ہوش ہے

مایوسیوں سے آہ تمنائیں مٹ گئیں — اب وہ نہ ذوق و شوق نہ جوش و خروش ہے

کیونکر طلسم جلوہ گہ راز کھل سکے — ہر کامیاب اہل تماشا خموش ہے

پھر دلفریب و روح فزا ہو وہی صدا — پھر محو اضطراب تمنائے گوش ہے

دیکھی ہے جس نے صورت حیرت فزا تری — شکل شبیہ آئینہ ہر دم خموش ہے

پھولے پھلے نہال تمنائے باغباں — ہر گوشۂ قفس سبد گل فروش ہے

ہاں اے اثر سنا کوئی روداد خونچکاں

مشتاق بگوش قصۂ عبرت نیوش ہے

محبت کی جیت

فرانس کے مشہور انشاپرداز و افسانہ نویس موپسان کا یہ ایک دل پذیر افسانہ ہے جسے مصر کے مشہور مرحوم و مغفور ادیب محمد تیمور نے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں عربی کا جامہ پہنایا۔ مترجم کا بیان ہے کہ "اس نے اس افسانے کے اشخاص اور زمان و مکان کو بدل دیا ہے اور اس کے ہر جزو میں مصریت پیدا کر دی ہے۔ اب اس میں روح کے سوا اصلی کاتب کی کوئی شے باقی نہیں ہے۔ یعنی روح فرانسیسی ہے اور قالب مصری! اس بات میں مترجم نے ٹالسٹائے کے نقش قدم کی پیروی کی ہے جو اس نے موپسان کے ایک قصہ کے ترجمے میں اختیار کیا تھا" میں نے اسے بجنسہ عربی سے اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اور لفظی و معنوی کوئی تغیر نہیں کیا۔

محوی

محمد بک عبدالقادر ایک پچپن سالہ شخص ہے، اس کی آنکھیں سیاہ، ناک لمبی، بھویں جُڑواں ہیں۔ مونچھیں ترشواتا ہے، داڑھی چھوڑ رکھی ہے۔ جب چلتا ہے تو آہستہ آہستہ سکون و وقار کے ساتھ، اور جب بیٹھتا ہے تو اپنی کُرسی پر پالتی مار کر، اپنے موزے اتار کر، یہ لمبا کوٹ پہنتا ہے، اس کے سوا یورپ کے لباس میں سے کوئی چیز پسند نہیں کرتا، اس لئے کہ یہ لباس بظاہر اپنی وضع قطع اور صورت شکل کے لحاظ سے ثقاہت لئے ہوئے ہے اور پرہیزگاری و تقوے کا لباس معلوم ہوتا ہے۔

محمد بک اپنی تمام بات چیت اور قول و فعل میں ایک پکا مسلمان ہے، وہ مذہب کے لئے گھلا جاتا ہے، اگر کسی ایسے بددین، ملحد سے مقابلہ ہو جائے جو خدا کو

ڈرتا ہو نہ رسول سے تو پوری مدافعت سے کام لیتا ہے، پردۂ نسواں کی ہر مجلس میں تائید کرتا ہے، خاصکر جہاں قدیم عادات کے پیرو اور پُرانی روشنی کی تقلید کے موافق و طرفدار لوگ ہوں تو اُن کی تائید کرتا ہے کسی نئی روشنی کے مسلمان نوجوان کو جب کسی دُکان پر بیٹھا ہوا جام شراب کے دور میں مصروف دیکھتا ہے تو اپنی جگہ پہ کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے، پھر غصّے میں زمین پر نفرت سے تھوکتا ہوا چل دیتا ہے۔ قرآنی آیات پڑھتا جاتا ہے۔ کریوں بنک میں تقریباً بیس ہزار پونڈ اُس کے جمع ہیں۔ مگر اس کا سود وغیرہ نہیں لیتا، خدائے عزوجل کے اس ارشاد کی پیروی میں کہ " احل اللہ البیع وحرم الربوا" (خدا نے لین دین کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام) وہ اسے ناجائز بلکہ حرام جانتا ہے۔

محمد بک ایک خوبصورت محل میں رہتا ہے، جو دریائے نیل کے کنارے پر بنا ہوا ہے، اور جسے ایک دل کشا باغ اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے۔ اس کے درخت جھوم جھوم پڑتے ہیں، جب نسیم خوشگوار انہیں دھیمے دھیمے ہچکولے دیتی ہے۔ اس میں ننھی ننھی خوبصورت چڑیوں کے جان نواز نغمے سننے میں آتے ہیں، جو نیل کی موجوں کے نغموں سے ملے جلے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حسین وریلکون موسیقی ایک عاشق مایوس کے کانوں کے لئے نوائے نغمۂ محبت ہے۔ جس وقت مغرب سے کچھ پہلے درختوں کی آڑ سے شفق سرخ نمودار ہوتی ہے، اور آسمان اپنا لال جوڑا پہنتا ہے تو دیکھنے والا یہ تصور کرتا ہے کہ یہ سرخی رات کے آنسوؤں کی ہے، جو دن کی روشنی کو وداع کرنے کے لئے نکل آئے ہیں۔ جس وقت اس گنبد نیلی فام پر چاند کسی رات جلوہ پیرا ہوتا ہے، خاصکر جب کہ رات بھی موسم گرما کی ہو، تو دلکشی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ طلوع فجر تک دیکھنے والے کا جی باغ سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا۔ یہ ایک بڑی خوش نصیبی ہے جو خدائے برتر نے اس نیک بخت بوڑھے کو اپنے خزانہ قدرت سے عطا کر رکھی ہے۔ اس کی نیک بختی، پرہیزگاری

اور اس کی عبادت و ریاضت کے صلے ہیں۔ اس کی بدولت بک کا دل مسرور اور آنکھیں ٹھنڈی رہتی ہیں۔ اس کے چہرے پر خوشی و مسرت کی چمک ہوتی ہے، جب وہ خدا کا نام لیتا ہے اور اس کی پیشانی پر نور مسرت نمایاں ہوتا ہے، جب وہ اپنے نبی کریم پر درود بھیجتا ہے۔ یا کوئی دعا پڑھتا ہے۔

مگر محمد بک عبدالقادر کی اولاد صرف ایک حسین صورت، خوش کلام، خوش اندام دوشیزہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ یہ دوشیزہ گلستان شعر کی وہ نرگس جمیلہ ہے جس کے آگے ہر بلند خیال و بدیع فکر شاعر ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ وہ کچھ اوپر بیس ۲۰ سال کی عمر کو پہنچ چکی ہے، اور اب اس کے شفیق باپ کو زیادہ تر اسی کے بیاہ شادی کی فکر دامنگیر رہتی ہے، وہ اپنی شریک زندگی بیوی سے اس بارے میں بارہا بات چیت بھی کر چکا ہے، نیز کئی ایک امیر خاندان کے نوجوانوں کے نام بھی بتا چکا ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک نوجوان کو انتخاب کرتے ہیں جس میں انہوں نے مطلوبہ اوصاف پائے ہیں مگر لڑکی اس نوجوان سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیتی ہے، ماں بیٹی میں جو کچھ بات چیت ہوئی تھی، اس کی اطلاع ماں نے اپنے شوہر کو دی۔ یہ انکار اسے سخت ناگوار ہوا اور اس نے بہت کچھ افسوس کیا تھا ایک دوسرا لڑکا انتخاب کیا اور ماں کے ذریعے لڑکی کو اطلاع دی۔ مگر لڑکی نے اس نسبت سے بھی نارضامندی ظاہر کی بلکہ شادی ہی سے انکار کر دیا۔ نوجوان لڑکی کے شادی سے اظہار بیزاری نے باپ کو سخت غضب ناک کر دیا۔ ماں باپ کے حکم سے بیٹی کی اس نافرمانی نے سارے گھر میں ایک قیامت برپا کر دی۔ غصے میں جو کچھ بک کے دل اور منہ میں آیا اس نے اپنی بیٹی کو کہہ سنایا، خوب ڈانٹا ڈپٹا اور نہایت درجہ ناراضی کا اظہار کیا۔ محمد بک کی اس بیجا محبت نے جو اسے ہر قدیم عقیدے کے ساتھ

تھی، خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا۔ اُسے پہلے نوجوان کے ساتھ لڑکی کو بیاہ دینے پر آمادہ کردیا۔ اور اس نے اپنا یہ حکم ناطق لڑکی کے کانوں تک پہنچا دیا۔ وہ بھی اس سختی کے ساتھ جو اس سے پہلے اس نازپروردہ بیٹی نے اپنے نیک بخت باپ کی جانب سے کبھی نہیں دیکھی تھی مگر لڑکی نے صبر و خاموشی اور آنسوؤں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔

(۴)

ماں ایک آنکھ یہ نہ دیکھ سکی کہ اس کی پیاری بیٹی زار زار روئے، اُسے یہ گوارا نہ ہوا کہ اس دوشیزہ کی جوانی یوں خاک میں ملے، اور اس کا جائز حق چھین لیا جائے اُس کی شباب کی امیدوں کو پامال کیا جائے، وہ اس کی حسرتوں کو یوں ساحل یاس پر چھوڑ دے۔ ماں ایک روز سویرے اپنی بیٹی کے پاس تنہائی میں گئی، جبکہ اُس کا باپ کسی دوست سے ملنے کے لئے گھر سے باہر گیا ہوا تھا اُس نے پہلے تو یہ عہد کیا کہ اپنے شوہر کے ہر ظلم و ستم کے مقابلے میں وہ ایک قوی بازو معاون ہوگی پھر قسم دے کر لڑکی سے شادی کے بارے میں گفتگو کی۔ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر ماں کے آگے رونے لگی، اور رو رو کر اس سے رحم و امداد کی طالب ہوئی۔ مگر زبان سے اُس نے کچھ نہ کہا۔

آخر یہ لڑکی اس قدر بلک بلک کر کیوں روئی؟ اتنی بیتاب اور بے قرار کیوں ہوئی؟ آخر وہ کیا بلا ہے، جس نے اُس کے پاک دل میں یہ چھپی ہوئی آگ بھڑکائی؟ ہر دوشیزہ شادی کی آرزومند ہوتی ہے، امیر اور حسین نوجوان کو پسند کرتی ہے، اس کے باپ نے جو لڑکا اس کی شادی کے لئے انتخاب کیا ہے، وہ خوش اخلاق ہے، شریف النسب بھی ہے، خوش اندام اور خوبصورت بھی، روپے والا بھی ہے اس کے ساتھ شادی کرنے سے کیوں انکار کرتی ہے؟ غالبًا اس میں کوئی اور راز

ہے! یہ باتیں تھیں جو اُس کی ماں اپنے دل سے کر رہی تھی۔ اور اپنی بیٹی کے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ جب لڑکی سسکیاں لیتے لیتے ذرا رُکی تو اس کی ماں نے اپنی شفقت اور رحم سے بھری ہوئی آواز میں اس سے کہا:

بیٹی! میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اُسی لڑکے کے ساتھ تیری شادی کروں گی جس کے لئے تو اپنی جان دئے دیتی ہے، مگر یہ تو بتا کہ وہ ہے کون؟

لڑکی نے اپنا سر جھکا لیا اور کچھ اس انداز سے آہستہ آہستہ مسکرائی کہ جو راز اب تک اُس کے دل میں دفن تھا، وہ اس کی ماں پر آئینہ ہوگیا۔ ماں نے اُسے پیار کر کے کہا:

آخر وہ ہے کون؟

لڑکی خاموش رہی، اور اپنا سر ماں کے کاندھے پر رکھدیا۔ ماں نے نہ چاہا کہ اب زیادہ سوالات کی بوچھار سے اپنی بیٹی کے نازک دل کو پریشان کرے، جو کچھ وہ سمجھ چکی تھی، اُس پر اکتفا کی۔

(۳)

محمد بک اپنے گھر آیا، اس کی بیوی اُس سے تنہائی میں ملی، اور اپنے شوہر سے درخواست کی کہ اس نامبارک شادی کو تھوڑے دنوں کے لئے ملتوی رکھے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ ماں نے بہت عاجزی کے ساتھ رحم و کرم کے ہر دروازے کو کھٹکھٹایا لیکن کوئی نہ کھلا۔ بک کو یہ امر سخت ناگوار تھا کہ وہ اس معرکے میں مغلوب ہو۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ آج اس کی شکست اُس کی جیت سے بہتر ہے۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا:

غالباً لڑکی کسی اور لڑکے کو پسند کرتی ہے اور اُسی سے نکاح کرنا چاہتی ہے؟

ماں نے بگڑ کر کہا: اگر ایسا ہے بھی تو ہمارے لئے نقصان کی کیا بات ہے،

"نقصان کی کیا بات ہے! یہ خوب کہی - ناسمجھ عورت! تو آگ کے ساتھ کھیل رہی ہے - میں اس لڑکی پر آسمان کی شفاف فضا اور سورج کی روشنی تک حرام کردونگا میں اُسے ایک اندھیری کوٹھری میں قید رکھوں گا اور جب تک میں زندہ ہوں، یہ ایک راہبہ کی زندگی بسر کرے گی"

وہ کمرے سے نکلا، جیسے کوئی دیوانہ، اور اپنی لڑکی کو آواز دی - لڑکی فوراً ایک فرماں بردار بیٹی کی طرح آئی، محمد بک نے آتے ہی گالیوں کی بوچھار شروع کردی اور برا بھلا کہتے کہتے اتنا طیش میں آیا کہ اگر اس کی بیوی بیچ میں نہ آجاتی تو غالباً جوان لڑکی کو وہ مار بیٹھتا - وہ اب گھر سے نکلا، اُس کے چہرے سے غصے کے آثار نمایاں تھے -

اس واقعے کو دو ماہ گزر گئے، اس اثنا میں کوئی نئی بات پیش نہ آئی - اس گھر پر ایک سناٹا چھایا رہا، محمد بک بالکل چپ تھا - اس نے آئندہ اس ناخوش گوار موضوع پر ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا، لیکن غصے کی آگ اس کے دل میں شعلہ زن تھی، اُس کی بیوی بھی خاموش تھی، مگر حقیقت میں وہ اپنی بیٹی کے رنج وغم پر دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی، وہ بہت اداس اور غمگین رہتی تھی، ادھر نوجوان لڑکی تمام تمام دن اور ساری ساری رات رو رو کر گزارتی، بغیر اس کے کہ کسی پر بھی اس کا دکھ درد ظاہر ہو وہ اس مصیبت کو استقلال سے برداشت کر رہی تھی - وہ چپکے چپکے راتوں کو بستر پر رو رو کر اپنی بھڑاس نکالتی تھی، اس کے لئے صرف آرزو کی ایک دھندلی سی روشنی زندگی کا سہارا تھا - مگر وہ روشنی بھی جھوٹی ثابت ہوئی، امیدوں اور حسرتوں کا ایک عارضی جلوہ تھا مگر وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا! سلام ہو اس کی گزشتہ خوش نصیبی پر اور سلام ہو اس کی ہر مردہ امید و آرزو پر!

ایک روز کا واقعہ ہے کہ محمد بک نے اپنی عادت کے موافق رات کا کھانا کھایا، قہوے کی دو پیالیاں پیں، پھر سگار سلگایا، اور اُسے ختم کرکے نمازِ عشا پڑھی۔ نماز پڑھکر وہ اپنی جانماز سے دو گھنٹے کے بعد اٹھا، جس میں اس نے چالیس وظائف پڑھ ڈالے، اٹھکر وہ ذرا دیر ٹہلتا رہا۔ پھر اپنے سونے کے کمرے میں داخل ہوا پلنگ پر لیٹ کر دیر تک آنکھیں بند کئے اس کوشش میں رہا کہ نیند آجائے لیکن اس ارادے میں کامیاب نہ ہوا۔ آخر چپکے سے اپنے باغ کیطرف نکل آیا، اس طرح کہ کسی کو اُس کے آنے کی خبر نہ ہو،

محمد بک اپنے شاداب و سرسبز باغ میں ٹہلنے لگا، اس نے اس خاموش رات میں نہایت فروتنی اور عاجزانہ بندگی کے ساتھ ایک نگاہ آسمان پر ڈالی، اُس نے دیکھا کہ معصوم چاندنی پھیلی ہوئی ہے، صاف اور شفاف چاند نکلا ہوا ہے جگمگاتے تارے چھٹکے ہوئے ہیں، اس منظر سے وہ بہت متاثر ہوا اور خدا کو مخاطب کرکے کہنے لگا "یارب! تونے یہ نعمت کس کے لے پیدا کی ہے؟"۔ پھر اُس نے درختوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ دیکھا کہ وہ بھی مزے لے لیکر کبھی داہنے کبھی بائیں کو جھوم رہے ہیں، نسیم بہار چل رہی ہے، اور گلاب کے پھولوں کی دو چار پنکھڑیاں، چمیلی کے پھولوں کی دو چار نرم و نازک پتیاں لا لاکر اس کے سامنے ڈالدیتی ہے، پھر محمد بک نے اپنے معبود کو پکار کر کہا: "خدایا یہ جنت تونے کس کے لئے پیدا کی ہے؟"

پھر اُس نے نہر کو دیکھا چاند کی نقرئی کرنیں نیل کی موجوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی ہیں، اور دیکھا کہ ایک کشتی چند لوگوں کو اپنی گود میں لئے تیرتی چلی جا رہی ہے یہ لوگ گاتے بجاتے، ہنستے ہنساتے، کشتی میں بیٹھے، نیل کی معصوم موجوں کو روندتے اور سطح آب کو پامال کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی دوران میں اُس نے ایک پرندے کی دلکش آواز سنی، جو اس خاموش رات کے سناٹے میں دیوانہ وار چہچہا رہا تھا۔

بک نے پھر اپنے خالق کو پکار کر کہا: الٰہی! یہ نعمت تو نے کس کے لئے پیدا کی ہے؟"
اب وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور ہر شے کو دیکھنے لگا، فطرت کی ہر اُس تصویر
کو جو کائنات کے مصوّر ازل نے اپنے ہاتھ سے صفحۂ ہستی پر بنائی تھی۔ وہ دیکھنے لگا اس
جمالِ قدرت کو جو خالقِ برتر کی عظمت و جلال کا پردہ فاش کر رہا تھا، اور اُس کی
قوت، اُس کی شفقت کا راز آشکارا کر رہا تھا۔ اس جنت کو جو محبت کا گہوارہ
اور جو لذت و نعیم کی ایک جلوت گاہ ہے اس نے پھر اپنے حقیقی آقا کو مخاطب کر کے
کہا: میرے معبود! تو نے یہ نعمتیں کس کے لئے پیدا کی ہیں" محمد بک کو اب اپنا وہ زمانہ
یاد آ گیا جب کہ وہ نوجوان تھا، اس کا دل یہ جمیل مظاہر۔ دیکھ کر ڈھرکنے لگا۔ اس نے
اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں، قرآن کریم کی کچھ آیتیں اور رسول اللہ کی کچھ حدیثیں
پڑھنے لگا۔ پھر آنکھیں کھول کر بولا: بیشک جنت صرف ......" اور نہ سمجھ سکا
کہ اب کون لفظ ہوگا جس سے جملہ پورا ہو سکتا ہے، وہ حیران تھا، آنکھیں کھلی کی
کھلی رہ گئی تھیں، اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ دو انسانی پیکر اُسی کی طرف بڑھتے ہوئے
چلے آ رہے ہیں۔ وہ ایک بڑے درخت کی آڑ میں چھپ گیا کہ دیکھنے والوں کی نظروں
سے اپنے آپ کو پنہاں رکھ سکے، اس کا دل دھڑکنے لگا، اور وہ اپنے جی میں کہنے
لگا: "وہ آخر یہ کون اجنبی ہے جس نے میرے باغ میں یوں پھرنے کی جرأت کی اور
وہ بھی آدھی رات کے قریب" دونوں مورتیں اس سے بالکل پاس آ گئیں۔ وہ
غور سے دونوں کو تاڑنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اُس کی حسین نوجوان بیٹی ایک خوبصورت
نوجوان کے پہلو بہ پہلو چلی آ رہی ہے اور اس نے اپنا سر اس نوجوان کے کاندھے پر رکھ دیا
ہے۔ نوجوان کی صورت خوب غور سے دیکھنے کے بعد محمد بک نے اُسے پہچان لیا، اور
اپنے جی میں کہنے لگا "ارے یہ تو وہی مفلس جوان ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتا
تھا، جب ہم محلہ حمزادی میں مقیم تھے۔ یہ دونوں مورتیں اس درخت کے قریب

ٹھہر کر باتیں کرنے لگیں ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر کہ بک ان کی باتیں خوب سن سکتا تھا۔
نوجوان نے کہا: "میری محبوبہ! میں تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑنے پر آمادہ ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ اپنی پاک اور شریفانہ محبت کے سچے عہد پر قائم رہوں گا، یہاں تک کہ میری ہڈیاں سپرد خاک ہوں"

دوشیزہ نے جواب دیا: "اور میں بھی قسم کھا کر تم سے یہی عہد کرتی ہوں"
نوجوان نے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ باغ کے دروازے کیطرف چلا تاکہ اپنے گھر کو رخصت ہو۔

اب بک اپنی کمین گاہ سے نکلا، وہ بالکل خاموش اور سناٹے میں تھا۔ دیر تک چُپ کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ اُس نے پھر آسمان، نہر اور باغ کے درختوں کو دیکھا، اُس نے قدرت کے حسن کو، اس انسانی نعیم کو پھر ایک نگاہ دیکھا اور جو کچھ سنا اور دیکھا تھا، تھوڑی دیر اس پر سوچکر بولا: "میرے آقا! بیشک یہ نعمت تو نے اہل محبت ہی کے لئے پیدا کی ہے اور میری جان عزیز کی قسم یہ محبت ہی کی جنت ہے" اب اس نے چند آیتیں تلاوت کیں، پھر اپنے گھر میں داخل ہوا، اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جو اس کے سکون اور اطمینان، اس کی کامگاری اور رفع پریشانی کی معنی خیز عبارت تھی۔

اس واقع کو ایک مہینے کی مدت گزر گئی، اس مہینے کے آخر میں ایک شادی کی شاندار تقریب عمل میں آئی۔ یہ تقریب تھی، ایک امیرزادی کی ایک غریب لڑکے کے ساتھ شادی کی! اور یہ شادی حقیقت میں دنیا کی ہر مشکل اور ہر چیز پر محبت کی جیت تھی!!

خمسہ بر غزل حکیم سنائی

رہی دن رات ظرافت میں بہت ہرزہ سرائی — نہ ہوئی ذہن کو جس سے رہ عقبیٰ میں رسائی
مگر اب غیب سے یہ بات مرے جی میں ہے آئی — ملکا ذکر تو گویم کہ تو پاکی و خدائی
نروم من بجز آں رہ کہ تو آں راہ نمائی

طلب وصل میں تیری میں بنوں عشق مجسم — سر شوریدہ سے یارب نہ یہ سودا ہو کبھی کم
یہ تمنا ہے کہ جبتک کہ رہے دم میں مرے دم — ہمہ درگاہ تو جویم - ہمہ در راہ تو پویم
ہمہ توحید تو گویم کہ بتوحید سزائی

کوئی کعبہ کا ہے ساکن تو گیا کا کوئی باشی — کوئی گرجا کا ہے شیدا کوئی دل دادۂ کاشی
ہے وے متفق اس بات پہ ہر ایک متلاشی — نہ بدے خلق تو بودی - نہ بود خلق تو باشی
نتو خیزی نہ نشینی - نتو کاہی نفزائی

تو ہے اوراک سے بالا تو ہے اندیشہ سے فایق — نہ کھلے بحث و دلائل سے کبھی تیرے حقایق
وہ تجھے دل ہی میں پالیتے ہیں جو تیرے ہیں شایق — نہ سپہری - نہ کواکب - نہ بروجی - نہ دقایق
نہ مقامی - نہ منازل - نہ نشینی - نہ بپائی

کوئی ہندی ہو کہ شامی - عجمی ہو کہ حجازی — وہ ہو سرمد کہ ہو منصور - وہ طوسی ہو کہ رازی
جو ہے اس راز سے واقف وہی لیجائیگا بازی — بری از چون و چرائی بری از عجز و نیازی
بری از صورت رنگیں بری از عیب و خطائی

نہ تو ہے جان سے زندہ نہ تو رکھتا ہے کوئی تن — نہ تو اعضا نہ جوارح نہ لباس اور نہ دامن
نہ تو فرزند ہے تیرے نہ کفو ہے نہ کوئی زن — بری از خفتن و خوردن بری از تہمت مردن

بری از بیم و امیدی ۔ بری از رنج و بلائی

کروں ہر لحظہ ثنا تیری یہی چاہتا ہے جی | مگر عاجز ہوں پیمبر تو بھلا کیا مری ہستی
نہ یہ قدرت ہے قلم کی نہ یہ طاقت ہے زبانکی | نتواں وصف تو گفتن کہ تو در وصف نگنجی

نتواں شرح تو کردن کہ تو در شرح نیائی

نہ چھپی تجھ سے تھی کیفیت یوسفؑ باسیری | جو تھی ادہم کو تری دھن انہیں دلوائی فقیری
یہی فاروقؓ سمجھتے تھے باایں شان امیری | تو علیمی ۔ تو حکیمی ۔ تو خبیری ۔ تو بصیری

تو نمائندہ فضلی تو سزاوار خدائی

وہی ہم تھے نہ سوا تیرے کسی سے بھی دلی | وہی ہم ہیں کہ صفت ایک بھی باقی نہیں اگلی
تری رحمت سے پھر اب عود کرے حالت اصلی | احد الیس کمثلی ۔ صمد الیس کفضلی

لمن الملک تو گوئی کہ سزاوار خدائی

یہی شاپور گنہگار کو مرشد سے ملا پند | کہ کرے ذکر خداوند جہاں گر ہے خردمند
رہے ہر وقت یہی دھن نہو جبتک کہ زباں بند | لب و دنداں سنائی ہمہ توحید تو گویند

مگر از آتش دوزخ بودش زود رہائی

شاپور کرمانی وکیل

غزل

ہے مرے واسطے پھر دامن صحرا بیتاب

کب سے ہے دیدۂ مضطر میں تمنا بیتاب
اور ہے تیری تمنا میں کلیجہ بیتاب

جاذبہ موج تنفس کا خبر دیتا ہے
کہ ہے قطرہ کے لئے دامن دریا بیتاب

میں وہ میکش ہوں ازل ہی سے مری واسطے تھے
ساقی و جام و صراحی مے و مینا بیتاب

مستیاں کہتی ہیں ساقی تری آنکھوں کی یہی
پھر میکش ہے ہر اک قطرۂ صہبا بیتاب

آج اُسی حسن خود آرا کا ہوں آئینہ میں
تھا مرے واسطے کل جس کا تماشا بیتاب

دیکھئے بحر حقیقت کا ملے کب ساحل
ہے مرے قلب میں پھر موج تمنا بیتاب

در حقیقت میں وہ خاکہ ہوں کہ تھا روز ازل
خود حقیقت کا مرے واسطے نقشا بیتاب

دیکھئے روح تجلی کی وہ کب تک پھونکیں
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب

اس لئے جی نہیں گلشن میں بہلتا اے درد
ہے مرے واسطے پھر دامن صحرا بیتاب

درد کاکوروی

اقتباسات

اقلیتوں کے مسئلہ کو یورپ نے کیونکر حل کیا؟ لکھنؤ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر رادھا کمد مکرجی نے مندرجہ بالا عنوان پر ایک قابلانہ مضمون ۲۶ر فروری ۱۹۲۹ء کو اراکین کونسل صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے سامنے پڑھا تھا، پھر اسی مضمون کو ۲ر اپریل ۱۹۲۹ء کو اراکین لیجلیٹو اسمبلی کے سامنے پڑھا۔ اس مضمون میں قابل پروفیسر نے یہ واضح کیا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کو حل کرنے میں جو دشواریاں اقلیتوں کے حقوق طے کرنے میں اس وقت پیش آ رہی ہیں یہ کچھ ہندوستان ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ اقلیتوں کا مسئلہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ جنگ عظیم کے بعد یورپ میں بہت سی نئی چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں کے قیام کی اصل وجہ اگر تلاش کیجائے تو یہی اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ تھا، اور اگر ان نئی ریاستوں کے دستور اساسی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

جنگ عظیم کے بعد جب صلح کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی تو فاتح اقوام کے نمائندے اس اصول پر متفق تھے کہ مختلف اقوام جن کی زبان ایک ہو اور ایک نسل سے ہوں لیکن سیاسی حیثیت سے مختلف ریاستوں میں بٹی ہوئی ہیں انکو ایک ریاست میں متحد کر کے سیاسی حیثیت سے خودمختار تسلیم کر لیا جائے۔ اس لئے کہ یورپ کی خانہ جنگیوں میں ہمیشہ سے اسی تفریق کی وجہ سے ابتری رہی ہے۔ اس اصول سے بہر حال کسی کو اختلاف نہ تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس پر کلیتہً عملدرآمد ممکن العمل نہ تھا۔ یہ مشکل تھا کہ ہر نسل کی چھوٹی سے چھوٹی آبادی کو ایک علحدہ خودمختار ریاست بنا دیا جائے اور یہ بھی دشوار تھا کہ مختلف النسل آبادیوں کو ایک ہی ریاست کے اندر

یکجا ہونے سے قطعاً روک دیا جائے۔ اس لئے (سیلف ڈٹرمینیشن) یعنی خودمختاری کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے "تحفظ حقوق اقلیت" کے اصول کو بھی تسلیم کرنا پڑا تاکہ اس کی بنیاد پر مختلف عنصر، مختلف تمدن اور مختلف جماعتوں کو ایک مشترکہ خودمختار حکومت کے ماتحت یکجا کیا جا سکے۔

چنانچہ انہیں دو اصولوں یعنی "تحفظ حقوق اقلیت" اور "خودمختاری" کے ماتحت یورپ کی ازسرنو تعمیر کی گئی اور مختلف ریاستوں کے حدود اربعہ میں وہ اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں جن کی وجہ سے قدیم ریاستوں کا نقشہ بالکل بدل گیا اور بہت سی جدید چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ وہ قدیم ریاستیں جن میں سے اقلیتوں کو علیحدہ کر کے کوئی جدید ریاست نہیں قائم کی گئی وہ آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ اور ترکی ہیں۔ ان حکومتوں سے جو معاہدے اتحادیوں نے بعد از جنگ کئے ہیں ان سب میں خصوصیت اور اہمیت کے ساتھ ایک دفعہ تحفظ اقلیت کے لئے رکھی گئی ہے چاہے یہ اقلیت بربنائے مذہب ہو یا بربنائے نسل و زبان۔ انکے علاوہ جو جدید ریاستیں قائم کی گئی ہیں مثلاً پولینڈ زیکوسلوویکا، سرب کروٹ سلوین، وغیرہ، ان سے اتحادیوں نے علیحدہ اور مخصوص طور پر معاہدے لئے ہیں جو "معاہدہ برائے تحفظ حقوق اقلیت" کے نام سے مشہور ہیں۔

انجمن بین الاقوامی نے ان معاہدوں کے مطابق اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی نگرانی کے لئے ایک خاص شعبہ قائم کیا ہے اور انجمن میں داخلہ کی یہ ایک شرط قرار دی گئی ہے کہ داخلہ سے قبل ہر ریاست کو اپنی اقلیتوں کے تحفظ حقوق کے مسئلہ پر انجمن کو ہر طرح کا اطمینان دلانا ہوگا۔ انجمن نے یہ بھی صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ یہ تحفظ صرف مذہبی اور لسانی اقلیتوں تک محدود ہوگا۔ سیاسی اور دیگر سماجی اقلیتوں کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

مختلف جدید ریاستوں نے اپنی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ جس طریقہ پر کیا ہے اس کا اندازہ انکے دستور اساسی کے مختلف دفعات سے ہوتا ہے۔ اور پروفسر ممدوح نے ان دفعات کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً "حکومت سرب کروٹ سلوین" کے دستور اساسی کی دفعہ ۱۲ قابل ذکر ہے جس میں مذہب اور ضمیر کی آزادی ہر شخص کو دی گئی ہے۔ یا ایک دوسری دفعہ میں نسلی اور لسانی اقلیتوں کے ابتدائی تعلیم انہیں کی مادری زبان میں دئے جانیکا قاعدہ رکھا گیا۔ ریاست پولینڈ کے دستور اساسی کی دفعہ ۱۱ میں تمام مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو حق دیا گیا ہے کہ اگر چاہیں تو اپنے مصارف سے خیراتی اور مذہبی تعلیم گاہیں اور دیگر سماجی ادارے قائم کریں۔ ان میں اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام کریں اور مادری زبان کو ترقی دیں۔ ان اداروں اور تعلیم گاہوں کے انتظام اور انصرام میں حکومت کوئی مداخلت نہ کرے گی۔ کچھ عرصہ ہوا جب جرمنی اور روسی حکومت نے اس امر کی شکایت کی تھی کہ پولش حکومت غیر پولش اقوام کے ساتھ جو قلیت میں ہیں۔ "معاہدہ تحفظ اقلیت" کے مطابق برتاؤ نہیں کرتی ہے چنانچہ ۱۹۲۴ء میں گرابسکی کی وزارت نے چند نئے قوانین اقلیتوں کے اطمینان کے لئے بنائے تھے ان میں سے ایک دفعہ یہ لکھی تھی کہ جن علاقوں میں غیر پولش اقلیتیں آبادی کی ۲۵ فیصدی ہوں وہاں کے مدارس میں ۴۰ بچوں کے والدین کی درخواست پر اس اقلیت کی مادری زبان میں تعلیم ہوسکتی ہے۔ زیکوسلووک جمہوریت کے دستور اساسی کی دفعہ ۱۳۲ میں یہ قاعدہ رکھا گیا ہے کہ سرکاری خزانہ کی منظور شدہ رقوم میں سے ایک معقول اور مستند بہ رقم اقلیتوں کی تعلیم کے لئے علیحدہ اور مخصوص کردیجائے گی۔ اسی طرح اسٹریا اور ہنگری کے دستور اساسی اور معاہدوں میں یا ترکی کے ساتھ جو معاہدہ لوزان میں کیا گیا تھا ان سبھوں میں اقلیتوں کی تعلیم کے لئے مخصوص انتظام اور دیگر امور کے متعلق صاف اور صریح دفعات موجود ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں جن دفعات اور معاہدوں کا ذکر کیا گیا انہیں طریقوں پر ہندوستان میں اقلیتوں کے مسئلہ کو حل کرنیکی کوشش کرنی چاہئے۔ یورپ میں جن ممالک کو اقلیتوں کے معاملہ میں بین الاقوامی تصفیہ کا پابند بنایا گیا ہے انکا اگر ہندوستان کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو حسب ذیل امور قابل لحاظ ہونگے۔

(۱) - جو نئی ریاستیں صلح کانفرنس کے معاہدہ کے بعد اتحادیوں نے قائم کی ہیں ان میں کہیں کسی ایک قوم کی اکثریت اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی کہ ہندو اکثریت ہندوستان میں ہے۔ مثلاً پولش اکثریت کا تناسب ۶۹ فیصدی ہے۔ زیکو سلووک کا ۶۴ فیصدی، سرب کروٹ کا ۷۳ فیصدی اور ہندو اکثریت کا ۷۵ فیصدی۔

(۲) اقلیتوں کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور دشوار زیکوسلووک کا ہے جہاں جرمن متمدن تعلیمیافتہ اور طاقتور اقلیت سے سابقہ ہے۔ جرمن اقلیت کا تناسب ۲۳ فیصدی ہے۔ ہندوستان میں اسی طرح مسلمان اقلیتوں کا معاملہ ہے جن کی آبادی کا تناسب ۲۴ فیصدی ہے لیکن حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ ریاست زیکوسلووکا نے اپنے ملک کی اقلیتوں کے مسئلہ کو حل کیا ہے۔

(۳) کوئی اقلیت اس وقت تک سیاسی حیثیت سے نہیں تسلیم کیجاتی ہے جب تک کہ وہ ایک خاص تناسب میں نہو۔ بعض دستوراساسی میں یہ تناسب مقرر کردیا گیا ہے اور جہاں نہیں مقرر کیا گیا ہے وہاں پڑوس کی ریاستوں کے مسلمہ معیار کو تسلیم کرلیا جاتا ہے پولینڈ میں کسی اقلیت کو سیاسی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لئے اسکا تناسب کم از کم ۲۵ فیصدی ہونا چاہئے۔ زیکوسلووکا میں ۲۳ فیصدی اور ہنگری میں ۲۰ فیصدی۔

اب اگر اس بین الاقوامی معیار تناسب کا اطلاق ہندوستان پر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کا تناسب ۲۵ فیصدی ہے اس لئے بین الاقوامی معیار کے مطابق جہانتک ہندوستان کا کلی حیثیت سے تعلق ہے مسلمانوں کے مخصوص حقوق کا تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر علٰحدہ علٰحدہ صوبوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بعض صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور دیگر صوبجات میں انکی اقلیت ہے وہاں وہ اتنی قلت میں ہیں کہ بین الاقوامی تناسب سے گر گئے ہیں۔ آخرالذکر صوبجات میں جہاں انکی اقلیت سب سے زیادہ طاقتور ہے وہ صوبہ متحدہ آگرہ اور اودھ ہے۔ اور یہاں بھی انکی اقلیت کا تناسب ۱۵ فیصدی ہے۔ اس لئے بین الاقوامی تصفیہ کی روشنی میں جہانتک صوبجات کا تعلق ہے اقلیت کا مسئلہ حقیقۃً ایک ہندو اقلیت کا مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ پنجاب اور بنگال دونوں صوبوں میں ہندوؤں کی اقلیت کا تناسب ۴۴ اور ۴۶ فیصدی ہے جو بین الاقوامی تناسب کے مقررہ معیار سے کہیں زیادہ ہے البتہ مرکزی حکومت کا جہانتک تعلق ہے مسلمانوں کی اقلیت کا مسئلہ البتہ قابل غور ہے۔

(۴) کسی ریاست میں مقامی طور پر بھی اقلیتوں کی آبادی کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیے کہ ان کی تعداد اکثریت کے مقابلہ میں بہت زیادہ نہ گھٹ جائے ورنہ اقلیت کے ساتھ وہ خاص مراعات نہیں کئے جا سکتے۔ جن کی پابندی ازروئے معاہدہ یا دستور اساسی کی دفعات کے مطابق عائد ہوتی ہے۔

(۵) اقلیتوں کے مذہبی اور لسانی مفاد کے تحفظ کے لئے اکثر ریاستوں کے دستور اساسی میں اقلیتوں کی تعلیم وغیرہ کے متعلق آسانیاں فراہم کرنے کے لئے صاف اور صریح طور پر ذکر ہے نیز آبادی کے تناسب اور اسی لحاظ سے سرکاری مدارس میں طلبہ کی تعداد یا کسی اقلیت کے لئے علٰحدہ مخصوص

سرکاری مدارس قائم کرنیکے لئے قاعدے مقرر کردئے گئے ہیں۔

(۶) کسی دستور اساسی یا کسی معاہدے میں جو مراعات کسی اقلیت کے ساتھ کی گئی ہے وہ صرف انکی مذہبی، لسانی اور نسلی خصوصیات یا مخصوص رسم ورواج کے لحاظ سے کی گئی ہے۔

(۷) سیاسی اقلیت (مثلاً لبرل یا اشتراکی جماعت) یا سماجی اقلیت (برہمن اور غیر برہمن یا اچھوت کے) حقوق کے تحفظ کا اصول کسی دستور اساسی میں تسلیم نہیں کیا گیا ہے

(۸) کسی دستور اساسی میں تحفظ حقوق اقلیت کے لئے فرقہ وارانہ حلقہاے انتخاب کا اصول نہیں تسلیم کیا گیا ہے۔ بلکہ بنیادی اصول یہ قرار پایا ہے کہ ریاست کے اندر صرف ایک ہی قومیت ہوگی نیز یہ کہ مذہب، نسل اور زبان سے قطع نظر ہر شخص کو کامل مساوی سیاسی اور شہری حقوق حاصل ہونگے

(۹) تحفظ حقوق اقلیت دستور اساسی کی صاف اور صریح دفعات کے ذریعہ کیا گیا ہے اور جمہوری نظام حکومت کے انتخابات اور دیگر سیاسی تغیرات سے ان کا کوئی تعلق نہیں رکھا گیا ہے۔

(۱۰) نمائندگی، سرکاری ملازمت، اور انتظام حکومت کے معاملہ میں اقلیتوں کے مخصوص مفاد کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

غرض اقلیتوں کے اہم مسئلہ کو انجمن بین الاقوامی نے حل کرنیکی کوشش کی ہے اور اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ پھر ہندوستان جو اس انجمن کا ایک رکن ہے کیوں نہ بین الاقوامی اصول اور معیار کے مطابق اور ان تجربات کی روشنی میں جو یورپ کی مختلف ریاستوں کو گذشتہ ۱۰ سال کے اندر ہوئے ہیں۔ اپنے اقلیتوں کے تحفظ حقوق کے مسئلے کو طے کرے۔

شذرات

امریکہ کے مشہور مخیر اینڈریو کارنیگی نے جہاں بنی نوع کی فلاح و بہبود کے لئے اور بہت سے ادارے قائم کئے وہاں کلیسا کی انجمن عامی امن کی بھی بنا ڈالی ۔ اس انجمن نے ۱۹۲۵ء میں اعلان کیا کہ وہ دنیا کے مذاہب کی ایک کانفرنس منعقد کرنا چاہتی ہے جس میں اس پر غور کیا جائے کہ مذہبی قوت سے کس حد تک جنگ کے انسداد اور امن کے قیام میں کام لیا جا سکتا ہے ۔ ستمبر ۱۹۲۸ء میں سوئٹزر لینڈ کے شہر جنیوا میں ایک ابتدائی کانفرنس کا اجلاس ہوا جس کی کارروائی ایک رسالے کی شکل میں شائع ہوئی ہے ۔

... ...

اس رسالے کا نام ہے "مذاہب عالم جنگ کے خلاف" اور یہ کانفرنس کی شاخ بمبئی کی طرف سے ہمارے پاس بھیجا گیا ہے ۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنیوا کی ابتدائی کانفرنس میں مختلف ممالک کے ایک سو نواسی (۱۸۹) نمائندے جمع ہوئے تھے جنہوں نے یہ طے کیا کہ سترہ آدمیوں کی ایک مجلس منتظمہ منتخب کی جائے جس کے صدر ڈاکٹر شیلر متھیوز اور سکریٹری ڈاکٹر اٹکنسن ہوں اور یہ مجلس ۱۹۳۰ء میں کسی مناسب مقام پر ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد کرے اور اس میں اپنی تجویز سے تمام اکناف عالم سے مختلف مذاہب کے نمائندوں کو بلائے ۔ یہ سب کے سب جمع ہو کر اس بات کا فیصلہ کریں کہ مختلف مذاہب میں کہاں تک جنگ کو روکنے اور امن قائم کرنے کی صلاحیت ہے ۔

... ...

ابتدائی کانفرنس میں تقریباً تمام مذاہب کے نمائندے موجود تھے اور ان کے خطبوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم دنیا کے مذہبی لوگ دل سے کشت و خون کے مخالف ہیں

اور مشرق سے مغرب تک امن داماں کا دور دورہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یورپ اور امریکہ کے
اکثر ممبروں کا رویہ دیکھتے ہوئے یہ اُمید نہیں ہوتی کہ یہ کانفرنس اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی
جرمنی کے ڈاکٹر ہاؤ ایر، پادری سی۔ ایف اینڈریوز اور متعدد ایشیائی نمائندوں کی یہ رائے
تھی کہ دنیا میں امن کا قیام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک نسلی مساوات، بین الاقوامی
انصاف اور عالمگیر برادری کو قوموں کے عقیدے اور عمل میں مناسب جگہ نہ مل جائے۔ چنانچہ
اینڈریوز صاحب نے اس مضمون کی ایک تحریک پیش کی کہ کانفرنس کی مجلس منتظمہ کو سچا اور پائدار
امن قائم کرنے کے لئے ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہئے جن سے قوموں میں بھائی چارہ پیدا ہو اور
وہ ایک دوسرے سے مساوات اور انصاف کا برتاؤ کریں۔ اس تحریک کی تائید ڈاکٹر ہاؤ ایر
(جرمنی)، چٹرجی صاحب اور ایس۔ کے۔ دت صاحب نے کی۔ ان حضرات نے اپنی تقریروں
میں اس پر زور دیا کہ ہندوستان والے اور دوسرے ایشیائی قدرتی طور پر ان سب انجمنوں
اور کانفرنسوں سے بدظن ہیں جنھیں یورپ والے قائم کرتے ہیں۔ انھیں یہ خوف ہے کہ یورپ
کے ارباب سیاست جہاں ایشیا کی قومیت کے اُٹھتے ہوئے جوش کو اور طرح طرح کے ہتھکنڈوں
سے دبانا چاہتے ہیں وہاں انہوں نے یہ حامی امن کانفرنس بھی قائم کردی ہے کہ مذہب کی
آڑ لے کر مغلوب قوموں کو جنگ سے روکے اور غالب قوموں کی حکومت کی بنیاد مضبوط کرے۔
ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے مناسب ہے کہ کانفرنس اینڈریوز صاحب کی تحریک کو منظور
کرلے۔ مگر یورپ اور امریکہ کے کئی ممبروں نے نہایت زور و شور سے اس تحریک کی مخالفت
کی۔ انہوں نے کہا کہ اس کانفرنس کا کام تو محض یہ ہے کہ مذہب کی مدد سے جنگ کا سد باب
کرے اور امن کے قیام کی کوشش کرے۔ اگر وہ بین الاقوامی مساوات اور برادری اور
انصاف کے انتظار میں رہے گی تو خدا جانے کب تک اصل مقصد کو ملتوی کرنا پڑیگا۔ غرض
نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک مسترد کردی گئی۔

ہمیں اس کا کوئی حق نہیں کہ بغیر کسی ثبوت کے کانفرنس کے بانیوں اور حامیوں کی نیت پر شبہ کریں اور یہ سمجھیں کہ یہ لوگ بھی انجمن اقوام والوں کی طرح یورپ کی بڑی طاقتوں کے آلۂ کار ہیں اور اُن کے سیاسی مقاصد میں جان بوجھ کر یا لاعلمی کی حالت میں مدد دے رہے ہیں۔ لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ان حضرات نے مغرب والوں کے عمل تجزیہ کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ مغرب کے لوگوں میں یہ عام رجحان ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ کو بالکل جداگانہ چیز سمجھتے ہیں اور اس پر اس حیثیت سے غور کرتے ہیں جیسے اسے بقیہ زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اسی اصول پر وہ سمجھتے ہیں کہ امن اور چیز ہے اور مساوات، برادری، اور انصاف کچھ اور۔ پہلے امن قائم کرلیا جائے پھر یہ چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی یا کم سے کم ان کے حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔

... ...

ہمیں ان حضرات سے یہ عرض کرنا ہے کہ انسان کا نفس ایک واحد مرکز ہے جس میں انسان کی تمام ذہنی قوتیں، اُس کے تمام جذبات اور خیالات جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ حقیقت میں علمائے اخلاق نے ہمیشہ اس نکتے کو سمجھا ہے کہ انسان کی زندگی کے کسی ایک پہلو کی اصلاح بجائے خود نہیں ہو سکتی جب تک اس کے نفس کی بہ ہیئت مجموعی اصلاح نہ ہو۔ پیمبروں اور ولیوں کی قوت اور کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ انسان کے منفرد خیالات، جذبات یا اعمال کو متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کی پوری شخصیت پر اثر ڈالتے ہیں۔ ہمیں اس سے بالکل اتفاق ہے کہ دنیا میں اگر امن قائم ہو سکتا ہے تو محض مذہب کے ذریعے سے۔ لیکن مذہب انسان کے دل سے جنگ وجدل کے شوق کو اسی طرح دور کر سکتا ہے کہ پہلے اسے نفرت، تکبر، طمع اور ظلم سے پاک کر دے۔ اگر یہ جذبات باقی رہیں گے تو کانفرنسوں کمیٹیوں، تقریروں اور پمفلٹوں کے باوجود لوگ ہمیشہ اپنے ناجائز مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے یا دوسروں کے ناجائز مقاصد کی مخالفت کے لئے جنگ وجدل سے کام لیں گے۔

... ...

اس لئے ہماری رائے میں کانفرنس کو چاہئے کہ اینڈریوز صاحب کے مشورے کے مطابق بین الاقوامی مساوات، برادری اور انصاف کو بھی اپنے مقاصد میں شامل کرلے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی خاص قوم یا چند خاص اقوام کی حمایت کرنے لگے کیونکہ یہ ایک سیاسی کام ہے جو اسے اپنے راستے سے دور ہٹالے جائیگا بلکہ برابری، آزادی، اخوت اور عدالت کے عام اصولوں کو لوگوں میں ہر دلعزیز بنانے کے لئے انہیں تمام تدابیر سے کام لے جن سے وہ امن کا ڈھنڈورا پیٹنے کی بےنتیجہ کوشش کرنا چاہتی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے کورٹ نے اپنے ۸ جولائی کے جلسے میں پٹنہ کالج کے پرنسپل مسٹر ہارن کو پرو وائس چانسلر مقرر کردیا۔ جتنے مسلمانوں میں قومی غیرت اور قومی مصلحتوں کا احساس موجود ہے وہ سب ابتدا سے اس کے مخالف تھے کہ کسی انگریز کو مسلمانوں کی سب سے بڑی قومی درسگاہ کا تعلیمی نگران بنایا جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شامت اعمال سے علیگڈھ والوں میں ذاتی مناقشات اور پارٹی بندیاں اس حد تک پہنچ چکی تھیں کہ بغیر سیاست فرنگ کے انکی اصلاح ناممکن تھی۔ بہرحال کورٹ کو اور نئے پرو وائس چانسلر کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ عام مسلمان اگر اس انتخاب کو قبول بھی کرتے ہیں تو محض مجبوری سے اور محض عارضی حیثیت سے۔ اور اس عرصے میں بھی اگر مسٹر ہارن یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ذمہ دار افراد انکی مخالفت نہ کریں تو انہیں چند باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جس خاص مقصد سے ان کا انتخاب ہوا ہے یعنی سیاست فرنگ کو کام میں لانا۔ اس پر وہ پورا اتریں مگر نہایت ایمانداری اور احتیاط کے ساتھ۔ دوسرے یہ کہ اپنے یا اپنے مربیوں کے سیاسی خیالات کو یونیورسٹی میں پھیلانے سے پرہیز کریں۔ تیسرے یہ کہ وائس چانسلر اور مجلس منتظمہ کے ساتھ پورے اتحاد عمل کا ثبوت دیں۔ ان کی خوش قسمتی سے وائس چانسلر ایسا شخص مقرر ہوا ہے جس پر مسلمانوں کے ہر طبقے کو اعتماد ہے۔ اگر وہ اس کا مستحق ثابت ہوا تو ہمیشہ

رہے گا۔ مسٹر ہارن کو وائس چانسلر کی مدد اور مشورے سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے تاکہ وہ اپنے نازک فرائض کو مقررہ میعاد تک کامیابی سے ادا کرتے رہیں اور جاتے وقت نیک نامی کے ساتھ رخصت ہوں۔

... ...

اس سلسلے میں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب قائم مقام وائس چانسلر کے فرائض نہایت خوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت مسلم یونیورسٹی کے کام کا بوجھ اُٹھانا بڑی ہمت اور حوصلے کا کام تھا۔ ایک تو سابق وائس چانسلر کے زمانہ سے بیشمار معاملات ایسے چلے آتے تھے جنہیں طے کرنے کے لیئے بڑی محنت اور عرق ریزی کی ضرورت تھی۔ دوسرے پارٹی بندی کی گرم بازاری میں اپنے دامن کو بے لوث رکھنا دشوار تھا اور بدنامی سے بچنا دشوارتر۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان مراحل سے بہت آسانی سے گزر گئے اور اب انہوں نے دفتری کام کو اتنا صاف کر دیا ہے کہ آنے والے وائس چانسلر کو دوسری ضروری اصلاحات کا پورا موقع ملے گا۔ حکومت نے ڈاکٹر صاحب کو سرکاری خدمات کے بدلے نائٹ کا خطاب ادا کیا ہے۔ اب قوم کو چاہیئے کہ انہیں قومی خدمات کے صلے میں مناسب معاوضہ دے۔ مگر قومی معاوضہ خطاب یا دولت یا جاہ و منصب کی شکل میں نہیں ملا کرتا بلکہ اس طرح کہ جو ایک کام اچھی طرح کرے اُسے دوسرا کام دیا جاتا ہے جو ایک خدمت عمدگی سے انجام دے اُس سے دوسری خدمت لی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی ایسے ہی معاوضے کے مستحق ہیں۔

جامعہ ملیہ یکم اگست کو کھل جائیگی۔ طلبہ کی درخواستیں داخلہ کے لیئے آرہی ہیں۔ ان کی اقامت کا مناسب انتظام کرنے کی پوری کوشش کیجا رہی ہے۔ ایک بہت بڑی دو منزلہ کوٹھی جو نئی سڑک پر واقع ہے اور ابھی بن کر تیار ہوئی ہے کرائے پر لے لی گئی ہے۔ اور جو

حضرات اپنے بچوں کو جامعہ میں داخل کرانا چاہتے ہوں وہ اس مہینہ کے آخر تک اطلاع دیدیں
تاکہ اور عمارتیں کرائے پر لیلی جائیں ورنہ یکم اگست کے بعد اچھے مکانوں کا ملنا مشکل ہوجائیگا۔
بچوں کے سرپرستوں کو ہم مشورہ دیتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو بچوں کو اپنے ساتھ لاکر داخل
کردیا کریں تاکہ دارالاقامہ کے منتظم تعلیم اور تربیت کے معاملہ میں ان سے تبادلۂ خیالات کرسکیں
اگر کسی وجہ سے خود نہ آسکتے ہوں تو ایک مفصل تحریر شیخ الجامعہ کے نام بھیجدیا کریں جس میں
بچے کے عادات و خصائل، اُس کی صحت، اُس کی کمزوریوں اور اُس کے عام رجحانات
کی تفصیل ہو۔

... ...

اس سال جامعہ کے لڑکوں کے لئے حفظان صحت کا خاص انتظام کیا جا رہا ہے۔
طبیہ کالج کے لائق اور ہمدرد ہاؤس سرجن ڈاکٹر ظفریاب حسین صاحب نے جو دو سال سے
ڈاکٹر شرما صاحب کے ساتھ جامعہ کے بچوں کا علاج بلا معاوضہ کرتے ہیں وعدہ فرمایا ہے کہ
اس سال داخلے کے وقت تمام طلبہ کا طبی معائنہ کریں گے، دارالاقامہ کے نگرانوں کو
حفظان صحت، غذا، دوا وغیرہ کے متعلق مفصل ہدایات دینگے اور وقتاً فوقتاً جانچ کرتے
رہیں گے کہ ان ہدایات پر کہاں تک عمل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ ایثار ہمارے دلی شکریہ
کا مستحق ہے۔

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

نمبر ۶	بابتہ ماہ جون ۱۹۲۹ء	جلد ۱۲

فہرست مضامین

۱- آزادی کی راہیں (۲)	برٹرنڈرسل مترجمہ حامد علیخاں صاحب بی۔ اے (جامعہ)	۴۰۲
۲- ہندوستان میں تنقید فن کا دور جدید	ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب پی ایچ۔ ڈی	۴۰۸
۳- ٹالسٹائے اور مشرق	بدرالدین صاحب چینی متعلم جامعہ	۴۱۶
۴- عربی معاشرت پر ایرانی اثرات	سید نذیر نیازی صاحب بی اے (جامعہ)	۴۳۱
۵- ایثار کی فتح (فسانہ)	مٹیلڈا سیراؤ مترجمہ اسرائیل احمد خاں صاحب	۴۳۷
۶- غزلیات	مولانا آزاد سبحانی صاحب	۴۶۶
	حضرت درد کاکوروی	۴۶۸
۷- تنقید و تبصرہ		۴۶۹
۸- شذرات		۴۷۵

آزادی کی راہیں

باب اول

مارکس اور مذہب اشتراک

ہر اس چیز کی طرح جو زندگی رکھتی ہے اشتراک بھی ایک رجحان ہے نہ کہ بندھی اصولوں کا ایک معین اور تعریف پذیر مجموعہ۔ اگر اشتراک کی تعریف کیجائے تو یقینی ہے کہ اس میں بعض خیالات شامل ہو جائیں گے جو اکثر لوگوں کے نزدیک غیر اشتراکی ہیں اور دوسرے ایسے خیالات خارج ہو جائیں گے جو شامل ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم اشتراک کی اصلیت سے سب سے زیادہ قریب تر ہونگے، اگر ہم اس کی تعریف یہ کریں کہ یہ زمین اور سرمایہ کے اجتماعی ملک ہونیکی حمایت کا نام ہے۔ اجتماعی ملک کے معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک جمہوری ریاست کی ملک، لیکن اس میں کسی ایسی ریاست کی ملک شامل نہیں سمجھی جا سکتی جو جمہوری نہ ہو۔ اجتماعی ملک کے معنی جیساکہ نراجی اشتراکی سمجھتے ہیں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ایک گروہ کے مرد اور عورتوں کی آزاد جماعت مالک ہو بلا ان جبری قوتوں کے جو ریاست بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ بعض اشتراکی توقع کرتے ہیں کہ یہ اجتماعی ملک یک بیک اور اپنی کامل صورت میں ایک تباہ کن انقلاب کے ساتھ ساتھ آ جائے گی، دوسرے امید کرتے ہیں کہ یہ رفتہ رفتہ آئے گی، پہلے ایک صنعت میں بعد کو دوسری میں۔ بعض اصرار کرتے ہیں کہ زمین اور سرمایہ کا یہ تمام وکمال جمہور کے ہاتھ میں آنا لازمی ہے، دوسرے

اس پر قانع ہیں کہ کہیں کہیں ملکیت شخصی کے جزیرہ سے باقی رہجائیں بشرطیکہ یہ
بہت وسیع اور طاقتور نہ ہوں - ان سب شکلوں میں جو چیز مشترک ہے وہ ہے جمہوریت
اور موجودہ نظام سرمایہ داری کا کامل یا تقریباً کامل انہدام اشتراکیوں، نراجیوں اور
سندکلیوں کا باہمی فرق زیادہ تر اس امر پر منحصر ہے کہ یہ جمہوریت ہو کس قسم کی -
اصلی اشتراکی حکومت کے میدان میں جمہوریت مشورتی کو کافی سمجھتے ہیں اور
اُن کا خیال ہے کہ دستور ریاست کی اس شکل میں جو خرابیاں آجکل معلوم ہوتی
ہیں وہ سرمایہ داری کے مٹ جانے سے خود مٹ جائیں گی - برخلاف اس کے
نراجی اور سندکلی سارے کے سارے مشوری نظام کے خلاف ہیں اور جماعت
کے سیاسی معاملات کے انضباط کے لئے یہ ایک دوسرا طریقہ چاہتے ہیں - لیکن یہ
سب کے سب جمہوری اس معنی میں ہیں کہ سب ہر قسم کی مراعات اور ہر نوع کی
مصنوعی عدم مساوات کو مٹانا چاہتے ہیں - سب کے سب موجودہ جماعت میں
مزدور کے حامی ہیں - تینوں کے معاشی مذہب میں بھی بہت کچھ مشترک ہے - تینوں
سرمایہ داری اور نظام مزدوری کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ یہ مالک طبقوں کے اغراض
کے لئے مزدور سے بیجا فائدہ اٹھانے کے ذرایع ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ (دولت)
پیدا کرنے والوں کو آزادی دلانے کا بس ایک ہی ذریعہ ہے یعنی کسی نہ کسی شکل
میں ملکیت اجتماعی کا قیام - لیکن اس مشترک مذہب کے ڈھانچے کے اندر بہت
سے فرقے ہیں اور خود ان میں جنہیں تنگ معنوں میں اشتراکی کہنا چاہیئے نہایت
قابل لحاظ اختلافات موجود ہیں - بحیثیت ایک طاقت کے یورپ میں اشتراکیت
کی ابتدا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مارکس سے ہوئی - یہ سچ ہے کہ اس سے پہلے بھی انگلستان
اور فرانس دونوں ملکوں میں اشتراکی نظریے موجود تھے - یہ بھی سچ ہے کہ ۱۸۴۸ء
کے انقلاب میں فرانس میں اشتراک نے تھوڑے عرصہ کے لئے ریاست میں خاصہ

اثر حاصل کر لیا تھا۔ لیکن مارکس سے پہلے جو اشتراکی ہوئے انکا رجحان عموماً خیالی خواب دیکھنے کیطرف تھا، چنانچہ یہ کوئی طاقتور یا پائدار سیاسی جماعت (پارٹی) نہ قایم کرسکے۔ یہ مارکس کا حصہ تھا کہ اُس نے اِنگلس کی مدد سے اشتراکی مسائل کا ایک مربوط مجموعہ تیار کیا جس میں اتنی سچائی تھی یا جو بظاہر اتنا معقول معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کی کثیر تعداد کے دماغوں پر حاوی ہوسکے اور نیز بین الملل اشتراکی تحریک کی بنیاد ڈالی جو پچھلے پچاس سال میں یورپ کے تمام ممالک میں برابر بڑھتی رہی ہے۔

مارکس کا مذہب سمجھنے کے لئے ضروری ہو کہ ان اثرات کے متعلق ہم کچھ واقفیت حاصل کریں جنھوں نے مارکس کے خیالات بننے میں مدد دی۔ یہ ۱۸۱۸ء میں جرمنی کے صوبہ رہائن کے ایک مقام تریوس میں پیدا ہوا۔ اسکا باپ ایک قانونی عہدیدار تھا اور نسلاً یہودی جس نے برائے نام عیسائیت قبول کرلی تھی۔ مارکس نے قانون، فلسفہ، معاشیات اور تاریخ کی تعلیم مختلف جرمن یونیورسٹیوں میں حاصل کی۔ فلسفہ میں اس نے ہیگل کے مذہب کا اثر لیا جو اس زمانہ میں معراج شہرت پر تھا اور ان مسائل کا کچھ نہ کچھ اثر تمام عمر اس کے خیال پر باقی رہا۔ ہیگل کی طرح اس نے بھی تاریخ میں ایک خیال کی نشوونما دیکھی۔ اس نے تغیرات عالم کا تصور یوں قایم کیا کہ یہ گویا منطقی منازل کی ایک کڑی ہو جس میں ایک حالت انقلاب کے ذریعے ایسی دوسری حالت میں بدل جاتی ہو۔ جو اس کی ضد ہو۔ یہ ایک تخیل ہے جس نے اس کے خیالات کو ایک سخت تجرید کا رنگ دیدیا تھا اور بجائے ارتقاء کے انقلاب پر اعتماد۔ لیکن ہیگل کے زیادہ قطعی مسائل میں سے مارکس میں جوانی کے بعد کوئی بھی باقی نہ تھا۔ اسے لوگ نہایت ذہین طالب علم تسلیم کرتے تھے اور یہ بہ حیثیت پروفیسر یا سرکاری عہدیدار کے نہایت خوشحال زندگی بسر کرسکتا تھا، لیکن اس کی سیاسی دلچسپی اور اس کے

انتہا پسند خیالات نے اسے زیادہ دشوار گذار راستوں پر لا ڈالا۔ ۱۸۴۲ء ہی میں
یہ ایک اخبار کا مدیر ہوگیا جسے اس کے انتہا پسند خیالات کی وجہ سے اگلے سال کے
شروع ہی میں پروشیا کی حکومت نے بند کردیا۔ چنانچہ مارکس نے پیرس کی راہ
لی۔ یہاں یہ اشتراکی کی حیثیت سے مصروف کار ہوگیا اور اپنے فرانسیسی پیشروؤں[1] کے
متعلق علم حاصل کرتا رہا۔ یہیں ۱۸۴۴ء میں انگلس سے اس کی وہ دوستی شروع
ہوئی جو ساری عمر قائم رہی۔ انگلس اس زمانہ تک بسلسلہ کاروبار مینچسٹر میں تھا،
اس نے یہاں انگریزی اشتراکیت سے واقفیت حاصل کی تھی اور بڑی حد تک اس
کے مسائل کو قبول کیا[2]۔ ۱۸۴۵ء میں مارکس پیرس سے نکالا گیا اور انگلس کے
ساتھ بروسیلز میں رہنے کے لئے گیا۔ یہاں اس نے "جرمن مزدوروں کی جمعیت"
قائم کی اور ایک اخبار شائع کرنا شروع کیا جو اس جماعت کا آرگن تھا۔ بروسیلز
کی کارگذاریوں کے سلسلہ میں پیرس کی جرمن اشتراکی لیگ کو اس سے واقفیت
پیدا ہوئی اور اس لیگ نے ۱۸۴۷ء کے ختم پر اسے اور انگلس کو دعوت دی کہ
انکے لئے ایک لائحہ عمل ترتیب دیں، جو جنوری ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ہے
وہ مشہور "اشتراکی اعلان" جس میں پہلی مرتبہ مارکس کا نظام پیش کیا گیا۔ یہ بڑے

---

(۱) ان میں سے خاص فورئیے اور ساں سیماں تھے جنہوں نے اشتراکی ریاستوں کے کچھ خیالی
نقشے تعمیر کئے تھے۔ پرودھاں کو جس سے مارکس کے کچھ بہت دوستانہ تعلقات نہ تھے بجائے
ارتودکس اشتراک کے نراجیوں کا پیشرو سمجھنا چاہئے۔

(۲) مارکس اپنی کتاب "فلسفہ کا افلاس" (۱۸۴۷ء) میں انگریز اشتراکیوں کا ذکر تعریف کے
ساتھ کرتا ہے۔ خود اسکی طرح یہ بھی اپنے دلائل کو ریکارڈو کی نظریہ قدر پر قایم کرتے ہیں لیکن
اس کا سا تبحر اور اس کی سی علمی وسعت نہیں رکھتے۔ ان میں تامس ہاجکن (۱۷۸۷-۱۸۶۹)

اچھے وقت شائع ہوا ۔ اگلے ہی مہینہ، فروری میں پیرس میں انقلاب برپا ہوا اور مارچ میں جرمنی تک پھیل گیا ۔ انقلاب کے خوف سے بروسلیز کی حکومت نے مارکس کو بلجیم سے خارج کر دیا لیکن جرمنی انقلاب نے اس کے لئے خود اپنے ملک میں واپسی ممکن کر دی ۔ جرمنی میں اس نے پھر ایک اخبار نکالا جس نے اسے پھر ارباب حکومت سے ٹکرایا اور جوں جوں انقلاب کا ردعمل زور پکڑتا گیا یہ مخالفت بھی بڑھتی گئی ۔ جون ۱۸۴۹ء میں اسکا پرچہ بند کر کے اسے پروسیا سے خارج کر دیا گیا ۔ یہ پیرس واپس گیا لیکن وہاں سے بھی نکالا گیا ۔ چنانچہ یہ جا کر انگلستان میں مقیم ہوا، جو اس وقت حامیان حریت کا مامن بنا ہوا تھا، اور اشاعت تحریک کے سلسلہ میں جو تھوڑے تھوڑے زمانہ کے لئے یہ باہر گیا اس سے قطع نظر یہ اپنی موت یعنی ۱۸۸۳ء تک انگلستان ہی میں رہا ۔ اس کے وقت کا زیادہ حصہ اپنی بڑی کتاب "سرمایہ" کی تالیف میں صرف ہوا ۔ آخری زمانہ میں اسکا دوسرا اہم کام "مزدوروں کی بین الملل جمعیت" کے قیام اور توسیع پر مشتمل تھا ۔ ۱۸۴۷ء سے لیکر بعد اس کے وقت کا زیادہ حصہ "برٹش

کا نام لیا جاسکتا ہے جو پہلے بحری افسر تھا لیکن بحری نظم کے طریقوں پر ایک تنقیدی رسالہ لکھنے کی وجہ سے موقوف کر دیا گیا ۔ اس کی تصنیف سے "سرمایہ داری کے خلاف محنت، دمانع" (۱۸۲۵ء) اور دوسری کتابیں ہیں ۔ نیز ولیم ٹامس (۱۷۷۵ - ۱۸۳۳) مصنف کتاب "تحقیق بابتہ اصول تقسیم دولت جو انسانی خوشحالی کے لئے سب سے زیادہ معین ہوں" (۱۸۲۴ء) اور "محنت کا انعام" (۱۸۲۵) : اور پیرسی راون اسٹون جس سے ہاجکن نے زیادہ تر اپنے خیالات لئے ہیں ۔ غالباً ان سب سے زیادہ اہم رابرٹ اودن تھا

(۱) اس کی پہلی اور سب سے اہم جلد ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی ۔ اور باقی دو جلدیں اس کے انتقال کے بعد ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۴ء میں

میوزیم" میں صرف ہوا جہاں یہ جرمن، صبر کے ساتھ، نظام سرمایہ داری کے خلاف
اپنی بے پناہ قرار داد جرم کے لئے مواد جمع کرتا تھا۔ لیکن بین الملی اشتراکی تحریک پر
اسکا قابو برابر قایم رہا۔ نپولین کے بھائیوں کی طرح اکثر ملکوں میں اس کے داماد
اس کے نائب تھے اور جو اندرونی مناقشے پیدا ہوتے تھے ان میں عموماً اسی کی
مرضی غالب رہتی تھی۔

ہندوستان میں تنقید فن کا دور جدید

(۱)

فن اور تنقید فن

جس طرح زمین و آسمان، ابر و باد و باراں، شجر حجر بشر، کرشمے ہیں قدرت و ذات خداوندی کے اسی طرح رنگینی شعر و رنگ آمیزی تصویر، موج رقص شیریں اور جوئے شیر فرہاد، بتان آذر اور سبحۂ خلیل جلوے ہیں قدرت و ذات انسانی کے یہ دونوں یعنی ایک طرف بزبان انگریزی 'نیچر' اور دوسری طرف آرٹ، تخلیقی پہلو ہیں ایک فرد مدرک، ایک شخصیت کے۔ ہم کو یہ پوری طرح سمجھ لینا چاہئے کیونکہ یورپ میں انیسویں صدی عیسوی کے آرٹ کی نیچر پرستی کے بعد جسے نسل انسانی کے فنی ارتقا کے دور اول کی تکمیل سمجھنا چاہئے، جو فنی انقلاب اکسپریشنزم کی صورت میں ظہور پذیر ہوا ہے اس کے پہلے ریلاں کے رفع دفع ہونے کے بعد آج ہم ٹھنڈے دل سے حال در اضی کے فنی کارناموں کا موازنہ کر سکتے ہیں، اور اس موازنے سے ہم پر یہ راز فاش ہو جاتا ہے کہ جس وقت انسان اپنا منصب تخلیق صورت کھو بیٹھتا ہے اور محض نقالی فطرت یا اتباع طرز و نقوش پارینہ کو اپنا مسلک بنا لیتا ہے، اس کی کوششوں پر لفظ آرٹ کا کسی صورت سے اطلاق باقی نہیں رہتا۔ جذبات کے نقوش کو الفاظ رنگیں کا جامۂ صد آہنگ پہنانا، اسی کا نام ہے شاعری اور جذبات کے پرتووں کی نقش و رنگ سے تنویر کر دینا اسی کا نام ہے مصوری۔ جس طرح الفاظ کے ٹھنڈے بے جان موتیوں کو ردیف و قافیہ کی لڑیوں میں پرونے والے کو ہم شاعر نہیں بلکہ ناظم کہتے ہیں

اسی طرح مشاہدات فطرت کو کینوس یا کاغذ پر جیسے کا تیسا بنا دینے والے کو ہم تصویر ساز کہیں مصور نہیں کہہ سکتے۔ شاعری جزو پیغمبری اور پیغمبری جزو خدائی اگر ہے تو آفرینش کی بنا پر اور مصور پر اگر دعوائے خدائی کا الزام عاید کیا جاتا ہے تو یہ بھی آفرینش ہی کی بنا پر۔ فن غالب و فن مانی کی بنیادی نوعیت ایک ہے۔ یہ ایک بڑا ادبی عجوبہ ہے کہ شاعر کو تو مصور جذبات کہیں اور مصور کا مصور جذبات ہونے سے کوئی واسطہ نہ سمجھیں اور اسکی ایک کاریگر کی سی حیثیت قرار دیدیں جو گارے اینٹ کی چنائی کے بجائے رنگ آمیزی میں سر کھپایا کرے اور اپنی باریکی قلم کو معراج فن کا معیار ٹھہرائے۔ زمانہ حال کے مغربی نکتہ رس آرٹ کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ "آرٹ اشکال پر اظہار کی تخلیق کا نام ہے"۔ لیکن میں اس طوالت کی ضرورت نہیں خیال کرتا کیونکہ ہر وہ شکل جس کی واقعی تخلیق کیجائے اور جو محض مشاہدہ فطرت کی نقل نہ ہو وہ لابد مظہر ہوگی جذبات شخصی کے پس منظر کی۔ آرٹ یا فن سے مراد ہے تخلیق اشکال۔

لیکن ہر بنائی ہوئی شکل پر تخلیق فنی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ تخلیق فنی اس وقت ہوتی ہے جب انسان کسی شکل کو اصل میں اس شکل کی خاطر اور محض ضمناً افادی اغراض کی بنا پر بناتا ہے۔ جب انسان نے اپنا پہلا پیالہ بنایا ہوگا تو جو شکل اس نے اس پیالے کی بنائی اس کے دائرے اور اس کی ہیئت، اس کی ضروریات مادی نتیجی نہ تھے بلکہ اس کے انفرادی ترنگ اور حسن کی موج کا نتیجہ تھے۔ میں خاص طور پر یہ کہنے سے احتراز کرتا ہوں کہ وہ اس کے حس لطیف اور اس کی ذوق جمال پر مبنی تھے۔ حسن ایک تصور اضافی ہے اور کسی ایسے معیار کا متحمل نہیں جس کا ہر زمان و مکان پر اطلاق ہوسکے۔ فن کی تعریف حسن کے معیار سے کرنا ایک امر بے معنی ہے۔ مزید براں یہ جمالی نقطۂ نظر انسان کی تخلیقی امنگ اور صلاحیت پر ایسے قیود عاید کر دیتا ہے جو ان

کی جدت و شدت اظہار کے لئے نہایت درجہ محدود کن ثابت ہوتے ہیں بلکہ بنا ہوجاتے ہیں فن کی بے بضاعتی اور اس کے جمود کی۔ مثلاً ہم یونانی بت تراشوں اور مغل اسکول کے مصوروں کو پیش کر سکتے ہیں جنکا معیار سراسر جمالی تھا۔ کس درجہ غیر محرک اور بے رس معلوم ہوتے ہیں انکے عمل چینی مصوروں کی آزاد قلمی اور ہندی بت تراشوں کی دیوانہ واری کے سامنے۔

اور جب انسان نے اپنا پہلا بت پرستش کے لئے تراشا تو اس کی شکل کسی مادی ضرورت کی پابند نہ تھی بلکہ اس کی اپنی انفرادی ترنگ کا مظہر تھی اور انہی انفرادی ترنگوں سے رفتہ رفتہ حسن کے ان معیاروں کا ارتقا ہوا ہے جو آج ہمارے پیش نظر ہیں اور انہیں انفرادی ترنگوں کی مجموعی قوت کی بنا پر آئے دن یہ معیار بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔

لہذا فن کا جمالی پہلو بھی اسی قدر عارضی ہے جتنا کہ اسکا اخلاقی پہلو اور ہرگز اس کا جوہر نہیں۔ فن، حسن اور اخلاق دونوں کی قیود سے بالاتر اور آزاد ہے اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے وہ جلوہ ہے انسان کی جذباتی کشمکشوں اور اس کی تخلیقی امنگوں کا۔ یہی کشمکش اور یہی امنگیں کہیں شعر اور ترنم بنکر "فردوس گوش" ہوتی ہیں تو کہیں تصویر اور کہیں رقص کی صورت میں "جنت نگاہ" کا اثر رکھتی ہیں۔ انہیں کشمکشوں اور امنگوں کا نتیجہ ہیں میلو کی زہرہ اور داونچی کی مونالیزا، نٹ راج شوا اور اجنٹا کی کوہ نگافیاں، دہلی کی مسجد اور آگرے کا تاج، بیتھوون کی سمفونیاں اور موتزارٹ کے آپرے۔ حافظ و غالب کے اشعار اور رومی و اقبال کی مثنویاں۔

میں نے سطور بالا میں کوشش اس امر کی کی ہے کہ فن سے جو کچھ مراد ہے اس کو مختصراً بیان کر دوں، اور اس نقطۂ نظر کو واضح کر دوں جو ہم کو فن کے سمجھنے اس کی تنقید کرنے اور اس سے لذت یاب ہونے میں غلط روی وارزانی سے بچائے اور ہندوستان

کے موجودہ مسئلہ فن پر ایک رائے قائم کرنے میں ہماری رہبری کرے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ فن سے لذت یاب ہونے یا فن کے برتنے کے لئے کسی نقطہ نظر کا دانستہ وجود لازم ہے۔ فن اپنے ارتقا کے بالاترزینوں پر پہنچکر یعنی جہاں وہ صناعی سے ہٹکر ایک مستقل تمدنی شعبہ کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوتا ہے سراسر مرقع ہوتا ہے انسان کی زندگی کے جذباتی پہلو کا۔ چنانچہ انسان ذہنی نقطہ ہائے نظر اور نظریات فن سے جس قدر آزاد ہوگا اسی قدر اس کے فنی کارنامے پرزور اور بے لاگ ہونگے یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے ذہنی و علمی نقطہ نظر دنیا پر غالب آتا گیا ہے ویسے ویسے فن کی شدت کیفی گھٹتی گئی ہے اور آج ہماری مجال نہیں کہ ہم فن کے پرانے کارناموں کا کیا بہ لحاظ وزن وجاہت اور کیا بہ لحاظ زور و شدت ایک آن مقابلہ کرسکیں۔ بلکہ فن سے واقعی لطف اندوز ہونے میں بھی ذہنی عنصر کا وجود ایک بڑی حد تک حائل رہتا ہے گو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہمارے ادراک میں ایسی باریکی پیدا کر دیتا ہے جو بذات خود لطف خاص سے خالی نہیں۔

لیکن ہمارا دور بیسویں صدی عیسوی کا دور ہے یعنی کیمرے اور سنیما کا دور اور ہوائی جہازوں نے تمدنی کنارہ کشی کے آخری امکانات کو مسمار کر دیا ہے۔ ہم کو اس سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں اور اس میں نئی نوع انسان کی سراسر بہتری ہے لیکن اس خیال سے کہ ہم اپنے ہیرے جواہرات کو گالیوتیزکی رنگ برنگی چوڑیوں کے بدلے انکی غیر معمولیت سے متحیر ہوکر تبدیل نہ کرلیں جیسا کہ امریکہ کے وحشی باشندوں کے متعلق مشہور ہے، یا سمندر پار سے جو کچھ کوڑا کچڑا بمبئی تک بہہ آوے اس کو عجائب روزگار ہی سے نہ سمجھیں ہم پر لازم ہے کہ ہم ذہنی عنصر کو استعمال کریں ہم پر لازم ہے کہ ہم تشریح کریں، چھان بین میں سر ماریں اور تفریق و ترتیب سے کام لیں۔ کسی کارنامہ فن سے محظوظ یا منغص ہوتے وقت اپنی دماغی کیفیت اور ساتھ

ہی ساتھ کاغذ پر جو نقش و رنگ ہیں انکی تشریح کریں۔ مختصراً یہ کہ ہم کو لازم ہے
کہ ہم اپنے اندر تنقید کی صلاحیت بہم پہنچائیں۔

لیکن دراں حالیکہ آج اس گئے گذرے زمانے میں بھی ہندوستان میں ایسے
اصحاب فن موجود ہیں جنکا پایہ دنیا کے بڑے سے بڑے صاحب فن سے کسی صورت
سے کم نہیں، کیا ہم اپنے یہاں صحیح معنوں میں نقاد فن کی ایک مثال بھی پیش کرسکتے ہیں؟
جو مضامین ہندوستان کے روزانہ اخباروں اور رسالوں میں فنی تنقید کے نام سے
شائع ہوتے رہتے ہیں اور جن میں ہندوستان کے جلیل سے جلیل اور کم پایہ سے
کم پایہ مصوروں کی کم و بیش ایک ہی جیسے الفاظ میں مدح سرائی کیجاتی ہے ان
کو پڑھکر جو روحی صدمہ ہوتا ہے اس کا بیان عبث ہے اور اس کی ساری ذمہ داری
صرف ہندوستانیوں پر عائد نہیں ہوتی۔ انکے معلمین فن یعنی انگریز جو ہندوستان میں
فن اور معیار فن کی ٹکسال قائم کئے ہوئے ایک شان ہمہ دانی کے ساتھ جلوہ گستر ہیں
بذات خود فن کے معاملہ میں فطرتاً حد درجہ کندحس واقع ہوئے ہیں۔ انگلستان
میں مسٹر کلاسوبل ایک دل خوش کن استثنا رہی، (بلکہ یہاں تک ماننا پڑے گا کہ
یورپ کے موجودہ نقادان فن میں انکا انداز بیان سب سے زیادہ صاف اور واضح
ہوتا ہے، گو یہ کہدینا بھی ضروری ہے کہ انکی تنقید کی نشو ونما پیرس کے ارباب فن کے
جھگھٹوں میں ہوئی) لیکن سویز کے اس طرف کا کیا رنگ ہے؟۔ جس عنوان سے
وہ کسی آرٹسٹ کے عمل پر نکتہ چیں ہوتے ہیں وہ کمتر مستثنیات سے قطع نظر سراسر
کھوکھلا اور مضحک ہوتا ہے اور اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ انکے اندر حس فن جو
ایک نقاد سخن کے لئے ناگزیر ہے موجود نہیں۔ وہ مباحث فنی کے متعلق جو ایک
لاطائل لفظی گورکھ دھندوں کی زبان قائم ہوگئی ہے کسی غریب کی تعریف یا کسی غریب
کی مذمت میں صرف کرتے ہیں اور رہیں اپنے ممدوح یا معتوب کے متعلق کوئی دائمی

اطلاع مطلقاً نہیں دیتے ۔ نقاد کی ذمہ داریاں دوہری ہوتی ہیں ۔ اسکا فرض اولین یہ ہوتا ہے کہ وہ عام افراد سے، جن میں تنقیدی صلاحیت اور حسِ فن کم ہوتی ہے فنی کارناموں کو قرین تر کردے اور ان کارناموں سے جو کیفیات خود اس پر طاری ہوتی ہیں خواہ بہ زبان حال خواہ بہ زبان قال دوسروں پر منتقل کردے، اور ان میں اچھے برے کی تمیز کا جذبہ مشتعل کردے ۔ ضمناً وہ آرٹسٹ کے لئے بھی امداد کا باعث ہوتا ہے اور یہ اس طرح کہ وہ اس کے کمزور پہلوؤں میں چٹکیاں لے لے کر اسے خوابِ غفلت سے جگاتا ہے ۔ ممکن ہے کہ وہ اس کو اکثر آمادۂ بغاوت کردے لیکن نقاد آرٹسٹ کو جمود سے محفوظ رکھتا ہے ۔

یہ صورت تو بہترین صورت اور نقاد کی یہ حیثیت بہترین حیثیت ہوگی لیکن ایک بڑا خطرہ یہ ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی ساکھ جم جانے کے بعد نقادِ فن سے دلالِ فن ہو کر نہ رہ جائے ۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم کو بتلادے کہ کون کیا ہے، کہاں تک ہے، اور کیوں، وہ آرٹسٹوں کو کیڑوں کے حیاتیاتی نمونوں کی طرح شیشوں میں بند کرکر کے ان پر ان کے ناموں اور داموں کی چٹھیاں چپکانے لگتا ہے ۔ بجائے نقش و رنگ کے وہ سونے اور چاندی کو معیار قرار دینے لگتا ہے اور آرٹ کے بازار پر اس طرح حاوی ہوجاتا ہے جس طرح مسٹر مانٹیگو ایک زمانے میں چاندی کے بازار پر حاوی تھے یا شاید اب بھی ہوں ۔ یہ ہے دراصل وہ وبا جو آج کل یورپ میں عام ہو رہی ہے اور ہم کو اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اسکا عہد مغلیہ کی سرپرستی فن سے بھی زیادہ یہ اثر ہوتا ہے کہ آرٹسٹ ایک مزدور بن کر رہ جائے اور اس پر "حکم سرکار کا قلم دربار کا" صادق آئے ۔ بہرحال جو کیفیت آجکل ہماری ہے ہندوستان میں وہ ناگفتہ بہ ہے اور فن کی طرف سے ہمارا نقطۂ نظر کلیتاً غلط ہے ۔ عوام، جن میں ابتک فنی خودشناسی پیدا نہیں ہوئی ہے، انکے دلوں کو تو انگریزی یا تصویر پوشکارڈوں نے مسخر کر رکھا ہے

کرلیا ہے۔ میں یہ عرض کردینا چاہتا ہوں کہ عوام سے میری مراد غریب و مفلس دہقانی نہیں
کیونکہ آرٹ کے نقطۂ نظر سے بڑے بڑے راجہ مہاراجہ اور یہ دہقانی ایک ہی صف میں
نظر آئیں گے بلکہ عموماً دہقانی کی حسیات ان سے زیادہ تیز اور صحیح پائی جائینگی۔ اب رہے
ایسے لوگ جو فن کا کچھ احساس رکھتے ہیں تو وہ عجیب عجیب مضحک خیالوں اور منصوبوں
کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر فن کو ایک قومی معاملہ بنائے ہیں اکثر ان سے
بھی بڑھکر اس کو ایک مذہبی معاملہ بنائے بیٹھے ہیں یعنی ایک طرح کا ہندو مسلم سوال۔
اجنتا ہندوؤں اور قوم پرستوں کا مسلک ہے تو تاج خلافتیوں کا منتہائے نظر۔ لیکن
دونوں کے دونوں کرانٹ مارکٹ کے مبتذل ٹکے والے یا تصویر پوسٹ کارڈوں
پر دل وجان سے ریجھ جائیں اور اپنی بدمذاقی کا ذرا احساس نہ کریں۔ ایک طبقہ ایسے
لوگوں کا بھی ہے جو اکثر امریکی سرپرستوں کی صلاح کے بموجب احتیاط کے پیرو ہوکر
ہندوستان کے "خالص آرٹ" کی "خدمت" کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان حضرات سے
کہوں گا کہ خدا کے لئے آپ اپنے کام سے لگئے اور ہندوستان غریب کے آرٹ اور
اس کے مسئلے کو اس کے حال پر چھوڑیئے۔ ان خیالات کو دماغ میں جگہ دیکر تصویریں
اگلنی نہ شروع کر دیجئے۔ تصویر بنائیے اور ضرور بنائے لیکن جب، کہ جیسے کسی کے دل
میں درد ہو اور اس سے چیخے بغیر نہ بنے، یا یوں کہ آپ کو کچھ کہنا ہے جو آپ کے خیال
میں کسی اور نے ابتک نہیں کہا ہے، یا اس لئے بھی کہ پیٹ ہر شخص کے ساتھ ہے اور
اسکا پالنا لابد، اور اپنی رنگ آمیزی اور تصویر سازی کے گر سب کے لئے ہیں
لیکن خدارا آپ ملک و قوم یا بنی نوع انسان کی خدمت کے خیال سے قلم کو جنبش
نہ دیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ان امریکی حضرات نے جو بے نقص سوٹ زیب تن کئے ہوئے
کیل کانٹے سے بالکل درست، غریب فاقہ کش ہندوستان کو ایک مہینے اور اجنتا کو
ایک دن میں "نپٹانے" کے لئے نئی دنیا سے آتے ہیں ہمارے لئے بہت کچھ باعث مضرت

ثابت ہو رہے ہیں ۔ ہندوستانی کم از کم اتنا تو ہے کہ اپنے فنی احساسات میں
ایمانداری سے کام لیتے ہیں اور خود کو دھوکے میں نہیں ڈالتے ۔ میں کہیں بہتر سمجھتا
ہوں کہ وہ مبتذل اور بد مذاق تصویروں کو دل سے لگائیں بجائے اس کے کہ وہ اجنبی
کی تصویروں کے سامنے کھڑے ہو کر جھوٹ موٹ کے حال میں مبتلا ہوں اور خود فریب
اضطراری کیفیات اپنے اوپر طاری کریں ۔ میں نے ان جہانیاں جہاں گشت غولوں
کو یورپ میں برسوں دیکھا ہے اور ان سے خوب واقف ہوں ۔ دنیا کے بہتر سے بہتر
فنی کارناموں کو دیکھتے وقت انکا رویہ قابل دید ہوتا ہے ۔ "تحیر انگیز!" "کس
درجہ تحیر انگیز!" ان میں سے ہر دیکھنے والا اور دیکھنے والی تھوڑے تھوڑے وقفہ
کے بعد کہتی رہے گی ۔ ساتھ ہی اس قسم کے اظہار خیال ہوتے رہتے ہیں کہ "یہ لاکھوں
میں بنا ہوگا" اور "یہ کروروں میں خریدا گیا ہوگا" اکثر ایسے بھی خوش مذاق ہوتے
ہیں جو یہ کہنے سے باز نہیں رہتے کہ امریکہ اگر چاہے تو یہ سب چیزیں خرید لے ۔ اور وہ
یکے بعد دیگرے گزرتے جاتے ہیں اور بیچارہ "گائڈ" جو انکے ساتھ ہوتا ہے ان کی
بکواس سنتا رہتا ہے اور آثار صنادید کی پرانی رٹی ہوئی داستان شروع سے آخر
تک آیت حدیث کی طرح دہراتا ہے اور وہ بھی انکے ساتھ ایک کمرے سے دوسرے کمرے
اور ایک برج سے دوسرے برج میں گزرتا جاتا ہے ۔ وہ کچھ نہیں دیکھتے اور انکو
بالکل کسی فنی قدر کا حس نہیں ہوتا ۔ میری اپنے ہم ملکوں سے دست بستہ یہ استدعا ہے
کہ وہ ان حضرات کو اپنا نمونہ نہ بنائیں ۔ دلی میں رہکر تاج کو دیکھے بغیر اس کی ایک
تصویر خیالی لیے ہوئے مرجانا اچھا ، لیکن تاج کو ڈھاڈی کی طرح چھو کر چلے آنا نہیں اچھا ۔

ٹالسٹائے اور مشرق

(ماخوذ)

جس وقت ٹالسٹائے نے وفات پائی کسی کو مطلق گمان نہ تھا کہ اسکا تخیل کبھی اس دنیا میں اثر بھی کریگا۔ مگر اس نے بیج بو دیا تھا اور وہ موسم بہار کی بارش کا منتظر تھا۔ بادل آئے، پانی برسا، کھیتی سرسبز ہوئی اور اب فصل کاٹنے کا وقت ہے۔ ٹالسٹائے کی کشت امید کا ہرا ہونا ہندوستان کے کسان گاندھی کی عرقریزی پر موقوف تھا۔

نوع انسان کی تاریخ میں ایک بات نہایت حیرت انگیز ہے۔ آپ ساری تاریخ دیکھ جائیے جتنی تخیلی امیدیں ارباب فکر کے ذہن میں تھیں اور جن کا پورا ہونا بظاہر محال معلوم ہوتا تھا سب کی سب ایک دن عملاً پوری ہو کر رہیں۔ بات یہ ہے کہ دنیا میں جب کوئی نیا خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اسکا عکس یعنی ایک مخالف خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ ان دونوں میں باہم تصادم ہوتا ہے اور ذہن انسانی کے سمندر میں ایک طوفان و تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ اس طوفان کی لہروں سے زندگی کی کھیتی سیراب ہوتی ہے اور اس سے نئے نئے پودے اُگتے ہیں۔

۱۸۴۷ء میں جب ٹالسٹائے کی عمر اُنیس سال کی تھی اور وہ قازان کے شفاخانہ میں زیر علاج تھا اُسے ایک لاما سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ بزرگ کسی ڈاکو کے ہاتھ سے زخمی ہو کر شفاخانے میں آئے تھے اور انہیں اتفاق سے ٹالسٹائے کے قریب ہی جگہ ملی تھی۔ ان کے فیض سے ٹالسٹائے کے دل میں حقیقت اور محبت کی چنگاری چمک اُٹھی۔ تیس سال تک دنیاداری کی راکھ میں یہ چنگاری دبی رہی اور اس کے بعد بھی اسے شعلۂ جوالہ بننے کے لئے موافق ہوا نہ ملی۔

البتہ کوئی ساٹھ برس کے بعد ۱۹۰۹ء میں اس چنگاری سے ہندوستان کے ایک نوجوان گاندھی کے دل میں معرفت اور محبت کا شعلہ بھڑکا۔ گاندھی نے تکلیف اور مصیبت کی آندھیوں میں اس شعلہ کو نشو ونما دی یہاں تک کہ اس نے سارے ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک آگ لگا دی جس کی آنچ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ ٹالسٹائے کو مشرق سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ یہ تعلق اس درجہ اہم ہے کہ اگر ٹالسٹائے کی سیرت میں اس کا ذکر نہ کیا جائے تو وہ سیرت نامکمل رہجائے گی۔ ٹالسٹائے کے خیالات سائبیریا ریلوے کی طرح یورپ اور ایشیا کو ملاتے ہیں۔

ٹالسٹائے اور ایشیا کے تعلقات کے متعلق ہم کو اس کے شاگرد رشید پاؤل بیروکاف کی کتاب ٹالسٹائے اور مشرق میں بہت کافی مواد ملتا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹالسٹائے کو ابتدا ہی سے مشرق سے محبت تھی اور اس کا دل ہمیشہ ادھر کھنچتا تھا۔ جب وہ ایک نوجوان طالب علم کی حیثیت سے جامع قازان میں تعلیم پاتا تھا تو اسے عربی اور ترکی زبان سیکھنے کا شوق تھا۔ وسط ایشیا کے قیام کے زمانے میں اسے اسلامی تہذیب سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اس سے بہت متاثر ہوا۔ ۱۸۷۲ء میں اس نے ابتدائی مدارس کے لئے جو کتابیں تصنیف کیں ان میں تقریباً سارا مواد ہندوستان اور عرب کے قصوں اور کہانیوں سے لیا گیا تھا۔ جب ٹالسٹائے کو مذہب کی طرف توجہ ہوئی تو اس نے یہ محسوس کیا کہ انسان کی تسکین اور نجات کے لئے محض انجیل ناکافی ہے۔ چنانچہ اس نے خالص مشرقی مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور یہ کوشش کرنے لگا کہ مشرقی مذاہب کے اصولوں کو یورپ کے لوگ بھی عقیدت اور احترام سے قبول کرلیں۔ چنانچہ اس نے ایک کتاب "تحیل العقلا" کے نام سے تالیف کی جس

میں اس نے انجیل کے حقائق، چینی حکیم (لے اوتسے) لے اوتسے کے کلام اور سری کرشن جی کے خیالات کو جمع کر دیا۔ اس کا ابتدا سے یہ عقیدہ تھا کہ بنی نوع انسان کے بڑے بڑے مذاہب کے اصول ایک ہی مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اُس نے اس مقصد کے لئے تمام مشرقی ممالک سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔

ٹالسٹائے کے تخیل سے زیادہ قریب چینیوں کا تخیل ہے لیکن چین ہی میں اُس کے خیالات پر سب سے کم عمل ہوا ہے ۱۸۸۰ء کے شروع میں ٹالسٹائے نے کنفیوشس اور لے اوتسے کی سیرت کا مطالعہ کیا ان میں سے وہ لے اوتسے کی زیادہ قدر کرتا تھا ۱۹۰۵ء میں اسے دو معزز چینیوں سے خط و کتابت کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سے ایک کا نام سین ہوانگ ٹونگ اور دوسرے کا کوک ہوانگ مینگ تھا۔ موخر الذکر پیکن کی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور یورپ میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ انقلاب کے زمانہ میں وہ جلاوطن کر دیا گیا اور جاپان میں پناہ گزیں ہوا۔

ستمبر ۱۹۰۶ء میں ٹالسٹائے نے جو خط کوک ہوانگ مینگ کو لکھا اس میں اس نے چینیوں کی بےحد تعریف کی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ کی قومیں ظلم اور فریب سے چین کے حصے بخرے کرنا چاہتی تھیں اور چین نے انتہائی مہمان نوازی سے اُن کی جوع الارض کو تسکین دینے کے لئے اپنے ملک کو سفرہ عام اور خوان یغما بنا دیا تھا۔ اس بات سے ٹالسٹائے بہت خوش تھا اور وہ چینیوں کو مشورہ دیا کرتا تھا کہ اس فیاضی پر استقلال سے قائم رہیں۔ آخر میں فتح انہیں کی ہوگی۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ٹالسٹائے کی پیشگوئی پوری ہوئی۔ مثلاً اُس زمانہ میں چین نے پورٹ آرتھر اور ڈالبی روس کو دیدیا تھا مگر آگے چلکر روس کو (جنگ روس و جاپان میں) اس کی بڑی زبردست قیمت ادا کرنا پڑی۔ اسی طرح کیوچیو جرمنی کے ہاتھ لگا تھا اور وی ہائی وی برطانیہ کی درازدستی کا شکار ہوا تھا۔ کیوچیو کا حشر دنیا کو معلوم ہے وی ہائی وی کا بھی انشاء اللہ

ایک دن یہی انجام ہونا ہے۔

مگر چند سال بعد جب چینیوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ یورپ والوں کا مقابلہ انہیں کے ہتھیار سے کریں تو ٹالسٹائے کو بڑی بےچینی پیدا ہوئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر چینی بھی یورپ والوں کے متعدی مرض میں مبتلا ہو گئے تو نہ صرف چین کی روحانی ہلاکت کا باعث ہوگا بلکہ ساری دنیا کو نقصان پہنچے گا۔ اسکا خیال ہے کہ بنی نوع انسان کی زندگی میں ایک دن ضرور اصلاح ہو گی اور اس اصلاحی تحریک میں چین دنیا کی رہنمائی کرے گا۔ چینیوں کے پاس ایک بڑی دولت ہے جسے وہ "ڈاؤ" یعنی حسن اخلاق کہتے ہیں۔ اُن میں کفایت شعاری، دیانت داری، نرمی، محنت اور استقلال کی خصلتیں ہیں۔ اگر انہوں نے یہ چیزیں کھو دیں تو وہ کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔ یورپ کی تقلید میں سیاسی اور صنعتی انقلاب کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ پرانا استبدادی نظام بدستور باقی رہے۔ یورپ کی حالت زار چینیوں کے پیش نظر ہے:۔ غریبوں کی قابل رحم حالت، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش، فوج کی بھرتی، جنگ کی تیاری۔ نوآبادیوں کو لوٹنے کی پالیسی۔ کیا چین والے اس کی تقلید کریں گے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ مگر دوسری طرف وہ اس پر بھی کبھی راضی نہ ہوں گے کہ یورپ والے انہیں پامال کر ڈالیں۔ ایسی صورت میں انکے لئے صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ روحانی قوت سے کام لیں اور روح کے ناقابل شکست ہونے پر یقین رکھیں۔ انہیں اس عقیدے اور اس قوت کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں استعمال کرنا چاہئے۔ اگر وہ کرہ ارض کی طرح خاموشی سے اپنے مدار پر حرکت کرتے رہے تو یورپ ایک دن مجبور ہوگا کہ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ نوع انسان کی خیر و برکت چین کے روحانی پیشواؤں کے ان تین اصولوں میں پوشیدہ ہے، کنفوشس کی "تواضع" لے اوتسے کے "نظم بے ضابطہ" اور بدھ کے "ایثار و محبت" میں۔

یہ ہے ٹالسٹائے کی نصیحت چین کو - اب سوال یہ ہو کہ کیا چین نے اس نصیحت پر عمل کیا ؟ ٹالسٹائے کا مکتوب الیہ کوک ہوانگ مینگ بہت تنگ خیال آدمی تھا - وہ شخصی حکومت کا حامی تھا اور اُسے ہر مرض کی دوا خیال کرتا تھا - وہ ناکامیاب ہوا اور ٹالسٹائے کے اصول کے مطابق اُسے ناکامیاب ہونا بھی چاہئے تھا - مگر چین کا موجودہ انقلاب بھی روسی حکیم کے راستے سے بہت دور ہے - یہ سوائے اس کے کہ تاریخ کے دفتر بے پایاں کا ایک ورق الٹ دے اور کچھ نہیں کر سکتا - ٹالسٹائے کے خیالات چین کے ہزاروں برس کے فلسفے کے مطابق ہیں - پھر کیا وجہ ہے کہ چین ان خیالات کو اپنے لئے مشعل ہدایت نہ بنائے -

جاپان کے متعلق ٹالسٹائے نے جو رائے قائم کی ہے وہ بالکل اس کے خلاف ہے - جاپانی بہت بے چین طبیعت رکھتے ہیں اور ان میں نئے خیالات قبول کرنے کا مادہ بہت ہو - ایشیا کی قوموں میں سب سے پہلے (غالباً ۱۸۹۰ء میں یا اس کے کچھ پیشتر) جاپانیوں نے ٹالسٹائے سے تعلق پیدا کیا - مگر ٹالسٹائے کو ان کی روحانی ترقی کی صلاحیت میں بہت شبہ ہو اس کے نزدیک یہ حب وطن اور فوجی قوت کی پرستش کرتے ہیں اور یورپ کی تہذیب سے مسحور ہو گئے ہیں - اس نے جاپان کے جتنے لوگوں سے خط و کتابت کی اُن سب کی طرف سے اُسے مایوسی ہوئی - ان میں سے جن لوگوں کو ٹالسٹائے کی پیروی کا دعوےٰ ہے ان کی بھی اصل میں یہ کوشش ہے کہ اُس کے اصولوں کی تاویل کر کے ان سب سے حب وطن کی حمایت کا کام لیں - مثلاً ایک نوجوان ۱۹۰۴ء میں ٹالسٹائے کی تصانیف کو پڑھ کر چلا اُٹھتا ہے کہ ”حقیقت میں ٹالسٹائے ہمارا پیغمبر ہے“ مگر چند ہفتے بعد جب جاپان سین ٹاؤ میں روس کے بیڑے کو غرق کر دیتا ہے تو یہی نوجوان حب وطن کی شراب سے متوالا ہو جاتا ہے - اور ٹالسٹائے کے بنیادی اصولوں کا مخالف -

صرف چند جمہوری اشتراکی لیڈر جاپان میں ہیں جو ٹالسٹائے کی طرح جنگ کے مخالف ہیں۔ مگر ان کے اور ٹالسٹائے کے خیالات میں مجموعی حیثیت سے بہت فرق ہے۔ انہوں نے ستمبر ۱۹۰۴ء میں روسی حکیم کو خط لکھا جس کے جواب میں اس نے ان کا شکریہ ادا کیا اور جنگ کی مخالفت میں ان کی ہمنوائی کی مگر اس کے ساتھ ہی اشتراکیت کی تحریک سے بھی اختلاف ظاہر کیا۔

مگر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جاپان پر ٹالسٹائے کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ ٹالسٹائے کی ہشتاد سالہ سالگرہ کے موقع پر جو مجموعہ مضامین شائع ہوا اس میں ایک جاپانی کاٹین چلینگ کا بھی ایک مضمون تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ٹالسٹائے سے جاپان کے لوگ بہت متاثر ہوئے ہیں، اُس کی مذہبی تصانیف کی بدولت ۱۹۰۲ء ۱۹۰۳ء میں نہ صرف جاپان کے عیسائیوں میں بلکہ بدھ مذہب والوں میں بھی ایک اخلاقی انقلاب شروع ہو گیا۔ بدھ مذہب مدت سے ظاہری عبادات و رسوم پر زور دیتا چلا آتا تھا۔ مگر اب اس میں باطنیت کی تحریک بھی شروع ہوئی۔ اب جاپان ہر طرف مذہبی احساس، مذہبی ضمیر کا چرچا ہونے لگا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی داخلیت بھی خطرے سے خالی نہیں۔ اس سے علاوہ قربانی اور محبت کے جذبات کے خود پسندی، خود غرضی، تعصب، مایوسی کے پیدا ہونے کا بھی امکان ہے بلکہ بعض اوقات خودکشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ جاپان والے اس قدر جذبات پرست واقع ہوئے ہیں کہ اگر وہ ٹالسٹائے کے مذہب پر ایمان لائیں تو انکے لئے اس کا نباہنا بہت مشکل ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں المناک نتائج نہ پیدا ہوں۔ پھر بھی جاپان میں ٹالسٹائے کے مریدوں کی چند چھوٹی چھوٹی جماعتیں گوبے کے آس پاس کاشتکاری کرتی ہیں، اور لوگوں کو حضرت عیسیٰ کا پیام محبت پہنچاتی ہیں۔ روسی حکیم کی یادگار میں ایک علمی انجمن بھی ہے جس کی طرف سے ایک سٹر صفحے کا ماہوار رسالہ شائع ہوتا ہے۔

جاپان میں ٹالسٹائے کے پیرووں میں سب سے زیادہ قابل احترام ذات ایک

شخص کی ہے جس کا نام ڈافو ہ چینیز ہے۔ اُس نے ٹالسٹائے کو ایک عقیدت آمیز خط لکھا لیکن اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اس پیر روشن ضمیر کی زیارت کے لئے روانہ ہوگیا وہ روسی زبان بالکل نہیں جانتا تھا اور انگریزی بھی بہت کم۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹالسٹائے کے گاؤں یاسنایہ تک پہنچا۔ وہ وہاں صرف پانچ روز قیام کرکے جاپان واپس آگیا مگر اس تھوڑے عرصے میں اس کے دل پر اُس کے مرشد کی زندگی، بات چیت اور خصوصاً مسکراہٹ کا اتنا گہرا اثر پڑا جو آج تک باقی ہے اور غالباً تمام عمر باقی رہے گا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے "اگرچہ مجھے ٹالسٹائے سے ملے ہوئے سات سو تیس دن ہوگئے اور میں اس سے ہزارہا میل کے فاصلے پر ہوں لیکن اُن کی مسکراہٹ اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ آج کل میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہوں۔ میرے ساتھ میری بیوی ہے اور ایک کتا۔ ہم سب مل کر ایک مختصر سے مکان میں گزر کر لیتے ہیں۔ میں نے کچھ ترکاری بو رکھی ہے اور اسکی کیاری میں جو گھاس روزانہ اُگ آتی ہے کھود کر پھینکتا رہتا ہوں۔ میرا سارا وقت اسی میں صرف ہوتا ہے اور یہ شغل مجھے بہت محبوب ہے۔ اس میں میری اندرونی زندگی کی تصویر نظر آتی ہے۔ بہت سے لوگوں کی حالت میری سی ہے مگر افسوس ہے کہ وہ اپنا سارا وقت مضمون لکھنے میں صرف کرتے ہیں اور عمل بالکل نہیں کرتے۔"

روس کی رعایا میں مسلمانوں کی تعداد دو کروڑ کے قریب ہے۔ اس لئے ٹالسٹائے کو اکثر مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جن دوستوں سے وہ خط وکتابت کیا کرتا تھا اُن میں بھی مسلمانوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ۱۹۰۱ء میں جب ٹالسٹائے نے روس کے عیسائی کلیسا سے قطع تعلق کیا تو اس نے اپنے ملک کی اعلیٰ مذہبی کونسل کے نام ایک کھلا خط بھیجا۔ اس خط میں توحید کی وہ سچی روح تھی جس نے تمام عالم اسلام کو ہلا دیا۔ بہت سے مسلمان ٹالسٹائے کے دل وجان سے حامی ہوگئے، روس کے باشکیریوں، ہندوستان کے مسلمان

رہنماؤں اور استنبول کے سربرآوردہ مسلمانوں نے ٹالسٹائے کو خلوص اور محبت سے بھرے
ہوئے خط لکھے جن کا مضمون یہ تھا کہ ٹالسٹائے کے خط میں موحدانہ جذبات دیکھ کر اُنکے
دلوں پر اتنا اثر ہوا کہ اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ وہ سب اسے اپنا بھائی
اور دل سے مسلمان سمجھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ زبان سے بھی اسلام کی حقانیت
کا اقرار کرلے۔ قادیان ضلع گرداسپور سے کسی صاحب محمد صادق نامی نے بھی ایک خط لکھا
جسے پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ انہوں نے بہت خلوص اور محبت کے ساتھ ٹالسٹائے
کو یہ بتایا کہ اسلام میں ایک مجدد پیدا ہوئے ہیں جن کا نام حضرت مرزا غلام احمد ہے۔
ان بزرگ نے عیسائیوں کے باطل خیالات کی تردید میں یہ بھی لکھا کہ کشمیر میں یوزآسف یعنی
(عیسیٰ) کی قبر کا انکشاف ہوا ہے۔

جن مسلمانوں نے ٹالسٹائے سے خط وکتابت کی ان میں سے اکثر حماقت اور مسخرے
پن کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کی کوتاہ نظری، خودبینی اور خودستائی کو دیکھ کر ٹالسٹائے
کو قرون وسطیٰ کے عیسائی یاد آتے تھے۔ مثلاً جب ٹالسٹائے اسلام کے ان مجدد پر ایمان
نہیں لایا تو خط لکھنے والے بزرگ نے کئی بار اسے لکھا کہ انسان کے پاس خدا کا پیام
تین طرح پہنچتا ہے بعض لوگ اپنے عقل و فہم سے ہدایت پاتے ہیں، بعض وحی اور الہام
سے اور بعض تلوار کے زور سے۔

ٹالسٹائے ان لوگوں پر اعتراض نہیں کرتا کیونکہ اُس کے خیال میں حقیقت
کے طالب کو نہ تو مختلف مذاہب کی کوتاہیوں پر نظر ڈالنا چاہئے اور نہ اُنکے اختلافی
مسائل پر بلکہ صرف اس نقطے کو تلاش کرنا چاہئے جو تمام مذاہب میں مشترک ہے چنانچہ
اُس نے ان قادیانی امام صاحب کو جنہیں اپنے مذہب کی برتری پر اس قدر ناز تھا صرف
یہ جواب دیا "ہر اس شخص پر جو سچی دینداری کے جذبات سے لبریز ہے فرض ہے کہ وہ
اپنی زندگی کو لوگوں کے لئے نمونہ بنائے اور ایمانداری اور خلوص کے ساتھ نیکی کی تبلیغ

کرے۔ ہم سب کا مقصد ایک ہی اور وہ بھلائی اور نیکی کی زندگی بسر کرنا ہی"

ٹالسٹائے نے اسلام کی بہت تعریف کی ہے اور قرآن کے بہت سے معارف اُس کے دل کو تسکین دیتے ہیں لیکن اُس کا خیال ہے کہ عیسائیت کی طرح اسلام میں بھی بہت سی دور از کار باتیں شامل ہوگئی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اسلام کو قابل قبول اور سچا مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اس میں سے بہت سے عقائد جو غلطی پر اور بہت سے جذبات جو تعصب پر مبنی ہیں نکال دینا پڑیں گے اور صرف وہ چیزیں رہ جائیں گی جو نیکی اور بھلائی کی جڑ ہیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے "اگر تمہیں میری باتیں بری لگیں تو معاف کرو کیونکہ میں جب حق بات کہتا ہوں تو پوری کہتا ہوں۔ آدھی بات کہنے سے تو میرے نزدیک چپ رہنا بہتر ہے" مگر دوسری طرف ٹالسٹائے کو بعض روشن خیال اور وسیع النظر مسلمانوں سے بھی سابقہ پڑا۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جب وہ روس کی عیسائی جماعت سے علیحدہ ہوا تو مصر کے مشہور مصلح اور رہنما مفتی محمد عبدہٗ نے اسے مبارکباد کا خط لکھا کہ اس کی ذات تمام طالبان حق کے لئے نمونہ ہی اور ان سب کی آنکھیں اس کے نقش قدم پر لگی ہوئی ہیں۔ تقریباً اسی مضمون کا خط ٹالسٹائے کو مرزا رضا خاں نے جو استنبول میں ایرانی قنصل کی حیثیت سے مقیم تھے لکھا تھا۔

لیکن سب سے زیادہ اثر ٹالسٹائے پر ایک بہائی کے خط کا ہوا۔ یہ جبریل ساشی نام ایک شخص تھا جو عرب کا رہنے والا تھا۔ اُس نے پہلے مذہب عیسوی اختیار کیا اور پھر بہائی ہوگیا۔ اپنے خط میں اُس نے ٹالسٹائے کو اپنے عقائد کی تبدیلی کی داستان لکھی تھی جس کے جواب میں ٹالسٹائے نے لکھا کہ میں مدت سے بہائیت کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا ہوں اور اس مبحث پر جتنی کتابیں مل سکتی ہیں قریب قریب سب میں نے جمع کرلی ہیں۔ مجھے یقین ہے بہائیت میں اخلاقی تربیت کی قوت ہی اور اس مذہب کو مشرق میں ترقی کا موقع ملیگا بلکہ مذہب عیسوی کی اندرونی کمزوری

کے سبب سے خیال ہوتا ہے کہ مذہب بہا اس کا قائم مقام ہو جائے تو تعجب نہیں۔

۱۹۰۸ء میں ٹالسٹائے کی ہشتاد سالہ سالگرہ کے موقع پر کلکتے کے ایک مسلمان عبداللہ ماموں سہروردی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے ٹالسٹائے کو مبارکباد بھیجی اور آسے یوگی کے لقب سے مخاطب کیا۔ انہوں نے لکھا کہ قرآن ٹالسٹائے کے عدم تشدد کے عقیدے کا ہرگز مخالف نہیں ہے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح ٹالسٹائے انجیل کا مطالعہ کرتا ہے یعنی باطل کی ظلمت میں نہیں بلکہ حق کی روشنی میں، اسی طرح قرآن کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ انہوں نے ٹالسٹائے کی تعریف میں کہا کہ وہ نہ مغرب کا نور ہے نہ مشرق کا بلکہ خدا کے انوار میں سے ایک نور ہے جو دنیا کی تاریکی کو دور کرنیکے لئے بھیجا گیا ہے۔ انہوں نے پیشین گوئی کی کہ ٹالسٹائے کا عدم تشدد کا عقیدہ ہندوستان کے مہاتماؤں کی تعلیم کے ساتھ مل کر ایک نیا مذہب بنائے گا جس کی تبلیغ کے لئے ایک نیا ہادی پیدا ہوگا۔ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور وہ شخص پیدا ہوگیا جو ہندوستان میں ٹالسٹائے کے فلسفے کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے۔

ہندوستان انیسویں صدی کے آخر میں بیدار ہوگیا۔ یوروپ والے بالعموم اس حقیقت سے بیخبر ہیں۔ صرف چند علما جو سیاست اور ملک گیری سے واسطہ نہیں رکھتے بلکہ کتابوں کے ایک ڈھیر کے درمیان اپنی زندگی گزار دیتے ہیں اس بیداری کا علم رکھتے ہیں۔ ۱۸۳۰ء میں کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہندوستان کے خدا داد جوہر پھر چمکیں گے لیکن ۱۹۰۰ء میں یہ چمکے اور ایسے چمکے کہ دیکھنے والوں کی نظریں خیرہ ہوگئیں۔ ذہنی زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ ریاضی ہو یا سائنس، شاعری ہو یا صنعت و حرفت ہندوستان میں ترقی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ آریہ سماج کے قائم ہونے سے ویدانی فلسفے کے دوبارہ زندہ ہونے کا امکان ہے اس کے علاوہ کیشب چندر سین نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی ہے جس نے خدمت خلائق اور رفاہ عام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس میں

کیشب چندر نے مذہب کے عیسوی تخیل اور مشرقی تخیل کو ملانے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان کے مذہبی مصلحوں میں سے دو خاص امتیاز رکھتے ہیں ایک تو رام کرشن (۱۸۳۶ء تا ۱۸۸۶ء) اور دوسرے انکے لائق شاگرد سوامی ویویکانند (۱۸۶۳ء تا ۱۹۰۲ء) ان دونوں نے اپنے ہموطنوں میں صدیوں کے بعد بھی مذہبی روح پھونکی ہے۔ ٹالسٹائے جو ہر میدان میں حقیقت کی تلاش میں سرگرم رہتا تھا ان دونوں کی طرف سے بھی غافل نہیں رہا۔ ویدک میگزین کے اڈیٹر رام دیو نے اُسے سوامی ویویکانند کی تصانیف بھیجی تھیں اس نے ان سب کو پڑھا اور ۱۸۹۶ء سے برابر ان مضامین کا مطالعہ کر رہا تھا جو سوامی جی کے قلم سے نکلتے تھے۔ اس کی نظر سے رام کرشن کے مقالات بھی گزرے۔ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ سوامی ویویکانند ۱۹۰۰ء میں یوروپ کی سیاحت کے دوران میں یاسنایا نہ جاسکے کہ ٹالسٹائے سے اور ان سے عمر بھر میں ایک بار تو ملاقات ہو جاتی۔ راقم الحروف کا قصد تھا کہ پیرس میں جاکر اس مقدس مہمان کی زیارت کرے مگر شومی قسمت سے موقع نہ ملا جس کی آج تک ندامت باقی ہے۔

وہ ہندوستانی جو قلب باصفا رکھتے ہیں ٹالسٹائے کو کرشن کا اوتار سمجھتے ہیں اور بہت سے لوگ اُسے مہاتما کہتے ہیں۔ دی نیو ریفارمر کے اڈیٹر گوپال چیٹی ٹالسٹائے کے پیرو ہیں۔ انہوں نے ٹالسٹائے کی ہشتادسالہ سالگرہ کے موقع پر (۱۹۰۸ء میں) ایک مضمون لکھا جس میں ٹالسٹائے کو گوتم بدھ سے تشبیہ دی۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں "اگر ٹالسٹائے ہندوستان میں پیدا ہوتا تو لوگ اُسے اوتار سمجھ کر، پرش سمجھ کر، سری کرشن سمجھ کر اُس کا احترام کرتے"

مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ ٹالسٹائے کو ہندوستان میں براہ راست جس جماعت سے سابقہ پڑا وہ سوراجیوں کی جماعت ہے۔ ۱۹۰۸ء میں سی آر داس نے جو آگے چل کر آزادی کی تحریک میں مہاتما گاندھی کے دست و بازو بن گئے ٹالسٹائے کو ایک خط لکھا جب

میں انہوں نے سچائی اور خلوص کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا اور ٹالسٹائے کے عدم مزاحمت کے نظریے پر نکتہ چینی کی اسی کے ساتھ انہوں نے ٹالسٹائے سے درخواست کی کہ اُن کے رسالے "فری ہندوستان" کی قلمی اعانت کرے۔ اس کے جواب میں ٹالسٹائے نے ۱۴ دسمبر ۱۹۰۸ء کو ایک طویل خط لکھا جس میں اس نے پہلی بار عدم مزاحمت اور محبت کا پیام ہندوستانیوں کے نام بھیجا۔ اس نے ہر جملے میں سری کرشن کے فلسفے کو مدنظر رکھا اور ہندوستانیوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی پرانی حکمت و دانش کو چھوڑ کر یوروپ کی تہذیب کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "توقع تھی کہ برہما، بدھ اور کنفیوشس کی قلمرو میں مغربی تہذیب کو کہیں جگہ نہ ملے گی یعنی چینی، جاپانی اور ہندی اپنے اپنے معلم کے نقش قدم پر چلتے رہیں گے۔ اور چونکہ وہ تشدد کے حامیوں کی غلطی سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے وہ مسائل زندگی کے حل کرنے کے لئے آشتی اور محبت کی تدابیر اختیار کریں گے لیکن کیسی بدقسمتی ہے کہ دوسری قوموں کو ان کی غلطیوں سے متنبہ کرنے کے بعد مشرق کے رہنے والے مغربی تہذیب سے مسحور ہو گئے چنانچہ جاپان کا یہی حال ہے اور اسکا انجام ہرگز اچھا نہ ہوگا۔ چین اور ہندوستان کے بعض رہنماؤں کا بھی اس طرف رجحان ہو گیا ہے چنانچہ آپ نے ہندوستان کے سوراج کا ذکر کرتے ہوئے کسی رسالے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ غاصب کا مقابلہ کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے اور عدم مزاحمت سے دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ہم کو سراسر نقصان"

"یہ کیوں؟ تم لوگ مذہبی آدمی ہو لیکن مغربی تہذیب سے مسحور ہو گئے ہو اور اپنی قوم کی قدیم رسم محبت کو توڑنا چاہتے ہو . . . . یوروپ کے لوگ جو پہلے مذہب کے غلام تھے اور اب سائنس کے بندے ہیں ہمیشہ سے تشدد کا خیال لوگوں کے کانوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔ وہ حق کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ تم نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ بھی تیاری نہ کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ تم کہتے ہو کہ انگریزوں نے ہندوستان پر اس لئے قبضہ

کر لیا کہ ہندوستان میں مقابلے کی قوت نہ تھی۔ مگر واقعہ اس کے برعکس ہے انگریزوں کو مقابلہ کرنے میں اس لئے آسانی ہوئی کہ ہندوستانی ابتدا سے انتہا تک اس عقیدے پر جمے رہے کہ تشدد ہی ہر منظم جماعت کی بنیاد اور اساس ہے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے ہندوستانی اپنے سرداروں کے مطیع بنے۔ اسی عقیدے کے سبب سے وہ آپس میں لڑتے ہیں، یوروپ والوں سے لڑتے ہیں، انگریزوں سے لڑتے ہیں ..... ایک تجارتی کارخانہ جس میں تیس ہزار سے زیادہ افراد نہیں تھے بتیس کروڑ آدمیوں پر غالب آگیا۔ لیکن کیا انگریز اس شخص پر غالب آسکتے ہیں جسے اُن کی طرف رغبت نہ ہو؟ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ نہیں کیا بلکہ ہندوستانیوں نے ہندوستان کو انگریزوں کے سپرد کر دیا .... ہندوستان کی زندگی ماضی سے حال تک تشدد کے ماتحت گذرتی رہی ہے۔ ہندوستان دائمی محبت کے قانون کو سمجھنے سے قاصر ہے ... کتنے افسوس کی بات ہے کہ انسان کی عمر جہالت میں گزرتی ہے۔ جو چیز اس کے قبضے میں ہے اُسے وہ دنیا بھر میں تلاش کرتا ہے کیونکہ اُسے علم نہیں کہ وہ اس کے پاس موجود ہے۔ واقعی جاہل کی حالت رحم کے قابل ہے "میں نے اسے (محبت کا) زیور دیا ہے اور یہ (محبت کا) زیور اُس کے پاس ہے مگر وہ اس سے بے خبر ہے" (سری کرشن)

"انسان کو صرف اس قانون، محبت پر عمل کرنا چاہیئے جو اُس کے دل میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور صرف عدم مزاحمت اور عدم تشدد کے قانون کو پیش نظر رکھنا چاہیئے تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ اس طرح نہ صرف کئی سو آدمی کئی ہزار آدمیوں پر غالب نہیں آسکتے بلکہ کئی لاکھ آدمی مل کر ایک آدمی کو مغلوب نہیں کر سکتے۔ بس تم یہ عہد کر لو کہ ہم کوئی گناہ نہیں کریں گے اور گنہگاروں کے ساتھ نہیں رہیں گے، قانون کو نہ توڑیں گے؛ خراج دینے سے انکار کرینگے، فوج میں نہیں داخل ہوں گے۔ پھر دنیا میں کوئی تم پر غلبہ نہ حاصل کر سکے گا"

اس طویل خط کے آخر میں ٹالسٹائے نے پھر سری کرشن کے چند جملے نقل کئے ہیں

"بچو! چشم غفلت کھول کر دور تک دیکھو تمہیں ایک محبت سے معمور نئی دنیا نظر آئے گی یعنی فطری عالم جو میری خالص عقل سے بنا ہے۔ یہی عالم حقیقی ہے۔ پس تمہیں اندازہ ہوگا اس کمال اور برتری کا جو محبت نے تمہیں عطا کی ہے اور تم پہچانو گے ان باتوں کو جن پر عمل کرنے کی تمہیں محبت نے ہدایت کی ہے۔

یہ کھلا خط جو ٹالسٹائے نے اصل میں سارے ہندوستانیوں کے نام لکھا تھا ایک نوجوان وکیل کے ہاتھ میں پڑا جو افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں رہتا تھا۔ یہ شخص جسے دنیا مہاتما گاندھی کہتی ہے اس خط کو پڑھ کر جوش مسرت سے اچھل پڑا۔ گاندھی نے غالباً ۱۹۰۹ء میں ٹالسٹائے کو خط لکھا جس میں انہوں نے یہ بتایا کہ وہ کس طرح دس سال سے ٹالسٹائے کی تعلیم کے مطابق اپنی قوم کی خدمت کر رہے ہیں اور اس بات کی اجازت چاہی کہ ٹالسٹائے نے جو خط سی۔ آر۔ داس کے نام لکھا تھا اس کا ترجمہ ہندوستانی میں شائع کر دیا جائے۔

ٹالسٹائے نے اس خط کا جو جواب دیا وہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے لکھا کہ "میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ظلم و ستم کے مقابلے میں نرمی اور آشتی کا اور غرور و تکبر کے مقابلے میں انکسار و محبت کا بول بالا ہو۔" اس کے بعد جب ٹالسٹائے نے گاندھی کی کتاب ہند سوراج پڑھی تو اسے اس مذہبی تحریک کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اس نے گاندھی کو ایک خط میں لکھا کہ تمہارا عدم تشدد اور عدم مزاحمت نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے قابل قدر ہیں۔

ٹالسٹائے نے جب گاندھی کی سوانح عمری پڑھی تو اُسے بیحد خوشی ہوئی اور باوجودیکہ وہ اس زمانے میں سخت بیمار تھا مگر اس نے گاندھی کو کئی خط لکھے (مئی ۱۹۱۰ء) جب اسے کسی قدر صحت ہوئی تو اس نے (اپنے مرنے سے ایک مہینہ پہلے یعنی ۷ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو) پھر گاندھی کو ایک خط لکھا جو عدم تشدد کے مذہب کے لئے انجیل کا حکم رکھتا ہے۔ یہ خط جو گویا ٹالسٹائے کا وصیت نامہ ہے جنوبی افریقہ میں "انڈین اوپینین" میں شائع ہوا۔ سچ پوچھئے

تو عدم تشدد کی پہلی کامیابی اس خط کی بدولت ہوئی۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ادھر یہ خط شائع ہوا اور اُدھر ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ شروع ہوئی جس کے شعلے دیکھتے ہی دیکھتے تمام عالم میں پھیل گئے اور لاکھوں خدا کے بندے اس نفرت اور عداوت کی آگ میں جل کر بھسم ہو گئے۔

مگر شکر ہے کہ یہ ہلاکت اور تباہی کے ہنگامے ختم ہو گئے ہیں۔ خونخوار درندوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بند ہو گئی ہیں اور امن وامان کی بلبل یعنی گاندھی کی خوشگوار آواز صلح و آشتی کے ترانے سنا رہی ہے۔ انسانی ہمدردی کا یہ نیا مقدس گیت بہت سے لوگوں کو پرانے گیت سے زیادہ شیریں اور زیادہ پر اثر معلوم ہوتا ہے۔

عربی معاشرت پر ایرانی اثرات

یہ مضمون مشہور جرمن مستشرق فان اے کریمر کے ایک رسالے سے ماخوذ ہے جو
عنقریب بعض ضروری مضامین کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہو جائیگا۔

عراق و ایران کی تسخیر کے تھوڑے ہی دنوں بعد عرب ایرانی شہنشاہوں کی شان و
شوکت اور انکے درباری آداب و مراسم اور تکلفات سے واقف ہو گئے تھے۔ اموی
خلفا نے بھی ان کی بہت کافی تقلید کی ہے۔ قرآن مجید کے امتناعی احکام کے باوجود دار
دمشق میں شراب نوشی کی رسم عام ہو گئی تھی۔ ابتدا میں یہ لوگ انگور کا ابلا ہوا رس
(طلا) یا ایک یونانی شراب جس کا نام رساطون ہے (رساطون یونانی لفظ ہی) استعمال
کرتے تھے۔ امویوں کے زوال کے بہت کافی زمانے کے بعد ایک مرتبہ بغداد میں بلور
کا ایک بہت بڑا جام دکھایا گیا تھا جس میں خلیفہ ہشام کی بیوی ام حکیم صبوحی پیا کرتی تھی
دربار بغداد میں بھی رومیوں کی شراب کی محفلوں کی طرح خوشی کے موقعوں پر میخواروں
کو پھولوں کے ہار پہنائے جاتے تھے۔

بایں ہمہ بنو امیہ کے زمانے میں دربار کے آداب بہت زیادہ سخت نہیں تھے
ہر شخص دربار میں آ جا سکتا تھا اور خاص خاص لوگ یا تو خلیفہ کے پاس ہی دیوان یا
کرسیوں اور گدوں پر بیٹھتے تھے۔ ایک درباری نے لکھا ہے کہ ایک روز جب کہ ابھی
چاندنی راتیں تھیں اسے ولید ثانی کے دربار میں جانیکا اتفاق ہوا تو ایک بہت بڑے
طشت میں اسکے سامنے شراب کے چند جام پیش کئے گئے اور جب اس نے یہ دریافت
کیا کہ یہ شراب نوشی کا کونسا موقعہ ہو تو اسے بتایا گیا کہ یہ وہ شراب ہی جسے ایرانی ہفت گاہ
کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کا دور سال کے ایک حصے میں برابر سات ہفتوں

تک قائم رہتا ہے۔ شام کی تفریحوں میں جب رقص سرود کی محفلیں قائم ہوتی تھیں تو خلفا قدیم ایرانی رسم کے مطابق پردے کی اوٹ میں بیٹھ جاتے تھے۔ یہ پردہ کمرے کے وسط میں لٹکا دیا جاتا تھا تاکہ خلیفہ اہل دربار اور گانے والوں سے ممتاز ہو جائے۔ لیکن اس رسم پر تمام خلفا نے عمل نہیں کیا۔

سرود کا فن جسے دربار دمشق میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی عربوں نے ایرانیوں سے سیکھا تھا۔ شروع شروع کے بہترین گانے والے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت یا تو ایرانی تھے یا ایرانی اساتذہ کے شاگرد۔ حریم خلافت میں شب و روز عیش و عشرت کا چرچا رہتا تھا۔ ان لوگوں میں اور مسلمانوں کے اولین خلفا میں جو کسی طرح بھی عام لوگوں سے ممتاز نہیں رہتے تھے کس قدر فرق تھا۔ ولید ثانی ہر روز جواہرات سے مرصع نئے نئے طلائی ہار پہنا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک دور دراز صوبے کے عامل۔ عامل خراسان نے ایک مرتبہ دربار خلافت سے شکایت کی کہ اس کے صوبے کی ساری مالگذاری اس کے باورچیخانے کے اخراجات کے لئے پوری نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ ایرانی لباس کا رواج عام ہو گیا۔ چنانچہ یزید ابن مہلب نے ایک عرب کو اس جرم میں سزا بھی دی تھی۔ عربوں کو ایرانی چیزوں سے خواہ مخواہ کا تعصب تھا ایک شخص نے اپنا چشم دید واقع بیان کیا ہے:۔ اسمٰعیل ابن یسار ایرانی نژاد تھا لیکن اس کے آبا و اجداد اپنے دوسرے ہم قوموں کی طرح ایک عربی قبیلہ (تیم) کے مولا ہو گئے تھے۔ باوجود اس کے یہ اسمٰعیل ہر ایرانی شئے کی تعریف کیا کرتا تھا۔ شروع شروع میں وہ عبداللہؓ ابن زبیر کی خلیفہ کا طرفدار تھا لیکن اسکے زوال پر اس نے امویوں کی قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ ایک مرتبہ اسے خلیفہ ہشام کے دربار میں حاضر ہونیکا موقع ملا ہشام اس وقت قصر رصافہ میں ایک مرمریں حوض کے کنارے بیٹھا تھا۔ اس نے اسمٰعیل سے کہا کوئی قصیدہ سناؤ۔ اس پر اسمٰعیل نے اپنے وہ اشعار پڑھنا شروع کئے جن میں اس نے اپنے ایرانی الاصل ہونے پر اظہار فخر کیا تھا

اسمٰعیل نے کہا :-

"مجھے اپنے آباو اجداد کی قسم میں وہ لکڑی نہیں ہوں جو لڑائی میں آسانی سے ٹوٹ جائے نہ وہ چشمہ ہوں جو خشک ہو جائے میں شریف قبیلے سے ہوں اور شان و شوکت میں کوئی مجھسے بڑھ کر نہیں۔ میری زبان تلوار کی طرح تیز ہے اور اس سے میں اپنے قبیلے اور اپنے خاندان کی عزت کی حفاظت کرتا ہوں خواہ وہ کوئی تاجدار کیوں نہ ہوں۔ میرے آبا و اجداد اپنے زمانے کے بادشاہ تھے۔ وہ نہایت شائستہ، فیاض اور مہمان نواز تھے۔ وہ شہرت اور عزت میں اور اپنی فوج کی کثرت میں خسرو اور شاپور سے مشابہ تھے۔ وہ لڑائی میں شیروں کی طرح حملہ آور ہوتے تھے۔ انہوں نے ترکوں اور یونانیوں کو نیچا دکھایا۔ وہ بھاری بھاری زرہیں پہنکر چلتے تھے جس طرح بھوکے شیر نکلتے ہیں اور اگر تم پوچھو تو میں تمہیں بتاؤں کہ ہم اس نسل سے ہیں جو سب سے افضل ہے۔"

پہلے تو خلیفہ صبر و تحمل کے ساتھ اس کے اشعار سنتا رہا لیکن آخر کار مغلوب الغضب ہو کر کہنے لگا "اسے حوض میں پھینکدو" جوشیلے درباریوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور حوض میں پھینکدیا جس سے وہ بمشکل تمام ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ بالآخر خلیفہ نے اسے شام سے نکالدیا اور اسمٰعیل نے بھاگ کر عرب میں پناہ لی جہاں وہ بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے آباو اجداد کی شان میں مدح خوانی کرتا رہا۔

دولت امویہ کے انقراض کے بعد جب عباسی حکومت قائم ہوئی تو اہل ایران اور ایران کے ہمدردوں کے دن پھر گئے۔ عباسی خلفاء کے دربار اور ان کے دار السلطنت میں بہت کافی ایرانی موجود تھے۔ ان لوگوں کو قرب سلطانی ہی حاصل نہیں تھا بلکہ رفتہ رفتہ انکو بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر فائز کیا گیا جس سے انکی دولت و ثروت اور جاہ و اقتدار میں بے حد اضافہ ہوگیا۔ برامکہ کے مشہور خاندان

کا حال کون نہیں جانتا - یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے زوال کی منحوس اور المناک ساعتوں تک نہایت مطلق العنانی کے ساتھ حکومت پر متصرف رہے - بڑی بڑی مہموں کی سرداری بھی ایرانیوں ہی کے حصے میں آتی تھی - خلیفہ ہادی کے زمانے میں ایک ایرانی جو اپنا سلسلۂ نسب ایرانی عمال کے ایک پرانے خاندان سے ملاتا تھا اور جو اسلام قبول کر لینے پر خلیفہ منصور کا مولا ہو گیا تھا خوزستان کا امیر عساکر مقرر ہوا اور اسے اختیار دیدیا گیا کہ وہ اس اہم صوبے کی مالگذاری بھی وصول کر لیا کرے -

یہ باتیں قدیم عربی جماعت کو نہایت ناگوار گذرتی تھیں اور وہ لوگ اکثر صاف صاف اپنے جذبات کا اظہار کر دیتے تھے - اس سلسلہ میں میں ایک ہجو کی طرف اشارہ کروں گا جو شروع عباسی عہد میں ایرانیوں کے خلاف لکھی گئی تھی اور جس سے عربی جذبات کی نہایت صحیح ترجمانی ہوتی ہے :-

"خدا کو یہ نہیں منظور تھا کہ میں تمہیں اسی وقت سے جانتا جب تم گھاس کی منڈی میں بیٹھا کرتے تھے اور ابھی تمہاری خوش قسمتی کا زمانہ نہیں آیا تھا - لیکن بمشکل ایک سال گذرنے پایا ہے کہ اب تم ریشم اور بانات کا لباس پہنے ادھر ادھر اکڑتے پھرتے ہو - ایک زمانہ تھا جب تمہاری عورتیں کنووں کے پاس بیٹھی دھوپ میں فاختاؤں کے ساتھ چلایا کرتی تھیں - خدا کی شان ہے کہ اب انکو بدن پر دنیا بھر کے ریشمی کپڑے نظر آتے ہیں - کیا انکو وہ زمانہ بھول گیا جب ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا وہ پہاڑیوں میں پتھر توڑا کرتی تھیں اور اپنے کرتے کے دامنوں میں گھاس کے بڑے بڑے گٹھے باندھ کر لایا کرتی تھیں - اب جوان کو مال و دولت نصیب ہوا تو وہ کس قدر بے شرمی سے جھوٹ بولتے ہیں اور کہتے ہیں ہم شریف ہیں، ہم دہقانوں کی اولاد ہیں - اور اگر ان میں سے کسی کمینے سے کمینے سے بھی پوچھا جائے کہ تم کون ہو تو نہایت غرور سے کہتا ہے

میں بہرام چوبیں کا بیٹا ہوں - میرا کون مقابلہ کرسکتا ہے، میں وہ ہوں جسے کسریٰ نے مال و دولت عنایت کیا تھا اور اپنا وارث بنایا تھا"

ایرانیوں کے غرور پر اس سے زیادہ شدید حملہ اور کیا ہو سکتا ہے ؟ -

" دیکھو اب انہوں نے گدھوں کی بجائے اپنی زینیں نہایت قیمتی ٹٹوؤں پر کس لی ہیں اور ترکاری بوتے بوتے امرا و سلاطین کے محلوں میں پہنچ گئے ہیں - وہ عربوں سے نفرت کرتے ہیں اس لئے کہ ان کو خدا اور اس کے رسول سے نفرت ہے -"

لیکن اس اظہار غیظ و غضب کے باوجود جو سلب قوت اور زوال اقتدار کا ضروری نتیجہ تھا - عربوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا - دربار خلافت میں ایرانی اثر بتدریج بڑھتا گیا - یہانتک کہ خلیفہ ہادی، ہارون الرشید اور مامون الرشید کے عہد میں تو اس کی انتہا ہو گئی - مامون کے اکثر وزرا ایرانی تھے یا ایرانی النسل - بغداد میں ایرانی وضع قطع اور ایرانی طرز معاشرت دن بدن مقبول ہوتا گیا - رفتہ رفتہ لوگوں نے نو روز مہرجان اور رام قدیم ایرانی تیوہار بھی منانا شروع کر دیے - ارکان سلطنت ایرانی لباس پہنتے تھے - چنانچہ دوسرے ہی عباسی خلیفہ کا حکم تھا کہ ملازمین حکومت قلانیس (لمبی لمبی مخروطی سیاہ ٹوپیاں جو یورپ کی ٹاپ ہیٹ سے مشابہ تھیں) استعمال کیا کریں (۷۷۰ ء - ۱۵۳ ھ) دربار میں بھی ایرانی شہنشاہوں کے سے زرتار کپڑے پہنے جاتے تھے اور یہ صرف خلفا کا حق تھا کہ اس لباس کو جسے چاہیں عنایت کریں ہمیں متوکل کے زمانے کا ایک سکہ ملا ہے جس میں خلیفہ ایرانی لباس پہنے نظر آتا ہے - اگرچہ ابتدا میں بھی مسلمان تصویر سازی کے کچھ بہت زیادہ مخالف نہیں تھے لیکن اس واقعہ سے یقین ہو جاتا ہے کہ دربار خلافت میں قدیم اسلامی تعصبات کا خاتمہ ہو چکا تھا اور یہ سب کچھ ساسانیوں کی تقلید کا نتیجہ تھا - بغداد کے اعلیٰ طبقوں میں ایرانی

اثرات کے اس طرح سرایت کر جانے سے مذہبی زندگی میں بھی ایک نئے ہیجان اور ایک جدید انقلاب کے آثار پیدا ہوئے۔ عراق میں ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں تھی جنھوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ ان مذہبی عقائد کو اختیار کر لیا تھا جنہیں اسلام سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب کچھ خاندانی اثر یا اجنبیوں سے میل جول کا نتیجہ تھا۔ عباسی عہد میں ان خیالات کو از سر نو تحریک ہوئی۔ بصرہ میں جو عہد خلافت کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ نہ صرف کثیر التعداد غیر عرب آبادی (جس میں ایرانی عنصر غالب تھا) موجود تھی بلکہ تجارتی تعلقات کی بدولت وہاں ہندی اثرات بھی پھیل رہے تھے۔ اسی شہر میں سب سے پہلے عقیدہ اختیار نے جسکی ابتدا دمشق میں ہوئی تھی ایک عقلی نظام دینیات کی شکل اختیار کی اور آگے چل کر مذہب اعتزال کے نام سے غیر معمولی وقعت حاصل کی۔ یہیں سب سے پہلے وہ آزاد خیال لوگ پیدا ہوئے جو رفتہ رفتہ اسلام سے بیگانہ ہوتے گئے اور یہیں سے مذہب سے بے اعتنائی کی وہ تحریک پیدا ہوئی جس سے آگے چلکر دربار خلافت بھی محفوظ نہیں رہا۔

تراوش قلم: میٹلڈا سیراؤ

(۱)

میٹلڈا سیراؤ (پیدائش ۱۸۵۶ء) اطالیہ کے زنانہ اہل قلم کی صف اول میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نے اپنے ملک کے سارے نسوانی طبقہ کے خلاف ایک شاہراہ زندگی اختیار کی۔ تیس سال کی عمر تک وہ مختلف شخصیتوں کے سوانح حیات پر رسائل و جرائد میں قلم فرسائی کرتی رہی۔

اس کے ابتدائی عہد کی تحریرات میں فرانسیسی حکمائے "واقعیت" (مثل زولا وغیرہ) کا رنگ علانیہ نمایاں ہے بیلزاک کی روح سے ارباب قلم میں شاید ہی کوئی اس قدر مشابہ ہو جیسی کہ میٹلڈا ہے۔ بعد میں اس نے نفسیات انسانی کا مطالعہ و تجربہ پیش کرنے والے ناول نویسوں کا مذاق اختیار کیا اور اس کے بھی بعد وہ "تصوف جدید" کے مسلک سے تعلق رکھنے والی جماعت مصنفین کے زمرہ میں داخل ہو گئی۔ چنانچہ اس کا افسانہ "ولی" اسی رنگ کا آئینہ دار ہے۔ اس کا طرز تحریر کسی قدر مردانہ ہے۔ لیکن اس کے قصوں میں بلا کا جوش و جذبہ ہوتا ہے۔ اُس کے ایک جدید افسانہ کی (ھیروئن) ایک امریکن عورت ہے لیکن وہ اہل امریکہ کے اس مذاق ادبی سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں رکھتی جس کا تقاضہ یہ ہے کہ "ہر قصہ کا خاتمہ مسرت آمیز اور نیک انجام پر ہو۔ مگر اس افسانہ (ایثار کی فتح) میں اس نے اسی امریکن مذاق کا تتبع کیا ہے، چنانچہ یہ قصہ اہل امریکہ کے نقطۂ نظر سے ایک "کامیڈی" ہے۔ اور خود مصنفہ کی زاویۂ نگاہ سے ایک "ٹریجیڈی"!

صوفیہ اپنے کام سے سر نہ اٹھاتی تھی اور اس کی نرم و نازک انگلیاں بڑی چابکدستی سے نفیس لیس پر متحرک تھیں لیکن لولو ادھر اُدھر کمرے میں ٹہل رہی تھی اور طاقچوں میں رکھے ہوئے سامان آرائش سے کھیل رہی تھی، یا وہ پھر کسی میز کی دراز کو کھولتی اور بے معنی انداز سے اس کے اندر جھانکتی

تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس وقت اس کا جی کسی کام میں نہیں لگتا اور وہ بیتاب ہے کہ سلسلۂ گفتگو شروع کرے۔ مگر ساتھ ہی اپنی بڑی بہن کے پُر وقار انداز سے مرعوب بھی ہے۔ خیر اب وہ ایک گیت گنگنانے لگی۔ اُس نے ایک شعر پڑھا، لیکن صوفیہ نے کوئی التفات نہ کیا۔ آخر لولو کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور اب وہ پوری بیباکی سے ہمکلام ہونے پر مجبور ہو گئی۔ وہ اپنی بہن کے بالکل سامنے جا کھڑی ہوئی اور پوچھا :-

"صوفیہ! انہیں کچھ خبر ہے کہ اُستانی نے مجھے کیا کہا ہے ؟ !"

"یقیناً کوئی دلچسپ بات نہ کہی ہو گی۔"

"صوفیہ! یہ ایسا خشک و سرد جواب ہے کہ اُس کو سُنکر گرمی کے موسم میں بھی آدمی کی رگ و پے میں سردی سرایت کر جائے! میری کشمیری بہن! آخر یہ سردی اور سردمہری تم میں کہاں سے آ گئی ہے ؟"

"لولو! تم ابھی تک بالکل بچّہ ہو!"

"ہاں! یہی تو تم کو غلط فہمی ہے؛ میری پیاری بہن! میں بچّہ نہیں ہوں؛ میری تو اب شادی ہونے والی ہے!"

"کیا کہا ؟ !"

"جی ہاں! یہی وہ غیر دلچسپ بات ہے جو جینٹّے نے مجھ سے کہی ہے!"

"کس قدر لغویات ہے! میں تمہاری گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر ہوں"

"اچھی بات ہے؛ تو اب میں تم کو ساری داستان ہی سنا دوں، جس طرح ڈرا ماٹسٹ سُنایا کرتے ہیں؛ لیکن حضور کے گوشگذار رہے کہ یہ ذرا طویل اور مسلسل تذکرہ ہو گا؛ اور میں سرکار دستانت مآب سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ پوری توجّہ سے اُس کو سُننا بھی گوارا فرمائیں گی ؟"

"ہاں ہاں! لیکن جلدی کیجئے"

"میدانِ مرزیخ میں جس دن گھوڑ دوڑ ہوئی ہے وہ دن اور وہ موقعہ اس داستانِ عشق کا

وقت اور محل ہے۔ آپ وہاں تشریف فرما نہ تھیں۔ اس لئے کہ آپ تو حسب معمول اپنی کتابوں میں مستغرق تھیں!"

"اگر تم نے اسی طرح قصہ بیان کیا اور نفس مضمون کو چھوڑ کر ایسی ہی بیراہ روی اختیار کی تو میں ایک حرف آیندہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوں!"

"اجی آپ سنیں تو! یہاں تو وہ حال ہو رہا ہے کہ:-

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد　　　وگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

"اچھا اب آپ شروع بھی کریں گے یا نہیں؟"

"ارے صاحب ذرا دم تو لینے دیجئے! اچھا تو گھوڑ دوڑ میں ہم اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں پاؤلو لیوٹو آیا اور ہمارے سامنے ایک خوبصورت نوجوان کو پیش کیا۔ یہ رابرٹ مانٹی فرینکو تھا۔ خیر رسمی صاحب سلامت اور طرفین سے بے معنی تکلف و تپاک کے بعد وہ لوگ عین ہماری پشت والی قطار میں بیٹھ گئے۔ ہمارے آپس میں دو چار ہی جملوں کا تبادلہ ہوا تھا کہ گھوڑ دوڑ کے شروع ہونے کا سگنل ہوا۔ تم جانتی ہو کہ گارگن (گھوڑی) میری منظور نظر تھی، مجھے مطلق خبر نہ تھی کہ میرے حق میں وہ کس قدر بے مروت ثابت ہونے والی ہے، خیر۔ آدمی کو حیوانوں کی محسن کشی پر بھی صبر کرنا پڑتا ہے۔ الغرض دوڑ شروع ہو گئی اور گھوڑے گرد و غبار کے بادل میں غرق ہو گئے۔"

بس یکبارگی چلائی کہ "گارگن جیت گئی"۔

فرینکو نے کہا: "نہیں، بلکہ لارڈ لیویلو (گھوڑا) جیتا!"

"میں اس کی تردید پر کبیدہ خاطر ہوئی مگر وہ مسکراتا رہا اور اسی جملہ کی تکرار کرتا رہا۔ آخر ہماری نوک جھونک اسی شرط پر ختم ہوئی کہ دیکھیں دونوں میں سے کون جیتتا ہے۔ کامل نصف گھنٹہ کی امید و بیم کے بعد مجھ کو معلوم ہوا کہ گارگن نے مجھے دھوکا دیا۔ میں ہاری اور مانٹی فرینکو جیتا۔ ذرا اس بات پر غور کرنا! اب میں اس سے کہہ رہی ہوں کہ میں ابھی شرط کا روپیہ ادا کرتی ہوں،

اور وہ سرنگوں ہوکر آداب بجالاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "کچھ مضائقہ نہیں، جلدی کیا ہے"۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اُس سے شیا جاپر ملتی ہوں اور ایک مستفسرانہ نگاہ اُس پر ڈالتی ہوں اور وہ بدستور سرخم کرتا ہے اور ایک معنی خیز تبسّم اس کے چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ بس بالکل تھیٹر کا سا معاملہ تھا! اب میں انتہائی اشتیاق تجسّس کی حالت میں ہوں ....

رابرٹو ایک جوانِ رعنا ہے، ۲۶ سال کی عُمر ہوگی؛ اور آج صبح کا یہ واقعہ ہے کہ مانٹی فرنیکو جو میرے آیندہ خسر بننے والے ہیں دو گھنٹہ تک امّی کے ساتھ مصروفِ گفتگو رہے!"

"اچھا!" صوفیہ کے مُنہ سے نکلا۔

"جی! اَب تو لوگوں کے چہروں پر توجّہ کی علامات نظر آتی ہیں! خیر! تو جن باتوں پر اُس مُلاقات میں بحث ہوئی ہے اُن کی مجھ کو پوری اِطّلاع ملی ہے: مختصراً یہ کہ شادی کے جملہ مراتب اَبسطے پاگئے ہیں، مگر ہاں ایک نہایت اہم جُزوی اَمر کا تعیّن ابھی باقی ہے۔ یعنی یہ کہ میئر کے دفتر "دارالنکاح" میں اَب مجھے کس دن جانا ہے، اور آیا میں اُس دن خاکستری گَون پہنوں گی یا قرمزی رنگ کا؟ اور ہاں اُس دن مجھ کو پھندنے دار ٹوپی پہننی چاہیئے یا بے پھندنے کی؟"

"تم تو ہَوا کے گھوڑے پر سوار ہو؟"

"ہَوا کا گھوڑا؟ بھلا یہ کیونکر؟ تمہیں کہو اَب کون سی رُکاوٹ باقی ہے؛ رابرٹو اور میں ایک دوسرے پر دیوانہ وار شیدا ہوجائیں گے؛ ہمارے والدین بھی اس رشتہ سے مطمئن ہیں۔"

"اور تم اِس طریقے سے ایک شخص سے شادی کرلوگی؟!" صوفیہ نے سوال کیا۔

"اِس طریقے کے کیا معنی ہیں؟ یہ تو بہت معنی خیز لفظ ہے!"

"یعنی یہی کہ بغیر اس کو جانے ہوئے اور بغیر اُس سے محبّت و اُلفت کے پینگ بڑھائے ہوئے!"

"مگر ایسا تو نہیں ہے، میں اس کو جانتی ہوں، میں نے اُس کو گھوڑ دوڑ میں دیکھا،

پھر باہر ٹہلتی ہوئی بھی اُس سے ملی ؛ باہمی شناسائی اِس حد تک بڑھ گئی ہے کہ مَیں اُس کی پرستش کرنے لگی ہوں ! پرسوں کا ذکر ہے کہ محض اس بات پر کہ میری اُس کی مُلاقات نہ ہوسکی میں نے دوپہر کا کھانا نہ کھایا اور صرف تین پیالی چاء پر دن گزار دیا ؛ اُس دن مَیں قریب تھا کہ خودکُشی کرلیتی !"

"اور وہ ! ؟" صوفیہ نے پوچھا

"وُہ ؟ وہ بھی یقیناً مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے ، پس معلوم ہوا کہ مجھ سے مُحبّت بھی کرتا ہے" لولو نے جواب دیا اس جواب میں ایک فاتحانہ لہجہ تھا ؛ مگر جب اُس نے دیکھا کہ اس بات پر صوفیہ کا چہرہ زرد پڑگیا ہے تو وہ اس ناعاقبت اندیشانہ انداز پر متاسّف ہوئی ، بہن کے سر پر جھک کر اُس نے پیار سے پوچھا :

"کیوں بہن ! کیا میرے مُنہ سے کوئی ناگوار بات نکلی ؟"

"نہیں پیاری نہیں ! تم ٹھیک کہتی ہو ؛ جب کوئی عشق کرتا ہے تو شادی بھی کرتا ہے ؛ لیکن جب مُحبّت نہ ہو تو مُحبّت پیدا تو نہیں کی جاسکتی !

عِشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ ؛ کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے !"

یہ کہنے کے بعد صوفیہ کے مُنہ سے ایک آہ نکلی !

"بہن ! یہ کیا کہا کہ "لگائے نہ لگے" ؟ مَیں تم سے کہتی ہوں کہ اس آگ کا بھڑکانا آسان ہے ، صوفیہ ! لیکن تمہاری طرح جب کسی کے ابروؤں سے متانت ٹپکتی ہو ، آنکھوں سے غم برستا ہو ، اور ہونٹوں پر کبھی تبسّم نہ پیدا ہوتا ہو ! جب تمہاری طرح کوئی لڑکی جا کر کونے میں بیٹھ جائے اور وہاں مصروفِ غور و فکر ہو جائے ، درآنحالیکہ دوسری لڑکیاں ناچتی کودتی اور ہنسی دل لگی کرتی پھر رہی ہوں ، جبکہ تمہاری طرح کوئی ہر وقت پڑھا ہی کرے اور عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بجائے فلسفیانہ اور شاعرانہ خواب ہی دیکھا کرے ! اور جبکہ تمہاری طرح کوئی لڑکی کم سِنی ہی میں بڑے بوڑھوں کا سا مُتفکّرانہ انداز اختیار کرلے ، تو اُس وقت تو بلا شبہہ یہ

مشکل ہے کہ کوئی اُس سے مُحبّت کرے !"

صوفیہ نے اپنا سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر آہستہ سے ایک ارتعاش پیدا ہوا اور ایسا معلوم ہوا کہ اُس کے لب پر آہ ہے۔ لیکن وہ ضبط کرنا چاہتی ہے! یہ حالت دیکھکر لولو نے پوچھا:

"بہن! کیا میں نے تمہارے جذبات کو پھر مجروح کر دیا؟ .... یقین مانو کہ میں نے یہ ساری باتیں اس لئے کہی ہیں کہ لوگ تم سے بھی مُحبت کرنے لگیں، اور میں تمکو شانِ محبوبی میں دیکھوں! تمہارے گرد و پیش مُحبّت و اُلفت کا حصار ہو اور میں تم کو ایک روز دُلہن بنا ہوا دیکھوں! ہاں! کیا خوب ہو کہ میری اور تمہاری شادی ایک ہی دن رچے!!"

"اس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں! سنا لولو! میں بڑھاپے تک کنواری رہنا چاہتی ہوں!"

"نہیں میری دوشیزہ! میں اس کو کب گوارا کر سکوں گی! تم کیسی خراب آدمی ہو! خدا نے تم کو کیا عجیب الخلقت بنایا ہے! اگر رابرٹو واقعی کوئی اچھا آدمی ہے تو اُس کا ضرور کوئی کنوارا بھائی بھی ہونا چاہیئے، کاش ایسا ہی ہو!"

گفتگو یہیں تک پہونچی تھی کہ اُن کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ہوا خوری کے لباس میں تھی۔

"کیا آپ پھرنے جا رہی ہیں، امی؟" لولو نے پوچھا۔

"ہاں پیاری میں اس وقت مُنیم کے یہاں جا رہی ہوں"

"اوہ! مُنیم کے یہاں! تو معلوم ہوا کوئی کاروبار کا معاملہ ہے۔

"بس لولو! تم کو جلد حقیقت معلوم ہو جائے گی! صوفیہ! تھوڑی دیر کے لئے تم میرے ساتھ چلو"

"ایں! کیا صوفیہ کو بھی کمبخت مُنیم کے ساتھ کوئی سابقہ پڑا کرتا ہے؟!"

"لولو! میں کہتی ہوں کہ تم کبھی سنجیدہ بھی ہوگی؟"

"بہت جلد امی! آپ خود دیکھ لیں گی"

لولو نے دروازہ کھولا تاکہ ماں اور بہن باہر نکل جائیں، اور پھر اُن کو دو دفعہ جھک کر سلام کیا۔ اور دبی زبان سے کہا: "میڈیم میڈیمائسل!"

جب دونوں کمرے سے روانہ ہوگئے تو لولو نے دروازے پر سے ان کو پکارا۔ اور ایک فرمائشی قہقہہ لگایا:

"ہاں ہاں! اپنی باتیں جاری رکھیئے، جاری رکھیئے! میں بھی جان بوجھکر انجان بن جاؤں گی"

(۲)
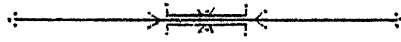
بحیثیت مجموعی رابرٹ مانٹی فرینکو کوئی صاحب فکر آدمی نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس کو اپنی فکر ونظر کو نشوونما دینے کا کوئی موقع ہی نہ ملا تھا۔ گھوڑوں کی سواری، ملاقاتیں اور دعوتیں ان ہی ہنگامہ آرائیوں میں اُس کے دن اُڑ جاتے تھے؛ اور اُس کی زندگی اب نہایت پُرلطف طریقے سے اُس کی حسین مہ جبین لولو کی آغوش اُلفت میں بسر ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بعض دردسری کے کام بھی رابرٹ کو انجام دینے پڑتے تھے: یعنی وکلاء کے ساتھ اوقات مقرّرہ پر طے شدہ قرارداد کے مطابق ملاقات کرنا۔ معاہدوں پر دستخط کرنا اور پرانے قرضوں کی حساب فہمی وغیرہ وغیرہ۔ اور آئندہ متاہل زندگی کی تیاریوں اور شادی کی کوشش میں جو مسلسل دورے اُس کو کرنے پڑتے تھے۔ اُن کا تو کچھ ذکر ہی نہیں بمشکل اُس کو آدھا گھنٹہ مطالعہ کے لئے ملتا ہوگا۔ یا کسی ہوٹل کے سامنے پندرہ منٹ چہلقدمی کے لئے! الغرض اس کو کبھی کسی نے اس حال میں نہ دیکھا کہ وہ غور وفکر میں محو ہو، نہ کبھی یہ سُنا کہ وہ کسی اجتماعی مسئلہ کے حل کرنے میں مصروفِ فکر پایا گیا ہو۔ رابرٹو کی زندگی کسی دردناک حادثہ سے آشنا نہ ہوئی تھی اور نہ اُس کی سیرت میں کوئی رستمانہ بات تھی بلکہ اس کے برعکس وہ ایک دنیادار اور کاروباری مزاج کا آدمی تھا اور اُس کے

بہت سے ساتھی اُس کی اس اُفتادِ مزاج پر رشک کرتے تھے۔

لیکن آج دوپہر کو خلافِ معمول اُس کو اس رنگ سے دیکھا گیا کہ وہ اپنی آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی ہوئی تھی اور اُس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور مُطالعہ کرنے کی حقیقی خواہش کے آثار اُس کے چہرہ پر نمایاں تھے! کتاب اگرچہ دلچسپ تھی، لیکن عجیب بات تھی کہ کتاب کا پڑھنے والا ایک بے خودی و محویت کے عالم میں تھا واقعہ یہ ہے کہ حقیقت کچھ اس سے بھی زیادہ تھی یعنی وہ کسقدر مُضطر و مُضطرب بھی تھا! اُس کو ورق گردانی کا کوئی موقع نہ ملتا تھا اس لئے کہ دو تین سطریں پڑھنے کے بعد اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مطبوعہ حروف اپنی جگہ سے محو ہو گئے ہیں، اِدھر اُدھر اڑتے پھرتے ہیں، آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، اور پھر نظر سے بالکل غائب ہو جاتے ہیں! آج غیر شعوری طور سے رابرٹو کا دل و دماغ فکر و تخیّل کی نئی اور غیر معلوم دُنیا کی سَیر کر رہا ہے!!

"والدہ اس نسبت سے مطمئن ہیں، میری سب بچیوں نے اپنی دُعائیں بھیجی ہیں، لیکن میری رشتہ کی بہنیں خفا ہیں! اُدھر ہوٹل کے حلقۂ احباب ہیں جو میرے دوست آشنا ہیں وہ ایک معنی خیز انداز میں مجھ کو مُبارکباد دے رہے ہیں! میرے قلبی دوست بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا کرتے ہیں۔ سوسائٹی میں یہ ساری باتیں پسندیدگی کے آثار ہیں اور فی الواقع شادی کی ایک "فضا" پیدا ہو گئی ہے .... اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ لولو بہت حسین ہے! جس وقت وہ اپنی شوخ و شنگ آنکھیں مجھ پر ڈالتی ہے، ہاں جب وہ مصروفِ تبسّم ناز ہوتی ہے اور اُس کے لب لعلین کی آڑ میں دُرِ دندان کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو بے اختیار میرے جی میں یہ بات آتی ہے کہ اُس کا پیارا سر اپنے ہاتھوں میں لے لوں، اور بار بار اُس کو چُومُوں! اُس کی سیرت بھی بہت خوب ہے؛ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ زرّین مزاج رکھتی ہے، ہمیشہ خوش و خرّم اور ہشاش بشاش رہتی ہے، بہت نیک نہاد ہے، ہنسی دلگی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتی ہے۔ بہت ذہین اور حاضر جواب ہے"!

خوش فعلیوں اور شگفتہ طبعیوں سے لبریز ہے، اور کبھی مغموم وملول نہیں ہوتی، غرض یہ کہ ہماری اُس کی خوب نبھے گی۔ میں پُر متانت انداز کو پسند نہیں کرتا۔ مجھے تو اُس کے دیکھنے تک کی برداشت نہیں۔ بالخصوص اُن لوگوں میں جن سے میں محبت کرنا چاہتا ہوں مجھکو ہمیشہ ایسا محسوس ہوا ہے کہ آدمی کے چہرے کے ایسے آثار کے پیچھے اندرونی رنج وغم ہوتا ہے جس سے میرا دل مطلقاً ناآشنا ہے، اور جس کا میرے پاس کوئی درماں نہیں۔ بلکہ مجھکو یوں کہنا چاہیئے کہ ایسے غم والم کا میں غیر ارادی طور سے خود باعث بنجاتا ہوں! صوفیہ جو میری سالی بننے والی ہے اُس کی طبیعت کا بھی رنگ ہے۔ مجھے سرد مہر اور جذبات سے خالی چہرے سے چڑھ ہے۔ جب کبھی وہ میرے سامنے آجاتی ہے میرے ہوش وحواس گُم ہو جاتے ہیں۔ میرے ہونٹوں سے ہنسی کافور ہو جاتی ہے؛ اُس وقت اگر موسم بہار کا شاندار آفتاب بھی ضیا پاشی کر رہا ہو تب بھی میرے لئے یہ سارا حسین منظر ماہ نومبر کا ایک سرد وخشک اور بے رونق اور بے کیف دن بن جاتا ہے! اس وقت مجھے تو آد سے بھی خوش طبعی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی! الغرض صوفیہ سارے جوش ومسرت کی قاتل ہے! .... ممکن ہے

اُس نے وہ ناگوار اثر محسوس کیا ہو جو وہ مجھپر ڈالتی ہے کیونکہ جس وقت وہ مجھسے بات کرتی ہے تو آنکھیں چار نہیں کرتی۔ مجھ سے ہاتھ بھی نہیں ملاتی، اور اگر اُس کو مجھے کسی بات کا جواب ہی دینا ہوتا ہے تو وہ مختصر ترین الفاظ اختیار کرتی ہے۔ شاید وہ میری ناپسندیدگی کو جان گئی ہے، ممکن ہے میری روش سے شاکی بھی ہو!

"مگر لو کو دیکھو کہ ہمیشہ ہنستی رہتی ہے؛ وہ کتنی شوخ ہے! وہ کبھی مجھ سے متانت کا ایک کلمہ بھی نہیں کہتی، اور کبھی اس کو اس قسم کا لفظ مُنہ سے نکالنا بھی پڑتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بن رہی ہے، اُسے یہ زبان ہی نہیں آتی۔"

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، مگر وہ محبت نہیں جو دیوانگی کی حد تک پہونچی ہوئی ہو، سچ تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں میرے جذبات بھی مجنونانہ نہیں ہیں۔ اور یہ بات بہت اچھی ہے!

اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں کہوں گا کہ دو نظریوں پر میرا عقیدہ بالکل راسخ ہے: ایک یہ کہ جو مرد اور عورت آپس میں ہم رشتہ ہونا چاہتے ہیں اُن کو ہم رشتہ ہونا چاہیئے؛ دوسرے یہ کہ اُن کو اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز تیز و تند جذباتِ عشق سے نہ کرنا چاہیئے۔ یہی ہم دونوں کا معاملہ ہے! میں اور لولو آپس میں بہت ہی خوشی و خرّمی کی زندگی بسر کریں گے؛ ہم اٹلی کا ایک چکر لگائیں گے لیکن عجلت کے ساتھ نہیں۔ چھوٹی چھوٹی منزلیں کریں گے اور ہر قسم کی لطف و آسایش سے لذّت لیں گے، جہاں چاہیں گے قیام کر دیں گے، اور بہت ہی حقیر اور غیر اہم چیزوں کو بھی بے دیکھے نہ چھوڑیں گے۔ اس طرح ہم اپنی سیر و سیاحت میں تین مہینے صرف کر دیں گے؛ مگر نہیں، یہ کافی نہ ہوگا! یوں کہنا چاہیئے کہ چار مہینے! مجھ کو اس بات سے خوشی ہوگی کہ میں لولو کو صوفیہ کی ماتمی صحبت سے تھوڑے دنوں کے لئے ہٹا لیجاؤں گا! لیکن میں کہتا ہوں کہ کیا یہ کوئی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ لڑکی (صوفیہ) اس سن و سال میں اس قدر متین ہو! اُسکی عمر ۲۳ سال سے زیادہ نہ ہوگی، اور اس کا چہرہ حُسن کے نقش و نگار سے خالی نہیں ہے! واقعہ یہ ہے کہ اس کی آنکھیں بہت حسین ہیں اور سارا انداز تو ایسا ہے جیسا کہ ایک بادشاہ بیگم کا ہوتا ہے! اگر وہ اس درجہ خشک و پُروقار نہ ہوتی تو اُس میں دلفریبی اور باصرہ نوازی کے بہت سے سامان موجود تھے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اگر اس کا یہی رنگ رہا تو وہ بڑھاپے تک ناکتخدا ہی رہیگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کو کوئی اندرونی روحانی جانکاہ غم ہے؛ ممکن ہے اس پردے کے پیچھے کوئی داستانِ عشق چھپی ہوئی ہو یعنی کسی "عشق ناکام" کا معاملہ! مجھ کو کتنا اشتیاق ہو کہ مجھے اُس کی اس غیر معمولی خاموشی اور بے خودی کا راز معلوم ہوتا! میں اور لولو ابکی مرتبہ جب اکیلے ہوں تو میں اس معمے کی بابت اس کا خیال معلوم کروں گا۔

ہاں میری لولو پھولوں کی بھی عاشق ہے، اپنے اس مذاق گلچینی سے اس نے مجھ کو اُسی شام کو مطلع کیا تھا جب مجھے اُس کے گھر جانے کا دوسرا موقع تھا۔ اپنے نازک ہاتھوں سے وہ کس انداز سے پھولوں کو توڑتی ہے! اور یہ پھول اُس کے ہونٹوں کے قریب جاکر ہمرنگی کی

وجہ سے کیسی غیر معلوم اور ناقابلِ شناخت ہو جاتے ہیں ! اور ہاں تھوڑی دیر کی "خانہ براندازیٔ چمن" کے بعد وہ کیسا پیچ و تاب کھاتی ہے کہ اور پھول اور کلیاں اب توڑنے کو نہیں رہیں !

سچ مچ بڑی پیاری ہے، بڑی ہی پیاری ہے ! ایک دن اُس نے چپکے سے میرے کان میں کہا، کہ "جب بادل گرجتا ہے تو میرا جی لرز جاتا ہے اور میں دوڑ کر اپنا سر تکیوں میں چھپا لیتی ہوں"۔ اپنے مذاق لباس کے متعلق ذکر کرتے ہوئے اُس نے یہ بات بیان کی کہ "میں مدتوں سے ایک سیاہ مخمل کے گون کا خواب دیکھ رہی ہوں کہ جس کے گلے اور آستینوں پر سفید جھالر لگی ہو، پوشاک کے معاملہ میں میرا یہ محبوب تخیّل ہے"۔

اُس نے مجھکو جتا دیا ہے کہ "میں رشک رقابت کا ایک قاتلانہ جذبہ رکھتی ہوں، ایسا جسکے لئے اہلِ اسپین ضرب المثل ہیں اور اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لئے میری خواہش یہ ہوتی ہے کہ میں ایک چھوٹا سا زرکار دستہ کا خنجر خریدوں !"

جس وقت ان الّھڑپنے کے طفلانہ خیالات پر وہ سرگرم گفتگو ہوتی ہے تو اُس وقت پرستش کے قابل ہوتی ہے ! اور تو اور صوفیہ بھی بعض اوقات اُس کی باتیں سُنکر مسکرانے پر مجبور ہو جاتی ہے، اور پھر اُس وقت اس لڑکی کا چہرہ کتنا دلفریب ہو جاتا ہے ! لیکن صوفیہ ! ارے یہ صوفیہ ! اس کے قلب کی گہرائیوں کو کوئی کب پا سکے گا ؟ !"

یہاں پہونچکر اُس کے گھٹنوں پر رکھی ہوئی کتاب فرش پر گر پڑتی ہے، اور یہ نوجوان اس آواز سے چونک پڑتا ہے اور حیرت زدہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ خود اپنے کو پہچاننے سے قاصر ہے !

مگر یہ وہی ہمارا دوست رابرٹ مانٹی فرینکو ہے جو حسین تخیلات کے پرستان میں اس وقت مصروف خواب ہو گیا ہے !

---

(۴)

جھٹپٹا یوں چھایا ہوا تھا جیسے آسمان سے بھوری راکھ برس رہی ہو صوفیہ کھڑکی میں

بیٹھی ہوئی سڑک کے ہجوم اور شور و غوغا کو دیکھ اور سن رہی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب شہر کا چوک لوگوں کی چہل پہل سے بہت بارونق ہو جاتا ہے اور مجمع کے تصادم سے یہ جگہ کافی خطرناک بھی ہو جاتی ہے۔ پیدل راہ گیروں اور گاڑیوں کی کثرت سے بازار میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ الغرض ایک مسلسل زندہ سیلاب تھا جو اس راہ سے رواں تھا۔ صوفیہ کی آنکھیں کسی خاص شخص کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ یکبارگی اس کے چہرے پر ایک سرخ رنگ آ گیا۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر جھکایا، اس کے رخسارے زرد پڑ گئے اور پیچھے ہٹ کر وہ کمرے میں چلی آئی۔ ایک منٹ کے بعد لوتو آندھی پانی کی طرح آدھمکی، دروازوں کو دھڑ سے کھولا۔ کرسیوں اور میزوں کو ادھر ادھر پھینکا اور چشم زدن میں صوفیہ کے پاس کھڑی تھی۔

"کیا کر رہی ہو تم یہاں، ڈانا صوفیہ سینٹ انجیلو؟ غالباً پڑھ رہی ہو گی؟"

"جی ہاں پڑھ رہی تھی۔"

"لیکن تم نے اس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر اس وقت سڑک کے منظر کا لطف اٹھاتیں؟!"

"اور اگر یہ مقصد عالیہ میں حاصل بھی کر لیتی تو کیا ہو جاتا؟"

"ہیہات! ہیہات! ابھی میں تو اس وقت بالاخانہ پر البینا ورزی کی منتظر تھی، چنانچہ آج شام کو زیب تن کرنے کے لئے وہ میرا گون تیار کر کے لایا تھا جس کے دیکھنے میں میں مشغول تھی۔ اور اسی کام میں میں اتنی دیر وہاں رکی رہی۔ انتظار و بےصبری سے میرا برا حال ہو رہا تھا کیونکہ میں جلد سے جلد یہاں حاضر ہونا چاہتی تھی۔ کل شام کو میں نے رابرٹو سے کہا تھا کہ اپنا خاکستری اوور کوٹ پہنکر آئے، گاڑی میں بہت نفیس سامان اور گھوڑے پر اعلے درجہ کا ساز ہو، اور ٹھیک ساڑھے چھ بجے سیر کو نکلنے کا انتظام کیا جائے۔ لوگ کیا جانیں کہ وہ میری فرمائش کی حرف بحرف تعمیل کریگا!"

"رابرٹو تو اسی ساز و سامان کے ساتھ ابھی اپنی گاڑی میں یہاں سے گذرا تھا اور وہ اسی رنگ کا اوور کوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔"

"خدا کی قسم ؟!" لولو چلّا اُٹھی، "کیا یہ واقعہ ہے ؟ نہیں بھلا کس طرح معلوم ہوا ؟ میں سمجھتی تھی کہ تم پڑھنے میں مشغول ہو گی !"

"میں کھڑکی میں بیٹھی ہوئی تھی"

"اور تم نے رابرٹو کو پہچان لیا ؟ مگر تم تو کبھی اُس کی طرف دیکھتی بھی نہیں ! کیسی عجیب بات ہے ! ہاں بتاؤ تو کیا اُس نے تم کو سلام کیا تھا ؟"

"ہاں !"

"ہاں بہن بتانا تو اُس نے اپنی ٹوپی کس طرح اُتاری تھی ؟"

"ٹوپی کس طرح اُتاری تھی ؟! ....جس طرح ہمیشہ اُتارتا ہے ؟!"

"اچھّا تم نے بھی اُس کے سلام کا جواب دیا تھا ؟"

"جواب ؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں آدابِ تہذیب سے اس قدر عاری ہوں کہ کسی کے سلام کا جواب نہ دوں ؟!"

"اچھّا یہ بتاؤ کہ تم اُس کو دیکھ کر کچھ مُسکرائی بھی تھیں ؟"

"ہرگز نہیں !—— مگر میں وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتی، ممکن ہے کوئی اضطراری حرکت اس قسم کی ہو گئی ہو۔"

"تم اچھّی آدمی نہیں ہو، صوفیہ ! بیچارا رابرٹو تو کل مجھ سے تمہارا بہت ذکر کرتا رہا۔"

"یہی ذکر کہ صوفیہ کوئی اچھّی آدمی نہیں ہے ؟"

"جی نہیں، تمہاری خاموشی اور کم سخنی کی بابت پوچھتا تھا، وہ کہتا تھا کہ تم دونوں بہنوں کی طبیعت میں یہ بُعد المشرقین کیوں ہے ؟ لیکن میں نے تمہاری نسبت ایک پورا نثریہ قصیدہ کہہ کر سُنا دیا : میں نے اُس سے کہا کہ صوفیہ مجھ سے بدرجہا زیادہ اچھی لڑکی ہے۔ مجھ سے زیادہ محبّت و اُلفت کے جذبات سے لبریز ہے۔ مجھ سے زیادہ شانِ محبوبی رکھتی ہے اور اس میں اگر کوئی عیب ہے تو یہی کہ وہ اپنے ان تمام صفاتِ پسندیدہ کو چھپانا چاہتی ہے۔ صوفیہ

سچ کہتی ہوں۔ اُس نے انتہائی دلچسپی سے میری زبان سے تمہاری فطرت کی تفسیر سُنی! ہاں آخر میں پھر اُس نے یہ پوچھا کہ صوفیہ آخر مجھ سے کیوں اس قدر دور دور رہتی ہے؟"

"دور دور؟"

"کم از کم اُس کے الفاظ یہی تھے اور تم خود ہی انصاف کرو کہ اُس نے کچھ غلط کہا؟ ماشاء اللہ آپ اس سے کتنا خُلوص اور مُحبّت کا برتاؤ کرتی ہیں۔ لیکن میں نے تو اس معاملہ میں بھی تمہاری وکالت کی۔ سچ پوچھو تو میں نے دنیا سازی اور ظاہر داری سے کام لیا، اس لئے کہ میں نے اُس سے کہا کہ صوفیہ تو تم کو بہت پسند کرتی ہے۔ اور تمہاری در پردہ بہت ہی قدر شناس ہے!"

"لو لو! تم بھی ایک ہی آفت کا پرکالہ ہو!"

"میں جانتی ہوں کہ یہ بات صحیح نہ تھی، لیکن میں تم سے پھر کہتی ہوں کہ رابرٹو تمہارا اتنا قدرداں اور ثنا خواں ہے کہ تمہارا اُس کے ساتھ یہ مغائرت کا سلوک بڑی بے دردی اور احسان ناشناسی ہے!"

صوفیہ نے اپنی باہیں چھوٹی بہن کے گلے میں ڈال دیں اور اُس کے رُخساروں کو بوسہ دیا! لولو بھی لپٹ گئی، اور بڑے پیار اور چاؤ کے لہجہ میں کہا کہ "بہن بتاؤ تو" بیچارے رابرٹو کی جگہ تمہارے دل میں کیوں نہیں ہے؟"

یہ سُننا تھا کہ صوفیہ یکبارگی بہن کو چھوڑ کر پیچھے ہٹی، اور بُت بن کر رہ گئی!

"اچھا" لولو نے فوراً کہا، میں اب سمجھی، تم آج شام کی ہوا خوری میں ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتی ہو۔"

"نہیں، میں نے کچھ قسم تو کھائی نہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ میرے سر میں درد ہے! تم امّی کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں؟"

"میں تو روز ہی جاتی ہوں اور آج بھی جاؤں گی۔ میں اس تفریح کا لُطف کیسے

چھوڑ سکتی ہوں ؟"

"کیا رابرٹو بھی تمہارے ساتھ جا رہا ہے ؟"

"نہیں وہ آج کلب جا رہا ہے، جہاں اس وقت ڈائرکٹروں کا ایک مشورے کا جلسہ ہونے والا ہے۔ میں اس فرصت کو غنیمت جان کر اس سے فائدہ اُٹھانا چاہتی ہوں۔ بعد میں بال میں جاؤں گی جہاں کل صبح تک مصروفِ رقص رہوں گی !"

"اور اگر کہیں اُس کو یہ معلوم ہو جائے ؟"

"اور بھی اچھا ہے ! اُس کو ابھی سے معلوم ہو جائیگا کہ میں اس معاملہ میں بالکل آزاد بے قید رہنا چاہتی ہوں، یہ کہ اگر وہ مجھپر کسی قسم کی بندشیں عائد کرنے کا خیال رکھتا ہو تو چھوڑ دے میں اس کو کبھی گوارا نہ کروں گی کہ اُس کی عادت بگاڑ دوں !"

"مجھکو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کو اُس سے بس برائے نام ہی محبت ہے" صوفیہ نے کہا

"نہیں، محبت تو بہت سخت ہے، لیکن یہ محبت میں اپنے ہی نقطۂ نظر سے کرنی چاہتی ہوں۔ ہاں بہن اب مجھ کو جا کر جلدی جلدی کپڑے بدلنا ہے۔ اس میں بھی تو مجھکو کم سے کم دو گھنٹے لگیں گے۔"

صوفیہ کھڑی روانہ ہونے والی گاڑی کو دیکھ رہی ہے جس میں اُس کی ماں اور بہن سیر کو جا رہی ہیں۔ وہ اب اکیلی رہ گئی، بالکل یک و تنہا۔ اور اُس کی خواہش بھی یہی تھی! بچپن کے زمانہ میں جب کبھی کوئی اُس کو ستایا کرتا تھا تو اس وقت بھی اُس کا یہی معمول تھا کہ تنہائی میں جا کر رویا کرتی تھی ! یہ پرانی عادت اس میں آج بھی باقی تھی۔ اب وسیع ڈرائنگ روم (نشستگاہ) میں اُس کے سوا کوئی نہ تھا۔ کمرہ روشنی سے بقعۂ نور ہو رہا تھا۔ صوفیہ کے ہاتھ بے حس و حرکت تھے۔ اور اُس کا سر آرام کرسی کی پُشت سے لگا ہوا تھا۔ اُس کے چہرہ پر دلدوز غم کا نقاب تھا جس میں ایک نہایت سخت اندرونی کشمکش کی جھلک نظر آ رہی تھی ! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بیکسی اور تنہائی کے عالم میں اس دردناک غم کے احساس نے اور بھی شدت اختیار کر لی ہے۔

امرِ واقعی کا ادراک جسے وہ عرصہ سے دبا رہی تھی۔ اس وقت ایک واضح اور خوفناک حقیقت بنکر آنکھوں کے سامنے تھا!

اتنے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ ہوئی اور صوفیہ چونک پڑی۔ کیا دیکھتی ہے کہ رابرٹو ہے! نووارد نے جب اس لڑکی کو کمرے میں اکیلا دیکھا تو وہ رُکا اور ٹھٹکا، لیکن بعد میں یہ خیال کرکے کہ گھر کے باقی لوگ دوسرے حصہ مکان میں ہوں گے وہ پھر آگے بڑھا۔ صوفیہ مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی!

"شام بخیر صوفیہ!"

"شام بخیر ——"

دونوں ایک کشمکش میں مبتلا تھے!

"خدایا! یہ لڑکی کس قدر ملول اور افسردہ رہا کرتی ہے!" رابرٹو نے اپنے دل میں کہا۔

اس اثنا میں صوفیہ نے اپنے ہوش و حواس درست کر لئے تھے اور اس کے چشم و ابرو ایک مرتبہ پھر متانت و وقار کی تصویر تھے! آخر کار دونوں بیٹھ گئے، لیکن ایک دوسرے سے کسی قدر فاصلہ پہ!

"آپ کی والدہ اچھی ہیں؟"

"جی ہاں، اچھی ہیں، شکریہ!"

"اور لولو؟"

"وہ بھی بالکل اچھی ہے"

اب پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ رابرٹو نے ایک عجیب جذبۂ مسرت محسوس کیا جس میں تلخی کی بھی آمیزش تھی!

"تو لولو کسی کام میں ہے؟" اس نے پوچھا۔

صوفیہ کے دل میں ایک خفیف اضطراب پیدا ہوا جس کو اس نے دبا دیا۔

"وہ امّی کے ساتھ بال میں گئی ہوئی ہے" صوفیہ نے جواب دیا، ساتھ ہی اُس نے یہ محسوس کیا کہ رابرٹو اس پر مزید سوالات کرے گا۔

چونکہ اس وقت صوفیہ اتفاق سے بالکل تنہا تھی۔ اس لئے رابرٹو نے خیال کیا کہ یہ بڑی بے مروّتی ہوگی اگر وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر اُس کے ساتھ باتیں نہ کرے۔ یہ خیال آتا تھا کہ رابرٹو کے دل میں ایک ناقابل مزاحمت جذبہ پیدا ہوا کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جائے۔ تاہم اُس نے اپنی نشست سے حرکت نہ کی۔

"میں اس وقت ادھر یوں نکل آیا کہ ہمارے کلب میں آج دوستوں کی کافی جمعیّت نہ تھی اور حاضرین کی مطلوبہ تعداد فراہم نہ ہوئی" رابرٹو نے یہ بات اس انداز میں کہی کہ گویا وہ اپنی اس وقت کی مداخلت بے جا کے لئے معذرت پیش کر رہا ہے!

"لیکن لولو آپ کی تشریف آوری کی متوقع نہ تھی، مجھے اس بات کا افسوس ہے" صوفیہ نے کہا
رابرٹو نے فوراً قطع کلام کر کے کہا کہ "خیر کوئی بات نہیں ہے!"

مگر رابرٹو کے مُنہ سے یہ جملہ بہت بے پروائی سے نکلا جس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اُسے لولو کی غیر حاضری سے کوئی خاص مایوسی ہوئی۔

"اور آپ تشریف نہ لے گئیں؟" اس نے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں میں تو نہیں گئی، آپ جانتے ہیں کہ میں "بال" کی ایسی دلدادہ نہیں ہوں"

"آپ کا خاص شوق تو شاید مطالعہ ہے؟"

"جی ہاں یہ مجھے بہت مرغوب ہے"

"لیکن اس مُسلسل کتب بینی سے آپ کی صحّت کو تو نقصان نہ پہونچے گا؟" رابرٹو نے کہا۔

"جی نہیں میری آنکھیں کافی قوی ہیں!" یہ کہتے ہوئے صوفیہ نے ذرا تیز نظروں سے اُسے دیکھا۔

"کافی قوی ہیں، اور کافی حسین!" رابرٹو نے اپنے دل میں کہا۔ "مگر آہ ان میں کوئی جوش اور جذبہ نہیں" (صوفیہ سے) میرا مطلب یہ ہے کہ ——

"اخلاقی نقصان، شاید؟" صوفیہ نے اُس کی بات کاٹ کر کہا "مگر میں ایسا خیال نہیں کرتی، جس قسم کی کتابیں میرے مطالعہ میں رہتی ہیں اُن سے مجھ کو بہت سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔"

"تو کیا تم سکون قلب کی محتاج ہو؟!"

"ہم سب ہی اس آب حیات کے پیاسے ہیں!"

صوفیہ کی آواز عارفانہ متانت کے لہجے میں ڈوب گئی؛ رابرٹو کو اس میں بڑا لطف آیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس مزے سے وہ پہلی بار لذت اندوز ہو رہا ہے۔ آج وہ اُس پُراسرار عورت کی آنکھوں سے دوچار ہے جو ابھی تک اُس کے لئے مکتوب سربستہ کا حکم رکھتی تھی اور جو اس وقت اپنے ہر لفظ سے اور ہر ادا سے اپنی مخفی ہستی کے اوپر سے نقاب اُٹھا رہی تھی صوفیہ کا تکلّف اور سرد مہری اس وقت رخصت ہو چکی تھی؛ وہ اس وقت ایسی از خود رفتہ تھی کہ اس کا وقار و تمکنت تھوڑی دیر کے لئے مُعطّل ہو گیا تھا، چنانچہ گرمیٔ کلام اور ذوق گفتگو میں وہ بار بار رابرٹو کو نظر بھر بھر کے دیکھتی بھی تھی، کبھی کبھی مُسکرا بھی دیتی تھی، اور اُس سے بالکل ایک دوستانہ انداز میں سرگرم گفتگو تھی! اس سے پہلے اُن کے باہمی تعلقات کس قسم کے تھے! اور اس وقت کیا رنگ نظر آرہا تھا!!

"لیکن جب میں کوئی کتاب پڑھا کرتا ہوں" رابرٹو نے کہا، "تو مجھ کو اس بات کی بیحد جستجو رہتی ہے کہ خود مصنف کی ہستی اور حقیقت کو معلوم کروں اور یہ پتہ لگاؤں کہ اس کی سیرت و سرشت کیسی ہے، آیا وہ بھی دُنیا کے علائق سود و زیاں میں حصّہ دار رہا ہے، آیا اُس نے بھی عشق و عاشقی کی ہے، اور آیا وہ بھی ہجر و وصال کی لذّت سے آشنا ہوا ہے ——————"

"میرا خیال ہے کہ آپ کا یہ اصول تنقید غلط فہمی پر مبنی ہے؛ کتابیں لکھنے والے "جگ بیتی" سُناتے ہیں۔ "آپ بیتی" نہیں کہتے!"

"اور یہ غالباً خودداری اور وقار کی بنا پر؟" رابرٹو نے رائے دی۔

"نہیں بلکہ رشک و رقابت سے" صوفیہ نے تصحیح کی، "جہاں تک میرا خیال ہے یہی بات ہے؛ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کا رازِ عشق نہانخانۂ دل سے نکلکر گوشِ اغیار تک پہونچے۔"

صوفیہ نے جس وقت یہ لفظ کہے اُس کی آواز میں کوئی تغیّر پیدا نہ ہوا، اُس کے چہرے پر صافگوئی کے آثار ہویدا تھے، اُس کا لہجہ بالکل معصومانہ اور مخلصانہ تھا۔ رابرٹو کو اس "حدیثِ دیگران" میں "سرِّ دلبران" کی جھلک نظر آتی تھی! رابرٹو کے لئے اب کوئی بات تعجّب خیز نہ تھی، اور ہر چیز قدرتی اور توقع کے مطابق نظر آتی تھی؛ حتیٰ کہ اُس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس پُر اَسرار روح رکھنے والی لڑکی صوفیہ کے ساتھ اُس کی یہ شام کی صحبت بھی گویا ایک نوشتۂ تقدیر اور اَمرِ الٰہی تھا! جس وقت وہ جُدا ہوئے ہیں تو دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا گویا کہ وہ اس طرح سے مزید اطمینان کرنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے ایک دوسرے کی روح کا بھید معلوم کر لیا ہے۔ رخصتی کے وقت صوفیہ نے مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ رابرٹو نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے جُھک کر بوسہ دیا! اب اس گرمجوشانہ مُلاقات کا آخری لمحہ آ گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو خُدا حافظ کہا۔"

جب صوفیہ کی موجودگی اور گفتگو کی طِلسمی فضا ختم ہو گئی تو رابرٹو کا دل و دماغ ایک شدید کشمکش میں مُبتلا ہو گیا۔ بہ یک وقت خوش و خرّم بھی تھا، اور ملول و غمگین بھی! وہ مرجانے پر آمادہ تھا، لیکن ساتھ ہی ایک مژدۂ حیات بھی اُس کے کانوں میں پہونچ رہا تھا! اُس کا دماغ بالکل کام نہ کرتا تھا کہ لولو کے متعلق کیا رائے قایم کرے، اپنی حالت کو کیا سمجھے اور اپنے مستقبل کے بارے میں کس نتیجے پر پہونچے۔

صوفیہ بہت خوش ہے، بہت ہی خوش ہے! چنانچہ اسی غیر معمولی جذبۂ خوشی سے مغلوب ہو کر وہ زار و قطار رونے لگی اور اسی عالم میں اُس کا سر پھر اپنے بستر کے تکیوں میں چھپ گیا تھا!

(۴)

تین مہینے گذر گئے ہیں اور لوتو کی شادی برابر ملتوی ہوتی رہی ہے۔ لوتو کی ماں جو اس التوا و تاخیر کا راز سمجھنے سے قاصر تھی بار بار لوتو کو تخلیہ میں لیجاتی اور اس گومگو کا سبب پوچھتی لیکن لوتو ہمیشہ یہی جواب دیتی کہ :

"میں ابھی انتظار کرنا چاہتی ہوں ؛ مجھ کو رابرٹو کے دل و دماغ سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے !"

واقعہ یہ ہے کہ اس لڑکی میں بھی غور و فکر کے آثار پیدا ہو گئے تھے ! اُس کی زندگی میں بظاہر کوئی تغیّر نہیں ہوا تھا' وہ پہلے کی طرح گایا کرتی تھی، ہنستی تھی، مذاق کرتی تھی لیکن وقتاً فوقتاً وہ اپنے ان زندہ دلانہ مشاغل کو ترک کر دیتی تھی اور اس اثنا میں اپنی بہن کی فطرت کا مطالعہ کرتی ! یا رابرٹو کے ایک ایک لفظ کو غور سے سنتی ! لوگ اُسے اکثر اس حال میں دیکھتے کہ اُس کے ہونٹ بھچے ہوئے ہیں، اور بھویں کھنچکر آپس میں مل گئی ہیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ اہم مسائل پر غور کر رہی ہے۔

پھر لوتو ہونے والے واقعات کو دیکھتی، اُس کے گرد و پیش عجیب و غریب واردات پیش آرہی تھیں ! رابرٹو میں اب وہ مادیّت اور ہشاشی اور بشاشی باقی نہیں رہی ہے، بلکہ وہ متفکر، مغموم، زرد اور مضطرب الحال سا نظر آتا ہے ! وہ بہت کم سخن ہو گیا ہے اور جب کچھ مختصر سی گفتگو کرتا بھی ہے تو اُس سے ایک بے خودی اور خود فراموشی ٹپکتی ہے ! جن چیزوں سے اُس کو پہلے غیر معمولی دلچسپی تھی اب اُن سے وہ کسی ذوق و التفات کا اظہار نہیں کرتا ! کبھی کبھی بہت سخت جد و جہد کے بعد وہ اپنی اس غیر حالت پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے، اور وہی پچھلا رابرٹو بن جاتا ہے۔ لیکن یہ قلب ماہیت محض آنی ہوتی ہے اور چند لمحوں سے زیادہ باقی نہیں رہتی ! وہ کبھی "بننے" کا عادی نہ تھا۔ اور اس قسم کی کوششوں میں ہمیشہ یہی طرح ناکامیاب ہوا کرتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اُس کے قلبی اضطراب

اور اُس کی روحانی کوفت کی غمازی، اُس کی آنکھیں کیا کرتی تھیں!

ہاں ان دنوں صوفیہ بھی کچھ بدلی بدلی سی نظر آتی تھی! یعنی ایک مضطرب صوفیہ، جو کبھی جوش محبت میں اپنی بہن کو سینہ سے لگاتی اور کبھی کئی کئی گھنٹے اس حالت میں گذار دیتی کہ اس کو نہ دیکھتی، اور نہ دیکھنا کیا معنی اس سے گریزاں سی نظر آتی! اس کے چہرے پر شرم و حیا کی اضطراری کیفیت سرخی بن کر جھلکتی اور معاً غائب ہو جاتی۔ اُس کی آنکھیں شعلہ افشانی کرتیں اس کی آواز کبھی گہری اور جوشیلی ہوتی، اور کبھی خشک و خشن! عالم جذب و جوش میں اُس کے ہاتھ کانپنے لگتے۔ اُس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی؛ لولو آدھی رات کے وقت اُٹھتی، اور برہنہ پا صوفیہ کی خوابگاہ کے دروازہ پر کان لگا کر سنتی اور بہن کو بے چینی سے کروٹیں بدلتے اور روتے پاتی۔ لولو پوچھتی: "بہن کیسی طبیعت ہے؟" مگر ہمیشہ ایک ہی جواب تھا کہ "کچھ نہیں لولو!"

جب رابرٹو اور صوفیہ آپس میں ملتے اور اُن کی یہ ملاقات بلا ناغہ روزانہ ہوتی، تو جو انقلاب دونوں کی دنیائے دل میں پیدا ہو گیا تھا وہ اُس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتا! گفتگو برائے نام ہی ہوتی؛ جوابات یا تو اضطراری انداز میں دئے جاتے یا وہ بالکل مبہم اور بے معنی سے ہوتے! عجب انوکھے طریقے سے وہ ایک دوسرے پر نظریں ڈالتے، کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ ملاقات کی پوری پوری شامیں سکوت مطلق میں گذر جاتیں، اور کوئی ایک کلمہ بھی دونوں کی مہر خاموشی کو نہ توڑتا! لیکن ساتھ ہی دونوں ایک دوسرے کی حرکات و سکنات کے مطالعہ میں غرق پائے جاتے! وہ کبھی پہلو بہ پہلو نہ بیٹھتے، لیکن بعض دفعہ دیکھنے میں آتا کہ جس کتاب کو صوفیہ کی انگلیوں نے مس کر دیا ہوتا اسکو رابرٹو کسی نہ کسی حیلہ سے ہاتھ میں اُٹھا لیا کرتا! بعض اوقات جب صوفیہ کمرے میں نہ آتی تو رابرٹو لحظہ بہ لحظہ مضطرب ہوتا جاتا اور بند دروازوں کی طرف رخ کر کے فرضی سوالات کا ایک خود فراموشی کے لہجہ میں جواب دیا کرتا! کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ صوفیہ کو آئے ہوئے ابھی پانچ ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ رابرٹو اپنی

ہیٹ سنبھالتا اور چل دیتا! لڑکی روز بروز زرد پڑتی جاتی تھی، اور اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے! آخر کار اس نے ارادہ کر لیا کہ کسی کو منہ نہ دکھائے گی۔ چنانچہ ہر ہفتہ کسی نہ کسی دن شام کے وقت وہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتی جہاں وہ بے صبر و بے تاب لرزاں و مرتعش نظر آتی، اور اپنی سوزشِ قلب سے سُلگا کرتی!

ایک دن شام کو لولو کمرے میں داخل ہوئی، اور اس نے صوفیہ کو مخاطب کر کے کہا:

"کیا اس وقت میرے لئے ایک کام کرو گی؟"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"مجھ کو اس وقت ایک خط لکھنا ہے، مگر رابرٹو باہر کھڑا انتظار کر رہا ہے: تم اتنا کرتیں کہ ذرا وہاں چلی جاتیں اور اس کے پاس بیٹھتیں، کیوں جاؤ گی؟"

"لیکن میں ———"

"بہن کیا اس کمرے میں پڑی پڑی اپنے کو ہلاک کر لو گی؟! کیا میری اتنی سی بات مان لینے میں تم کو کوئی بڑی سی قربانی کرنی پڑے گی!"

"اچھا پھر تم جلدی چلی آؤ گی؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"مجھے تو بس چند سطریں لکھنے کے لئے چند منٹ چاہئیں"

صوفیہ نے باہر کی طرف رخ پھیرا؛ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سخت آزمائش کے لئے وہ اپنا جی کڑا کر رہی ہے! وہ اٹھی لیکن دروازہ تک پہونچ کر ٹھہر گئی؛ رابرٹو باہر چبوترے پر ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا؛ آخر اس نے ہمت کی اور قدم بڑھاتی ہوئی اس کے پاس جا پہونچی۔

"لولو نے مجھے بھیجا ہے" اس نے زیرِ لب آواز میں کہا۔

"مگر تم کو یہاں آنے میں اپنے آپ پر بہت جبر کرنا پڑا ہو گا!"

"جبر؟!۔ نہیں تو!"

صوفیہ کے سارے بدن میں رعشہ ہے۔ رابرٹو اس کے قریب ہی کھڑا ہے: اس کے

چہرے کی ہیئت ایک خاص جذبہ نے بدل دی ہے!

"صوفیہ! میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟" رابرٹو بولا۔

"جی کچھ نہیں، آپ نے کیا کیا ہے؟ اللہ! میری طرف ان نظروں سے نہ دیکھئے! میں التجا کرتی ہوں، ہاتھ جوڑ کے کہتی ہوں!"

"صوفیہ، تم جانتی ہو کہ تم میرا دل لے چکی ہو! بالکل لے چکی ہو!!"

"اُف چپ رہو، رابرٹو، چپ رہو! خدا کے لئے ایسا کلمہ منہ سے نہ نکالو! تم سوچتے نہیں کہ اگر لولو ہماری باتیں سُن پائے ————"

"مجھ کو لولو سے محبّت نہیں! اب میں تمہارا دلدادہ ہوں!"

"آہ! یہ غدّاری! یہ بے وفائی!!"

"میں اس جرم کا معترف ہوں، لیکن اب تو میں تمہارا عاشق ہوں! اچھا اب میں جاؤں گا ————"

"خوب!" لولو کمرے کے دوسرے دروازے میں کھڑی ہوئی دور سے چلائی، "خوب! آج تو تم دونوں میں صلح نامہ سا ہو گیا ہے!"

اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ صوفیہ بھاگی، اور اس نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا! لیکن رابرٹو بالکل بے حس و حرکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا؛ اس کے سکوت و جمود کا یہ حال تھا کہ گویا وہ ایک سنگی مجسّمہ ہے!

"رابرٹو!" لولو نے پکارا۔

"لولو"

"یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟!"

"کچھ نہیں؛ اب جاتا ہوں"

اور بغیر اس کی اجازت وہ چل کھڑا ہوا! روانہ ہوتے وقت وہ یاس و دلشکستگی کی

ایک تصویر تھا! لولو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، وہ حیران کھڑی ہوئی تھی، اور خیالات میں مُستغرق!

"اُف! میں یہاں اور وہ وہاں!" لولو کی زبان آہستہ سے متحرّک ہوئی، لیکن اس افسانۂ عشق کا ماضی کتنا شاندار تھا! خیر، کچھ نہیں!

ہر چہ با دا با دحرفے چند میگویم بہ او　　کار خود در عاشقی ایں بارکیسوی کنم!"

(۵)

"اور پس ان تمام قوی دلائل اور اہم مصالح کی بناء پر میں اَب رابرٹ مانٹی فرنیکو سے شادی نہیں کر سکتی" لولو نے آخر کار اپنی ماں سے کہہ دیا!

"یہ کس قدر نامعقول دلائل ہیں! بیٹی ذرا ان کے مہمل پن پر تو غور کرو!" ماں نے اپنا سر ہلا کر کہا۔

"ماں! بس قصّہ مختصر یہ ہے کہ میں آپ سے صاف صاف کُھلی کُھلی بات کہتی ہوں کہ رابرٹو کی ذات میں اب میری مسّرت قلب کا کوئی سامان نہیں ہے۔ اور میں نے طے کر لیا ہے کہ اُس کے ساتھ ہرگز شادی نہ کروں گی!"

یہ باتیں صاف صاف اور کُھلی کُھلی تو ضرور ہیں، لیکن ایک وہم وجنون سے زیادہ نہیں! تم جانتی ہو کہ رابرٹو تم سے مُحبت کرتا ہے"

"خیر اگر وہ مجھ سے مُحبّت بھی کرتا ہے تو اُس کی

طبیعت کو ہو گا قلق چند روز　　سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائیگی!"

"لیکن تم اس بات کو بھول جاؤ گی کہ تمہارے اور اس کے درمیان قول و قرار ہو چکے ہیں؟!"

"ہم اپنے قول و قرار کو واپس لے لیں گے؛ اَب وہ زمانہ نہیں کہ لوگ جبراً شادی

کرنے پر مجبور کئے جائیں!"

"دنیا کیا کہے گی ؟!"

"اماں! ذرا اس "دنیا" کی تعریف تو کرنا!"

"یہی سب لوگ!"

"مجھے بتائیے کہ یہ "لوگ صاحب" کون بزرگ ہیں ؟! مجھے ان کی خدمت میں اب تک نیاز حاصل نہیں ہوا! میں ان "حضرت لوگ" کی اتنی مرہونِ منت نہیں ہوں کہ اُن کی خاطر اپنی ساری زندگی کو تلخ کر لوں!"

"کس قدر آتش کا پرکالہ ہو! لیکن اب مجھے بتاؤ کہ رابرٹو سے میں کس طرح معاملہ طے کروں؟ میں اُس سے کہوں تو کیا کہوں ؟"

"جو چاہیئے کہہ دیجئے، آپ کو اختیار ہے، آپ میری ماں ہیں۔"

"آہ! کیا یہ میرا فرض ہے کہ تم نے جو اندھے پنے سے غلطیاں کی ہیں اُن کا خمیازہ میں بھگتوں ؟! افسوس کیسی رسوائی ہو گی!"

"میں رسوائی کی رسومات کو نہیں مانتی؛ بہتر ہے کہ آپ اس سے یہ بات مُہذّب طریقہ سے نرمی کے ساتھ کہہ دیں، میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ اُس سے میری برائی بھی کر سکتی ہیں اُس سے کہیئے کہ لولو ایک شکی طبیعت کی خفیف الحرکات اور طفلانہ مزاج لڑکی ہے؛ کہہ دیجئے کہ بحیثیت بیوی کے وہ بہت بُری ثابت ہو گی، کہیئے کہ اُس میں قطعاً متانت نہیں ہے۔ نیز یہ کہ وہ شانِ وقار سے بالکل خالی ہے اور یہ کہ لولو کی بہن ——————"

"لولو کی بہن ؟! تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے!"

"اجی! آپ بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتی ہیں؛ فی الحال رابرٹو اور صوفیہ ایکدوسرے سے بے تعلق سے ہیں۔ لیکن اگر ان کی راہ و رسم اور جاری رہی اور وہ ایک دوسرے کے مذاق سے زیادہ واقف ہوئے تو پھر انہیں ایک دوسرے سے وحشت نہ رہے گی۔ وہ

ایک دوسرے کے قدرداں اور مدّاح ہو جائیں گے، اور پھر ——— کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوگا؟! اور آپ کی بھی تعریف ہوگی کہ کتنی اچھی ماں تھی جس نے آخر بڑی ہی لڑکی کو پہلے بیاہا!"

"سچ کہتی ہو! ———"

"اور میں بھی بے شوہر کے نہ رہوں گی اور ابھی اس کے لئے کون جلدی ہے؛ میں بمشکل اٹھارہ برس کی ہوں گی۔ ابھی تو چند روز تک میں تفریح کرنا چاہتی ہوں، ابھی کچھ دنوں ناچوں گی کودوں گی۔ اور اپنی پیاری ننھی سی ماں کے ساتھ اپنی جوانی کا لُطف اُٹھاؤنگی!

"تم بھی آفت ہو آفت!" ماں نے کہا اور یکبارگی مُحبّت سے مغلوب ہو کر ٹولو کو گلے سے لگا لیا۔

"شکر ہے کہ آپ میرے نقطۂ نظر کو سمجھ گئیں! اچّھا اب یہ نا ملائم خبر ملائمت و خوبصورتی کے ساتھ رابرٹو کو پہونچا دیجئے۔ لیکن یہ کہئیے کہ ہم اب بھی آپس میں دوست رہیں گے، اگر رابرٹو اور صوفیہ ایک دوسرے کے عشق میں مُبتلا ہو جائیں تو اُن کو ہونے دیجئے۔ جو چیز مقدّر ہو چکی ہے اس کو کون روک سکتا ہے؟

"لیکن نٹ کھٹ لڑکی! تجھے یقین ہے کہ معاملات صلح و آشتی کے ساتھ ہمارے حسبِ مرضی ہی طے پا جائیں گے، اور کوئی مشکل پیش نہ آئے گی؟ تم جانتی ہو کہ میں جھگڑے سے کتنا بھاگتی ہوں؟"

"میری پیاری ماں! میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں اور آپکی بدعقیدگی کا کیا علاج کروں؟ آپ تو سینٹ ٹامس سے بھی زیادہ منکرانہ دماغ رکھتی ہیں! ہاں مجھکو جو وسیع تجربہ ان معاملات میں حاصل ہے اس کی بناء پر میں کہہ سکتی ہوں کہ کوئی بدنامی کی صورت پیش نہ آئے گی۔ رابرٹو ایک شریف آدمی ہے اور وہ کبھی مجھ سے یہ تقاضا نہ کرے گا کہ میں بغیر مُحبّت کئے اُس سے شادی کرلوں!"

"جو چیز مجھ کو ناممکن نظر آتی ہے وہ صوفیہ کا معاملہ ہے ———"

"اماں، کوئی چیز ناممکن چیزوں سے زیادہ ممکن نہیں!" لولو نے بڑی عالمانہ شان متانت سے کہا۔

"پیاری لولو! ایک ہی وقت میں اتنے فلسفیانہ ملفوظات کا ڈھیر نہ لگا دو! بس اتنا ہی بہت ہے! ہم کو یہ سارے پیچیدہ معاملے مستقبل پر چھوڑ دینا چاہئیں، شاید وقت ہی ہماری بگڑی کو بنا سکتا ہے۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہو اس میں تو کلام نہیں کہ تمہارا دماغ صحیح نہیں ہے!"

"ہاں میں بہت وہمی ہوں ———"

"وہمی تو کیا، مگر یہ تمہاری خامکاری ہے، اور قوت فیصلہ کی غلطی"

"نہیں نہیں، میں پرلے درجہ کی وہم پرست ہوں۔ آپ جو کچھ فرمائیں مجھے قبول ہے مجھکو وعظ و پند سنائیے تنبیہ کیجئے۔ میں ان سب باتوں کی مستحق ہوں، ہاں ہاں! کہئے، رُک کیوں گئیں؟ میں تو منتظر ہوں، کیا آپ کے پاس اب کچھ اور کہنے کو نہیں؟"

"پیاری آؤ۔ مجھے ایک بار پیار کرنے دو اور پھر جا کر سو رہو! شب بخیر!"

"شکریہ اماں، شب بخیر"

(۶)

"خیر چلو اچھا ہے" لولو کی ماں نے اپنے دل میں کہا، "لولو ابھی کم سن بھی ہے اور ہم آئے دن ان کم سن لڑکے لڑکیوں کی شادیوں کا انجام دیکھتے رہتے ہیں۔ خدا ہم کو ان افسوسناک نتائج سے بچائے رکھے! ہاں، مصلحت یہی ہے!"

"واہ وا!" لولو نے چونک کر اپنے دل میں کہا" واہ میں نے کس حکمت عملی سے کام لیا اور والدہ کو قائل کرنے میں اس فن لطیف کی کیسی داد دی! میں تو ایک بہت اچھی

مُلکی سفیر بن سکتی ہوں! کتنی زبردست کامیابی ہے! کامرانیٔ عشق کی طرح! لیکن یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس فتح کا سہرا تو لو تو ہی کے سر ہے!"

لو لو بہن کے کمرے کے دروازہ پر کھڑی ہے اور اندر کی آوازوں کو سن رہی ہے! وہ بار بار دلدوز آہوں کو سنتی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ صوفیہ ضبط فغاں کی جدّوجہد کر رہی ہے! آہ غریب صوفیہ دل شکستہ ہو گئی اور اس نے اپنا اطمینان قلب کھو دیا!

"سو جاؤ بہن صوفیہ سو جاؤ" لو لو نے آہستہ سے بڑے پیار کے لہجے میں کہا اور یہ الفاظ منہ سے نکالتے ہوئے اس نے دروازے کے قفل کو چوم لیا۔ گویا کہ وہ اپنی مصیبت زدہ بہن کی پیشانی کو بوسہ دے رہی ہو! "اپنے دل مضطر کو تسلّی دو۔ اور کچھ سو لو۔ آج شام کو میں نے تمہارے لئے کچھ کیا ہے!"

اور اس کے بعد یہ فراخ دل لڑکی خود بھی جا کر سو رہی اور اس اطمینان نے اُسکو لوری دی کہ اس نے اپنی بہن کے دردِ دل کے درماں کے لئے کچھ کر دیا ہے!

وقت نے، قدیم مہربان وقت نے ہاں اس وقت نے جو حکمت سرمدی کا حامل ہے۔ آخر یہ مہم سر کر لی، اور ساری مشکلیں آسان کر دیں۔ لو لو نے اپنے دل سے پوچھا کہ آیا یہ بن بیاہی بہن جو دلہن کی سہیلی بنی ہے اس موقع پر آسمانی ریشم کا گون زیب تن کرے گی۔ یا بادامی رنگ کی سیدھی سادی پوشاک پہنے گی! اس نے رابرٹو سے پوچھا کہ کیا وہ اس تقریب میں بہت سے بتاشے لائیگا اور پھر صوفیہ سے درخواست کی کہ کیا وہ عاریتہً اُس کو اپنا کشیدہ کاردستی رومال دیدے گی جو اپنی شاعرانہ باریکی و لطافت میں بس ایک لکہ ابر کی طرح ہے جس کو بادِ نسیم اڑائے لئے جا رہی ہو! رابرٹو اور صوفیہ جان گئے تھے کہ اس لڑکی کے دل میں کتنی وسعت پیدا ہو گئی ہے اُس کی ان شگفتہ طبعی اور لاابالی پن کی باتوں پر ہنستے تھے۔ لو لو دونوں کی محبوب اور عزیز تھی اور وہ اُس کو اپنے لئے ایک فرشتۂ غیب سمجھتے تھے!

"میرا عرصہ سے یہ عقیدہ ہے" رابرٹو مانٹی فرنیکو نے سلسلۂ کلام میں جبکہ وہ اپنی شادی کے مسئلہ پر بحث کر رہا تھا، کہا "کہ میاں بیوی کو متضاد طبیعتوں کا ہونا چاہیئے اس لئے کہ انتہائی نقاط آپس میں مَس ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے متبائن اوصاف کو محسوس کر سکیں گے۔ آپس میں ملیں گے، اور دونوں اجزا سے ایک مکمل واحد چیز بنائیں گے! لیکن برعکس اس کے یکساں مذاق رکھنے والا جوڑا مثل متوازی خطوط کے ہوتا ہے: وہ بے شک پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ لیکن کبھی ملتے نہیں بالخصوص عشق و محبّت کی نشو و نما کے لئے یہ اختلاف طبائع بہت کار آمد ہے۔ ہاں اب میرا یہی نظریہ ہے اور میں اب اسی کی تلقین کیا کرتا ہوں!"

غزل

از مولٰنا آزاد سبحانی

اس ضعف کا کیا کہنا بخشے جو توانائی
اس یاس کے میں صدقے دی جس نے شکیبائی

ہے مذہب اُلفت کا آئین جُداگانہ
سرمستی ہے ہشیاری نادانی ہے دانائی

عشاق کا سرمایہ، ناطاقتی و پیری
سرمایۂ معشوقاں رعنائی و زیبائی

ہر درد پہ ہنگامے ہر رنج پہ فریادیں
اور اسپہ ہی حضرت کو دعوائے شکیبائی

ہر قید سے بے قیدی، ہر وضع سے بے وضعی
رکھنا ہے یہی مشرب بننا ہے جو شیدائی

عاشق کو ہر اک جلوہ بس جلوۂ جانانہ
مجنوں کی نگاہوں میں ہر جلوہ تھا لیلائی

ہم عاشق صادق ہیں ہم ننگ کے دشمن ہیں
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں بدنامی و رسوائی

ہر شمع ہے پروانہ ہر ہوش ہے دیوانہ
کیا طرفہ تماشا ہے یہ انجمن آرائی

کوئی نہیں جُز تیرے، تو اور تیری شانیں
عارف کی نظر میں ہے یہ معنئ یکتائی

وہ جلوہ نما ہر جا، میں جلوہ طلب ہر جا
ہر جگہ میسّر ہے اُن کی مری یکجائی

ہر رنج کے شکوے بھی ہر جور پہ طعنے بھی
کس مُنہ سے پھر اپنے کو کہتا ہے تمنائی

اِک بندۂ عاجز کی فریاد نہیں سنتا
سچ کہنا مرے دارا، کیا ہے یہی دارائی

سبحانئ وحشی کو معذور رکھے خلقت
دیوانہ ہے دیوانہ، سودائی ہے سودائی

ولہٗ

کوئی ایسا ہے جسے کہئے کہ یہ باہوش ہے
جو بھی ہے اس بزم میں وہ سر بسر مدہوش ہے

ساری مے میخانۂ عالم کی ہو جاتی ہے صرف
بیشک اس میخانہ میں کوئی بڑا مے نوش ہے

یہ سبق دیتا ہے دریا کو سمندر کا خروش
جس میں جتنا مادّہ ہے اتنا وہ پُر جوش ہے

یہ وہ مے خانہ ہے جس کی ہائے دھو ہے دائمی
دل کے خم خانہ میں ہردم شغل نوشانوش ہے

دل کی اس افسردگی پر کھا نہ دھوکا اے حریف
شعلہ ہی تو ہے اگرچہ شعلۂ خاموش ہے

قتل ہوتے ہیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے حسینؑ
وائے اس دنیا پہ جب مسلم بھی ناحق کوش ہے

رحم کے قابل ہے تیرا حالِ زار اے مردِ عشق
بار ہے کونین کا اور تیرا نازک دوش ہے

اس کے رنج و غم کا پیمانہ ہی کیا جانچے کوئی
یہ مریضِ عشق جو آٹھوں پہر بیہوش ہے

محویت میں ہو چکا ہوں ساری دنیا سے الگ
التفاتِ یار میں ہوں اور تری آغوش ہے

دیکھتی ہے لغزشیں اور پردہ در ہوتی نہیں
وہ نگاہِ رحم دیکھو کتنی لغزش پوش ہے

دل سے بالکل محو کر دے دوش کو ماضی پرست
فکرِ فردا کر کہ بے انجام ذکرِ دوش ہے

ہو بھی تو دلکش کوئی نغمہ بیان و پند کا
رندِ مستغرق کا تو ہر رونگٹا اک گوش ہے

کس کو ساغر میں ملی ہے اور کس کو اوک میں
اس ذرا سے فرق پہ کیوں میکشو یہ جوش ہے

کوئی کیف اس دہر کا لطفِ بقا رکھتا نہیں
جو ہے یاں صرفِ فنا ہی نیش ہے یا نوش ہے

کاٹتا ہے زندگی سبحانی اب اس وضع سے
سر بکف، زنجیر در پا، و کفن بر دوش ہے

غزل

از حضرت درؔد ۔ کاکوری

روان ہیں اشک اور ہر دم کلیجہ مُنہ کو آتا ہے
الٰہی خیر ہو دل کی یہ آخر ماجرا کیا ہے

ورق حسرت کا ہے دست الم میں اور دل غمگیں
نہ وہ بزم شبانہ ہے نہ وہ ذوق تمنّا ہے

رواں ہیں اشک، چہرہ پر اُداسی، پھول دامن میں
الٰہی کون پھر فاتحہ مدفن پہ آیا ہے

خبر دیتا ہے ہر دم جاذبہ موج تنفس کا
کہ پھر بچھڑے قطرے کیلئے بیتاب دریا ہے

سر محفل دلوں میں پھونکدی سی آگ سی جس نے
یہ سوز دل ہے یا ساز جگر کا اک ترانا ہے

ترے صدقہ نہ پنہاں ہو ابھی اے جلوہ پنہاں
ترے قرباں ابھی تجھکو کہاں جی بھر کے دیکھا ہے

جگر میں ٹیس، لب پر آہ، اشک آنکھوں میں دل زخمی
ہمارا قلب، یا اک محشر انگیز تمنّا ہے

کہیں روز ازل حسنِ ازل کو دیکھہ پایا تھا
سبب یہ ہے جو ہر دم درؔد دل اپنا تڑپتا ہے

ولہٗ

باز بکوئے من گذر، کرد کہ کرد یار کرد
باز بسوئے من نظر، کرد کہ کرد یار کرد

باز ز تیغ غمزہ ہا، کشت کہ کشت یار کشت
ظلم و ستم بریں جگر، کرد کہ کرد یار کرد

باز لبوئے بسملاں، دید کہ دید یار دید
باز بخستگاں نظر، کرد کہ کرد یار کرد

برق جمال بر دلم، ریخت کہ ریخت یار ریخت
باز زعشق شور و شر، کرد کہ کرد یار کرد

دعوت جذب بیخودی، داد کہ داد یار داد
بیخود و مست و بے خبر، کرد کہ کرد یار کرد

سوز و گداز درؔد دل، داد کہ داد یار داد
باز ز ناز یک نظر، کرد کہ کرد یار کرد

تنقید و تبصرہ

کتب :-

ہندوستان کے معاشرتی حالات - اسلام اور غیر اسلام
اسلام اور غلامی - مختصر تاریخ گجرات

ہندوستان کے معاشرتی حالات | مجموعۂ خطبات علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب۔ شائع کردہ ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد، قیمت عہ

پچھلے برس ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کی دعوت پر جناب عبداللہ یوسف علیصاحب نے ہندوستان کے ازمنہ متوسطہ کے معاشرتی اور اقتصادی حالات پر متعدد خطبات دیے تھے جن کو اب ہندوستانی اکاڈیمی نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ عبداللہ یوسف علی صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ تاریخ اور معاشیات انکے خاص مضامین ہیں۔ جو لوگ تاریخ ہند سے ذوق رکھتے ہیں وہ ان خطبات کو نہایت دلچسپ اور مفید پائیں گے۔ طلبہ کو خصوصیت کے ساتھ ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔

پہلے خطبے میں عبداللہ یوسف علیصاحب نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ کے مختلف ادوار قائم کیے ہیں اور پھر ازمنہ متوسطہ کے تین حصے قرار دیکر دوسرے تیسرے اور چوتھے خطبات میں یکے بعد دیگرے ساتویں صدی دسویں اور گیارہویں صدی اور چودہویں صدی عیسوی (اس لئے کہ ازمنہ متوسطہ کے یہی تین حصے ہیں) کے معاشرتی اور اقتصادی کوائف پر نہایت دلچسپ انداز میں نظر ڈالی ہے۔ عبداللہ یوسف علی صاحب کے یہ خطبات معلومات کا ایک بے بہا گنجینہ ہیں

اور جو لوگ ان سے مدد لیکر اپنے مطالعہ کو وسعت دینے کی کوشش کرینگے۔ انکے
علم میں یقیناً قابل قدر اضافہ ہوگا۔ اس لئے کہ جناب عبداللہ یوسف علی صاحب
نے ہماری توجہ جن مسائل کیطرف منعطف کرائی ہے وہی دراصل تاریخ کی جان
ہیں۔ ہماری زبان میں حروب وسنین کے متعلق تو غالباً بہت کافی کتابیں موجود
ہوں گی لیکن ایک رسالے کی شدید ضرورت تھی جس کے مطالعہ سے علم دوست طبقہ تاریخ
ہند کے اصلی مسائل کیطرف توجہ کرتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جناب عبداللہ یوسف علیصاحب کے
ان قابل قدر خطبات نے اس ضرورت کو بوجہ احسن پورا کر دیا ہے۔ ابتدا میں تمہید کے طور پر
انہوں نے کتابت وطباعت کی بحث چھیڑتے ہوئے حامیان اردو کو مشورہ دیا ہے کہ
وہ ٹائپ سے بے اعتنائی نہ برتیں بلکہ جہانتک ہوسکے اسے "حسین وجمیل" بنانے کی
کوشش کریں۔ ہماری رائے میں انکا یہ مشورہ نہایت مفید ہے۔

اسلام اور غیر مسلم
اسلام اور غلامی
از محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواروی۔ قیمت ۸ر اور ۳ر ملنے کا پتہ:۔
مسلم بکڈپو پھلواری شریف (پٹنہ)

یہ دو نہایت ہی مفید رسالے ہیں جن میں مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب نے بڑی خوش
اسلوبی سے ان الزامات کی تردید کی ہے کہ اسلام کی اشاعت بزور شمشیر عمل میں آئی یا یہ
کہ اسلام نے غلامی کو جائز ٹھہرایا ہے۔ مسلمانوں کے لئے ان دونوں رسالوں کا مطالعہ بہت
مفید ثابت ہوگا۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب نے اپنا مطلب بڑی خوبی سے ادا کیا ہے اور
جابجا قرآن پاک، احادیث اور مسلم اور غیر مسلم مورخین کے بیانات اپنے دعوے کی تائید
میں پیش کئے ہیں۔

مختصر تاریخ گجرات
مصنفہ سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر مہاودیالے۔ مطبوعہ مطبع معارف
اعظم گڈھ۔ مصنف سے مہاودیالے احمدآباد (گجرات) کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

یہ تاریخ گجرات پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں ابوظفر ندوی صاحب پروفیسر

مہاودیا لے نے بچوں کی واقفیت کے لئے راجگان وسلاطین گجرات کے مختصر حالات جمع کر دیے ہیں آخر میں تحریک ترک موالات اور کسی قدر انگریزی عہد کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب بچوں کے لئے کچھ بہت زیادہ مفید نہیں اس لئے کہ محض واقعات اور سنین کے مطالعہ سے بچوں کے دماغ پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑتا۔ بہتر ہوتا اگر کتاب کو زیادہ دلچسپ بنانیکی کوشش کیجاتی۔

رسائل واخبار :۔

ادبی دنیا - کامیابی - جدت - دولت کونین - موٹرکار - مومن

ادبی دنیا لاہور | ماہوار باتصویر رسالہ زیرنگرانی سر عبدالقادر۔ چیف ایڈیٹر تاجورصاحب نجیب آبادی۔ ایڈیٹر حنیف صاحب ہاشمی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۴ حجم تقریباً نوے صفحے۔ کاغذ اچھا لکھائی چھپائی اوسط درجے کی سرورق بہت خوشنما سالانہ چندہ مع محصول ڈاک ۱۲ روپے

بڑی خوشی کی بات ہے لاہور سے ایک اور قابل قدر ادبی رسالہ نکلا ہے۔ اس کے دو نمبر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلامت مذاق اور تنوع مضامین کے لحاظ سے دوسرے رسالوں سے سبقت لیجائے گا۔ اس قیمت میں بڑے سائز پر عمدہ مضامین کے نوے صفحے شائقین ادب کے لئے ایک ایسی نعمت ہے جسے وہ یقیناً ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اس رسالے میں اور کئی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے رسالوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ تصویروں کے انتخاب میں خوش مذاقی سے کام لیا جاتا ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانوں سے چیدہ ادبی ٹکڑوں کا ترجمہ شائع ہوتا ہے۔ آخر میں ایک فرہنگ ہوتی ہے جس میں مشکل الفاظ کے معنی دئے جاتے ہیں۔

ہم اس رسالے کی ادارت کو چند مخلصانہ مشورے دینا چاہتے ہیں۔ ایک تو یہ

کہ رسالے کا سائز اتنا بڑا نہ رکھا جائے۔ اس سے دیکھنے والے مرعوب تو ضرور ہوتے ہیں مگر مانوس نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ دوسری زبانوں سے جو ترجمے دیے جاتے ہیں وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں تک محدود نہ ہوں بلکہ مکمل قصے یا مضامین ہوں جن سے اس زبان کی خصوصیات کا اندازہ ہو سکے۔ یہ ضرورت نہیں کہ ہر پرچے میں تمام دنیا کی زبانوں سے ترجمے موجود ہوں۔ باری باری سے تین چار زبانوں کے ترجمے چھاپے جا سکتے ہیں۔
آخر میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ ارباب ادارت کو زبان کے معاملے میں زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ زبان کی خوبی ادب کی جان ہے۔

کامیابی دہلی | ماہوار رسالہ زیر ادارت ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۴۸ صفحے۔ لکھائی چھپائی نفیس کاغذ عمدہ سرورق بہت خوشنما قیمت سالانہ عہ

یہ اپنے طرز کا بالکل نیا رسالہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں عزم و استقلال، کسب حلال کا شوق اور کامیابی کا ولولہ پیدا کیا جائے۔ مضامین کا انتخاب اور ترتیب قابل داد ہے۔ بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اصلاحی مضامین خشک نہیں ہیں بلکہ زبان کی سلاست اور روانی نے انہیں شگفتہ بنا دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب جیسے ادیب کی نگرانی میں یہ رسالہ اونچے ادبی معیار پر قائم رہے گا۔

جو دو پرچے اب تک نکلے ہیں ان میں مضامین زیادہ تر ادبی ہیں یا اصلاحی۔ غالباً آئندہ پرچوں میں ایسے مضامین بھی شائع ہونگے جن سے تجارت، زراعت اور دوسرے پیشوں میں کامیابی کے ذرائع معلوم ہوں۔ کامیابی کا ترانہ سنانے کے ساتھ کامیابی کی راہ دکھانا بھی ضروری ہے

روزنامہ جدت | چیف اڈیٹر سید شبیر حسن صاحب قتیل۔ ملنے کا پتہ۔ روزنامہ جدت لکھنؤ لکھائی چھپائی متوسط۔ کاغذ بھی متوسط۔ بڑا سائز۔ چندہ سالانہ لعہ سششماہی صہ فی پرچہ ۱ؐ
کسی ملک میں آجکل کثرت سے اخبارات کا شائع ہونا اس کے مہذب اور تعلیم یافتہ

ہونیکی سب سے بڑی دلیل ہے اس لحاظ سے ہمارے ملک میں جس کثرت سے اخبارات شائع ہوں اسی قدر ہماری نیکنامی ہے۔

ہمارے سامنے اس وقت روزنامہ جدت کا دوسرا نمبر ہے۔ کاغذ اور صفحات کے لحاظ سے اس کی ایک پیسہ قیمت بہت ہی کم ہے۔ اودھ کے باشندوں کے لئے یہ نایاب موقع ہے کہ کم سے کم قیمت میں ایک روزنامہ کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

مضامین کی ترتیب اور زبان بھی خاصی ہے لیکن ایک اخبار کا جہاں یہ فرض ہو کہ وہ اپنی ظاہری زیبائش کو قائم رکھے۔ اپنی باطنی خوبیوں کو بھی برقرار رکھنا چاہیئے۔ شاید جدت اس آخری خوبی کو اس نمبر میں قائم نہیں رکھ سکا۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ جدت کو جانبدارانہ جذبات سے علیحدہ رہکر خدمت قوم کرنا چاہیئے

دولت کونین | اڈیٹر جناب مفتی محمد نعیم صاحب فاضل دیوبند۔ ملنے کا پتہ لودھیانہ (پنجاب) سائز ۲۰×۲۶/۸ قیمت سالانہ عہ فی پرچہ ۴ر

یہ ایک مذہبی رسالہ ہے۔ اس میں کثرت سے وہی مضامین درج ہوتے ہیں۔ جن سے مسلمانوں کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔ خاص خاص مہینوں کی مناسبت سے ان کی خصوصیات اور انکے متعلق احکامات بھی درج کئے جاتے ہیں۔ مفتی صاحب موصوف ایک اسلامی درسگاہ کے مہتمم بھی ہیں۔ اس لئے اس رسالے کے اجراء سے غالبًا ان کا مقصد یہ بھی ہوگا کہ اس درسگاہ سے لوگوں کو روشناس کرایا جائے۔

موٹر کار | اڈیٹر عبدالرحیم صاحب۔ چندہ سالانہ رؤسا سے عمر عوام۔ طلبہ اور موٹر ڈرائیوروں سے عہ۔ سائز چھوٹا۔ ملنے کا پتہ۔ اڈیٹر موٹر کار گورکھپور (یو۔پی)

رسالہ موٹر کار کی تیسری کا نمبر ۲-۳۶ ہمارے سامنے ہے۔ اس کا مقصد مشینوں کے متعلق عمومًا اور موٹر کار اور موٹر سائیکل کے متعلق خصوصًا معلومات فراہم کرنا ہے۔ تمام کے پڑھنے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس میں سارے مضامین موٹر ہی کے متعلق

ہونگے لیکن ایسا نہیں ہے۔ دلچسپی کے لئے غزلیات اور ادبی مضامین بھی درج کئے جاتے ہیں۔ ایک ایسے شہر سے جو ادب اردو کے لئے مشہور نہ ہو ایسے مختلف اور مجتمع المقاصد رسالہ کا نکلنا قابل مبارکباد ہے۔

رسالہ مومن | اڈیٹر مولوی حافظ وحی الدین احمد۔ ملنے کا پتہ اڈیٹر رسالہ مومن۔ منگل بازار ہزاری باغ (بہار) سالانہ چندہ عہ ممالک غیر سے ۶؍ فی پرچہ ۳؍

خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے بھی اب ایسی زبان کیطرف توجہ کی ہے جو تقریباً انہیں کی ہے

رسالہ مومن اس کا کافی ثبوت ہے۔ یہ رسالہ ہندی رسم الخط میں شائع ہوتا ہے اس میں مضامین بہت سادے اور مذہبی رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کو خاص طور پر مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس رسالہ کا ضرور خریدیں۔ بشرطیکہ وہ ہندی سمجھ لیتے ہوں۔

شذرات

جامعہ کا یہ نمبر مئی کے نمبر کے بعد چند ہی روز کے وقفہ سے شائع ہو رہا ہے امید ہے کہ انشاءاللہ اگست کے مہینے میں بھی اسی طرح ۲ نمبر شائع ہوں گے۔ اور رسالہ اپنے معمولی وقت پر آجائے گا۔

جب سے رسالہ کی اشاعت مقررہ وقت سے پیچھے ہو گئی ہے قارئین کرام مسلسل شکایت اور تقاضے کے خطوط لکھ رہے ہیں۔ اس سے ہمیں شرمندگی بھی ہے اور خوشی بھی۔ شرمندگی تو ظاہر ہے کہ اپنے قصور پر ہے مگر خوشی اس بات کی ہے کہ ہمارے رسالے کے پڑھنے والے اسے شوق سے پڑھتے ہیں اور اگر کسی نمبر کے پہونچنے میں دیر ہو تو پہلے انتظار۔ اور پھر شکایت اور تقاضا کرتے ہیں۔ بظاہر یہ معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر ادارت جامعہ کے خیال میں بہت غنیمت ہے۔ کہ جامعہ کے سے خشک رسالے سے کچھ حضرات تو دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس رسالے کی کوشش ابتداہی سے یہ ہے کہ جتنے مضامین پیش کئے جائیں، وہ علمی شان، ادبی لطف اور سلامت مذاق سے خالی نہ ہوں۔ اس کے علاوہ بلند تر اخلاقی اور مذہبی مقاصد بھی پیش نظر ہیں۔ اگرچہ ابھی کل مضامین اُس معیار تک نہیں پہونچے جو مدیران جامعہ اور مُربیان جامعہ نے قایم کیا ہے پھر بھی عام سطح سے رسالہ ضرور اونچا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی اشاعت محدود ہے اور اس کے قدرداں کم ہیں۔ لیکن ہمیں اس کمی کا افسوس نہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ رسالے کے پڑھنے والے حضرات وہی ہوں جو معیار کے بلند ہونے کی شکایت نہیں بلکہ بلند تر ہونے کی تاکید کریں۔

ہمارے موقر ہمعصر رسالہ "کامیابی" کے جولائی نمبر میں مکرمی ڈاکٹر سعید احمد صاحب نے جامعہ ملیہ کے کارکنوں کو بہت مفید مشورہ دیا ہے۔ صحیح مشورہ بڑی قیمتی چیز ہے خصوصاً جب مشورہ دینے والے کا دل خلوص اور ہمدردی سے لبریز ہو۔ ممدوح کی رائے یہ ہے کہ جامعہ والے شہر سے دور کسی گاؤں میں ایک بستی بسائیں، جہاں جامعہ کے بچوں اور اُستادوں کے علاوہ بچوں کے والدین بھی رہ سکیں اور جامعہ کے کارکنوں کے ساتھ اس تعلیمی تجربے میں شریک ہوں جو وہ کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جامعہ کے لوگوں کے پیش نظر جو نصب العین ہے یعنی وہ تعلیم جو زندگی کی صحیح تفسیر ہو وہ تربیت جو عقیدے اور عمل پر مبنی ہو وہ سادگی جو رہبانیت کی حد تک نہ پہونچے وہ مذہبیت جس میں تنگ خیالی اور تعصب کی بو نہ ہو وہ روشن خیالی جو لامذہبی اور بے اصولی سے پاک ہو، وہ حبِّ وطن جو اسلام کی وسعت نظر کے منافی نہ ہو وہ قوم پرستی جو خدا پرستی سے نہ روکتی ہو اس کے حاصل کرنے کے لئے یقیناً موجودہ "تہذیب و تمدن" کی فضا سے باہر رہنا ضروری ہے۔ یہ فضا نفرت، عداوت، بغض و حسد، شک و شبہہ پست خیالی اور پست ہمتی کی زہریلی ہواؤں سے مسموم ہو رہی ہے۔ اس سے دور رہنا ہماری صحت کے لئے بلکہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔ جامعہ کے کارکنوں کے دل میں بہت دنوں سے یہ ارادہ ہے۔ اور وہ دہلی کے قرب و جوار میں مناسب جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ مدیر "کامیابی" کے یہ الفاظ انھیں اپنے خیال میں اور پختہ اور اپنے ارادے میں اور مستقل کر دیں گے۔

مگر اکثر مفید اور اہم تجاویز کی طرح اس تجویز کے ساتھ بھی بہت سے خطرات

وابستہ ہیں جن سے بچنے کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ تمام تعلیمی اور اصلاحی کاموں کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ پوری قوم کی زندگی کو سُدھاریں۔ اگر اصلاح کی کوشش کرنے والے ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ آبادی سے دور جا بسیں تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ان کا رشتۂ تعلّق ہیئت اجتماعی سے منقطع نہ ہو جائے۔ اور اگر تعلق باقی بھی رہے مگر صرف اتنا کہ وہ کشمکش زندگی سے الگ بیٹھے تحریروں اور کتابوں کے ذریعہ اصلاحی تدابیر بتایا کریں تو اس سے کچھ زیادہ کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں جہاں تک ممکن ہو، عملی حصّہ لیں اور اپنے بھائیوں کے دوش بدوش ساری کڑیاں جھیلیں۔ جو شخص حیاتِ قومی کی کشتی کو منجدھار سے نکالنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ کافی نہیں کہ کنارے پر کھڑا ملّاحوں کو ہدایتیں دیتا رہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ کشتی میں رہ کر کشتی والوں کو تسکین دے۔ ملّاحوں کا ہاتھ بٹائے اور اُن کی ہمّت بڑھائے۔

اگر یہ مقصد آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے تو تعلیمی اور علمی مقاصد کیلئے گوشہ نشینی میں کوئی ہرج نہیں۔ تعلیم کے لئے بچّوں کو عام زندگی کے شور وشر سے بچا کر ایک گوشۂ عافیت میں رکھنا ایسا ہی جیسے باغبان چھوٹے پودوں کو طوفان ابر وباد کی زد سے باہر کسی گرم خانہ میں یا محفوظ کیاریوں میں رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ یہ حفاظت عارضی ہے ایک دن ان پودوں کو سورج کی گرمی۔ آندھی کی تیزی اور پانی کے طوفان کا مقابلہ کرنا ہے لیکن اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جب ان کی جڑوں میں زندگی کا رس دوڑ جائے گا اور مضبوطی واستحکام پیدا ہو جائے گا تو وہ عناصر کے حملوں کی تاب نہ لا سکیں گے اور وہ اس کا خیال رکھتا ہے کہ جیسے جیسے اُن کی نشوونما مکمل ہوتی جائے وہ انھیں آہستہ آہستہ ان قوتوں کی مقاومت کی مشق کراتا جائے

جن سے انھیں عمر بھر کا سابقہ ہے۔

اگر جامعہ ملیہ والے اپنی تجویز پر جسے مدیر "کامیابی" کی تائید حاصل ہے عمل کریں تو انھیں ان سب باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ "بے ہمہ اور باہمہ" کی راہ صرف صوفیوں ہی کے لئے دشوار گزار نہیں بلکہ ہر سالک زندگی کو اس کی صعوبت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن بے اس کٹھن مرحلے سے گزرے چارہ بھی نہیں ہے۔

جنوبی جرمنی کے شہر میونک میں ایک نیم سیاسی اور نیم علمی ادارہ جرمن اکادمی کے نام سے قائم ہوا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے قومی ادب کو ترقی دے، غیر ممالک کو جرمنی کی علمی خدمات سے آگاہ کرے اور بین الاقوامی سیاسی مباحث میں جرمنی کی قلمی حمایت کرے۔ اس اکادمی نے ابھی حال میں تین وظائف کا اعلان کیا تھا جو ان ہندوستانی طالب علموں کو دیے جائیں گے جنھیں ہندوستان میں تعلیم ختم کرنے کے بعد میونک یونیورسٹی میں طب، انجینیری، اور کیمیا یا طبعیات میں ریسرچ کرنے کا شوق ہو۔

یہ غالباً پہلا وظیفہ ہے جو کسی یورپ کی یونی ورسٹی نے ہندوستانی طالبعلموں کے لئے مخصوص کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جرمن اکادمی کو جیسا اس نے اعلان کیا ہے ہندوستانیوں کی مہماں نوازی کا احسان اُتارنا ہے جو اُنھوں نے میونک یونیورسٹی کے چند طالب علموں کے ساتھ برتی تھی لیکن پھر بھی ہمارا یہ فرض ہے کہ اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کریں۔ غریب ہندوستانیوں کو کون اس قابل سمجھتا ہے کہ اُن کی حقیر خدمات کا مُعاوضہ دے۔

اخباروں میں روز یہ خبر آرہی ہے کہ روس اور چین کے تعلقات بہت کشیدہ ہیں اور ان دونوں میں عنقریب جنگ شروع ہونے والی ہے بلکہ باوجود باقاعدہ اعلان جنگ نہ ہونے کے ایک آدھ معرکہ ہو بھی چکا ہے ان خبروں سے ان سب لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے جو سمجھتے ہیں کہ روس خلوص کے ساتھ ایشیائی قوموں کی آزادی اور ترقی کا حامی ہے اور بغیر اپنی کسی غرض کے ان کی مدد کرنے کو موجود ہے۔

کچھ دن پہلے جب چین کے قوم پرستوں کی جماعت جنوبی حصہ ملک پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی مستبدوں سے سرگرم پیکار تھی تو روس نے ایثار کے لمبے چوڑے دعووں کے ساتھ ان کی مدد کا وعدہ کیا اور کچھ تھوڑی بہت مدد کی بھی لیکن بہت جلد اس ایثار کی حقیقت کھل گئی اور معلوم ہو گیا کہ روسی جو مددگار بن کر آئے تھے مالک بنکر رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ غریب قوم پرستوں کو ایک وقت میں دو دشمنوں کا بلکہ متعدد دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک طرف تو شمالی مستبد حکومت کا دوسری طرف بالشویکوں اور ان سادہ لوح یا بدنیت چینیوں کا جو ان کے اثر میں تھے اور تیسری طرف دول یورپ کا جو خفیہ سازشوں کا جال پھیلا رہی تھیں۔ خدا نے ان کی مدد کی اور چینی قوم ان اندرونی اور بیرونی دشمنوں پر غالب آئی۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا ہے بلکہ اسے پھر ان دشمنوں سے ایک ساتھ یا علیحدہ علیحدہ مقابلہ کرنا ہوگا۔

جو لوگ یورپ کی سیاسی تاریخ سے واقف ہیں انھیں روس کے قول و فعل میں یہ اختلاف دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ یورپ میں مدتوں سے یہ قاعدہ چلا آتا ہے کہ کسی ملک کے نظام حکومت کی اندرونی تبدیلیوں سے سیاست خارجہ میں

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرانس میں جب وہ عظیم الشان انقلاب ہوا جس نے تمام دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور صدیوں کی جمی ہوئی شاہی حکومت کو چند دنوں میں نیست و نابود کر کے جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی تو کیا اس کی بیرونی سیاسی پالیسی بدل گئی؟ تاریخ سے پوچھئے تو وہ کہے گی ہرگز نہیں۔ فرانس کی زمین کی بھوک اور قوت کی ہوس نہ صرف نپولین کے زمانہ میں بلکہ نپولین کے بعد بھی بدستور باقی رہی اور آج تک باقی ہے۔ اسی طرح روس کے جو ارادے اور حوصلے ہمیشہ سے چلے آرہے ہیں ان میں اشتراکی انقلاب سے کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ اور زیادتی ہو گئی ہے۔ کیونکہ روس کی فوجی طاقت اب پہلے سے بہت زیادہ ہے روس کا دانت چین، ہندوستان، ایران، ٹرکی پر جیسے پہلے تھا اب بھی ہے۔

ایشیا والوں کو خصوصاً ہندوستانیوں کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قوموں کے اندر مختلف جماعتوں میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو لیکن غیر قوموں کے مقابلے میں اُنھیں اپنی عصبیت قایم رکھنا پڑتی ہے اور اسی پر ان کی زندگی منحصر ہے۔ روس کی بالشویک حکومت ہو یا انگلستان کی لیبر حکومت کسی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے ملک کے مفاد کو پس پشت ڈالکر کسی اصول یا کسی نصب العین کی حمایت میں ایشیا کی کمزور قوموں کا ساتھ دے گی بڑی نادانی ہے۔ بفرض محال اگر کسی مُلک کی حکمراں جماعت اس ایثار پر آمادہ بھی ہو جائے تو عام قوم اُس جماعت کو ایک دن بھی برسر حکومت نہ رہنے دیگی۔

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

نمبر ۱	بابتہ ماہ جولائی ۱۹۲۹ء	جلد ۱۳

فہرست مضامین

۱- آزادی کی راہیں	برٹرینڈ رسل مترجمہ حامد علیخانصاحب بی اے (جامعہ)	۲
۲- ہندوستان اور مسئلہ تعلیم	لالہ لاجپت رائے مترجمہ اسرائیل احمد خانصاحب	۲۴
۳- ادبیات ایران کی ترقی میں سلطان محمود غزنوی کا حصہ	مولوی حسین حسان صاحب ندوی متعلم جامعہ	۳۳
۴- قلعہ دہلی کے میوزیم پر ایک نظر	مولوی عبدالجلیل صاحب ندوی متعلم جامعہ	۴۲
۵- مذاہب اسلامی کی ابتدا	سید نذیر نیازی صاحب بی اے (جامعہ)	۴۹
۶- عینک فروش (افسانہ)	ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی	۶۹
۷- نمود سحر (نظم)	ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری	۷۹
۸- شذرات	. . . .	۸۰

آزادی کی راہیں

باب اول نمبر۲

مارکس اور مذہب اشتراک

مارکس کی تعلیم کے نہایت ضروری مسائل تین کہے جا سکتے ہیں :- (۱) وہ جسے تاریخ کی مادی تشریح کہتے ، (۲) اجتماع سرمایہ کا قانون ؛ (۳) معاشی طبقوں کی جنگ۔

۱۔ تاریخ کی مادی تشریح : مارکس کا خیال ہے کہ جماعت انسانی کے تقریباً تمام مظاہر کی اصل مادی حالات میں ہے اور یہ حالات اس کے نزدیک نظامہائے معاشی میں متشکل ہوتے ہیں۔ دستور سیاسی، قوانین، مذاہب، فلسفے، یہ سب اس کے خیال میں اپنے موٹے موٹے خط و خال میں اس معاشی اقتدار کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں جو انہیں پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ مارکس کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر کہا جائے کہ اس کے نزدیک صرف جانے بوجھے معاشی محرک ہی کو اہمیت حاصل ہے، بلکہ اس کا خیال یہ ہے کہ معیشت سیرت اور رائے کی تشکیل کرتی ہے اور اس طرح اکثر ان چیزوں کا سرچشمہ ہے جو شعور انسانی میں اس سے بالکل بے تعلق نظر آتی ہیں۔ یہ اپنی تعلیم کو بالخصوص دو انقلابوں پر عائد کرتا ہے، ایک گذشتہ اور ایک آنے والا۔ گذشتہ انقلاب منصب داری کے خلاف بورژوا کا انقلاب ہے جس کا اظہار اس کے نزدیک خصوصاً فرانسیسی انقلاب میں ہوا۔ آنے والا انقلاب بورژوا کے خلاف مزدوروں یا بے مایگان کا انقلاب ہے جس سے اشتراکی دولت کا قیام عمل میں آئے گا۔ تاریخ کی ساری رو اس کے نزدیک ایک لازمی چیز ہے بطور

اس نتیجہ کے جو مادی اسباب وجود انسانی پر اثر ڈال کر پیدا کرتے ہیں۔ یہ اشتراکی انقلاب کی تلقین اتنی نہیں کرتا جتنی اس کی پیش گوئی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نزدیک یہ سود بخش ہوگا، لیکن اسے زیادہ تر یہ بات ثابت کرنے سے سروکار ہے کہ یہ لازماً واقع ہوگا۔ یہ جو سرمایہ داری کے نظام کی برائیاں واضح کرتا ہے اس میں بھی یہی احساس لزوم نمایاں ہے۔ یہ جن مظالم کا مجرم سرمایہ داروں کو بتاتا ہے اس پر انہیں الزام نہیں دیتا، وہ تو صرف یہ بتاتا ہے کہ جبتک زمین اور سرمایہ پر ملکیت شخصی قایم رہے گی سرمایہ دار ایک لزوم کے ماتحت مجبور ہے کہ بے رحمی سے پیش آئے۔ لیکن انکا یہ ظلم ہمیشہ جاری نہ رہے گا، کیونکہ یہ خود وہ قوتیں پیدا کرتا ہے جو آخر میں اسے تہ و بالا کر دیں گی۔

۲ ۔ اجتماع سرمایہ کا قانون :۔ مارکس نے یہ بات بتائی کہ سرمایہ داری کاروبار دن بدن بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ اس نے پہلے سے آزاد مقابلہ کی جگہ بڑے بڑے ٹرسٹوں کو پڑکرتے دیکھ لیا تھا اور پیش گوئی کر دی تھی کہ سرمایہ داری کاروبار کی تعداد اسی نسبت سے کم ہوتی جائیگی جس نسبت سے انفرادی کاروبار کی وسعت میں اضافہ ہوگا۔ اس کا گمان تھا کہ اس عمل سے نہ صرف کاروبار کی تعداد بلکہ خود سرمایہ داروں کی تعداد میں بھی تخفیف ہوگی۔ بلکہ اس کے بیان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے اس کے نزدیک ایک کاروبار کا مالک ایک شخص ہو۔ لہذا وہ سمجھتا تھا کہ سرمایہ داروں کی صفوں سے آدمی برابر نکل نکل کر بے مایہ مزدوروں کے گروہ میں شامل ہوتے رہیں گے اور جہانتک تعداد کا تعلق ہے ہوتے ہوتے سرمایہ دار دن بدن کمزور ہوتے جائیں گے۔ اس نے یہ اصول صرف صنعت ہی پر نہیں بلکہ زراعت پر بھی عائد کیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ زمینداروں کے علاقے روز بروز بڑھتے جائیں گے اور ان کی تعداد دن بدن گھٹتی جائے گی۔ یہ صورت حالات روز بروز نظام سرمایہ داری کے عیوب اور بے انصافیوں کو زیادہ روشن

طریقہ سے پیش کرے گی اور اس طرح مخالف قوتوں کو دن بدن زیادہ ابھارے گی۔
معاشی طبقوں کی جنگ :۔ مارکس مزدور اور سرمایہ دار کو ایک گہرے تضاد کی صورت میں تصور کرتا ہے۔ اس کے خیال میں ہر آدمی یا تو کلیتہً ایک ہے یا کلیتہً دوسرا اور اگر اب نہیں تو عنقریب ہو جائے گا۔ مزدور سے جس کے پاس کچھ نہیں سرمایہ دار جس کے پاس سب کچھ ہے بیجا فائدہ اٹھاتا ہے۔ نظام سرمایہ داری اپنے کو جوں جوں پھیلاتا ہے اور اس کی اصلیت جوں جوں صاف ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے بورژوا اور بے مایہ مزدور کی مخالفت زیادہ بین ہوتی جاتی ہے۔ ان دونوں طبقوں کے اغراض چونکہ مخالف ہیں اس لئے یہ باہمی جنگ پر مجبور ہوتے ہیں جس سے اقتدار سرمایہ داری میں اندرونی انتشار کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مزدور رفتہ رفتہ اپنی ذات سے بیجا فائدہ اٹھانے والوں کے خلاف متحد ہونا سیکھ لیتے ہیں، پہلے تو مقامی حیثیت سے پھر قومی اور آخر کار بین الاقوامی طور پر۔ جب یہ بین الاقوامی طور پر متحد ہونا سیکھ جائیں گے تو انکی فتح لازمی ہے۔ اب یہ حکم نافذ کر دیں گے کہ ساری زمین اور سرمایہ مشترک ملک ہو، بیجا فائدہ اٹھانے کا انسداد ہو جائے گا، مالکان دولت کا ظلم اب ممکن نہ رہے گا، اب جماعت کی تقسیم مختلف طبقوں میں باقی نہ رہے گی، اور سب آدمی آزاد ہو جائیں گے۔
یہ سارے خیالات اشتراکی اعلان ہی میں موجود ہیں جو نہایت حیرت انگیز قوت اور تاثیر کی تصنیف ہے جس میں نہایت جامع، اختصار کے ساتھ دنیا کی عظیم الشان قوتیں، انکا معرکۂ جنگ اور اسکا اٹل نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اشتراکیت کے نشوونما میں اس درجہ اہمیت رکھتی ہے اور جن مسائل کو بعد میں ''سرمایہ'' کے اندر زیادہ تفصیل اور بہت ثقالت کے ساتھ بیان کیا گیا ان کا اسقدر عمدہ بیان اس میں موجود ہے کہ اس کے خاص خاص حصوں کا علم ہر اس شخص کے لئے لازمی ہے جو چاہتا ہے کہ اس اثر و تسلط کو سمجھے جو مارکسی اشتراک

نے مزدور طبقہ کے قائدین میں سے ایک بڑی تعداد کے ذہن اور تخیل پر حاصل کرلیا ہے۔

یہ یوں شروع ہوتا ہے: "یورپ کے سر پر ایک آسیب سوار ہے، اشتراک کا آسیب قدیم یورپ کی تمام قوتیں اس آسیب کو اتارنے کے لئے باہم ایک ائتلاف مقدس میں شامل ہوئی ہیں۔ پوپ اور زار، میٹرنک اور گیزو، فرانسیسی انتہاپسند اور جرمن پولیس کے جاسوس۔ وہ کونسا مخالف فریق ہے جسے اس کے بااقتدار حریفوں نے اشتراکی کہہ کر فضیحت نہ کیا ہو؟ وہ فریق مخالف کہاں ہو جس نے خود اپنے گروہ کے زیادہ انتہاپسند فریقوں کو نیز اپنے قدامت پسند حریفوں کو اشتراکی ہونے کی ملامت نہ کی ہو؟"

معاشی گروہوں کی جنگ کوئی نئی بات نہیں: "ساری موجود جماعت کی تاریخ طبقات معاشی کی کشمکش کی تاریخ ہے" اس کشاکش میں معرکہ "ہر مرتبہ یا ہیئت اجتماعی کی ایک انقلابی ترتیب نو کی صورت میں ختم ہوا یا جنگ آزما طبقوں کی یکساں تباہی میں"

"ہمارے عہد نے، جو بورژوا طبقہ کا عہد ہے، اس سماجی جنگ کو سادہ کر دیا ہے۔ ہیئت اجتماعی بہ حیثیت کلی روز بروز دو بڑے مقابل لشکروں میں منقسم ہوتی جا رہی ہے، دو بڑے طبقوں میں جو بلا واسطہ ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں: یعنی بورژوا (سرمایہ دار) اور بے مایہ مزدور" اس کے بعد منصب داری کے زوال کی تاریخ آتی ہے جس کے سلسلہ میں بورژوا کا بہ حیثیت انقلابی قوت کے بیان آتا ہے "تاریخ میں بورژوا نے نہایت انقلابی حصہ لیا ہے" اس ناجائز فائدہ اٹھانے کے بجائے جو مذہبی اور سیاسی خرابیوں کے پردہ میں ہوتا ہے اس نے کھلے بندوں، بے حیائی سے، براہ راست اور وحشیانہ فائدہ اٹھانا شروع

کر دیا ہو" اپنی پیداوار کے لیۓ روز افزوں بازار کی ضرورت بورژوا کو سارے
کرۂ ارض پر لیۓ پھرتی ہے" سو سال سے بھی کم عرصہ کے اقتدار میں بورژوا طبقہ
نے اس سے زیادہ وسیع اور عظیم پیدائشی قوتیں پیدا کر دیں جتنی تمام سابقہ نسلوں
نے مل کر نہ کی تھیں "منصب داری تعلقات اب زنجیریں تھیں، " انکا توڑنا
ضروری تھا، چنانچہ یہ توڑ دی گئیں " اور ایسی ہی ایک تحریک ہماری آنکھوں
کے سامنے بھی جاری ہو" "جن ہتھیاروں سے بورژوا طبقے نے منصب داری
کے قصر کو منہدم کیا تھا وہی اب خود اس کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔ لیکن
بورژوا طبقہ نے یہی نہیں کہ وہ ہتھیار تیار کر دئے ہیں جو اس کی موت کا باعث
ہوں گے بلکہ اس نے وہ آدمی بھی پیدا کر دئے ہیں جو یہ ہتھیار اٹھائیں گے یعنی
کارگذار طبقہ؛ بے مایہ مزدور۔

اس کے بعد مزدوروں کی ناداری کے اسباب پیش کئے گئے ہیں "ایک
کام کرنے والے (مزدور) کی پیدائش کا صرف تقریباً بالکل ان ذرائع گذر پر محدود
ہے جو اسے اپنے زندہ رکھنے اور اپنی نسل کو جاری رکھنے کے لئے درکار ہیں۔
لیکن کسی چیز کی قیمت، اور لہذا محنت کی قیمت بھی اس کے صرف پیدائش کے برابر
ہوتی ہو۔ لہذا جس نسبت سے کہ کام کی کراہیت بڑھتی ہے مزدوری گھٹتی ہے۔
یہی نہیں بلکہ جس نسبت سے کہ مشین کے استعمال اور تقسیم عمل میں اضافہ ہوتا ہو اس
نسبت سے مشقت کا بار بھی بڑھتا ہو"

"جدید صنعت نے شفیق استاد کی چھوٹی دوکان کو صنعتی سرمایہ دار
کے بڑے کارخانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ کارخانوں میں کھچا کھچ بھرے ہوئے
مزدوروں کے انبوہ سپاہیوں کی طرح منظم کر دئے گئے ہیں۔ صنعتی لشکر
کے سپاہیوں کی حیثیت سے یہ عہدیداروں اور حوالداروں کے ایک درجہ بدرجہ

مرتب نظام کے زیر حکم ہیں۔ یہ بورژوا طبقہ اور بورژوا ریاست ہی کے غلام نہیں بلکہ ہر دن ہر ساعت مشین کے غلام ہیں اور ان سب سے بڑھکر خود اپنے بورژوا کارخانہ دار کی ذات کے غلام۔ یہ استبداد جس قدر کھلے الفاظ میں منافع کو اپنا مقصد اور اپنی غایت ظاہر کرتا ہے اسی قدر چھچھورا، قابل نفرت اور تلخ ہوتا جاتا ہے"

اس کے بعد یہ اعلان ان طبقات معاشی کی باہمی جنگ کے بڑھنے کے طریقے بتاتا ہے "مزدور طبقہ نشو و نما کے کئی منازل سے گذرتا ہے۔ پیدائش کی گھڑی ہی سے بورژوا سے اس کی پیکار شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے پہل تو انفرادی حیثیت سے مزدور مقابلہ کرتے ہیں، پھر ایک کارخانے کے مزدور، پھر ایک صنعت کے کارگذار کسی مقام میں ان انفرادی سرمایہ داروں کے خلاف ہو جاتے ہیں جو براہ راست ان سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ بورژوا پیدائش دولت کے حالات کے خلاف حملہ کرنیکے بجائے خود آلات پیدائش کے دشمن بن جاتے ہیں۔

اس منزل میں مزدور ابھی سارے ملک میں پھیلے ہوئے اشخاص کا ایک بے ربط مجموعہ ہیں اور باہمی مقابلہ کے باعث منتشر۔ اگر یہ کہیں زیادہ منضبط جماعتوں میں متحد ہوتے ہیں تو یہ خود انکے شعوری اتحاد کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ بورژوا طبقہ کے اتحاد کا، جو خود اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے سارے مزدور پیشہ طبقہ کو حرکت میں لانے پر مجبور ہوتا ہے اور ابھی کچھ زمانہ تک انہیں حرکت دینے کی قوت بھی رکھتا ہے،،

انفرادی مزدور اور انفرادی سرمایہ دار کا تصادم روز بروز دو معاشی طبقوں کے تصادم کی حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس پر مزدور بورژوا کے خلاف اپنی جمعیتیں بنانا شروع کرتے ہیں (اتحاد ہائے صنعتی) اجرت کا نرخ اونچا

رکھنے کے لئے یہ باہم ملتے ہیں، اپنی ہنگامی بغاوتوں کے لئے پہلے سے انتظام کرنے کی غرض سے یہ مستقل انجمنیں بناتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ مقابلہ بلوؤں کی شکل اختیار کرتا ہے کبھی کبھی مزدور فتحمند ہوتے ہیں، لیکن محض عارضی طور پر۔ انکے معرکوں کا اصلی پھل انکے فوری نتیجے میں نہیں ہوتا بلکہ مزدوروں کے روز بروز وسعت پذیر اتحاد میں۔ اس اتحاد میں ان ترقی یافتہ ذرائع آمدورفت سے مدد ملتی ہے جو موجودہ صنعت نے پیدا کر دیے ہیں اور جو مختلف مقامات کے مزدوروں میں باہم تعلق پیدا کرا دیتے ہیں۔ متعدد مقامی معرکوں کو جنکی نوعیت ایک ہی تھی مرکزی حیثیت سے مجتمع کر کے معاشی طبقوں کی ایک قومی جنگ بنانے کے لئے اس تعلق کی ضرورت تھی لیکن معاشی طبقوں کی ہر جنگ سیاسی جنگ ہے۔ اور جس اتحاد کے پیدا کرنے کے لئے قرون وسطےٰ کے شہریوں کو اپنی خراب سڑکوں کے باعث صدیاں درکار تھیں وہ ریلوں کا بھلا ہو موجودہ مزدور طبقہ چند سال میں حاصل کر لیتا ہے۔ مزدوروں کی ایک معاشی طبقے میں اور لہذا ایک سیاسی فریق (پارٹی) کی شکل میں تنظیم برابر اس مقابلہ کی وجہ سے بکھر جاتی ہے جو خود مزدوروں میں باہم موجود ہے۔ لیکن یہ پھر اٹھتی ہے اور پہلے سے مضبوط تر، قوی تر، پائندہ تر ہو کر بورژوا طبقہ میں جو باہمی مخالفتیں ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر یہ مزدوروں کے بعض مخصوص اغراض کو قانوناً تسلیم کرا لیتی ہے۔"

"بے مایہ مزدور طبقے" میں عام طور پر پرانے اجتماعی حالات عملاً مٹ ہی چکتے ہیں۔ مزدور بے املاک ہوتا ہے، اپنی بیوی بچوں سے اس کے جو تعلقات ہوتے ہیں ان میں اور بورژوا خاندانی تعلقات میں کوئی چیز مشترک باقی نہیں رہتی۔ موجودہ صنعتی محنت نے سرمایہ کی محکومیت، جو انگلستان اور فرانس، امریکہ اور جرمنی سب جگہ یکساں ہے اسے سیرت و خصائل قومی کے ہر اثر

سے عاری کر دیا ہے۔ قانون، اخلاق، مذہب اس کے لئے بس بورژوا تعصبات ہیں جن کی آڑ میں اتنے ہی بورژوا اغراض پوشیدہ ہیں۔ سارے گذشتہ طبقے جو غالب آئے انہوں نے اپنی حاصل شدہ حیثیت کو اور مضبوط کرنے کے لئے ساری جماعت کو اپنی شرائط تملیک کا پابند بنایا۔ مزدور ہیئت اجتماعی کی پیدائشی قوتوں پر کسی طرح قابض نہیں ہو سکتے۔ سوائے اس کے کہ اپنے سابقہ طریق تملیک اور لہٰذا ہر دوسرے سابقہ طریق تملیک کو مٹا دیں۔ انکا اپنا تو کچھ ہے نہیں جسے یہ بچائیں اور محفوظ کریں انکا مقصد ہے ملکیت شخصی کی تمام سابقہ حفاظتوں اور ضمانتوں کو تباہ کر دینا۔ تمام سابقہ تاریخی تحریکیں اقلیت کی تحریکیں تھیں یا اقلیت کے اغراض کے لئے تھیں۔ مزدوروں کی تحریک بہت بڑی اکثریت کی شعوری اور خود مختار تحریک ہے اور اسی بڑی اکثریت کے اغراض کے لئے۔ مزدوروں کا طبقہ جو موجودہ جماعت کی سب سے نیچی تہ ہے اس وقت تک نہ حرکت کر سکتا ہے نہ اپنے کو ابھار سکتا ہے جب تک کہ دفتری ہیئت اجتماعی کی ساری کی ساری اوپر کی تہیں پرزہ پرزہ ہو کر فضا میں نہ اڑ جائیں۔"

مارکس کہتا ہے کہ اشتراکی سارے مزدور طبقہ کے ساتھ ہیں۔ یہ بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں وہ اشتراکیوں پر ایک الزام یہ اور لگایا جاتا ہے کہ یہ ملکوں اور قوموں کے مٹانے کے آرزومند ہیں۔ مزدور کا کوئی ملک نہیں۔ ہم ان سے وہ چیز نہیں چھین سکتے جو وہ رکھتے ہی نہیں۔"

اشتراکیوں کا سب سے پہلا مقصد مزدوروں کے ہاتھوں سیاسی قوت کا حصول ہے وہ اشتراکیوں کا نظریہ ایک جملہ میں بند کیا جا سکتا ہے: ملکیت شخصی کا مٹانا۔"

اس قسم کے الزامات کے جواب میں کہ اشتراک عیسائیت کا مخالف ہے تاریخ

کی مادی تشریح استعمال کی گئی ہے" اشتراک کے خلاف مذہبی، فلسفیانہ یا عموماً عینی نقطہ نظر سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ زیادہ گہری تحقیق کے مستحق نہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے کیا کوئی گہرا وجدان درکار ہے کہ انسان کے خیالات آرار، اور تصورات مختصراً انسان کا شعور ہر اس تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے جو اس کے وجود مادی کی کیفیات، اس کے معاشرتی تعلقات اور اس کی جماعتی زندگی میں پیدا ہو؟"

ریاست کی طرف "اعلان" کا رویہ ہر وہ بالکل آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ "جدید ریاست کی نظامیہ بس تمام بورژوا طبقہ کے معاملات مشترکہ کے انتظام کے لئے ایک کمیٹی ہے"، تاہم مزدور طبقہ کا پہلا قدم ریاست میں حصول اقتدار ہونا چاہئے۔ "ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مزدور طبقہ کے انقلاب میں پہلا قدم یہ ہے کہ مزدوروں کو حکمراں طبقہ بنا دے، جمہوریت کا معرکہ سر کرے۔ مزدور طبقہ اپنے سیاسی اقتدار کو اس غرض کے لئے استعمال کرے گا کہ رفتہ رفتہ بورژوا طبقہ سے سارا سرمایہ چھین لے اور تمام آلات پیدائش دولت کو مرکزی حیثیت سے ریاست کے ہاتھ میں جمع کر دے یعنی بطور طبقہ حکمراں منظم مزدوروں کے ہاتھ میں۔ اور پیدائشی قوتوں کے مجموعہ کو جس قدر تیزی سے ممکن ہو بڑھائے۔"

اعلان آگے چل کر فوری اصلاحات کا ایک پروگرام پیش کرتا ہے جس سے اول اول تو موجودہ ریاست کی قوت میں بہت اضافہ ہوگا لیکن یہ کہا گیا ہے کہ جب اشتراکی انقلاب تکمیل کو پہنچ جائے گا تو ریاست کا وجود جس حیثیت سے ہم اسے جانتے ہیں ختم ہو جائے گا۔ جیسے انگلس ایک دوسرے موقع پر کہتا ہے کہ جب مزدور طبقہ ریاست کی قوت اپنے ہاتھ میں لے لیگا "تو ساتھ ہی معاشی طبقوں

کے تمام اختلافات اور خصومتوں کا خاتمہ بھی کردیگا چنانچہ ریاست کا وجود بھی بہ حیثیت ریاست کے ختم ہوجائے گا۔" اس طرح اگرچہ واقعۃً مارکس اور انگلس کی تجاویز کا نتیجہ ریاستی اشتراک ہوتا ہم ان پر ریاست کو عظمت دینے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔

"اعلان" ساری دنیا کے مزدوروں کو اشتراک حمایت کے لئے کھڑے ہونے کی ایک اپیل پر ختم ہوتا ہے "اشتراکی اپنے خیالات اور مقاصد کو چھپانے کو حقیر جانتے ہیں۔ یہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ انکے مقاصد صرف اس طرح حاصل ہوسکتے ہیں کہ تمام موجودہ جماعتی حالات کو بہ جبر تباہ کردیا جائے۔ حکمراں طبقے اشترا کی انقلاب کے ڈر سے کانپیں! مزدوروں کے پاس سوائے اپنی زنجیروں کے اور کچھ کھونے کو نہیں۔ فتح کرنے کو انکے لئے ایک عالم ہے۔ تمام ممالک کے مزدورو متحد ہو جاؤ!"

اس اشتراکی "اعلان" کی اشاعت کے بعد جلد ہی روس کے علاوہ براعظم یورپ کے تمام بڑے ملکوں میں انقلاب بپا ہوا لیکن سوائے شروع شروع میں فرانس کے یہ انقلاب نہ معاشی تھا نہ بین الاقوامی۔ ہر دوسری جگہ اسے قومیت کے خیالات نے ابھارا تھا۔ چنانچہ وقتی طور پر خوف زدہ ہونے کے بعد دنیا کے حکمرانوں نے ان مخالفتوں کو ابھار کر پھر اقتدار حاصل کرلیا جو قومی خیالات میں لازمًا موجود ہوتی ہیں۔ اور ایک بہت مختصر سی ظفرمندی کے بعد یہ انقلاب ہر جگہ جنگ اور ردعمل کی شکل میں ختم ہوا۔ اشتراکی "اعلان" کے خیالات شائع ہوگئے قبل اس کے کہ دنیا انکے لئے تیار ہوتی۔ لیکن اس کے مصنفوں نے ہر ملک میں اس اشتراکی تحریک کی ابتدا اپنی آنکھوں سے دیکھ لی جو روزافزوں قوت کے ساتھ آگے بڑھتی رہی ہے، حکومتوں پر روز بروز زیادہ اثر ڈال رہی ہے، جو روسی

انقلاب پر حاوی ہے شاید وہ دن دور نہیں کہ یہ تحریک وہ بین الاقوامی فتح حاصل کرنے کا اہل اپنے کو ثابت کرسکے جس کی طرف اعلان کے آخری جملے دنیا کے مزدوروں کو دعوت دیتے ہیں۔

مارکس کے شاہکار "سرمایہ" نے "اشتراکی اعلان" کے قضیوں میں حجم اور مواد کا اضافہ کیا۔ اس نے "قدر زاید" کا نظریہ پیش کیا جو سرمایہ داری فائدہ بجائے واقعی کل پرزوں کی تشریح کا مدعی ہے۔ یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے اور ہم خالص نظریات میں اسے مشکل ہی سے ایک اضافہ تسلیم کرسکتے ہیں۔ بلکہ یہ زیادہ صحیح ہوگا کہ ہم اسے تجریدی الفاظ میں مارکس کی اس نفرت کا ترجمہ سمجھیں جو اسے اس نظام سے تھی جو انسانی زندگیوں سے مادی دولت بناتا ہے۔ اور اسی معنی میں اس کے مداحوں نے اسے سمجھا ہے نہ کہ بے لوث تحلیل علمی کی حیثیت سے۔ نظریہ قدر زاید کی تنقیدی تحقیق میں خالص معاشی نظریہ کی بہت سی دشوار اور مجرد بحثیں آجائیں گی اور اشتراک کی علمی صحت یا عدم صحت پر اسکا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوگا۔ اس لئے موجودہ کتاب کی حدود میں اس کا شامل کرنا نا ممکن معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اس کتاب (سرمایہ) کے بہترین حصے وہ ہیں جو معاشی واقعات سے بحث کرتے ہیں اسلئے کہ مارکس انکا نہایت ہمہ گیر علم رکھتا تھا۔ انہیں واقعات سے اسے توقع تھی کہ وہ اپنے چیلوں میں وہ پائدار اور غیر فانی نفرت پھونک سکے گا جو انہیں مرتے دم تک معاشی طبقوں کی جنگ میں سپاہی بنائے رکھے گی۔ اس نے جو واقعات جمع کئے ہیں وہ ایسے ہیں جو چین کی زندگی بسر کرنیوالے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت کے لئے عملاً نا معلوم ہیں۔ یہ بڑے ہیبت خیز واقعات ہیں اور جو معاشی نظام انہیں پیدا کرتا ہے اسکے متعلق تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ نہایت مہیب ہے۔ اس کے انتخاب واقعات کی چند مثالیں بہت سے اشتراکیوں کی تلخی کی تشریح کا کام دیں گی:۔

۱۴ار جنوری ۱۸۶۰ء کو ناٹنگھم کے مجلس گھر میں مسٹر بروٹن چارلٹن مجسٹریٹ ضلع نے ایک جلسہ کے صدر کی حیثیت سے بیان کیا کہ "دیس کی صنعت سے آبادی کے جس حصے کا تعلق ہے اس میں ناداری و مصیبت کا عالم یہ ہے کہ حکومت کے دوسرے حصوں میں کیا ساری دنیا میں ایسی حالت نہ ملیگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نو نو دس دس برس کے بچے اپنے میلے کچیلے بستروں سے صبح ۲، ۳ یا ۴ بجے باہر گھسیٹ لئے جاتے ہیں اور انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ محض گزارہ پر رات کے ۱۰، ۱۱ یا ۱۲ بجے تک کام کریں ۔ انکے ہاتھ پاؤں گھسے جاتے ہیں، انکی ہڈیاں پگھلی جاتی ہیں ۔ انکے چہرے سفید پڑ جاتے ہیں، اور انکی انسانیت اترتے اترتے مطلق پتھر کنکر کے سے جمود کی ایسی سطح پر پہونچی جاتی ہے جس کا تصور بھی تکلیف دہ ہے "

لندن کے ایک جوری کے سامنے تین آدمی کھڑے ہیں ۔ ایک گارڈ، ایک انجن چلانیوالا، ایک جھنڈی دکھلانے والا ۔ ایک مہیب ریل کے حادثہ نے سیکڑوں مسافروں کو دوسری دنیا میں پہنچا دیا ہے ۔ ملازموں کی غفلت اس حادثہ کا سبب ہے اور یہ بیک آواز جیوری کے سامنے بیان کرتے ہیں کہ دس یا بارہ سال پہلے انکا کام روزانہ صرف ۸ گھنٹہ رہتا تھا ۔ پچھلے ۵ یا ۶ برس سے یہ بڑھکر ۱۴، ۱۸ اور ۲۰ گھنٹہ روزانہ تک ہوگیا ہے اور جب چھٹیاں منانے والوں کا زیادہ زور ہوتا ہے اور تفریح کی گاڑیاں چھوڑی جاتی ہیں تو انکا کام بلا وقفہ ۴۰ یا ۵۰ گھنٹہ تک چلتا ہے ۔ یہ معمولی آدمی ہیں جن یا دیو تو نہیں ہیں ۔ ایک نقطہ پر پہنچکر انکی محنت نے جواب دیدیا ۔ انپر جمود طاری ہوگیا ۔ انکا دماغ سوچنے سے معذور ہوگیا اور انکی آنکھیں دیکھنے سے ۔ ان سراپا عزدر، انگریز ارکان جوری

نے حکم لگایا کہ انہیں قتل انسانی کے جرم میں عدالت بالا کے سپرد کیا جائے اور اپنے حکم کے ساتھ ایک نرم تنبیہہ، میں بہ مقدس امید ظاہر کی کہ ریل کے سرمایہ دار اکابر آئندہ (قوت) محنت کی کافی مقدار خریدنے میں ذرا زیادہ فراخدل ہونگے اور اپنے ملازموں سے کام لینے میں ذرا زیادہ "اعتدال" زیادہ "نفس فراموشی" اور زیادہ "کفایت" سے کام لیں گے۔

جون ۱۸۶۳ء کے آخری ہفتہ میں لندن کے تمام روزانہ اخباروں نے "محض زیادتی کار سے موت" کے "سنسنی خیز" عنوان کے ماتحت میں ایک عبارت شائع کی۔ اسمیں میری این وا‌لکلے نامی ایک بیس سالہ درزن کی موت کا ذکر تھا جو ایک نہایت معزز لباس سازی کے کارخانے میں ملازم تھی جس پر ایلیزا کا خوش آئند نام رکھنے والی ایک خاتون متصرف تھیں۔ یہ لڑکی اوسطاً ½ ۱۶ گھنٹے، اور خاص بکری کے موسم میں بلا وقفہ ۳۰ گھنٹے کام کرتی تھی۔ اور اس کی رو بہ زوال قوت کو وقتاً فوقتاً شیری یا پورٹ شراب یا کافی کی فراہمی سے دوبارہ زندہ کیا جاتا تھا۔ اس وقت بکری کا موسم زوروں پر تھا۔ نووارد شہزادی ویلز کی آمد کی تقریب میں ناچ ہونے والے تھے اور اسمیں جو معزز خواتین مدعو تھیں انکے لئے بال مارتے میں شاندار لباس تیار کرنے تھے۔ میری این واکلے نے اور ۶۰ لڑکیوں کے ساتھ بلا وقفہ ½ ۲۶ گھنٹے کام کیا۔ ایک کمرہ میں ۳۰ لڑکیاں کام کرتی تھیں جس میں انکے لئے جتنے مکعب فٹ ہوا درکار تھی اس کی صرف ایک چوتھائی پہنچ سکتی تھی۔ رات میں یہ دو دو ملکر ایک ایسی کوٹھری میں سوتیں جہاں دم گھٹتا تھا اور جو کمرہ خواب کو تختوں سے تقسیم کرکے بنائی گئی تھیں اور یہ کارخانہ لندن کے بہترین لباس سازی کے کارخانوں میں سے تھا۔

میری این واکلے جمعہ کو بیمار پڑی، اتوار کو مرگئی، اور ایلیزا خاتون کو بڑا تعجب ہوا کہ ہاتھ میں جو کام لیا تھا اسے ختم کئے بغیر! ڈاکٹر مسٹر کیز نے جو بستر مرگ پر بہت دیر میں بلائے گئے تھے، جوری کے سامنے شہادت دی کہ "میری این واکلے آدمیوں سے بالکل بھرے ہوئے کمرہ میں بہت دیر تک کام کرنے اور ایسی کوٹھری میں سونے کیوجہ سے مرگئی جو بہت تنگ تھی اور جس میں ہوا کے جانے کا انتظام بہت خراب تھا" ڈاکٹر صاحب کو آداب حسنہ کی تعلیم دینے کے لئے جوری نے فیصلہ کیا کہ "متوفیہ مرگی کے عارضہ وغیرہ وغیرہ"۔ آزادی تجارت کے حامی کابدن اور برائٹ کا پرچہ مارننگ اسٹار چلا اٹھا کہ "ہمارے سفید غلام جو کثرت مشقت سے قبر کا منہ دیکھتے ہیں اکثر خاموشی سے گھلتے رہتے ہیں اور بالآخر مرجاتے ہیں[1]"۔

ایڈورڈ ششم: اسکی حکومت کے پہلے سال (۱۵۴۷ء) میں ایک قانون نافذ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کام کرنے سے انکار کرے تو یہ اس شخص کا غلام قرار دیدیا جائے جس نے اسپر کام چوری کا الزام لگایا ہے۔ آقا اپنے غلام کو کھانے کے لئے روٹی اور پانی، ہلکی سی یخنی اور ایسا بچا کھچا گوشت دے جو اس کے خیال میں اس کے لئے موزوں ہو۔ آقا کو حق ہے کہ جس کام پر چاہے اسے مجبور کرے چاہے یہ کام کتنا ہی نفرت انگیز کیوں نہ ہو۔ اور یہ چابک اور زنجیر کی مدد سے۔ اگر غلام دو ہفتے غائب رہے تو یہ ساری عمر کے لئے غلام ہو جائے گا اور اس کی پیشانی اور پشت پر حرف S داغدیا جائے گا۔ اگر یہ تین مرتبہ بھاگ جائے تو مستحق موت مجرم کی حیثیت سے اسے پھانسی دی جائے۔ آقا اسے بیع کر سکتا ہے۔ ورثہ میں دے سکتا ہے، غلام

---

(۱) جلد اول صفحہ ۲۳۹-۲۴۰

کی حیثیت سے کرایہ پر دے سکتا ہے، بالکل جیسے کسی ذاتی چیز یا مویشی کو اگر غلام اپنے آقا کے خلاف کچھ کرنیکی کوشش کریں تو بھی انہیں سزا موت دیجائے منصفان امن کو جب خبر پہنچے تو چاہئے کہ ان بدمعاشوں کو گھیر کر انکا تعاقب کرے۔ اگر کوئی آوارہ گرد کہیں ۳ دن تک بیکار پھرتا پکڑا جائے اسے اس کے مقام ولادت پر لیجانا چاہئے، لال دہکتے ہوئے لوہے سے اس کے سینہ پر حرف V داغنا چاہئے اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر سڑک کوٹنے یا کسی اور کام پر لگا دینا چاہئے۔ اگر یہ آوارہ گرد غلط مقام[1] پیدائش بتائے تو یہ ساری عمر کے لئے اس مقام کا غلام بنا دیا جائے یعنی اس کے باشندوں اور اس کی جمعیت بلدی کا، اور اس کے جسم پر حرف S کا داغ دیدیا جائے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ آوارہ گردوں کے بچوں کو مددگار کی طرح لیجائیں، نوجوانوں کو ۲۴ سال کی عمر تک اور لڑکیوں کو ۲۰ سال تک، اگر یہ بھاگیں تو اس عمر تک اپنے استادوں کے غلام رہیں، ان آقاؤں کو اختیار رہے کہ اگر چاہیں تو انہیں زنجیروں میں جکڑیں کوڑوں سے ماریں۔ ہر آقا اپنے غلام کے گردن، بازو یا پیر میں ایک لوہے کا کڑا ڈالے جس سے اسے آسانی سے پہچانا جاسکے اور بھاگ نہ پائے۔ اس قانون کا آخری حصہ یہ ہے کہ بعض غریب لوگ ایسے مقامات یا ایسے اشخاص کے ملازم بنائے جاسکتے ہیں جو انہیں کھانا پینا دینے کو راضی ہوں اور انکے لئے کام فراہم کریں۔ حلقہ کے غلاموں کی یہ قسم انگلستان میں انیسویں صدی میں عرصہ تک "چوکیداروں" کے نام سے قائم رہی"

اسی نوع کے واقعات کا صفحہ بہ صفحہ اور باب بہ باب، جن میں سے ہر ایک اس تقدیری نظریہ کی مثال میں پیش کیا گیا ہے جس کے یقینی دلائل سے ثابت کرنے کا

---

(۱) جلد اول صفحہ ۵۸ء۔ ۵۹ء

مارکس مدعی ہے، کیسے ہوسکتا ہے کہ ہر جذبات رکھنے والے مزدور پیشہ پڑھنے والے کو آگ بگولا نہ کردے اور سرمایہ کے ہر مالک کو جس میں شرافت اور انصاف یک قلم مفقود ہی نہ ہوگیا ہو ناقابل برداشت شرم سے پانی پانی نہ کردے۔

کتاب کے تقریباً ختم پر ایک نہایت مختصر سے باب میں "جو اجتماع سرمایہ کا تاریخی رجحان" کے زیر عنوان ہے، مارکس ایک لمحہ کے لئے اس امید کی ذرا سی جھلک آنے دیتا ہے جو موجودہ مصیبت سے پرے کہیں بہت دور ہے۔

"جب تبدیل ہیئت کا یہ عمل قدیم جماعت کو سرتا پا پراگندہ کر چکے گا، جب کام کرنیوالے بے مایہ مزدوروں میں مبدل ہو جائیں گے اور ذرائع محنت سرمایہ میں، جب سرمایہ داری طریقہ پیدائش دولت خود اپنے پیروں پر کھڑا ہوگا، تو محنت کا مزید خدمت جماعت میں صرف ہوتا، زمین اور دیگر ذرائع پیدائش کا جماعت کے فوائد کے لئے اور لہذا مشترک ذرائع پیدائش کی حیثیت سے استعمال ہونا، نیز شخصی ملکیت رکھنے والوں کی مزید بے دخلی، یہ سب چیزیں ایک دوسری شکل اختیار کریں گی اب جس کی بے دخلی ہوگی وہ مزدور نہیں جو خود اپنے لئے کام کرتا ہے بلکہ سرمایہ دار ہوگا جو بہت سے مزدوروں سے بیجا فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ بے دخلی خود سرمایہ داری پیدائش دولت کے مضمر بالذات قوانین سے عمل میں آتی ہے یعنی سرمایہ کے اجتماع مرکزی سے۔ ایک سرمایہ دار ہمیشہ کئی کو مارتا ہے۔ اس مرکزیت یا چند کے ہاتھوں کئی کی بے دخلی کے ساتھ ساتھ روز افزوں طور پر عمل محنت کی تعاونی شکل نشو ونما پاتی ہے، نیز صنعت میں حکمت کا بالارادہ استعمال زمین کی باقاعدہ کاشت، آلات محنت کی تبدیلی ایسی شکلوں میں جو صرف مشترک حیثیت سے قابل استعمال ہیں۔ سارے ذرائع پیدائش کے استعمال میں اس طرح کفایت کہ انہیں صرف متحدہ اور جماعتی محنت کے ذرائع کے طور پر استعمال کیا جائے، تمام اقوام کا ایک دنیا کے بازار میں ایک دوسرے سے خلط ملط۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اقتدار

سرمایہ داری کی بین الاقوامی نوعیت۔ جیسے جیسے اکابرین سرمایہ کی تعداد گھٹتی ہے اور یہ اس تبدیلی کے تمام فوائد کو غصب کرکے اپنے اجارہ میں لیتے جاتے ہیں اسکے ساتھ ہی ساتھ فلاکت، ظلم، غلامی، ذلت اور فائدہ بیجا کا انبار بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مزدور طبقہ کی بغاوت بھی بڑھتی ہے، ایک طبقہ جس کی تعداد روز بڑھتی جاتی ہے اور جو خود سرمایہ داری اور پیدائش دولت کی ضرورتوں کے اثر سے منضبط، متحد اور منظم ہے۔ سرمایہ کا اجارہ طریقہ پیدائش کے لئے زنجیر بن جاتا ہے، اس طرز پیدائش کے لئے جو اسی سے ابھرا تھا اور جس نے اسی کے ساتھ اور اسی کے ماتحت ترقی پائی تھی۔ ذرائع پیدائش کی مرکزیت اور محنت کا جماعتی استعمال اب ایسے نقطہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ اس سرمایہ داری کے خول کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ چنانچہ خول پھٹتا ہے۔ سرمایہ داری ملکیت شخصی کی موت کا گھنٹا بجتا ہے۔ بے دخل کرنے والے بے دخل کئے جاتے ہیں۔"(۱)

بس صرف اسقدر۔ اس کے علاوہ شروع سے آخر تک مشکل ہی سے کوئی اور لفظ ہے جو اداسی کو دور کرے۔ اور پڑھنے والے کے دماغ پر اسی بیدردانہ دباؤ میں اس قوت کا بڑا حصہ مضمر ہے جو اس کتاب نے حاصل کی ہے۔

مارکس کی تصنیف سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول آیا تاریخی ارتقار کے جو قانون اس نے بتائے ہیں وہ صحیح ہیں؟ دوم، کیا اشتراک پسندیدہ چیز ہے؟ دوسرا سوال پہلے سے بالکل بے تعلق ہے۔ مارکس ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اشتراک کا آنا لازمی ہے، لیکن اس کی دلیل دینے سے اسے مشکل ہی سے کچھ سروکار نظر آتا ہے کہ جب یہ آئیگا تو اچھی چیز بھی ہوگا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ جب یہ آئے تو اچھی چیز ہو۔ چاہے مارکس کی تمام وہ دلیلیں غلط ہی ہوں جو اس نے اس کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ اسکا آنا

---

(۱) جلد اول صفحہ ۷۸۸ - ۷۸۹

لازمی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانہ نے مارکس کے نظریات میں سے بہتوں میں کمزوریاں ظاہر کی ہیں
دنیا کی ترقی اس کی پیش گوئی سے بیشک اتنی کافی شباہت رکھتی ہے کہ اسے نہایت غیر معمولی
دقت نظر کا آدمی ثابت کردے، لیکن اتنی مشابہ نہیں کہ سیاسی یا معاشی تاریخ کو اس کی پیشگوئی
کے بالکل مطابق کرنے کے لئے کافی ہو۔ قومیت کا جذبہ، گھٹنے کا کیا ذکر، اور بڑھ گیا ہے۔
اور اس پر وہ عالمگیر رجحانات فتح نہیں پاسکے ہیں جو مارکس نے نہایت ٹھیک طور پر مالیات
میں دیکھے تھے۔ اگرچہ بڑے کاروبار اور بڑے ہوگئے ہیں اور بہت بڑے رقبہ میں اجارہ
کی منزل پر پہنچ چکے ہیں تاہم ان میں حصہ داروں کی تعداد اسقدر کثیر ہے کہ ان افراد کی تعداد
جن کے اغراض نظام سرمایہ داری کے ساتھ وابستہ ہیں، برابر بڑھتی گئی ہے۔ علاوہ بریں
اگرچہ بڑے کارخانے زیادہ بڑے ہوگئے ہیں تاہم ساتھ ساتھ اوسط درجہ کے کارخانے بھی
تعداد میں بڑھتے رہے ہیں اسی اثنار میں مزدور جنہیں مارکس کے خیال کے مطابق محض گذارہ
کی اس سطح پر ہی رہنا چاہئے تھا جس پر وہ انیسویں صدی کے نصف اول میں انگلستان میں
تھے۔ انھوں نے بجائے اس کے دولت کی عام فراوانی سے فائدہ حاصل کیا ہے اگرچہ اس
درجہ نہیں جتنا کہ سرمایہ داروں نے۔ اجرت کا مفروضہ قانون آہنی جہانتک متمدن ممالک کی
محنت کا تعلق ہے، غلط ثابت ہوچکا ہے۔ اگر ہمیں آج سرمایہ دارانہ ظلم کی ایسی مثالیں
ڈھونڈنی ہوں جن سے مارکس کی کتاب بھری پڑی ہے تو ہمیں اپنے مواد کے اکثر حصے کے لئے
منطقہ حارہ کیطرف رجوع کرنا ہوگا جہاں ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے نیچی نسلوں کے انسان
موجود ہیں۔ پھر یہ کہ آج دنیائے محنت میں ہنرمند مزدور "رئیس" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسکے
لئے یہ ایک سوال ہے کہ وہ سرمایہ دار کے خلاف بے سیکھے مزدوروں سے یا ان کے
خلاف سرمایہ دار سے ملے۔ اکثر یہ خود ایک چھوٹا موٹا سرمایہ دار ہوتا ہے، اور اگر انفرادی
حیثیت سے یہ خود نہ بھی ہو تو اسکا "اتحاد صنعتی" یا اس کی "انجمن احباب" تو ظن غالب
ہے کہ ہوگی۔ لہذا معاشی طبقوں کی جنگ میں وہ شدت قائم نہیں رہی۔ بجائے اس پہلے

نادار مزدور اور ہمہ دار سرمایہ دار کے صریحی منطقی تضاد کے اب تو غریب اور امیر کے درمیان مدارج ہیں بیچ کی منزلیں ہیں۔ خود جرمنی میں جو ارتودکس مارکسیت کا گھر بن گیا تھا اور جس کی نہایت ترقی یافتہ اور طاقتور اشتراکی جمہوری پارٹی "سرمایہ" کے مسائل کو لفظی حیثیت کے علاوہ اور ہر طرح منزل من اللہ جانتی تھی خود وہاں جنگ سے قبل زمانہ میں تمام طبقوں کے اندر دولت کی بیحد فراوانی نے اشتراکیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے عقائد پر نظر ثانی کریں اور انقلابی رویہ کے بجائے ارتقائی رویہ اختیار کریں۔ ایک جرمن اشتراکی برنشٹائین نے جو عرصہ تک انگلستان میں مقیم تھا ایک "ترمیمی" تحریک کی ابتدا کی اور بالآخر اشتراکی پارٹی کے بڑے حصہ کو اپنا حامی بنا لیا۔ ارتودکس مارکسیت کے خلاف اس کی نکتہ چینی اس کی کتاب "ارتقائی اشتراک" میں پیش کی گئی ہے۔ اور تمام وسعت مذہب کے حامی مصنفین کیطرح برنشٹائین کا کام بھی زیادہ تر یہ ظاہر کرنا تھا کہ خود بانیان مذہب اپنے مذہب کے مسائل پر اس درجہ سختی سے قائم نہ تھے جتنا کہ انکے متبعین۔ مارکس اور انگلز کی تحریروں میں بہت کچھ چیزیں ہیں جو اس شدید ارتودکسی میں نہیں کھپتیں جو انکے تبعین میں پیدا ہوگئی تھی۔ علاوہ اس نکتہ چینی کے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں ان متبعین کے خلاف برنشٹائین کی تنقید انقلاب کے مقابلہ میں نفس ارتقائی اور تدریجی عمل کی حمایت پر مشتمل ہے۔ یہ مذہب حریت کی اس بیجا خصوصیت کے خلاف احتجاج کرتا ہے جو اشتراکیوں میں بہت عام ہو اور اس بین الاقوامیت کی دھار بھی کند کرتا ہے جو بلاشبہ مارکس کی تعلیم کا جزو ہے۔ یہ کہتا ہے کہ جہاں مزدور شہری بنا تو پھر وطن کا بھی پابند ہوجاتا ہے اور وہ اس قوم پرستی کی حمایت کرتا ہے جس کے متعلق جنگ نے ثابت کر دیا کہ یہ اشتراکی طبقوں میں عام ہے۔ یہ یہاں تک کہتا ہے کہ یورپی قوموں کو ممالک حارہ پر بوجہ اپنی اعلیٰ تہذیب کے حق حکومت حاصل ہو یہ تعلیم انقلابی امنگ کو مدھم کرتی اور اشتراکیوں کو لبرل فرقہ کا ایک بازوئے چپ بنا دیتی ہے۔ لیکن جنگ سے قبل مزدوروں کی روز افزوں مرفہ الحالی نے خیالات کی اس نشوونما

کو ناگزیر بنا دیا تھا۔ آیا جنگ اس بارے میں حالات بدلیگی اس کا جاننا فی الحال ناممکن ہے۔
برنسٹائین اس عاقلانہ قول پر اپنی تصنیف ختم کرتا ہے: "ہمیں مزدوروں کو اس طرح دیکھنا ہے جیسے کہ وہ واقعاً ہیں۔ اور یہ نہ تو اس درجہ عالمگیر طور پر نادار ہیں جیسا کہ اشتراکی اعلان میں بیان کیا گیا تھا، نہ تعصبات اور کمزوریوں سے ایسے پاک ہیں جیسا کہ انکے درباری ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں"

برنسٹائین مارکسی ارتودکسی کے اس زوال کا نمائندہ ہے جو اندر سے شروع ہوا ہے۔ سندکلیت کا اسپر باہر سے حملہ ہے یعنی ایک ایسے مذہب کے نقطہ نظر سے جو مارکس اور انگلز سے زیادہ بنیادی اور انقلابی ہونے کا مدعی ہے۔ مارکس کیطرف سندکلی رویہ کا پتہ سوریل کی چھوٹی سی کتاب "انتشار مارکسیت" اور اس کی بڑی تصنیف "افکار بابتہ تشدد" جس کا انگریزی ترجمہ بہ اجازت مصنف ٹ۔ا۔ ہیوم نے کیا ہے (مطبوعہ ۱۹۱۵ء ایلن واپون) برنسٹائین نے جہانتک مارکس پر نکتہ چینی کی ہے اسے بالاتفاق نقل کرنے کے بعد سوریل ایک دوسری قسم کی نکتہ چینی شروع کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے (اور یہ سچ بھی ہے) کہ مارکس کی نظری معاشیات مذہب منچسٹر سے بہت قریب ہے۔ اس نے اپنے شباب کے زمانہ کی ارتودکس معاشیات کو بہت سی ایسی باتوں میں تسلیم کر لیا ہے جو اب غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ سوریل کے نزدیک مارکس کی تعلیم میں واقعی اصلی چیز طبقات معاشی کی جنگ ہے۔ جو کوئی اسے زندہ رکھے وہ اشتراک کی روح کو ان لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ زندہ رکھ رہا ہے جو اشتراکی جمہوری ارتودکسی پر حرف بحرف اڑے ہوئے ہیں۔ اس جنگ طبقاتی کی بنیاد پر فرانسیسی سندکلیوں نے مارکس پر وہ تنقیدیں کی جو اس تنقید سے جس پر ہم ابھی تک غور کر رہے تھے بہت زیادہ گہری ہے۔ ارتقار تاریخی کے متعلق جہانتک امر واقعہ کا تعلق ہے مارکس کے خیالات میں تھوڑی بہت غلطی ہو سکتی تھی تاہم ممکن تھا کہ وہ سیاسی و معاشی نظام جو یہ پیدا کرنا چاہتا تھا اتنا ہی پسندیدہ ہوتا جتنا کہ اس کے متبع

فرض کرتے ہیں۔ لیکن سنڈکلیوں نے محض امر واقعہ کے بابتہ ہی مارکس کے خیالات پر نکتہ چینی نہیں کی بلکہ اس مقصد پر بھی جو اس کے پیش نظر ہے اور ان ذرائع کی عام نوعیت پر جو یہ تجویز کرتا ہے۔ مارکس کے خیالات نے ایسے زمانہ میں صورت اختیار کی تھی کہ ابھی جمہوریت کا وجود نہ تھا۔ اسی سال جب کتاب "سرمایہ" شائع ہوئی ہے انگلستان میں شہری مزدوروں کو پہلی مرتبہ حق رائے ملا اور شمالی جرمنی میں بسمارک نے عام حق انتخاب منظور کیا۔ فطری بات تھی کہ جمہوریت سے جو جو حاصل ہو سکتا ہے اس کے متعلق بڑی بڑی امیدیں باندھی جائیں۔ ارتودکس معاشیئن کیطرح مارکس کا بھی گمان تھا کہ انسان کی رائے کم و بیش ذاتی یا اپنے طبقہ کے معاشی اغراض سے بنتی ہے۔ سیاسی جمہوریت کے طویل علمی تجربہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ اس معاملہ میں احرار و اشتراکی دونوں کے مقابلہ میں دسرائیلی اور بسمارک فطرت انسانی کے بہتر جاننے والے تھے۔ یہ بات روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہے کہ ریاست پر ذریعہ حریت کی حیثیت سے اعتبار کیا جائے یا سیاسی فرقوں کو اس بات کے لئے کافی قوی آلہ تسلیم کیا جائے کہ وہ ریاست کو قوم کی خدمت پر مجبور کر سکیں۔ سوریل کہتا ہے کہ جدید ریاست "ذہنیئن کی ایک جماعت ہے جس کے ہاتھ میں کچھ مراعات ہیں اور ایسے ذرائع (جنہیں سیاسی کہا جاتا ہے) جن سے یہ ذہنیئن کے ان دوسرے گروہوں کے حملوں سے اپنے کو بچا سکے جو ملازمت عامہ کے فوائد حاصل کرنے کے مشتاق ہیں۔ ان ملازمتوں کو حاصل کرنیکے لئے سیاسی فرقے بنتے ہیں اور یہ خود ریاست سے مشابہ ہوتے ہیں "[1]

سنڈکلی آدمیوں کو فرقوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ پیشہ کے لحاظ سے منظم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بس یہی طبقات معاشی کی جنگ کا صحیح تصور اور سچا طریقہ ہے چنانچہ یہ پارلیمنٹ اور انتخابات کے ذریعہ ہر سیاسی عمل کی تحقیر کرتے ہیں۔ یہ جس کارروائی کو پیش

---

(۱) "انتشار مارکسیت" صفحہ ۵۳

کرتے ہیں وہ انقلابی سنڈیکیت اور اتحاد صنعتی کا براہ راست اور بلاواسطہ عمل ہے۔ سیاسی
عمل کے مقابلہ میں صنعتی (معاشی) عمل کا آوازۂ جنگ فرانسیسی سنڈکلیوں سے بہت دور
دور پہنچ گیا ہے۔ یہ امریکہ کی "دنیا کے صنعتی مزدوروں" کی تحریک میں پایا جاتا ہے،
اور برطانیہ کے "صنعتی اتحادیوں" اور گلڈ اشتراکیوں میں۔ اس کے حامی اکثر مارکس سے
مختلف مقصد بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ انکا عقیدہ ہے کہ جہاں ریاست ساری طاقت رکھتی
ہو فرد کے لئے کبھی کافی آزادی نہیں ہو سکتی چاہے یہ ریاست اشتراکی ریاست ہی کیوں
نہ ہو۔ ان میں سے بعض سرتاسر نراجی ہیں اور ریاست کو مطلقاً معدوم دیکھنا چاہتے ہیں،
دوسرے صرف اس کے اختیار میں تخفیف کرنا چاہتے ہیں۔ اس تحریک کی وجہ سے
مارکس کی جو مخالفت پہلے سے نراجی طرف سے موجود تھی وہ بہت قوی ہوگئی ہے۔ ہم
اگلے باب میں اسی مخالفت کی قدیم شکل سے بحث کریں گے۔

ہندوستان اور مسئلہ تعلیم

(اقتباس از ان ہیپی انڈیا مصنفہ لالہ لاجپت رائے آنجہانی)

یہ کہاں کی دوستی ہو کہ بنے ہیں دوست ناصح   کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا!

ہندوستان میں غیر سرکاری ذرائع سے ابتدائی اور نیز اعلیٰ ادبی اور صنعتی تعلیم کی اچھی خاصی اشاعت ہوئی ہو۔ مسٹر جے این ٹاٹا آنجہانی نے اپنی دولت کا ایک معقول جز بلند پایہ سائنٹفک تعلیم کے لئے وقف کیا۔ بنگلور کا سائنس انسٹی ٹیوٹ اپنے وجود کے لئے انہیں بزرگ کا مرہون احسان ہو۔ بوس انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ (جس کے ساتھ نامور ماہر کیمیا سر پی۔ سی۔ رائے کا وجود گرامی وابستہ ہے) نیشنل میڈیکل کالج، یہ سب مراکز تعلیم تمام وکمال یا بڑی حد تک پرائیویٹ جدوجہد ہی کے نتائج ہیں۔ حال یہ ہو کہ بعض سرکاری یونیورسٹیاں بھی بعض پرائیویٹ اشخاص کی فیاضیوں کی بہت کچھ دست نگر ہیں ان بزرگوں میں سر گرو داس بنرجی کا نام نامی واسم گرامی خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ ہندو یونیورسٹی بنارس اعلیٰ ترین ادبی تعلیم دینے کے علاوہ ایک انجنیرنگ کالج بھی چلاتی ہے لیکن مس میو اپنے قارئین کرام کے دلوں میں اس دعوے کو نقش کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستانی لوگ اشاعت تعلیم کے ذیل میں کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں اور یہ کہ ہندوستانی زعمائے قوم گورنمنٹ کو مفت کا الزام دیتے ہیں کہ وہ خدمت تعلیم کے فریضہ سے تغافل برت رہی ہو! ہندوستان کی تعلیمیافتہ جماعت کی اس علمی سرد مہری اور ناسپاسی کے افسانے کی بنیاد حسب معمول وہ ایک معتبر راوی کے بیان پر رکھتی ہو، چنانچہ یہ بیانات ایک زبردست لیکن خیر سے غیر معروف ومجہول الاسم بنگالی قانون پیشہ بزرگ کے اعترافات پر مبنی ہیں جنہیں مس موصوفہ نے شرف مصاحبت بخشا اور جنہوں نے اگرچہ بیشمار روپیہ اپنی قانونی

پریکٹس کے ذریعے اپنے اہل ملک کی جیبوں سے گھسیٹا لیکن جن کو قوم کی تعلیم کی راہ میں مدت العمر ایک پیسہ دینے کی توفیق نہ ہوئی! ایسے عجیب الخلقت بزرگوں کا ہندوستانیوں کی تعلیمی غیر دلچسپی پر خون در جگر ہونا بجا بھی ہے!

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

لیکن آخر کار اس امر کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تعلیم ایک ایسا کام ہے جس کی ذمہ داری جدید اصول حکمرانی کی رو سے حکومت ہی پر ہے۔ غیر سرکاری کوششیں چاہے وہ کتنی ہی وسیع اور قابل داد ہوں، زمانہ حاضر کی کسی قوم کی تعلیمی ضروریات و مہمات کی حریف نہیں ہو سکتیں! مسٹر فشر نے، جو برطانیہ کے نامور ماہر تعلیم ہیں اور جو سنین گذشتہ میں انگلستان کے وزیر معارف رہ چکے ہیں، اپنی تقریروں میں بار بار اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ دنیا کے تمام متمدن ممالک میں پبلک کی تعلیم و تربیت حکومت کا فرض عین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ حکومت کا "فرض" بھی ہے اور "حق" بھی کہ وہ ہر حال میں اس بات پر نظر رکھے کہ شہریوں کی جس دنیا کی وہ سیاسی رہنما ہے وہ قعر جہالت میں نہ گرنے پائے! اپنے ایک پبلک اعلان میں صاحب موصوف نے جن کے خیالات مسائل تعلیم میں قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں، فرمایا!

"لیکن اگرچہ حکومت نو عمر مزدوری پیشہ لوگوں کو محنت مزدوری سے منع نہیں کر سکتی تاہم اس کو طالب العلمی اور مزدوری کے مابین ایک مخصوص رابطہ و توازن قائم رکھنا چاہیے۔ حکومت کو زیبا ہے کہ وہ تعلیم عامہ کو اپنے عقائد دینی میں داخل کرلے، لیکن ساتھ ہی اس کا فرض ہے کہ تعلیم کے مقام بلند کی معرفت بھی حاصل کرے! اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ تعلیم کے معنی محض نوشت و خواند کی تعلیم نہیں ہیں بلکہ زیر تعلیم لوگوں کے صفحہ دماغ اور لوح دل پر اخلاق و سیرت انسانی کا ایک دیرپا نقش کندہ کر دینا! ایک دوسری ضرورت یہ ہے کہ قوم کے ہر بچے کے دل میں حق تعلیم کا احساس پیدا کیا جائے! تعلیم گورنمنٹ کا ناگزیر فریضہ ہے عوام الناس کے اندر علم و حکمت کی اشاعت کے مقصد عظیم کو اسے کسی حالت میں

بھی پس پشت نہ ڈالنا چاہئے اور نہ مصارف کی کمی کا خیال ان خدمات عالیہ میں حائل ہونا چاہئے! ...... اُس کو تعلیم کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام ترتیب دینا چاہئے جس کی امداد سے ملک کے ہر فرد کو اپنے نفس کی ان تمام قوتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملے جو قدرت نے اُس کے اندر ودیعت کی ہیں! ساتھ ہی اس کو مخصوص صورتوں میں غیر معمولی امداد و سرپرستی کی ضرورت کو بھی تسلیم کرنا چاہئے!"

حکومت کے "حقوق و فرائض" کی اس فہرست کو آپ سنتے ہیں! مس میو کو جا کر کوئی خبر کر دے کہ ہندوستانی شوریدہ سر لیڈر ہی نہیں جو حکومت ہند سے تعلیم عامہ کے سارے بار کو برداشت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں بلکہ ع

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند!

عہد حاضر کے ایک سیاست داں کی نظر میں تعلیم ملکی کا جو اہم ترین نصب العین ہے اس کے بعض اطراف کو بے نقاب کرنے کے لئے ہم مسٹر فشر کی بعض دوسری تقریروں سے ایک آدھ اقتباس اور پیش کرنا چاہتے ہیں۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں:-

"زمانہ حال کی ہر دلعزیز تعلیم کا نظریہ ہے کہ ملک کے ہر مرد عورت کو فرائض شہریت کی بجا آوری کے لئے تیار کیا جائے۔ ان سب کو زندہ رہنے کا حق ہے، لیکن بعض کو اپنے ملک و ملت کی خاطر "تسلیم جاں" کا فریضہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے! ہر متنفس کو خطرۂ جہالت وضلالت سے بچانیکی ضرورت ہے اور یہ کام حکومت کا فرض اولین ہے! واقعہ یہ ہے کہ یہ شے فرائض حکومت سے بھی اعلیٰ وارفع چیز ہے؛ تعلیم ایک شخص کا تمدنی مطالبہ ہی نہیں ہے بلکہ بحیثیت انسان کے اُس کا ایک پیدائشی حق ہے اور ایک فطری ضرورت ہے! ہر انسانی ہستی کا ایک جائز رجحان ہے، کہ صحیفۂ قدرت میں ہر شے جو قابل معرفت ہے اس کو جانے، ہر قابل استفادہ چیز سے متمتع ہو، ہر صحیح جذبے سے لطف اندوز ہو، اور ہر بشری امید سے اپنی تسکین قلبی اور تشفی روحانی کا مقصد حاصل کرلے!"

اپنی بریڈ فورڈ کی تقریر میں مسٹر فشر نے فرمایا :

"جس وقت میں نے قوم کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا تو میں یہ دیکھ کر سخت حیرت زدہ
اور رنجیدہ ہوا - اور میرا یہ خیال ہے کہ بشرط مشاہدہ ہر دوسرا شخص بھی میرے اس احساس
میں شریک ہوگا - کہ اب بھی برطانیہ عظمیٰ کے اندر لاکھوں مرد اور عورتیں ایسی ہیں جو انسانی
زندگی کے اُن دلفریب عطیوں کو قبول کرنے سے معذور رہیں جو زندگی انکے سامنے پیش کرنے
کے لئے تیار ہے! کتنے آدمی ہیں جو کتابوں سے کوئی لطف نہیں اٹھا سکتے ؟ کتنی بڑی تعداد
ہے جو مصوری و موسیقی کی لذت بخشی سے ناآشنا ہے! الغرض بشریت کا کتنا معتد بہ حصہ
ایسا ہے جن کے لئے حیات انسانی کی وہ نعمتیں ناقابل فہم ہیں جو ہمارے دل و دماغ کی تربیت
سے پیدا ہوتی ہیں اور جن کے ہم گویا خالق معنوی ہیں! یہ لوگ ایک خشک میکانکی مشقت
میں گرفتار رہیں، آہن و فولاد کی مشینوں سے پا بہ زنجیر ہیں - انکی تاریک زندگیاں شاعری
کے کسی لمحہ منور سے روشن نہیں ہوتیں، انکی مادیات کے زنگ سے آلودہ دل کسی عین
کی صیقل سے صاف نہیں ہوتے - دنیا اپنے دامن میں جو عظمتیں اور شوکتیں رکھتی ہے انکا
وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، ان کو اتنی دماغی دلبستگی بھی نصیب نہیں کہ جن آلات اور
مشینوں کو وہ حیوانوں اور مویشیوں کی طرح چلاتے ہیں انکے متعلق اُس علمی اصول اور
فلسفیانہ کلیہ ہی کو معلوم کریں جو اس انسانی صنعتی کارگاہ کے اندر بطور روح رواں
کے کام کر رہا ہے، الغرض انکی مادیت میں کوئی روحانیت نہیں، انکی کثافت میں کوئی
لطافت نہیں، انکی پستی میں کوئی بلندی نہیں، انکی ارضیت میں کوئی سماویت نہیں، اور
ان کو فطرت سادہ نے جو کچھ دیدیا ہے اُس میں اپنے انسانی عمل تخلیق سے کسی طرح کا اضافہ
کرنیکی ان میں کوئی طاقت نہیں! میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا ہمارے لئے اس پر
صبر کرنا ممکن ہے کہ زمین پر یہ سب چیزیں ممکن الحصول ہوں اور پھر بشریت کا ایک وسیع
حصہ ان سے اس افسوسناک طریقے سے محروم رہے ؟! کم از کم ہم کو اپنا موجودہ پروگرام

اس طرح ترتیب دینا چاہئے کہ مستقبل کسی حد تک ہماری ماضی کی مجرمانہ کوتاہیوں کا کفارہ پیش کر سکے، اور ہم اس وقت اس خوشگوار توقع ہی سے اپنے قلوب کو کچھ تسلی دے سکیں کہ زمین کے دور آئندہ میں ایک ایسی دنیا تعمیر ہو سکے گی جو انسان پر اُن "نعمتوں کا اتمام" کرے گی جو پردۂ غیب اور عالم امکان میں اس کے لئے منتظر ہیں!"

دار العلوم میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"وسیع مفہوم میں وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو ہم اپنی قوم کو ملنے کے خواہشمند ہیں؟ بس یہی کہ وہ اچھے شہری بن سکیں، اپنے سارے حقوق و فرائض کو پہچانیں، صحیح الجسم ہوں اور صحیح الدماغ، اپنے تمام کاروبار و اعمال زندگی کو انجام دینے کی پوری تربیت و اہلیت رکھتے ہوں، اور اپنے فرصت کے لمحوں کو ذہنی دلچسپی اور تخلیقی لذت اندوزی میں تبدیل کرنے کا فن لطیف جانتے ہوں!"

مسٹر فشر اپنے زمانۂ خدمت میں برابر تعلیم عامہ کے غیر معمولی طور پر اہم اور ناگزیر ہونے پر زور دیتے رہے۔ انہوں نے سال بسال تعلیمی بحث کے لئے زائد از زائد رقوم طلب کیں، اور دوران جنگ کی نازک ترین حربی و سیاسی ضرورتوں کے مقابلے میں بھی تعلیمی مالیہ کی قطع و برید نہونے دی بلکہ اُس کے تدریجی اضافے کو حسب معمول جاری رکھا۔ تمامی صیغوں اور سررشتوں میں کفایت و تخفیف مصارف کے عالمگیر نعرۂ جنگ کے مقابلے میں انہوں نے کیا ہی خوب فرمایا۔

"میں بھی کفایت ہی چاہتا ہوں، اور نیز اضافۂ آمدنی۔ لیکن سمجھ لیجئے کہ کس چیز کا؟ انسانوں کا اور انسانیت کا جو ملک کی قیمتی ترین متاع ہے اور سب سے زیادہ قابل قدر جنس! آج اسی "انسانی سرمایہ" کی حفاظت ہمارے پیش نظر ہے! ماضی میں یہ دولت بے بہا بُری طرح تاراج ہوئی ہے۔ لیکن اب ہم اس کی بے بدل قدر و قیمت سے ناآشنا نہیں رہ سکتے!"

بلند نفس نشر کا تعلیمی نصب العین سنئیے :-

"میں مستقبل میں ایک ایسے معشر انسانی کے ظہور کا متمنی ہوں جس کے ہر فرد کو بلا قید جنس و عمر اور بدون امتیاز تمول و فقر دولت تعلیم سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوگا! موجودہ غم انگیں و خجالت آفریں صورت حال یہ ہے کہ دولتمندوں کے ہاتھ میں قلم ہے اور غربا کے ہاتھ میں کُدال! "

مس میو ایک خالص برطانوی مشن پر ہندوستان آئی تھی - ہندوستان میں مسئلہ تعلیم پر جو گہر افشانی اس نے کی ہے اُس کے اندر یہ باطل کوشانہ روح بے نقاب نظر آتی ہے! وہ ہندوستان کی اصلاحات کی ثنا و صفت میں قدرتاً بہت رطب اللسان ہے اور اس بات پر اُس نے خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ زور دیا ہے کہ اصلاح یافتہ کونسلوں میں جبکہ چند دیگر امور کے علاوہ تعلیم عامہ کا شعبہ بھی صیغہ جات منتقلہ میں داخل کر دیا گیا ہے تو اب بھی اگر ملک میں رفتار تعلیم سست اور نشر علوم و معارف کا حلقہ تنگ رہے تو اُس کے لئے اہل ہند کو اپنے ہموطن وزرائے تعلیم ہی کا ممنون احسان ہونا چاہیئے! مس میو نے ان الفاظ میں اپنے خبث باطن اور اپنے جہل مرکب دونوں کا ثبوت دیا ہے! اُس کو خبر نہیں کہ صوبجاتی حکومتوں میں طریق کار کیا ہے! وہ ہندوستانی وزرا کی بے بسی کو دیکھنے سے قاصر نہیں رہ سکتی تھی بشرطیکہ وہ بادنیٰ تامل ان سیاسی تماشا گاہوں کی جنگ ہائے زرگری کو دیکھنا چاہتی - ہندوستان کے ملت پرست عناصر "اصلاح یافتہ" کونسلوں میں صیغجات منتقلہ و غیر منتقلہ کے درمیان غیر مساویانہ و غیر منصفانہ تقسیم زر پر مسلسل و پرزور احتجاج کرتے رہے ہیں - میدان تعلیم کے اندر وزرا کوئی حقیقی اقدام ترقی کرنے سے معذور محض ہیں، اس لئے کہ روپیہ انتظامی کونسلوں کے ممبروں کے ہاتھ میں ہے جو سیاہ و سفید کے مختار ہیں اور وزرا ہر وقت انکے دست کرم کے محتاج رہتے ہیں - گورنمنٹ ہند کا وہ عجیب و غریب نظام حکومت جو امپیریل سروس کے موٹے

تازے صیغوں کے لئے بیک جنبش قلم ایک کروڑ روپیہ کے مزید عطیہ کا اعلان کرسکتا ہے اور جو سالانہ اسّی کروڑ روپیہ کا گنج قارونی فوج پر بہاتا ہے، وہ اُس وقت پورا انگلستان اور تہیدست ہوتا ہے جبکہ تعمیر قومی کے ان کارہائے ناقصہ کے لئے رقوم کے تعین کا موقع آتا ہے جو غریب ہندوستانی وزرار کے سر تھوپے گئے ہیں!

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا!

مسٹر ریچی، گورنمنٹ ہند کے کمشنر تعلیم کا پیام امید سنئے:

"مرکزی اور نیز صوبجاتی حکومتوں کی محدود مالیات کو دیکھتے ہوئے ملک کے اندر مستقبل قریب میں کسی عاجلانہ تعلیمی انقلاب پیدا کرلینے کی امید قطعًا خارج از بحث ہے!"

ہم انگلستان کی سی قسمت کہاں سے لائیں جس کے مایہ ناز فرزند فشر نے ملک کے سامنے پیہم اعلانات کئے کہ جنگ کے زمانے میں بھی تعلیم قومی کی راہ میں جو رقم صرف ہوگی وہ ایک "زر محفوظ" اور ایک "تاجرانہ لاگت" ہوگی! جس کے ضائع ہونیکا کوئی خوف نہیں ہے۔ تخفیف اخراجات کے ہمہ گیر شور شغب اور جنگ عظیم کی قیامت آویز رستخیز کے درمیان وہ پورے سکون خاطر اور خوش انجامی کی کامل امید کے ساتھ کثیر المصارف اور گراں بار تعلیمی بجٹوں کی ترتیب و تیاری میں مشغول تھا! یہ فیاض منش برطانوی عاشق تعلیم شاید خودکشی کرلیتا اگر ہندوستان کی وزارت تعلیم کی کرسی پر متمکن ہوکر وہ مسٹر ریچی کی زبان فیض ترجمان سے یہ دانش فروشانہ موعظت سنتا کہ:

"تعلیم عام کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کوئی مختصر راستہ نہیں ہے جس پر یلغار کرکے ہم اُس تک جا پہنچیں!"

مسٹر فشر نے تعلیمات کے موضوع پر جو ارشادات فرمائے ہیں وہ اہل ہند کیلئے خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ ہندوستان و برطانیہ کے آئینی تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے

وہ ہندوستان کے لئے مخصوص طور پر کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اس بارے میں ہر دوسرے ملک کے کسی اور ماہر تعلیم کے مقابلہ میں مسٹر فشر کے افکار و تجاویز زیادہ مشعل راہ بن سکتے ہیں فشر سلطنت کا وہ زبردست تعلیمی مرشد اعظم ہے جس نے اُن تعلیمی حقایق اور اُن تعلیمی کلیوں کو اپنے مخاطبین کے سامنے پیش کیا ہے جو ہر خود دار اور ترقی دوست ملک کے لئے یکساں طور پر موزوں ہیں۔ آہ! ہم ہندوستانی اپنے وطن کے اندر اپنے کاروان تعلیم کے خود سالار کارواں نہیں ہیں! ہمارے صوبجاتی وزرائے تعلیم کی ہستی ہمارے لئے اور بھی تلخ کامیوں اور حسرت آفرینیوں کا سبب ہے: صیغہ تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں ہے، اور خزانۂ عامرہ کی کلید سرکاری رکن مجلس منتظمہ کی گرفت میں! اس صورت حالات کی ستم ایجادی قابل داد ہے!

از صحن خانہ تا بلب بام، از آن من   وز سقف خانہ تا بہ ثریا، از آن تو!

اقوام عالم کے مختلف جدید العہد نظامات تعلیم کے مطالعہ کے بعد مسئلہ تعلیم قومی کے باب میں بعض اہم کلیات کا استخراج کیا جا سکتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) قوم کا صیغۂ تعلیم اُس کے عسکری سررشتہ مدافعت وطنی کا ہمسر و ہم وقعت ہے آخر الذکر اگر چمن ملت کی بیرونی خاردار چار دیواری ہے تو اول الذکر اُس کے اندرونی گل و ثمر کی بہار ہے! ایک ترقی یافتہ قوم کی اشتہائے عالیہ کی غذا علوم و معارف ہی ہیں! قوم کے بام عروج پر پہنچنے کے لئے سب سے زیادہ یقینی زردبان ترقی تعلیم ہی ہے!

(۲) قومی تعلیم کا بار گراں پرائیویٹ حوصلہ مندیوں کے دوش پر اٹھانیکی کوشش کرنا ناممکنات کو عملی جامہ پہنانیکی سی ہرزہ کاری ہے! اس میں شک نہیں کہ قومی تعلیم کے جہاز کی ناخدائی قوم کے رہنماؤں کے ہاتھ میں ہونی چاہئے، لیکن ملک کا سارا خزانہ اور صیغہ مالیات کی کنجی انکے دوسرے ہاتھ میں ہونے کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے!

(۳) یہ خیال کہ حکومت کو صرف ابتدائی تعلیم کی پرائیویٹ سرگرمیوں کی اپنی

مالی امداد سے سرپرستی کرنی چاہئے زمانے کے ساتھ رخصت ہوگیا ہے۔ تازہ ترین اور صحیح ترین نظریہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کا فرض تعلیم کی اولین منازل کی دستگیری پر ختم نہیں ہوجاتا۔ قوم کی اقتصادی و مادی مرفہ حالی کا انحصار ایک کامیاب صنعتی و حرفتی تعلیم پر ہے اور ان مہمات سے سرکاری خزانہ ہی عہدہ برآ ہوسکتا ہے، ایک دوسرا فریضہ حکومت کا اعلیٰ تعلیم بھی ہے۔ یہ جسم قومی کے اندر وسیع دل اور بلند دماغ پیدا کرتی ہے۔ ملک کے اندر ایسے زعمائے قوم جو قومی مشکلات و خطرات کی آزمائشوں میں ملک کے لئے "سالک باخبر" بن سکیں، اعلیٰ تعلیم ہی وجود میں لاسکتی ہے اور ایسے مخصوص افراد اسی شجر طیبہ کے گل و ثمر بنکر قوم کے ہاتھ آسکتے ہیں۔ پس تعلیم کا یہ شعبہ اس اہم ترین قومی ضرورت کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

(۴) تعلیم کا یہی مفہوم نہیں ہے کہ قوم کے بچوں کو معمولی نوشت و خواند اور حساب و کتاب کے ابتدائی اصول سے آشنا کرکے چھوڑ دیا جائے۔ اس کے مقاصد اس سے بمراحل زیادہ بلند اور وسیع ہیں: اس کے اندر قوم کے ہر نونہال کی جسمانی نشوونما، دماغی تنویرِ افکار، اخلاقی تہذیبِ نفس، اور روحانی تزکیۂ قلب سب ہی داخل ہے!

(۵) ملک کے ہر بچے کی ایسی تربیت جو اس کو قوم کا ایک فرزند رشید، ریاست کا ایک مفید شہری، دنیا کا ایک کامیاب آدمی، انسانیت کا ایک قابل فرد، اور عالم کا ایک شاندار انسان بنادے بغیر اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ اس کارِ عظیم کو حکومت اپنے سارے وسائل مال اور اپنے جملہ ذرائع عزم و ہمت کے ساتھ اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے!

ادبیات ایران کی ترقی میں

سلطان محمود غزنوی کا حصہ

یہ مقالہ مولوی حسین حسان صاحب ندوی متعلم جامعہ ملیہ نے گزشتہ سال یوم تاسیس کے موقع پر شعبہ تاریخ کیطرف سے پیش کیا تھا۔ ہم اسے تین نمبروں میں شائع کریں گے پہلے دو نمبروں میں وہ حصہ جس میں ادب فارسی کی نشو و نما سلطان محمود غزنوی سے پہلے دکھائی گئی ہے اور تیسرے نمبر میں وہ حصہ جس میں سلطان کے ادبی ذوق اور اس کی علم دوستی کا ذکر ہے۔

ایران کی موجودہ زبان دراصل زمانہ مابعد اسلام کی پیداوار ہے اس سے پہلے جو زبان رائج تھی وہ پہلوی یا دری وغیرہ اس کی مختلف شاخیں تھیں۔ ایران میں جب اسلامی فتوحات کا سیلاب آیا تو قدرتی طور پر عربی زبان بھی تمام ملک پر چھا گئی یہانتک کہ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں ایران کے تمام دفاتر بھی فارسی سے عربی میں ہوگئے چنانچہ اس زمانہ میں ایرانیوں کی جتنی تصانیف ہیں تقریباً سب عربی میں ہیں اہل عجم نے عربی میں اس قدر دسترس حاصل کر لی کہ خود عرب انکا مقابلہ نہیں کر سکے، اسلام کے مایہ ناز مشاہیر امام ابوحنیفہ، نظام الدین طوسی، امام بخاری، امام مسلم، امام غزالی، سیبویہ، جوہری، بوعلی سینا، قطب الدین رازی، قطب الدین شیرازی، عبدالقاہر وغیرہ سب ایرانی عجمی تھے، ابن مقفع ایرانی الاصل تھا جس نے عرب میں تربیت پائی اسکی سی علمی و ادبی قابلیت کے لوگ، خود عرب کی سرزمین میں بھی بمشکل پیدا ہو سکے۔ اسکی بعض کتابوں درۃ الیتیمہ۔ کلیلہ و دمنہ وغیرہ کا جواب باوجود سخت کوشش کے عربوں سے بن نہیں پڑا۔

علاوہ بریں ایک بڑا سبب ایران میں عربی زبان کی ترویج کا یہ ہوا کہ ایرانی زبان علمی حیثیت سے تقریباً(۱) تہی مایہ تھی، چند مذہبی اور تاریخی کتابیں اس کے علمی و ادبی لٹریچر کی کل کائنات تھیں۔ برخلاف اس کے اسلام نے تھوڑی مدت میں ادب و دانش کے سرمایہ میں اسقدر ترقی اور علم و فن کی شاخ میں وہ تنوع اختراعات اور جدتیں پیدا کر دیں کہ ایک ایران پر کیا منحصر ہے تمام قوموں کو اس کے سامنے اپنا قدیم لٹریچر بے وقعت اور ہیچ نظر آنے لگا۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں اسلامی علوم و فنون نے مفتوحہ اقوام کے علوم و فنون کی درخشانی کو بالکل ماند کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مصر اندلس، افریقہ وغیرہ کی اصلی زبانیں رفتہ رفتہ فنا ہوگئیں اور آخرکار عربی نے انکی جگہ لے لی غرضکہ عربی زبان نے ایرانی دل و دماغ پر بھی کچھ اس طرح تسلط حاصل کر لیا تھا کہ اگر دو ایک صدی تک اور یہی حالت رہتی تو دوسرے ممالک کی طرح ایران کی زبان کا حشر بھی نہایت دردناک ہوتا لیکن یہ صورت حال کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکی۔ تیسری صدی ہجری میں بغداد کی خلافت کو زوال شروع ہوا۔ بڑے بڑے صوبے خود مختار ہو گئے اور نئی نئی حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ اسکا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان کا آفتاب اقبال بھی ڈھلنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ایرانی امرا و سلاطین اور ایرانی علما نے بھی اپنی زبان کی جانب توجہ کی لیکن دو صدیوں سے برابر عربی زبان کا سکہ رائج تھا اس لئے قدیم فارسی میں عربی الفاظ اس کثرت سے گھل مل گئے تھے کہ اصلی زبان بالکل متغیر ہو چکی تھی اور عربی و فارسی

---

(۱) فارسی زبان کا جو سرمایہ عربی زبان میں آیا اُس میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ہندسہ کا پتہ نہیں ملتا۔ یہانتک کہ نہایت کدو کاوش سے کسی فارسی حکیم کا نام بھی معلوم نہیں ہوتا حالانکہ یونانی حکما، مثلاً ارسطو افلاطون، بقراط اور جالینوس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے اسکی وجہ اسکے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں کے زمانہ سے پہلے فارسی کا ذخیرہ اکثر برباد ہو چکا تھا (رسائل شبلی صفحہ ۲۱۸)

کی اس آمیزش سے ایک نئی زبان تیار ہوگئی تھی اور اگرچہ فارسی زبان سے عربی الفاظ کو نکال دینے کی بہت کچھ کوششیں ہوئیں لیکن ظاہر ہے کہ اسمیں کامیابی کیونکر ممکن تھی، فردوسی اس جدوجہد میں سب سے پیش پیش ہے شاہنامہ میں عربی الفاظ لانے سے اُس نے بہت احتراز کیا ہے پھر بھی اسے اس میں پوری کامیابی نہ ہوسکی۔ اور اب بھی یہی مخلوط زبان جدید تغیرات کے ساتھ ایران میں مروج ہے۔

فارسی شاعری کی ابتدا

ایران میں شاعری کی ابتدا کب سے ہوئی؟ یہ مسئلہ بہت مختلف فیہ ہے بعض مورخین کا خیال ہے کہ زمانہ قبل اسلام میں شعر شاعری کا وجود ہی نہ تھا بعض کا خیال ہے کہ شعر تھا لیکن وزن سے خالی تھا، بعض ایرانی تذکرہ نویسوں نے یہ بھی ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ قدیم شعرا کی شاعری عربوں کے غلبہ کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔ اس لئے کہ عربوں نے محض مذہبی تعصب کی بنا پر ایران کے کتب خانوں کو جلا ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کا تمام سرمایہ علم وادب ہمیشہ کے لئے خاک میں مل گیا اور قدیم فارسی شاعری بھی اسی آتش تعصب کی نذر ہوئی۔ لیکن اس خیال کی لغویت کو مولنا شبلی رسائل شبلی میں اچھی طرح ثابت کرچکے ہیں[1] شعرالعجم[2] میں بھی ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"اسلام نے ملکی زبان سے کبھی کچھ تعرض نہیں کیا حضرت عمر کے زمانہ سے حجاج بن یوسف کے زمانہ تک تمام دفاتر فارسی زبان میں تھے حجاج کے زمانہ سے عربی میں ہوگئے۔ لیکن ملک کی اصلی زبان وہی رہی ..... اور جب خود فارسی زبان

---

(۱) رسائل شبلی بعنوان "اسلامی کتب خانے" صفحہ ۳۶-۳۷-۳۸۔ و بعنوان "تراجم" صفحہ ۲۱۸ و ۲۱۹

(۲) شعرالعجم حصہ اول صفحہ ۱۲

سے کسی قسم کے تعصب کا اظہار نہیں کیا گیا تو فارسی شاعری نے کیا گناہ کیا تھا "

بہر حال یہ خیال بہت مضحکہ خیز ہے کہ فارسی لٹریچر کی بربادی کا سبب مسلمان ہیں یہ محض قومی اور وطنی عصبیت کا نتیجہ اور واہمہ کی خلاقی ہے، شاعری کے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ ایران میں شاعری مذہباً ممنوع تھی، المعجم میں اس کے متعلق ایک روایت بھی پائی جاتی ہے مگر وہ نہ روایتاً قابل استناد ہے اور نہ درایتہً قابل تسلیم۔

اس مسئلہ پر مولنا عبدالرحمن صاحب مصنف مراۃ الشعر نے بھی اپنی تحقیقی رائے لکھی ہے جو اس قابل ہے کہ ناظرین کے سامنے پیش کیجائے آپ "قدیم فارسی اور شعر" پر تبصرے کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

. . . کوئی کہتا ہے کہ فارسی میں شعر تھا لیکن وزن سے خالی تھا میں سمجھتا ہوں یہ عرب فاتحین کی رائیں ہیں اولاً انہیں مغالطہ ہوا سمجھے کہ فارسی شعر میں وزن نہیں ہے اور چونکہ خود اُنکے نزدیک وزن ضروری تھا اس لئے بعض نے کہدیا کہ فارسی میں شعر ہی نہیں اور یہی دوسرا مسلک بن گیا۔ عربی فارسی کتابوں میں کہیں کہیں فارسی شعروں کا ذکر آیا ہے لیکن اس قدر مجمل ہے کہ اُس سے صاف وصریح نتیجہ نکالنا آسان نہیں۔ لیکن میں اس اجمال و قرائن و قیاس سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فارسی میں شعر تھا مگر اس میں عربی کی طرح وزن حقیقی اور لازمی نہ تھا، بیشتر وزن غیر حقیقی تھا اور عرب تھے وزن حقیقی کے عادی جب سننے والوں نے سنا تو اپنے شعر کے مقابلہ میں ناموزوں پایا، عاری از وزن کہدیا یہی نقلاً قابل تسلیم معلوم ہوتا ہے اور یہی تقتضائے عقل بھی ہے ورنہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ جس قوم کے جشنہائے عیش وعشرت کی آجتک عالم میں دھوم ہے جس کی کوئی بزم کوئی محفل نغمہ وسرود سے خالی نہ ہوتی تھی جس کی عبادت و پرستش میں بھی زمزمہ وسرود کو دخل نہ تھا، جس کی مٹی ہوئی زبان نے

بھی چاپ آمہ و چگامہ اور ترانہ جیسے متعدد الفاظ انواع شعر کے لئے باقی چھوڑے جس کی خوش مذاقی نازک خیالی ہمیشہ مسلم رہی جس کی ذہانت وطباعی کا ارسطو نے اعتراف کیا جس کی طاقت وتہذیب ایران وروم سے ٹکراتی اور ہندوستان کو دباتی رہی جس کے سیاسی وتجارتی تعلقات ان لوگوں سے رہے جن کے ہاں ہومر اور والمیک جیسے شاعر پیدا ہوئے اُس قوم میں از ابتدائے عروج تا انتہائے زوال شاعری نہ پیدا ہوا اور اسلامی فتوحات کے بعد عرب کے صد سالہ اختلاط سے اسی قوم میں شعر وشاعری اس طرح پھیلے کہ بن میں آگ لگ جائے۔ اور ہر طرف شعلے ہی شعلے نظر آئیں یہ کیونکر سمجھ میں آجائے۔

کوئی شک نہیں کہ مولانا کی فیصلہ کن تحریر بہت کچھ غور و توجہ کی مستحق ہے مصنف نے جس مجتہدانہ انداز میں اپنا فیصلہ صادر فرمایا ہے وہ لائق ستائش ہے لیکن پھر بھی اگر ایک جویائے حق کو تسکین نہ ہو تو غالبًا مولنا بھی اُسے اس بات کا حق دیں گے کہ وہ تحقیق کا قدم اور آگے بڑھائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے قدیم ایرانی تذکرہ نگاروں کی تقلید میں کسی نہ کسی نہج سے سارا الزام عربوں ہی پر رکھا ہے کہ وہ چونکہ وزن غیر حقیقی کے عادی تھے اس لئے انہوں نے فارسی کی بے وزن شاعری دیکھ کر سرے سے ایرانی شاعری ہی سے انکار کر دیا۔ لیکن یہ دعوئ نقلی ثبوت کا بھی محتاج تھا جو افسوس ہے کہ کہیں نظر نہ آیا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسی قسم کی غیر موزوں شاعری تھی جسے تسلیم کرنے سے اس طرح انکار کر دیا گیا۔ اور پھر اس انکار کا اس قدر ناگوار اثر پڑا کہ وہ شاعری ہی سرے سے ناپید ہوگئی۔ اور آج قدیم شاعری کا ایک شعر بھی محفوظ نہیں۔ یہ امر ہم پہلے گوش گزار کر چکے ہیں کہ قدیم فارسی لٹریچر کا کوئی کارنامہ ہمارے سامنے موجود نہیں، ہمارے سامنے ایران کی کوئی قدیم ترین تصنیف ہے تو وہ اوستا ہے۔ یہ زرتشت کی تصنیف یا وحی آسمانی ہے جو اُس پر نازل ہوئی

ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اوستا زرتشت کا کلام ہی نہیں اور بعض کے نزدیک صرف ایک باب (گاتا) اصل ہے اور ۲۱ باب الحاقی ہیں لیکن یہ ایک علیحدہ بحث ہے اور ہمارے موضوع سے خارج اسلئے ہم سردست اس میں پڑنا نہیں چاہتے اور تسلیم کئے لیتے ہیں کہ ساری کتاب زرتشت کی لکھی ہوئی ہے ہمارا خیال ہے کہ یہی ایک کتاب کسی قوم کی دماغی ترقی، طباعی نازک خیالی اور ذہانت کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے، لیکن آئیے ہم آپ کو بتائیں ایک یوروپین مستشرق کا اس کے متعلق کیا خیال ہے، پروفیسر براؤن "اوستا" پر تبصرہ کے دوران میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"تاریخی حیثیت سے یا زرتشت کے عقائد کا مرقع اور قدیم مذہب کی مقدس یادگار ہونیکے لحاظ سے یہ کیسی ہی کارآمد کتاب ہو مگر نہ تو یہ خوشگوار ہے اور نہ دلکش ہے اپنی نسبت تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک طرف قرآن کو جوں جوں پڑھتا جاتا ہوں لطف بڑھتا جاتا ہے اور شوق سے اسکا مطالعہ اور اس کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں دوسری طرف اوستا کا مطالعہ بدمزگی اور تنغص پیدا کرتا ہے اور یہ کیفیت مزید مطالعہ کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے کچھ لوگ تحصیل زبان تحقیق مذاہب دریافت آثار قدیمہ کی غرض سے اور بعض لوگ الہامی کتاب سمجھکر بھی اسے پڑھ تو لیا کرینگے۔ مگر مجھے تو یقین نہیں کہ اس کا ترجمہ خواہ کیسا ہی دلچسپ کیا جائے، معمولی طبیعت کے کتب بیں جو کتابیں دلچسپی کے لئے پڑھا کرتے ہیں شروع سے آخر تک پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے"

صرف یہی نہیں بلکہ زرتشت کے مرنے کے کچھ ہی دنوں بعد خود زرتشتی عالموں اور موبدوں کے لئے یہ ایک لاینحل معمہ بنکر رہگیا۔ نظام الملک طوسی نے مزدک کی بحث میں لکھا ہے۔

مزدک گفت مرا فرستادہ اند تا دین زرتشت تازہ گردانم کہ خلق معنی ژند واوستا فراموش کردہ اند . . . . . موبدان گفتند در ژند و اوستا سخنان است کہ

ہر سخن دہ معنی دارد و ہر موبدے و دانائے را درو قولے و تعبیرے "

مولانا مسلم عظیم آبادی نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

اس کا سبب تاخت اسکندری کے علاوہ ایرانی طرز تحریر کا نقص اور اہل ایران کی علم سے بے نیازی تھا۔ عہد اسکندری سے حکمت یونان کی جو کچھ روشنی ایران میں پہنچنے لگی تھی۔ وہ بھی بہت جلد حکومت ایران کے زوال کے ساتھ زائل ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران مختلف زمانوں میں مختلف تمدنوں کے زیر اثر رہا اسی طرح طرز تحریر بھی بدلتا رہا۔ پہلے آرامی پھر میخی، اور پھر پہلوی اسی کا نتیجہ تھا زبان میں عجیب خلط ملط ہوگیا، اوستھا کا مختلف زبانوں میں ترجمہ در ترجمہ ہوا شرحیں لکھی گئیں، مگر پھر بھی اصل مشکل آسان نہ ہوسکی اسی اخلاط کی وجہ سے زبان میں یہ خرابی پیدا ہوگئی، لکھتے کچھ تھے اور پڑھا کچھ اور جاتا تھا، مثلاً زنا کو آن۔ ملکا کو ملکان اور ملکا کو شہنشاہ۔ من کو لحمہ کو نان بسرہ کو گوشت وغیرہ وغیرہ۔ ابن مقفع کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں پانچ مختلف زبانوں اور سات مختلف رسم الخط کا خلط مبحث تھا ہر طبقہ کے لئے علحدہ علحدہ زبانیں مخصوص تھیں۔

ایسی تحریر اور طرز تحریر جس کی اس قدر ناگفتہ بہ حالت ہو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کیونکر کسی لٹریچر کی حامل ہوسکتی تھی، شاعری کو بھی اسی پر قیاس کر لیجئے فاضل مؤلف "مراۃ الشعر" اپنے قیاسی دلائل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں "۔۔۔۔۔ جس کی مٹی ہوئی زبان نے بھی جامہ چگامہ اور ترانہ جیسے الفاظ باقی چھوڑے" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ الفاظ قدیم ایرانی زبان کے بقایا ہیں۔ غالباً مولانا آزاد کا بھی یہی خیال ہے لیکن مولنا مسلم عظیم آبادی اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

ایرانیوں کی حب وطنی نے انہیں ہمیشہ سے غیر مخلوط خالص پارسی کے شیوع کا

متنبی اور ساعی رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد صالح دربار شاہجہانی کا مصنف تھا
اُس نے اپنی ایک کتاب "عمل صالح" میں عربی اصطلاحات عروض کی جگہ
خالص پارسی اصطلاحات گھڑی تھیں جسکا نمونہ یہ ہے۔

قصیدہ کے لئے چگامہ ۔ غزل کے لئے چامہ
ردیف " پاوند ۔ وزن شعر " دم
نثر " پراگندہ نظم " پیوستہ
تخلص " داغ

ایرانیوں کی خوش مزاجی نازک خیالی اور ذہانت وطباعی سے کسے انکار ہے۔
اس حقیقت کو بھی ہم آشکارا کر چکے ہیں، کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ایرانیوں نے
عربی ادب اور علوم وفنون حتیٰ کہ مذہب کی بھی خود عربوں سے زیادہ خدمت کی لیکن اس
سے یہ نتیجہ نکالنا آسان نہیں کہ اسلام کے غلبہ سے پہلے ایران خود بھی علوم وفنون کا سرمایہ دار
تھا۔ جناب سلم عظیم آبادی ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں۔

"فارسی روایات کے مطابق سکندر نے جب ایران فتح کیا تو مجوسیوں کی دینی
کتابیں تلف کر دیں، باقی کتب فلسفہ، نجوم، طب، زراعت وغیرہ وغیرہ
ڈھونڈھ ڈھونڈ کر اسکندریہ اور یونان اُٹھوا لے گیا اس طرح ایران کی جو کچھ متاع
علم تھی مرکز علم کو منتقل ہو گئی پانچ صدیوں کی گھٹا ٹوپ تاریکی نے قدرۃً عجم کا
دماغ کند بنا کر اُسے وحشت وجہالت کی پستی میں گرا دیا۔ اور علوم وفنون تو الگ
رہے، مذہب بھی بھلا بیٹھے۔ ساسانی عہد میں بعض اولوالعزم بادشاہوں نے
احیاءِ علوم کی کوشش کی مگر وہ نسبتہً ایسی حقیر ہے کہ مصر و یونان کے مقابلہ
میں اُنکا نام نہیں لیا جا سکتا۔ مزمن جہالت کے علاوہ خط کی دقت نے پارسی
علوم کو پنپنے نہیں دیا۔ جس دن مالدار زبان عربی نے اپنے وسیع خزانے

سے انکو لغات دئے۔ اور لغات کے ساتھ آسان خط مہیا کر دیا۔ اُنکے دماغ کی مہر ٹوٹ گئی۔ اور زبان چل پڑی، خود قرآن شریف ایک عظیم الشان لٹریچر ہے عربی شاعری کے اعلیٰ نمونے اُنکے سامنے آئے "

ایک مستند فارسی تذکرہ نویس لکھتا ہے۔

چوں آفتاب ملت حنیفی و دین محمدی سایہ بر دیار عجم انداخت لطیف طبعان فرس را با فضلائے عرب اتفاق محاورہ پدید آمد و از انوار فضائل ایشاں اقتباس کردند و بر اسالیب لغت عرب وقوف گرفتند۔ و اشعار مطبوع آبدار حفظ کردند بغور آں فرو رفتند و بر حقائق بحور و دوائر آں اطلاع یافتند و ہم بر آں منوال تسائج فضائلے کہ نتائج طبع ایشاں بود یافتن گرفتند۔

(قلعہ دہلی کے)

میوزیم پر ایک عام نظر

پچاس سال سے زیادہ عرصہ ہوتا ہو کہ ۱۸۶۸ء میں دہلی میونسپل بورڈ کے زیر اہتمام
ٹاؤن ہال کے کسی کمرہ میں ایک میوزیم قایم ہوا تھا جس کے بانی ایف ایچ کوپر
ڈپٹی کمشنر دہلی تھے، مگر اس میوزیم کی بنیاد کسی خاص مقصد کے ماتحت نہیں رکھی گئی۔
نہ تو یہ کوشش تھی کہ دنیا کی تمام چیزیں جو آج عجیب سمجھی جاتی ہیں یا کل سمجھی جائیں گی، مہیا
کیجائیں اور نہ چیزوں کو جمع کرتے وقت یہ خیال پیش نظر تھا کہ اس میں وہی چیزیں لائی جائیں
جو کسی خاص مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوں۔ قدیم بدھ کے مجسموں کے ساتھ ساتھ جے پور کی
کی مورتیاں، فنون لطیفہ کی نادر اشیاء کے ساتھ ساتھ بچوں کے کھلونے اور اسی قسم کی صدہا
چیزیں تھیں جس سے یہ میوزیم معجون مرکب بن گیا تھا، چنانچہ ایک موقعہ پر محکمہ آثار قدیمہ کے
ایک فاضل افسر نے جب اس میوزیم کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ میوزیم ایک (howling
Wilderness) وحشت ناک جنگل ہے موصوف کے یہ الفاظ بے شبہ ہمارے اس مفہوم کی
کافی توضیح اور اصل حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں، میوزیم کی یہ شکل کچھ تو ان اسباب سے
اور نیز اس وجہ سے بھی کہ کوئی ماہر فن منتظم میوزیم کو ایسا میسر نہ آیا کہ وہ اس کی باقاعدہ
تشکیل پیش کرسکتا، ۱۹۰۱ء میں محکمہ آثار قدیمہ کیطرف سے موجودہ وائسرائے لارڈ کرزن
کی توجہ میوزیم کیطرف مبذول کرائی گئی، مگر اس درخواست کا بجز اس کے کوئی نتیجہ نہ ہوا کہ اس
کا کام محکمہ کے سپرد کردیا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں سر جان مارشل نے (جو محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر
تھے) یہ تجویز پیش کی کہ نوبت خانہ یا نقار خانہ میں ایک تاریخی عجائب خانہ ہو جس میں دہلی قلعہ کی

تاریخ سے متعلق چیزیں رکھی جائیں، لارڈ کرزن نے اس تجویز کو پسند کیا لیکن اس مرتبہ بھی ۱۹۰۸ء تک کوئی عملی قدم نہ بڑھایا گیا بے توجہی اور بے پروائی کے اس عالم میں یہ پرانا عجائب خانہ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ کوئی نیا عجائب خانہ بھی نہ قایم ہو سکا ۱۹۰۸ء میں اس پرانے میوزیم کے ٹوٹ جانیکے بعد ارباب نظم ونسق کچھ ہوش میں آئے اور جنرل مارشل کی پرانی تجویز اس سال زیر عمل آنا شروع ہوئی۔ غیر متعلق چیزیں جو اس جدید میوزیم کے دائرہ مقاصد سے باہر تھیں وہ دوسری جگھوں پر جہاں وہ رکھی جاسکتی تھیں بھیجدی گئیں، بدھ کے قدیم مجسمے اور نیز اسی قسم کے دوسرے بت لکھنؤ اور لاہور کے عجائب خانہ میں جینیوں کے تین بت متھرا میں اور علاوہ انکے اسی قسم کی دوسری چیزیں بھی ادھر اُدھر منتقل کر دی گئیں اور از سر نو ۱۹۰۹ء میں تاریخی اشیار کا ایک عجائب خانہ نوبت خانہ (قلعہ میں) میں قایم کیا گیا، اور ابھی دو سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ قلعہ کی ایک دوسری عمارت ممتاز محل میں یہ عجائب خانہ منتقل کر دیا گیا، اس عجائب خانہ میں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے زیادہ تر قلعہ دہلی سے متعلق تمام چیزیں بہم پہنچائی گئی ہیں کچھ تو شاہان دہلی کے اسباب اور سامان ہیں جو کسی نہ کسی طرح ہاتھ آئے کچھ انکے اور انہیں کے متعلقین کے آلات اور ہتھیار، کچھ تاریخی پتھر جن پر کندہ کی ہوئی تحریریں ہیں، کچھ شاہی مہریں ہیں اور کچھ فرامین اور اسناد، تصویریں بھی ہیں زیادہ تر شاہان مغلیہ اور انکے درباریوں کی، قلعے کے اندر اور باہر کی عمارتوں کے نقشے بھی ہیں جن میں سے اکثر شاہی عمارتیں یا ان سے متعلق دوسری عمارتیں ہیں، قدیم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں ہیں جو کُل کی کل شاہی کتب خانہ سے متعلق تھیں اور بہترین خطاطوں کے خوشخطی اور خوشنویسی کے نمونے بھی جن میں سے اکثر کا تعلق قلعے سے ضرور تھا۔ یہ سب چیزیں نو حصوں میں تقسیم کیجا سکتی ہیں، فرنیچر[1] اور نیز دیگر سامان، ہتھیار[2] اور آلات، مہریں[3] اور کتابت، فرامین[4] اور اسناد، ڈرائنگ[5] اور عکسی تصاویر، نقشے[6]، قلمی تصویریں[7]، قدیم مطبوعہ[8] اور غیر مطبوعہ کتابیں، بہترین[9] خطاطوں کے خوشنویسی کے نمونے،

یوں تو تاریخی حیثیت سے ان میں کی ہر ہر چیز اپنی جگہ پر کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور رکھتی ہے، مگر باوجود اس کے بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی نوعیت میں زیادہ عجیب یا تاریخی حیثیت سے زیادہ اہم ہیں، شاہی اسباب اور سامان کا وہ تاریخی اور قیمتی قالین جو اپنی صنعت و بناوٹ میں بے مثل ہے اور جس کو کبھی دلّی کے آخری تاجدار کے زیر دست ہونیکا شرف حاصل تھا آج تقریباً اسی حال میں باقی ہے، اور اسی بادشاہ کا وہ زرق و برق لباس بھی جس سے اس زمانہ کے طرز لباس اور پوشش کا پتہ چلتا ہے، زینت محل کے بعض سونے اور موتیوں کے زیورات بھی موجود ہیں اس سکشن کی زیادہ عجیب و غریب چیز جو میوزیم کی زینت ہے وہ اورنگزیب کا فلٹر ہے جس کو وہ اپنے شاہی دورے پر استعمال کرتے تھے جہاں صاف پانی ملنے کا امکان نہ ہوتا وہاں پانی اس فلٹر میں بھر دیا جاتا اور صاف ہوکر اس کے باریک سوراخوں سے باہر گرتا، یہ فلٹر صرف پتھر کے ایک ہی ٹکڑے سے بنایا گیا ہے، جس پر یہ عبارت کندہ ہے۔
"آب متقطر سنگ صافی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی ۱۰۸۰ھ"

ہتھیار اور آلات میں زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی علی مردان خاں کی تلوار ہے۔ تلوار پر سنہری نستعلیق حروف اور فارسی زبان میں دو عبارتیں کندہ ہیں، ایک دستہ کے سطح پر اور دوسری پشت پر، پشت پر یہ عبارت کندہ ہے، "ایں شمشیر خاص از حضور عباس خلداللہ ملکہ و سلطانہٗ بخانہ زاد علی مردان خاں سرفرازی یافت"،

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تلوار فارس کے بادشاہ عباس صفوی کیطرف سے (جن کا عہد حکومت ۱۵۸۷ء سے ۱۶۲۹ء تک رہا ہے) علی مردان خاں کو ملی تھی، علی مردان خاں جنکا اصل نام علی مردان بیگ ہے گنج علیخاں کے بیٹے تھے۔ گنج علیخاں شاہ عباس صفوی کے وفادار نوکر تھے انہیں ارجن بابا کا خطاب بادشاہ کی طرف سے دیا گیا اور یہ پہلے کرمان کے پھر قندھار کے حاکم بنائے گئے، باپ کی وفات پر علی مردان خان کو خان بابا ثانی کا خطاب مرحمت ہوا تھا، لیکن اس کے کچھ سال بعد شاہ عباس صفوی کی جگہ پر انکے پوتے گدی پر

متمکن ہوئے ۔ علی مردان خاں نے انکی بیجا سختیوں سے ملول ہوکر شاہجہاں کو قندھار کا علاقہ سپرد کردیا اور خود دہلی شاہجہاں کے ہاں پناہ گزیں ہوئے یہاں انکی بڑی آؤ بھگت ہوتی شاہجہاں کی طرف سے امیرالامراء کا خطاب ملا اور اس حالت میں جبکہ وہ پناہ گزیں تھے یہ تلوار ہندوستان بھیجی گئی ، کچھ دن علی مردان خاں کے پاس تھی کہ اس کے بعد یہ تلوار نواب اودھ سعادت علیخاں کے قبضہ میں آئی جنہوں نے اس پر ۱۲۱۹ھ میں یہ عبارت کندہ کرائی ۔

یا علی العلیٰ

وزیرالملک نواب سعادت علیخاں بہادر ۱۲۱۹ھ

شاہجہاں کی بھی ایک تلوار مع نیام اور پیٹی کے موجود ہے جو اپنی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے اس کے دستے پر ۹۹ نام خدا کے سنہرے حرفوں میں لکھے ہوئے ہیں ایک اور عبارت سنہرے حرفوں میں کندہ ہے جس سے شاہجہاں کی تلوار ہونیکی تصدیق ہوتی ہے ۔

عبارت : لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

ہست ایں شمشیر خاص ثانی صاحبقران شاہ غازی بادشاہ بحروبر شاہجہاں ل ۱، ص ا ن ۲۸ نصرت بخش

نصرت بخش کے متعلق عام خیال ہے کہ یہ اس تلوار کا نام ہے ، ایک خنجر ہے جو شاہ طہماسپ شاہ ایران کا ہے یہاں رکھا ہوا ہے اس پر جو عبارت کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مظفر شاہ کاشانی کا بنایا ہوا ہے ۔

عمل مظفر کاشانی

فیضی کا لکھا ہوا ایک کتبہ جس کا پتھر ایک قدیم مسجد سے لایا گیا ہے بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ مسجد جواب بالکل شکستہ حالت میں پڑی ہے دلی دروازہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے ۔ یہ مغل طرز کی بنی ہوئی ہے اور اس کے بانی صدر جہاں شیخ عبدالنبی تھے جو شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ کی اولاد سے تھے اور اکبر کے دربار میں بڑا ممتاز درجہ

رکھتے تھے، یہ کتبہ اسی مسجد کا ہو جس کی لمبائی ۳ فٹ ۶ انچہ اور چوڑائی دو فٹ ۲½ انچہ ہے۔ عربی قطعہ فیضی کا کہا ہوا خط نسخ میں کندہ ہو جس سے فیضی کی عربی شعرگوئی کی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے اور مسجد کی تاریخی نوعیت کا بھی۔

فی زمان الخلیفہ الاکبر	اید اللہ ذاتہ النفاع
قد بنی بقعۃ مقدسۃ	مثلہا لایکون فی الانقطاع
شیخ الاسلام زائر الحرمین	شیخ اہل الحدیث بالاجماع
شیخ عبدالنبی نعمانی	معدن العلم منبع الانفاع
سال تاریخ ایں بنا فیضی	سال العقل قال خیر بقاع

شاہی فرامین اور اسناد میوزیم کی اہم ترین چیزوں میں سے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے انکا ہر ہر لفظ قابل مطالعہ ہو، اور خصوصیت کے ساتھ ان مورخین کے لئے جو ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں تصویروں میں علاوہ شاہان دہلی کی ان تصویروں کے جو مختلف وقتوں اور مختلف حیثیتوں سے بنائی گئی ہیں ایک ایرانی خاتون کی تصویر قابل دید ہے، یہ تصویر معین مصور کی بنائی ہوئی ہے، مصور نے سادگی اور بھولے پن کا نقشہ تصویر میں نمایاں کیا ہے جس سے یہ تصویر حد درجہ دلکش اور جاذب ہوگئی، ایک اور تصویر جس میں افیونیوں کی ایک صحبت دکھائی گئی ہے حد درجہ مضحک ہو دیکھتے ہی بے ساختہ ہنسی آتی ہے، ان لوگوں کی صورت ڈراونی ہے، گردن پتلی پتلی، ہڈیاں اُبھری ہوئی، گال پچکے ہوئے حقہ ہر ایک کے سامنے رکھا ہوا ہے پینک میں اونگھ رہے ہیں اور منہ سے حقہ لگا ہوا ہے بعضوں کے سر اونگھتے اونگھتے زمین تک پہنچ چکے ہیں، اور اسی بیہوشی کی حالت میں بدن کا کچھ حصہ بھی کھل گیا ہے، غالب اور کبیر داس کی تصویریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور نظام الدین اولیا اور دوسرے صوفیائے کرام کی تصویریں اچھی کھینچی گئی ہیں، اکبر ثانی کا ایک جلوس بھی جس سے اکبر کے شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے

بہت خوب دکھایا گیا ہے ایک اور تصویر بہادر شاہ ثانی آخری تاجدار دہلی کی ہے جب کہ وہ بستر مرگ پر ہیں، یہ تصویر بہت موثر ہے۔

قلمی کتابوں میں جو سب کی سب شاہی کتب خانے سے متعلق تھیں خصوصیت کے ساتھ قرآن کا ایک نسخہ جو باعتبار اپنی قدامت اور عمدہ کتابت کے ایک امتیازی شان رکھتا ہے کوفی اور نسخ خط کے درمیان لکھا گیا ہے شروع کے دو صفحے سنہرے حرفوں میں ہیں حاشیہ رنگ برنگ کے بیل بوٹوں سے آراستہ کیا گیا ہے، شاہنامہ فردوسی کا ایک قدیم اور مصور نسخہ (دو جلدوں میں) جو شاہی کتب خانہ کی خاص کتاب تھی یہاں موجود ہے۔ ایک اور قلمی نسخہ نجیاور خاں کی بیاض ہے اس میں کچھ تو خود انہیں کے کہے ہوئے اشعار اور کچھ مستند شعرائے فارسی کے کلام کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع کیا گیا ہے یہ کتاب ۱۱۷۰ھ کی لکھی ہوئی ہے، جس کے لکھنے والے مختلف مشہور خطاط ہیں، میوزیم کا ایک اور دلچسپ شعبہ وہ ہے جس میں مشہور اور ممتاز پرانے کاتبوں کی خطاطی کے نمونے ہیں ان خطاطوں کے ناموں کی فہرست جن کی تحریریں میوزیم میں محفوظ رکھی گئی ہیں طویل ہے، لیکن خاص طور پر عبدالرحیم فرمان نویس، میر علی تبریزی، عرب شیرازی، میر علی الکاتب، میر محمد باقر قابل ذکر ہیں۔ عبدالرحیم[1] فرماں نویس کے ہاتھ کا ایک فرمان عمدہ نستعلیق خط میں لکھا ہوا میوزیم میں محفوظ ہے۔ فرمان پر ۱۰۲۵ھ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے، خط نستعلیق کا عمدہ نمونہ میر[2] علی تبریزی کا بھی ہے، عرب شیرازی کی لکھی ہوئی ایک دعائیہ

---

(۱) عبدالرحیم جہانگیر کے دربار کا خاص فرماں نویس تھا جو آقا عبدالرشید مشہور خطاط کے شاگرد تھے قطعہ اور فرمان میں دوسرے خطاطوں کی نسبت سے انکے خط میں متانت زیادہ ہوتی تھی، ان کو عنبریں قلم کا خطاب ملا تھا

(۲) میر علی تبریزی امیر تیمور کے زمانہ کے مشہور خطاط تھے۔ خط نستعلیق کے متعلق کچھ اصول انہوں نے بنائے جس سے انکی کافی شہرت ہوئی اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خط نستعلیق کے موجد تھے۔

نظم[1] ہی جو خط نستعلیق کا عمدہ نمونہ ہی یہ عبداللہ قطب شاہ آخری حکمران گولکندہ کے لئے ۱۰۴۱-۴۲ھ / ۱۶۳۱-۳۲ء
میں لکھی گئی ہے۔

میر علی[2] الکاتب کا بھی خوشنویسی کا ایک نمونہ موجود ہے اور میر محمد[3] باقر کا بھی۔

یہ ایک مجمل خاکہ ہی میوزیم کے اس مفصل نقشے کا جو ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ انشاء اللہ ہم ہر حصے پر الگ الگ نظر ڈالیں گے اور ان تمام تاریخی جواہر پاروں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیں گے جو اس خزانے میں محفوظ ہیں۔

---

(۱) نظم :- تا بود بر سپہر گردندہ ۔۔۔ در جہاں پادشاہ عبداللہ
ماہ تاباں و مہر تابندہ ۔۔۔ دشمن شاد باہ باغم و آہ

(۲) میر علی الکاتب ہرات کے سادات سے ہیں باپ کا نام محمود ہے، یہ میر علی سلطان کے شاگرد ہیں عربی فارسی کے اچھے عالم اور شعرگوئی میں بھی باکمال تھے انہوں نے اپنا تخلص مجنوں رکھا تھا، کچھ دن بخارا میں سکونت اختیار کرنیکے بعد ادہر اُدہر مختلف مقامات میں گھومتے رہے، یہ ایک مشہور خطاط تھے انکے زمانے کی جو بہترین تحریریں اب ملتی ہیں عام طور پر انہیں کی طرف منسوب کیجاتی ہیں، چنانچہ غلام محمد ہفت قلمی اپنی کتاب تذکرہ خوشنویساں میں انکے خط کی تعریف میں لکھتے ہیں

..... گلشن خط را رنگ و بوے تازہ و رونق بے اندازہ دادہ، مشام عالم را از ریاض دریاچین خط خود معطر ساخت و در اصول وصفا از ہمہ خوب تر نوشت،

انکی منظوم خطوط سبعہ جس کو کہ سلطان منظفر کے صاحبزادے کے لئے کیا تھا بہت مقبول ہوئی۔

(۳) میر محمد باقر عالمگیر کے خوشنویس ہیں، بادشاہ کو انکا خط بہت پسند تھا جیسا کہ اکثر رقعات میں اسکا تذکرہ کیا ہے، عالمگیر انکو اُستاد اور والا جاہ کے لقب سے سرفراز فرماتے تھے۔ غلام محمد نے انکے خط کی تعریف اپنے ان الفاظ میں کی ہے۔

خط ایں عزیز بسیار شیریں و دلچسپ و مضبوط بنظر در آمد۔

مذاہب اسلامی کی ابتدا

مسلمانوں کی معاشرت اور ان کے عقاید کے مختلف تغیرات کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض علمی حلقوں میں اکثر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ مذاہب اسلامی کا نشو و نما چند خارجی اثرات کے ماتحت ہوا۔ ممکن ہے بعض لوگ اس رائے کو پسند کریں اس لیے کہ بدعات و فتن کے ظہور اور مختلف فرقوں کی ضلالت اور بے راہ روی کی توجیہ کے لیے یہ ایک عمدہ نظریہ ہے لیکن ہمارے نزدیک اس قسم کے عاجلانہ مفروضات علمی تحقیقات کے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذاہب اسلامی میں بے شمار خارجی عناصر موجود ہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی ابتدا بھی خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔ اگر اس دلیل کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تمدن اسلامی کا آغاز بھی خارجی اثرات سے ہوا۔ تمدن اسلامی میں ان اجزا کی کمی نہیں جو کسی نہ کسی بیرونی سرچشمے سے ماخوذ ہیں باایں ہمہ کوئی شخص بھی اسلامی تہذیب و تمدن کی جدت و بداعت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی تحریک میں خارجی عناصر موجود ہوں اور وہ خارجی تہذیبوں کے زیر اثر رہی ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا اصلی سرچشمہ خود اسی کی ذات میں پوشیدہ ہو۔ بعینہٖ یہی کیفیت مذاہب اسلامی کی ہے۔ واقعات پر جس قدر غور کیا جائے اسی قدر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ مذاہب اسلامی کی ابتدا ان داخلی اسباب کی بنا پر ہوئی جو دین اسلامی میں از خود رونما ہو گئے تھے۔ کچھ ان قدرتی سوالات کی وجہ سے جو انسانی طبائع میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں اور کچھ اس ربط و ضبط کے باعث جو جماعت اسلامی کے مختلف اور متضاد عناصر میں پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں یہ کیونکر ممکن تھا کہ جب تک خود ملت اسلامیہ کے داخلی شئون اور تعلیمات قرآنی کے اندر اصولی اور عقلی مباحث کا امکان نہ ہوتا محض خارجی اثرات کی بنا پر اسلامی دینیات کا آغاز ہو جاتا۔ خارجی اثرات نے بعض مذہبی تحریکات پر اپنا نقش چھوڑا ہے اور ایک حد تک ان کی تشکیل میں حصہ لیا ہے لیکن ان کا موجب نہیں ہوئے

پھر جن اثرات کو ہم 'خارجی' قرار دیتے ہیں ان میں سبھی خارجی نہیں۔ اگر بعض مسلم اقوام نے اپنے فطری رجحانات کے مطابق چند دینی مسائل کی ابتدا کی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ مسائل جماعت اسلامی کے غور و فکر کا نتیجہ نہیں تھے۔ اگر عرب ان افکار سے ناآشنا تھے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دینیات اسلامی کا نشو و نما عربوں ہی کے حصے میں نہیں آیا تھا نہ یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کی توجہ صرف انہی مسائل پر رہتی جو عربی مذاق کے مطابق تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اس امر کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ جب اسلام کا ظہور ہوا تو دنیا علم و حکمت سے خالی نہیں تھی۔ ضرور تھا کہ دنیائے قدیم کا یہ علمی ترکہ مسلمانوں کی ذہنی سرگرمیوں میں کوئی نہ کوئی حصہ لیتا۔ لہذا دیکھنا یہ ہے کہ جماعت انسانی کے عقلی اور مذہبی مسائل نے اس زمانے میں کیا صورت اختیار کی۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ قدیم افکار کا کس قدر حصہ خود بخود اسلام میں منتقل ہو گیا لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سے اسلامی دینیات کے آزادانہ نشو و نما میں کوئی فرق نہیں آتا۔ باعتبار زمانہ اسلام کا ظہور ایک خاص وقت پر ہوا اور اس وقت آب و گل کا جو بھی سرمایہ موجود تھا اُس سے اسلام نے اپنی زبردست قوت تخلیق کی بدولت ایک نیا عالم تعمیر کیا۔ یہی وہ جانفزا تحریک تھی جس سے دنیائے قدیم کے مردہ جسد میں ایک نئی روح پیدا ہوئی اور جس نے آگے چل کر مسلمانوں کی عنان توجہ علم و عمل کی مختلف ضروریات کی طرف موڑ دی۔ مسلمانوں کی تمام سرگرمیوں میں اسی ایک جذبے کی کارفرمائی ہے۔ بغیر اس کے نہ مشرق کی مردہ اور تارک عمل اقوام میں زندگی کی کوئی حرکت پیدا ہو سکتی تھی نہ یونانی افکار اور ایرانی ادارات میں اس قدر قوت باقی رہ گئی تھی کہ کسی جدید اور زبردست روحانی تحریک کے بغیر ان کو از سر نو زندہ کیا جا سکتا۔ بہرکیف اسلام کی ذہنی تاریخ کے مطالعہ میں ان علمی اور عملی محرکات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جو اسلام کی اندرونی قوت کا نتیجہ تھے اور جنہوں نے اسلامی افکار و آراء کے نشو و نما میں مختلف اسباب کی حیثیت اختیار کی ہے۔ اس اعتبار سے ہم مذاہب اسلامی کے متعلق چند ایسے حقائق کی طرف اشارہ کرینگے جن سے ان کی ابتدا و آغاز کا مسئلہ صاف ہو جائے گا۔

مدینہ منورہ میں ابتدا ہی سے دینیاتی بحثوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

شروع شروع کے یہ سب مسائل فقہی بحثوں سے متعلق تھے لیکن اس زمانے میں بھی ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کو معراج کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف الرائے پاتے ہیں[۱]۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے قضا و قدر کے متعلق سوالات کئے جاتے تھے اور ان کا آپ نے جواب بھی دیا[۲]۔ عربوں کے علمی رجحانات کے باوجود ان میں اس قسم کے مباحث کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب انگیز امر نہیں۔ لیکن اگر شروع شروع میں ان پر زیادہ زور نہیں دیا گیا تو محض اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی اثر کی بدولت ان کے دلوں پر مذہب کی حقیقت کچھ اس طرح جاگزیں ہو گئی تھی کہ اگر ان کے ذہن میں اس قسم کا کوئی سوال پیدا بھی ہوتا تھا تو ایمان و اعتقاد کے متعلق کسی موشگافی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ پھر عرب اپنے قومی اور اجتماعی مسائل میں اسطرح منہمک تھے کہ اس وقت نظری امور پر غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں تھا۔ باوجود اس کے یہ بالکل ممکن تھا کہ خود عرب ان تمام مباحث کی طرف توجہ کرتے جو کسی عقیدے کے تسلیم کر لینے سے از خود پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی نہایت سادہ تھی لیکن وہ اپنے گرد و پیش کے افکار سے بے خبر نہیں تھے۔ تمام قدیم اقوام کی طرح عرب بھی تقدیر کے قائل تھے[۳]۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم

---

[۱] شبلی: الکلام، حصہ اول صفحہ ۱۴: ۔ حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے معراج میں خدا کو دیکھا تھا۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں ہرگز نہیں دیکھا تھا۔

[۲] سید امیر علی: "Spirit of Islam" بحوالہ احتجاج الطبرسی: ۔ امیر المومنین سے ایک روز قضا و قدر کے معنی پوچھے گئے۔ آپ نے فرمایا قضا کے معنی ہیں احکام الٰہی کا اتباع اور گناہ سے اجتناب اور قدر کا مطلب ہے پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت...... نہ یہ کہو کہ انسان مجبور ہے ...... اور نہ یہ کہ قادر ہے، ملاحظہ ہو دسواں باب صفحہ ۱۰ تا ۴۰۹۔

[۳] "تمام قدیم اقوام کی طرح عرب بھی تقدیر کے قائل تھے۔ ان کی قدیم شاعری ...... کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے انہوں نے چاروناچار قسمت کے سامنے سر جھکا رکھا تھا۔ ان کے نزدیک انسان تقدیر کے ہاتھ میں محض ایک کھلونا

ہوتا ہے کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل عربوں میں یہ خیال پیدا کیا — اور یہ وہ خیال ہے
جس کی جاہل سے جاہل شخص سے لیکر بڑے سے بڑے عالم کو ہمیشہ ضرورت رہیگی — کہ قضائے الٰہی کے
اٹل اور غیر متغیر نظام کے ساتھ انسان کی ذاتی نجات اس کے اپنے عمل سے وابستہ ہے۔ اس سے
طبائع میں جہد و توکل کے دو گونہ خصائص پیدا ہوئے اور عربوں نے محسوس کیا کہ جس چیز کو وہ اپنی
مجبوری کا ایک ناگوار سبب سمجھتے تھے وہی اُن کے لئے امید اور قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ ثابت
ہوا۔ لیکن خیالات کا یہ انقلاب جس تیزی کے ساتھ رونما ہوا تھا اُس کے سبھی متحمل نہیں ہو سکے۔
احادیث کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض متجسس یا نفاق انگیز طبائع جبر و اختیار کے اس ظاہری
تضاد سے کچھ بہت زیادہ مطمئن نہیں ہوئیں۔ یہ لوگ حکم الٰہی کے متعلق طرح طرح کے شبہات ظاہر
کرتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں بڑی سختی کے ساتھ فہمائش کی کہ قضائے الٰہی سے
انکار کرنا کسی مسلمان کے لئے زیبا نہیں لیکن ان حدیثوں میں بھی جن میں وجوب تقدیر کی شدت کے
ساتھ حمایت کی گئی ہے انسان کی اخلاقی ذمہ داری پر برابر زور دیا گیا ہے۔ کسی نے رسول اللہ صلعم
سے پوچھا "یا رسول اللہ مشرکین کی اولاد کا انجام کیا ہوگا؟" آپ نے فرمایا اس کا انحصار ان کے
اعمال پر ہے[1]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں اگرچہ
اس امر کو پسند نہیں کیا جاتا تھا کہ لوگ دین کے معاملے میں غیر ضروری غور و فکر سے کام لیں لیکن اس
قسم کے سوالات کو بالکل روکا بھی نہیں جاتا تھا لہذا اگر شہرستانی نے دینی مباحث کی ابتدا ان اسباب
سے کی ہے جو عہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ تاریخ مذاہب اسلامی
کے اس جلیل القدر مصنف نے لکھا ہے:-

"(امت اسلامیہ) میں تمام شبہات منافقین کے شبہات سے پیدا ہوئے جب انہوں

[illegible] کا اعتنا ہوا — Spirit of Islam صفحہ ۴۰۱، دسواں باب بالخصوص ملاحظہ ہو۔

[1] بخاری ۔ کتاب القدر۔

نے رسولؐ کے اوامر و نواہی پر اظہار رضامندی نہیں کیا۔ غیر ضروری باتوں میں خیال آرائی کی اور ایسی چیزوں کے متعلق سوالات کیے...... جن سے انہیں روکا گیا تھا۔ جیسا کہ حدیث ذوالخویصرۃ التمیمی سے ظاہر ہوتا ہے جس نے آنحضرت صلعم سے کہا تھا "اے محمدؐ! عدل کر تو عدل نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا اگر میں عدل نہیں کرتا تو پھر کون عدل کریگا۔ اس پر بھی اس لعین نے اپنے سوال پر اصرار کیا اور کہا کیا تو ایسی ہی تقسیم سے اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے[1]۔ یہ صریح خروج ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ جو کوئی سچے امام پر اعتراض کرتا ہے خارجی ہو جایا کرتا ہے۔ لیکن اس سے بڑا خارجی کون ہوگا جس نے سچے رسول پر اعتراض کیا۔ کیا یہ نص صریح کے مقابلے پر اپنی ذاتی عقل کا قیاس نہیں ہے؟ آنحضرت نے فرمایا اس شخص سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو دین سے کوئی تعلق نہیں رکھیگی......

یہی کیفیت منافقین کے اُس گروہ کی تھی جس نے (غزوۂ) احد میں کہا تھا "ھل لنا من الامر من شیٔ"[2] پھر ان کا یہ کہنا کہ اگر ایسا ہوتا (لو کان لنا من الامر شیٔ[3]) تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے[4]۔ اور ان کا یہ کہنا کہ اگر ہمارا کچھ اختیار ہوتا تو نہ ہم مرتے نہ قتل ہوتے[5]۔ کیا یہ صریحاً قدر نہیں ہے۔ اسی طرح مشرکین کا ایک گروہ کہتا تھا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرتے[6]۔ پھر ایک گروہ کا یہ کہنا کہ کیا ہم اسے کھلائیں جسے اللہ کھلانا نہیں چاہتا[7]۔ کیا یہ صریحاً جبر نہیں ہے؟ مشرکین

---

[1] بخاری: استتابۃ المرتدین والمعاندین، باب قتل الخوارج والملحدین۔

[2] "کیا ہمارا بھی کچھ اختیار ہے؟" قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۴

[3] قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۴

[4] ما قتلنا ھٰھنا۔ قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۴۔

[5] لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا۔ قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۵۔

[6] لو شاء اللہ ما عبدنا من دونہ من شیٔ۔ قرآن مجید، سورۃ النحل، آیت ۳۵۔

[7] أنطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ۔ قرآن مجید، سورہ یٰسین، آیت ۴۷

کا ایک اور گروہ تھا جس نے اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کے تصرفات افعال میں بحث کی حتیٰ کہ قرآن میں یہ کہہ کر ان کا رد کیا گیا کہ ویرسل الصواعق فیصیب بہا من یشاء وہم یجادلون فی اللہ و ھو شدید المحال[1] اور یہ سب کچھ اس زمانے میں ہوا جب ابھی آنحضرت صلعم صاحب قوت و شوکت اور صحیح و سالم تھے لیکن منافق ...... اسلام کا اقرار کرتے ہوئے مسلمانوں کو دھوکا دیتے تھے۔ یوں کبھی کبھی ان کے باطنی نفاق کا اظہار رسول اکرم کے افعال و اعمال پر نکتہ چینی کی صورت میں ہو جایا کرتا تھا۔ اسی سے شبہات پیدا ہوئے[2]

ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں شبہات پیدا ہوتے تھے ضروری نہیں کہ منافق ہی ہو۔ بہرحال اس عبارت کے بعد علامہ موصوف نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ان اجتہادی اختلافات کا تذکرہ کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رونما ہوئے یعنی (۱) واقعۂ قرطاس، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں دوات و کاغذ طلب کیا تو حضرت عمر نے کہا آپ پر تکلیف کا غلبہ ہے۔ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے (۲) جیش اسامہ کا معاملہ جو دوران مرض میں مرتب ہوا اور اس امر میں تذبذب تھا کہ رسول اللہ صلعم کو حالت مرض میں چھوڑ کر کوچ کرے یا نہیں۔ (۳) جب آنحضرت صلعم کا انتقال ہوا تو حضرت عمر نے کہا کہ آپ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے ہیں (۴) اس امر میں بھی اختلاف تھا کہ آپ دفن کہاں کئے جائیں مکہ میں یا مدینہ میں یا بیت المقدس میں (۵) مہاجرین و انصار نصب امام کے معاملے میں متفق الرائے نہیں تھے (۶) حضرت فاطمہؓ وراثت کی دعویدار تھیں لیکن اس کے جواب میں یہ حدیث پیش کی گئی کہ ہم نبی ہیں ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا (۷) آغاز خلافت کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ جن لوگوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا ہے ان کا قتل جائز ہے یا نہیں (۸) حضرت عمر کی جانشینی پر بھی اعتراض

---

[1] وہ بھیجتا ہے بجلیاں اور ان میں سے جسے چاہتا ہے پکڑ لیتا ہے اور وہ اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں اور اللہ بڑا صاحب قوت ہے۔ قرآن مجید، سورۃ رعد، آیت ۱۳

[2] شہرستانی: الملل والنحل، حاشیہ کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل لابن حزم، جزو اوّل، صفحہ ۱۷ - ۱۹۔

ہوا لیکن حضرت ابوبکر نے کہا میں نے جو کچھ کیا ہے امت کی بھلائی کے لئے کیا ہے (۹) حضرت عمر کے بعد پھر اختلاف رونما ہوا حتی کہ لوگوں نے حضرت عثمان پر اتفاق کیا لیکن .... آپ نے حکم ابن امیہ ...... کو واپس بلا لیا. ...... حضرت ابوذر غفاری کو ربذہ میں جلاوطن کر دیا .... عبداللہ بن سعد کو پناہ دی ...... اپنی لڑکی کی شادی مردان میں حکم سے کی اور اسے افریقہ کے مال غنیمت کا ایک خمس دیدیا ...... عبداللہ بن عامر کو بصرہ میں عامل بنایا ...... (۱۰) امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں .... طلحہ اور زبیر (رضی اللہ عنہما) نے بیعت کے بعد خروج کیا .... صفین کا واقعہ پیش آیا ..... خوارج نے جنگ کی .... عبد اللہ بن سبا اور اس کی جماعت سے بدعت وضلالت کی ابتدا ہوئی اور رسول اللہ کا یہ کہنا صحیح ہوا کہ علی کے محب غالی اور مبغض دونوں جہنم میں جائیں گے۔ علامہ موصوف کہتے ہیں اس کے بعد اختلافات کی دو قسمیں ہوگئیں۔ وہ اختلافات جن کا تعلق امامت سے تھا اور اصولی اختلافات۔[۱]

لیکن ان اجتہادی اختلافات میں بھی کہیں کہیں اصولی اختلافات کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر تشریف لے گئے ہیں جہاں سے آپ چالیس روز کے بعد واپس آجائینگے۔ شیعوں کی ایک جماعت کے عقیدۂ الرجع سے کس قدر مشابہ ہے۔ البتہ ابو الفدا نے حضرت عمر کا نام نہیں لیا۔ اس کا بیان ہے کہ ایک جماعت نے آنحضرت صلعم کی موت سے انکار کیا۔ وہ لوگ کہتے تھے آنحضرت صلعم کیونکر فوت ہو سکتے ہیں۔ آپ ہم پر شاہد ہیں آپ فوت نہیں ہوئے بلکہ عیسی علیہ السلام کی طرح آسمان پر اُٹھا لئے گئے ہیں۔[۲] بخاری میں یہ روایت مذکور نہیں لیکن یہ الفاظ موجود ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگو میری بات سنو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے تو حضرت عمر نے ایسا محسوس کیا گویا انہوں نے اس آیت کو پہلی مرتبہ سنا "وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ افإن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم۔[۳] یہاں تک کہ وہ غش کھا کر گر پڑے

---

[۱] شہرستانی، صفحہ ۲۷ - ۲۰۔ [۲] ابو الفدا: المختصر فی اخبار البشر جزاول، صفحہ ۱۵۲۔

[۳] قرآن مجید، سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۳

پھر یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر نے فرمایا "خدا تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کریگا"[۵۱] اس سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات پر ایک جماعت کے دل میں واقعی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ آپ فوت نہیں ہوئے[۵۲]۔
بہرکیف ان روایات سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ قدیم خیالات دلوں میں موجود تھے اسی طرح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا دولت اور ملکیت دولت کے متعلق اختلاف کرنا ایک زبردست معاشی اور اصولی بحث کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگوں نے طرح طرح کے سوالات کئے ہیں۔ اور اگرچہ آنحضرت صلعم نے کثرت سوال کو پسند نہیں فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روش بھی یہی رہی لیکن طبائع میں ہر قسم کے خیالات جمع ہو رہے تھے اور حضور علیہ الصلوٰة والسلام کے بعد تو ان کا دائرہ اور بھی وسیع ہوتا گیا۔ اعلام الموقعین میں ابن قیم لکھتے ہیں:-

> آنحضرت صلعم نے 'اغلوطات' سے منع فرمایا۔ ابوبکر ابن ابی شیبہ کہتے ہیں مجھ سے عیسیٰ ابن یونس نے اوزاعی سے اسناد کے ساتھ ایسی ہی روایت کی ہے۔ چنانچہ اوزاعی کا خیال ہے کہ اغلوطات سے مراد 'صعاب المسائل' ہیں۔ اور ولید بن مسلم نے اوزاعی سے' اوزاعی نے عبداللہ بن سعد بن عبادہ بن قیس الصنابحی سے اور عبداللہ ...... نے معاویہ بن ابی سفیان سے روایت کی ہے کہ وہ معاویہ کے پاس مسائل کا ذکر کر رہے تھے کہ معاویہ نے کہا کیا تم جانتے ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکل مسائل سے منع فرمایا ہے۔ ابوعمر کہتے ہیں ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوالات کو ناپسند فرمایا اور آپ نے فرمایا اللہ تعالےٰ قیل وقال اور کثرت سوال کو پسند نہیں کرتا...[۵۳]

---

۵۱ بخاری: کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ

۵۲ حاشیۃ السندی:- "بخاری کا یہ کہنا کہ عمر بن الخطاب لوگوں سے باتیں کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ حضرت عمر لوگوں سے یہ کہتے تھے کہ آنحضرت فوت نہیں ہوئے اور روایت ہے کہ آنحضرت صلعم فوت نہیں ہوں گے جبتک کہ اللہ منافقین کو ہلاک نہیں کر دیگا"۔ ملاحظہ ہو حاشیہ بخاری، مطبوعہ مصر، جزء ثالث صفحہ ۵٦۔

۵۳ (دیکھو صفحہ آیندہ)

ان عبارات سے معلوم ہوجاتا ہے کہ دینی مباحث کی داغ بیل مدینہ منورہ ہی میں پڑ چکی تھی - لہٰذا اگر ہم ان واقعات کی بنا پر یہ خیال قائم کریں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم ہی کے زمانے میں اختلافات کی بہت کافی گنجائش تھی تو غیر مناسب نہیں ہوگا - بہرکیف تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب سیاسی اور اجتماعی تفرقوں کی بنا پر مسلمان شیعی، خارجی اور اموی جماعتوں میں منقسم ہوگئے تو یہ اختلافات بھی خاموشی کے ساتھ کام کرتے رہے اور بنو امیہ کے غلبے کے ساتھ پوری شدت سے منظر عام پر آگئے شیعی اور خارجی جماعت میں سب سے بڑا مسئلہ امامت کا تھا لیکن خوارج نے قضیۂ تحکیم کے ساتھ ایک طرح سے عقائد و اعمال کی باہمی نسبت کا مسئلہ بھی چھیڑ دیا تھا - ان کا خیال تھا کہ کتاب الٰہی کے سوا کسی اور کو اپنا حکم بنانا گویا کتاب کا انکار کرنا ہے - حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جماعت کی یہ غلطی تھی کہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ کر عمرو بن عاص اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو حکم مانا - اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے کافر ہوجاتا ہے[۵] - پھر ان فرقوں کی تشکیل و تنظیم سے وہ اصولی اور فروعی مباحث نہایت تیزی کے ساتھ رونما ہوتے گئے جو آگے چلکر متعدد دینی مسائل کا مرکز بننے والے تھے - چنانچہ خوارج کے نعرہ ان الحکم الا للہ اور شیعوں کی امامت منصوص کے ساتھ بنو امیہ میں قدیم عربی خیالات کے ساتھ قسمت کا عقیدہ ازسرنو جاگزیں ہو رہا تھا - امت اسلامیہ میں تفریق پہلے ہی رونما ہو چکی تھی - سیاسی اور اجتماعی انقلابات نے مذاہب اسلامی کے نشوونما کو اور زیادہ آسان کر دیا - یہی خیال مولانا شبلیؒ نے علم الکلام میں ظاہر کیا ہے - اختلافات عقائد کے مختلف اسباب بیان کرنے کے بعد انہوں نے لکھا ہے :-

> اختلاف عقائد کے اگرچہ یہ سب اسباب فراہم تھے لیکن ابتدا پالیٹکس یعنی ملکی ضرورت سے ہوئی - بنو امیہ کے زمانے میں چونکہ سفاکی کا بازار گرم رہتا تھا - طبیعتوں میں شورش پیدا ہوئی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ابن قیم الجوزی : اعلام الموقعین، جزو اول، صفحہ ۸۰ -

۵ قرآن مجید، سورۃ مائدہ آیت ۴۴ :- ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الکفرون -

لیکن جب کبھی شکایت کا لفظ کسی کی زبان پر آتا تھا تو طرفداران حکومت یہ کہکر اُسے چپ کرا دیتے تھے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے ہم کو دم نہیں مارنا چاہیئے۔ آمنایا لقدر خیرہ و شرہ۔ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں جو ظلم و جور کا دیوتا تھا معبد جہنی ایک شخص تھا جس نے صحابہ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور دلیر اور راست گو تھا۔ وہ امام حسن بصری کے حلقۂ درس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے امام صاحب سے عرض کی کہ بنو امیہ کی طرف سے قضا و قدر کا جو عذر پیش کیا جاتا ہے کہاں تک صحیح ہے۔ امام صاحب نے کہا " یہ خدا کے دشمن جھوٹے ہیں " وہ پہلے سے بنو اُمیہ کی زیادتیوں پر طیش میں بھرا ہوا تھا۔ اب علانیہ بغاوت کی اور جان سے مارا گیا۔

معبد کے بعد غیلان دمشقی نے اس خیال کو ترقی دی۔ وہ حضرت عثمان کا غلام تھا اور محمدؐ بن حنفیہ سے بیک واسطہ تعلیم پائی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو اُس نے ایک نہایت آزادانہ خط لکھا اور بنو امیہ کے مظالم پر توجہ دلائی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسے بلا بھیجا اور شاہی توشہ خانہ کے نیلام کی خدمت سپرد کی وہ بر سرِ عام نیلام کرتا تھا اور پکار پکار کر کہتا جاتا تھا " یہ وہ مال و اسباب ہے جو ظلم اور جبر سے حاصل کیا گیا تھا " اس وقت اسلام کی قدیم سادگی بہت کچھ باقی تھی تاہم توشہ خانہ میں تیس ہزار جرابیں نکلیں۔ غیلان نے کہا " صاحبوا اس ظلم کی کچھ حد ہے کہ عوام فاقے کرتے تھے اور ہمارے فرمانروا تیس تیس ہزار جرابیں توشہ خانہ میں مہیا رکھتے تھے ...... ہشام بن عبدالملک ...... غیلان کی کارروائیاں آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ تخت نشینی کے ساتھ اس کو طلب کیا اور بغاوت انگیزی کے جرم میں اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا دئے .... آخر اسی جرم میں جان سے مارا گیا۔

اسی زمانہ میں جہم بن صفوان پیدا ہوا۔ وہ بھی امر بالمعروف کے اسی جرم پر قتل ہوا۔ لیکن یہ خون خالی نہیں گئے اور امر بالمعروف کا مسئلہ زیادہ پھیلا اور اس قدر زور پکڑا کہ ایک گروہ کثیر ...... بالآخر معتزلہ کے لقب سے پکارا گیا ...... ۱۲۵ھ میں جب ولید تخت نشین ہوا تو اس فرقے کا شمار ہزاروں سے تجاوز کر چکا تھا یہاں تک کہ خود خاندان بنی امیہ میں یزید بن الولید نے

یہ مذہب اختیار کیا...... اس کے طرفداروں میں ایک عمرو بن عبید تھا جو مذہب اعتزال کا بہت بڑا امام گزرا ہے۔

ملکی ضرورت نے اگرچہ جبر و قدر کے مسئلہ پر توجہ دلائی لیکن جب ایک دفعہ کسی وجہ سے خیالات میں حرکت پیدا ہوئی تو بڑھتی گئی یہاں تک کہ بنوامیہ کا دور ختم نہیں ہوا تھا کہ خلق قرآن، تنزیہ و تشبیہ صفات باری وغیرہ کی بحثیں چھڑ گئیں اور...... چند ہی روز میں بیسیوں فرقے نکل آئے۔[۱]

واقعات کے مطالعہ سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے جس طرح شیعوں کی امامت منصوص کے خلاف خوارج میں امام کی ذات کے متعلق انتہائی جمہوریت کا خیال پیدا ہوا۔ اسی طرح جب بنوامیہ نے اپنی ہر زیادتی کے لئے قضا و قدر کا عذر پیش کرنا شروع کیا تو اہل بیت اور شیعیان اہل بیت نے انسان کی اخلاقی ذمہ داری پر زور دیا۔ سیاسی اعتبار سے یہ مختلف عقائد ان مختلف جماعتوں کیلئے کس قدر موزوں تھے۔ حامیان بنوامیہ کے ساتھ ہی ارض شام میں مرجیہ کا ظہور ہوا جن کی یہ رائے تھی کہ گنہ سے کفر لازم نہیں آتا۔ یہ دوسرا حربہ تھا جو شیعی اور خارجی جماعتوں کے خلاف اہل شام کو میسر آیا۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین کے نزدیک یہ فرقہ اس زمانے کے سیاسی حالات کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔[۲]

---

[۱] شبلی: علم الکلام، حصہ اول، صفحہ ۱۹-۱۷

[۲] شہرستانی: الملل والنحل، حاشیہ کتاب الفصل، صفحہ ۱۸۶:۱۔ رجا کے دو معنی ہیں تاخیر اور رجا (امید) لیکن مرجیہ کا اطلاق اول الذکر پر ہوتا ہے اس لئے کہ انہوں نے عمل کو نیت پر مؤخر رکھا۔ البتہ دوسرے معنوں میں یہ مطلب ہوگا کہ مرجیہ وہ تھے جو کہتے تھے کہ ایمان کے ساتھ معصیت کوئی ضرر نہیں پہنچاتی جیسے کفر کے ساتھ اطاعت بیکار ہے۔

"دربار دمشق میں جس سے کسی شیعہ یا خارجی کو اتفاق نہیں ہو سکتا تھا خیالات کا جو عالم تھا ان کیلئے، انکے عقائد کس قدر موزوں تھے...... ان کو ابنائے وقت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا...... دولت امویہ کے ساتھ مرجیہ کا بھی خاتمہ ہو گیا اس لئے کہ اب انکی کوئی ضرورت نہیں تھی" براؤن: تاریخ ادبیات ایران، جلد اول، صفحہ ۲۸۰۔

محدثین نے بھی اس فرقے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا[۵۴]۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں یہ واقعات تھے جو مسلمانوں کے ذہنی اضطراب سے طرح طرح کے دینیاتی مباحث کا موجب ہوئے۔ مرجیہ اور قدریہ یا معتزلہ کی بنا نہ مسیحی اثرات کا نتیجہ تھی جیسا کہ فان کریمر نے ظاہر کیا ہے[۵۵] نہ یہ محض عجمی اقوام کی اسلام دشمنی تھی جسے غلطی سے ابن حزم نے تمام اصولی اختلافات کا باعث قرار دیا ہے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:۔

> دین اسلامی میں اکثر فرقے اس لئے پیدا ہوئے کہ وسعت سلطنت اور دوسری اقوام پر غلبہ اور برتری کے اعتبار سے ایرانی تمام اقوام سے افضل تھے۔ وہ اپنے آپ کو احرار اور ابنا کہتے تھے اور دوسروں کو غلام۔ لیکن جب ان کی سلطنت عربوں نے چھین لی جو اہل ایران کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے تو یہ ان کے لئے ایک عظیم الشان مصیبت تھی۔ لہذا انہوں نے دین اسلام میں رخنہ اندازی شروع کی لیکن اللہ تعالےٰ نے حق کا بول بالا کیا۔[۵۶]

اب یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہر ایرانی محض اس ارادے سے اسلام قبول کرتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسلام میں کوئی فتنہ برپا کر سکے۔ یہ کہنا کہ کسی ایرانی نے خلوص نیت سے اسلام قبول نہیں کیا ایک ایسا مبالغہ ہے جسے کوئی شخص تسلیم نہیں کریگا۔ علاوہ ازیں اسلام نے جس عظیم الشان مذہبی تحریک کی بنا رکھی تھی اس کا یہ تقاضا تھا کہ متمدن دنیا اپنے معتقدات پر ایک مرتبہ پھر نظر ثانی کرتی۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کا ہر طبقہ اپنی مخصوص دشواریوں کو حل کر رہا تھا اور اس کے ساتھ عقائد اسلامی میں نئے نئے خیالات سرایت کر رہے تھے۔ یہ اسلام ہی کی ہمہ گیر روح تھی جس نے مسلمانوں کی ہر علمی اور عملی تحریک کے لئے نقطۂ آغاز کا کام دیا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح امت اسلامیہ کے داخلی شئون سے دینی مباحث کا آغاز ہوا۔ مسلمان علما نے نہ عیسائیوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا نہ وہ کسی ایرانی

---

۵۴ صحیح مسلم کتاب الایمان۔ کنز العمال جزء اول، باب فی ذم القدریہ والمرجیہ۔ شبلی: علم الکلام، جزء اول، صفحہ ۲۶۔

۵۵ تمدن اسلامی پر ایک نظر Culturgeschichtliche Streifzüge

۵۶ ابن حزم: کتاب الفصل فی الملل والاہوا والنحل، جزء ثانی، صفحہ ۱۱۵۔

سازش کے زیر اثر تھے ۔ دراصل وہ تمام خیالات جو مذاہب اسلامی کی تہ میں کام کرتے رہے اس وقت کے اخلاقی اور ذہنی ماحول میں موجود تھے ۔ جب ان کا تصادم تعلیمات قرآنی سے ہوا تو نئے نئے مباحث کا آغاز ہوا ۔ ہمیں اس امر سے انکار نہیں کہ ان خیالات کا بہت سا حصہ مذاہب اسلامی میں ملگیا اور ان سے مسلمانوں کے اکثر فرقے متاثر بھی ہوئے لیکن دینیات اسلامی کا نشو و نما ایک آزادانہ تحریک تھی جو ازخود مسلمانوں کے اندر رونما ہوئی ۔ جس طرح مدینہ منورہ میں فقہی مذاہب کا آغاز ہوا اور مسلمانوں نے ایک غیر معمولی ذہانت کے ساتھ قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر، لغت، نحو، ادب اور تاریخ وغیرہ علوم کی طرف توجہ کی ــــ یاد رہے کہ ان کا یہ علم کسی بیرونی سرچشمے سے ماخوذ نہیں تھا ــــ اسی طرح دینی مسائل کی ابتدا ہوئی ۔ اسلام کے اولین فقہا اور محدثین کے ساتھ ہمیں ان بزرگوں کے نام بھی ملتے ہیں جنہوں نے مذہب کے معاملے میں غور و فکر سے کام لیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے امام جعفر الصادق (رضی اللہ عنہ) کی بدولت مسلمانوں میں ایک نہایت ہی خوشگوار ذہنی تحریک کا آغاز ہو رہا تھا[۱]۔ امام حسن بصری کو بیک وقت صوفی اور عالم دینیات خیال کیا جاتا ہے ۔ بنو امیہ کے عقیدۂ تقدیر کے متعلق انکی جو رائے تھی وہ معبد جہنی کے واقعہ سے ظاہر ہو سکتی ہے[۲]۔ مسلمانوں کی یہی ذہنی سرگرمیاں تھیں جو ان کے سیاسی اور اجتماعی تفرقات اور مختلف مسلم اقوام کے افکار و آرا سے ملکر مذاہب اسلامی کا سنگ بنیاد ثابت ہوئیں ۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمام وہ ارتجاعی اور ملحدانہ تحریکیں جو اسلام کے خلاف پیدا ہوئیں خواہ وہ زرتشتی عقائد کا نتیجہ ہوں یا مانویت اور یونانیت کا، وہ سب کی سب مذاہب اسلامی کی ابتدا سے مؤخر تھیں ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم ان خیالات کی طرف توجہ کریں جن سے بظاہر اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے "کہ مذاہب اسلامی کا نشو و نما مسیحی اور ایرانی اثرات کے ماتحت شروع ہوا ۔

---

[۱] ملاحظہ ہو "اسپرٹ آف اسلام" اور ابن خلکان، وفیات الاعیان ۔

[۲] ملاحظہ ہو ابن خلکان جز اول ۔

انگلستان کا ایک فاضل مستشرق لکھتا ہے :-

اسلامی دینیات کا نشو و نما...... آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد شروع ہوا جب تک آپ زندہ تھے...... ظاہر ہے کہ کوئی نظام دینیات قائم نہیں ہو سکتا تھا...... بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی بدعات کی ابتدا مبہم سی ہے...... قدیم اہل الاہوا کے متعلق ہمیں کچھ نا تمام سے قصص ملتے ہیں...... بایں ہمہ تاریخ کے اس دھندلکے میں دو فرقوں کا پتہ چلتا ہے جن پر اس زمانے کے تاریخی واقعات اور فلسفیانہ ضروریات کا بہت کافی اثر تھا۔ ان میں سے ایک مرجیہ ہے دوسرا قدریہ...... خوارج اور شیعہ بنو امیہ کو کافر سمجھتے تھے...... لیکن مرجیہ کہتے تھے کہ بنو امیہ مسلمانوں کے فی الواقعہ (de facto) خلفا ہیں اور توحید کے قائل...... لہذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت کریں...... معلوم ہوتا ہے اس طرح مرجیہ کی ابتدا ہوئی۔ گویا سیاسی اعتبار سے وہ خوارج کے تشدد فی الدین کے مخالف تھی۔

قدریہ کا ظہور ذہن انسانی کے ایک عقلی اقتضا کا نتیجہ تھا۔ افراد و اقوام کو خدا کے حکم مطلق اور انسانی عمل کی آزادی میں جو تضاد نظر آتا ہے اسی سے انکی منکرانہ زندگی کا آغاز ہوا ہے۔ یہی کیفیت اسلام کی تھی...... جب تک مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے رہے ان کے خیالات پر خدا کے حکم مطلق کا عقیدہ حاوی رہا[۱]...... اسی فرقے کے بانیوں میں سے ایک معبد الجہنی تھا جو ۸۰ھ میں الحاد کے جرم میں مقتول ہوا (اس کے بعد مصنف نے معبد الجہنی اور امام حسن بصری کی اس گفتگو کا ذکر کیا ہے جس کی طرف اس سے پہلے اشارہ ہو چکا ہے)

...... تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فرقہ بندی کا رجحان پیدا ہوا...... مرجیہ اور قدریہ کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن ان کا کچھ حصہ کٹر اسلام میں مل گیا اور کچھ ایک جدید فرقے میں...... اس فرقے کا آغاز پھر حسن بصری کی طرف منسوب ہے جن کی ذات معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں تمام

---

[۱] کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ جب خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو انکو اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس ہوا۔ نیازی۔

مذہبی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ کسی نے آپ سے پوچھا .... مرجیہ اور وعیدیہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ مرجیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو جب بھی وہ مسلمان ہی رہتا ہے لیکن وعیدیہ کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو جاتا ہے .... پیشتر اس کے کہ امام موصوف کچھ جواب دیں عمرو بن عبید یا واصل ابن عطا دونوں میں سے کسی نے کہا کہ اس کی حیثیت دونوں کے بین بین ہو گی۔ ایسا شخص نہ مسلمان ہو گا نہ کافر .... اس کے بعد وہ امام صاحب کے حلقے سے اٹھکر مسجد کے ایک دوسرے حصے میں چلا گیا تاکہ وہاں اپنے خیالات کو باقاعدہ بیان کر سکے .... اس پر امام صاحب نے اپنے اس شاگرد کے متعلق کہا اعتزل عنا اور اسطرح اس نئے فرقے کا نام معتزلہ ہوا .... اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں ایک ایسی جماعت موجود تھی جو .... قرآنی عقائد کو عقل سے سلجھا رہی تھی[ل]

سطور بالا سے ہمارے پچھلے بیانات کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے لیکن اس قدر لکھنے کے بعد مسٹر میکڈانلڈ نے مستشرقین کے اس مفروضہ نظریے سے مجبور ہو کر جو اسلام کے نشو و نما کو مسیحی افکار کا نتیجہ ٹھہراتے ہیں لیکن جس کی تائید میں وہ کسی تاریخی شہادت کو معقولیت کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے اس امر کا ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ مرجیہ اور قدریہ کا ظہور مسیحی اثرات کے ماتحت ہوا۔ مسٹر میکڈانلڈ کہتے ہیں :-

> مرجیہ اور قدریہ کے نشو و نما میں ہم دینیات یونانی کیساتھ بازنطینی اور شامی مذاہب کی دھینگا مشتیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ امر غور طلب ہے ... کہ شیعہ اور خوارج کی سیاسی بدعات کا ظہور عرب، عراق اور ایران میں ہوا لیکن خالص مذہبی بدعات کی ابتدا سب سے پہلے شام اور بالخصوص دمشق میں ہوئی جو اموی خلفا کا مستقر تھا .... دولت امویہ نے بہت سی باتوں[ل]

ل D. B. Macdonald — Muslim Theology

فصل سوم، باب اول، صفحہ ۳۰ - ۱۲۱ -

میں عرب قبل اسلام کے خیالات کو اختیار کرلیا تھا...... ان کے زمانہ میں سرجیس.... ایک اموی خلیفہ کا خزانچی تھا۔ سرجیس کے بعد یہ عہدہ اس کے بیٹے کو ملا...... جو یونانی کلیسا کا آخری امام ہے۔ اسی کے ہاتھوں یونانی دینیات کی تکمیل ہوئی...... اس کی اور اس کے شاگرد تھیوڈر ابوکارا کی تحریروں میں اسلام پر مناظرانہ رسالے موجود ہیں جنکو اس انداز میں لکھا گیا ہے گویا عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان بحث ہو رہی ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس سے اس زمانے کے خصائص کا اظہار ہوتا ہے۔ مرجیہ اور قدریہ اور یونانی کلیسا اور یوحنائے دمشقی کے خیالات میں جو مشابہت پائی جاتی ہے اس کی تشریح کی یہی ایک صورت ہے۔[۵]

اب بغیر اس امر پر غور کئے کہ ازمنۂ قدیم کی وہ مسخ شدہ عیسائیت جس میں ہر طرح کے مشرکانہ تخیلات کام کر رہے تھے اور جس کے پیروؤں کی ساری زندگی دن بدن وثنیاتی صورت اختیار کر رہی تھی ذات الٰہی اور خود مذہب کے متعلق ان اعلیٰ اور ارفع تخیلات کا کیونکر موجب ہوسکتی تھی جو اسلام کے ساتھ ظہور میں آئے مسٹر میکڈانلڈ نے حمایت مذہب کے جوش میں یوحنائے دمشقی کی تحریروں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی کوشش کی ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کے قدیم مذاہب اور بالخصوص عیسائیت کی حالت جس قدر ناگفتہ بہ تھی سب کو معلوم ہے۔ عیسائیت کے اس خوفناک انحطاط اور اس کی انتہائی پستی کو دیکھتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فرض نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے کسی طرح اسلام یا فرقہ ہائے اسلامی متاثر ہوسکتے تھے۔ بایں ہمہ مسٹر میکڈانلڈ کا خیال ہے کہ:-

بحیثیت مجموعی اگرچہ یہ مسئلہ مزید تحقیقات کا محتاج ہے لیکن یونانی دینیات نے اسلام پر جو اثر ڈالا ہے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ صرف یہ امر کہ دونوں نے ذات و

---

[۵] D. B. Macdonald, Muslim Theology
فصل سوم، باب اوّل، صفحہ ۱۳۲-۱۳۱

صفات الٰہی کے مسئلے پر بے حد زور دیا ہے اس بات کا بہت کافی ثبوت ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانان مغرب بالخصوص علمائے اسپین کے خیالات میں جو تشدد پایا جاتا ہے وہ لاطینی اور آگسٹائینی اثرات کا نتیجہ ہے۔[۵]

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر میکڈانلڈ نے واقعات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دو چیزوں کی ظاہری اور سطحی مشابہت سے بلا وجہ ایک کو اس کی علت اور دوسری کو اس کا نتیجہ قرار دیا حالانکہ دو چیزوں میں مشابہت کا موجود ہونا اس امر کا ثبوت نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک دوسری سے ماخوذ ہے۔ تاریخی حقائق علت و معلول کے اس مفروضہ رشتہ کے اور بھی مخالف ہیں۔ گزشتہ صفحات میں ہم یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ جبر و قدر اور دوسری بحثوں کا آغاز کیونکر ہوا۔ باعتبار زمانہ یہ سب بحثیں عہد امویہ سے مقدم تھیں۔ فان کریمر نے لکھا ہے کہ عقیدۂ 'قدر' کی بنا ان دو عیسائی علما نے ڈالی جو دمشق میں رہتے تھے اور شب و روز عربوں سے میل جول رکھتے تھے یعنی یوحنائے دمشقی اور تھیوڈور ابو کارا[۶]۔ اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ مسلمانوں میں یہ خیالات مشرقی کلیسا سے بہت پہلے رونما ہو چکے تھے اور معبد جہنی یوحنائے دمشقی کا معاصر تھا لیکن دمشق کی کسی مسیحی جماعت سے ربط و ضبط رکھنے کی بجائے امام حسن بصری کے حلقہ درس میں شریک ہوتا تھا ہم فان کریمر اور مسٹر میکڈانلڈ کے مناہج تحقیق کے ماتحت یہ فرض کر لینے میں کہیں زیادہ حق بجانب ہیں کہ مشرقی کلیسا کے یہ خیالات اسلامی اثرات کا نتیجہ تھے۔ بہر کیف اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ خوارج اور شیعہ جماعتوں کے ظہور میں کسی مسیحی یا غیر اسلامی اثر کا حصہ نہیں بلکہ یہ آویزش خلافت کے داخلی شئون کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔ لہٰذا اگر شیعی اور خارجی فرقوں کے مقابلہ میں مرجیہ اور قدریہ کا

---

[۵] D. B. Macdonald, Muslim Theology
فصل سوم، باب اول، صفحہ ۱۳۲ - ۱۳۳

[۶] فان کریمر: تمدن اسلامی پر ایک نظر۔

ظہور ارض شام میں ہوا تو اس لئے نہیں کہ یوحنائے دمشقی یا تھیوڈورابوکارا کا قیام دمشق میں رہتا تھا بلکہ اس لئے کہ ارض شام کا یہ قدیم شہر خلفائے امویہ کا مرکز تھا اور ان کے جور واستبداد اور 'جبری' رجحانات کے خلاف اگر احتجاج ہو سکتا تھا تو یہیں اور یہیں یہ لوگ خوارج کے اُن سخت اور متشددانہ خیالات کے خلاف جو احساس معصیت سے پیدا ہوئے اپنے انجام کو امید واطمینان کی نظر سے دیکھتے ہوئے 'رجا' پر زور دے سکتے تھے۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ یہ خیالات صرف دمشق تک محدود تھے غلطی ہوگی۔ مدینہ منورہ کے بعد اگرچہ دنیائے اسلام کا سیاسی مرکز دمشق ہوا لیکن ملت اسلامیہ کی ذہنی اور علمی مرکزیت کوفہ اور بالخصوص بصرہ کے حصے میں آئی تھی۔ یہیں مسلمانوں کی متفرق جماعتیں ـــ بالخصوص عرب اور ایرانی ـــ اپنی گزشتہ روایات اور باہمی ربط وضبط کی بدولت مختلف مسائل کی طرف متوجہ ہوئیں اور یہیں سے عقیدہ 'قدر' کی رو معبد جہنی کے ساتھ شام میں پہنچی۔ رفتہ رفتہ مذہب اعتزال نے ایک باقاعدہ فرقہ کی صورت اختیار کی اور آگے چلکر جب مسلمان علما کے ایک طبقے نے فلسفہ وحکمت کے مطالعہ کے بعد اپنے آپ کو 'حکما' کے نام سے موسوم کیا تو عقیدہ اور عقل کے باہمی تضاد کو دور کرنے کے لئے علم کلام کی بنیاد پڑی۔ اکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مذاہب غیر سے ربط وضبط کی وجہ سے مسلمانوں نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہوں انکا جواب دینے کی کوشش کی جائے۔ یہ مختصر کیفیت ہے مذاہب اسلامی کی ابتدا اور ان کے نشو ونما کی معلوم ہوتا ہے خود مسٹر میکڈ انلڈ بھی نادانستہ طور پر ان حقائق کو محسوس کر رہے تھے اس لئے کہ اپنے گزشتہ خیالات کے اظہار کے بعد انہیں فوراً اس امر کو تسلیم کرنا پڑا کہ :-

"مسلمان عیسائی علما کی تحریروں کا مطالعہ نہیں کرتے تھے۔ دراصل یہ خیالات باہمی ربط وضبط اور بحث ومباحثہ میں منتقل ہو رہے تھے۔ یوحنائے دمشقی کے رسالے کی ترتیب ہی سے اس امر کا پتہ چلتا ہے جس کی عبارت یوں ہے کہ اگر عرب تم سے یہ کہے تو اس کے جواب میں یہ کہنا ...."[1]

پھر آگے چلکر لکھتے ہیں :-

یونانی فلسفہ، زرتشتیت، مانویت، حران کی قدیم وثنیت، یہودیت، عیسائیت یہ
سب چیزیں فضا میں موجود تھیں اور اپنا اثر ڈال رہی تھیں[1]

بالفاظ دیگر یہ سب خیالات اس وقت کے ذہنی اور مذہبی ماحول میں موجود تھے اور طبائع میں پہلے ہی سے اس امر کی بہت کافی گنجائش تھی کہ اگر کوئی جدید مذہبی تحریک پیدا ہو تو وہ از سرنو ان خیالات کی طرف توجہ کریں۔ لیکن ان خیالات کے ابھرنے کے لئے جو افراد و اقوام کے حافظے میں ایک غیر شعوری صورت اختیار کر چکے تھے کسی شدید محرک کی ضرورت تھی۔ لہذا جون ج ں

(نوٹ صفحہ گزشتہ) D. B. Macdonald, Muslim Theology
فصل سوم، باب اول، صفحہ ۱۳۳

خوش قسمتی سے میرے پیش نظر کتب خانہ جامعہ کا وہ نسخہ تھا جو زندان بیجاپور میں مولانا محمد علی مدظلہ کے زیر مطالعہ رہ چکا ہے۔ مولانائے محترم نے مسٹر میکڈانلڈ کے اس جملے پر یہ نہایت ہی صحیح خیال ظاہر کیا ہے کہ "یہ خیالات پہلے ہی سے فضا میں موجود تھے ..... یوحنائے دمشقی کو غالباً مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی مخالفت منظور تھی جس کے جواب میں مسلمانوں نے ایک اور نظام "سولاسطیت" مرتب کیا۔ مولانا کی اصل عبارت یہ ہے :-

The ideas were in the air the commonplaces of the times. What John of Damascus did perhaps was to prepare a defence of the proselytising activities of the Mussalmans and Mussalmans in reply built up another system of scholastics.

[1] D. B. Macdonald, Muslim Theology
فصل سوم، باب اول، صفحہ ۱۳۴۔

مسلمانوں کی داخلی زندگی میں نئے نئے انقلابات رونما ہوئے اسی لحاظ سے یہ تمام افکار منظر عام پر جلوہ گر ہوتے گئے۔ اس طرح اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذاہب اسلامی کا ظہور اور اُن کی تشکیل و انضباط کسی مسیحی یا ایرانی اثر کا نتیجہ نہیں تھا۔ نہ اس کے اسباب و علل کے لئے ہمیں کسی غیر اسلامی سرچشمے کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اسلامی دینیات اور اس کے مختلف مذاہب کی بنا ایک آزادانہ تحریک تھی جو از خود رونما ہوئی کچھ اس غور و فکر کی گفتگو سے جس کا آغاز مدینہ منورہ ہی میں ہو گیا تھا اور کچھ عرب اور نومسلم اقوام کے باہمی اختلاط و ارتباط کی وجہ سے جس سے مسلمانوں کے اندر ایک جدید ذہنی تحریک کا آغاز ہوا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اسلامی دینیات اور اس کے مختلف مذاہب خارجی افکار سے متاثر ہوئے ہیں بلکہ ایک حد تک یہ افکار ان کے محرکات بھی ثابت ہوئے ہیں لیکن یہ محض اس لئے کہ جس دنیا میں اسلام کا ظہور ہوا تھا اس میں قدیم افکار اور ادارات موجود تھے۔ جب ان قدیم افکار و ادارات کا تصادم اسلامی تعلیمات سے ہوا تو ان کا ایک حصہ اسلام میں مل گیا اور باقی یا تو ہمیشہ کے لئے محو ہو گئے یا اپنا دھندلا سا نقش مذاہب اسلامی پر چھوڑ گئے۔

عینک فروش

ڈاک گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی مجھے معمولی سواری گاڑی کی رفتار سے بھی وحشت ہوتی ہے اور ڈاک گاڑی کی تیزی سے تو اختلاج ہونے لگتا ہے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اگر خدانخواستہ میرے سفر کی سمت غلط ہو تو جتنی تیز یہ گاڑی چلے گی اتنا ہی میں منزل مقصود سے دور ہو جاؤں گا۔ پھر سوچتا ہوں کہ یہی صورت زندگی کے سفر کی ہے سست قدم راہ رو اگر غلط راہ بھی اختیار کرتے تو دن بھر میں منزل سے زیادہ دور نہ ہٹے گا لیکن وہ مسافر جو برق رفتار مرکب پر سوار ہے۔ راہ سے بے راہ ہو جائے تو دم بھر میں خدا جانے کہاں جا پہنچے گا۔ عقل کہتی ہے کہ یہ منطق غلط ہے۔ تیز چلنے والا تیزی سے واپس بھی آسکتا ہے مگر جو شخص قدم گن گن کر رکھتا ہے اُسے آدھی دور سے لوٹنا پڑے تو جانے میں جتنی دیر لگی تھی اتنی ہی آنے میں لگے گی۔ کس کی مجال ہے کہ ریاضی کی اس مساوات سے انکار کرے مگر یہ بتائے کہ پچھلے مہینے جب میں دلی سے لاہور جانا چاہتا تھا اور غلطی سے بمبئی کی ڈاک میں بیٹھ کر جھانسی جا پہنچا، جہاں آٹھ گھنٹے تک واپسی کے لئے پسنجر بھی نہ ملی اس وقت یہ مساوات کہاں چلی گئی تھی۔ اس وقت میں ریاضی سے سر پھوڑتا یا منطق کو لے کر چاٹتا۔ ریاضی اور منطق کی صحت مسلم مگر زندگی میں انکا استعمال اتنا سہل نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ غرض مجھے ڈاک گاڑی کی رفتار سے ڈر لگتا ہے۔ میرا سر چکراتا ہے طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے بات بات پر غصہ آتا ہے۔ ہر شخص سے لڑنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے لئے منطقی دلیل یا ریاضی کی مساوات کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں ڈیوڑھے درجے کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں بیٹھا تھا جس میں آمنے سامنے صرف دو بنچیں تھیں۔ میرے علاوہ تین مسافر اور تھے۔ ان میں سے ایک پہلی نظر میں

موٹے معلوم ہوتے تھے، دوسری نظر میں اس سے بھی زیادہ موٹے اور تیسری نظر میں یہ انکشاف ہوتا تھا کہ گو آنکی آنکھیں کھلی ہیں اور منہ بھی کھلا ہے مگر وہ سو رہے ہیں۔ یہ بزرگ میرے سامنے کی پوری بنچ پر پھیلے ہوئے بیٹھے تھے اور جب کبھی میں نظر اٹھاتا تھا مجبوراً انکے چہرے کی زیارت ہوتی تھی۔ مجھے انکے موٹاپے سے اور انکے یوں بیساختہ سونے سے بڑی کوفت ہوتی تھی اور جب یہ سوتے سوتے جوش میں آکر خراٹے بھی لینے لگتے تھے تب تو بیساختہ جی چاہتا تھا کہ بقیہ دو مسافروں کی مدد سے انہیں اٹھا کر کھڑکی سے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ دروازے سے باہر پھینکدوں۔

میں بنچ کے ایک سرے پر تھا اور میرے داہنے ہاتھ پر ایک نوجوان بیٹھے تھے جن کے چہرے سے کسی گہرے صدمے کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ انکے لب خشک تھے، چہرے کا رنگ زرد تھا اور آنکھوں کی بے حالی سے دل کی بے چینی ٹپک رہی تھی۔ بنچ کے دوسرے سرے پر ایک پیر مرد نیم دیسی نیم انگریزی وضع کے تشریف فرما تھے جنہیں میں نے اکثر ریل میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ انکے ساتھ ایک چمڑے کا ہینڈ بیگ تھا جس پر ان کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کئی بار اسے پڑھنے کی کوشش کی تھی مگر چونکہ یہ کھٹکا رہتا تھا کہ وہ میرے اس خلاف تہذیب تجسس کو نہ دیکھ لیں اس لئے کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی آج موقع پاکر میں نے اتنا معلوم کر لیا کہ وہ عینک کے ایک مشہور کارخانے کے ایجنٹ ہیں۔ نام دوسری طرف تھا اسے نہ پڑھ سکا۔

میں خود ریل میں باتیں نہیں کرتا اور چاہتا ہوں کہ کوئی نہ کرے۔ اسی لئے حتی الامکان خالی درجے میں بیٹھا کرتا ہوں۔ مگر ڈیوڑھے درجے میں خالی ڈبہ بتقدیر ہی سے ملتا ہے۔ آج میرے ساتھ تین مسافر تھے مگر بظاہر ان میں سے کسی سے یہ اندیشہ نہ تھا کہ زیادہ باتیں کریگا سامنے کی بنچ والے خواہ مخواہ مرد آدمی کا شمار تو اس وقت حیوان ناطق کی ذیل میں تھا ہی نہیں۔ رہے وہ دونوں حضرات جو میری بنچ پر تھے ان میں سے نوجوان تو بیچارے

حزن وملال کی تصویر بنے ہوئے تھے اور پیر مرد عینک فروش کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھے۔ اس لئے میں اطمینان سے بیٹھا گاڑی لڑنے، پل ٹوٹنے، آدمیوں کے گرنے کچلنے، مرنے کے تصور سے اپنے دل کو دہلانے اور پریشان کرنے کا سامان کر رہا تھا۔

گاڑی ...... اسٹیشن پر رکی۔ باہر کی چہل پہل کے اثر سے ہمارے چھوٹے سے حلقے میں بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ ہمارے نوجوان رفیق گھبرا کر اس انداز سے اٹھے گویا یہیں اترنا چاہتے ہیں، مگر جب انھوں نے کھڑکی کے پاس جا کر اسٹیشن کا نام پڑھا تو کسی قدر مایوسی کے ساتھ آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ موٹے مسافر نے بھی گاڑی ٹھہرتے ہی آنکھ کھولی اور بیٹھے ہی بیٹھے اسٹیشن کیطرف مڑ کر گردن کھڑکی میں سے نکالی۔ انہوں نے اس کریہہ آواز سے جو شاید نزع کے وقت انجن کے گلے سے نکلتی ہوگی سودے والوں کو بلایا اور تھوڑی دیر میں ان کی بنچ کے ایک کونے میں مٹھائی، پوری، کباب، دہی بڑے، گگڑی امرود اتم غلم کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ میں سمجھا کہ شاید انہیں کئی دن تک مسلسل سفر کرنا ہے اس لئے انہوں نے یہ ذخیرہ جمع کر لیا ہو لیکن جب انہوں نے نیت باندھ کر کھانا شروع کیا تو میرے دیکھتے دیکھتے چند منٹ میں وہ سارا سامان رسد انکے صندوق شکم میں جا کر غائب ہو گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے ایک بڑا سا لوٹا اٹھایا اور منہ سے لگا کر ایک سانس میں خالی کر دیا پھر آستین سے منہ پوچھا، ڈکار لی، گاڑی کی دیوار کے سہارے سے پھیل کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کرلیں اور چشم زدن میں جہاں سے آئے تھے وہیں پہنچ گئے۔

میں اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر دل میں کڑھ رہا تھا کہ گاڑی چلی اور پیر مرد نے جو اب تک برابر مطالعے میں مصروف تھے دفعتہً کتاب بند کر دی اور نوجوان مسافر کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے "آپ کہاں تشریف لیجا رہے ہیں" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے یہ بات بیحد ناگوار ہوئی۔ مغربی تہذیب میں اگر مجھے کوئی اصول پسند ہے تو یہ کہ جس شخص سے تعارف نہ ہو اس سے بے ضرورت گفتگو کرنا جائز نہیں۔ میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں

آپ کو ایک اجنبی سے اس طرح سوال کرنے کا کیا حق ہے مگر خیال ہوا کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ تمہیں دخل در معقولات کا کیا حق ہے اس لئے میں خاموش ہو رہا لیکن دل میں دعا مانگتا تھا کہ وہ نوجوان پیر مرد کی اس جسارت پر ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ مگر نوجوان نے ڈوبی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا "کیا عرض کروں کہاں جا رہا ہوں" اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ گفتگو کا سلسلہ چلا اور دیر تک چلا۔ غصّہ تو مجھے ضرور آیا مگر اسی کے ساتھ یہ اشتیاق بھی تھا کہ نوجوان کی اس شکستہ دلی اور مایوسی کی وجہ معلوم ہو بظاہر تو میں منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا مگر کان ان دونوں کی گفتگو پر لگے تھے۔

"آپ بہت اداس معلوم ہوتے ہیں"

"جی ہاں کچھ ایسی ہی پریشانیاں ہیں"

"آخر معلوم تو ہو وہ کونسی ایسی بات ہے جس نے آپ کو شگفتگی کے موسم میں پژمردہ کر دیا ہے۔ میری اس بے تکلفی کو معاف کیجئے میں بے فائدہ دوسروں کے حالات کا تجسس نہیں کرتا۔ آپ سے یہ سوال اس لئے پوچھتا ہوں کہ شائد آپ کی کچھ مدد کر سکوں"

"میں آپ کی اس بزرگانہ شفقت کا شکرگزار ہوں مگر میری مدد دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا"

"آپ کیوں میرا حوصلہ پست کرتے ہیں اپنی سی کوشش تو کرنے دیجئے"

"جب آپ کی کوشش ناکام ہو گی تو حوصلہ اور زیادہ پست ہو گا"

"نہیں ایسا نہیں۔ راہ سعی میں پیروں کا تھک جانا اس سے اچھا ہے کہ آرزوئے سعی میں دل ڈوب جائے"

"شاید ہو مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے، میں تو اسی سعی ناکام کا کشتہ ہوں۔ اور اب سعی، کوشش، عمل کے نام سے کانپتا ہوں۔ آپ نے دریافت کیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں وہاں جاتا ہوں جہاں انسان دنیا کے شور و شر سے ایمن زندگی کی

کشمکش سے محفوظ امن وعافیت سے دن گذار سکتا ہے، جہاں نہ اسے اپنے بھائیوں کی غفلت، جہالت، پستی، نکبت کے منظر آنکھوں سے دیکھنا پڑیں گے اور نہ انکی نامہربانی، نا ناشکر گذاری، احسان فراموشی، کینہ پروری کے زخم سینے پر کھانا پڑیں گے، جہاں نہ وہ اپنی قوم کے تنزل کے احساس سے تڑپے گا اور نہ اُسکی اصلاح کوشش کر کے پچھتائے گا۔ میں آبادی سے دور پہاڑوں پر جا رہا ہوں کہ وحدت کی مومیائی سے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑوں خلوت کے دامن میں بکھری ہوئی طبیعت کو سمیٹوں، باہر کی دنیا سے آنکھ بند کر لوں اور اندر کی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھوں"

"مگر یہ تو معلوم ہو کہ ہماری دنیا نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ اس سے اس قدر بیزار ہیں؟"

"سنئے صاحب میرے لئے دنیا ہندوستان ہے اور یہی ہو سکتا تھا یہی وہ زمین ہے جس میں میری زندگی کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اور یہیں میرا شجر حیات پنپ سکتا تھا، اب آپ یہ پوچھئے کہ ہندوستان نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اس کا میں جواب دیتا ہوں مگر میرا دل یہ کہانی کہتے دکھتا ہے اور آپ کا دل اسے سن کر دکھے گا۔ آہ اس بدنصیب ملک نے مجھ سے وہ دولت چھین لی جو زندگی کا سہارا ہے یعنی عقیدہ اور امید اور مجھے وہ چیز دیدی جو موت کا پیام ہے یعنی انکار اور مایوسی۔ جب میں نے اپنے آپ کو دل و جان سے اس کی خدمت کے لئے وقف کیا تھا۔ اس وقت میرا سینہ عقیدے کے نور سے معمور تھا اور میرا دل امید کے ولولے سے لبریز۔ مجھے یقین تھا کہ ہندوستان والوں میں ایمان ہے، خلوص ہے، درد ہے، قابلیت ہے، ذہانت ہے، جفاکشی ہے، صبر ہے، استقلال ہے، صرف ہمت، عزم اور جوش کی کمی ہے مجھے امید تھی کہ یہ چیزیں ذرا سی کوشش سے پیدا ہو جائیں گی جس طرح مستوں کے لئے ایک الاپ، دیوانوں کے لئے ایک ہو عقلمندوں کے لئے ایک اشارہ کافی ہے اسی طرح ہندوستانیوں کے لئے صرف ایک ترانہ امید، ایک

نعرۂ مستانہ چاہئے ۔ یہ آواز کانوں میں پہنچتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے غلامی کا طوق اتار کر پھینک دیں گے جہالت کی بیڑیاں توڑ کر رکھ دیں گے ۔ اور پھر ہندوستان میں ایک عظیم الشان تمدن کی بنیاد پڑے گی جو ساری دنیا کے لئے باعث حیرت اور قابل تقلید ہوگا ۔ یہ تھا میرا عقیدہ یہ تھی میری امید ۔“

” مگر افسوس کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا ، تصور اور واقعے میں اتنی نسبت بھی تو نہ تھی جتنی چیزیں اور اُس کے سائے میں ہوتی ہے ہیں اور مجھ جیسے دوسرے تکلیفیں اٹھا کر کڑیاں جھیل کر سارے ملک میں پھرے کہ سوتوں کو جگائیں رہ نوردوں کو رہنماؤں کا پیام پہنچائیں کچھ سونے والے اٹھے کچھ مسافروں نے آگے قدم بڑھایا ۔ ہمارا دل خوش ہوا ، ہماری ہمت بڑھ گئی ۔ مگر یہ اطمینان عارضی تھا کیونکہ راہ کی دشواریوں نے چلنے والوں کے چھکے چھڑا دیئے اور اس پر ستم یہ ہوا کہ کچھ رہنما راہزن نکلے اور کچھ راہ سے نابلد ۔ ان میں سے بعض اپنے پیروؤں کو لوٹ کر چل دیئے اور بعض ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور اس پر جھگڑنے لگے کہ دائیں کو مڑیں یا بائیں کو آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں ۔ یہ نتیجہ ہوا سالہا سال کی کوشش کا ، یہ پھل بلا مدتوں کی ریاضت کا ۔ میرا تو یہ دیکھ کر جی چھوٹ گیا ہاتھ پیر شل ہو گئے زبان بند ہوگئی افسردگی دل و دماغ پر مسلط ہو گئی مایوسی رگ و پے میں سرایت کر گئی ۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ ہندوستان ہمیشہ غفلت کی نیند سوتا رہے گا ۔ غلامی کی ذلت اٹھاتا رہے گا ۔ مجھ میں یہ جانکاہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہیں اس لئے میں آبادی سے منہ موڑ کر کوہ و بیاباں کیطرف جا رہا ہوں تاکہ کم سے کم اپنی روح کو اس ذلت اور پستی سے بچاؤں اور تزکیۂ نفس و تصفیہ قلب کے ذریعے سے معرفت اور نجات حاصل کروں ۔“

مجھے خوشی تھی کہ نوجوان کی آنکھوں سے فریب ہستی کا پردہ اُٹھ گیا ہے لیکن یہ افسوس تھا کہ اس پر بجائے طیش کے یاس کا غلبہ ہو گیا ہے میں تو اسے یہ رائے دیتا کہ دنیا سے پیچھا چھڑانے کی جگہ دنیا کے پیچھے پڑ جائے سست قدم رہ نوردوں کو ملامت کرے اور جھوٹے رہنماؤں

کی قلعی کھولے۔ بہرحال میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پیر مرد پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا اس لئے میں نے ذرا سا مڑ کر کنکھیوں سے اُن کے چہرے کو دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک لمحے تک مجھے ہمدردی کے، افسوس کے، دُکھ کے آثار نظر آئے۔ مگر فوراً ہی یہ کیفیت جاتی رہی اور وہی سکون و اطمینان اور خفیف سا تبسم جو پہلے تھا پھر نظر آنے لگا۔ انھوں نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا :۔

"میں نے آپ کی داستان بہت غور سے سنی اور میرے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا مگر ایک بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب آپ کا جذبہ محبت سچا تھا تو آپ نے انجام کی فکر کیوں کی۔ پروانہ جس کی فطرت میں جلنا ہے کامیابی اور ناکامی سے غرض نہیں رکھتا شمع جس کی سرشت میں گھلنا ہے یاس اور امید کی پابند نہیں ہوتی۔ مستی میں یہ ہشیاری کیسی؟ دیوانگی میں یہ تدبر کیوں؟ آپ کی طرف سے سعی اور خدا کی طرف سے اتمام۔ آپ نے اپنا کام کرتے کرتے خدا کے کام کی فکر اپنے سر کیوں لے لی۔"

"جناب انسان کو جس نے عشق دیا ہے اُسی نے عقل بھی دی ہے اور تدبر، تعقل تفکر کی تاکید بھی کی ہے۔ انسان نہ پروانہ ہے کہ حسن سوزندہ کی ایک جھلک دیکھ کر دیوانہ وار جل مرے اور نہ شمع کہ عشق سوزاں کی ایک ادا پر گھل گھل کر مر مٹے۔ اُس کی مستی ہوشیاری کے سہارے چلتی ہے اُس کی دیوانگی دانائی کے پروں پر اڑتی ہے۔ عشق انسان کے دل میں شوق منزل پیدا کرتا ہے، اور ذوق سفر، عقل اُسے راہ سجھاتی ہے، اور اس کے لئے زادِ راہ فراہم کرتی ہے۔ میرا جذبۂ محبت تو خیر جیسا کچھ ہے میں جانتا ہوں لیکن میری عقل یہ کہتی ہے کہ ملک و قوم کے پنپنے کی کوئی امید نہیں تو اپنی روح کو بچا اور اُس کی بالیدگی کا سامان کر۔"

"الحمدللہ کہ آپ عقل کے قائل ہیں اور اُسے عشق کا دست و بازو سمجھتے ہیں۔ ورنہ ہمارے اہلِ حال کے یہاں تو عقل بیچاری راندۂ درگاہ ہے اس لئے کہ وہ عشق کی ضد

سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے جو کچھ ابھی فرمایا اس کے سبب سے گفتگو میں بڑی آسانی ہوگئی۔ عقل کا قدم درمیان رہے تو باہمی مفاہمت ممکن ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ آپ کی ہنگامہ زندگی سے مایوسی اور گوشہ خلوت کی طلب عقل پر مبنی ہے یا محض جذبات کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔ پہلے اس یاس کو لیجئے۔ آپ کی باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کو مایوسی خدانخواستہ نظام عالم اور قانون زندگی سے نہیں بلکہ انسانوں سے ہے، اپنے ملک کے انسانوں سے۔ آپ کو یہ بدگمانی نہیں کہ دنیا میں سعی اور عمل، خلوص اور ایثار، پامردی اور استقلال کا پھل نہیں ملتا بلکہ یہ گمان ہے کہ آپ کی قوم ان چیزوں سے محروم ہے۔ آپ کے دل میں یہ وسوسہ نہیں کہ رحمت ایزدی مستحقوں کو نہیں پہچانتی یا جان بوجھ کر اُن سے روگردانی کرتی ہے بلکہ یہ خدشہ ہے کہ آپ کے بھائی اس رحمت کے مستحق نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اُس اتھاہ مایوسی سے بچے ہوئے ہیں جو روح کے لئے دائمی موت ہے۔ مگر یہ دوسری قسم کی مایوسی یعنی اپنے ملک اور اپنی قوم کی طرف سے نا امیدی جو آپ کے سر پر منڈلا رہی ہے یہ بھی کچھ کم مہلک نہیں، اگر سچی ہو۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ سچی اور پائدار مایوسی نہیں بلکہ ایک عارضی افسردگی ہے جو جوش کی حد سے بڑھ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو کہ قوموں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ مہینوں اور برسوں سے نہیں قرنوں اور صدیوں سے کیا جاتا ہے۔ ہندوستان بلکہ ایشیا کی پچھلی نصف صدی کی تاریخ آپ کو یہ بتائے گی کہ اکثر قوموں میں خصوصاً مسلمانوں میں ایک عام بیداری پیدا ہوئی ہے۔ دنیا کے اہل الرائے اس پر متفق ہیں کہ یہ لوگ خواب غفلت سے چونک اٹھے ہیں۔ انکی رگوں میں زندگی کا خون جو اب تک منجمد تھا پھر گردش کر رہا ہے۔ انہوں نے راہ عمل پر چلنا بلکہ دوڑنا شروع کر دیا ہے۔ ٹھوکریں کھاتے ہیں مگر پھر سنبھل جاتے ہیں تھک کر بیٹھتے ہیں مگر پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

کوئی اس کا دعوٰے نہیں کر سکتا کہ اُسے انجام کا یقینی علم ہے بڑے سے بڑا دانشمند

علامات پر حکم لگتا ہے اور علامات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترقی کی لہر جو اٹھی ہے یہ اب رکنے والی نہیں۔ یہ لوگ جو اس راہ پر گامزن ہیں بہت بھٹکیں گے بہت نشیب و فراز دیکھیں گے مگر کسی نہ کسی دن منزل پر ضرور پہنچیں گے۔ مسلسل کوشش کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ زندگی کا یہ قانون ہے، دنیا کا یہ دستور ہے خدا کا یہ وعدہ ہے۔

آپ جس تحریک کی ناکامیابی کو رو رہے ہیں وہ ایک بڑے سلسلے کی کڑی تھی اس کا لوہا کمزور تھا جب زندگی کے جھٹکے پڑے تو ٹوٹ گئی۔ اس پر فریاد کرنا نادانی ہے اور اس سلسلے کو ناتمام چھوڑنا بزدلی ہے۔ لوہے کو کچھ دن آگ میں تپنے اور ہتوڑے کی چوٹ کھانے دیجئے کہ وہ فولاد بن جائے پھر کڑی میں کڑی پڑتی جائے گی سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا اور توڑنے والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔"

"خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ تو اس وقت میرے حق میں مسیحا ہو گئے۔ آپکی باتوں کا جو اثر دل پر ہوا ہے اس کا پورا اندازہ تو بعد میں ہوگا مگر اس وقت معلوم ہوتا ہے جیسے تیز بخار مدت کے بعد اترا ہو۔ مایوسی کی کیفیت میرے دل سے تقریباً بالکل جاتی رہی اور امید کا ایک ہلکا سا رنگ چھا گیا۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ میں اب کیا کروں؟ جو قصد کر چکا ہوں اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا مگر یہ خیال ہوتا ہے کہ صحرانوردی کی ایک مدت معین کر لوں اور اسے پورا کر کے واپس آؤں۔ آپ فرماتے ہیں کہ لوہے کو فولاد بنانا چاہئے لیکن لوہا اگر زنگ آلودہ ہو تو اس پر صیقل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی صورت یہی نظر آتی ہے کہ انسان کچھ دن تنہائی میں ریاضت کرے۔ دنیا کی آلائشوں میں رہ کر تو یہ کثافت دور نہیں ہوتی۔"

"آپ کا یہ حسن ظن جو میرے حق میں اور خود اپنے حق میں ہے صحیح نہیں۔ آپ کا بخار اگر اترا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ خود آپ کی طبیعت میں مرض کو دفع کرنے کی قوت موجود تھی اور ایک ذرا سا سہارا ڈھونڈھتی تھی۔ آپ کی مایوسی اگر دور ہوئی ہے تو اس

کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نیچے امید کی تہ ابھرنے کو مستعد تھی اور ایک ہلکی سی چھیڑ کی منتظر تھی۔
میں نے طبیب کا کام نہیں کیا بلکہ ایک معمولی تیمار دار تھا۔ اب رہا آپ کا یہ خیال کہ آپ
تنہائی کی زندگی میں محض اپنی قوت سے تزکیہ نفس کی ہفتخواں کو طے کر لیں گے یہ بہت بڑا
دھوکہ ہے۔ جس منزل کو آپ ابتدائی منزل سمجھتے ہیں یہ آخری منزل ہے۔ خلوت کے
سکون کا انعام اسی کو ملتا ہے جو جلوت کی سعی کے امتحان میں پورا اتر چکا ہو۔ لوہے کا زنگ
وہی زندگی کی آگ دور کر سکتی ہے جو اسے فولاد بناتی ہے۔ اسکے بعد کہیں وہ وقت آتا ہے
کہ فولاد جلا پاتے پاتے شیشہ بنے، جو خام کار ابتدا میں تنہائی اختیار کرتے ہیں ان کے
دل کا زنگ دور نہیں ہوتا بلکہ ہوائے نفس سے اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ وہ ادنیٰ خواہشات
وجذبات کی مستی کو نشۂ معرفت، غرور نفسانی کو تمکین روحانی خودی کو خدا سمجھنے لگتے ہیں
خدا تک پہنچنے کا کوئی چھوٹا سا رستہ نہیں۔ ہر سالک کو زندگی اور دنیا کی سنگلاخ راہوں
سے گزرنا پڑتا ہے۔ بیشک اس راہ میں راہزن بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ راہنما بھی ہیں
ہر انسان اپنا اور دوسروں کا راہزن ہو سکتا ہے مگر راہنما بھی ہو سکتا ہے۔ یہی خیر و شر
کا امکان زندگی ہے یہی دنیا ہے۔ کمزور دل اس دگدے سے کانپتے ہیں مگر مضبوط دل
اسی میں یکسوئی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے میں
مفصل جواب دیتا مگر وقت کم ہے۔ یہ اسٹیشن جو آنیوالا ہے اسی پر مجھے اترنا ہے۔ وہ
دیکھئے سگنل گذر گیا۔ اب صرف چند منٹ باقی ہیں اس لئے میں آپ کے سوال کے
جواب میں ایک شاعر کے چند شعر پڑھتا ہوں جس نے زندگی کے راز کو سمجھا بھی اور اپنی
زبان میں "سمجھا بھی دیا۔ سنئے۔

کاٹتے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح — جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں — جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا — نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں — غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا — رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح
پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی — پر بھلا تکتے ہیں اک کا یگانوں کی طرح
آس کھیتی کے پنپنے کی انہیں ہو یا نہ ہو — ہیں اسے پانی دئے جاتے کسانوں کی طرح
کام سے کام اپنے انکو گو ہو عالم نکتہ چیں — رہتے ہیں تیس دانتوں میں زبانوں کی طرح
طعن سن سن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار — دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

لیجئے وہ اسٹیشن آگیا۔ اب میں جاتا ہوں خدا حافظ۔ میں آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ آپنے اپنا قصد بدلا یا نہیں کیونکہ جب میں نے آپ کو خدا کی حفاظت میں دیدیا تو پوچھنے کی ضرورت کیا اور میں پوچھنے والا کون۔ آئیے مصافحہ کر لیجئے۔ خدا حافظ "

یہ کہہ کر پیرمرد نے اپنا ہینڈ بیگ سنبھالا اور گاڑی سے اُتر کر چل دیئے۔ مجھے بھی اس اسٹیشن پر اتر کر گاڑی بدلنا تھا۔ میری گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ صرف پلیٹ فارم درمیان میں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا ٹھہر کر کسی طرح یہ معلوم کر لوں کہ نوجوان کا ارادہ اب کیا ہے مگر اتنے میں میری گاڑی نے سیٹی دی اور میں مجبوراً اترا اور دوڑ کر بدحواسی میں ایک دوسرے درجے کے ڈبے میں گھس گیا۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ نوجوان سر جھکائے گہری فکر میں ڈوبے بیٹھے ہیں اور موٹے مسافر کھڑکی سے سر نکالے اپنے لحن شدادی میں چائے والے کو پکار رہے ہیں۔

نمودِ سحر

از مولوی سید ابو محمد ثاقب صاحب کانپوری

اے نمودِ صبح اے رنگینیٔ دورِ حیات ۔۔۔ تیری لطف انگیزیوں میں غرق ہے یہ کائنات

تو نے آکر بھر دیا پھولوں میں حسنِ تازگی ۔۔۔ تو نے ہر غنچے میں اک روحِ تبسم پھونک دی

تو نے ہر ذرّے کو رشکِ مہرِ تاباں کر دیا ۔۔۔ یعنی حسنِ شاہدِ فطرت کو عریاں کر دیا

منتشر ہے سارے عالم میں ہوائے مشکبار ۔۔۔ صرف گلشن ہی نہیں آئینہ ہے ہر کوہسار

اے نمودِ صبح تجھ سے ہے بہارِ کائنات ۔۔۔ حسنِ فطرت کو ہے تیری وجہ سے حاصل ثبات

وہ ستاروں کا تبسم اور وہ حسنِ انتشار ۔۔۔ وہ نسیمِ صبح کا تھم تھم کے چلنا بار بار

وہ طیورِ صبح خواں کی زمزمہ پردازیاں ۔۔۔ سبزۂ خوابیدہ کی وہ بار بار انگڑائیاں

چاندنی میں جھومتا سبزے کا وہ مستانہ وار ۔۔۔ کیف پرور کس قدر ہیں یہ ادا ہائے بہار

وہ ہوائے سرد، وہ جنگل، وہ رنگینی تری ۔۔۔ کوہساروں کی ہوا ہے برف میں ڈوبی ہوئی

ڈوبتے تاروں کا چشموں میں وہ دلکش انعکاس ۔۔۔ گویا مخمل پر ستارے جڑ دئے ہیں پاس پاس

آسماں کو صبح کی سُرخی نے رنگیں کر دیا ۔۔۔ یا مطلا ہو گئی ہے دہر کی ساری فضا

وہ ترنم ریز نغمے وہ وفورِ بے خودی ۔۔۔ اور وہ طاری ہر اک دل پر سرورِ بیخودی

اک ترانہ بن گئی ہے باغ کی ساری فضا
طائروں کی نغمہ پیرائی ہے کیسی دلربا

شذرات

محمد عنایت اللہ صاحب کا چندہ بابت ممبری اردو اکادمی وصول ہوا ہے۔ مگر اُن کا پتہ دفتر سے گم ہوگیا ہے۔ وہ براہ مہربانی اپنے پتے سے دفتر کو جلد اطلاع دیں تاکہ رسالہ جامعہ اُنکے نام جاری کردیا جائے اور جو کتاب تیار ہونیوالی ہے وہ تیاری کے بعد بھیجی جائے۔

یہ جولائی کا نمبر ستمبر کے پہلے ہفتہ میں قارئین کرام کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔ اگست کا نمبر بھی انشاء اللہ ستمبر کی ابتدائی تاریخوں میں چھپ جائے گا۔

اردو اکادمی نے منجملہ اور کاموں کے ایک یہ کام بھی اپنے ذمے لیا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے مستشرقین نے جو کتابیں اسلامی علوم اور اسلامی تمدن کے متعلق لکھی ہیں ان میں سے منتخب کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں شائع کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک کتاب "عربوں کا تمدن" شائع ہوچکی ہے اور دوسری "سیرۃ نبوی اور مستشرقین" عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ اردو میں شائع کرنا مفید نہیں کیونکہ انکو پڑھ کر ہندوستان کے مسلمان مذہب اسلام اور تاریخ اسلام کو یوروپ والوں کی نظر سے دیکھنے لگیں گے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس مصلحت کی بنا پر اردو اکادمی نے یہ کام شروع کیا ہے اُنکی تشریح کردیجائے تاکہ اکادمی کے ارکان کو اس مسئلے پر رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔

پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ آج کل مستشرقین کا عام رویہ اسلامی تمدن کیطرف سے

کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یوروپ میں اسلام پر کتابیں لکھنے والے کلیسا کے آلۂ کار تھے
انکا مقصد یہ تھا کہ جس طرح ممکن ہو اسلام کو بدنام کریں چاہے اس میں ہزاروں بے بنیاد
افسانے گھڑنا پڑیں اور سچائی کا خون ہو جائے۔ مگر اب رنگ بدل گیا ہے۔ اب مستشرقین
کے گروہ پر کلیسا کا مطلق اثر نہیں بلکہ مذہب کا بھی کم ہے۔ اب انکا مقصد عموماً یہ ہوتا ہے
کہ حتی الامکان مسلمانوں کے قدیم اور جدید تمدن کی سچی تصویر پیش کریں۔ ان کی تصنیف
و تالیف کی محرک ہمیشہ سچی علمی تحقیق کی لگن نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی
قوم کے لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں سے واقف ہونے کا موقع دیں تاکہ اسے مسلمانوں
سے معاملت کرنے میں، ان پر سیاسی غلبہ پانے اور ان سے تجارتی فوائد بٹورنے میں
آسانی ہو۔ بہرحال خواہ ان کا مقصد تحقیق علمی ہو یا افادی دونوں صورتوں میں وہ
بڑی محنت اور کاوش سے سچے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مگر یہ لوگ بھی انسان ہیں اور دور دراز ملکوں، غیر زبانوں اور اجنبی قوموں سے
پوری واقفیت حاصل کرنا انکے لئے مشکل ہے اس لئے یہ اپنی تصانیف میں غلطیاں بھی
کرتے ہیں خصوصاً مذہب اسلام کی اصل روح کو سمجھنے میں بڑی ٹھوکریں کھاتے ہیں کیونکہ
عام طور پر ان میں خود اپنے مذہب کی روح بھی نہیں ہوتی بلکہ سرے سے مذہبیت کے
متعلق انکے تصورات بہت ناقص ہوتے ہیں تاہم یہ لوگ عموماً بہت قابل ہوتے ہیں اور
برسوں عرق ریزی کرکے کتابیں لکھتے ہیں اس لئے ان کتابوں سے وہ طالبان علم جو ان خامیوں
سے دھوکا نہ کھائیں۔ بڑے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔

اردو اکادمی چاہتی ہے کہ اردو داں طبقے کے ہاتھوں میں انکی کتابوں کے ترجمے
پہنچا سکے۔ انگریزی داں طبقہ انکی کتابیں دقت سے پڑھتا ہے لیکن چونکہ اس کے اکثر افراد

اسلامی علوم کے اصل ماخذوں سے بالکل بیگانہ ہوتے ہیں اسلئے ان کتابوں پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آتے ہیں۔ مگر اردو داں طبقہ میں وہ علما بھی موجود ہیں جو اسلامیات پر عبور رکھتے ہیں اور ان کتابوں کو تنقید کے معیار پر پرکھ کر انکے حسن و قبح سے پڑھنے والوں کو آگاہ کر سکتے ہیں تاکہ وہ ان سے مفید معلومات حاصل کریں اور انکے غلط نتائج سے قطع نظر کر لیں۔

اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ جو کھلی ہوئی خامیاں ان کتابوں میں ہوں انکی ترجمہ کرنے والے خود تصحیح کر دیں لیکن پورا حق تنقید ادا کرنا ماہرین فن کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کی تنقیدوں کو شائع کرنے کے لئے رسالۂ جامعہ حاضر ہے اور ان میں سے وہ اعتراضات اور ایرادات جو وقیع اور اہم ہوں کتابوں کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کئے جا سکتے ہیں بلکہ یورپ کی زبانوں میں ترجمہ کر کے مصنفوں کو یا ان کتابوں کے شائع کرنیوالوں کو بھیجے جا سکتے ہیں۔

مگر عربوں کے تمدن پر جو تنقیدیں شائع ہوئی ہیں ان میں سوائے رسالہ معارف کی تنقید کے اور کسی سے اکادمی کو کوئی مدد نہیں ملی اس میں بعض ایرادات قابل تسلیم تھے اور انکے لئے اکادمی تنقید نگار کی شکر گزار ہے۔ مگر افسوس ہے کہ انداز تحریر میں ناگوار مناظرے کا رنگ (مناظرہ صرف مصنف سے نہیں بلکہ مترجم سے بھی) آگیا تھا اور مترجم نے اس کا جو جواب رسالہ جامعہ میں شائع کیا اس میں بھی یہ رنگ غالب تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ جواب اکادمی کی طرف سے نہ تھا جامعہ میں یہ اسی حیثیت سے شائع ہوا جیسے کسی اور رسالہ میں شائع ہوتا۔ جناب مدیر معارف اسے معارف میں شائع کرنا چاہتے تھے مگر افسوس ہے کہ ان کا پیام جب پہنچا تو یہ مضمون چھپ چکا تھا۔ وہ بیچ "میں بھی اس مضمون پر ایک نوٹ لکھا گیا ہے

اور آئندہ نمبروں میں کتاب پر مفصل تنقید لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ جناب مدیر سچ کے نزدیک معارف کی تنقید ضرورت سے زیادہ نرم ہے کیونکہ اس میں "ہذیان سرائی" کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے اور "جامعہ ملیہ اسلامیہ" اور "تحقیق" کو واوین کے اندر نہیں لکھا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ جناب مدیر "جامعہ ملیہ" کے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں اسمیں نہ تو عالمانہ تنقید کا رنگ ہوتا ہے نہ دوستانہ نصیحت کا، نہ مرشدانہ ہدایت کا بلکہ مخالفانہ طنز کا، حالانکہ یہ اصلاح کا کوئی مفید طریقہ نہیں نصیحت کا اثر جب ہوتا ہے کہ وہ خلوص سے کیجائے اور چاہے تلخ ہو مگر ترش نہ ہو۔ طنزیہ کلمے لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی ضد پیدا کرتے ہیں۔ جناب مدیر سچ بیکار دوسروں کو اس امتحان میں ڈالتے ہیں جس میں وہ خود کبھی پورے نہیں اترے۔

فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ۱۲

از جنوری تا جون ۱۹۲۹ء

مذہب

مضمون	مضمون نگار		صفحہ
حقیقت حج	مولٰنا اسلم صاحب جیراجپوری		۳۹
زرتشت اور بدھ	مولوی اسرائیل احمد خانصاحب		۱۲
سیرۃ نبوی اور مستشرقین	مولوی عبدالعلیم احراری صاحب بی اے (آنرز)		۲۴۳

تاریخ

مضمون	مضمون نگار		صفحہ
کیا اکبر امی محض تھا؟	زبید احمد صاحب (لندن)		۲
زرتشت و بدھ	مولوی اسرائیل احمد صاحب		۱۲
دو عجیب کتابیں	مولٰنا سید سلیمان صاحب ندوی	فروری	۴۹
گیارہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں علوم صحیحہ کی حالت	ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی		۲
سلطان سلیمان اعظم قانونی	مولٰنا اسلم صاحب جیراجپوری	مارچ	۳۲
ترکی قوم پرستی اور اتحاد تورانی	ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم اے پی ایچ ڈی		۴۱
سیرۃ نبوی اور مستشرقین	مولوی عبدالعلیم احراری صاحب		۲۴۳
شخصیت اور تاریخ	پروفیسر فریڈرس مائنکے (برلین)		۲۷۱
سید قاسم آذر بائیجانی	حضرت درد کاکوروی		۴۶۴
ٹالسٹائے اور مشرق	بدرالدین بینی صاحب متعلم جامعہ ملیہ		۴۱۶
عربی معاشرت پر ایرانی اثرات	سید نذیر نیازی صاحب بی اے (جامعہ)		۴۳۱

ادب

عنوان	مصنف	صفحہ
محبت، موت اور علالت	ملک محمد اسلم خاں بی۔ اے (کیمبرج)	۶۴
ایک تصویر	پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) فروری	۲
فاؤسٹ کے چند ورق	ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ۔ڈی //	۵۴
گڑیا کا گھر (تنقید)	پروفیسر محمد مجیب صاحب //	۷۵
افسانہ نویسی	// // مارچ	۲۰
رائزمریا رلکے	ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی صاحب پی ایچ ڈی	۲۶۳
نئی دہلی	مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی	۲۸۶
مجذوب کی بڑ	ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب	۳۵۱
ہندوستان میں تنقید فن (آرٹ کا دور جدید)	ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی صاحب پی ایچ ڈی	۴۰۸

افسانہ

عنوان	مصنف	صفحہ
سائل	انتون چیخوف (ترجمہ) فروری	۴۰
خانصاحب	پروفیسر محمد مجیب صاحب مارچ	۵۱
دلاری	سجاد ظہیر صاحب بی اے (از آکسفورڈ)	۳۰
محبت کی جیت	مولنا محمد حسین صاحب محوی صدیقی	۳۷۷
ایثار کی فتح	مولوی اسرائیل احمد خانصاحب	۴۳۷

ڈراما

عنوان	مصنف	صفحہ
ماموں جان	جلیل احمد صاحب قدوائی بی اے (علیگ)	۴۹

اجتماعیات

عنوان	مصنف	صفحہ
اشتراک	ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم اے پی ایچ ڈی	۱۴
// (۲)	// // //	۲۷۶

آزادی کی راہیں	حامد علیخانصاحب بی اے (جامعہ)	۳۴۲
" (۲)	" "	۴۰۲

سیاسیات

عراق عرب	مولوی اسرائیل احمد خانصاحب فروری	۲۵
ترکی قوم پرستی اور اتحاد تورانی	ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم اے پی ایچ ڈی مارچ	۴۱
جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے	شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ)	۳۵۹

حصہ نظم

کلام اثر	شاگرد حضرت خواجہ میر دردؒ	۴۸
غزل	مولٰنا محوی صدیقی فروری	۴۷
دوشیزہ سحر	حضرت درد کاکوروی "	۴۸
نوائے محوی	حضرت محوی صدیقی	۳۰۶
غزل	حضرت صفی لکھنوی	۳۰۷
غزل	حضرت اثر رودولوی	۳۷۶
خمسۂ غزل حکیم سنائی	حضرت شاپور کرمانی	۳۸۶
غزل	حضرت درد کاکوروی	۳۸۸
غزل	مولٰنا آزاد سبحانی	۴۶۶
غزل	حضرت درد کاکوروی	۴۶۸

اقتباسات

یورپ کا قرض	جنوری	۵۹
برطانوی ہند میں خواندہ و ناخواندہ لوگوں کا تناسب		۶۳
ہر مردم شماری میں مرد اور عورت اور خواندہ و ناخواندہ مرد اور عورتوں کی تعداد	جنوری	۶۴
تعلیم پر کل ہندوستان کا خرچ اور اسکی تقسیم	"	۶۶
متفرق	مارچ	۶۵ - ۷۱
روس کی تعلیمی ترقی		۳۰۸ - ۳۱۱
اقلیتوں کے مسئلہ کو یورپ نے کیونکر حل کیا		۳۸۹ - ۳۹۴

تنقید و تبصرہ

(رسائل و اخبارات)

پیغام صلح کا آخری نبی نمبر	جنوری	۶۹
نورس۔ اجمل۔ مونس	"	۷۰ و ۷۱
ادبی دنیا (لاہور)		۴۷۱
کامیابی (دہلی) روزنامہ جدت		۴۷۲
دولت کونین۔ موٹر کار		۴۷۳
رسالہ موہن (ہندی)		۴۷۴

(کتب)

تذکار سلف - اردو کا قاعدہ جواہر سخن ۷۲-۷۳

سرکار کا دربار - وصلی ابجد ۷۳-۷۴

الصلوٰۃ للہ والصیام رحمٰن مارچ ۷۲-۷۳

مقابلہ اسلام و یورپ " ۷۴-۷۵

ارنسٹ ۳۱۲

مخزن نجات - مہمات الصرف ۳۱۳

مبادی نباتات ۳۱۴

گڑیا کا گھر فروری ۶۷

عربوں کا تمدن ۳۳۱

ہندوستان کے معاشرتی حالات ۴۶۹

اسلام اور غیر مسلم - مختصر تاریخ گجرات ۴۷۰

شذرات -

جنوری ۷۵-۸۰ فروری ۷۵-۷۹ مارچ ۷۶-۸۰

اپریل ۳۱۵-۳۱۸ مئی ۳۹۵-۴۰۰ جون ۴۷۵-۴۸۰

مضمون نگاران "جامعہ" بابتہ جلد ۱۲ از جنوری تا جون ۱۹۲۹ء

آثر مرحوم شاگرد حضرت خواجہ میر درد رح

آثر ردولوی

آزاد سبحانی (مولنا)

اسرائیل احمد خانصاحب (مولوی)

اسلم صاحب جیراجپوری (مولنا)

اسلم خانصاحب بی اے (کیمبرج) (ملک)

بدرالدین چینی صاحب متعلم جامعہ

برٹرینڈ رسل

جلیل احمد صاحب قدوائی بی اے (علیگ)

حامد علیخانصاحب بی اے (جامعہ)

درد کاکوروی صاحب (حضرت)

ذاکر حسین خانصاحب ایم اے پی ایچ ڈی (ڈاکٹر)

زبید احمد صاحب (از لندن)

سجاد ظہیر صاحب بی اے (از آکسفورڈ)

سید سلیمان صاحب ندوی

سلیم الزمان صدیقی صاحب پی ایچ ڈی (ڈاکٹر)

شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی اے (جامعہ)

شاپور کراچی صاحب (حضرت)

صفی صاحب لکھنوی (حضرت)

عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (ڈاکٹر سید)

عبدالعلیم احراری صاحب بی اے (آنرز)

فرحت اللہ بیگ صاحب (مرزا)

فریڈرش ہائینکے

محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) (پروفیسر)

محوی صاحب (مولنا)

مُیلڈا اسیراؤ

نذیر نیازی صاحب بی اے (جامعہ)

یوسف حسین خانصاحب بی اے (از پیرس)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی

نمبر ۲	بابتہ ماہ اگست ۱۹۲۹ء	جلد ۱۳

فہرست مضامین

۱ ۔ آزادی کی راہیں (۴) — برٹرنڈ رسل ۔ مترجمہ حامد علیخانصاحب بی اے (جامعہ) — ۹۰

۲ ۔ ترکی اور جنگ عظیم — خالدہ ادیب خانم مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب — ۹۹

۳ ۔ ادبیات ایران کی ترقی میں سلطان محمود غزنوی کا حصہ (۲) — حسین حسان صاحب ندوی متعلم جامعہ — ۱۰۹

۴ ۔ رائنر ماریا رلکے (۲) — ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب پی ایچ ۔ ڈی — ۱۲۱

۵ ۔ ابین کی یوسف زلیخا — نصیر الدین صاحب ہاشمی از پیرس — ۱۲۶

۶ ۔ فلسفۂ انبساط — پنڈت جیب الرحمٰن صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ — ۱۳۵

۷ ۔ باغی (افسانہ) — سلما لاگرلوف مترجمہ اسرائیل احمد خانصاحب — ۱۴۷

۸ ۔ غزلیات — حضرت جگر مرادآبادی — ۱۶۱

۹ ۔ تنقید و تبصرہ — ۱۶۳ ۱۰ ۔ شذرات — ۱۶۵

آزادی کی راہیں

باب ۲

باکونین اور نراج

عام ذہن میں نراجی ایک شخص ہے جو بم پھینکتا ہے اور دوسرے خوفناک جرم کرتا ہے خواہ اس وجہ سے کہ وہ کم وبیش پاگل ہے یا انتہا پسند سیاسی خیالات کو اپنے مجرمانہ رجحانات کے لئے پردہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہ خیال ظاہر ہے کہ ہر طرح ناقص ہے۔ بعض نراجی بم پھینکنے میں یقین رکھتے ہیں، بہت سے نہیں رکھتے۔ پھر یہ کہ دوسرے عقائد کے لوگ بھی مناسب حالات میں بم پھینکنے پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ مثلاً جن آدمیوں نے سراجیوو میں وہ بم پھینکا تھا جس سے موجودہ جنگ شروع ہوئی وہ نراجی نہ تھے، قوم پرست تھے۔ اور اگر اس نہایت چھوٹے حصہ سے قطع نظر کیجائے جنہوں نے ٹالسٹائے کا عدم مقاومت کا رویہ اختیار کرلیا ہے، تو وہ نراجی جو بم پھینکنے کے موافق ہیں دوسرے لوگوں سے اس بارے میں کوئی اہم اصولی اختلاف نہیں رکھتے۔ اشتراکیوں کی طرح نراجی بھی گویا معاشی طبقوں کی جنگ پر یقین رکھتے ہیں، اور اگر یہ بم استعمال کرتے ہیں تو اسی طرح جیسے حکومتیں اغراض جنگ کے لئے بم استعمال کرتی ہیں۔ لیکن ہر ایک بم کے مقابلہ میں جو ایک نراجی تیار کرتا ہے، حکومتیں لاکھوں تیار کرتی ہیں اور ہر ایک آدمی کے مقابلہ میں جس نے نراجی تشدد کے ہاتھوں جان دی ہے ریاست کے تشدد سے لاکھوں مارے جاتے ہیں۔ لہذا ہم تشدد کا یہ سوال جو عام تخیل میں اس قدر اثر رکھتا ہے اپنے ذہن سے بالکل دور کر سکتے ہیں۔ کیونکہ نراجی خیال والوں کے لئے یہ نہ تو لازمی ہے نہ انکے ساتھ مخصوص۔

نراج، جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ایک نظریہ ہے جو ہر قسم کی جبریہ حکومت کے مخالف ہے، اگر ریاست جبر و تشدد کا مجسمہ ہے جو سماج پر حکومت کرتا ہے تو یہ ریاست کا مخالف ہے جس حکومت کو نراج برداشت کر سکتا ہے وہ آزاد حکومت ہونی چاہئے، نہ صرف اس معنی میں کہ یہ اکثریت کی حکومت ہو بلکہ اس معنی میں کہ سب اس پر راضی ہوں۔ نراجی پولیس اور قانون فوجداری کے خلاف ہیں اس لئے کہ انکے ذریعہ سے جماعت کے ایک حصہ کی مرضی دوسروں پر عائد کیجاتی ہے، انکے خیال میں جمہوری حکومت اس وقت تک حکومت کی دوسری شکلوں پر کچھ زیادہ قابل ترجیح نہیں جبتک کہ اقلیت کو جبر واقعی یا امکانی کے ذریعہ اکثریت کی مرضی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ نراجی مذہب میں حریت خیر اعظم ہے اور اس حریت کی تلاش کا سیدھا راستہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ فرد پر جماعت کا جو بھی جبریہ قابو اور تصفیہ ہے اسے یک قلم اٹھا دیا جائے۔

اس معنی میں نراج کوئی نیا مسئلہ نہیں۔ ایک چینی فلسفی چوانگ تسو نے جو ۳۰۰ سال قبل مسیح تھا نہایت قابل تعریف طریقہ سے اسے پیش کیا ہے:

"گھوڑوں کے سم ہوتے ہیں کہ انہیں پالے اور برف پر لیجائیں، بال ہوتے ہیں کہ انہیں ہوا اور سردی سے بچائیں۔ یہ گھاس کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں اور میدان میں اپنے سموں پر اڑ جاتے ہیں۔ یہ ہے گھوڑوں کی حقیقی فطرت، عالیشان عمارتیں ان کے لئے بیکار ہیں۔

ایک دن پوکو یہ کہتا ہو نمودار ہوا: "میں گھوڑوں کا انتظام کرنا جانتا ہوں،" چنانچہ اس نے انہیں داغ دیئے، انکے بال کاٹے، سم تراشے، اور لگامیں چڑھائیں، سر سے باندھا، پچھاڑیاں کیں، اور انہیں اصطبلوں میں رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دس میں سے دو تین مر گئے پھر اس نے انہیں بھوکا پیاسا رکھا، قدم چلایا اور دلکی، مالش کرائی اور کھریرا کرایا، آگے پھندنے دار لگام کی مصیبت، پیچھے گرہ دار چابک کا خوف، حتیٰ کہ آدھے سے

زیادہ ختم ہوگئے

کمہار کہتا ہے: "میں جو چاہوں مٹی کے ساتھ کرسکتا ہوں۔ اگر گول بنانا چاہوں تو پرکار استعمال کرتا ہوں، چوکور بنانا ہو تو مربع"

بڑھئی کہتا ہے: "میں جو چاہوں لکڑی کے ساتھ کرسکتا ہوں، اگر اسے خمیدہ بنانا ہو تو قوس استعمال کرتا ہوں، اگر سیدھا تو مسطر"

لیکن ہم آخر یہ سمجھ کس بنا پر سکتے ہیں کہ مٹی اور لکڑی کی فطرت اس پرکار و مربع قوس و مسطر، کے استعمال کی مقتضی ہے۔ تاہم ہر زمانہ میں پو لو کی تعریف ہوئی ہے، گھوڑوں کے انتظام میں اسکی ہنرمندی کی اور مٹی اور لکڑی کے معاملے میں کمہاروں اور بڑھیوں کی ہنرمندی کی جو لوگ سلطنت پر حکومت کرتے ہیں ان سے بھی یہی غلطی سرزد ہوتی ہے۔

اچھا، میں سلطنت پر حکمرانی کو بالکل مختلف نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں۔

لوگوں میں بعض فطری جبلتیں ہوتی ہیں۔ کپڑا بننا اور اپنے کو ملبوس کرنا، زمین جوتنا، اور اپنا پیٹ بھرنا۔ یہ ساری انسانیت کے لئے مشترک ہیں اور سب اس پر متفق ہیں ایسی جبلتوں کو "آسمان سے بھیجا ہوا،، کہتے ہیں۔

لہذا جس زمانہ میں فطری جبلتیں غالب تھیں تو آدمی آہستہ چلتا تھا اور اس کی نگاہ استوار تھی۔ اس زمانہ میں پہاڑوں پر سڑکیں نہ جاتی تھیں، نہ کشتیاں تھیں نہ پانی پر پل۔ سب چیزیں اپنے اپنے مخصوص دائرے کے لئے پیدا کیجاتی تھیں۔ پرند اور چرند کی پود بڑھتی تھی، پیڑ بوٹے پھلتے پھولتے تھے۔ اول الذکر کو ہاتھ سے تھام سکتے تھے؛ کوئی چاہتا تھا تو اوپر چڑھ کر کوے کے گھونسلے میں جھانک آتا کیونکہ اس زمانے میں انسان چرند اور پرند کے ساتھ رہتا تھا، ساری مخلوق ایک تھی۔ بھلے اور برے آدمی کی تفریق نہ تھی۔ سب چونکہ یکساں بے علم تھے لہذا انکی نیکی راہ نہیں بھٹک سکتی تھی۔ سب چونکہ بری خواہشوں سے یکساں آزاد تھے لہذا ایک فطری وحدت و یگانگت کے عالم میں تھے

جو وجود انسانی کا کمال ہے۔

لیکن جب عقلاء پیدا ہوئے جنہوں نے خیرات کی رکاوٹ راہ میں ڈالی اور پڑوسی کے حقوق کی بیڑیاں ڈالیں تو شبہ نے دنیا میں راہ پائی اور جب انہوں نے موسیقی کے متعلق بلبلا اٹھا اور رسوم کی بابتہ دانتا کلکل شروع کی تو سلطنت کے اندر انتشار پیدا ہو گیا۔[1]

جس معنی میں ہمیں اس سے سروکار ہے اس میں موجودہ نراج زمین اور سرمایہ کی مشترک ملکیت کے عقیدہ سے وابستہ ہے اور اس طرح نہایت اہم اعتبار سے اشتراک سے قریب ہے۔ اس مذہب کو صحیح طور پر نراجی اشتراک کہتے ہیں لیکن اس میں چونکہ عملاً سارا جدید مسئلہ نراج شامل ہے لہذا ہم فی الحال انفرادی نراج کیطرف سے قطع نظر کر کے اپنی تمامتر توجہ اس کی اشتراکی شکل پر مبذول کر سکتے ہیں۔ اشتراک (خالص) اور نراجی اشتراک دونوں اس ادراک سے پیدا ہوئے ہیں کہ شخصی سرمایہ بعض افراد کو دوسروں پر ظلم کا باعث ہے۔ ارتودکس اشتراک یقین کرتا ہے کہ اگر ریاست تنہا سرمایہ دار ہو جائے تو فرد آزاد ہو جائیگا برخلاف اس کے نراج کو اندیشہ ہے کہ ایسی حالت میں شاید ریاست کو شخصی سرمایہ دار کے تمام ظالمانہ رجحانات ورثہ میں ملیں گے۔ لہذا یہ ایک ایسے ذریعہ کا متلاشی ہے جس سے ملکیت مشترک اور ریاست کے اختیار میں زیادہ سے زیادہ تخفیف باہم ملجائیں بلکہ آخر میں چلکر ریاست مطلقاً معدوم ہی ہو جائے۔ یہ اشتراکی تحریک کے اندر ہی اس کے انتہائی پہلوئے چپ کی حیثیت سے پیدا ہوا۔

بعینہ اسی معنی میں جس میں مارکس کو جدید اشتراکیت کا بانی کہا جا سکتا ہے، باکونین کو اشتراکی نراج کا بانی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مارکس کیطرح باکونین نے مسائل کا کوئی مختتم اور منظم مجموعہ نہیں تیار کیا۔ اس سے بہت قریب پہنچنے میں ہمیں اس کے تبع کروپاٹکن کی تحریروں

---

(۱) "ایک چینی صوفی کی افکار"

سے بدلے گی۔ جدید نراج کی توضیح کے لئے ہم باکونین کی زندگی[1] اور مارکس سے اس کی مخالفت کی تاریخ سے ابتدا کریں گے اور اس کے بعد نراجی نظریہ کا ایک مختصر سا بیان پیش کریں گے جیسا کہ یہ جزواً خود اس کی اور زیادہ تر کروپوٹکن کی تصانیف میں ملتا ہے۔

میخیل باکونین ایک روسی امیر گھرانے میں پیدا ہوا ہے جو اپنی خدمت سے سبکدوش ہو کر سرکار تویر میں اپنے دیہی تعلقہ میں آبسا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں باکونین پیٹرسبرگ کے توپخانہ کے مدرسہ میں شامل ہوا اور ۱۸ سال کی عمر میں یہ ایک رجمنٹ میں افسر کی حیثیت سے بھیجا گیا جو سرکار منسک (Minsk) میں تعینات تھی۔ ۱۸۳۰ء کی پولی بغاوت ابھی ابھی دبائی جا چکی تھی۔ مبہوت و خوف زدہ پولینڈ کے منظر نے "بقول گیلوم" نوجوان افسر کے دل پر بڑا گہرا اثر کیا اور اس میں استبداد کی طرف سے نفرت پیدا کرنے میں مدد دی"۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کی آزمائش کے بعد اس نے اپنا فوجی پیشہ ترک کر دیا۔ اس نے ۱۸۳۴ء میں اپنے عہدہ سے استعفا دیا اور ماسکو جا کر چھ سال فلسفہ کی تعلیم میں صرف کئے۔ اس دور کے سب طلبہ فلسفہ کی طرح یہ بھی ہیگل کا متبع ہو گیا اور ۱۸۴۰ء میں اس امید کے ساتھ کہ آگے چل کر پروفیسر ہو جائے گا یہ برلن میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے آیا لیکن اس زمانے کے بعد اس کے خیالات میں بڑی تیز تبدیلی ہوئی۔ اسے اب ہیگل کا یہ قول تسلیم کرنا ناممکن معلوم ہونے لگا کہ جو کچھ ہے مطابق عقل ہے۔ یہ ۱۸۴۲ء میں ڈریسڈن منتقل ہو گیا جہاں اسے Deutsche Jahrbücher کے ناشر آرنلڈ روگے سے واسطہ رہا۔ اس زمانہ میں یہ انقلابی بن چکا تھا اور اگلے ہی سال اس نے اپنے آپ کو سیکسنی حکومت کے عتاب کا مورد بنا لیا۔ چنانچہ سویزرلینڈ جانے پر مجبور ہوا۔ یہاں جرمن اشتراکیوں کے ایک گروہ سے یکجائی کا موقع ملا، لیکن سوئس

---

(۱) نراجی نقطۂ نظر سے باکونین کے حالاتِ زندگی اس کے مجموعۂ تصانیف (شائع کردہ گیلوم، پیرس) کی دوسری جلد میں ملیں گے۔

پولیس تنبیہہ کر ہی چکی تھی اور روسی حکومت نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا، لہٰذا یہ پیرس چلا گیا اور یہاں ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۷ء تک رہا۔ اس کے خیالات و آراء کی تشکیل میں پیرس کے یہ سال بہت اہم تھے۔ یہاں اس کی پرودھان سے واقفیت ہوئی جس نے اس پر کافی اثر ڈالا، نیز جارج سینڈ اور بہت سے اور مشہور لوگوں سے۔ پیرس ہی میں اس کی واقفیت مارکس اور انگلز سے پیدا ہوئی جن سے اسے ساری عمر معرکہ آرائی کرنی تھی۔ بہت عرصہ بعد ۱۸۷۱ء میں اس نے اپنے اور مارکس کے اس زمانہ کے تعلقات کو یوں بیان کیا:۔

مارکس مجھ سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا، اور آج بھی اگرچہ وہ خیالات کے اعتبار سے آگے بڑھا ہوا نہیں ہے مگر علمیت کے اعتبار سے میرا اس سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا میں اس وقت معاشیات کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے ابتک مابعد الطبیعی تحریروں سے رہائی نہ حاصل کی تھی، اور میرا اشتراک بس فطری و جبلی تھا۔ وہ اگرچہ مجھ سے کم عمر تھا، تاہم اسی زمانہ میں دہریہ تھا، نہایت واقف کار مادہ پرست، اور سوچا سمجھا اشتراکی۔ ٹھیک اسی زمانہ میں اس نے اپنے موجودہ نظام کی اول بنیادیں ترتیب دی تھیں۔ ہم ایک دوسرے سے اکثر ملا کرتے تھے، کیونکہ میں اس کی علمیت اور فرد و رد کے باب میں اس کی دلی اور گہری دلچسپی کے باعث (جس میں ہمیشہ ذاتی خودبینی کی بھی آمیزش ہوتی تھی) اس کی بڑی عزت کرتا اور اس کی گفتگو کا دل سے اشتیاق رکھتا تھا کیونکہ یہ گفتگو ہمیشہ سبق آموز اور دانشمندانہ ہوتی تھی، بشرطیکہ اس کی تہ میں کوئی حقیر نفرت نہ ہو جیسا افسوس ہے کہ اکثر ہوتا تھا۔ لیکن ہم دونوں میں صاف بے تکلفی کبھی نہ تھی۔ ہمارے طبائع اس کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ وہ مجھے جذباتی خیالی کہتا تھا اور ٹھیک کہتا تھا، میں اسے خودبین متفنی اور مکار کہتا اور میں بھی ٹھیک کہتا تھا،،

باکونین ارباب اختیار کی دشمنی کا مورد بنے بغیر کبھی ایک جگہ عرصہ تک نہ ٹھہر سکا

ایک تقریر کے سبب سے جو اس نے ۱۸۳۰ء کی پولی بغاوت کی تعریف میں کی روسی سفارت کی درخواست پر نومبر ۱۸۴۷ء میں اس کا فرانس سے اخراج ہوا۔ اور روسی سفارت نے اسے عام ہمدردی سے محروم رکھنے کے لئے یہ بے بنیاد خبر پھیلا دی کہ یہ روسی حکومت کا کارندہ ہے لیکن چونکہ اسکا رویہ قابل اعتراض ہے اس لئے ہمیں اسکی ضرورت نہیں رہی، فرانسیسی حکومت نے جان بوجھکر خاموشی اختیار کی اور اس طرح اس قصہ کو اور اکسایا اور یہ الزام کم وبیش زندگی بھر اس کے سر رہا۔

فرانس چھوڑنے پر مجبور ہوا تو بروسلز گیا۔ یہاں مارکس سے واقفیت کی تجدید ہوئی۔ اسکے ایک خط سے جو اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں وہ شدید نفرت موجود تھی جس کے لئے بعد کو اتنے وجوہ پیدا ہوگئے "یہ جرمن کاریگر بورن اشٹیڈ مارکس اور انگلز اور خصوصاً مارکس یہاں اپنی معمولی شرارت کر رہے ہیں خودبینی کینہ، غیبت سے معمور نظری حیثیت سے بر خود غلط، عمل کے اعتبار سے چھچورے، عملی زندگی اور سادگی افکار میں کورے، انشاپردازی اور مناظرے کے کاریگر اور اس کے ساتھ قابل نفرت کبر و نخوت میں مدہوش نوابزادے۔ بورژوا ہے، لفظ بورژوا ایک لفظ ہی جسے اتنا دہراتے ہیں کہ جی متلانے لگے لیکن سب کے سب سر سے پیر تک پکے دیہاتی بورژوا۔ مختصر یہ کہ جھوٹ اور حماقت، حماقت اور جھوٹ۔ اس صحبت میں آزادی سے پوری سانس بھرنا بھی ممکن نہیں۔ میں ان سے الگ تھلگ رہتا ہوں اور نہایت قطعی طور پر اعلان کر چکا ہوں کہ میں انکے اشتراکی اتحاد کاریگران میں کبھی شامل نہ ہوں گا اور اس سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔"

۱۸۴۸ء کے انقلاب کیوجہ سے یہ پیرس واپس گیا اور وہاں سے جرمنی آیا ایک معاملہ میں مارکس سے اسکا جھگڑا ہوا، جس کے متعلق بعد کو اس نے خود اقرار کیا کہ اس میں مارکس حق پر تھا۔ پراگ میں یہ سلافی کانگریس کا رکن بنا اور ایک سلافی بغاوت

ابھارنے کی بیکار کوشش کرتا رہا۔ ۱۸۴۸ء کے اواخر میں اس نے "سلافیوں کے نام اپیل" لکھی جس میں ان سے کہا گیا ہے کہ دوسرے انقلابیوں سے ملکر تین ظالم سلطنتوں کو تباہ کر دو یعنی روس، اسٹریا اور پروشیا۔ مارکس نے اخبار میں اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ بھی خود مختاری کی تحریک عبث ہے کیونکہ سلافیوں کا کوئی مستقبل نہیں کم سے کم ان علاقوں میں جہاں وہ جرمنی اور آسٹریا کے محکوم ہیں۔ باکونین نے اس معاملہ میں مارکس پہ جرمنی وطن پرستی کا الزام لگایا اور مارکس نے اس پر اتحاد سلافی کی حمایت کا اور اسمیں شبہ نہیں کہ دونوں الزام بجا تھے۔ لیکن اس قضیہ سے پہلے ایک زیادہ سخت جھگڑا ان دونوں میں ہوچکا تھا۔ مارکس کے اخبار نے بیان کیا تھا کہ جارج سینڈ کے پاس ایسے کاغذات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ باکونین روسی حکومت کا کارندہ ہے اور منجملہ ان لوگوں کے ہے جو حال کی پولی گرفتاریوں کے ذمہ دار ہیں۔ باکونین نے ظاہر ہے کہ الزام کو جھٹلایا اور جارج سینڈ نے اس اخبار کی ادارت کو لکھکر اس بیان کی کلی تردید کی۔ یہ تردیدیں مارکس نے شائع کر دیں اور باہم برائے نام سمجھوتا ہوگیا لیکن اسوقت سے لیکر آئندہ کبھی ان دونوں حریف قائدوں میں مخالفت ٹھنڈی نہ پڑی اور یہ ایک دوسرے سے ۱۸۶۴ء تک نہیں ملے۔

اس اثنا میں ردعمل ہر جگہ جڑ پکڑ رہا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں ڈرسڈن میں بغاوت کے بعد کچھ لمحوں کے لئے شہر انقلابیوں کے ہاتھ میں آگیا، پانچ دن تک اسے انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور ایک انقلابی حکومت قائم کی۔ ان انقلابیوں نے پروشی فوجوں کا جو مقابلہ کیا اس کا روح رواں باکونین ہی تھا۔ لیکن یہ مغلوب کر لئے گئے اور باکونین ہوائنر اور رچارڈ واگنر کے ساتھ بھاگنے کی کوشش میں گرفتار کیا گیا اور موسیقی کی خوش نصیبی کہ موخرالذکر گرفتاری سے بچ گیا۔

اب بہت سے مجلسوں اور مختلف ملکوں میں قید کا ایک طویل زمانہ شروع ہوتا ہے۔

۱۴ر جنوری ۱۸۵۱ء کو اس پر سزائے موت کا حکم لگایا گیا، لیکن ۵ مہینہ کے بعد یہ حکم بدلدیا گیا اور اسے اسٹریا کے سپرد کر دیا گیا جو اسے سزا دینے کی سعادت کا طالب تھا۔ اسٹریوں نے بھی مئی ۱۸۵۱ء میں اس پر سزائے موت کا حکم لگایا اور پھر یہ حکم بھی حبس دوام میں تبدیل کر دیا گیا۔ آسٹروی قیدخانوں میں اس کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں اور ایک قیدخانہ میں تو اسے کمر کی پیٹی سے دیوار سے باندھ دیا گیا تھا۔ باکونین کو سزا دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص مسرت حاصل ہوتی تھی کیونکہ اسٹریوں سے اب روسی حکومت نے اسے طلب کیا اور انہوں نے اس کے سپرد کر دیا۔ روس میں اسے پہلے پطرس اور پولوس کے قلعہ میں قید رکھا گیا اور بعد کو شلوسل برگ میں۔ یہاں اسے فساد خون کا عارضہ ہو گیا اور اس کے سارے دانت گر گئے۔ اس کی صحت بالکل خراب ہو گئی اور اس کے لئے تقریباً ہر غذا کا ہضم کرنا ممکن ہو گیا۔ لیکن اگرچہ اس کا جسم کمزور ہو گیا تھا، تاہم اس کی روح مغلوب نہیں ہوئی تھی۔ اسے سب سے زیادہ ایک بات کا ڈر تھا۔ یہ کہ کہیں قید کے کمزور کرنے والے اثر سے یہ کسی دن ذلت کی اس حالت پر نہ پہنچ جائے جس کی مشہور مثال سلویو پیلیکو ہے۔ یہ خوف تھا کہ یہ کہیں نفرت کرنا نہ چھوڑ دے، کہیں بغاوت کا وہ جذبہ جو اسے سہارا دیتا رہتا تھا اس کے دل سے مٹنے نہ لگے، کہیں یہ اپنے سزا دینے والوں کو معاف کر کے اپنی قسمت پر قانع و صابر نہ ہو جائے۔ لیکن یہ خوف غیر ضروری تھا، اس کی قوت نے ایک دن کے لئے بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اپنی قید کی کوٹھری سے اسی آن بان سے نکلا جیسے اس میں داخل ہوا تھا۔

ترکی اور جنگ عظیم

قصہ شروع ہوا اسٹریا کے ولی عہد کے قتل سے اور ختم ہوا جنگ عظیم کے اعلان پر
ان دنوں ترکی میں کوئی یہ گمان بھی نہ کرتا تھا کہ اسکا نتیجہ ایسی عالمگیر تباہی کی شکل میں
نکلے گا۔ اس تباہی کی ذمہ داری پر میں بحث نہ کرونگی۔ اگر جرمنی کی معاش اور فوجی ترقی
اور اسکا مادی فلسفہ اس جنگ کے معین تھے تو اب یہ بھی تو معلوم ہو چکا ہے کہ اتحادیوں
کی طرف بھی ایسے ہی مادی اسباب اور اتنی ہی جارحانہ تیاریاں عرصہ سے جاری تھیں
لیکن جن وجوہ سے ہم اس عام تباہی میں شریک ہوئے ان پر ایک نظر تکلیف دہ سہی لیکن
دلچسپ ضرور ہے۔ ہمارے شامل ہونے سے ہی مشرق قریب میں ۴ سال جنگ رہی، دنیا
کو بہت کچھ دکھ پہنچا! اور خود ترکی قوم کی ہزاروں جانیں تلف ہوئیں اور ایسی تکلیفیں اٹھانی
پڑیں جنکا اٹھانا کچھ ضروری نہ تھا۔ اپنی شمولیت کی وجوہ بتانے سے پہلے میں قارئین کرام
کی توجہ تین خاص کتابوں کی طرف منعطف کرانا چاہتی ہوں جن سے واقعات پر بہت کچھ
روشنی پڑتی ہے۔ پہلی کتاب تو پروفیسر آرل (   ) کی تصنیف ہے "بغداد ریلوے"
جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف غیر متعصب آدمی ہے حق بات معلوم کرنا چاہتا
ہے اور ایسے زمانہ میں اس نے اپنی کتاب لکھی ہے جب دونوں طرف سے پروپگنڈا کے
بادل چھٹ چکے تھے اس لئے یہ معاملات کو صاف صاف دیکھتا ہے۔ اور چونکہ کتاب
خاص معاشی ہے اس لئے جو شخص اس معاشی معمہ کو سمجھنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے یہ
کشمکش ہوئی اسے اس کتاب میں نہایت اچھی اور غیر جانبدار سند ملے گی۔

دوسری کتاب روسی سفارتخانہ قسطنطنیہ کے ترجمان اول منڈلسٹن کی تصنیف ہے
سلطنت عثمانیہ) یہ کتاب ۱۹۱۷ء

میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف نے نوجوان ترکوں کی بابتہ بہت زیادہ مواد جمع کیا ہے۔ اوران اسباب کی بابتہ جنہوں نے ترکی کو جرمنی کی طرف شریک جنگ کرایا۔ اس مصنف کا بس ایک مقصد ہے اور اس نے اپنا تمام مواد اسی بات کو ثابت کرنے کے لئے جمع کیا ہے اور اسے ہر طرح توڑ مروڑ کر اسی کام کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس کا نقطہ نظر کم وبیش وہی ہے جس پر ان دنوں میں ساری دول اتحادی نہایت شدت کے ساتھ، اندھے پن اور تنگی دل سے یقین رکھتی تھیں۔ اس مصنف کے دلائل کی روح یہ ہے کہ ترکی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے چاہئیں۔ ترکوں کو معمولی انسان نہ سمجھنا چاہیئے؛ اور نوجوان ترکوں کو تو ارمینوں کے قتل کے باعث عادی مجرم جاننا چاہیئے۔ کتاب میں ارمینوں کے قتل کا تفصیلی بیان ہے اور دوسری اقلیتوں کی بابتہ بہت مبالغہ آمیز الزامات ہیں جن کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ ترک انہیں یک قلم مٹا دینا چاہتے تھے لیکن مجھے اس بات میں بلغاریوں کے ہاتھوں ترکوں کے قتل کا ذکر کہیں نہ ملا، نہ ۱۹۱۲ء کے مظالم کا، نہ ترکوں کے اس قتل عام کا جو ارمینوں نے روسی فوج کے ساتھ مشرقی ترکی میں داخل ہو کر ۱۹۱۵ء میں کیا تھا، اور جس کا ذکر صاف سیدھی زبان میں انہی روسی افسروں نے کیا ہے جنہوں نے ان ارمنی مظالم سے بیزاری ظاہر کی تھی۔ کثرت مواد کے باوجود اس کتاب سے مجھ پر پہلی مرتبہ روشن ہوا کہ میرے ملک اور میری قوم کے متعلق اس زمانہ میں یورپی دماغ میں کیسی لاعلاج تنگی تھی اور کیسا یکطرفہ پن۔ اور پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آیا کہ نوجوان ترکوں کے دلائل میں سچ مچ واقعیت تھی۔ بہر حال ہمارے ایک سابق وزیر اعظم کے بیانات میں (جنہیں مصنف نے اپنی کتاب کے مطالب کی رد میں خود نقل کیا ہے) ترکوں کی جانب سے کافی مواد اور نہایت قوی اور ناقابل انکار دلائل موجود ہیں۔

منڈلسٹن کی کتاب کے بالکل مخالف ایک تیسری کتاب ہے، ''اسباب جنگ'' جو بوغمی ہے دتج کی تصنیف ہے اور ابھی حال میں پیرس سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں

ان رجحانات سیاسی کا ذکر ہے جو جنگ سے پہلے دنیا پر چھائے ہوئے تھے: زاری روس کی سیاست جس کا مقصد اسٹریا کو اور بلقان میں ترکی کو ختم کر دینا تھا، اور فرانس کی سیاست جو روس کی حمایت کرتی تھی تاکہ جرمنی کو پیس دے اور الساس لورین کا صوبہ واپس لے لے بوغی بجے وچ ایک پرانا سربی رکن سیاست ہے جوان سیاسی مقاصد کے تیاری کے زمانہ میں نیز ایام جنگ میں سیاسی کام کرتا تھا۔ اس لئے اس نے نہایت دلچسپ سیاسی دستاویزیں بھی نقل کی ہیں۔

میں خود تو ہر جنگ کی مخالف ہوں اس لئے میں شرکت جنگ کی حمایت نہیں کر سکتی چاہے وہ کسی طرف سے ہوتی۔ لیکن اگر کوئی اس راز کے سیاسی دلائل کی گتھیوں کو سلجھائے اور ان نوجوان ترک قائدوں کی کیفیت ذہنی کو سمجھنے کی کوشش کرے تو اسباب بالکل واضح ہو جاتے ہیں: پہلا سبب تو خود مختاری کی خواہش تھی یعنی غیر ملکیوں کے مراعات کو مٹا دینے کی خواہش۔ نوجوان ترکوں نے بہت سخت کوشش کی کہ اتحادی دول کی ہمدردی حاصل کریں۔ لیکن بے سود۔ اتحادی انہیں غیر جانبدار دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس کے عوض کچھ دینے کو تیار نہ تھے۔ دوسرا سبب روسی سامراج کا موروثی اور جائز خوف۔ یہ اور بات ہے کہ روس کو قسطنطنیہ دینے کا وعدہ ۱۹۱۴ء میں کیا گیا یا ۱۹۱۶ء میں نوجوان ترک یہ ضرور جانتے تھے کہ روایتی اور سیاسی اعتبار سے روس انگلستان کا دشمن ہے اسے پھانسنے کے لئے انگلستان ترکی کو ضرور نرم چارہ کی طرح استعمال کرے گا۔ تیسرا سبب ترکی کی افسوسناک مالی حالت تھی۔ غیر جانبدار رہنے کے لئے بھی ترکی کو مالی مدد درکار تھی اور یہ مالی مدد اتحادیوں سے مل نہ سکتی تھی۔ دورِ حاضر کے ایک معروف مدبر نے مجھ سے بیان کیا کہ جب انگلستان نے ہمارے جہاز ضبط کئے اور انکے دام دینے سے بھی انکار کیا تو حکومت پر جنگ کے موافق عنصر کا بہت اثر پڑا اور وہ اس طرف ڈھل گئی۔ بالفرض اگر یہ بیان پوری حقیقت حال پر حاوی نہ ہو تو اس کے ایک اہم جزو پر ضرور حاوی ہے

اور اس سے ترکی کی شدید مالی احتیاج کا پتہ چلتا ہے۔ چوتھا سبب اتحادیوں کا کھلم کھلا اور متعصبانہ طور پر عیسائیوں کی حمایت کرنا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ عیسائی اقلیتوں کو مدد دی کہ یہ مسلم و ترک اکثریت کے مقابلہ میں معاشی بلکہ سیاسی تفوق تک حاصل کرلیں۔ پانچواں سبب یہ تھا کہ جرمنی کو ترکی کمزوریوں سے پوری پوری ذہنی و نفسی واقفیت تھی اور اس نے صحیح لمحہ کے انتخاب میں نہایت ہوشیاری سے کام لیا۔

نوجوان ترکوں کے قائدوں نے اپنے جنگ میں شامل ہونے کے موافق جو دلیلیں بھی ممکن تھیں سب کی سب استعمال کیں، اور ترک قوم کو جس میں اتحادی بہت ہر دلعزیز تھے اتحادیوں کے خلاف ابھارنے کی سب کوششیں کیں۔ عجیب سی بات ہے کہ ترکی رائے عامہ اس وقت اتحادیوں کے خلاف ہوئی اور نوجوان ترکوں کے دلائل کو اس نے اس وقت صحیح تسلیم کرنا شروع کیا جب نوجوان ترک برسر اقتدار نہ رہے۔ یونانی قبضہ اور انگریزوں کی شہ پر یونانی مظالم اُدھر اور ادھر زمین میں فرانسیسیوں کی سرپرستی میں ارمنیوں کے مظالم جب سامنے آئے تو لوگ کہنے لگے کہ دیکھا اتحادیوں کے انصاف اور حکومت کا یہ نمونہ ہے اور اسے اتحاد و ترقی والوں نے جنگ سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں عام آبادی ہی نہیں بلکہ خود اتحاد و ترقی کے اکثر اہل فکر اور با اثر لوگ جنگ کے مخالف تھے۔ صرف انور پاشا اور ایک چھوٹا سا فوجی گروہ جنگ کے موافق تھا اور انکے ساتھ کچھ ایسے لوگ جو جنگ سے مالی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ نہ جانے کیا بات تھی لوگ جنگ کو ناممکن سا سمجھتے تھے۔ اگرچہ ڈرتے بہت لوگ تھے اور بے چین بھی تھے اسلئے کہ ترکی میں حکومت فوجی کی قوت سے واقف تھے۔

شروع اکتوبر میں دو شخص میرے پاس ملنے آئے اور ان سے دو یادگار گفتگوئیں ہوئیں پہلے جمال پاشا، وزیر بحر آئے۔ اور بیگم جمال کے ساتھ میرے یہاں آکر چاء پی۔

میں نے ان سے صاف صاف کہا "مجھے تو ڈر ہے کہ ہماری حکومت جنگ کیطرف

چل رہی ہے" وہ ہنسے گویا میں نے کوئی بے معنی بچوں کی سی بات کہی۔ مجھے انکے چہرہ کا نہایت قطعی انداز ابتک یاد ہے جب انہوں نے کہا "نہیں، نہیں، خالدہ خانم، ہم جنگ میں شریک نہ ہونگے،، میں نے پوچھا " اور وہ کیسے؟" جواب ملا! "میرے پاس اتنی قوت ہے کہ میں ان لوگوں کو سمجھا سکوں کہ جنگ میں شریک نہ ہونا چاہیئے۔ اگر میں اس میں ناکام ہوا تو میں استعفیٰ دیدوں گا۔ جنگ میں شامل ہونا سخت حماقت ہوگی۔"

تین دن بعد جاوید بے ملنے آئے۔ یہ کچھ مایوس اور شکستہ خاطر سے تھے اور چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت پریشان ہیں۔ میں نے ان سے بھی وہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا "اگر یہ لوگ جنگ میں شریک ہوئے تو میں مستعفی ہوجاؤں گا۔ ہم اگر جیت بھی گئے تو تباہ ہوجائیں گے۔ اور لوگ بھی ہیں جو استعفار دیدینگے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ ہم انہیں جنگ میں شامل ہونے سے روک لیں گے۔ طلعت بھی اس وقت جنگ کے مخالف ہیں۔"

اسی مہینہ کی اٹھارہ تاریخ کو ترکی جنگ میں شریک ہوگیا۔ جاوید بے اور انکے کچھ ساتھیوں نے استعفا دیدیا لیکن جمال پاشا مستعفی نہ ہوئے۔

چند ہی روز بعد جمال پاشا رخصت ہونے آئے۔ یہ تیسرے لشکر کے سردار مقرر ہوئے تھے یعنی روسی محاذ پر۔ خوب بشاش تھے اور اپنی رائے میں تبدیلی کے وجوہ بیان کرتے تھے۔ ان کی خاص دلیل وہی روس والی دلیل تھی۔ انہیں یقین تھا کہ اگر اتحادی جیتے تو قسطنطنیہ روس کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ اور چونکہ غیر جانبداری کی صورت میں اتحادی کوئی کافی ضمانت نہیں دیتے اس لئے ترکی فوج کا یہ فرض اول ہے کہ روس کے مخالفوں کی مدد کرے۔ اور اگر جرمن اور ترک جیتے جس کا انہیں کامل یقین تھا، تو ترک ایسے آزاد ہوجائیں گے جیسے کبھی پہلے نہ ہوئے تھے اور خارجی مداخلتیں اور مراعات بالکل ختم ہوجائیں گی۔

آج یہ سوچکر کیسا افسوس ہوتا ہے کہ اگر اتحادی اسوقت مراعات کے ہٹا دینے پر راضی ہوجاتے اور قسطنطنیہ کی بابت کوئی یقین دلا دیتے تو فوجی جماعت ترکی کو جنگ میں

نہ گھسیٹ سکتی۔

جاوید بے معتوب تھے اور انکی سختی سے نگرانی ہوتی تھی، کچھ دنوں تو یہ گھر سے نہ نکلے۔ انتہا پسند اور اتحاد و ترقی والے نہایت سختی سے ان پر حملے کرتے تھے اور بعض نے انہیں غدار تک ٹھہرایا۔

جمال پاشا کو بعد میں چوتھے لشکر کا سردار بنایا گیا اور انہیں شام بھیجا گیا۔ انکے سپرد مصر پر حملہ کرنا اور انگریزوں کو مصروف رکھنے کا کام ہوا تا کہ انگریز شامی محاذ پر اپنے لشکر جمع کر دیں۔

گیلی پولی کی دل ہلا دینے والی مدافعت۔ ترکی میں جنگ کا سب سے پہلا اہم واقعہ تھا۔ میں یہاں اس کی فوق البشری شجاعت اور قربانی کا ذکر نہ کروں گی۔ میرے نزدیک تو ساری عزت اور سارا فخر عام ترکی سپاہی کا حق ہے جسکا نہ کوئی نام جانتا ہے نہ پتہ اور جو متحرک تصاویر میں شخصیت وقت کی حیثیت سے بھی ہمارے سامنے نہیں آسکتا۔ مسٹر میسفیلڈ کی کتاب "گیلی پولی" سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز جیسی قوم نے اس معرکہ میں کتنے آدمی اور کتنا سامان کیا۔ اور اسی کتاب سے ترکی فوج کی قوت مدافعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے جس نے اتحادیوں کی افواج اور بیڑوں سے گیلی پولی کو بچایا۔ سپاہیوں میں نہایت قومی احساس تھا کہ وہ ترکی ارض پاک کے دروازوں کی حفاظت کر رہے ہیں اس سے زیادہ احساس اس بات کا تھا کہ وہ اس روسی بھوت سے لڑ رہے ہیں جس کی شکل اتحادی افواج نے انکے ذہنوں میں پیدا کر دی تھی۔

دردانیال پر جب اتحادیوں کا حملہ ہوا ہے تو بہت سے خاندان قسطنطنیہ سے آئے تھے۔ اور میں نے بھی اپنے بچوں کو بروسا بھیجدیا تھا۔ تقریباً ۵ / مارچ کے معرکہ عظیم کے وقت یوسف اکچورہ نے قوم پسند مصنفوں کو "ترک اوردو" کے دفتر میں جمع ہونے کی دعوت دی اور نہایت سنجیدگی سے اس پر غور شروع ہوا کہ اگر اتحادی افواج دردانیال سے گزر کر قسطنطنیہ میں داخل ہو گئیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ فیصلہ یہ کرنا تھا کہ اس مصیبت میں انہیں قسطنطنیہ

ہی میں ٹھہرنا چاہئے یا کسی محفوظ تر مقام پر جاکر کام کرنا اور لوگوں کے سینوں میں قومیت کے جذبات اور تخیلات کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

بڑی لمبی لمبی نشستیں ہوئیں، اور طولانی بحثیں، اور سب نے آخر میں جاکر ایک مبالغہ آمیز سی شکل اختیار کی۔ لیکن انکی گرمی اور حدت کبھی کم نہ ہوئی۔ ڈاکٹر عدنان چونکہ حاضرین میں سب سے زیادہ ٹھنڈے آدمی سمجھے گئے اسلئے صدارت انہیں کے سپرد ہوئی۔

پہلے تو ہر ایک کو اپنا قومی عقیدہ بیان کرنا پڑا۔ نوجوان مصنفوں کو پرلو نواد اور عمر سیف الدین نے کہا کہ قوم پرستی نام ہے نفس قومی کی تلاش اور دریافت کا اور قوم کے افراد کو اسکا درس دینے کا۔ نفس قومی کے عناصر بنیادی کے تعین میں یہ دونوں غیر معین سے خیالات رکھتے تھے۔ عمر نے جو بعد کو میرا دوست ہو گیا تھا ایک دفعہ مجھ سے ہنسی ہنسی میں اقرار کیا کہ ہمارا استاد کوک الپ ضیا، جو اسوقت قسطنطنیہ میں موجود نہیں وہ تو ہمیشہ نفس قومی کے اجزا کو بدلتا رہتا ہے، ہم لوگ کبھی کوئی صاف بات اسلئے نہیں کہہ سکتے کہ کہیں آگے چل کر اسکے بالکل خلاف بات نہ پیش کرنی ہو!

آغا اوغلو احمد نے جو ایک پرانے قوم پرست ہیں، کہا کہ قومیت ایک مشترک ذہنیت کا نام ہے جو چار عناصر سے مرکب ہے یعنی زبان مذہب، نسل، اور رسوم۔ ان چار عناصر پر اور انکے مدارج اہمیت پر پھر سارا مباحثہ ہوتا رہا۔ چونکہ ترکی قوم پرستی کے سیاسی رجحانات کا دارومدار بڑی حد تک ان عناصر کے مدارج کی اہمیت ہی پر تھا اس لئے یہ بحث نہایت مفید اور سبق آموز تھی۔ حسین زادہ علی نے جو ایک محترم رکن اتحاد و ترقی اور پرانے قوم پرست تھے، کہا کہ مذہب اور زبان اہم تر عناصر ہیں۔ اور نسل اس کے بعد آتی ہے۔ انہوں نے فرمایا "ایک مسلم حبشی جو ترکی بولتا اور اپنے کو ترک کہتا ہے مجھ سے بہ نسبت اس ماگیار کے قریب تر ہے جو نسلاً ترک ہے"، وہ گویا ذرا نرم شکل میں اتحاد اسلامی کے حامی تھے، نوجوان لوگ نسل اور زبان پر زیادہ مصر تھے اور مذہب کو سب سے کم اہمیت کی چیز بتلاتے تھے یہ گویا

"اتحاد تورانی" کے حامی تھے۔

آخر میں جلسہ نے یہ طے کر لیا کی کوشش کی کہ جو مصنف ترکی قومیت کے خیال کا مجسمہ ہیں انہیں قسطنطنیہ میں ٹھہرنا یا کہیں اور چلا جانا چاہئے۔ اس موقع پر ایک نوجوان صحیفہ نگار محمد علی توفیق نے ایک جوشیلی تقریر کی جو خطابت کی تاثیر سے پر تھی اور جس میں مشورہ دیا گیا تھا کہ یہ مصنف یہی نہیں کہ قسطنطنیہ میں ٹھہریں بلکہ انہیں کوشش کرنی چاہئے کہ اپنے کو شہید کرائیں اور قومیت کے اعلان پر اپنے خون سے مہر لگائیں۔ اگرچہ ان دنوں اپنے کو شہید کرا دینا کچھ مشکل نہ تھا پھر بھی جو مصنف اس شرف کے اہل سمجھے گئے تھے انکی کچھ عجیب سی حالت تھی۔ محمد امین جن کا نام سب سے اول تھا اپنے ہاتھ باندھے بیٹھے تھے اور کچھ سوچ رہے تھے۔

میرا نام بھی انتخاب میں آیا تھا اور میں سوچتی تھی کہ محمد امین اسوقت موت کے خیال میں کیسے محو ہیں۔ بہت سے دوستوں کی آنکھوں میں نمی دکھائی دیتی تھی اور میں تو سمجھتی ہوں کہ ان پر غم ایام میں یہ سب سے بڑا مذاق تھا جو کیا گیا۔

دردانیال کا حملہ تو گذر گیا، لیکن مشرقی اناطولی محاذ پر گڑ بڑ شروع ہو گئی۔ ارمنوں کے اخراج اور اس کے خونی نتائج کے متعلق افواہیں برابر پھیل رہی تھیں۔ چرچا تھا کہ ارمنیوں نے ترکی گانوں جلا ڈالے اور ترکوں کا قتل عام کیا۔ اسکا بھی چرچا تھا کہ انکے انقلابی مرکز ترکی فوج کے لئے اندرون ملک میں پریشانی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ ان واقعات کے بہت دنوں بعد حکومت نے ایک کتاب شائع کی جس میں مشرقی اناطولیہ کی سازشوں کو طشت از بام کیا گیا۔ جب اخراج شروع ہوا تو عام رائے دل سے حکومت کی مخالف تھی لیکن ملک جنگ میں مبتلا تھا اور اس مسئلہ کے متعلق کوئی خبر شائع بھی نہ ہوئی تھی، ترکی آبادی کے لئے یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ اگر عام طور پر حکومت کی یہ کارروائی ناپسند کیجاتی تھی لیکن لوگوں کو ترکی کے شدید خطرے کا پورا احساس تھا اور سب سمجھتے تھے کہ اگر فوج کو شکست ہوئی تو ترک لٹ جائیں گے بلکہ صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ ظاہر ہے لوگ جانتے تھے کہ

ارمینوں کے انقلابی مرکز ترکوں کے خلاف اتحادیوں کی کارروائیوں کو کامیاب بنانے کے لئے کمینگاہ کا کام دیتے تھے ۔اس سیاسی دلیل کے علاوہ جس کو ارمینوں نے خواہ مخواہ اپنی سفاکانہ اعمال سے حق بجانب بنادیا تھا ایک معاشی دلیل بھی تھی جس کی اخلاقی تائید جرمن کرتے تھے ۔ وہ یہ تھی کہ ارمینوں کے معاشی تفوق کو ختم کیا جائے اور اس طرح منڈیاں ترکوں اور جرمنوں کے لئے خالی ہوں ۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ جس سیاست خارجی نے ترکوں اور ارمینوں دونوں کو قتل کرایا وہ خوب جانتی تھی کہ فطرت معاشی دنیا میں بھی خلا کو پُر کردیتی ہے اور ترکی اقوام کے باہمی قتل سے جو جگہیں خالی ہونگی انہیں یورپی ممالک کی فاضل آبادی ہی پُر کرے گی ۔

دو چیزیں انسان کو اپنے نوع کے قتل پر آمادہ کرتی ہیں : متخیلین کے اصول اور وہ مادی اغراض جو ان اصولوں کی اتباع سے حاصل ہوتی ہیں ۔ انہیں متخیلین کے اصول زیادہ خطرناک ہوتے ہیں ، اس لئے کہ اگر آدمی ان سے اتفاق بھی نہ کرے تو ان کی عزت ضرور کرنی ہوتی ہے ۔طلعت انہیں متخیلین میں تھا ۔ میں نے طلعت کو ارمینوں کے اخراج کے بعد سے بہت کم کہیں دیکھا ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ ایک دن اس مسئلہ پر بحث کرتے کرتے غصہ میں آگئے اور ذرا درشت لہجہ میں کہا "خالدہ خانم ! دیکھو ۔میرا دل بھی ویسا ہی اچھا ہے جیسا تمہارا ، اور انسانی تکالیف کا خیال مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا لیکن یہ شخصی معاملہ ہے اور میں دنیا میں اپنی قوم کی خدمت کے لئے زندہ ہوں اپنے احساسات کی خاطر نہیں ۔کسی مقدونی یا ارمنی لیڈر کو جب کبھی ساری دنیا میں کہیں موقع ملتا ہے تو وہ چوکتا نہیں ، جنگ بلقان کے زمانہ میں اتنے ہی ترک اور مسلمان قتل ہوئے ، لیکن دنیا نے مجرمانہ خاموشی اختیار کی ۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ جبتک کوئی قوم اپنے اغراض کے لئے پوری کوشش کرتی ہے اور کامیاب ہوتی ہے ، اس وقت تک دنیا اس کی قدر کرتی ہے اور اس کے اعمال کو اخلاقی مانتی ہے ۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے لئے

میں اپنی جان دینے کو تیار ہوں اور میں جانتا ہوں کہ اس کے لئے جان دونگا"۔ ۱۹۲۲ء میں ایک ارمنی نے انہیں برلن میں گولی کا نشانہ بنایا۔

۱۹۱۶ء میں میں نے ترک اوجک، میں ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے تقریر کی، حاضرین زیادہ تر اتحاد و ترقی والے تھے، تقریر ارمنی مسئلہ اور قومی معیشت کے متعلق تھی۔ آج ارمنی مسئلہ کے متعلق میرا جو خیال ہے اس وقت اس سے بالکل مختلف تھا۔ مجھے ارمنی مظالم کا علم نہ تھا اور میں یہ نہ سمجھتی تھی کہ اگر دوسری جگہ ایسے ہی حالات ہوتے تو دوسرے ہم سے سوگنا زیادہ سخت ثابت ہوتے چنانچہ اس تقریر میں میں نے نہایت خلوص اور عقیدت کے ساتھ خونریزی کی مخالفت کی اور اپنا یہ یقین ظاہر کیا کہ اس سے ظالموں کو مظلوموں سے زیادہ نقصان ہوگا۔ کوئی سات سو آدمی موجود تھے۔ میں نے تقریر ختم کی تو نوجوانوں نے خوب تالیاں بجائیں لیکن ایک طب کا ایک نوجوان طالبعلم جس کا نام شکری افلاطون تھا، اٹھا اور حمداللہ صبحی کو پکار کر کہا: "جناب صدر، میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اور ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ حق دوسری طرف ہے" ایک اور شخص اٹھا اور بولا "شکری افلاطون جس طرز کی گفتگو کرنا چاہتا ہے اسکی اجازت اوجک کو نہ دینی چاہیے۔ ہم اس قسم کا ایک لفظ سننا نہیں چاہتے" میرے نزدیک بڑی ناواجب بات تھی، لیکن صدر شکری افلاطون کی تقریر سننے پر حاضرین کو آمادہ نہ کرسکے۔ دوسرے ہی دن مجھے ارمینوں کے ہاتھوں ترکوں کے قتل عام کے متعلق ایک بڑی سی کتاب ملی۔ میں نے یہ بھی سنا کہ اتحاد و ترقی کے بعض اراکین مجھ پر بہت خفا ہوئے اور یہ تجویز ہوئی کہ مجھے سزا دیجائے لیکن طلعت پاشا نے انکار کردیا۔ اور کہا "وہ اپنے ملک کی خدمت جس طرح ٹھیک سمجھتی ہے کرتی ہے۔ اسے اپنے خیالات ظاہر کرنے دو وہ سچی مخلص عورت ہے" البتہ ان نوجوان اہل فکر کی تعداد جو مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے بہت گھٹ گئی، لیکن طلعت پاشا نے اپنے دوستانہ رویہ میں ذرا فرق نہ آنے دیا۔

ادبیات ایران کی ترقی میں
سلطان محمود غزنوی کا حصّہ

(۳)

حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی عہد کے خلفاء و سلاطین خصوصاً خلفائے عباسیہ کے ذوق علم نے نہ صرف ایران بلکہ یونان و روم اور ہندوستان کے علما کو ایک مرکز پر مجتمع کر دیا تھا خود عربوں پر اس وقت مذہبی جوش کا پورا تسلط تھا۔ علاوہ بریں فطرتاً وہ بجائے ذہنی و دماغی کاوشوں کے عادی ہونیکے سیاست و تدبر ملکی فتوحات کی طرف زیادہ مائل تھے اس لئے انہوں نے اگر اسوقت عربی علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی تو یہ قدرتی بات تھی لیکن خود ایران اسوقت عرب مسلمانوں کی محکومی میں داخل تھا۔ اس کی زندگی اور اسکی قومیت کی بقا کی اگر کوئی صورت ہو سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ وہ فاتح اور غالب قوم کی مذہبی سرگرمیوں اور اسکی اشاعت علوم و فنون کی کوششوں میں پر جوش اعانت کرے۔ بلا شبہ ایرانیوں نے ایسا کیا اور بعض حیثیتوں سے محکوم قوم حاکموں سے بھی فوقیت لے گئی۔ عرب و ایران کے اسی ذہنی اختلاط نے وہ شاندار علمی کارنامے انجام دئے جن پر آج اسلام کو بجا طور پر فخر و ناز ہے۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں۔

> یہ فرض کر لینا کسی طرح صحیح نہیں کہ مسلمانوں کی فتح ایران کے بعد دو تین صدیاں ایران کی ذہنی تاریخ کا سادہ ورق تھیں۔ برخلاف اس کے یہ نہایت عجیب اور بے نظیر دلچسپیوں کا دور گزرا ہے عہد قدیم اور عہد جدید کے تداخل و انفعالات کی تشکیل۔ اور خیالات کے باہمی تجاذب اور اعتدال کا زمانہ تھا، کسی معنی

میں بھی یہ جمود یا موت کا زمانہ نہ تھا، یہ بالکل صحیح ہے کہ سیاسی اعتبار سے کچھ مدت کے لیۓ ایران کی علیحدہ ہستی رک گئی، کیونکہ یہ اُس عظیم الشان اسلامی سلطنت میں جذب ہو گیا۔ جو جبل الطارق سے لیکر جیحون تک وسیع تھی لیکن اقلیم دماغی میں اس نے بہت جلد وہ غلبہ حاصل کر لیا جس کا استحقاق اہل ایران کی قابلیت اور فطری جودت و ذکاوت نے اسے دے رکھا تھا۔

غرضکہ اہل ایران میں ذہنی و دماغی جوہر پہلے سے موجود تھے ضرورت اس بات کی تھی کہ ان خوابیدہ قوتوں کو بیدار کیا جاۓ چنانچہ اسلام نے یہ اہم کام کیا اور اس بیداری کے بعد ایرانیوں نے وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیۓ جن سے خود اسلام کی وقعت و عظمت کو چار چاند لگ گئے۔

مصنف مراۃ الشعر نے قدیم فارسی کے وجود کے ثبوت میں باربدا ور اُس کی شاعری کا بھی نہایت اہمیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے لیکن مولانا مسلم عظیم آبادی کی راۓ اس معاملے میں بالکل مختلف ہے:۔

قدیم فارسی شاعری کی تلاش میں باربدا ور تین چار اور بھاٹوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ عرب شاعر خالد بن فیاض نے جو پہلی صدی کے آخر میں گذرا ہے۔ باربد کا افسانہ عربی میں لکھا ہے، باربد ایک بھاٹ تھا۔ جو خسرو پرویز کو گا بجا کر خوش کیا کرتا تھا۔ یہ نہایت مغلوب الغضب بادشاہ تھا۔ جب کوئی ناگوار بات اُس کے کانوں تک پہنچانا ہوتی تو اہل دربار، باربد کی موسیقی اور بول کے ذریعہ سے آگاہ کرتے۔ چنانچہ بادشاہ کے شدیز نامی گھوڑے کی موت کی خبر باربد نے اُسے کس طرح گا کر دی ہے خالد نے عربی نظم میں اس کو بتایا ہے مگر عربی میں اس قسم کے افسانے اور چٹکلے بہت ہیں جن کو تاریخی رنگ دیکر دلچسپ اور مقبول طبع بنایا گیا ہے......

اگر باربد کی اصلیت تسلیم بھی کرلیجائے تو اس کے بول شعر نہ تھے چنانچہ عوفی کا بیان ہے :-

"نوائے خسروانی کہ آں را باربد درصورت دادہ است بسیار است تا ما ازوزن شعر وقافیہ و مراعات نظائران دور است بداں سبب تعرض کردہ نیامدئ"

درحقیقت بھٹئی اور شاعری دو چیزیں الگ الگ ہیں اور بھاٹوں کا وجود بجائے تہذیب و تمدن کی علامت کے ہمیشہ اور ہر ملک کی تاریخ میں وحشت و بدویت کی نشانی رہا ہے آجتک غیر مہذب پہاڑی علاقوں میں بھاٹ پائے جاتے ہیں جو قومی افسانے گایا کرتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کے دور وحشت میں امیروں کے درباروں میں آزاد آوارہ گرد بھاٹ پہنچا کرتے تھے جنکی صحیح تصویر مشہور افسانہ نویس اور قومی شاعر سر والٹر سکاٹ نے اپنی تصانیف میں کھینچی ہے۔ ...... سرحدی پٹھانوں میں بھی بھاٹ موجود ہیں۔ مگر اُنکا وجود تمدن و تہذیب اور علم و ادب سے جو کچھ علاقہ رکھتا ہے محتاج بیان نہیں "

علامہ شبلی نے بھی باربد اور اسکی شاعری کے متعلق کم و بیش انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قدیم شاعری کے ثبوت میں اکثر یہ دو شعر بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

پژیرا بہ گیہاں نوشہ بدی — جہاں را بہ دیدار توشہ بدی

منم آں پیل دماں و منم آں شیر یلہ — نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ

اسمیں سے پہلا شعر شاہنامہ میں بھی موجود ہے جب کوئی درباری بادشاہ سے عرض معروض کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس شعر کو پڑھ لیتا ہے، دوسرا شعر بہرام گور کا بتایا جاتا ہے ایک مرتبہ شیر کا شکار کرکے پرجوش تفاخرانہ لہجہ میں بے ساختہ اُس کے منہ سے یہ موزوں الفاظ نکل گئے۔ بہرام گور کے متعلق مشہور رہے کہ اُس نے عرب میں تربیت پائی جو اُس زمانہ

میں شعر و شاعری کا مرکز تھا اس لئے اس میں یہ مذاق پیدا نہ ہونا تعجب تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں
نے اس کے کچھ عربی اشعار بھی نقل کئے ہیں مگر اس فارسی "شعر" کے متعلق عوفی کا خیال
ہے کہ یہ صرف چند موزوں الفاظ ہیں انکو شعر نہیں کہا جا سکتا۔ لب الالباب میں اس
شعر کو جس طرح لکھا ہے وہ بہ نسبت نظم کے نثر سے زیادہ مشابہ ہے لیکن دوسرے تذکرہ نویسوں
نے جنکا تمام تر ماخذ لب الالباب ہے اصلاح و تحریف کے بعد بالکل فارسی بحر میں کر دیا ہے
یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایران جیسے متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں ناممکن تھا کہ شعر و شاعری
کا وجود نہ ہوتا خصوصاً جبکہ وہاں فطری صلاحیتیں بھی بدرجۂ اتم موجود ہوں لیکن علامہ
شبلی اسکا جواب اس طرح دیتے ہیں۔

"ایران کی سینکڑوں تلمیحات اور روایتیں آج موجود ہیں ایران کا فلسفہ
اور علوم نہیں رہے لیکن علمائے ایران کے نام اور اُنکے اقوال آجتک کتابوں
میں نقل ہوتے چلے آتے ہیں۔ یورپ کے محققوں نے پہلوی زبان کی بہت
سی کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالی ہیں لیکن چار شعر بھی ہاتھ نہیں آئے
فارسی کے قدیم اشعار نہ ملتے تو نہ ملتے لیکن شعرا کا نام تو زبان پر ہوتا۔۔۔۔۔

اس سے پہلے کہیں تذکرہ ہو چکا ہے کہ جب دولت عباسیہ میں ضعف و انحطاط شروع
ہوا تو تمام بڑے بڑے صوبے خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے، اور انکی بجائے مستقل حکومتیں
قائم ہونے لگیں، اس قسم کی سب سے پہلی سلطنت خراسان میں قائم ہوئی۔ ظاہر ہے کہ دربار
کی شان و شوکت کے لئے دوسرے لوازم کے ساتھ شاعروں کا ہونا بھی ضروری تھا
چنانچہ اس زمانہ میں متعدد فارسی شعرا پیدا ہو گئے یہ تیسری صدی ہجری کا ابتدائی
زمانہ تھا فارسی شاعری نے حقیقت یہ ہے کہ اسی زمانہ میں جنم لیا۔ ورنہ اس سے پیشتر
کم و بیش دو سو سال تک ایران میں تقریباً بالکل خاموشی چھائی رہی۔ یہ سچ ہے کہ اس
عرصہ میں کبھی کبھی کچھ چرچا ہو جاتا تھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ایرانیوں کے نہاں خانہ

فطرت میں شاعری کی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں لیکن کوئی ہوا دینے والا نہ تھا اس لئے عرصہ تک وہ یونہیں دبی پڑی رہیں اور جب یہ بات حاصل ہوگئی تو تھوڑے ہی عرصہ میں ایران میں شاعری اس طرح پھیل گئی جیسے "بن میں آگ لگ جائے" لیکن یہ امر ہنوز حل طلب ہے کہ آخر کن وجوہ کی بنا پر اس قدر طویل عرصہ تک ایرانیوں کی زبان گنگ رہی اور ایران ایک شاعر بھی پیدا نہ کر سکا۔ مولانا شبلی نے اس کے مختلف اسباب بتائے ہیں ایک موقع پر لکھتے ہیں:

"اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس قوم میں پھیلتا تھا اس کو مذہبی اثر سے اس قدر لبریز کر دیتا تھا کہ اُسے سوائے مذہب کے دنیا کی کسی چیز سے سروکار نہیں رہتا تھا۔ خود عرب کو دیکھو وہ ملک جس کے در و دیوار سے شاعری کی آواز آتی تھی۔ اسلام کے آتے ہی دفعتہً چاروں طرف سناٹا چھا گیا، ولید کے زمانہ میں جب شاہانہ دربار قائم ہوا تو لوازم سلطنت کی حیثیت سے شاعری نے دوبارہ جنم لیا لیکن تخت کی زبان عربی تھی اس لئے شاعری بھی عربی رہی شعرا جو مدحیہ قصائد کے ذریعہ زندگی بسر کرتے تھے فارسی میں شاعری کرتے تو ممدوح اُنکی زبان کیونکر سمجھتا اور نہ سمجھتا تو اُنکی داد کیا دیتا"

آگے چل کر لکھتے ہیں:-

ایک بڑا سبب یہ بھی ہوا کہ چند ہی روز میں اسلام نے اپنے خاص علوم و فنون میں ادب و انشا کا سرمایہ اس قدر وسیع کر لیا تھا اور ہر شاخ میں وہ اختراعات اور جدتیں پیدا کی تھیں کہ اُس کے سامنے تمام قوموں کو اپنا قدیم لٹریچر ہیچ اور بے وقعت نظر آتا تھا۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں اسلام کی جہاں جہاں حکومتیں قائم ہوئیں یعنی ایران، مصر، شام، اندلس ان تمام ممالک میں اسلامی علوم و فنون نے مفتوحہ قوموں کے علوم و فنون کو بالکل ماند کر دیا اس لئے عرب کی شاعری کے آگے دوسری قوموں کو اپنی زبان میں شاعری

کرتے شرم آتی تھی، خراسان، شام، مصر وغیرہ میں سینکڑوں ہزاروں شعرا پیدا ہوگئے تھے، لیکن جو کچھ کہتے تھے عربی میں کہتے تھے ثعلبی نے یتیمۃ الدہر میں ان عجمی شعرا کا مفصل تذکرہ لکھا ہے (۱)

ایک اور موقعہ پر لکھتے ہیں :-

"اصل یہ ہے کہ اسلام جب ایران میں آیا تو ایک مدت تک عرب براہ راست حکمراں رہے حتیٰ کہ بنو امیہ کے زمانہ تک صوبوں اور اضلاع کے حاکم بھی عرب ہی ہوتے تھے عباسیوں کے دور میں وزارت عجم کے ہاتھ میں آئی اور برامکہ کے مشہور خاندان نے اس قدر اقتدار حاصل کر لیا کہ عنان سلطنت بھی گویا اس کے قبضہ میں آگئی ..... شخصی سلطنتوں میں علوم و فنون بھی سلطنتوں کے زیر اثر ہوتے ہیں، اس لئے جب تک ایران میں خالص عرب کی حکومت رہی فارسی شاعری نے زبان نہیں کھولی" (۲) -

لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ایرانیوں کو اپنی زبان کی طرف سے بے توجہی نہ تھی اس میں شک نہیں کہ عربی علم و ادب میں انہوں نے زبردست کمال حاصل کیا اور علم و ادب کی ہر شاخ میں مہارت پیدا کی، یہ بھی صحیح ہے کہ شروع شروع میں عربی علم و ادب نے اُنکے دل و دماغ کو اس قدر مرعوب کر دیا تھا کہ اپنی زبان نظروں میں ذرا بھی نہیں جچتی تھی، پھر بھی اپنی ملکی زبان کی محبت دل سے کیونکر دور ہوسکتی تھی۔ عربی میں وہ جو کچھ کہتے تھے محض خلفا و سلاطین کی قدر دانی اور صلہ کی خاطر۔ برعکس اس کے فارسی شاعری کا کوئی قدرداں نہ تھا اس لئے کچھ کہتے بھی تو حوصلہ افزائی کون کرتا اور صلہ کہاں سے پاتے لیکن باوجود اس کے جہاں کہیں انہیں ذرا سا بھی موقع مل جاتا تھا وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں دریغ

---

(۱) شعرالعجم جلد اول صفحہ ۱۷ و ۱۸ (۲) شعرالعجم جلد چہارم صفحہ ۱۱ و ۱۲

نہ کرتے تھے۔ چنانچہ خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں اس کی ایک مثال نظر آتی ہے مامون الرشید کی ماں عجمی تھی خود دربار میں عجمیوں کی کثرت تھی اس لئے عجمی شعرا کو اپنی زبان زندہ کرنے کے لئے یہ موقع غنیمت معلوم ہوا اور عباس مروزی نے یہ فارسی قصیدہ مامون کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اے رسانیدہ بدولت فرق خود بر فرقدین — گسترانیدہ بہ فضل وجود در عالم یدین

مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را — دین یزداں را تو بائستہ چو رخ را ہر دو عین

کس بدیں منوال پیش از من چنیں شعری نگفت — مر زبان پارسی را ہست با ایں نوع بین

لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت — گیرد از مدح وثنائے حضرت تو زیب و زین

مامون نے اس کے صلہ میں ہزار اشرفیاں دیں، لیکن مامون پھر بغداد چلا گیا اسلئے فارسی شاعری پر خاموشی چھا گئی۔

ہم بتا چکے ہیں کہ دولت عباسیہ کے زوال کے وقت پہلا شخص جس نے خود مختاری اور استقلال کی جانب قدم بڑھایا ہو خراسان کا حاکم عام یا گورنر تھا۔ اس خاندان نے جو خاندان طاہریہ کے نام سے مشہور ہے کم وبیش ۵۴ برس تک شاہانہ کر و فر کے ساتھ خراسان پر حکومت کی خود یہ خاندان عربی النسل تھا اور فارسی سے بہت کم ذوق رکھتا تھا لیکن چونکہ حکومت خراسان میں تھی اور شاہانہ شان وشوکت کے لئے شاعروں کا وجود ضروری تھا، اس لئے حنظلہ۔ محمود وراق فیروز مشرقی وغیرہ کئی شاعر پیدا ہو گئے۔ یہ فارسی شاعری کی ابتدا تھی اور یہیں سے اُس نے آہستہ آہستہ ترقی کے قدم اٹھانا شروع کئے۔ یعقوب صفار اور اس کے خاندان کے عہد میں بھی ابو سلیک گورگانی وغیرہ دو ایک اچھے شاعر پیدا ہوئے۔ لیکن فارسی شاعری کو حقیقی معنی میں ترقی وعروج سامانی خاندان کے زمانہ میں شروع ہوا۔ اس خاندان کی قدر افزائیوں سے فارسی شاعری میں چار چاند لگ گئے اور تھوڑے عرصہ میں شاعری نے حیرت انگیز ترقی کر لی، ایران میں عربی اثرات کے خلاف ردعمل

کی ابتدا ابھی یہیں سے ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سامانی خاندان کا سلسلہ نسب بہرام چوبین تک پہنچتا ہے اس لئے اس خاندان میں حکومت و اقتدار کے آنے کا مطلب یہی تھا کہ عجمی شان و شوکت جاہ و جلال دوبارہ عود کر آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا عجمی و ایرانی علوم و فنون اور ادبیات کی سرپرستی ہونے لگی شعرائے ایران کی حوصلہ کے موافق قدردانی کیجانے لگی۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کو اس وقت کی زبان میں قلمبند اور منظوم کرنے کا خیال اسی عہد میں پیدا ہوا اور دقیقی کو یہ کام سپرد کیا گیا جس کی تکمیل بعد میں آکر فردوسی نے کی سامانی خاندان کی یہی قدردانیاں اور حوصلہ افزائیاں تھیں جنہوں نے بہت سے باکمال شعرا پیدا کر دئے فارسی زبان کو انہوں نے دوبارہ زندگی بخشی جو خود انکی اور انکے آبا ؤ اجداد کی زبان تھی اور جو عربی کے مقابلہ میں دوسری زبانوں کی طرح مٹ جانیوالی تھی۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ پیدا ہوا کہ عربی زبان کی جو ہیبت ایرانیوں کے دلوں پر بیٹھ گئی تھی وہ زائل ہونے لگی اور اُن کی سمجھ میں آیا کہ دوسری زبانوں کی طرح فارسی میں بھی بہت کچھ صلاحیتیں موجود ہیں۔ خود سامانی خاندان قدردان علم و فن ہونیکے ساتھ صاحبِ کمال اور سخن سنج تھا اس نے دیکھا کہ ایرانی اپنی قومی و ملکی خصوصیات سے رفتہ رفتہ دور ہوتے جاتے ہیں اور اُن کی محنت و قابلیت ایک غیر زبان پر صرف ہو رہی ہے انکی دوراندیش نظر نے یہ بھی تاڑ لیا کہ اگر کچھ دنوں اور یہی رفتار رہی تو ایران اپنا قومی و ملکی عزّ و وقار کھو بیٹھے گا۔ اس لئے اس خاندان کے حکمرانوں نے ایرانی علوم و ادبیات کی قدر افزائی میں شاہانہ فراخ دلی اور سیر چشمی سے کام لیا فارسی شعرا کے بیش قرار مشاہرے مقرر کئے بہت سی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کرائے ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا کتابیں لکھوائیں اپنے اسلاف کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کے لئے شاہنامہ کی بنیاد ڈالی۔ غرضکہ انہوں نے عرب کے مقابلہ میں عجم کو زندہ کرنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو انکے امکان میں تھا چنانچہ اس زمانہ میں فارسی کے ان گنت شعرا پیدا ہو گئے۔ جن میں رودکی[1]، دقیقی[2]، ابوشکور بلخی

اور مروزی وغیرہ قابل ذکر ہیں - ان میں سے ہر ایک نے علیٰ قدر مراتب فارسی شاعری

---

(۱) رودکی اس دور کا مشہور شاعر ہے تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ سب سے پہلے جس نے فارسی میں دیوان مرتب کیا وہ رودکی تھا۔ سامانیوں کے عہد میں سینکڑوں شعرا تھے لیکن آج تک سامانیوں کا نام جس کی بدولت زندہ ہے وہ رودکی ہے شریف گورگانی کہتا ہے -

ازیں چندیں نعیم جاودانی   کہ ماند از آل ساں وآل ساماں

ثنائے رودکی ماندست ومدحش   نوائے باربدماندست ودستاں

رودکی کا اصلی نام محمد جعفر، رودک نخشب یا نسف کے ضلع میں ایک گاؤں تھا بعض کے نزدیک وہ رودک (ایک باجہ کا نام) اچھا بجاتا تھا۔ مادرزاد اندھا تھا ۸ سال کے سن میں قرآن حفظ کیا فن قرأت میں تکمیل کی، شاعری بھی اسی وقت سے شروع کر دی ساتھ ساتھ علوم متداولہ میں کمال حاصل کیا۔ آواز اچھی تھی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں طاق تھا۔ آخر نصر بن احمد سامانی کے دربار میں رسائی ہوئی بادشاہ کی جانب سے زیادہ قدردانی کا اظہار ہوا، اور رفتہ رفتہ رودکی کو اسقدر دولت حاصل ہوئی کہ دربار کے بڑے بڑے امرا بھی اسکا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ سواری میں دو سو زریں کمر غلام رکاب کے ساتھ چلتے سلطان نصر بن احمد نے کلیلہ دمنہ نظم کرائی اور ۴۰ ہزار درہم انعام دئے عنصری کہتا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش   عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

(تفصیل کے لئے دیکھو شعر العجم جلد اول بیان رودکی)

(۲) اصل نام منصور بن احمد وطن بخارا - ابتدائی تربیت امرائے چغانیہ یعنی ابوالمظفر نے کی لیکن جب اسکا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلا کر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی، دقیقی نے یہ خدمت قبول کی اور کم وبیش ۲۰ ہزار شعر لکھے جو آج شاہنامے میں شامل ہیں مثنوی کے ساتھ قصیدہ اور غزل کو بھی ترقی دی یہ دو شعر اسی کی غزل کے ہیں۔ (بر صفحہ ۱۱۸)

کو ترقی دینے کی زبردست کوششیں کیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ طاہریہ خاندان سے لیکر
اس وقت تک فارسی شاعری نے طفولیت سے نکل کر کس طرح جوانی میں قدم رکھا ہے وہی
زبان جس میں پہلے لوگوں کو ایک شعر بھی کہتے شرم آتی تھی تھوڑی مدت میں کس طرح بام عروج
پر پہنچ گئی اور کس طرح اسکا دامن علمی وادبی خزانوں سے مالا مال ہو گیا، یہ درحقیقت ایرانی
امرا و سلاطین کی قدر دانیاں اور حوصلہ افزائیاں تھیں جنہوں نے ایران کی دماغی کاوشوں
کے سیلاب کا رُخ پھیر دیا۔ عربی ایک غیر ملکی زبان تھی پھر بھی ایرانیوں نے عربی ادب اور
علوم و فنون کے حصول میں ایسی حیرت انگیز مہارت، ذہانت اور طباعی کا ثبوت دیا کہ
خود عربوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں، فارسی خود گھر کی زبان تھی اور جب انہیں خود اپنی
زبان کو ترقی دینے کا موقع ملا تو اس میں انہوں نے اور بھی کمال دکھا دیا اور تھوڑی
سی مدت میں اتنی ترقی کر لی کہ دوسری قوموں کو اس کے لئے طویل عرصہ درکار ہوتا
تاہم چونکہ امرا و سلاطین کی عام طور پر توجہ شاعری کی طرف تھی اس لئے اہل ملک کا بھی

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد — آرے دہد و لے بہ عمر دگر دہد
من عمر خویش را بہ صبوری گزاشتم — عمر دگر ببایدتا صبر بر دہد

ایک مسلسل غزل بہار کی رنگینی اور مے و معشوق پر لکھی ہے جس کے چار شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں

روا نگندا اے صنم ابر بہشتی — زمیں را خلعت اردے بہشتی
زمیں بر ساں خون آلودہ د — ہوا بر ساں خون آلودہ دشتی
بداں ماند کہ گوئی از مے و مشک — مثال دوست بر صحرا نوشتی
بتے رخسار او ہمرنگ یاقوت — مے بر گونہ جامہ کنشتی
جہاں طاؤس گونہ گشت گوئی — بجائے نرمی و جائے درشتی

دقیقی شاہنامہ نظم کرنے میں مصروف تھا کہ ایک نوجوان نے . . . قتل کر دیا (شعر العجم جلد اول)

زیادہ تر رجحان اسی طرف رہا۔ اور تھوڑے سے وقفہ میں فارسی شاعری کا مذاق گھر گھر پھیل گیا
غرضکہ فارسی زبان اپنی ترقی و عروج کے لئے بڑی حد تک ایرانی امرا و سلاطین کی رہین منت
ہو۔ سامانی خاندان کے علاوہ ایران میں اور بہت سے خاندانوں نے عروج حاصل کیا اگرچہ
ان میں آپس میں اپنے جاہ و اقتدار کے لئے گہری رقابت اور دشمنی ہوتی تھی اور ایک دوسر
کو تباہ کرنے کے لئے موقع کا منتظر رہتا تھا لیکن پھر بھی انہیں کوئی چیز ما بہ الاشتراک تھی تو
وہ اپنی زبان کو ترقی دینے کا جذبہ تھا ان میں سے اکثر نہ صرف یہ کہ شعرا اور علما کے قدردان
ہوتے تھے بلکہ خود بھی اُنہیں علم و ادب میں اچھی خاصی دستگاہ ہوتی تھی۔ شاعری کی ترقی
میں انکی نکتہ سنجی اور قابلیت علمی کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ شاعر کی قدر و منزلت انکے
یہاں حکومت کے کسی اہم رکن سے کسی طرح کم نہ تھی بڑے بڑے شہنشاہ شعرا کو تخت پر اپنے برابر
بٹھاتے تھے شاعروں کے گھر پر ملاقات کے لئے جاتے تھے۔ مشہور سلاطین کے یہاں ملک الشعرا
کا عہدہ قائم تھا جس کی بیش قرار تنخواہ ہوتی تھی ملک الشعرا کے علاوہ دربار میں اور
بھی بہت سے شاعر ہوتے جو مختلف موقعوں پر مدحیہ قصائد لکھکر انعام حاصل کرتے چنانچہ
محمود کے دربار میں علاوہ ملک الشعرا عنصری کے چار سو شاعر تھے۔ شعرا کی ان قدردانیوں
کی تہ میں علاوہ زبان کی خدمت کے ایک اور جذبہ بھی کام کر رہا تھا اور وہ یہ کہ شعر بقائے
نام اور شہرت دوام کا سب سے بڑا ذریعہ ہو۔ شریف گورگانی کہتا ہے۔

ازاں چندیں نعیم جاودانی   کہ ماند از آل ساساں وآل ساماں

ثنائے رودکی ماند ست مدحش   نوائے بار بد ماندست ودستاں

نظامی عروضی کہتے ہیں۔

بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد   کہ از رفعت ہمی با ماہ مرا کرد

نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برجائے   مدیح عنصری ماندست برجائے

اسمیں شک نہیں کہ شاہان ایران کی یہ فیاضیاں اسراف و تبذیر کی حد تک پہنچ گئی تھیں

لیکن اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسقدر غیر معمولی فیاضی اور داد و دہش سے کام نہ لیا جاتا تو شاعری کو اس قدر فروغ بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں ۔

> یہ فیاضیاں اصول سلطنت کے لحاظ سے جائز تھیں یا نا جائز اسکا فیصلہ شاعری کی تاریخ سے تعلق نہیں رکھتا لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس نے شاعری کی ترقی و وسعت میں آب حیات کا کام دیا تمام ملک میں شاعری کا مذاق پھیل گیا بڑے بڑے حکما اور علما علوم و فنون چھوڑ کر شاعر بن گئے یہ فیاضیاں نہ ہوتیں تو اقلیم سخن کو، خیام ، انوری ، نظامی ، ناصر خسرو فیضی کہاں سے ہاتھ آتے ۔

غرضکہ فارسی شاعری سلاطین وامرا کے دامن دولت میں تربیت پا رہی تھی اور روز بروز ترقی و وسعت حاصل کر رہی تھی تا آنکہ سلطان محمود کا زمانہ آیا یہ وقت فارسی ادبیات کی ترقی و عروج کے شباب کا تھا۔ محمود کی ادبی سرپرستیوں نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا اور فارسی شاعری ترقی کے انتہائی منازل تک پہنچ گئی ایران کے مشہور شعرا فردوسی عنصری ۔ اسدی طوسی ۔ منوچہری ۔ فرخی ۔ حکیم سنائی جن میں سے ہر ایک یکتاے روزگار ہے۔ سب اسی عہد کی پیدا وار ہیں ۔

رائنر ماریا رلکے

(نمبر ۲)

(مئی کے نمبر میں ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب اس جرمن شاعر کے کلام کی خصوصیات بتا چکے ہیں۔ اب وہ اسکی چند منتخب نظموں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں)

آوازیں

ماخوذ از "دس بوخ در بلدر"

عنوان

امیر اور خوش نصیب کیوں نہ چپ رہیں،
کوئی کیوں جانے کہ وہ کیا ہیں۔
لیکن محتاج تو اپنے تئیں دکھائیں گے،
وہ تو کہیں گے
کہ لوگو دیکھو میں اندھا ہوں
یا نہیں ہوں تو ہو جاؤں گا،
یا بڑی آفت ہے مجھپر جینا،
یا میرا بچہ بیمار ہے،
یا یہ دیکھو میں پیوند ہوں اور پیوندوں پر رفو . . . .
اور شائد اتنے ہی پر بس نہیں۔
اور چونکہ لوگ جیسے سب چیزوں کو ویسے انکو
دیکھتے جاتے ہیں اور گزرتے جاتے ہیں۔

اس لئے وہ مجبوراً گاتے ہیں۔
اور ان سے اچھے اچھے گیت سننے میں آتے ہیں
البتہ آدمی زاد عجیب مخلوق ہے
اس کو مجہول راہبوں[1] کے مل مل کر گانے میں زیادہ مزا آتا ہے۔
لیکن خدا خود مصیبت کے ماروں کے گیت سننے آتا ہے اور دیر تک سنتا ہے
جب یہ محزون اسے سناتے ہیں۔

اندھے کا گیت

میں اندھا ہوں، اے باہر والو، ایک عذاب ہے یہ،
ایک نقیض ہے، ایک تضاد ہے یہ،
ایک دن دونا رات چوگنا بوجھ۔
اپنا ہاتھ اپنی جورو کے کاندھے پر رکھ لیتا ہوں
اپنا بیرنگ ہاتھ اس کی بیرنگی بیرنگی پر،
اور وہ مجھکو ایک خالی عالم میں لئے پھرتی ہے
تم کتراتے ہو، ذرا ہٹتے ہو، جگہ دیتے ہو، اور سمجھتے ہو

---

(۱) ان راہبوں کیطرف اشارہ ہے جو قرون وسطیٰ میں رومن کیتھاک گرجوں میں گانے کے لئے اختہ کردئے جاتے تھے تاکہ انکی آوازوں کی شیرینی قائم رہے۔

(۲) مترجم اس اندھے کیطرف نظر التفات چاہتا ہے جو ساری دنیا کو "اے باہر والو" کہکر مخاطب کرتا ہے اور جسکے درد بھرے دل اور کانوں کیلئے لوگوں کے ذرا ہٹ بچکر نکل جانیکی آہٹ پتھروں کے ٹکرانے کی کرخت آواز سے زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان آہٹوں سے اسمیں اپنی مجبوری اور معذوری کا احساس برابر تازہ ہوتا رہتا ہے۔

کہ تمہارے ہٹنے بچنے کی آوازیں پتھروں کے ٹکرانے کی آوازوں سے شیریں تر ہیں ۔
لیکن تم غلطی پر ہو۔ میں تنہا
جیتا ہوں، رنج سہتا ہوں، شور کرتا ہوں۔
میرے اندر نالوں کا ایک طوفان ہے۔
اور مجھے پتہ نہیں چلتا کہ یہ میرے اندر کون چلا رہا ہے
میرا دل یا میری انتڑیاں۔
سنے تم نے یہ گیت؟ کچھ تم نے تو گائے نہ تھے یہ،
اور گائے بھی تھے تو بالکل اسی انداز سے نہیں۔
تمہارے کھلے کھلے گھروں میں تمہارے لئے
روز کے روز ایک نئی گرمی، ایک نئی روشنی نازل ہوتی ہے۔
اور تم ایک دوسرے کے چہروں سے متاثر ہوتے ہو،
اس سے آدمی آدمی کا خیال کرتا ہے۔

شرابی کا گیت

میرے اندر نہ تھا۔ جاتا تھا، آتا تھا۔
میں نے روکنا چاہا۔
شراب نے روکا ۔
(اب کچھ یاد نہیں کہ کیا تھا)
پھر اس نے میرے لئے کبھی یہ چیز روکی کبھی وہ۔
پھر میں نے اپنے تئیں بالکل اس کے حوالے کر دیا۔
میں سڑی ۔

اور اب میں اس کا کھیل ہوں،
مجھے جدھر چاہے پھینکے، میری اوقات پر تھوکے،
چاہے ابھی اس جانور کے ہاتھ بیچ دے،
جس کا نام موت ہے۔
اور جب اس نے مجھ میلے کچیلے پتے کو جیت لیا
تو مجھے اپنی کھوپڑی کی ہڈیاں کھجائیں
اور مجھے لید کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

خودکشی کرنیوالے کا گیت۔

اور بس ایک لمحہ۔
بار بار یہ لوگ میرے پھندے کو
کاٹ دیتے ہیں۔
کچھ دن ہوئے میں بالکل تیار تھا،
بلکہ میری انتڑیوں میں
جیسے کچھ ادھر والوں کی سی آوازیں تک آنے لگی تھیں . . .
بار بار منہ میں چمچہ دئے کھڑے ہیں۔
زندگی کا چمچہ۔
نہیں، اب مجھ سے یہ نہیں نگلا جاتا
اُگلنے دو خدارا اُگلنے دو۔
جانتا ہوں کہ زندگی اچھی اور مزے کی چیز ہے۔
اور دنیا ایک بھری ہانڈی ہے۔

لیکن میرے خون میں وہ نہیں اترتی
میرے تو اس نے صرف سر کو پکڑ لیا ہے، سر کو۔
اوروں کے لئے پالنا ہے میرے لئے آزار،
سمجھو تو سہی لوگو کہ وہ آدمی کے حلق سے نہیں اترتی
اب تو مجھے ایک ہزار برس تک
پرہیز ہی چاہئے۔

امین کی یوسف زلیخا

دکھنی اُردو کے مواد فراہم کرنے کے سلسلہ میں اب میں پیرس کے قومی کتبخانہ
سے استفادہ کر رہا ہوں مکرم دوست مسٹر یوسف حسین خاں کے حسب ارشاد
ایک مضمون ناظرین "جامعہ" کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے ۔
گر قبول افتد زہے عز و شرف ۔

ہاشمی

یورپ کے عظیم الشان کتب خانوں میں جہاں دیگر زبانوں کے مخطوط محفوظ ہیں وہاں ہماری اردو کے مخطوط بھی زینت کتب خانہ بنے ہیں ۔ لنڈن[1] کے مشہور کتب خانوں کے علاوہ پیرس اور برلن میں بھی ان کا کافی ذخیرہ ہے جس پر تفصیل سے کام کرنے کے لئے ایک بڑے وقت کی ضرورت ہے ۔

انگلستان کے کتب خانوں سے جو مواد حاصل ہوا ہے وہ کئی سو صفحات کا متقاضی ہے رسالہ معارف اور نیرنگ خیال وغیرہ کے ذریعہ کچھ حالات پیش کئے گئے ہیں ۔

پیرس کا کتب خانہ [illegible] nationale سے موسوم ہے اس کے ذخیرہ کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہے ۔ اس کی عمارت وسط شہر میں نہایت عظیم الشان اور شاندار ہے ۔ برٹش میوزیم کی طرح یہاں بھی مطالعہ کے علیحدہ[2] علیحدہ مقام ہیں ۔ انتظامی

---

(۱) لندن کے تین کتب خانوں میں اُردو مخطوط ہیں یعنی انڈیا آفس ۔ برٹش میوزیم رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۔ اس کے علاوہ اڈنبرا ۔ آکسفوڈ اور کیمبرج اور ایٹن میں بھی اس کا مواد ہے ۔

(۲) برٹش میوزیم میں مطالعہ کے تین مقام ہیں ۔ مطبوعہ کتب کے مطالعہ کا مقام ۔ مخطوطوں کے مطالعہ کی جگہ اور مشرقی علوم کے مطالعہ کا مقام ۔ مگر پیرس میں دو مقام ہیں آخر الذکر مقام علیحدہ نہیں ہے

حالت کے لحاظ سے انگلستان کے ہر کتب خانہ کو فوقیت دیجا سکتی ہے۔ اردو مخطوطوں کی گرد آلود
حالت سے قیاس ہوتا ہے وہ عرصہ دراز سے زیر مطالعہ نہیں رہے ہیں۔ انکی کوئی علحدہ
فہرست نہیں ہے بلکہ مرہٹی۔ ہندی۔ بھاکا وغیرہ کے ساتھ ان کو شامل کر کے انڈین
مخطوطوں سے انکو موسوم کیا گیا ہے مذکورہ کیٹلاگ ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی ہے جس کا مصنف
(A. cambatam) ہے۔

یہاں اس امر کا موقع نہیں ہے کہ کل مخطوطوں کی وضاحت کیجائے جس کے لئے کوئی اور
وقت چاہئے۔ البتہ یہاں صرف ایک مخطوط کی صراحت کیجاتی ہے۔

زیر بحث مثنوی یوسف زلیخا کا نمبر (۸۵۶) اور ان کی تعداد (۱۴۹) اور فی صفحہ
(۱۴) سطر ہیں۔ نستعلیق میں لکھی گئی ہے مگر خوش خط نہیں ہے۔

یہ مثنوی محمد امین کی تصنیف ہے۔ انکے متعلق قدیم تذکرہ جات ساکت ہیں البتہ ڈاکٹر
اسپرنگر نے اپنی فہرست میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے اور اس کا پہلا شعر بھی بطور نمونہ درج
کیا ہے۔ مولف اردوئے قدیم نے اسپرنگر کی صراحت کو اپنی تالیف میں اردو کا جامہ پہنایا
ہے مثنوی کے متعلق کوئی مزید اضافہ نہیں کیا۔

جہانتک میرا خیال ہے اس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے کیونکہ آج تک جس
قدر کتابیں اور مضامین دکنیات وغیرہ کے متعلق شائع ہوئے ہیں ان میں غالباً اس کا
تذکرہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اس مخطوط کی اہمیت زیادہ ہوجاتی ہے۔

امین کا نام محمد امین ہے یہ گجرات کے رہنے والے صوفی المشرب قادریہ طریقہ کے
بزرگ تھے عالمگیر کے عہد میں زندہ تھے اسی زمانہ میں اپنی مثنوی لکھی۔ انکے کلام سے انکے
صوفی ہونے کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ مثنوی جیسا کہ قبل ازیں ظاہر کیا گیا ہے خاصی ضخیم ہے اس کے اشعار کی تعداد (۴۱۱۴)
ہے اور تاریخ تصنیف یکشنبہ جمادی الاول ۱۰۹۸ھ۔ ان امور کو خود مصنف نے بیان کیا

ہے ملاحظہ ہو:۔

اگیارہ سو اوپر جب تو گزرے ۔۔۔ برس ہجرت محمد مصطفیٰ کے
بتیان چالیس سو پہر چودہ اور سو ۔۔۔ ہیں لکھا گودھری کے بیچ سن سیو
جمادی الاول ہیں اتوار کے روز ۔۔۔ اتھی تاریخ دوجی نے دل افروز
صبحی کے وقت لکھ رہیا امین رے ۔۔۔ الہی تون محبت سب کیتن دے

(ص ۱۹۸)

امین نے اس کو فارسی سے گجراتی زبان میں ترجمہ کیا ہے جس کو گوجری سے اور کبھی "گودھری" سے موسوم کیا ہے۔ مصنف نے اکثر جگہ اس کا ذکر کیا ہے مگر یہ نہیں بیان کیا کہ کس کی فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔

سنو مطلب ہے اب یوں امین کا ۔۔۔ لکھے گوجری میں یوسف زلیخا
ہر یک جاگہ قصہ ہے فارسی میں ۔۔۔ امین اسکوں اتارے گوجری میں

(ص ۱۰)

پڑا ہوے جو کوئی فارسی کون ۔۔۔ وہی جانے حقیقت وے سوں مون
اپنے جوناں پڑا ہووے بچارا ۔۔۔ سو کیا بوجھے اتون کا عشق سارا
ہیں اس کے واسطے کیتی یہ گجری ۔۔۔ حقیقت سب عیاں ہوئے اون کی

(ص ۲۹۵)

امیں آتا ہی میرے دل ہیں یون ۔۔۔ زلیخا اور یوسف کے قصے کون
کروں پورا سنے سو ہوے خوشحال ۔۔۔ سنے اس کے جگت کے چھوڑ جنجال
الہی تیں مجھے توفیق جو دی ۔۔۔ تو میں کی فارسی سین گوجری کی

(ص ۲۹۴)

مثنوی میں حسب رواج قدیمہ اول حمد ہے جس کے (۳۶) شعر ہیں اس کے بعد

نعت میں (۱۶۹) شعر اسی میں معراج کے متعلق بھی صراحت ہے پھر وہ خلفائے راشدین کی منقبت کا عنوان قائم کرتے ہیں اسی سلسلہ میں امام حسینؓ فاطمہ زہراؓ امام ابو حنیفہ و امام مالک و امام شافعی اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح کی ہے۔ اس کے بعد عشق کی توصیف کرتے ہوئے قصہ کی ابتدا کی ہے۔ قصہ کو بھی عنوانات کے تحت لکھا ہے۔ آخر میں خاتمہ سے پہلے عالمگیر کی مدح کی ہے اور اس کی عدالت کا ذکر کرتے ہوئے دعائے خیر کی ہے۔

قاضی محمود بحری نے اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اپنی مثنوی "من لگن" ۱۱۱۲ھ میں لکھی مگر زبان کے لحاظ سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے اس کی زبان قاضی صاحب سے بہت صاف ہے۔ بطور مقابلہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بحری نے حمد اور نعت میں لکھا ہے:۔

اے روپ ترا رتی رتی ہے	پربت پربت رتی رتی ہے
اوٹ اے قلم اس گھڑی نگھر جائیں	ٹک نعت نگر کی سیر کرائیں
ہے نا نوا حد نشان احمد	سرخی سو احد ہے پان احمد

یا مثلاً عالمگیر کی مدح کرتے ہیں:۔

اب بول تون مدح بادشاہ کا	ہور اس کی کمالیت کلاہ کا
جس کی بود و باش پن کی عادت	عالمگیر [illegible] عبادت
یک ملک نہیں جو ان لیا نہیں	یک نفس نہیں جو ان کیا نہیں
دیندار دلیر ہور دانا	یک علم نہ سب منے سیانا

اب حمد و نعت میں امین کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اول تعریف سن خالق کی اے یار	کہ دو نو جگ کا ہے ؟ کرن ہار
وہی تا بود سون سب کو کرے بود	کرے سب کون حیاتیں دے کے خوشنود

محمد کی سنو معراج کی بات — امین بخشے نبی کوں رب نے درجات
نبی کی سن کے صفتاں خوش کرو دل — شفاعت وہ کریں گے روز مشکل

عالمگیر کی مدح :-

زمانے شاہ اورنگ زیب کے ہیں — لکھی یوسف زلیخا کوں امین نین (نے)
الٰہی توں ایسا عادل شہنشاہ — رکھیں جب لگ رہے قائم مہرماہ

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے امین نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ تصنیف معلوم ہوتی ہے اور یہی اسکے صاحب سخن ہونے کی کافی ضمانت ہے۔ مختلف مقامات سے نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے جس سے اسکے کلام کا انداز ہ کیا جا سکتا ہے۔

قصہ کی ابتدا یوں کرتے ہیں :-

ارے ساقی پیالا بھر شتابی — امین کے ہات دے ذرا انشرابی؟
بلور بن جام کی بہتر مے لعل — توں پڑ کر کر امیں کو بخش درحال

زلیخا کی شادی عزیز مصر سے ہونے کا ذکر :-

پیالا لا اے ساقی لایزالی — تو اسمیں بھر شراب پرتگالی
پچھوں تیموس نے کیتی فکر یوں — مصر کے بیچ یک قاصد کو بھیجوں
لکھی تیموس اُنے یک کتابت — عزیز مصر کوں بائیں نزاکت
لکھا یوں کر کے یک بیٹی ہے میری — اسے آتی رہیں مانگے بہتیری
زروم و شام اور دو جے لک سوں — دلے آتا نہیں کوئی میری من موں
میرا دل یونکہ ہے بیاہوں مصر میں — تو کچھ ہووے ٹھنڈک میری جگر میں

(ص ۱۵۷)

شادی ہونے کے بعد عزیز مصر کو زلیخا دیکھتی ہے اور اپنے خواب کی صورت نہونے

سے ماتم کرتی ہے :-

دیکھی صورت عزیز مصر کی جب — پڑی دھرتی اوپر بچھراے کرتب
کہ واویلا کہ واویلا کر دائی — بخت رب نے میری اوندھی دکھائی
وی تو کچھ اور تھا ایتو ہے کچھ اور — ایتو دشمن رہا اس دوست کے ٹھور
ہمیں مجے کد ملیگا مجھ ستیں وو ہیں — ارے ہیات اور افسوس افسوس
ہمیں کیونکر ملیگا محبوب مجے شاہ — ہزار افسوس اور صداہ صداہ

(ص ۹۷)

یوسف غلاموں کے بازار میں فروخت کے لئے لائے جاتے ہیں قیمت کا تصفیہ نہیں ہوتا لوگوں کا ہجوم ہے زلیخا جنگل کی سیر سے واپس آ رہی ہے اور مجمع کا سبب دریافت کر کے غلام کو دیکھنے کے لئے پردہ اٹھاتی ہے اور خواب والی صورت پا کر بے قرار ہو جاتی ہے :-

زلیخا نے سو تب پردہ اٹھا کر — صورت یوسف کی نظروں بیچ لیا کر
پہچاناں ہے وہی دل یار جانی — کہ جس کارن ہوں پھرتی تھی دیوانی
یوسف کوں دیکھ کر روئی پکاری — پڑی ہو بیخبر کر کر کے زاری
سواری کون شتابی لیکہ بھاگے — زلیخا کو لے آئے گھر کے آگے
اتارے گھر میں تب ہوئی خبردار — پوچھی تب دائی نے یوں اسکو گفتار
تیری پھر عقل اور سدہ کاں گئی تھی — ایسی تو بے خبر کیوں ہو رہی تھی

(ص ۱۰۱)

یوسف کی قیمت بہت زیادہ ہے عزیز مصر انکے خریدنے سے عاجز ہو کر زلیخا کے پاس آ کر بیان کرتے ہیں میرے اتنی دولت نہیں جس کو دیکر یوسف کو خرید وں یہ سنکر زلیخا ڈبیا سے موتی دیکر یوسف کو لانیکی فرمایش کرتی ہے :-

عزیز نے تب کہا نہیں مجھ کنے زر — کہ میں اسکوں لے آؤں مول دیکر

جو کوئی میری متاع ساری ملاوے — تو بھی یوسف کا آدھا مول پاوے
زلیخا نے تب ایک ڈبا نکالا — بھرے تھے اس بھتر موتی سوالا
دیا ڈبا کہا اب لیا تون کر مول — وے اب موتی تون اب مالک کتیں کھول

(ص ۱۰۲)

یوسف خرید ہو کر آئے زلیخا ان کی والہ و شیدا ہو گئی اور اپنے عشق سے بے قرار ہو کر پہلے دائی کے ذریعہ اور پھر خود آکر یوسف سے التجا کی یوسف جواب میں کہتے ہیں :-

کہا یوسف نے یوں سن اے زلیخا — تو بی ہر انے ہیں ہوں سو بندا
ایتو مجھ بندے سوں ہوئیگا نہیں کام — نہ کر مجھے تون عاجز کون یوں بدنام
منجھے تو عشق ہیں لبستا نہیں کیں — ہوا مجھ زیان سب جا عشق کیتن

(ص ۱۲۴)

اس کے بعد یوسف قید ہوئے برسوں مقید رہے قید سے رہا ہوئے اور ترقی کرتے کرتے عزیز مصر ہوئے۔ زلیخا اپنے کئے پر نادم ہوئی۔ جوانی گزر گئی بڑھاپا آگیا تمام مال دولت خیرات میں دیچا چکی اور غربت میں بسر ہونے لگی۔ یوسف کو اس کا خیال ہی نہیں رہا ایک مدت کے بعد یوسف کا اس طرف گزر ہوا جہاں زلیخا رہا کرتی تھی۔ زلیخا کو یوسف کا آنا معلوم ہوا سامنے آئی اور اس موقع پر بیحد شوق اور بے تابی سے کہتی ہے۔

کہے یوسف منجھے تیں نان پچھانے — پچھانا ں تجکو میں اے یار جانی
وہی میں ہوں زلیخا نام میرا — وہی یوسف تیں دل آرام میرا
وہی میں ہوں جو تیں تیرے سینے مان — دیکھا صورت بی کیتی منجکوں بیمان
وہی میں ہوں جو تیں تیرے وطن سوں — کری منجھ بیوطن اور دکھ دیا یوں
وہی میں ہوں جنے تجکوں لیا تھا — لکھو کھا درہم تیرا سو لیج دیا تھا

(ص ۱۵۰)

ان امور کے بعد زلیخا کو گھر لاتے ہیں خدا سے دعا کرتے ہیں زلیخا جوان ہو جاتی ہے اور پھر یوسف اس سے شادی کرتے ہیں اور سب کی ضیافت کی جاتی ہے۔ داستان اس پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد یوسف کا انتقال ہوتا ہے اس رنج سے زلیخا پہلے تین دن تک بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس کے بعد زلیخا کا بھی انتقال ہو جاتا ہے۔

انوں سجدے ستیں سر نہیں اٹھایا
دیسے میں جبریل ان پاس آیا

کہا یوسف کر سر کون سو اونچا
تمارا سوال درگاہ پہنچ پہنچا

کری حق نے قبول لے عرض ساری
جوانی کیتی سو پھر بوڑی تے ناری

خدا نے دی اُسے پھر کر جوانی
توانا کیتی کھد کر تا توانی

یہ سن خوش خبر یا سر کون اٹھایا
زلیخا کا درس نظروں میں آیا

دیکھا مکھڑا اشو روشن جون چند سور
نین دو نور ستیں دیکھے بھرپور

(ص ۱۵۵)

پڑی بیہوش ہو کر پھر زلیخا
نہ تھا معلوم اس کو حال ایس کا

پڑی رہی تین دن تک یہ بیچاری
ہی چوتھے روز آئی ہوشیاری

بیٹھی اُٹھ کر یوسف پکاری
اپنے دل سر وستیں آہ ماری

کہتی تھی یوں کہ سن یوسف پیارے
وفا آخر منجھے نیں کیوں دیا رے

دجا ہے تم کون اُٹھ جنت میں جاؤ
منجھے اس بھاگ سے بھتیر جلاؤ

منجھے کہنوں چھوڑے رہی چھوڑے یوسف
محبت کاٹنے تم توڑے رے یوسف

اگن بھیتر جلائے نین منجھے رے
نہ آیا ترس کچھ آخر تجھے رے

ارے ہیہات اور ہیہات ہیہات
نہ لیتے تم مجھے کیوں آپنے سات

بہت رشے سوں پھر بیتاب ہو کر
پڑی بچھڑائے کر دھرتی کے اوپر

(ص ۱۸۵)

رسوں کی تعداد۔ عشق۔ ہنسی۔ رحم۔ غضب۔ بہادری۔ دہشت۔ نفرت۔ حیرت
اطمینان۔ یہ نو رس ہیں۔

ان میں سے عشق (شرنگار) کے رس کی تعریف یہ ہے۔ شرنگ عشق کے دیوتا (کامدیو)
کے ابھرنے کو کہتے ہیں اس ابھرنے کا سبب اور زیادہ تر اعلیٰ ہیرو سے متعلق رس عشق کا رس
کہلاتا ہے۔

پرائی عورت اور بے وفا طوائف کو چھوڑ کر دوسرے اقسام کی عورتیں اس میں
محرک اساسی ہوتی ہیں، نیز عادل (تمام بیویوں سے یکساں موانست رکھنے والا) اور اسکے
مماثل ہیرو نیز بھی، چاند۔ صندل۔ بھنورے کی مستانہ گنگناہٹ اور ایسی ہی دوسری چیزیں
اس میں محرک مہیج ہوتی ہیں، محبت نما پرشکن ابرو اور الفت آمیز نگاہیں اس رس کے
اثرات ہیں۔ غضب۔ موت۔ سستی اور کراہت کو چھوڑ کر بقیہ کل جذبات عارضی اس
میں منقلبات بنتے ہیں، اس کا جذبہ مستقل محبت ہے۔ مثال نئی دلہن۔ سونی خواب گاہ
(سہیلی وغیرہ سے خالی) دیکھکر پلنگ سے قدرے آہستہ آہستہ اٹھی اور اٹھکر بناوٹی نیند سوئے
ہوئے محبوب (شوہر) کے چہرے کو بہت دیر تک بغور دیکھا (کہ کہیں جاگتے تو نہیں ہیں)
پھر سوتا سمجھ کر بڑے اطمینان سے اس کا بوسہ لیا لیکن اس بناوٹی نیند میں مشغول محبوب کے
رخساروں پر (خوشی کی وجہ سے) اقشعرار[1] دیکھکر اس نوعروس کا چہرہ شرم سے نڈھال اور
پژمردہ ہوگیا اور اس کے محبوب (شوہر) نے ہنس ہنس کر اسے بہت دیر تک پیار کیا۔
مثال بالا میں ہیروئن کے دل میں موجودہ محبت کا محرک اساسی ہیرو ہے۔ اور
خواب گاہ کا خالی ہونا محرک مہیج ہے۔ اطمینان سے بوسہ لینا اثر محبت ہے۔ آہستہ آہستہ اٹھنے

زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے جلدی جلدی بدلتے رہتے ہیں۔
(۱) بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجانا۔

سے خوف بتین کے ساتھ شوق خفی ، اور بغور دیکھنے سے ظاہر و نمایاں ہونیوالا خوف اور شرم منقلبات

ہیں ، اسی طرح اس مثال میں ہیرو کی محبت کا محرک اساسی ہیروئن ہے ۔ اس کے (ہیروئن

کے) چہرہ کا نڈھال ہونا مہیج ہے ۔ دیر تک پیار کرنا اثر محبت ہے ، خوشی اور ہنسی جذبات عارضی

یعنی منقلبات ہیں ، ان محرک ، اثر اور منقلبات کے سمجھنے والے ناظرین عشق کی لذت سے لطف

اندوز ہوتے ہیں ۔"

عشق کے رس کی دو قسمیں ہیں نمبر ۱ فراق نمبر ۲ وصال ۔

جب محبت ہو جانے پر چاہت تو گہری ہو لیکن وصلِ محبوب نصیب نہ ہو تو اسے فراق

کہتے ہیں ۔ فراق کی اندرونی توضیح سمجھنے کے لئے حسب ذیل حالتوں کا بیان ضروری ہے ۔

آرزو[۱] ۔ تفکر[۲] ۔ یاد[۳] ۔ تذکرہ اوصاف[۴] ۔ بے چینی[۵] ۔ بڑ[۶] ۔ پاگل پن[۷] ۔ بلائے نہانی[۸] ۔ بے حسی[۹]

موت[۱۰] یہ دس حالتیں فراق کے وقت عشاق پر طاری ہوتی ہیں انکی تعریفات حسب ذیل ہیں ۔

وصل کی تمنا کا نام آرزو ہے ۔

محبوب سے ملنے کی ترکیب سوچنے کو تفکر کہتے ہیں ۔

ذی شعور اور غیر ذی شعور کی تمیز نہ رہنا پاگل پن ہے ۔

دل کے بہکنے سے پیدا ہونیوالی بے تکی باتوں کو بڑ کہتے ہیں ۔

ٹھنڈی سانس ، بدن میں زردی اور لاغری پیدا کرنیوالی اندرونی حالت کو بلائے نہانی

کہتے ہیں ۔

اعضاء اور قلب کے بے حس و حرکت ہونیکا نام بے حسی ہے ۔

بقیہ حالتیں واضح ہیں اور تعریف کی محتاج نہیں ۔

واقعی دیدار سے پیدا ہونیوالی آرزو کی مثال :-

اُس بھولی چتون والی حسینہ کی وہ محبت آلود ، الفت سے پر ، شناسائی کیوجہ سے گہری

چاہت میں مستغرق ، فطری طور پر دلکش اور شیریں ، عشقیہ حرکات و سکنات کیا میری وجہ

سے کبھی پھر واقع ہوگی، جن کو ذرا سا یاد کرتے ہی فوراً آنکھ وغیرہ حواس خارجی کے مشاغل رُک کر میری روح ایک گہری مسرت میں محو ہو جاتی ہے۔

عملیات (ورد وظائف) کے ذریعے سے دیدار حاصل ہونیکی آرزو کی مثال:۔

"عشق کے دیوتا کی حقیقی دولت اس غزال چشم کو میں کیسے دیکھوں گا اس سوچ میں پریشان ہیرو کو رات میں نیند نہیں آتی۔"

اس مقام پر کسی ہیروئن کو عمل کے زور سے دیکھکر مشتاق ہیرو کا تفکر ظاہر ہو رہا ہے۔

بے چینی کی مثال: تمہاری جدائی میں وہ نازکبدن لمبی لمبی سانسیں لیتی ہے۔ زمین پر لوٹتی ہے تمہاری راہ دیکھتی ہے، اور دیر تک گریہ وزاری میں مصروف رہتی ہے، اور اپنے لاغر ہاتھ ادھر اُدھر ٹپکتی ہے۔ اے دلربا! خواب ہی میں تمہارا وصل ہو جائے اس تمنا میں نیند چاہتی ہے لیکن بدقسمتی اسے سونے نہیں دیتی۔

بڑ کی مثال:۔ پچھلی شب میں ذرا دیر کے لئے آنکھ لگتے ہی یہ ہماری سہیلی "اے مہا دیو کہاں جاتے ہو؟" کہتی اور بڑبڑاتی ہوئی کسی کی خیالی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے جاگ اٹھتی ہے۔

بے حسی کی مثال: کنول کی سیج پر پڑا جسم تو بالکل بے حس ہے۔ ہاں لمبی سانس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی جان باقی ہے۔ (اگرچہ مخالف رس ہونیکی وجہ سے موت کا بیان نہیں کیا جاتا۔ لیکن پھر بھی موت کی مانند حالت کا بیان کرنا چاہئے اور موت کی تمنا کا بھی اور اگر جلدی ہی پھر زندگی نصیب ہو جائے تو موت کا بھی بیان کر دیا جاتا ہے)

پہلی مثال: وہ نازکبدن ہارسنگھار کے پھول کھلے دیکھکر تو کسی نہ کسی طرح زندگی قائم رکھ سکی لیکن اس وقت مرغ کی اذان سنکر بیچاری نہ معلوم کس حالت میں ہوگی (ہارسنگھار کے پھول آدھی رات میں کھلتے ہیں) آدھی رات تک تمہارا انتظار کرتے کرتے انہیں دیکھکر آتش جدائی سے پریشان وہ نازنین کسی نہ کسی طرح زندہ رہی مگر اب مرغ کی آواز سے صبح سمجھکر نہ معلوم کس حال میں ہوگی۔

دوسری مثال: بھنورے اپنی مستانہ گنگناہٹ سے اطراف کو پر کریں صحرائی صندل سے آئی ہوئی صندل بز ہوا، آہستہ آہستہ چلتی رہے۔ آموں کے بور پر بیٹھی ہوئی مست کوئل پانچویں سُر میں اپنی میٹھی راگنی الاپتی رہے اور تیھرے بھی سخت تر میری جان بھی اب رخصت ہو۔
تیسری مثال: جیسے کادمبری نامی کتاب میں پنڈریک کی موت اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا بیان ہے۔

فراق کی چار قسمیں ہیں۔ اول "پہلا رنگ"۔ دوسرے روٹھنا۔ تیسرے پردیس جانا۔ چوتھے رحم در فراق۔

خوبصورتی وغیرہ اوصاف حمیدہ کے سننے اور دیکھنے سے ایک دوسرے پر مائل ہیرو اور ہیروئن کی وصل سے قبل کی حالت کا نام "پہلا رنگ" ہے۔ پہلا رنگ تین طرح کا ہوتا ہے۔ نیلا (نیلگوں) کسومی۔ مجیٹھی۔ جو اوپری چمک دمک تو زیادہ نہ دکھائے لیکن دل سے کبھی جدا نہ ہو وہ "نیلا رنگ" کہلاتا ہے جیسے رامچندر اور سیتا کا رنگ محبت۔

کسومی رنگ وہ ہوتا ہے جس میں دلکشی بہت ہو لیکن قائم نہ رہے۔

مجیٹھی رنگ اسے کہتے ہیں جس میں دلکشی بھی ہو اور قیام بھی۔

غصہ ہو جانے کا نام روٹھنا ہے۔ یہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک محبت سے پیدا ہوتا ہے دوسرا رقابت کی آگ سے۔ محبت کی الٹی رفتار ہوتی ہے اس لئے دونوں کے دل میں پوری محبت ہونے پر بھی جو بلا سبب ایک دوسرے پر غصہ پیدا ہو اسے محبت کا روٹھنا کہتے ہیں۔

محبت میں ہیرو کے روٹھنے کی مثال: نیند کا بہانہ کرکے یونہی آنکھیں میچنے والے حضرت مجھے بھی تھوڑی جگہ دو۔ رخسار چومنے سے مقشعر الاعضا ہاتا جی (شاہ صاحب) اب کبھی دیر نہ ہوگی۔
دونوں کے ایک ہی وقت روٹھنے کی مثال: دونوں محبت کی وجہ سے روٹھے ہیں اور دونوں ہی بناوٹی نیند سو رہے ہیں نیز آہستہ آہستہ روک روک کر لی ہوئی ایک دوسرے کی سانسوں

پر دونوں ہی کان لگائے پڑے ہیں، دیکھیں ان دونوں میں کون بہادر ہے (اگر یہ روٹھنا منانے
تک نہ قائم رہے تو اسے عشق کے رس کی قسم (فراق) نہ سمجھنا چاہئے بلکہ وصل کے رس کا "منقلب"
جاننا چاہئے اس کی مثال حسب ذیل ہے۔

بھویں ٹیڑھی کرنے پر بھی (علامت غصہ پیدا کرنے پر بھی) نظر، زیادہ پُر اشتیاق ہو جاتی
ہے۔ گفتگو بند کر دینے پر بھی جھلسا (عورتوں کی غصہ کے وقت کی گالی) منہ مسکرانے لگتا ہے
دل سخت کر لینے پر بھی جسم میں اقشعرار ہونے لگتا ہے پھر بھلا انکا سامنا ہونے پر غصہ کو کیسے
نبھا سکوں گی ؟ (جب ساری فوج ہی دوسروں سے جا ملے تو سپہ سالار بیچارہ کیا کریگا)

اسی کی دوسری مثال: دل میں منانے کی خواہش پیدا ہونے پر بھی اپنا اپنا بھرم (خودداری)
قائم رکھنے کے لئے منہ پھیرے چپ چاپ علیحدہ سیج پر بیچین پڑے ہوئے ہیرو، ہیروئن کی آہستہ
آہستہ محبت بھری ترچھی نظروں کے ذریعہ سے چار آنکھیں ہوتے ہی جنگ محبت ختم ہو گئی
اور ہنستے ہوئے ہم آغوشی تمام ہوئی۔

شوہر کا دوسری عورت میں عشق دیکھنے پر یا قیاس کرنے پر یا کسی سے سن لینے پر عورتیں
رقابت کیوجہ سے روٹھتی ہیں (دوسری عورت سے شوہر کی محبت کا قیاس تین طرح پر ہوتا
ہے۔ خواب میں دوسری عورت کے متعلق باتیں بڑبڑانے کی وجہ سے یا شوہر میں وصل
غیر کی علامتیں ملنے سے یا شوہر کے منہ سے اچانک دوسری عورت کا نام نکل جانے سے)

دوسری عورت میں شوہر کا عشق دیکھکر روٹھنے کی مثال ؛ ہیرو کو دوسری ہیروئن کی آنکھوں
سے پھونک کر زرگل ہٹاتے دیکھکر اس عورت کی دونوں آنکھیں آتش غضب سے سُرخ ہو گئیں۔

وصل غیر کی علامات ملنے کی وجہ سے روٹھنے کی مثال : جسم کی تازہ خراش ناخن کو کپڑے سے
چھپاتے ہو۔ اور دانتوں سے زخمی ہونٹ ہاتھ سے دبا رہے ہو لیکن یہ بتاؤ کہ دوسری عورت
کے وصل کی گواہ، چاروں طرف پھیلتی ہوئی اس نئی خوشبو کو کیسے روکو گے۔

ضرورت، بددعا یا خوف کیوجہ سے ہیرو کے دوسرے (دور دراز) مقام پر چلے جانے

کو پردیس جانا کہتے ہیں۔ اس حالت میں ہیروئن کے جسم اور کپڑوں میں میلاپن۔ سر میں صرف ایک جوڑا (خاص طور پر آراستگی کے ساتھ نہ گوتھ کر سب بالوں کی ایک چوٹی بنا لینا) ہوتا ہے نیز حرماں نصیب نازنین ٹھنڈی سانسیں لیتی ہے اور روتی اور زمین پر لوٹتی ہے)

پردیس جانیکی مثال: کسی انتہائی ضرورت کیوجہ سے پیارا شوہر پردیس جانے کے لئے تیار ہے۔ نازنین کو اس واقعہ سے جانکنی کی سی تکلیف ہو رہی ہے۔ تپش اور درد تنہائی کی زیادتی کے اثر سے پگھلی ہوئی روح آنکھوں کے ذریعہ آنسوؤں کی شکل میں برابر بہہ رہی ہے اتنے میں شوہر نے باہر سے آکر محبت آمیز نگاہوں سے اپنی محبوبہ کو خوش کرتے ہوئے سفر کے لئے رخصت چاہی۔

شوہر۔ اے حسینہ ہم جاتے ہیں (اس سوال پر محبوبہ نے صاف طور پر منع کرنا مناسب نہ سمجھا اور بدشگونی کے خوف سے اپنے کو مانع سفر نہ بنایا لیکن اپنے سرتاج کو درپردہ طور پر سفر سے روکنے کے لئے جو بلیغ گفتگو کی وہ حسب ذیل ہے)

عورت۔ اے پردیسی جاؤ۔

مرد۔ اے نازک اندام بیکار رنج مت کرو۔

عورت۔ اے پردیسی مجھے تمہارے جانے میں رنج کیوں ہوگا۔

مرد۔ اگر رنج نہیں ہے تو پھر یہ لگاتار آنسو کیوں بہا رہی ہو۔

عورت۔ تم جلدی نہیں جاتے اس لئے۔

مرد۔ مجھے بھیجنے کے لئے تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے۔

عورت۔ تمہارے ساتھ ساتھ جانے کے لئے کربستہ میری جان کی یہ گھبراہٹ ہے۔

ہیرو اور ہیروئن میں سے ایک کے مرجانے پر دوسرے کو جو غمگینی ہوتی ہے اس کو رحم " درفراق " کہتے ہیں لیکن یہ قسم اسی وقت صادق آتی ہے جب اس مردہ ہستی کے اسی دنیا میں اسی جسم کے ساتھ پھر ملنے کی امید ہو، جیسے کادمبری نامی کتاب میں مہاشویتا

اور پنڈریک کا واقعہ، اگر پھر ملنے کی امید ٹوٹ جائے یا دوسری زندگی میں ملاقات کا سہارا
ہو تب تو صرف رحم ہی کا رس ہوتا ہے۔ لیکن پنڈریک کے مرنے پر ہاتف غیبی کے زندگی کی
خوشخبری سنانے کے بعد اس کے ملنے کی امید میں جذبۂ محبت میں ایک گونہ تازگی اور
روئیدگی پیدا ہو جانے کی وجہ سے، اسوقت عشق کا رس تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر ہاتف غیبی کی
آواز سے پہلے رحم ہی کا رس ہوتا ہے کیونکہ اس وقت تک افسوس ہی کا دور دورہ رہتا ہے
محبت مفقود اور کالعدم ہو جاتی ہے جو عشق کے رس کی بنیاد ہے۔

ایک دوسرے کی محبت میں چور ہیرو اور ہیروئن کا باہمی دیدار و ارتباط سے مستفید
ہونا وصل کہلاتا ہے۔

بوس و کنار اور دیگر اس کے غیر محدود اقسام کا شمار نہیں کیا جا سکتا اس لئے وصل
کے نام سے موسوم اس کی ایک ہی قسم مانی جاتی ہے۔

چھ موسموں۔ سورج اور چاند۔ طلوع اور غروب۔ سیر دریا۔ صبح کی سینری۔ خوشی
رات کا کھیل۔ صندل لگانا۔ زیورات کی آراستگی اور دوسری صاف ستھری خوشگوار اشیاء
کے بیان پر وصل کے مضامین مشتمل ہوتے ہیں۔ یہی بھرت منی نے کہا ہے۔ اگرچہ وصل اپنی غیر
محدود قسموں کی وجہ سے قابل شمار نہیں، اس وجہ سے ذاتی طور پر ایک ہی مانا جاتا ہے
لیکن پھر بھی پہلے رنگ۔ روٹھنے۔ پردیس جانے اور حد رقابت کے بعد واقع ہونیکی وجہ سے
اسے بعض لوگوں نے چار قسم کا مانا ہے مقصد یہ ہے کہ وصل اس وقت تک کامل وصل نہیں
ہے جب تک کہ فراق کے بعد واقع نہو اور فراق کی چار قسمیں ہیں لہذا وصل کی بھی چار قسمیں
ہوئیں چنانچہ کہا گیا ہے۔ کہ بغیر فراق کے وصل مکمل ہی نہیں ہوتا۔ جیسے کسی دوسری مناسب
چیز میں رنگنے کے بعد کپڑے پر اصلی (مقصود) رنگ خوب چڑھتا ہے (یہی وجہ ہے کہ اکثر
انار کے چھلکوں کے پانی میں کپڑوں کو رنگنے کے بعد دوسرے رنگ میں رنگنے کا رواج
ہے۔ یہ اس وجہ سے تاکہ رنگ مقصود خوب چڑھے) اسی طرح فراق کے بعد کا وصل بہت

ہی پر لطف اور مکمل ہوتا ہے۔ اور فراق کی چونکہ چار قسمیں ہیں لہذا اس کے بعد واقع ہونے والے وصل کی بھی چار قسمیں ہوئیں۔ اس کی مثالیں بخوف طوالت نظرانداز کیجاتی ہیں۔

متغیر شکل، آواز، لباس۔ اور حرکات و سکنات کا سین کھینچنے سے قلب میں ہنسی کا رس ظاہر ہوتا ہے۔ اسکا جذبہ مستقل شگفتہ دلی ہے۔ جس شخص کی بدلی ہوئی شکل آواز، اور پوشش کو دیکھکر لوگ ہنستے ہیں، وہ اس کا محرک اساسی ہوتا ہے اور اس کی حرکات، محرک ہیج ہوتی ہیں۔ آنکھیں سکڑنا۔ منہ اور چہرے کا کھل جانا وغیرہ اس کے اثرات ہیں اور نیند، سستی اور اخفاء جذبات اس کے منقلبات میں داخل ہیں۔ ہنسی کی چھ اقسام ہیں۔

(۱) جب آنکھوں میں کچھ شگفتگی ہو۔ اور ذرا ذرا ہونٹ سکڑیں تو اُسے تبسّم کہتے ہیں۔

(۲) اگر انفعال مذکور کیساتھ کچھ کچھ دانت بھی چمکنے لگیں تو اُسے خندہ شیریں (انطرار) کہتے ہیں۔

(۳) اب سب کے ساتھ ہلکی آواز بھی ہو تو اُسے خندۂ نازک (کنکتا) کہتے ہیں۔

(۴) اور اگر کندھے وسر وغیرہ میں کپکپی بھی پیدا ہو جائے تو وہ قہقہہ (کرکرہ) ہے۔

(۵) جس ہنسی میں آنکھوں میں پانی بھی آجائے وہ خندۂ گریاں (استغراب) ہے۔

(۶) اور اگر ہنسنے والا ادہر اُدہر ہاتھ پیر بھی پھٹکنے لگے تو وہ زہرقہ (انتہائی ہنسی) ہے

بڑے لوگوں میں تبسم ہوتا ہے۔ درمیانی لوگوں میں خندۂ نازک اور قہقہہ اور ادنے لوگوں میں قہقہہ اور زہرقہ ہوتا ہے۔ ہنسی کی ان اقسام کی وجہ سے ہنسی کے رس کی بھی چھ قسمیں ہو جاتی ہیں۔

مثال۔ وشنو شرما پنڈت کا حسب ذیل قول بیان کرکے کوئی ہنستا ہے:۔

"میرے اُس سر پر جو وید منتروں کے ہر ہر ربع کے تلاوت کے ختم پر پانی (دم شدہ) کے چھینٹوں سے پاک کیا گیا تھا، طوائف نے تھوک کر ناپاک ہاتھ کا گھونسہ بنا کر دھم سے مارا"

یہ کہکر ہائے ہائے کرکے پنڈت وشنو شرما رو رہا ہے۔

اس مثال میں وشنو شرما محرک اساسی ہے اور اُسکا رونا محرک ہیج، اور تماشائیوں

میں پیدا ہونیوالی مسکراہٹ اور قہقہہ اس کے اثرات ہیں، دیکھنے والوں کی گھبراہٹ اور اضطراب منقلبات میں شامل ہے اور شگفتہ دلی اس کا جذبہ مستقل ہے۔

مرغوب اور محبوب شے کے مٹنے اور غیر مرغوب کے حصول سے رحم کا رس نمودار ہوتا ہے۔ اس میں افسوس جذبہ مستقل ہوتا ہے اور مرے ہوئے اعزہ (قابل افسوس شخصیتیں) محرک اساسی ہوتے ہیں، اور انکی تجہیز و تکفین اور اس کے لوازمات محرک مہیج، پچھاڑیں کھانا۔ گریہ وزاری کرنا۔ تبدیلی رنگت۔ لمبی سانسیں بے حسی اور بڑا اس کے اثرات ہیں شکستہ دلی۔ پریشانی۔ صرع۔ مرض۔ تکان۔ تذکرہ۔ محنت۔ بے حوصلگی۔ سراسیمگی۔ جنون اور فکر اس کے منقلبات میں شامل ہیں۔ چونکہ اس کا جذبہ مستقل افسوس ہوتا ہے اس وجہ سے اسکا شمار رحم در فراق میں پھر وصل کی امید قائم رہنے کی وجہ سے محبت ہی جذبہ مستقل رہتی ہے۔

مثال۔ اے مادر محترم یہ جلدی کہاں جانے کے لئے ہے، یہ کیا ہوا۔ ہائے دیوتاؤں (بزرگوں) کی دعائیں کہاں گئیں۔ لعنت ہے ہماری اس (جوایسی مادر محترم کے مرنے پر بھی صحیح و سلامت ہے) جان پر۔ آسمان ٹوٹ پڑا۔ تیرے ہاتھ پیر دل میں آگ دیدی گئی۔ آنکھیں جل رہی ہیں۔ اس طرح چلا چلا کر رونے کی وجہ سے عورتوں کی گلے میں پھنسی اور تھرائی ہوئی دردناک آوازیں تصویروں تک کو طرح طرح سے رلا رہی تھیں اور اپنے دردناک اثر سے در و دیوار کے ٹکڑے ٹکڑے کئے ڈالتی تھیں۔

اس مثال میں جذبہ مستقل افسوس ہے، اس کا محرک اساسی مردہ عورت، اور عورت کا جلانا اور جلانے کے لوازمات محرک مہیج ہیں۔ شہر کی عورتوں کا رونا اثرات میں داخل ہے۔ بے بسی تکان اور غشی اس کے منقلبات ہیں۔

غضب کے رس میں غصہ جذبہ مستقل ہوتا ہے اور محرک اساسی دشمن اور دشمن کی حرکات مہیج ہوتی ہیں۔ چیں بر جبیں ہونا، ہونٹ چبانا۔ خم ٹھوکنا۔ جھڑکی دینا اپنے پچھلے

مناقب (بہادری کے) بیان کرنا۔ ہتھیار گھمانا غضب۔ گھبراہٹ۔ اقشعرار۔ عرق ریزی۔ لرزہ
مستی یہ اس کے اثرات ہیں، اعتراض کرنا۔ غضب آلود نگاہ سے دیکھنا۔ پریشانی اور خلش
انتقام منقلبات ہیں۔ (بھبھوڑنے۔ پھاڑ ڈالنے گھونسہ مارنے گرانے اور جنگ کے لئے
بیتابی کے بیان سے یہ رس خوب چمکتا ہے آنکھوں اور چہرے کے غصہ سے سرخ ہو جانا اسی
رس کی علامت ہے۔ بہادری میں یہ علامت نہیں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ بہادری کے
رس میں حوصلہ جذبہ مستقل ہوتا ہے)

مثال۔ جن ہتھیار بند حد و شکن۔ انسانی صورت حیوانوں نے یہ (قتل اُستاد) گناہ
کیا۔ جن لوگوں نے مشورہ دیا۔ جنہوں نے اسے دیکھنا روا رکھا سری کرشن۔ ارجن
اور بھیم کے ساتھ میں اُن سب کے لہو گوشت اور چربی سے اطراف کے دیوتاؤں۔
(سنسکرت ادب میں ہر سمت کا مالک ایک دیوتا تسلیم کیا گیا ہے) کی دعوت کروں گا۔

اس مثال میں غصہ جذبہ مستقل ہے۔ اس کے محرک اساسی ارجن وغیرہ قاتل
ہیں، اور قاتل کے والد کی موت اور مارنے والوں کا اپنے ہاتھوں میں ہتھیار گھمانا
محرک ہیجی ہے، اور قاتل کا عہد مذکور (دعوت کروں گا) اثرات میں شامل ہے اور
"ایسا میں کروں گا" اس جملے سے مترشح گھمنڈ اس جگہ جذبہ منقلب ہے۔ اس تفصیل
کو سمجھنے والے تماشائی غضب کے رس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

بہادری :۔ یہ رس عالی ظرف ہیروؤں میں پیدا ہوتا ہے۔ اسکا جذبہ مستقل حوصلہ
ہے اور فتح کرنے کے قابل مرد مقابل اس میں محرک اساسی ہوتا ہے اور مرد مذکور
کی حرکات ہیجی ہوتی ہیں، معاونین جنگ (ہتھیار یا فوج وغیرہ) کی تلاش اس کے
اثرات میں شامل ہے۔ سکون۔ فیصلہ۔ گھمنڈ۔ تذکرہ۔ سوچ و بچار اور اقشعرار اسکے
منقلبات ہیں۔

مثال۔ راون کا لڑکا (میگھناد) رامچندر جی کی فوج سے حسب ذیل خطاب کرتا ہے۔

"اے ہیچ و پوچ بندرو! تم مت ڈرو کیونکہ راجہ اندر کے ہاتھی کے کوہان کو ریزہ ریزہ کرنے والے میرے تیر تمہارے جسم پر پڑتے ہوئے شرماتے ہیں۔ اے لکشمن تو ایک طرف ہٹ جا۔ کیونکہ میرے غصہ کے لئے تو بھی مناسب محل نہیں ہے مجھے تو اُس رام کی تلاش ہے جس نے اپنی ترچھی ابرو کے ادنیٰ اشارے سے سمندر کے بہاؤ کو روک دیا ہے۔

مثال بالا میں حوصلہ جذبہ مستقل ہے اور اُسکا محرک اساسی رامچندر جی ہیں۔ اور سمندر کا بہاؤ روکنا محرک مہیج ہے۔ کمزوروں پر بے توجہی اور رامچندر جیسے جوانمرد سے لڑنے کی تمنا اثرات میں داخل ہے۔ اپنے گذشتہ کارنامے کی یاد اور "میرے تیر شرماتے ہیں" اس قول سے تشنج گھمنڈ منقلبات میں داخل ہے۔

باغی

سلمٰی لاگرلاف ایک زمانے میں معلمہ تھی۔ ۱۹۰۸ء میں اہل سویڈن کی قومی
عید کے موقعہ پر اس کے سر پر 'تاج ادب' رکھا گیا اور اس طرح وہ ملک کی
ہر دلعزیز مصنفہ قرار پائی۔ اس نے بچوں کے متعلق قصوں کا ایک سلسلہ لکھا
ہے جس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اسلئے کہ ان قصوں میں قدیم
زمانے کی داستان نویسی کے عجائب وغرائب کا ایک پر لطف ادبی صنعکاری
اور عہد حاضر کی فطرت نگاری اور واقعہ طرازی کے ساتھ امتزاج کیا گیا ہے۔
۱۸۹۵ء میں اس نے ممالک غیر کی سیاحت کی، اور اس کے بعد ہی
اپنے مشہور "قصص صقلیہ" پیش کئے۔ اس سلسلہ کے اکثر افسانوں کو ادب
انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے۔

سلمٰی لاگرلاف کا طرز تحریر سکون، بے تکلفی، قادر الکلامی، وسعت تخیل اور
شعریت کے لوازم سے ممتاز ہے "باغی" جو اس کے تمام افسانوں کی
جان ہے، اُس کی جملہ ادیبانہ خصائص کا حامل ہے۔

ایک دہقانی نے ایک راہب کو مار ڈالا تھا اور جنگل میں بھاگ گیا تھا۔ متمدن دنیا کو
مستقلاً ترک کے وہ باغی بن گیا۔ اس کے سر کے لئے ایک انعام کا اعلان کیا گیا۔
جنگل میں وہ ایک دوسرے مفرور سے ملا۔ یہ ایک نوجوان ماہی گیر تھا جو دور دراز
جزائر سے ترک وطن کر کے آیا تھا۔ اُس پر ایک جال کی چوری کا الزام تھا۔ چنانچہ بمصداق:

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو — خوب گذرے گی جو مل بیٹھینگے دیوانے دو!

دونوں میں خوب گاڑھی دوستی ہوگئی، انہوں نے پہاڑ کے سنگین دامن میں

اپنے رہنے کے لئے ایک غار کاٹ لیا اور ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ وہ ساتھ ہی ساتھ اپنا کھانا پکاتے تھے، ساتھ ہی ساتھ مچھلیوں کا شکار کرتے تھے۔ تیر بنانے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے، اور باری باری سے اپنی صحرائی کمینگاہ سے نکل کر شکار کرتے تھے۔

دیہاتی کبھی جنگل کے محفوظ دامن کو نہ چھوڑ سکتا تھا اس لئے کہ وہ ایک سنگین جرم کا مرتکب ہوا تھا، لیکن ماہی گیر جس کا جرم اتنا شدید نہ تھا وقتاً فوقتاً آبادی کیطرف نکل جاتا اور شہر کے مضافات و مفصلات میں پہنچکر اپنے شکار کے بدلے دودھ مکھن، لباس اور تیروں کے پیکاں لے آتا۔ مچھلی کے علاوہ اس بازار میں پیش کرنے کے لئے اس کے پاس پہاڑی مرغ اور اس کے چکیلے پر، ذائقہ دار گوشت والی جنگلی فاختہ اور خرگوش ہوا کرتے تھے۔

انکا سنگستانی مسکن۔ ایک عمیق غار تھا جس کے منہ کو چوڑی چوڑی پتھر کی سلوں سے بند کر دیا گیا تھا اور مزید حفاظت کے لئے خار دار جھاڑ جھنکاڑ کا ایک پردہ بھی کر دیا جاتا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک عظیم صنوبر کا درخت تھا جس کی پیچ در پیچ جڑوں کے بیچ میں ہمارے ان صحرانشینوں کے باورچیخانے کے دود کش کا دھواں گم ہو جایا کرتا تھا۔ اس طرح کسی انسانی بود و باش کی کوئی علامت دور سے نظر نہ آسکتی تھی۔ غار تک پہنچنے کے راستہ میں ایک نالہ بھی حائل تھا جو پاس ہی کے پہاڑ کے دامن سے نکلکر بہتا تھا۔ ان دونوں "صید ہائے رمیدہ" کے حق میں یہ جگہ ایک "حرم" کا حکم رکھتی تھی۔

شروع شروع میں لوگوں نے انکو گرفتار بھی کرنا چاہا اور دیہاتی انکے بہت درپے ہوئے، یہ لوگ انکا تعاقب کیا کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اگر یہ خطرناک وحشی ہاتھ لگجائیں تو انکو بھیڑیئے یا ریچھ کا لقمہ بنوادیں۔ اکثر گاؤں کے کماندار جنگل کا محاصرہ کر کے کھڑے ہو جاتے تھے اور پھر نیزہ بردار لوگ اندر گھستے اور کوئی جھاڑی یا کوئی نالہ بغیر جستجو کے نہ چھوڑتے۔ دونوں باغی ایسے وقت اپنے تیرہ و تار غار میں چھپکر بیٹھ جاتے، وہ بالکل دم بخود ہوتے اور خوف و وحشت سے لرزہ براندام، اور جب انسان کا شکار کھیلنے والے ان شکاریوں

کی ٹولی شور وغل مچاتی ہوئی نکل جاتی تب انکی جان میں جان آتی۔

ایک دفعہ اسی قسم کے تعاقب اور دار وگیر کے سلسلہ میں ان دونوں روپوش باغیوں کو پورے دن بھر اس کالے غار میں گوشہ نشین رہنا پڑا، چنانچہ جو شخص ان میں قاتل تھا وہ اس قید تنہائی کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ یکبارگی اس "قبر" سے نکل کھڑا ہوا تاکہ کھلے میدان میں آکر اپنے دشمنوں کو دیکھ سکے۔ متعاقبین نے اس کو دیکھ پایا اور معًا اس کے پیچھے ہو گئے اگرچہ موقع مخدوش تھا لیکن اس کو یہ پسند تھا اور نامردوں کی طرح زندہ درگور رہنے سے اس مقابلہ کو وہ بہرحال ترجیح دیتا تھا چنانچہ اب وہ آگے تھا اور لوگ اس کے پیچھے: وہ نالے کو کودا، پہاڑ کے ڈھلان سے پھسلا، اور کوہستان کی عمودی بلندی پر چڑھ گیا۔ جان کے خطرہ نے تازیانے کا کام کیا تھا، اس کے سارے اعصاب متحرک ہو گئے تھے اور ساری خوابیدہ عضلاتی طاقتیں بیدار! نقل و حرکت کرنے میں اس کا بدن ایسا لوچدار ہو گیا تھا جیسے کہ ایک فولادی اسپرنگ! اس کا پاؤں جہاں پڑتا تھا صحیح پڑتا تھا، اس کا ہاتھ جس چیز کی گرفت کرتا تھا مضبوط کرتا تھا، اس کے چشم و گوش کی حس دو چند تیز ہو گئی تھی!! درختوں کی پتیوں کی ایک ایک جنبش کے معنی وہ سمجھتا تھا! ہر بیجان پتھر کی حرکت خفی کی سخن فہمی کے لئے اس میں ایک ادراک پیدا تھا!

ایک بڑے اونچے پہاڑ ی کگارے پر چڑھ کر باطمینان تمام وہ بیٹھ گیا۔ نیچے تعاقب کرنیوالے آکر جمع ہو گئے تھے، لیکن سب بے بس تھے اور مفرور تک کسی کی رسائی ہونا کارے دارد کا معاملہ تھا، چنانچہ وہ اپنے دشمنوں کی اس بے دست و پائی پر فاتحانہ نعرے لگا رہا تھا اور حقارت آمیز الفاظ میں انکو چیلنج دے رہا تھا لوگ جب اپنے نیزوں کو پھینک کر اس کے سر کو نشانہ بنانا چاہتے تھے تو وہ انکو بڑی چابکدستی سے گیند کی طرح جھیل لیتا تھا، اور پھر لوٹکر انہی کے سر پر رسید کرتا تھا اس کے اندر ایک وحشیانہ مسرت کا جوش متلاطم تھا۔ اسی حالت میں ایک پہاڑی پر اس کی نظر پڑی جس کی چوٹی عام سطح کوہستان سے بہت

اونچی نکلی ہوئی تھی اور اُس کے سر پر کلغی کی طرح ایک سرِ بفلک صنوبر کا درخت اُگا ہوا تھا! درخت کی انتہائی بالائی شاخوں میں ایک شاہین کا گھونسلا تھا جو اُس بلند فضا میں ہولے جھولا جھول رہا تھا! دلیر باغی کی بلند حوصلگی اور بلند پروازی ان بلندیوں کے مناظر میں اپنی معراج پر تھی چنانچہ وہ دوسرے دن اسی درخت پر جا چڑھا اور بالکل اس کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ گرفتار کرنے والوں کا پڑاؤ بھی اسی نواح میں پڑا ہوا تھا اور وہ بدستور سرگرم جستجو تھے، لیکن وہ اُنکی تیز نظروں سے بالکل بے خوف اپنی "معمولی تفریح" میں مصروف تھا۔ گھونسلے کے پاس جا کر اُس نے آشیانہ نشین شاہیں کے بچوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ انکے ماں باپ اس مخدوش انسانی دستبرد سے بیتاب ہو گئے اور مداخلت کرنیوالے کے سر کے گرد منڈلانے لگے۔ وہ تیزی اور خونخواری سے اس پر جھپٹے مارتے لیکن وہ خوشی سے اُنکا خیر مقدم کرتا اور اُنکے خطرناک پنجوں کے وار کو اپنے کھلے ہوئے چاقو پر لیتا۔ شکاری پرندوں کی ساری حملہ آوری بیسود تھی اور ہمارے باغی کے لئے ایک دلچسپ سامانِ تفنن!

اب اُس کا شوقِ تفریح اور بھی تیز ہوا اور اس نے کیا کیا کہ عین گھونسلے میں پاؤں ڈال کھڑے ہو کر "ہنڈولے" کی طرح اُس میں جھولنا شروع کیا!

مگر اب جبکہ دیر کے بعد ہوش آیا تو متعاقبین دور نکل گئے تھے۔ تفتیش کے دوران میں ان میں سے ایک کی بھی نظر ہمارے من چلے جنگی پر نہ پڑی جو آسمان سے باتیں کرنیوالے ایک نرالے جھولے پہ جھپٹنے کی ساری بے ہوشی اور بے پروائی کے ساتھ محوِ لہو و لعب تھا! مگر اب اُس نے آخر کار موقع کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اُسکا جی لرز گیا اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی گویا تلوار کی دھار پر سدھی ہوئی تھی اور اُس کو اپنا حشر بہت ہولناک نظر آ رہا تھا! آخر کار بہزار خرابی وہ درخت سے صحیح سالم اترانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگرچہ اب وہ زمین پر تھا مگر ہراس و ہیبت نے اُس کے دل میں ایسا گھر کر لیا تھا کہ

وہ اب بھی کانپ رہا تھا۔ لغزش زدہ پاؤں کو سہارا دینے کے لئے اُس نے ایک درخت کا تنہ پکڑ لیا، اور بالآخر زمین پر چت لیٹ گیا اور ایک جھاڑی کے پردے میں اپنے آپکو چھپا لیا۔ اس وقت وہ ایسا ہیجان اور زار و نزار ہو رہا تھا کہ صرف ایک آدمی بآسانی اُس گرفتار کر سکتا تھا!

ماہی گیر کا نام ٹارڈ تھا، وہ صرف سولہ سال کا تھا لیکن مضبوط اعصاب اور بڑے دل گردے کا نوجوان تھا۔ اُس کی بادیہ نشینی کو اب ایک سال ہونے آتا تھا

دہقانی کا نام برگ تھا، لوگ اسکو "دیو" کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ ایک خوبصورت سڈول جسم کا آدمی تھا، سارے ضلع کی آبادی میں سب سے زیادہ قوی الجثہ اور طویل القامت تھا۔ وہ چوڑا سینہ اور کاندھے رکھتا تھا لیکن پھر بھی چھریرا معلوم ہوتا تھا، اُس کے ہاتھ بڑے نرم و نازک تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کام کاج سے ہمیشہ ناآشنا رہے ہیں۔ اُس کے بال بادامی تھے اور اُس کے چہرے کے رنگ میں ایک صباحت تھی۔ لیکن جنگل میں رہنے سے اُس کے تیوروں میں قدرے خشونت پیدا ہو چلی تھی۔ شکاریوں کی سی نظر بازی کی مشق سے اُس کی آنکھیں بڑی تیز ہو گئی تھیں، اور پیشانی پر جلالی شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اُس کے ہونٹ زیادہ چپک گئے تھے اور چہرے کا سارا حلیہ متغیر ہو گیا تھا۔ منہ کا گوشت پگھل گیا تھا اور رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ کنپٹیاں خشک ہو گئی تھیں اور اُن میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ الغرض جنگل کی جفاکشی کی زندگی سے جسم کی ساری نرمی و نزاکت رخصت ہو گئی تھی، اور پرگوشت بدن میں بہت خشکی اور سختی آ گئی تھی، لیکن اعصاب میں اسی نسبت سے مضبوطی بھی آ گئی تھی۔ بالوں پر بھی تیزی سے سفیدی آ رہی تھی۔

ٹارڈ نے جسمانی جمال و جلال کا ایسا پیکر عمر بھر نہ دیکھا تھا۔ اُس کو اپنے متخیلہ میں برگ ایک عظیم الشان شاہ بلوط معلوم ہوتا تھا۔ وہ آقا کی طرح اس کی خدمت کرتا تھا، اور

دیوتا کی طرح اُس کی پرستش! ٹارڈ بھی ایک رضا کار اور بے عذر غلام بنکر شکاری نیزہ اٹھا کر جنگل کو نکلتا، اور مارا ہوا شکار خود ہی لاد کر لاتا، خود ہی پانی بھرتا، اور خود ہی آگ جلاتا۔ دیو ہیکل برگ ان ساری نیازمندانہ خدمتوں کو شرف تبولیت بخشتا لیکن کبھی بھولے سے بھی ٹارڈ پر ایک نظر نوازش نہ ڈالتا۔ وہ اُس کو ایک حقیر شے سمجھتا تھا، اور ایک قابل نفرت چور!

یہ لوگ اگرچہ باغی ہوگئے تھے، لیکن لوٹ مار پر بسر اوقات نکرتے تھے۔ اُن کا ذریعہ معاش شکار اور ماہی گیری تھا۔ وہ ایسی امن پسندی اور خوش معاشی کی زندگی بسر کرتے تھے کہ اگر برگ ایک مقدس شخص کا قاتل نہوتا تو گردونواح کے دیہات والے کبھی اسقدر انکے درپے نہوتے اور کوہستان کی پناہ گاہ میں انکو بے غل و غش زندگی بسر کرنے دیتے۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ اگر ایک ایسے شخص کو کیفر کردار کو نہ پہنچایا گیا جس نے خدائے قدوس کے ایک خادم خاص (راہب) کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں تو گاؤں پر قہر خداوندی نازل ہو جائے گا! جب کبھی ٹارڈ آبادی میں اپنا شکار بیچنے کے لئے لیجاتا تو لوگ بخوشی اُسکو خریدتے، اور کچھ زائد رقم بھی اس کو پیش کرتے۔ وہ اُس سے یہ چاہتے تھے کہ وہ اُن سے برگ کی مخبری کردے۔ کہ وہ اس کو اپنے مواخذے سے بری کرنے کے لئے بھی تیار تھے لیکن ٹارڈ ساری مراعات کو ٹھکرا دیتا اور اگر کبھی گاؤں والے خود ہی اس کے ساتھ ہو لیتے تاکہ قاتل کا سُراغ لگائیں تو وہ غلط راستہ اختیار کر لیتا اور انکو اسقدر سرگردان کرتا کہ پریشان ہو کر وہ اس تفتیش سے دستبردار ہو جاتے!

ایک دفعہ برگ نے ٹارڈ سے برسبیل تذکرہ پوچھا کہ کبھی لوگوں نے اُس کو خیانت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب ٹارڈ نے اثبات میں جواب دیا اور برگ کو اس انعام کی مقدار معلوم ہوئی جو اس کام کے معاوضہ میں اُس کو پیش کیا جاتا تھا تو اُس نے بہت متعجب ہو کر کہا کہ "تم بڑے گدھے ہو کہ ایسے بڑے معاوضہ کو مفت میں ہاتھ سے دیدیا!"

برگ کی اس گفتگو پر ٹارڈ کی آنکھیں ایک ایسے جذبے سے منعکس ہوگئیں جس کا مشاہدہ اول اللہ کرنے کبھی نہ کیا تھا، کسی حسین عورت نے جس کو ایام شباب میں اُس نے اپنی محبوبہ بنایا ہو، کبھی اُس کی طرف اس نگاہ ناز اور ایسی طرز جانستاں سے نہ دیکھا ہوگا، خود اُس کے بچوں اور اُس کی بیوی کی آنکھوں نے کبھی ایسی محبت پاشی نہ کی ہوگی!

"آہ آپ ایسا خیال فرماتے ہیں۔ آپ کو خبر نہیں کہ میں نے آپ کو اپنا دیوتا بنایا ہے! آپ میرے فرمانروائے مطلق ہیں جن کی حکومت کو میں نے اپنے اوپر بہ طیب خاطر قبول کیا ہے!"

برگ کے دل میں اس نوجوان کی طرف سے کچھ جگہ ہوئی، وہ اب ذرا قدر کی نگاہ سے اُس کو دیکھنے لگا، اُس نے محسوس کیا کہ لڑکا ایک خلوص و وفا کا پیکر ہے، اور اگرچہ وہ لمبے چوڑے دعوے کرنے کا عادی نہیں لیکن وقت پر اپنی جان پر کھیل جانیوالا ہے! وہ کوہ صحرا کے سارے خطرات اور موسم کی بے رحمیوں کے سارے مصائب بھگتنے کے لئے تیار ہے، لیکن اُس کی رفاقت اور خدمت سے محرومی گوارا نہیں کرتا۔

کبھی کبھی برگ اُس کے ان فداکارانہ جذبات کی طرف اشارہ کرتا اور اس کی اس بے غرض محبت کا سبب اُس سے پوچھتا تو وہ اس معمے کو حل نہ کر سکتا اور کچھ سراسیمہ سا ہو جاتا!

ٹارڈ کبھی رات کو آگ کے پاس نہ لیٹتا جو غار کے عقبی گوشہ میں گرمی پیدا کرنے کے لئے جلائی جاتی تھی، اُس کے نزدیک برگ کی جان کی حفاظت اور اُس کے مسکن کی نگہبانی مقدم تھی۔ چنانچہ جب برگ سو جایا کرتا تو وہ سرک کر آتشدان کے پاس سے غار کے منہ پر چلا آتا اور وہاں ایک چوڑی سل پر بستر لگا کر لیٹتا! برگ نے ایک رات اس بات کو دیکھ پایا، اگرچہ اُس نے اپنے قیاس سے اس کی وجہ معلوم کر لی تاہم اُس نے ٹارڈ سے اُس کی نسبت پوچھا۔ مگر ٹارڈ کوئی جواب نہ دینا چاہتا تھا۔ مزید پرسش اور کاوش سے برگ کو بچانے کے لئے اُس نے اپنے بستر کی جگہ بدل دی، اور وہ دو تین کا غوطہ دے کر

پھر اپنی اصل "خوابگاہ" میں منتقل ہوگیا!

ایک رات برف کا سخت طوفان آیا۔ تمام شجر و حجر برف پوش ہوگئے، بلند صنوبر کے درختوں کی چوٹیوں سے لے کر نیچی سے نیچی جھاڑی کی جڑ تک برف کے تودوں میں اٹ گئی۔ یہ طوفان برف و باد اتنا شدید تھا کہ "باغیوں کے غار کے بعض اندرونی گوشوں تک کی برف کی قلموں نے خبر لی، ٹارڈ جب صبح اُٹھا ہے تو وہ برف کے ایک کمبل میں لپٹا ہوا تھا! یہ ایک اندیشہ ناک افتاد تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ برف باری کے دو تین دن بعد ٹارڈ بیمار پڑگیا۔ اُس کے سینہ کے رگ و ریشہ میں درد پیدا ہوگیا اور اُس کو تنفس میں دقت محسوس ہونے لگی۔ کئی دن تک وہ خاموشی اور صبر کے ساتھ یہ تکلیف برداشت کرتا رہا لیکن ایک دن شام کو جب وہ آگ پھونکنے کے لیے جھکا تو یکبارگی درد اور ضعف میں بیتاب ہوگیا بے اختیار گر پڑا، اور کسی طرح اُٹھ نہ سکا۔ برگ جھپٹ کر پاس آیا اور اُس کو بستر میں آرام سے لیٹنے کی ہدایت کی۔ ٹارڈ اگرچہ درد کی شدت سے بے حال تھا لیکن ایسا نزار و نزار ہو رہا تھا کہ مطلق حرکت نہ کرسکتا تھا۔ وہ بیچارگی سے بڑا اکراہ رہا تھا۔ آخر برگ نے اُس کو اپنی گود میں اُٹھایا اور بستر پر جا کر ڈالا۔ ٹارڈ کو اُٹھاتے وقت برگ کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا وہ کسی سانپ کو چھو رہا ہو! اس کے منہ سے اس کو ایسی بو آئی جیسے اُس نے گھوڑے کا گوشت کھایا ہو! ایک ذلیل و حقیر چور کے بدن کو مس کرتے ہوئے وہ کیسا متنفر و بے زار ہو رہا تھا!

برگ نے ریچھ کی کھال ٹارڈ پر ڈال دی اور اُس کو پانی لا کر دیا۔ یہی کل تیمارداری تھی جو اُس نے اُس کی کی۔ لیکن خوش قسمتی سے بیماری خطرناک نہ تھی اور ٹارڈ کی صحت و طاقت بہت جلد عود کر آئی۔ اس بیماری کے ایام میں چونکہ برگ نے بھی ٹارڈ کی تھوڑی خدمت و خبرگیری کی اس لیے دونوں ایک دوسرے سے اور بھی مانوس ہوگئے۔ برگ کی نگاہ لطف نے ٹارڈ کی کچھ ہمت افزائی کی، اور وہ کبھی اپنے آقا سے ہم کلام ہو لیتا تھا

چنانچہ ایک دن شام کو جبکہ دونوں آگ تاپ رہے تھے اور تیر بناتے جاتے تھے، اُنکے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

"آپ بہت عالی خاندان شخص ہیں" ٹارڈ نے برگ سے کہا " آپ کے رشتہ دار اس گانوں کے سب سے زیادہ دولتمند لوگ ہیں، آپ کے ہم نام (لقب) اور ہم خاندان لوگوں نے بادشاہوں کی خدمتیں کی ہیں، اور اُن کے قلعوں میں لڑکر داد وفاداری دی ہے۔"

"لیکن اکثر اوقات انہوں نے بادشاہوں کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کیا ہے اور شاہی املاک وجائداد کو نقصان پہنچایا ہے" برگ نے جواب میں کہا۔

"آپ کے بزرگ میلاد مسیح کی تقریب پر بڑی بڑی شاندار دعوتیں دیا کرتے تھے اور جبتک آپ کی یہ جلاوطنی شروع نہ ہوئی تھی توضیافتوں کی ان خاندانی روایات کو آپ نے بھی پوری آن کے ساتھ قائم رکھا۔ آپ کے دارالضیافت کے پُرشوکت ایوان میں سیکڑوں مردوں اور عورتوں کی کرسیوں کی گنجائش ہوتی تھی۔ یہ ہال ایک قدیم عہد کی تعمیر تھا اور ایک مشہور رسم کی یادگار میں بنایا گیا تھا۔ بڑے بڑے نقرئی ظروف ان دعوتوں میں استعمال کئے جاتے تھے اور پرتکلف کھانوں سے مہمانوں کی مدارات کیجاتی تھی۔"

ان نیازکیشانہ قصیدہ خوانیوں پر برگ نے ٹارڈ کی طرف دیکھا۔ ٹارڈ اپنے بیان سے خود متاثر ہو رہا تھا جس وقت برگ کے خاندان کی عظمت وحشمت کے ذکر واذکار میں وہ رطب اللسان تھا، تاریخ گزشتہ کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا، چشم تخیل نے اُن پُرشوکت ضیافتوں کی تصویر کھینچدی جن میں زرق برق لباس پہنے ہوئے مہمانوں کا ہجوم ہوتا تھا اور برگ صاحب خانہ کی حیثیت سے ساری محفل کا سرتاج نظر آتا تھا۔ برگ نے دیکھا کہ اُس کی عظمت واقبال کے زمانے میں بھی کوئی خادم اُس کے لئے اس قدر طاعت واطاعت کا مجسمہ نہ تھا، نہ اُس کا ایسا مداح اور وفادار! وہ اس سے بہت متاثر ہوا لیکن

ساتھ ہی اس نے ایک طرح کی کبیدگی بھی محسوس کی۔ ٹارڈ پھر ایک حقیر آدمی ہے۔ اس کے منہ کی تعریف و توصیف ہی کیا؟ ایک ذلیل چور اُس کی مدح و ستائش کر کے سوئے ادب کا موجب ہو رہا ہے!

"کیوں کیا تمہارے گھر میں دعوتیں نہیں ہوا کرتی تھیں؟" برگ نے سوال کیا

"وہ دور چٹانی جزیروں پر والد و والدہ کا دولت خانہ ہے! باپ کا یہ پیشہ ہے کہ طوفان شکستہ کشتیوں کو لوٹ لیا کرتا ہے، اور ماں ایک جادوگرنی ہے۔ جب سمندر متلاطم ہوتا ہے اور بحری مسافروں کی کوئی جماعت مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو وہ ایک آبی جانور کی پیٹ پر سوار ہو کر موقع واردات پر پہنچ کر منتظر کھڑی ہو جاتی ہے، اور موجیں جتنی لاشوں کو اچھالکر خشکی پر پھینکدیتی ہیں وہ سب اس کا مال ہوتی ہیں!"

"مگر وہ لاشوں کو لے کر کیا کرتی ہے؟" برگ نے پوچھا۔

"اجی آپ کو معلوم نہیں؟ جادوگرنیوں کو ہمیشہ لاشوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے میری ماں اُن سے دوا بناتی ہے، اور شاید ان کو کھاتی بھی ہے۔ چاندنی راتوں میں وہ ان لاشوں کو لے کر بیٹھتی ہے اور اپنے عملیات و حاضرات کیا کرتی ہے" ٹارڈ نے جواب دیا۔

"کتنی ہولناک باتیں ہیں!" برگ بولا۔

"شمہیں شک نہیں ہے، لیکن یہ محض دوسروں کے نقطۂ نظر سے نہ کہ ایک جادوگرنی کے خیال میں، اُسکو بغیر اس کے چارہ نہیں" ٹارڈ نے متانت اور سکون سے کہا۔

برگ کے لئے یہ ایک بالکل ہی نیا زاویۂ نگاہ تھا جس سے اُس نے ایک عورت کی زندگی پر تبصرہ کیا۔

"تو اس کے یہ معنی ہیں کہ پھر چوروں کو چوری کرنا چاہئے جس طرح کہ جادوگرنیوں کے لئے جادو منتر کرنا لازمی ہے؟" برگ نے جھلا کر سوال کیا۔

"جی ہاں، کیوں نہیں" لڑکے نے جواب دیا "ہر شخص کو لامحالہ وہ کام کرتا

ضروری ہے جس کے لئے خدا نے اُس کو پیدا کیا ہے۔" لیکن انکسار اور ادعا سے مخلوط ایک مسکراہٹ اُس کے لبوں پر ظاہر ہوئی جس کے ساتھ اُس نے کہا:

"بعض ایسے چور بھی ہیں جنہوں نے کبھی چوری نہیں کی ہے۔"

"اس بے معنی بات کے معنی؟" برگ نے پوچھا۔

لڑکے کے چہرے پر اب بھی وہی پُر اسرار مسکراہٹ تھی، برگ کے سامنے اس نے ایک پہیلی کہدی تھی اور برگ اُس کی بوالعجبی سے جس طرح شش و پنج میں تھا اُس سے ٹارڈ لطف لے رہا تھا۔

"ہاں بعض ایسی چڑیاں ہیں جو اڑتی نہیں، اور بعض ایسے چور ہیں جنہوں نے کبھی چوری نہیں کی ہے!" ٹارڈ نے پھر کہا۔

برگ نے ارادۃً اپنے کو مبہوت بنا لیا تاکہ ٹارڈ جو رمز کہہ رہا تھا اس کی تشریح کرے اُس نے کہا:

"یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس نے چوری کا ارتکاب نہ کیا ہو اُس پر چور کا لقب صادق آئے!"

لڑکے نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے گویا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اُس کو زبان پر لانے میں تامل ہے۔

"لیکن فرض کیجئے کہ اس کا باپ چور ہو؟" بالآخر اُس کے منہ سے نکلا۔

"ایک لڑکا ورثہ میں اپنے باپ کا گھر اور مال پا سکتا ہے، لیکن "چور" کا خطاب تو اُسے خود اپنی کمائی کی صورت ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔

ٹارڈ آہستہ سے ہنسا "لیکن اگر کسی کی خوش قسمتی سے اُس کی ایک ماں ہو جو اُس کے پاس آئے اور واویلا مچائے اور منت وزاری سے کہے کہ باپ کے جرم کا ترکہ بھی قبول کرو۔ اور پھر اگر وہ اس مصیبت میں مبتلا ہو جائے، اور ایک موقع پر جبکہ وہ

بالکل ناکردہ گناہ ہو سرکاری دار و گیر سے اپنی جان بچانے کے لئے جنگل میں بھاگ آئے تب؟ ممکن ہے کہ اس کو باغی بنا کر قانون کے سارے حق حقوق سے محروم کر دیا جائے لیکن وہ غریب کیا کرے جب کہ اُس کے اوپر ایک ایسے مچھلی کے جال کی چوری کا الزام ہو جس کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہے"۔

برگ نے غصے میں اپنا گھونسہ پتھر کے تختے والی میز پر مارا! "اُف اس نوجوان خوبصورت لڑکے نے اپنی جوانی میرے لئے وقف کر دی! اس کو اپنے ماں باپ کی کوئی محبت نہیں، اپنی برادری کی وابستگی کا کوئی خیال نہیں، چوری کے پیشہ کے دھن دولت کا کوئی لالچ نہیں صرف میرے لئے گویا" امور خانہ داری کا کل انصرام اس نے اپنے اوپر لے رکھا ہے، اور پھر کمبخت نے مجھکو اپنی حقیقت سے بالکل بے خبر رکھا اور میری بد سلوکی سے اپنی معصومیت کی توہین کرائی!"

الغرض برگ نے لڑکے سے بہت شکوہ شکایت کیا، لیکن نوجوان نے مطلق اُس کی پرواہ نہ کی، اور اُس کو صرف ایک دلسوز ماں کی ملامت سمجھا!

کوہستان کی بلندی پر ایک مسطح قطعہ پر جس پر گھنی جھاڑی تھی، ایک دلدلی جھیل واقع تھی۔ اُسکا دور مربع شکل کا تھا، اور اُس کے کنارے بھی ایک مربع کے ضلعوں کی طرح خط مستقیم میں چلے گئے تھے جھیل کے گوشے بھی ایسے ہی صاف تھے گویا کہ وہ اقلیدی شکل کے باضابطہ زاوئے ہوں اور انسانی ہاتھوں کی کاریگری ہو۔ جھیل کے تین طرف اونچی پہاڑیاں تھیں جن کی سنگین سطح پر سخت جان کوہستانی صنوبر اُگے ہوئے تھے، اور جن کی جڑوں کی دبازت ایسی تھی جیسی کہ انسانی بازوؤں کی موٹائی ہوتی ہے۔ یہ جڑیں پانی میں بھی چلی گئی تھیں اور اکثر موقعوں پر جھیل کی سطح کے اوپر نکل آئی تھیں۔ آپس میں پیچ در پیچ ہو کر انھوں نے ایک خاص منظر اختیار کر لیا تھا، اور ایسا نظر آتا تھا کہ گویا یہ کوئی عجیب و غریب قسم کے سانپ ہوں جو پانی سے نکلکر بھاگ رہے ہوں لیکن جھیل کے

کسی سحر انگیز اثر سے پتھر بن گئے ہوں ! یا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان دیووں کے ڈھانچے ہیں جو کبھی جھیل میں ڈوب گئے ہیں اور اب ان کی مردہ ہڈیوں کو جھیل نکال کر پھینکدینا چاہتی ہے ۔ سکرات موت کے عالم میں ان دیووں کے ہاتھ پاؤں بری طرح آپس میں اینٹھکر الجھ گئے ہیں اور انگلیاں سخت ہو کر پتھروں میں غرق ہو گئی ہیں، اُنکی پسلیوں نے محرابیں بنالی ہیں جو ان عظیم الہیئت درختوں کو اپنے اوپر سادھے ہوئے ہیں ۔ لیکن وقتاً فوقتاً ان آہنی انگلیوں اور سنگین پنجوں کی ساری گرفتیں اور بندشیں ڈھیلی پڑگئی ہیں اور تیز و تند شمالی آندھیوں نے ان درختوں کو اکھاڑ پھینکا ہے جو اپنے موقع سے بہت دور جھیل کی دلدل میں جا گرے ہیں، جہاں اُنکی چوٹیاں کیچڑ ملے پانی میں گھس گئی ہیں ۔ درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں نے مچھلیوں کو چھپنے کے لئے محفوظ کنج بہم پہنچائے ہیں ۔ گرے ہوئے درختوں کا سارا نقشہ ایسا ہے کہ گویا وہ دیووں اور بھوتوں کے خوفناک پنجر ہوں جنہوں نے جھیل کو بدمنظر کر کے اس کو ایک مکروہ صورت دیدی ہے !

جھیل کے چاروں طرف سنگین کنارے سلامی بنتے چلے گئے ہیں ۔ ایکطرف سے ایک چھوٹا سا دریا جھیل سے نکلا تھا ۔ لیکن قبل اس کے کہ اس کو ایک ہموار راستہ ملے اُسکو بہت سے پیچیدہ اور تنگ نالوں، نالیوں میں ہو کر گزرنا پڑا، جا بجا مٹی اور پتھر کے تودوں کی بلندیاں ہیں جنہوں نے بیشمار جزیروں کی شکل اختیار کرلی ہے ۔ اس مجمع الجزائر میں بعض ٹاپو اتنے چھوٹے چھوٹے ہیں کہ بمشکل اُن پر قدم رکھا جا سکتا ہے اور بعض کا طول وعرض اور رقبہ ایسا ہے کہ وہ اپنی پشت پر جنبش بیس درختوں کو اُٹھائے ہوئے ہیں ۔

یہاں چونکہ چٹانیں زیادہ بلند نہیں ہیں اور سورج کی روشنی کے لئے کھلا رستہ ہے اس لئے تھوڑے تھوڑے پتوں والے درخت اُگ آئے ہیں، مزید براں مختلف قسم کی کوہستانی نباتات کا اس جگہ ہجوم ہے اور ان کی سبزی اور پھولوں کی عطر بیزی سے یہ خطہ معطر اور گلزار ہو رہا ہے ۔

جھیل کے دہانے پر چھوٹی چھوٹی قد آدم جھاڑی کا ایک جنگل ہے جس میں سے ہو کر سورج کی دھوپ ایسی نرم اور سبز گوں ہو کر پڑتی ہے جیسے کہ ہری مخمل کے فرش پر لیمپ کی روشنی۔ جن موقعوں پر پانی تھا وہاں جھاڑیوں روزنوں نے پیدا ہو کر چھوٹے چھوٹے تالاب بنا دئے ہیں جن میں کنول چمک رہے ہیں! فطرت کی یہ نازک اندام اور گلبدن نازنیں طلوع آفتاب کے ساتھ اپنی آنکھیں کھولتی ہیں اور سورج کی شعاع واپسیں کے ساتھ اپنے ننھے ننھے سینوں کو بند کر لیتی ہیں۔

(باقی)

غزل

از حضرت جگر مرادآبادی

ہاں نگاہِ شوق وہ اٹھی نقاب — "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"

شوق بے پایاں وجوشِ بےحساب — عشق کیا ہے ایک مسلسل اضطراب

دستِ رنگین وجمالِ بے حجاب — اے خوش آں وقتے وخوش جامِ شراب

میری ہستی ہی غبارِ کوئے دوست — مجھ سے پیدا ہر سکوں ہر اضطراب

ہوش ہے پھر مائل فرزانگی — لاشراب، اوست ساقی لاشراب

آج کچھ اپنا پتہ ملتا نہیں — میں کہاں ہوں اے نگاہ باریاب

جاں سراپا کچھ ہے راحت کچھ خلش — دل مجسم کچھ سکوں کچھ اضطراب

عشق کیا ہے پرتوِ حسن تمام — شوق کیا ہے حسن کا عکس شباب

اُن لبوں کی جاں نوازی دیکھنا — مُنہ سے بول اُٹھنے کو ہی جامِ شراب

مختصر ہے شرحِ ہستی اے جگر
زندگی ہی خواب، اجل تعبیرِ خواب

ولہ

ستم کامیاب نے مارا — کرم لاجواب نے مارا

ایک رنگیں نقاب نے مارا — حُسن بن کر حجاب نے مارا

جلوۂ آفتاب کیا کہیے — سایۂ آفتاب نے مارا

نگہِ شوق ودعویٔ دیدار — اس حجاب الحجاب نے مارا

چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا　　اس ادائے حجاب نے مارا
اب نظر کو کہیں قرار نہیں　　کاوشِ انتخاب نے مارا
ہم نہ مرتے ترے تغافل سے　　پرسشِ بے حساب نے مارا
خود نظر بن گئی حجابِ نظر　　ہائے! اس بے حجاب نے مارا
میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا　　اس سوال و جواب نے مارا
حشر تک ہم نہ مرنے والوں کو　　مرگِ ناکامیاب نے مارا
بچ رہا جو تری تجلی سے　　اُس کو تیرے حجاب نے مارا
اپنے سینہ ہی پر پڑا اکثر　　تیر جو اضطراب نے مارا

دل کہ تھا جانِ زیست آہ جگرؔ
اسی خانہ خراب نے مارا

ولہ

غافل ز دلم نشیں جاناں زسرِ مستی　　صد نغمہ برانگیز و سازے کہ تو بشکستی
صد حسن دراں پنہاں صد جلوہ ازاں پیدا　　قربان نگاہِ تو، نازیم برایں مستی
از اوّل گامِ عشق، کردیم نثارِ حسن　　دنیا و غمِ دنیا، ہستی و غمِ ہستی
گہ تا فلک اندیشم گہ بیخبر از خویشم　　گاہے بہ چناں ہوشے گاہے بہ چنیں مستی

آں رندِ خراباتی نامش کہ جگرؔ خوانند
صد ہوش بہ جاں دارد با اینہمہ صد مستی

تنقید و تبصرہ

رسائل :-

نظام المشائخ (رسول نمبر)   پیشوا (رسول نمبر)

نظام المشائخ (رسول نمبر) | سائز ۲۳×۸/۸ حجم علاوہ اشتہاری ضمیموں کے ۲۳۲ صفحات
سالانہ چندہ باتفسیر ۸؍ بے تفسیر ۶؍ فی پرچہ ۴ر اس نمبر کی قیمت عہ
پتہ :- دفتر نظام المشائخ - کوچہ چیلان - دہلی -

خواجہ حسن نظامی صاحب، خالص اور بے میل، سادہ اور چٹکیلی اردو لکھنے میں جتنی صحیح اور جائز شہرت رکھتے ہیں اسی قدر انکا یہ رسالہ پسندیدہ شہرت کا مالک ہے - رسالہ کی یہ ۴۲ ویں جلد ہے اور عام رواج کے مطابق جبلی نمبر کے لئے گویا اب ۷ یا ۸ ہی جلدوں کی کسر ہے - عرصے سے اب اس کی ترتیب واشاعت کے ذمہ دار خواجہ صاحب کے معقول، سنجیدہ و متین حواری جناب واحدی ہیں اور خوشی کی بات ہے رسالہ انکی ادارت میں برابر ترقی کر رہا ہے -

رسول نمبر ماشاءاللہ بہت خوب ہے اور مرتب کی خوش مذاقی اور سلیقہ کا شاہد - مضمون نگاروں میں بعض مشاہیر علماء اور معروف ادیبوں کے نام ہیں اور اول سے آخر تک جو کچھ ہے معقول و دلچسپ ہے - سیرۃ مقدسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریباً جملہ مضامین مفید دلکش اور بعض خاصی کاوش و تلاش کے نتائج ہیں - چند نظمیں بھی اچھی خاصی ہیں حضرت امجد حیدرآبادی کی نظم ہجرت خواجہ حالی مرحوم کے مشہور مسدس کے انداز میں سب نظموں پر بھاری ہے، لیکن اگر نظموں کی مزید تلاش و ترتیب میں ذرا اور کاوش کیجاتی تو اچھا تھا -

بہرحال رسول نمبر محاسن صوری و معنوی سے آراستہ اور رواج کے خلاف گندے

اشتہاروں سے بھی الحمدللہ پاک وصاف ہے۔ سرورق کا ڈیزائن بھی مرغوب سادگی کے ساتھ بہت دلکش ہے۔

پیشوا (رسول نمبر) | سائز ۲۰×۳۰/۸ حجم ۱۸۴ صفحات، سالانہ چندہ ۶ فی پرچہ ۳ / اس نمبر کی قیمت ۱۲

پتہ:۔ دفتر پیشوا دہلی۔

یہ اس رسالہ کی چھٹی جلد شروع ہوا اور خوشی کی بات ہے۔ اس مختصر عرصے میں رسالہ نے باعتبار روش اور بلحاظ محاسن صوری ومعنوی امید افزا ترقی ہے۔ اس سال اس نے پھر ایک موٹا سا بھاری بھرکم رسول نمبر نکالا ہے جو پچھلے سال سے بہتر ہے۔ کاغذ نفیس اور کتابت بھی (بقائی صاحب کے رسالے کی بری بھلا کیونکر ہو سکتی ہے) خاصی ہے۔ طباعت کے لئے آزاد پریس کا نام کافی ضمانت ہے۔ پورے ڈھائی درجن بلاک کے مطبوعہ فوٹو ہیں گویا روحانی تسکین وتسلی کے ساتھ ساتھ مقامات مقدسہ کا ایک البم بھی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے موجود ہے۔

پوری ۲۹ نعتیہ نظمیں اور تقریباً ۸۰ مضامین نثر کے ہیں جو اکثر مشہور علماء اور ادیبوں کے نتائج افکار وقلم ہیں۔ مختصراً یہ کہ رسول نمبر ماشاء اللہ بہت اچھا ہے اور مسلمانوں کو اس سے ضرور مستفیض ہونا چاہئے۔

جناب بقائی کی خدمت میں بخلوص وثبات نیت ہم یہ عرض کرنے سے کسی طرح باز نہ رہ سکے کہ "رسول نمبر" کا ڈیڈیکیشن دنیا کے کسی بڑے سے بڑے رئیس یا "شہریار" کے نام دیکھ کر راقم الحروف ایسے عامی مسلمان کو تو تکلیف ہی ہوئی۔ خواہ وہ رئیس یا "شہریار" کیسے ہی پسندیدہ صفات وخصائل محمودہ کے مالک ہوں۔ اس کے علاوہ رسول نمبر میں "شب عروسی" کا اشتہار وہ بھی بہت نمایاں کہ ٹھیک سرورق کے صفحہ ۴ پر خاصی زیبا زینت کے ساتھ دیا گیا ہے، کچھ کم تکلیف دہ نہیں۔

(ا۔ا۔م)

شذرات

وسط اگست سے دہلی کے بعض محلوں میں فصلی وبا شروع ہوگئی ہے لیکن خدا کے فضل سے اور محکمہ حفظان صحت کی سرگرمی کی بدولت اب تک زیادہ پھیلنے نہیں پائی اور امید ہے کہ آخر ستمبر تک موسم بدل جانے کے بعد بالکل معدوم ہو جائے گی۔ جامعہ ملیہ میں حفظ ماتقدم کی پوری کوشش کیجا رہی ہے۔ سب طلبہ کے ٹیکے لگائے گئے ہیں اور کھانے پینے میں ہر طرح کی احتیاط کی جا رہی ہے۔ حفظان صحت کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر سیٹھنا صاحب اس معاملے میں منتظمین جامعہ کی پوری امداد کر رہے ہیں اور انکے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے معائنے کے سلسلے میں یہ رائے ظاہر کی کہ جامعہ کے طلبہ کی صحت کا عام معیار دوسرے مدرسوں کے مقابلے میں بہت اچھا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ جناب شیخ الجامعہ صاحب اور بورڈنگ ہاؤسوں کے نگراں طلبہ کی تندرستی کے لئے نہایت دلسوزی اور توجہ سے ہر ممکن تدبیر اختیار کرتے ہیں یوں تو حافظ حقیقی خداوند تعالیٰ کی ذات ہے اور ہر شخص کو اپنی صحت اور سلامتی کے لئے اسی کا شکر کرنا چاہئے لیکن منتظمین جامعہ اس لحاظ سے تعریف کے قابل ہیں کہ وہ اس معاملے میں اپنے فرائض کا پورا احساس رکھتے ہیں اور انہیں بہت خوبی سے انجام دیتے ہیں۔

امیر جامعہ جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مدظلہ ۶ ستمبر کو بھوپال اور حیدر آباد کے قصد سے روانہ ہو رہے ہیں کہ اپنے احباب خاص کے حلقہ میں جامعہ ملیہ کے مقاصد کی اشاعت کریں اور اس کے لئے مالی امداد فراہم کریں۔ شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر

ذاکر حسین خانصاحب بھی ممدوح کے ہمراہ تشریف لیجائیں گے۔

پچھلے مہینے جناب مولانا محمد علی صاحب کو وہ جانکاہ صدمہ پیش آیا جسے انسان کا قلب بغیر خداوند تعالیٰ کی مدد کے ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔ ممدوح کی صاحبزادی نے جن کا عقد جناب ماجد علی صاحب انجنیر سے ہوا تھا ڈیرہ دون میں وفات پائی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ ہمیں جناب مولانا و بیگم محمد علی صاحبہ اور ماجد علی صاحب سے دلی ہمدردی ہے اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ انکو صبر جمیل عطا کرے۔

جامعہ ملیہ کے فارغ التحصیل طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے عموماً جرمنی یا فرانس جایا کرتے ہیں کیونکہ ان ممالک میں تمام یونیورسٹیاں جامعہ کی سند کو تسلیم کرتی ہیں اور یوں بھی ان ممالک میں ہندوستانی طلبہ کے ساتھ وہ تعصب نہیں برتا جاتا جس کے لئے انگلستان بدنام ہے۔ براعظم یورپ کی تعلیمگاہوں میں عموماً اور جرمنی کی یونیورسٹیوں میں خصوصاً اتنی علمی فیاضی پائی جاتی ہے کہ ایشیائی طالب علموں کو تحصیل و تحقیق کا موقع اسی طرح دیا جائے جیسے یورپ کے طالبعلموں کو بلکہ کبھی کبھی ان غریب الوطنوں کے ساتھ خاص ہمدردی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

اس سال بھی جامعہ کے دو طالب علم جرمنی جارہے ہیں جن میں سے ایک ہائیڈلبرگ کی یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھنا چاہتے ہیں اور دوسرے برلن اور لائپزگ میں رہ کر عربی، عبرانی اور دوسری سامی زبانوں کا لسانیات تقابلی کے اصول پر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

عربیات کے ایک فارغ التحصیل طالب علم مصر جانے کا عزم رکھتے ہیں کہ جامعہ ازہر اور جامعہ مصریہ میں عربی زبان و ادب اور دینی علوم کی تکمیل کریں۔

ہم ان تینوں صاحبوں کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں کہ یہ تحصیل علم کے مبارک ارادے سے اتنے دور دراز سفر اختیار کر رہے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند تعالےٰ انہیں توفیق دے کہ نہایت محنت اور جفاکشی سے تحصیل علوم میں مصروف رہیں اپنے قول و عمل سے لوگوں کے دلوں میں اپنے ملک و قوم کی محبت پیدا کریں اور ہندوستان واپس آکر ایمانداری اور خلوص سے مفید علمی اور عملی خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر سر سی وی رامن صاحب نے مائیسور یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اگرچہ مختصر ہے لیکن خیالات کی گہرائی اور نظر کی وسعت کے اعتبار سے ان طول طویل خطبات سے کہیں زیادہ قابل قدر ہے جو سامعین کو گھنٹوں تک خواب اور بیداری کی سرحد پر اس حالت میں رکھتے ہیں کہ ازیں سو رانده وازاں سو مانده۔ موصوف نے ابتدا میں ریاست میسور کی علمی خدمات کا مناسب الفاظ میں اعتراف کیا اس کے بعد یہ بتایا کہ دنیا میں امن قائم رکھنے اور مختلف قوموں کو ایک رشتۂ اتحاد میں مربوط کرنے کے لئے علم کس حد تک مفید ہے اور یونیورسٹیاں جو علم کا مرکز کہلاتی ہیں اس فرض کو کیونکر ادا کرسکتی ہیں۔ مثلاً جرمنی نے اپنے علمی فضل و کمال کی بدولت جنگ عظیم کے بعد کتنی جلدی پہلے انگلستان سے اور پھر دوسری قوموں سے دوستانہ تعلقات قائم کرلئے بلکہ ان پر دوبارہ ذہنی اور تمدنی اقتدار حاصل کرلیا۔ یونیورسٹی کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ اسکا کام محض عام تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ ہر نوجوان کی مخصوص ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنا اور نشوونما دینا۔ تاکہ وہ اپنے ملک کی اقتصادی، معاشرتی، سیاسی اصلاح و ترقی کا بوجھ اٹھاسکیں اور اسے دنیا کے دوسرے مہذب ملکوں کا ہمرتبہ بناسکیں۔

مگر افسوس کی بات ہے کہ جہاں ڈاکٹر صاحب نے ملک کی سیاسی حالت پر تبصرہ کیا

ہے اور نوجوان طالب علموں کا تعلق سیاست سے دکھایا ہے وہاں یہ بات صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ موصوف بھی اور اہل علم کی طرح اپنے علمی افکار و مشاغل میں اسقدر ڈوبے رہتے ہیں کہ علمی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے سے بالکل معذور ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ نوجوانوں میں سیاسی بے چینی پیدا ہونیکی وجہ محض بیکاری ہے اور اگر انکے لئے مفید کاموں کا انتظام کردیا جائے تو یہ بات جاتی رہے گی۔ گویا آپ کے نزدیک قوموں کا سیاسی اور اقتصادی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا محض ایک بے شغلی کا مشغلہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ابتدا میں برطانوی حکومت کا بھی یہی خیال تھا اور وہ ہندوستان کے "بے چینوں" کو کھلونے دیکر بہلانیکی کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے۔ مگر اسے یہ محسوس ہوگیا ہے (اور ڈاکٹر صاحب اگر چاہیں تو اس سے پوچھ کر تصدیق کر سکتے ہیں) کہ ان کھلونوں سے "بچے" تھوڑی دیر تو بہلتے ہیں لیکن پھر انکی "شرارت" چوگنی ہوجاتی ہے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب انہیں یہ نصیحت کرتے ہیں جس میں ہم بھی موصوف کے ہمزبان ہیں کہ وہ انتہائی محنت اور جفاکشی سے کام لے کر علمی میدان میں آگے قدم بڑھائیں اور اپنی قوم کی ذہانت اور قابلیت کا سکہ دوسری قوموں کے دل پر جما دیں۔

نوجوانوں میں جو سیاسی ہیجان و طوفان اٹھ رہا ہے اسے روکنا نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس سیلاب کو بے قید نہ رہنے دیا جائے بلکہ نہروں میں پابند کرکے اسکا رُخ اس طرح پھیرا جائے کہ ملک کی آزادی کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ اس کے دھارے میں بہہ جائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ۔ ڈی

جلد ۱۳	بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

۱۔ آزادی کی راہیں	برٹرنڈ رسل مترجمہ حامد علیخانصاحب بی اے (جامعہ)	۱۷۰
۲۔ ادبیات ایران کی ترقی میں سلطان محمود کا حصہ	مولوی حسین حسان صاحب ندوی متعلم جامعہ	۱۸۰
۳۔ ہندوستان میں فن کا دور جدید	ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب صدیقی پی ایچ ۔ ڈی	۱۹۳
۴۔ اسلامی اور مسیحی اخلاق	خواجہ غلام الحسنین صاحب فاضل پانی پتی	۲۰۹
۵۔ باغی (افسانہ) نمبر۲	اسرائیل احمد خانصاحب	۲۲۳
۶۔ غزل	حضرت درد کاکوروی	۲۴۰
۷۔ غزل	حضرت جلیل قدوائی	۲۴۱
۸۔ تنقید و تبصرہ ۲۴۲	شذرات	۲۴۴

آزادی کی راہیں

باب ۲

باکونین اور نراج

(گذشتہ سے پیوستہ)

زار نکولاس کی موت کے بعد بہت سی سیاسی قیدیوں کو معافی دی گئی لیکن اسکندر ثانی نے خود اپنے ہاتھ سے اس فہرست سے باکونین کا نام کاٹ دیا۔ باکونین کی ماں جب نئے زار کی خدمت میں باریابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تو زار نے اس سے کہا "خاتون، اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارا بیٹا جب تک زندہ ہے آزاد نہیں ہو سکتا۔" لیکن بہر حال ۱۸۵۷ء میں آٹھ سال کی قید کے بعد اسے مقابلۃً آزاد کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ یہاں سے ۱۸۶۱ء میں جاپان بھاگ گیا اور وہاں سے امریکہ ہوتا ہوا لندن پہنچا۔ اسے حکومتوں کی مخالفت کی وجہ سے قید کیا گیا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ اس کی مصیبتوں نے اس پر وہ اثر نہ ڈالا جو لوگ چاہتے تھے یعنی ان سے محبت پیدا کرنا جنہوں نے اس پر یہ مصیبتیں ڈالی تھیں۔ اس زمانے سے اس نے اپنے کو تمام تر نراجی بغاوت کی روح پھیلانے کے لئے وقف کر دیا اور اسے کوئی مزید قید نہیں کاٹنی پڑی۔ کچھ سال یہ اٹلی میں رہا۔ یہاں ۱۸۶۴ء میں اس نے ایک "بین الاقوامی برادری" یا "اشتراکی انقلابیوں کا اتحاد" قائم کیا۔ اس میں بہت سے ممالک کے لوگ تھے لیکن بظاہر کوئی جرمن نہ تھا۔ اس نے اپنے کو زیادہ تر جرمنی کی قوم پرستی کی مخالفت کے لئے وقف کیا۔ ۱۸۶۷ء میں یہ سوئٹزرلینڈ میں منتقل ہو گیا۔ یہاں اگلے سال اس نے "اشتراکی جمہوریت کے بین الاقوامی اتحاد" کے قیام میں مدد دی اور اس کا

پروگرام تیار کیا۔ اس پروگرام میں اس کے خیالات کا ایک اچھا مختصر سا خلاصہ ملتا ہے :۔

"یہ اتحاد اپنے مادہ پرست ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ یہ طبقات (معاشی) کو قطعی اور کلی طور پر مٹانا چاہتا ہے اور مردوں، عورتوں کی سیاسی اور معاشی مساوات کا خواہشمند ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ زمین، آلات محنت، نیز ہر دوسرا سرمایہ عمل جماعت کی مشترکہ املاک ہو جائے اور سوائے کام کرنے والوں (مزدوروں) کے کوئی انہیں استعمال نہ کر سکے، یعنی صرف زرعی اور صنعتی انجمنیں۔ یہ باور کرتا ہے کہ تمام موجودہ سیاسی اور با اختیار ریاستوں کو چاہئے کہ اپنی کوششوں کو انتظامی معاملات تک محدود رکھیں اور رفتہ رفتہ زرعی و صنعتی انجمنوں کے ایک عالمگیر اتحاد میں گم ہو جائیں۔" جمہوریت اشتراکی کے اس بین الاقوامی اتحاد نے "بین الاقوامی انجمن مزدوران" کی شاخ بننے کی خواہش کی لیکن اس سے اس بنیاد پر انکار کر دیا گیا کہ شاخیں مقامی ہونی چاہئیں، یہ خود بین الاقوامی نہیں ہو سکتیں، لیکن اس اتحاد کی جنیوا والی شاخ جولائی ۱۸۶۹ء میں داخل کر لی گئی تھی۔

"بین الاقوامی انجمن مزدوران" ۱۸۶۴ء میں لندن میں قائم ہوئی تھی اور اس کے قواعد اور پروگرام مارکس نے بنائے تھے۔ پہلے پہل باکونین کو توقع نہ تھی کہ یہ کامیاب ہوگی اور اس نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن یہ بہت سے ملکوں میں غیر معمولی تیزی سے پھیلی اور بہت جلد اشتراکی خیالات کی تبلیغ کے لئے ایک موثر قوت ہو گئی۔ شروع شروع میں یہ کسی طرح بالکل اشتراکی نہ تھی، لیکن یکے بعد دیگرے اجلاسوں میں مارکس نے اسے روز بروز اپنے خیالات کا حامی بنا لیا اور تیسری کانگریس منعقدہ بروسلز ستمبر ۱۸۶۸ء میں یہ قطعًا اشتراکی ہو گئی۔ اب باکونین نے بھی اپنی سابقہ علیحدگی پر افسوس کر کے فیصلہ کیا کہ اس میں شامل ہو جائے اور اپنے ساتھ فرانسیسی سوئزرلینڈ، فرانس، ہسپانیہ اور اطالیہ سے متبعین کی کافی تعداد بھی ساتھ لایا۔ چوتھی کانگریس منعقدہ بیل (Bale) ستمبر ۱۸۶۹ء میں دو مختلف لہریں بالکل جدا جدا معلوم ہوتی تھیں۔ جرمن اور انگریز ریاست کی اس

شکل میں مارکس کے ہمخیال تھے جو یہ ملکیت شخصی کے مٹنے کے بعد اختیار کریگی، یہ اس خواہش میں بھی اس کے ساتھ تھے کہ مختلف ممالک میں مزدوروں کی پارٹیاں قائم کیجائیں اور نظام جمہوریت کو اس لئے استعمال کیا جائے کہ پارلیمنٹ کے لئے مزدوروں کے نمائندے منتخب ہوں۔ برخلاف اس کے لاطینی قومیں ریاست کی مخالفت اور حکومت نمائندگان کے نظام سے بے اعتمادی کے معاملہ میں باکونین کی متبع تھیں۔ ان دونوں گروہوں کی مخالفت روز بروز تلخ تر ہوتی گئی اور ایک نے دوسرے پر طرح طرح کے الزام لگائے۔ یہ بیان پھر دہرایا گیا کہ باکونین جاسوس ہے اور تحقیق کے بعد واپس لیا گیا۔ مارکس نے اپنے جرمن دوستوں کے نام ایک خفیہ تحریر میں لکھا کہ باکونین اتحاد سلافی پارٹی کا کارندہ ہے اور وہاں سے ۲۵ ہزار فرانک سالانہ پاتا ہے۔ اسی زمانے میں باکونین کو روس میں کسانوں کی ایک بغاوت کے اکسانے میں دلچسپی پیدا ہوگئی اور اس وجہ سے اس نے "بین الملل" کے مقابلہ کیطرف سے نہایت نازک موقع پر غفلت برتی۔ فرانسیسی پروشیائی جنگ میں باکونین نے نہایت شدت سے فرانس کی طرفداری کی خصوصًا نپولین سوم کے تخت سے اتارے جانے کے بعد اس کی کوشش تھی کہ لوگوں کو ۱۷۹۳ء کی سے انقلابی مقاومت پر ابھارے، چنانچہ لیان میں بغاوت کی ایک ناکام کوشش سے اسکا تعلق پایا گیا۔ فرانسیسی حکومت نے اس پر پروشیا کا کارندہ ہونے کا الزام لگایا اور یہ بڑی مشکل سے بچکر سوئزرلینڈ بھاگا۔ مارکس اور اس کے متبعین سے اس کی جو مخالفت تھی وہ اس قومی تنازعہ کے باعث اور بھی شدید ہوگئی۔ باکونین (جیسے اس کے بعد کروپاٹکن) جرمنی کی نئی قوت کو دنیا میں حریت کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ یہ جرمنوں سے نہایت سخت نفرت رکھتا تھا۔ کچھ تو بلاشبہ بسمارک کی وجہ سے لیکن غالبًا اس سے زیادہ مارکس کی وجہ سے۔ آجتک نراج تقریبًا کلیتہً لاطینی ممالک تک محدود ہے اور جرمنی کے خلاف نفرت سے وابستہ ہے۔ جو "بین الملل" میں مارکس اور باکونین کے مناقشہ سے پیدا ہوئی تھی۔

"بین الملل"، کی عام کانگریس منعقدہ ہیگ ۱۸۷۲ء میں باکونین کے فرقہ کو قطعی طور پر دبا دیا گیا۔ اجلاس کا مقام "جنرل کونسل" نے طے کیا تھا جس میں مارکس کا کوئی مخالف نہ تھا اور باکونین کے دوست کہتے ہیں کہ اس خیال سے یہ جگہ منتخب کی گئی تھی کہ فرانسیسی اور جرمن حکومتوں کی مخالفت کے باعث باکونین کا وہاں آنا ناممکن اور اس کے دوستوں کا آنا دشوار ہو جائے۔ باکونین کو "بین الملل" سے خارج کر دیا گیا، اور یہ ایک اطلاع کی بنا پر جس میں اس پر علاوہ اور باتوں کے ذرا دھمکا کر سرقہ کا الزام لگایا گیا تھا۔

بین الملل کی ار تو وکسی تو بچ گئی لیکن اس کی قوت حیات جاتی رہی۔ اس زمانے سے خود اس میں کوئی قوت باقی نہ رہی، لیکن دونوں فرقے اپنے اپنے گروہوں میں برابر کام کرتے رہے اور بالخصوص اشتراکی گروہ نہایت سرعت کے ساتھ بڑھنے لگے۔ بالآخر ۱۸۸۹ء میں ایک نیا "بین الملل" قائم کیا گیا جو موجودہ جنگ کے شروع ہونے تک باقی رہا۔ اشتراک بین الملل کے متعلق پیش گوئی کرنا خلاف احتیاط ہے، اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی خیال نے اتنی کافی قوت اختیار کر لی ہے کہ جنگ کے بعد اسے پھر ایک ایسے ذریعۂ اظہار خیال کی ضرورت پڑے گی جیسی کہ پہلے اشتراکی کانگریسوں میں موجود تھی۔

اس وقت باکونین کی تندرستی بالکل بگڑ چکی تھی اور چند چھوٹے چھوٹے وقفوں سے قطع نظر یہ ۱۸۷۶ء میں اپنی موت تک کنارہ کشی کی زندگی گذارتا رہا۔

برخلاف مارکس کے باکونین کی زندگی بہت طوفانی ہے۔ ارباب اختیار کے خلاف ہر بغاوت سے اسے ہمدردی تھی اور جب ساتھ دیتا تھا تو ذاتی خطرہ کی ذرا بھی پروا نہ کرتا اس کا اثر جو بلاشبہ بہت گہرا ہے زیادہ تر اہم افراد پر اس کی شخصیت سے پیدا ہوا۔ اس کی تصانیف بھی مارکس کی تصانیف سے اتنی ہی مختلف ہیں جتنی انکی زندگی۔ یہ منتشر ہیں، زیادہ تر عارضی مواقع کے لئے لکھی گئی ہیں، نہایت تجریدی ہیں اور فلسفیانہ، سوائے اس صورت کے کہ جب یہ سیاست حاضرہ سے بحث کرتی ہوں وہ معاشی واقعات سے دوچار نہیں ہوتا

بلکہ عموماً ایک نظری و مابعد الطبیعی دنیا میں رہتا ہے اور جب کبھی اس دنیا سے نیچے اترتا ہی تو مارکس سے کہیں زیادہ موجودہ سیاست بین الاقوامی کے زیر اثر ہوتا ہی اور اپنے اس عقیدہ کے نتائج کا بہت کم اثر رکھتا ہے کہ اصلی چیز معاشی اسباب ہیں۔ وہ مارکس کی تعریف کرتا ہی کہ اس نے اس مسئلہ کی تلقین کی لیکن قومی سیاست ہی کے اعتبار سے سوچتا اور فکر کرتا ہی۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف "سلطنت اور انقلاب جماعتی" میں زیادہ تر فرانسیسی پروشی جنگ کی آخری منازل میں فرانس کی حالت سے بحث ہی اور جرمن شہنشاہیت کا مقابلہ کرنیکے ذرائع سے۔ اس کی تصانیف کا زیادہ تر حصہ بڑی عجلت سے دو بغاوتوں کے درمیانی وقفہ میں لکھا گیا ہی۔ اس کے ادبی ترتیب کے فقدان میں بھی نزاج کی شان ہی۔ اسکی سب سے مشہور تصنیف ایک ناتمام تحریر ہے جسے شائع کرنے والوں نے "خدا اور ریاست" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کتاب میں یہ خدا اور ریاست پر عقیدے کو انسانی آزادی کی راہ میں دو بڑی رکاوٹیں بتاتا ہے۔ ایک نمونے کی عبارت سے اسکا طرز ظاہر ہو جائیگا۔

"ریاست جماعت نہیں؛ یہ تو صرف اس کی ایک تاریخی شکل ہی، جیسی مجردو بیہی ہی ہیمی، تاریخاً یہ ہر ملک میں تشدد اور تاخت و تاراج یعنی جنگ اور فتح کے دیوی دیوتا کے باہمی ازدواج کا نتیجہ ہے۔ جنہیں قوموں کے دینی تخیل نے کامیابی سے پیدا کیا۔ ابتدا سے ریاست یہی تھی اور اب بھی یہی ہے یعنی وحشیانہ قوت اور فاتحانہ عدم مساوات کا مذہبی جواز۔

ریاست اختیار ہے، جبر ہے، جبر کی نمایش اور جبر کا فریب، یہ تالیف قلوب نہیں کرتی یہ کسی کو اپنا ہم خیال بنانا نہیں چاہتی۔ یہ اچھی بات کا حکم بھی دیتی ہے تو اس کی راہ میں کانٹے پیدا کرتی اور اسے خراب کرتی ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ اسکا حکم دیتی ہے اور ہر حکم حریت کی جائز بغاوتوں کو اکساتا اور تحریک دیتا ہے۔ اور اس وجہ سے کہ خیر بھی جہاں اسکا

حکم دیا گیا سترہیں تبدیل ہو جاتی ہے، حقیقی اخلاق، انسانی اخلاق (یقینی الٰہی اخلاق نہیں) کے نقطۂ نظر سے انسانی عزت اور حریت کے نقطہ نظر سے حریت، اخلاق، اور آدمی کی انسانی شان بس اسی میں ہے کہ وہ خیر پر کاربند ہو اس وجہ سے نہیں کہ اسکا حکم دیا جاتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ خود اسے خیر جانتا ہے، اس کی آرزو رکھتا اور اس سے محبت کرتا ہے

ہمیں باکونین کی تصانیف میں اس جماعت کی کوئی صاف تصویر نہیں ملتی جو اس کا مطمع نظر تھی اور نہ اس بات کا کوئی ثبوت کہ ایسی جماعت پائدار بھی ہو سکتی ہے۔ ہم اگر نراج کو سمجھنا چاہیں تو ہمیں اس کے متبعین کیطرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً کروپاٹکن کی طرف جو خود اس کی طرح یورپ کے قید خانوں سے آشنا روسی امیر تھا اور اسکی طرح ایک نراجی جو باوجود اپنی بین الاقوامیت کے جرمنوں سے نہایت شدید نفرت رکھتا تھا۔

کروپاٹکن نے اپنی تحریر کا بڑا حصہ پیدائش دولت کے صنعتی مسائل پر صرف کیا ہے۔ "کھیت اور چھوٹے بڑے کارخانے" اور "روٹی کی فتح" میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر پیدائش دولت زیادہ حکمی اصول پر ہو اور بہتر منظم تو تھوڑا سا خوشگوار کام آبادی کو آرام سے قائم رکھنے کے لئے کافی ہوگا۔ اگر ہم تسلیم بھی کرلیں، اور غالباً ہمیں تسلیم کرنا چاہئے، کہ اس نے ہمارے موجودہ علوم حکمیہ کے امکانات میں ذرا مبالغہ سے کام لیا ہے تب بھی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے بیان میں بہت کچھ سچائی ہے۔ اور پیدائش دولت کے مضمون پر توجہ کر کے اس نے ظاہر کر دیا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اصلی سوال کیا ہے۔ اگر تہذیب و ترقی مساوات کے ہم رکاب ہوں تو اس مساوات کے معنی یہ نہ ہونا چاہئے کہ ضروریات زندگی سے تھوڑا سا زیادہ حاصل کرنے کے لئے تکلیف دہ مشقت کی

(نوٹ صفحہ نمبر ۱۷۱) یہ نام باکونین کا دیا ہوا نہیں بلکہ کافیرو اور ایلزی ریکلس کی اختراع ہے۔ جنہوں نے اسے شائع کیا۔ انہیں یہ نہ معلوم تھا کہ یہ "سلطنت" کی نظر ثانی کے بعد دوسری اشاعت کا ایک ناتمام جزو تھا

طویل ساعات برداشت کرنی پڑیں، کیونکہ جہاں فرصت و آرام نہیں وہاں علوم و فنون مردہ ہوجائیں گے اور ساری ترقی ناممکن ہوجائے گی۔ بعض لوگوں کو اشتراک اور نراج کے خلاف اس بنیاد پر جو اعتراض ہے وہ محنت کی امکانی پیداآوری کا لحاظ کرکے باقی نہیں رہتا۔

کروپاٹکن کی نظر میں جو نظام ہے وہ صحیح ہو یا نہ ہو۔ مگر یہ ضرور ہے کہ آجکل کے مروجہ طریقہائے پیدایش دولت میں بہت بڑی ترقی کا طالب ہے۔ یہ مزدوری کے نظام کو مطلقاً مٹا دینا چاہتا ہے اور یہ بھی اکثر اشتراکیوں کی طرح اس معنی میں نہیں کہ ایک شخص کام کرنیکی آمادگی کے لئے اجرت دینی چاہئے نہ کہ واقعی اس کام کے لئے جو اس سے مطلوب ہو، بلکہ اس سے زیادہ اصولی اور گہرے معنی میں۔ یعنی کام کرنے پر کوئی مجبور نہ ہو، اور ساری اشیا رکل آبادی میں ساوی تقسیم ہوں۔ کروپاٹکن کو بھروسہ اس پر ہے کہ محنت کو خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ اسکا خیال ہے کہ جو جمعیت اس کے پیش نظر ہے اس میں عملاً ہر شخص کاہلی پر کام کو ترجیح دیگا۔ کیونکہ کام کے معنی ضرورت سے زیادہ مشقت اور غلامی نہ ہونگے، نہ اس میں اب وہ انتہائی تخصیص کار ہوگی جو موجودہ نظام صنعتی کا نتیجہ ہے، بلکہ دن کے چند گھنٹوں کے لئے ایک خوشگوار مشغلہ ہوگا جس میں آدمی کو اپنے فطری محرکات تخلیقی کے اظہار کے مواقع ملیں گے۔ کوئی جبر نہ ہوگا، نہ کوئی قانون حکومت جو جبر کا استعمال کرے، اعمال جمعیت اب بھی باقی رہیں گے، لیکن یہ سب کی رضامندی کا نتیجہ ہونگے، اور چھوٹی سے چھوٹی اقلیت بھی بہ جبر نہ دبائی جائے گی۔ ہم ایک اگلے باب میں یہ تحقیق کریں گے کہ یہ نصب العین کہاں تک قابل حصول ہے، لیکن اس میں کلام نہیں کہ کروپاٹکن نے اسے نہایت خوبی کے ساتھ اسے پیش کیا ہے کہ آدمی قائل ہوجائے۔

یہ نراج کے ساتھ انصاف نہیں بلکہ بیجا طرفداری ہوگی اگر ہم اس کے "تاریک پہلو کے متعلق کچھ نہ کہیں۔ یعنی وہ پہلو جس نے اسے پولیس سے ٹکرایا اور معمولی شہریوں کے

لئے اسے ایک ہیبت خیز لفظ بنا دیا۔ اس کے عام مسلک میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے تشدد کے طریقوں کو یا امیروں کی شدید نفرت کو کوئی لازمی تعلق ہو اور اس عام مسلک کے اکثر ماننے والے ذاتی طور پر نرم دل اور طبعًا تشدد سے بیزار ہوتے ہیں۔ لیکن نراجی جمعیت اور اخبارات کا عام لہجہ اس درجہ تلخ ہے کہ اسے بمشکل عاقلانہ کہہ سکتے ہیں اور خصوصًا لاطینی ممالک میں معلوم ہوتا ہے کہ خوش نصیبوں کے خلاف کینہ کو اکسایا جاتا ہے نہ کہ بدنصیبوں کے ساتھ رحم کو۔ مخالفانہ نقطہ نظر سے اس کا بالکل قابل اعتماد تو نہیں مگر واضح اور دلچسپ بیان فیلس ڈیوبو کی کتاب "نراجی خطرہ" میں ملتا ہے جہاں ضمنًا نراجی رسائل سے بعض کارٹون بھی نقل کئے گئے ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جنہیں محبت انسانیت کا حقیقی جذبہ قابو میں رکھے اور دوں میں قانون کے خلاف بغاوت کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام معمولاً قبول کئے ہوئے اخلاقی قاعدے بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور انتقامی بیرحمی کی وہ تلخ روح پیدا ہو جاتی ہے جس سے کوئی خیر بمشکل پیدا ہو سکتی ہے۔

عام نراج کی سب سے عجیب خصوصیت اس کی شہید پرستی ہے جو مسیحی شکلوں کی نقل کرتی اور جس میں (مثلاً فرانس میں) صلیب کے بجائے پھانسی ہوتی ہے۔ ارباب اختیار کے ہاتھوں جن لوگوں نے تشدد کی وجہ سے موت کا منہ دیکھا ان میں سے بہت سے بلاشبہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے سچے دل سے ایک مقصد میں اپنے عقیدہ کی خاطر تکلیف اٹھائی لیکن دوسرے ایسے بھی ہیں کہ جن کی عزت اتنی ہی کیجاتی ہے، لیکن انکا معاملہ مشتبہ ہے اس دبے ہوئے مذہبی ہیجان کی نکاسی کی سب سے عجیب مثال راواسول کی پوجا ہے جسے مختلف ڈینامائٹ کے جرموں کی بنا پر ۱۸۹۲ء میں پھانسی دیگئی تھی۔ اسکا ماضی مشتبہ تھا لیکن اس نے جان دی بہادری سے اور اس کے آخری الفاظ ایک مشہور نراجی گیت Chant du Pere Duchesne (یا دادو شیدن کا گیت) کے تین مصرع تھے۔

قدرتی بات تھی کہ سربرآوردہ نراجیوں نے اس کی یاد کی تقدیس میں حصہ نہ لیا لیکن

پھر بھی یہ رسم حیرت انگیز بے اعتدالیوں کے ساتھ بڑھی ۔

مسلک نراج یا اس کے سربرآوردہ حاملین کے خیالات پر ایسے مظاہر کو دیکھکر حکم لگانا بالکل بے انصافی ہے، لیکن یہ امر واقعہ اپنی جگہہ باقی ہے کہ نراج اپنی طرف بہت سے ایسے مواد کو کھینچتا ہے جو جنون اور جرم کی سرحد پر ہے[1]۔ اس واقعہ کا یاد رکھنا ارباب اختیار اور غور نہ کرنے والے عوام کی صفائی کے لئے ضروری ہے کہ یہ اس تحریک کے نکھٹوؤں کو اور ان سچے بہادر اور عالی خیال لوگوں کو یکساں نفرت میں گڈمڈ کر دیتے ہیں جنہوں نے اس کے نظریے ترتیب دئے اور انکی اشاعت و تبلیغ کی خاطر اپنا آرام اور اپنی کامیابی قربان کر دی ۔

یہ تشدد کی تحریک جس میں راواشول جیسے لوگ کام کر رہے تھے عملاً ۱۸۹۴ء میں ختم ہو گئی ۔ کچھ عرصہ بعد بہتر قسم کے نراجیوں نے ٹیلوتیر کے زیر اثر ایک کم نقصان دہ راہ

---

(۱) تمام بہتر قسم کے نراجیوں کا رویہ وہ ہے جو ل ۔ س ۔ بیوگشن نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے: "بیشک ہمیں علم ہے کہ اپنے کو نراجی کہنے والوں میں غیر متوازن جوشیلے دیوانوں کی ایک چھوٹی سی تعداد ہے جو ہر غیر قانونی اور سنسنی خیز تشدد کے فعل کو بڑی مسرت اور جشن کے قابل تصور کرتے ہیں یہ لوگ جو پولیس اور اخبارات کے لئے نہایت کارآمد کا ذہن کے ڈانواں ڈول اصول اخلاق میں کمزور ہوتے ہیں بارہا ثابت کر چکے ہیں کہ وہ مالی (رشوت) اثرات سے متاثر ہو سکتے ہیں ۔ یہ انکا تشدد اور انکا نراج خریدے جا سکتے ہیں، اور آخر کار اس بے وردی کی جنگ میں جو بورژوا طبقہ قوم کے آزادی خواہوں کے خلاف کر رہا ہے یہ اس کے نہایت کارآمد ساتھی بن جاتے ہیں اور انکی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے" انکا نتیجہ نہایت عاقلانہ ہے: "بلا اتنیا ز قتل و غارت کے کام کو ہم حکومت کے لئے چھوڑ دیں ۔ اس کے مدبروں کے لئے، اس کے دلالوں کے لئے، اس کے عہدیداروں اور اس کے قانون کے لئے" (نراج اور تشدد صفحہ ۱۰-۹)

نکالی کہ اتحاد ہائے صنعتی اور "مبادلات محنت" میں انقلابی سنڈکلیت کی حمایت کریں

نراجی اشتراکیوں نے جماعت کی معاشی تنظیم کا جو تصور قایم کیا ہے وہ اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں جو اشتراکی چاہتے ہیں، اشتراکیوں سے انکا اختلاف حکومت کے معا میں ہے۔ انکا مطالبہ ہے کہ حکومت کے لئے سب محکوموں کی رضامندی کی ضرورت ہے نہ کہ صرف ایک اکثریت کی۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اکثریت کی حکومت آزادی کے تقریباً اتنی ہی منافی ہو سکتی ہے جتنی کہ اقلیت کی حکومت اکثریت کے حق الہی کا بے قیل و قال عقیدہ اپنے اندر بس اتنی ہی سچائی رکھتا ہے جتنا کہ کوئی اور ایسا عقیدہ۔ ایک مضبوط جمہوری ریاست آسانی سے اپنے بہترین شہریوں پر ظلم شروع کر سکتی ہے یعنی ان پر جن کی دماغی بے تعلقی انہیں ترقی کی ایک قوت بناتی ہے۔ جمہوری پارلیمنٹی حکومت کے تجربہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ پہلے کے اشتراکیوں نے اس سے جو توقع قائم کر لی تھی یہ بہت کم پوری ہوئی چنانچہ اس کے خلاف نراجی بغاوت کچھ تعجب خیز نہیں۔ لیکن خالص نراج کی شکل میں یہ بغاوت کمزور اور ہنگامی رہی ہے۔ یہ دراصل سنڈکلیت ہے اور وہ دوسری تحریکیں جو اس سے پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے پارلیمنٹی حکومت اور مزدوروں کی رہائی کے لئے خالص سیاسی ذرائع کے خلاف بغاوت کو عوام میں پھیلایا۔ لیکن اس تحریک سے ایک علحدہ باب میں بحث کرنی چاہئیے۔

ادبیات ایران کی ترقی میں

سلطان محمود غزنوی کا حصّہ

(۳)

سلطان محمود غزنوی | قبل اس کے کہ محمود غزنوی کی علمی سرپرستیوں کا ذکر چھیڑا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے

غزنوی خاندان کے سلسلہ کی کڑی بھی دراصل سامانی خاندان سے ملتی ہے اس لئے کہ عبدالملک نوح سامانی کے عہد میں ایک شخص نصرحاجی تاجر نے سبکتگیں کو خرید لیا اور بخارا لیجا کر امیر ابتگین امیر حاجب کے ہاتھ فروخت کردیا اسی سبکتگین نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی اور اس قدر کارہائے نمایاں انجام دئے کہ آخر کار غزنین کا تخت حاصل کرلیا نہ صرف یہ بلکہ غور وطخارستان وغیرہ بھی مفتوحہ ممالک میں داخل کرلئے۔ ہندوستان پر بھی دو تین نہایت سخت حملے کئے۔ غرضکہ ایک ادنیٰ سے غلام نے محض اپنے بل بوتہ پر ایسی حیرت انگیز ترقی کرلی اور وہی ذلیل ہستی جو ادہر اُدہر بکتی پھرتی تھی بڑے بڑے رؤسا امرا سلاطین کی گردنیں اس کے سامنے خم ہونے لگیں

محمود[۱] غزنوی ۳۶۰ھ میں پیدا ہو ۳۸۷ھ میں باپ کے انتقال پر بادشاہی تخت

---

(۱) نام ونسب محمود بن سبکتگین، سلطنت غزنین کا دوسرا بادشاہ۔ دادا کا نام قرا بحکم اصل نام جوق ترکی میں بحکم بمعنی شور وغوغا اور قرا رسیاہ کو کہتے ہیں۔ یہ نام اس کے رعب وہیبت کی وجہ سے پڑگیا سلسلۂ نسب یہ ہے محمود بن سبکتگیں بن جوق قرا بحکم بن قرار سلان بن قرابات بن قرالقمان بن فیروز بن یزدجرد

پر بیٹھا۔ خلیفۂ وقت قادر باللہ نے یمین الدولہ امین الملۃ محب امیر المومنین کا خطاب عطا فرمایا۔ محمود کے حوصلے اور ارادے اپنے باپ سے بھی بلند تر تھے، زمانہ مابعد اسلام میں یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا، تھوڑے سے عرصے میں اس نے اس قدر طاقت و اقتدار حاصل کر لیا کہ خود دربار خلافت میں اس کے نام سے ہیبت طاری ہو جاتی تھی، اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ ہر سال جہاد کریگا چنانچہ ہندوستان پر اس نے کم وبیش سترہ حملے کئے۔ خود تمام ایران اور وسط ایشیا اُس کے زیرنگیں تھا۔ ہندوستان میں شمالی ہند کے تقریباً مشرقی علاقے تک اُس کے حملوں سے محفوظ نہ رہے چنانچہ بنارس بھی اس کے مفتوحہ علاقے میں شامل تھا۔

محمود کے جہاد کی حقیقت پر بہت کچھ بحث کی گئی ہے عام طور پر یہ خیال ہے کہ محض مذہبی جوش اور اشاعت حق کا خیال ان حملوں کا موجب تھا۔ ایک جدید خیال یہ ہے کہ محمود کے ان حملوں کو ہرگز کوئی مذہبی حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ جہاد کے پردے میں ہندوستان کی بے اندازہ دولت کی طمع تھی جو اسے بار بار حملے کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس لئے کہ ہندوستان میں اگر اُس نے کوئی بھی ایسی بات نہیں کی جس سے اشاعت دین و مذہب کا ثبوت ملتا ہو، نہ اُسکا رویہ کچھ ایسی جاذبیت رکھتا تھا جو ہندوؤں کو قبول اسلام کی جانب مائل کرتا برخلاف اس کے وہ ہر بار ہندوستان سے بیشمار مال و دولت گھسیٹ کر لیجاتا اور بجائے اس کے کہ اس روپیہ کو مذہبی کاموں میں خرچ کرتا یا ہندوستانیوں کے فائدے کے لئے خود ہندوستان پر خرچ کرتا۔ اس نے اس بے شمار دولت سے ایران کی ترقی وتعمیر کا کام لیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے ہندوستان کی بعض مشہور عبادتگاہوں کو تباہ کیا جو مرکزی حیثیت رکھتی تھیں لیکن اس میں کسی مذہبی جذبہ کو دخل بہت کم تھا اُس زمانہ میں مذہبی عبادتگاہیں زروجواہر سے پر ہوتی تھیں سومناتھ کے مندر کی بربادی اس لئے نہیں ہوئی کہ محمود کا جذبہ ایمان اُسے اس بربادی پر مجبور کر رہا تھا بلکہ اس کو منہدم کر کے اس نے لاکھوں اور کروڑوں

روپیہ کی دولت حاصل کی۔

بعض مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ چونکہ وہ غلام در غلام تھا اس لئے اس عیب پر پردہ ڈالنے کے لئے اُس نے جہاد کی پالیسی اختیار کی تاکہ اس کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے اوصاف اس کی بدنسلی کے عیوب پر پردہ ڈالدیں، اور لوگوں کی نظریں اُس کی ذات پر پڑنے کی بجائے اُس کے افعال پر پڑیں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس کی ان فتوحات کا موجب دراصل ایران کی تمدنی نشوونما کا تخیل تھا وہ خود ایرانی تہذیب و تمدن کا بہت بڑا علمبردار تھا، ایران کی ترقی اور نشوونما کے لئے جس قدر کامیاب جدوجہد اُسکے زمانے میں ہوئی اس سے پیشتر کبھی نہ ہوئی تھی، فردوسی کا "شاہنامہ" جو فارسی دنیا کی ادبیات میں ایک عظیم الشان اور عدیم النظیر کارنامہ ہے اُسی کے زمانہ میں اور اُسی کے حکم سے تصنیف ہوا علاوہ اس کے ایرانی شاعروں کی اس نے حیرت انگیز طریقہ پر حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے فارسی شاعری انتہائے عروج پر پہنچ گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمود نے اپنی طاقت کے بل پر تمام ایران اور وسط ایشیا کو زیر اثر اور زیرنگیں کرلیا تھا، ہندوستان پر اس کے بعض حملے نہایت کامیاب ہوئے، اُس نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں بڑی بڑی بہادر قوموں کو نیچا دکھایا بلکہ بے اندازہ مال و دولت بھی حاصل کی لیکن باوجود اس کے ہمیں اس کو ایک کامیاب فرماں روا تسلیم کرنے میں تامل سے کام لینا چاہئے یہ سچ ہے کہ اس نے ہندوستان کی بڑی بڑی قوتوں کو شکست دی بڑے بڑے اہم معرکوں میں کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہا ہندوستان کی مرکزی عبادتگاہوں کو مسمار کیا، لیکن انتظامی صلاحیت کے فقدان کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ وہ باوجود اس قدر زبردست اور پیہم فتوحات کے ہندوستان پر کبھی مستقل قبضہ نہ کرسکا۔ درحقیقت ہندوستان میں اس کی فتوحات

ایک سیلاب تھا کہ آیا اور بہت سے قلعوں کو مسمار بہت سی عمارتوں کو منہدم اور بہت سے شہروں کو تباہ و برباد کرکے گذر گیا۔ خود ایران اور غزنین میں اُس کی حکومت مستقل بنیادوں پر قایم نہ تھی ایران کی چھوٹی چھوٹی خاندانی حکومتوں کے استیصال میں اُسے پورے طور پر کامیابی نہیں ہوئی تھی یہ محض محمود کی ہیبت تھی کہ اُس کے زمانے میں ایران میں ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں نے سر نہیں اٹھایا۔

اسکے مرنیکے بعد اُسکے جانشینوں نے اور بھی نا قابلیت کا ثبوت دیا سعود نے بیشک کچھ عرصہ تک کامیابی سے حکومت کی لیکن صرف احمد بن حسن میمندی کے بل بوتے پر جب تک احمد بن حسن میمندی اُسکا وزیر تھا اور تمام انتظامی امور انکے ہاتھ میں تھے حکومت کا کام بھی ایک ڈھرے پر چلتا رہا اور اسکے مرنیکے بعد حکومت میں بھی ایک ابتری پیدا ہوگئی خود محمود کا دربار جنرلوں اور مدبروں سے خالی تھا اور اگر بہتات تھی تو وہ علماء اور شعرا کی حسن میمندی بیشک ایک اچھا عالم اور مدبر تھا (اگرچہ اسکو بھی نظام الملک طوسی اور تاریخ کے دوسرے مشہور سیاسی مدبروں کے مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا) لیکن اُسے بھی کسی بات سے ناراض ہوکر ہندوستان کے جیلخانوں میں ڈلوا دیا۔ جنگی معرکوں میں محمود کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود ایک اچھا دلیر اور بہادر سپاہی تھا۔ معرکہ کارزار میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتا اُس کے سپاہیوں میں اس قدر غلط مذہبی جوش بھرا ہوا تھا کہ وہ اپنی جان ہتیلی پر لئے پھرتے تھے ان میں شجاعت تھی مگر تھوڑے سے لبریز، یہی وجہ تھی کہ مخالفین کے دلوں میں محمود اور اس کی فوج کا خوف اور ہیبت بیٹھی ہوئی تھی اور وہ جہاں پہنچتا تھا فتح و نصرت اُس کے قدم چومتی تھی۔ تاہم یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اپنے عہد حکومت کے طویل عرصہ میں وہ ایک جنرل بھی پیدا نہ کرسکا۔

محمود کی جنگی و انتظامی قابلیتوں پر تنقید و تبصرہ ایک طویل بحث کا محتاج ہے جس کو ہم کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں، لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ محمود کو ایک کامیاب حکمراں یا کامیاب جنرل کی حیثیت کسی طرح نہیں دیجاسکتی بے شک وہ ایک اچھا سپاہی تھا اور اسی سپاہیانہ سرگرمی اور جوش عمل نے اس کو اس مرتبہ پر پہنچا دیا۔ لیکن

جنگی اور انتظامی نقائص اور خامیوں کے ساتھ ساتھ اُس میں چند لایق رشک خوبیاں بھی تھیں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وہ ایرانی تہذیب و تمدن کا بہت بڑا علمبردار تھا اس نے ایرانی ادبیات اور ایرانی شعرا اور علما کی جیسی سرپرستی کی ہے ایران کے کسی دوسرے حکمراں کو اس کے مقابلے میں بہ مشکل لایا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ محمود کو جس زمانہ میں عروج ہوا وہ عربی اثرات کے خلاف ردعمل اور ایرانیت کے نشو و نما کا زمانہ تھا ایرانیوں میں رفتہ رفتہ زندگی و بیداری کا احساس پیدا ہو رہا تھا وہ عربوں کی غلامی کے جوے کو اتار پھینکنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے دولت عباسیہ کے ضعف و انحطاط نے انہیں اور بھی اس کا موقع دیدیا تھا ایران میں آئے دن نئی حکومتیں قائم ہو رہی تھیں ایران کے وہی امرا جو پہلے دربار خلافت کے حلقہ بگوش تھے اب خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے تھے وہ نہ صرف ظاہری غلامی سے بیزار تھے بلکہ ذہنی غلامی سے بھی آزادی کی کوشش کر رہے تھے۔ عربوں کی شاگردی کو وہ اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے حالانکہ یہ انکی کھلی ہوئی ناسپاسی اور ناشکر گذاری تھی عربوں نے انہیں وحشت و جہالت کی تاریکیوں سے نکالا انہیں ایک شائستہ اور متمدن قوم بنایا وہ صدیوں سے نکبت و ادبار کی گہرائیوں میں پڑے ہوے تھے اور گویا اُن پر سکرات کا عالم طاری تھا عربوں نے ایسے وقت میں انکی مسیحائی کی اور انہیں ایک زندہ قوم بنا دیا۔ علوم و فنون اور ادب غرضکہ سب کچھ انہوں نے عربوں سے حاصل کیا۔ حتی کہ انکی شاعری پر عربوں کے زبردست احسانات ہیں فارسی شاعری میں عربی شاعری کی حرف بحرف تقلید کی گئی بلکہ شروع شروع میں تو ایرانی شاعر عربی شاعری کے مضامین کا کھلا ہوا سرقہ کرتے تھے شعر العجم میں آپ کو اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ غرضکہ باوجود اس قدر زبردست احسانات کے جب ایرانیوں کے قومی احساسات بیدار ہوئے تو انہیں عربوں سے انتہائی نفرت ہو گئی اور قومیت کے جذبے نے آخر کار تعصب کی شکل اختیار کر لی فردوسی نے "شاہنامہ" میں ایک سے زائد موقعوں پر اپنی اس نفرت کا اظہار کیا ہے چنانچہ ایک موقعہ پر وہ کہتا ہے۔

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار   عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاج کیاں را کند آرزو   تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

"شاہنامہ" کی تصنیف کا خیال صرف اسی غرض سے نہ تھا کہ اسلاف کے کارناموں کو زندہ کیا جائے بلکہ ایک مقصد یہ بھی پیش نظر تھا کہ رستم وسہراب فریدوں اور کیخسرو کو عربی ابطال کے مقابلے میں پیش کیا جائے اور ان کو ترجیح دیجائے۔ انکے دلوں میں رستم وسہراب کی جو عزت و وقعت تھی وہ خالد بن ولید اور سعد بن وقاص کی ہرگز نہ تھی وہ اپنے کلام میں دلیری و بہادری کی تشبیہہ خالد سے یا جود وسخا کی حاتم سے دینا باعث ننگ و عار سمجھتے تھے غرضکہ اس وقت ایرانی قومیت کی نشو ونما کی رفتار بہت سرعت کے ساتھ ترقی پذیر تھی۔ محمود نے بھی اس میں بیش از بیش حصہ لیا اُس کی جنگی فتوحات بھی اسی ملکی نشو ونما کے زیر اثر تھیں، ہندوستان میں سال بہ سال حملے کا مقصد اسلام کی ترویج واشاعت تو بہرحال ہرگز نہ تھا بلکہ غالباً اس مذہبی جہاد کے پردہ میں اصلی غرض یہ تھی کہ ایرانیت کی توسیع اور ایرانی تہذیب وتمدن کی اشاعت ہو۔

وہ خود بھی اچھا خاصہ عالم اور شاعر تھا مذہبی علوم میں بھی خاصی دسترس تھی مولانا شبلی لکھتے ہیں:۔

"محمود جس طرح فاتح اور کشورستاں تھا اسی طرح علم وفضل میں بھی کمال رکھتا تھا "جواہر مضیئہ" جو فقہائے حنفیہ کے حالات میں ایک نہایت مستند کتاب ہے اس میں اس کو فقہا میں شمار کیا ہے فقہ میں خود اس کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے"

اس کی شاعری کے متعلق ایک ایرانی تذکرہ نویس لکھتا ہے:

شاعری کا نہ صرف ذوق تھا بلکہ خود شاعر تھا ایک کنیزک سے اُسے خاص محبت تھی

(۱) شعرالعجم جلد اول

اس کے انتقال کی جب اُسے یک بیک خبر پہنچائی گئی تو اسے دلی اذیت ہوئی اور
اس کے مرثیہ میں یہ اشعار کہے

ناتوا ے ماہ زیر خاک شدی	خاک ۔ ابر سپہر فضل آمد
دل جزع کرد گفتم اے دل صبر	این قضا از خداے عدل آمد
آدم از خاک بود خاکی شد	ہر کہ زو زاد باز اصل آمد

"جب سلطان کا بالکل آخری وقت آن لگا اور اُسے اپنی موت کا یقین ہوگیا تو
اس وقت اس نے مندرجہ ذیل اشعار میں خود اپنی نوحہ گری کی"۔

زبیم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشاے	جہاں مسخر من شد چو تن مسخر راے
گہے بعز و بدولت ہمی نشستیم شاد	گہے زحرص ہمی رفتے زجاے بجاے
بے تفاخر کردم کہ من کسے ہستم	کنون برابر بینم ہمی امیر و گداے
اگر دو کلۂ بوسیدہ درکشی زد و گور	بسر امیر کہ داند زکلہ گراے
ہزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست	بسے مصاف شکستم بیک فشردن پاے
چو مرگ تاختن آور ہیچ سود نکرد	بقا بقاے خدایست و ملک ملک خداے[1]

علم و ادب کی سرپرستی میں اُس نے جنگی فتوحات سے کم انہماک سے کام نہیں لیا
شہر غزنین کو تھوڑی مدت میں علم و فن کا شاندار مرکز بنا دیا۔ شہر میں ایک عظیم الشان جامعہ یا
کالج قائم کیا۔ اس جامعہ کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا جس میں تمام دنیا کی نادر چیزیں
فراہم کی گئی تھیں۔ خود اس کے دربار میں وقت کے بہترین شاعر اور عالم و فاضل موجود
تھے، علما اور شعرا کی سچے دل سے قدردانی کرتا تھا اور اُنکا یہانتک احترام کرتا تھا کہ بعض
اوقات ابوالخیر الحسن بن سوار البابا المعروف با بن الخمار کے سامنے زمیں بوس ہو جاتا تھا۔[1]

---

(۱) البیرونی

ایک ایرانی تذکرہ نویس لکھتا ہے۔

"تمام جنگی مشاغل کے باوجود علما، کی تربیت سے غافل نہیں تھا انکی حوصلہ افزائی میں کبھی دریغ نہ کرتا، اُسے علمار کی صحبت کی سچی خواہش تھی اُن پر گرانقدر صلوں اور انعامات کی بارش کرتا اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر ایک نے اپنے مقدور بھر اُس کے نام اور اس کے کارناموں کو غیر فانی بنا دیا عبدالجبار عتبی نے تاریخ یمینی کے نام سے اس کی ایک تاریخ لکھی ہے غرضکہ اس کی علم دوستی میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں۔

اہل علم سے فیض صحبت حاصل کرنے کے لئے وہ ہر ممکن جدوجہد سے کام لیتا تھا یہاں تک کہ جنگ وجدال پر بھی آمادہ ہو جاتا تھا۔ خوارزم شاہیوں سے اس نے محض اس وجہ سے جنگ کی کہ بو علی سینا اور البیرونی کو حاصل کرے چنانچہ خوارزم فتح کر کے البیرونی کو وہ اپنے دربار میں لے آیا۔

سب سے زیادہ توجہ اُس نے شاعری پر کی اُس کا ایک علحدہ اور مستقل محکمہ قائم کیا اس محکمہ کا افسر ملک الشعرا عنصری کو بنایا گیا دربار کے دوسرے شعرا کو حکم تھا کہ اپنے اشعار عنصری کو دکھا کر پھر دربار میں پیش کریں، شاعروں کے کلام کو وہ ہاتھوں ہاتھ لیتا ایک ایک قصیدہ بلکہ ایک ایک شعر پر بیش قرار انعامات دیتا، ایک مرتبہ شہزادہ مسعود کی خراسان سے غزنین میں آمد پر دربار عام منعقد ہوا، شعرا نے اپنے اپنے قصائد پیش کئے۔ اس موقع پر ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور عنصری اور زینتی کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا ہوئے، عنصری کو ایک رباعی پر حکم دیا کہ منہ جواہرات سے بھر دیا جائے، غضائری کو صرف دو شعروں پر دو توڑے ملے وہ خود کہتا ہے۔

مراد و بیت مود شہر یار جہاں	براں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ بفرستاد دو ہزار درہم	برغم حاسد و تیمار بد سگال نکال

محمود کی شاہانہ فیاضیوں نے عنصری کو اس مرتبہ تک پہنچا دیا کہ چار سو زریں کمر غلام

اس کی رکاب میں چلتے سفر کرتا تو اس کا ساز و سامان چار سو اونٹوں پر بار ہوتا، شعرا اس کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے تھے محمود کا لبقاے نام بھی اسی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے نظامی عروضی کہتے ہیں:۔

بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد — کہ از رفعت ہمی با مہ ندا کرد

نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برپائے — مدیح عنصری ماندا ست برجائے

غزنی کی دولت و جاہ کی یہ نوبت پہنچی تھی کہ بیس زریں کمر غلام رکاب میں چلتے عفاری جب تک وطن میں رہا اُس کے ہر قصیدہ پر بیس ہزار اشرفی مقرر تھی فردوسی کو جب شاہنامہ نظم کرنیکی خدمت تفویض ہوئی تو ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی کا صلہ مقرر ہوا محمود کی اس علم پرستی اور قدر افزائی کو دیکھکر تمام شعرا اس کی طرف جھک پڑے حتیٰ کہ اس کے دربار کے شعرا کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی۔ علاوہ شعرا کے دربار میں ہر مذہب و ملت کے اہل کمال موجود تھے۔

محمود غزنوی پر الزامات | محمود غزنوی کے خلاف دو ایک نہایت سنگین الزامات بھی لگائے گئے ہیں جن میں سب سے اہم فردوسی کو موعودہ[1] صلہ نہ دینے کا واقعہ ہے اس واقعہ کی تفصیل میں ایرانی تذکرہ نویسوں کا اس قدر اختلاف ہے کہ ہمیں اصل واقعہ کے تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے، اگر واقعہ کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ہمارے خیال میں محمود کا اتنا قصور نہیں جتنا ظاہر کیا جاتا ہے، بلکہ واقعات سے جہاں تک نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اہل دربار کی دراندازیوں کو اس میں زیادہ دخل ہے ورنہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا فراخ حوصلہ فرمانروا جس کی علمی قدردانیاں اور فیاضیاں عدیم النظیر ہیں وہ بلا وجہ اس طرح اپنے وعدے سے پھر جائے اور بجائے "سونیکے پھلوں" کے "چاندی کے پھول" بخش کرے لیکن اگر بفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ روپیہ کا لالچ اس کی علمی قدردانی پر غالب آگیا تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ علمی قدردانی کا جذبہ اس عارضی جذبہ سے دب نہ سکا اور آخر کار اس نے موعودہ رقم

---

[1] تفصیلی نوٹ آئندہ نمبر میں،

دوبارہ بھجوائی گووہ فردوسی تک نہ پہنچی

محمود غزنوی پر دوسرا الزام یہ ہے کہ اُس نے البیرونی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا ایک دفعہ اُسے غزنین کے قلعہ میں چھ ماہ کے لئے قید کر دیا[1]۔ اور پھر ہندوستان میں

---

(۱) محمود کی بدسلوکی کا ایک واقعہ چہار مقالہ میں درج ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

یمین الدولہ سلطان محمود بشہر غزنین بر بالائے کوشکے در چہار دری نشستہ بود بباغ ہزار درخت روے با بوریحاں کرد و گفت من ازیں چہار در از کدام در بیروں خواہم رفت، حکم کن و اختیار آں بر پارۂ نویس و در زیر نہالی من نہ وایں ہر چہار در راہ گذر داشت، ابوریحاں اصطرلاب خواست وازتقام بگرفت وطالعے درست کرد وساعتے اندیشہ نمود و بر پارۂ کاغذ بنوشت و در زیر نہالے نہاد، محمود گفت حکم کردی ؟ گفت کردم، محمود بفرمود تا کنندہ دستہ و بیل آوردند بر دیوارے کہ بجانب مشرق است درے بکندند وازاں در بروں رفت وگفت آں کاغذ پارہ بیاوردند بوریحاں بروے نوشتہ بود کہ ازیں چہار در ہیچ بیروں نشود و بر دیوار شرق درے بکنند وازاں در بیروں شود محمود چوں بخواند طیرہ گشت، گفت اورا بمیان سرائے فرو اندازند چناں کردند مگر بابام میانگین دامے بستہ بود بوریحاں بر آں دام آمد و دام بدرید و آہستہ بزمین فرود آمد چنانکہ بروے افگار نشد محمود گفت اورا بر آرید، بر آوردند، گفت با بوریحاں ازیں حال بارے ندانستہ بودی، گفت اے خداوند دانستہ بودم، گفت دلیل کو ؟ غلام را آواز داد و تقویم از و بستد، و تحویل خویش از میان تقویم بیروں کرد در احکام آں روز نوشتہ بود کہ ازجائے بلند بیندازند ولیکن بسلامت بزمین آیم و تندرست برخیزم، ایں سخن نیز موافق راے محمود نیامد طیرہ ترگشت، گفت کہ اورا بقلعہ برید و باز دارید اور ابقلعہ غزنین باز داشتند و شش ماہ در آں حبس ماند

چہار مقالہ مطبوعہ لیڈن صفحہ ۵۷

جلاوطن کر دیا۔ غرضکہ البیرونی کے ساتھ اسکا رویہ کسی طرح بھی قابل تقلید نہیں کہا جا سکتا لیکن ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ البیرونی کے ساتھ محمود نے جو کچھ رویہ اختیار کیا وہ خاص حالات کے ماتحت تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ محمود کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کا نام مسعود تھا چھوٹے کا محمد۔ محمود کی خواہش تھی کہ محمد کو اپنا جانشین بنائے لیکن اس کے لئے خلیفہ کی تصدیق سب سے اہم اور ضروری چیز تھی تاکہ اگر بعد کو مسعود کی جانب سے ادعاے حکومت ہو تو محمد کو دربار خلافت سے ہر قسم کی تائید حاصل ہو۔ اس زمانے میں مذہب قرامطہ کا بہت زور شور تھا یہ چونکہ ایرانی دماغ کی پیداوار ہے اس لئے اسکا مرکز بھی قدرتی طور پر وہیں ہونا چاہئے تھا چنانچہ ایران کے بڑے بڑے علما پر قرمطی ہونیکا شبہ کیا جاتا تھا محمود کے پاس متعدد با دربار خلافت سے احکام پہنچے کہ اس فتنہ کو دبایا جائے اور جن لوگوں کے متعلق شبہ ہو ان کو سزا دیجائے، محمود، کچھ تو خلافت کے احکام سے مجبور ہو کر اور کچھ خلیفہ کی خوشنودی اور تائید حاصل کرنے کے لئے اس قسم کی حرکات کر بیٹھتا تھا۔ البیرونی چونکہ فلسفی تھا اور اس وقت یہ چیزیں کٹر علما کی نظروں میں ایک شخص کو مشتبہ بنانے کے لئے کافی تھیں اس لئے البیرونی خاص طور سے محمود کی ان حرکات کا نشانہ بنا لیکن یہ عرض کرنیکی ہم پھر جرأت کریں گے کہ محمود کا یہ طرز عمل اختیاری نہ ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ البیرونی محمود کے بعد اسی خاندان کے دامن دولت سے وابستہ رہا اور اپنی ساری عمر اسی حکومت کے زیر سایہ گزاری۔

مضمون بہت طویل ہوتا جاتا ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ محمودی دربار کے شعرا اور علما کے مختصر حالات اور انکے علمی و ادبی کارناموں پر ایک نگاہ ڈال لیں

فردوسی | ترتیب کے لحاظ سے مناسب تو یہ تھا کہ پہلے عنصری کے حالات لکھے جاتے اس لئے کہ عنصری محمود کے دربار کا ملک الشعرا ہے اور فردوسی کی رسائی محمود کے یہاں بہت بعد میں ہوئی ہے لیکن چونکہ فردوسی محمود کے دربار کا ہمارے نزدیک سب سے بڑا شاعر ہے اسلئے اس اہمیت کی وجہ سے ہم اس کے ذکر کو سب پر مقدم رکھتے ہیں۔

نام ونسب | حسن بن اسحاق بن شرف نام فردوسی تخلص طبرستان کے نواحی میں باژ یا شاداب نام ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ گھر سے خوشحال تھا اس لئے اطمینان کے ساتھ علمی و ادبی مشاغل میں منہمک رہتا تذکرہ نویسوں نے فردوسی کی جانب تمام شاعروں سے زیادہ توجہ کی ہے لیکن افسوس ہے کہ باوجود اس قدر توجہ کے اُس کے حالات میں سخت اختلاف ہے مختلف فیہ روایات کی تفصیل اور ان پر جرح وتنقید کا یہ موقع نہیں بہر حال اتنا ثابت ہے کہ فردوسی نے محمود کے دربار میں آنے سے پیشتر شاہنامہ کی بنیاد ڈالدی تھی اور اس کا کچھ حصہ نظم بھی کرلیا تھا دوسری طرف محمود کو شاہنامہ نظم کرانیکی فکر تھی۔ چنانچہ یہ اہم خدمت اس نے دربار کے چند مشہور شعرا عنصری وغیرہ کے سپرد کی تھی، لیکن بعد کو فردوسی کی رسائی دربار میں ہوگئی، اُس نے کچھ نظمیں لکھکر بطور نمونہ کے محمود کی خدمت میں پیش کیں محمود نے فردوسی کو اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں پایا۔ اور یہ خدمت اسی کو تفویض ہوئی۔

شاہی محل کے قریب ایک مکان بھی دیا گیا جو تمام ضروری ساز وسامان آلات جنگ اسلحہ حرب، شاہان عجم اور بہادروں اور پہلوانوں کی تصاویر سے آراستہ تھا۔ فردوسی نے کئی سال کی مسلسل محنتوں کے بعد اس اہم کام کو انجام دیا۔

لیکن باوجود اس شدید محنت کے فردوسی کی حسب دلخواہ ہمت افزائی نہ ہوئی بلکہ جیسا کہ اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے محمود کی جانب سے وعدہ خلافی کی گئی اور بجائے ۶۰ ہزار سرخ دینار کے ۶۰ ہزار سفید درہم پیش کئے گئے، اس واقعہ کا ہم محمود کے بیان میں تذکرہ کرچکے ہیں اس لئے یہاں اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

شاہنامہ کے ماخذ کے متعلق بھی ایسا ہی اختلاف ہے، علامہ شبلی نے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ فردوسی کے وقت تک ایرانی تاریخ کا بہت کافی ذخیرہ عربی میں منتقل ہوگیا تھا ابن مقفع نے متعدد فارسی تاریخوں کا ترجمہ کیا تھا۔ عربی زبان کے مصنفین نے ایران کی جو تاریخیں لکھیں انہیں ترجمہ شدہ کتابوں سے مدد لیکر لکھیں، دقیقی کے زمانے میں ایرانی تاریخ کا معتدبہ

سرمایہ فراہم ہو چکا تھا، دقیقی نے سامانی خاندان کی فرمائش سے شاہنامہ لکھا۔ سامانیوں کا کتب خانہ اس وقت عالم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا بو علی سینا نے جب یہ کتب خانہ دیکھا تو اس پر حیرت چھا گئی اور اعتراف کیا کہ ایسا عظیم الشان کتب خانہ اس سے پہلے اس کی نظر سے نہیں گزرا اور نہ آئندہ امید ہے اس کتاب خانہ میں یقیناً دقیقی کے لئے بھی پورا مسالہ فراہم کیا گیا ہوگا۔ اور دقیقی نے اسی کو سامنے رکھکر شاہنامہ کی بنیاد ڈالی ہوگی۔ محمود غزنوی سامانیوں کو مٹا کر انکا جانشین بنا تھا اس لئے اغلباً یہ تمام سامان اس کے قبضہ میں آیا ہوگا اور فردوسی کو بھی اس سے فائدہ اٹھانیکا موقعہ ملا ہوگا لیکن خود فردوسی کو اس سے انکار ہے اس کا قومی غرور عرب کا اس قدر احسان اٹھانا بھی گوارا نہیں کرتا، چنانچہ فردوسی نے دعوے کیا ہے کہ قدیم زمانے کی ایک مبسوط تاریخ موجود تھی لیکن مرتب نہ تھی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزا تھے

(باقی)

ہندوستان میں فن کا دورِ جدید

(۲)

ٹیگور اور ٹیگور کے شاگرد و خوشہ چیں

لیکن ہم کیا کریں، کہاں جائیں اور کس سے کہیں؟ پرانے اب بیحد پرانے ہو لئے اور نئے ہیں کہ بیحد نئے۔ ہماری ان تک اور انکی ہم تک رسائی دشوار۔ ہم کو چاہیئے کہ ہم جو کچھ ہو چکا ہے اس کو دیکھیں اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو دیکھیں۔ اچھا، بُرا، سب لیکن کچھ کہیں تو جب کہیں کہ بن کہے نہ بنے، اور اپنے انداز سے اپنی آواز میں کہیں، ہم کو چاہیئے کہ اس طرح چلنا سیکھیں جس طرح بچہ چلنا سیکھتا ہے۔ گریں پڑیں لیکن چلیں تو اپنے پاؤں چلیں۔ تعمیر؟ یہ ایک بڑا لفظ ہے اور بڑے الفاظ جس قدر کم استعمال ہوں اتنا ہی اچھا۔ یہ تو آنے والوں کا حق ہوگا کہ وہ ہمارے کئے ہوئے کو دیکھیں، اور پرکھیں کہ ہم نے کیا کیا ہے اور ہم اپنے اسلاف کے فنی ورثہ اور اپنے موجودہ ماحول سے کہاں تک مستفید ہوئے ہیں۔ آیا ہم نے ایک بے بساط اسکول کے لڑکے کی طرح محض کتاب یا ہمسائے کی کاپی سے نقل کر دیا ہے یا یہ کہ اس میں کچھ ہماری جان اور ہماری روح کا بھی افشردہ ہے جو انکے لئے فخر کا باعث ہو سکے۔ آج دنیا تمام دوسری قوموں سے ہمارے لئے کہیں زیادہ فنی عروج کے امکانات سے پر ہے۔ بشرطیکہ ہم ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

اور ہم میں ایک شخص ایسا بھی موجود ہے جس نے ہم کو راستہ دکھلا دیا ہے۔

کم ہیں آج ایسے لوگ جو ابا نندر ناتھ ٹیگور کی فنی عظمت کی صحیح انتہا سے واقف ہوں۔ حال و ماضی کی دیوانی ہانڈی سے انہوں نے ایک ایسے طرز کی بنیاد ڈالی جو انوکھا اور

انکا اپنا ہے اور جس میں سراسر انکی شخصیت جلوہ گر ہے۔ انہوں نے اجنٹا جاکر پرانوں کی روٹیاں نہیں توڑی ہیں۔ منغص ہو جاتی ہے طبیعت آج کل کے فنی قلانچوں کو اجنٹا کی بے حجابانہ و بے ہنگام گداگری کرتے دیکھ کر۔ ٹیگور نے جو چین اور ہندوستان کے فنی کارناموں کے مصر اور مغل قلم کے دلدادہ تھے جب رجوع کیا تو اپنی طرف رجوع کیا، اپنے اندر کی طرف لوٹے، اپنا خون جگر دنیا کے سامنے پیش کیا، بنایا تو اپنا بنایا اور روح ڈالی تو اپنی روح ڈالی جب یہ سب کچھ ہو جائے تب تصویر تصویر کہلائے اور بنانے والا مصور۔

اس سے یہ مطلب نہیں کہ ٹیگور کے یہاں ہم کو اجنٹا کے آب و نمک اور مغل اسکول کی پرکاریوں کی جھلک، یا راجپوت اسکول کی روحی پابندیوں اور چین کی آزادہ روی کے پرتو نظر نہیں آتے یا انکے فن میں یورپ کے طرز نو کی دیوانگی اظہار اور اس کے پرانوں کے وقار کے عنصر نہیں ملتے۔ ٹیگور کی آنکھوں نے سب کچھ دیکھا ہے اور ٹیگور کے ہاتھوں نے سب سے لیا ہے لیکن یہ سب کچھ لے دے کے وہ پھر اپنے اندر کی طرف لوٹے ہیں۔ بنایا ہے تو اپنے اندر سے بنایا ہے اور رنگ و نقش کے مجسموں میں جان ڈالی ہے تو اپنی جان ڈالی ہے۔ اور جو کامیابی ٹیگور کو اس طرز نو میں ہوئی ہے وہ دنیا کے سامنے موجود ہے۔ جس کو خدا نے آنکھیں دی ہیں وہ دیکھے اور لطف اندوز ہو۔ ٹیگور آج دنیا میں اگر سب سے بڑا مصور نہیں تو بڑوں کا ایک بڑا ضرور ہے۔ اور ٹیگور نٹوں[۱] میں کا ایک نیا ہے جس طرح کہ فرانس کا مایۂ ناز مصور رنوار[۲]، جو چند سال ہوئے اسی برس سے کچھ اوپر ہو کر مرا نٹوں کی صف میں شمار ہوتا تھا۔ ٹیگور کے مقابل انسان یوروپ کے نٹوں میں سے اور کس کس

---

(۱) نٹوں سے مراد ہے یوروپ کے فنی انقلاب کے بعد جو جدید روشیں قائم ہوئی ہیں انکے برتنے والے آرٹسٹ جن کو "ماڈرنز" کہتے ہیں۔ (۲) رنوار کے نام پر یوروپ کی اصطلاحات میں "امپرشنسٹ" ٹکٹ چپاں ہیں لیکن وہ فن کی ان بڑی ہستیوں میں ہے جو اسکولوں کی قیود سے بالاتر ہے۔ رنوار رنوار ہے اور بس۔

کا نام ہے ۔ سیزان[1] ! فان گوخ[2] ! گوگان[3] ! ان بیچاروں کی روحیں طوفان خیز کشمکشوں کا جولانگاہ

---

(۱) سیزان ہی فرانس کا وہ آرٹسٹ ہے جس نے "اکسپرشنزم" یعنی "اظہاریت" کی بنیاد ڈالی اور اپنی تجدید فن کی راہ میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں ۔

(۲) فان گوخ ہالینڈ کا وہ سریع الحس اور پر جذبات آرٹسٹ تھا جس کو "امپرشنزم" اور "اکسپرشنزم" کے درمیانی منازل کا راحل قرار دیا جاتا ہے ۔ اس کو شروع سے مصوری کیطرف ذرا رجحان نہ تھا چنانچہ تعلیم کے ختم ہونے کے بعد کچھ عرصے تک پادری کی حیثیت سے مامور رہا ۔ ۲۶ ، ۲۷ برس کی عمر میں پہلے پہل نقاشی اور مصوری کی طرف یک بیک رخ بدلا اور انتہائی سرعت کیساتھ فن میں ترقی اور پختہ کاری حاصل کی ۔ مصور گوگان سے انکی دوستی پہلے بہت بڑھی اور عرصے تک گو دونوں دور رہے لیکن ایک جان دو قالب کی سی صورت رہی ۔ بعد میں جب کچھ دنوں ایک ساتھ رہے تو کچھ ایسی غلط فہمیاں آپس میں حائل ہوگئیں جو ان میں نزاع کا باعث اور طرفین میں محرک یاس ہوئیں ۔ لیکن فان گوخ پر اس کا خاص طور سے نہایت گہرا اثر پڑا ۔ چالیس کے لگ بھگ اس کے حواس مختل ہوگئے ۔ اس کے کام کرنے کی یہ صورت ہوا کرتی تھی کہ ایک تصویر کے خیال کو دن دن رات رات سودے کی طرح سر میں لئے پھرتا اور بیچین رہتا یہانتک کہ یہ سودا رنگوں کی صورت میں سر سے پھوٹ نکلتا اور وہ درندانہ عجلت اور انہماک سے تصویر بنانے پر ٹوٹ پڑتا ۔ ۔ ۔ پھر یہی سودا اتنا بڑھا کہ جنون ہوگیا اور جنون بھی اس زور کا کہ اس میں اس کے رنگوں کے زور کا اندازہ لگتا تھا اور اس میں اس کی کششوں اور خموں کی قوت وبیباکی نمایاں تھی ۔ ایک دن عالم دیوانگی میں اپنا کان کاٹ کر پھینکدیا ۔ بعد میں جب حواس آئے تو خود ہی بیٹھ کر اپنی تصویر بنائی اور اس کا نام رکھا "کان کٹا آدمی" پھر بعد میں ایک دن تپنچے سے پیٹ میں گولی مار لی ۔ یوروپ والے آج اس دیوانے کو خدا کے فن مانتے ہیں ۔

(۳) گوگان کے ماں باپ فرانسیسی سے نہ تھے بلکہ ہسپانوی اور جنوبی امریکہ کے ایک شریف خاندان سے

تھیں اور انکی قسمت نہایت دردانگیز قسمت تھی۔ ان میں سے ایک پر اسکے فن کے انوکھے پن
اور شاہراہ عام سے بعد ِطبین رکھنے کی بنا پر پیرس کے جاہل عوام نے پتھر تک برسائے۔ دوسرے
نے کم عمری ہی میں پاگل ہو کر موت پائی۔ تیسرا انتہائی افلاس اور کس مپرسی کی حالت میں
وطن سے دور جزیرہ ہائے بحرالجنوب میں تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہوا، جس کی دیوانگی کی داد
اس کے سیاہ رنگ "وحشی" نوکر نے اس کی موت پر یوں بین کر کے دی کہ "اب دنیا
میں انسان نہ رہا" یہ لوگ پیمبر تھے اور جو پیغام وہ لائے اس کے لئے انہوں نے اپنی
جانیں دیں۔ وہ ہستیوں میں بڑی ہستی اور فن والوں میں بڑے فن والے تھے لیکن انکے
فن کی نوعیت تہدیمی اور انکاری تھی۔ انکے سر انیسویں صدی کے فنی جمود سے منحرف تھے
اور انکا خون انقلاب کی امنگوں سے مشتعل۔ انکو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ایک

لیکن وہ پیدا پیرس میں ہوا (۱۸۴۸ء) اور فرانس ہی میں نشو و نما پائی۔ کم عمری میں ایک عرصہ
تک جہاز رانی کی تعلیم میں لگا رہا۔ ۱۸۷۰ء کی جنگ کے بعد جہاز رانی کا سلسلہ چھوڑ کر بنک کی ملازمت
میں ہو گیا اور سات برس تک نہایت خوشحالی سے زندگی بسر کی ۲۸ سال کی عمر تک تصویر کے نام
ایک لکیر بھی نہ کھینچی تھی۔ بالکل اتفاقیہ ایک دن اتوار کی چھٹی میں سیر کو جاتے جاتے رہ گیا۔ بیٹھ کر کسی بچے
کے رنگوں کے بکس سے دفع الوقتی کے لئے تصویر بنانے لگا۔ یہ تھی ابتدا۔ مصور پیارد نے اس کی تھوڑی بہت
رہبری کی پانچ برس بعد اس کی ایک تصویر کے متعلق نقادان فن کی رائے ہوئی کہ پیارد کی
تصویروں کو یہ آن بان اور یہ زندگی نصیب نہ تھی۔ تین برس اور گزرے اور اس نے ایک دن یہ
طے کیا کہ اب اتوار اتوار نہیں اب روز چھٹی ہوگی اور روز تصویر بنے گی۔ اپنی خوشحالی کی زندگی کو خیرباد
کہا اور اس کے بدلے عسرت کے کانٹے مول لئے۔ نوکری چھوڑی اور ٹکے ٹکے کے پوسٹ کارڈ
بیچ کر زندگی بسر کی۔ ایک عرصہ بعد کچھ سستی کے خیال سے کچھ نئی اور گرم آب و ہوا، نئی اور گرم
صورتوں، نئے اور گرم حسن کی تلاش میں فرانس کی دور دراز، بحرالجنوب کے جزائر کی (ملاحظہ ہو صفحہ

حسب دلخواہ طرز کی تلاش میں کوہ کنی کرنی پڑی اور انہوں نے بے دریغ کوہ کنی کی۔ انہوں نے فطرت پرستی کی رسم رائج کی ساری قیود کو نہایت بیباکی اور دلیری کے ساتھ توڑ ڈالا اور انیسویں صدی والوں کو یہ بتلا دیا کہ تم نے بھاپ سے انجن چلائے ہوں، بجلی سے سڑکیں روشن کر دی ہوں اور تم ہوا میں گرہیں لگاتے لگاتے آسمان کے تارے تک توڑنے میں کامیاب ہو گئے ہو لیکن جہاں تک فن کا تعلق ہے جو انسانی تمدن کا اصلی جوہر اور اس کا انتہائی مقصد ہے اس میں تمہارے کارنامے اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے کہ ان کو زمین سے برابر کر کے ان پر نئی بنیادیں ڈالی جائیں، اور ایک نئی عمارت تیار کیجائے۔ پی کاسو[1] اور ماتس[2] بھی ان سے زیادہ مختلف نہ تھے گو اب بالخصوص اول الذکر "نو معروضیت" کی طرف رجوع ہو کر ایک اثباتی طرز کو ابھارنے میں کوشاں ہیں۔ اور ٹیگور بھی فن کا پیمبر ہے لیکن اس کا فن شروع ہی سے رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں اثباتی ہے انکاری نہیں اس کا فن بناتا ہے بگاڑتا نہیں، تعمیر کرتا ہے مسمار نہیں کرتا البتہ بگاڑنے اور مسمار کرنے کے لئے تھا ہی کیا جو مسمار کیا جاتا۔ پرانوں کے لئے کون جان دینے لینے پر تیار ہوتا اور مغلوں کے بعد فن کی کوئی زندہ رسم موجود نہ تھی جس کے لئے لوگ آمادہ بہ پیکار ہوتے اور جس کو ڈھائے بغیر آگے چلنا دشوار ہوتا۔ اس لحاظ سے ٹیگور کا کام سہل تر تھا۔ لیکن جتنا سہل تھا اتنا ہی مشکل بھی تھا۔ کسی زندہ رسمی طرز کے نہ ہونے اور نقادان فن کے عدم وجود نے انکو اس درجہ آزادی دیدی تھی کہ اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ برتنے کے لئے ایک پیمبر فن ہی کی ضرورت تھی اور وہ بھی ٹیگور جیسے پیمبر فن کی۔

کالونی کا سفر کیا پہلے برٹانیا پھر ہیٹی میں رہا۔ ۱۹۰۳ء میں وہیں موت پائی۔ گوگان بھی اکسپرشنزم کے اولین نمائندوں میں تھا۔ لیکن اسکا رنگ عام رنگ سے جدا تھا۔

(۱) پالو پکاسو قوم کا ہسپانوی ہے لیکن اس کی فنی نشو و نما پیرس میں ہوئی۔ یہ بھی فن مصوری کی طرف عمر کا کافی حصہ گزر جانے کے بعد رجوع ہوا۔ (۲) ماتس فرانسیسی ہے اور طرز اظہاریہ میں اس کے یہاں لذت جمال دوسروں سے کہیں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کے خاص رنگ میں لوگ اسکو پی کاسو پر ترجیح دیتے ہیں۔

دنیا کے فنوں میں ٹیگور کا پکاسو سے موازنہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ ان دونوں نے ایک نئی طرز کی بنیاد ڈالی۔ ٹیگور نے اپنے نام سے موسوم طرز فن کی اور پکاسو نے ثلثی طرز یعنی کیو بزم کی۔ لیکن پکاسو مدرس فن کی حیثیت سے ٹیگور سے بڑا ہے۔ اس کے اثر سے چارہ محال ہے اور اس کا اثر باریک تر ہوتا ہے۔ دونوں "مشاق" ہیں۔ یعنی فن کو طرح طرح سے برتتے ہیں۔ نت نئے انداز ڈھونڈتے ہیں اور نئے طرز نکالتے ہیں، لیکن مشاقی فن کے لحاظ سے بھی پکاسو ہی کا پلہ چڑھا ہے ذہین دونو نہایت درجہ ہیں لیکن پکاسو ذہن کو فن میں زیادہ استعمال کرتا ہے اور ٹیگور ذہن کی لگام اپنے جذبات کے ہاتھ میں دیتا ہے اور اپنے دماغ کو دل کی سرزمین تاراج کرنے سے عاری رکھتا ہے دونوں کے عمل میں مٹیلسزم یعنی باطنیت کا رنگ حاوی ہے لیکن اس رنگ میں اگر ہندی ہسپانی سے معمور تر ہے تو جائے تعجب نہیں۔ ان دونوں میں جو سب سے بڑا فرق ہے وہ یہ ہے کہ ٹیگور اپنی قوم کے اس دور میں پیدا ہوا ہے جبکہ وہ اپنی غلامی اور اپنے افلاس اور انحطاط کے ہاتھوں فن سے بالکل بے واسطہ اور بے بہرہ ہے اور پیکاسو اقوام یورپ کے اس دور میں جبکہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب کوش ہیں، قومی آزادی سے انفرادی آزادی کی طرف بڑھ رہے ہیں، روحی کشمکشوں میں مبتلا ہیں لیکن خوشحال ہیں اور فن کی قدر انکے یہاں تمام دوسری قدروں پر حاوی ہے۔ مگر، ع ۔ ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے ۔ جو جہاں ہے وہیں کے لئے بنا تھا اور وہیں اچھا ہے۔ وہ وہاں اور یہ یہاں۔

اب تک تو میں نے دنیا کی ایک بڑی شخصیت کا دوسری بڑی شخصیتوں سے موازنہ کیا تاکہ ہندوستان کے مایہ ناز مصور کی خصوصیات ہم پر وسیع ترین نقطہ نظر سے ظاہر ہو جائیں اور ہم کچھ سمجھیں کہ ہمارے پاس اس وقت کیا ہے

اب رہیں ہندوستان کی دوسری فنی ہستیاں اور ان میں سب سے پہلے خود ٹیگور کے پیرو، تو پیرو ہمیشہ کم بساط ہوتے ہیں۔ اگر مضامین نو کے انبار انکے یہاں ہونے بھی تو انکی نے اور لے دونوں مانگے کی۔ اور مانگے کی نے اور لے سے کوئی کہاں تک پہنچ سکتا ہے بلکہ بیشتر تو ایسے ہوتے

ہیں کہ بس استاد کے اگال کی جگالی کیا کرتے ہیں اور اسی میں زندگی کے دن گذار دیتے ہیں۔ البتہ ٹیگور کے شاگردان خاص میں سے چند افضل شخصیتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ان میں سے نندلال بوس ایک ممتاز اور پرزور شخصیت رکھتے ہیں آنکی تصویریں شلاً "ورشِ انسان کی نیند لے جاتی ہیں، ان کی معرفت واقعی معرفت ہوتی ہے اور وہ اس ارزان " ہو " سے ایک بالکل جداگانہ شے ہوتی ہے جو ہندوستان کی خود فریب قل اعوذیت پر چھائی ہوئی ہے اور جس کی ہندوستان کے بازاروں میں اس قدر مانگ ہے۔ ایک وقت تھا کہ نندلال اب سے زیادہ کرتے تھے اور اب سے کہیں زیادہ کہتے تھے۔ میرا مطلب بسیار گوئی اور بسیار کاری سے نہیں بلکہ زور کلام اور زور عمل سے۔ اب وہ اجنٹا کے ضرورت سے زیادہ پیچھے پڑ گئے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ انکی ندرت دو لنشینی اور انکی اثر آفرینی کم ہوتی جاتی ہے۔ اب بھی ان کے "کر سکتے" میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا اور آگے چلکر شاید وہ اب سے اور زیادہ "کر سکیں" لیکن مصوری کا جوہر "کر سکنا" یعنی کاریگری نہیں، بلکہ "ہو سکنا" یعنی زور ہستی ہے اور یہی ایک بڑے مصور کا تمغہ امتیاز ہوتا ہے بہت کچھ امید ہے کہ انکے اندر خودی کی دبی ہوئی آگ ایک دن پھر بھڑکے اور وہ اجنٹا کی مریدی سے پھر کر اپنی ہی طرف رجوع کریں۔

ٹیگور کے شاگردوں میں سے ایک نہایت مسرت آگیں ہستی ہے ونکٹ ٹپا۔ ٹپا کا امتیازی پہلو آنکی تصویروں کی لذت فروشی ہے۔ ان کی تصویریں ایک صریح جسمانی سرور کا باعث ہوتی ہیں۔ ہوتی ہیں یا ہوتی تھیں کیونکہ جب سے ٹپا ریاست میسور کے درباری ہو گئے ہیں تب سے ان کے یہاں بے رس مذہبیت کی سخت بھر مار نظر آتی ہے۔ انکا طرز مغل اور ٹیگور اسکول کا ایک نہایت یگانہ و پرکار امتزاج ہے گو یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ اس کے اس طرز خاص میں مغل اسکول کی جھلک نمایاں تر ہے۔ ٹپا دور حاضرہ کے ہندو اہل فن کی شاید تنہا مثال ہے جس نے مغل اسکول کی نمایاں خوشہ چینی کی ہے اور کس خوبی سے کی ہے۔ بڑی حد تک اس کی وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ ٹپا اور سمیع الزمان جو مغل اسکول کے ہمیشہ سے فدائی رہے ہیں، دونوں ایک ہی زمانے میں

کلکتے میں ٹیگور کی آنکھوں کے سامنے رہے اور انکی معلمی و مصری سے فیضیاب ہوئے۔

سمیع الزماں جو اپنے کو صناعی کہتے ہیں اور جن کے بھائی ہونے کا راقم الحروف کو شرف حاصل ہے ہندوستان کے ہمعصر مصوروں میں ایک نہایت عجیب و یگانہ شخصیت ہیں۔ انہوں نے اس استاد کے طرز نو سے جس کے سامنے انہوں نے زانوے ادب تہہ کیا کوئی حصہ ورثے میں نہیں پایا۔ یہ ایک استاد کے لئے نہایت قابل ستائش ہے۔ اپنے شخصی اثرات کو دور رکھنا اور پھر بھی رہنمائی کرنا فن کے استاد اور معلم کی انتہائی خوبی ہے۔ لیکن ٹیگور کے ان شاگرد نے حد سے زیادہ اپنا نامہ اعمال مردہ صدیوں کے ساتھ بندھوالیا ہے۔ زندہ اور آجکل والے انکے لئے دلچسپی سے بالکل خالی ہیں، وہ اس پرانے زمانے کی پرانی ریت کے قائل ہیں جب حضرت حوا پکاتی تھیں اور حضرت آدم کھاتے تھے، اور شہنشاہان مغلیہ ہمارے جزیرہ نما پر حکمراں تھے۔ یہ ایک صریحی غلطی ہے اور ایک آرٹسٹ کے لئے "خشت اول چوں نہد معمار کج" کے مصداق ایک آرٹسٹ جو زندگی حال سے بالکل بے واسطہ اور منحرف ہو اس آواز کی مثال ہے جو صحراؤں میں گونج کر گم ہو جائے۔ ان کی تصویروں کے موضوع بالعموم قدیم اور بیشتر آورد پر مبنی ہوتے ہیں۔ کہیں مجنوں کی فرسودہ حکایت ہے کہیں نورجہاں کی پیدایش کے واقعہ کا لاحاصل بیان۔ انکی ہر کہانی ایک ملبی کہانی ہوتی ہے اور ہمارا دور بے لاگ، دلنشیں اور سنگین اثروں کا قائل دور ہے۔ ان کی تصویریں ایک قصے کا مرقع ہوتی ہیں یا ایک شعر کا یا بہت سے شعروں کا۔ وہ مرقع نگار ہیں اور مرقع نگاری آرٹ میں دوسرے درجے کی چیز ہے۔ وہ مغل اسکول کی تقلید میں سرمو فرق نہیں چاہتے اور اگر اپنے رنگوں اور اپنے چہروں میں ذرا بھی اس فرق کو محسوس کرتے ہیں تو اس پر اپنی ہیچمدانی سے نالاں ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے ان غلط اصولوں کے باوجود فن کی ایک نہایت بڑی شخصیت ہیں۔ ایک طرف تو انکی باریکی قلم، جو گذرے زمانے میں تصویر کی خوبی کا سب سے بڑا معیار سمجھی جاتی تھی، عہد ماضی کے بڑے سے بڑے استادوں کے قلم کا مقابلہ کرتی ہے اور ان میں اکثر سے سبقت لیجاتی ہے، اور دوسری طرف انکے رنگ اور انکی کشش نہایت

یگانہ اور پرزور ہوتے ہیں ممکن نہیں کہ کوئی مبصر انکو دیکھے اور پہچان نہ لے کہ یہ کس کی حسن آفرینی کے جلوے ہیں۔ یہی حال انکے تازہ تر دور کے آسمانوں کی پرکاریوں کا ہے کہ آدمی آنکھیں بند کرکے کہدے کہ یہ سمیع صنعانی کا بنایا ہوا آسمان ہے۔ انکی لذت کا بیان آنکھوں اور زبان دونوں کے امکان سے باہر ہے اور وہ اپنے قائل ہیں جس طرح کم کوئی دوسرا آرٹسٹ اپنا قائل ہوتا ہے انکے نزدیک صرف انکا طرز فنی اظہار کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا طرز نہیں۔ اس معاملے میں وہ کسی سمجھوتے کے روادار نہیں اور اس میں انکے عقائد پتھر کی لکیر ہیں کہ ٹل نہیں سکتے۔ کوئی کچھ کہے وہ سب کی رائوں کو جوتے کی نوک پر مارتے ہیں اور اپنی تصویروں کو بہت کم نمائشوں میں بھیجتے ہیں۔ یہ سب انکے موافق ہے۔ یہ سب خصوصیات ایک نہایت بڑے اور سچے آرٹسٹ کی خصوصیات ہوسکتی ہیں۔ لیکن سمیع الزمان صنعانی زمانہ ماضی ہیں زمانۂ حال نہیں اور یہ کہنے میں جو نقیض عائد ہوتی ہے وہی وہ چیز ہے جو انکی شخصیت کو ایک نہایت درجہ دلچسپ فنی شخصیت بنا دیتی ہے۔

ایک اور نام خاص طور سے قابل ذکر ہے ۔چغتائی! عبدالرحمٰن چغتائی ۔ انکا ذکر کرنے سے پیشتر میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں فن مصوری کی ابتدا، اس کے عروج اور اس کی خصوصیات پر مختصراً بحث کیجائے، دنیا کی تمام قوموں کے تشکیلی فنون کی ابتدا جذبہ پرستش سے ہوئی ہے اور انکا نشو و نما انکے مذاہب کے ساتھ بالکل نہیں تو ایک بڑی حد تک وابستہ رہا ہے۔ شوق سجود سے مجبور ہوکر انسان نے مختلف آب و ہوا میں مختلف تخیلات کے مطابق مختلف قسم کی ایسی شکلیں اختراع کیں جن کو وہ پیکر ایزدی کا مرقع سمجھکر انکے سامنے سرنیاز خم کرے اور اپنے بنانے والے اور اس کے قوانین و مظاہر کی طرف سے جو ہیبت اور محبت کے جذبات اس کے سینے میں مشتعل ہوتے ہیں انکا اظہار اپنی بندگی کے اعتراف یعنی اپنی جبیں سائی سے کرے۔ وحشی اقوام کے فنی کارنامے اس خیال کے اسی طرح حامی ہیں جس طرح کہ پرانے تمدنوں کے قدیم آثار۔ ہمارے پاس مصر، چین۔ ہندوستان، یونان کی مثالیں ایک طرف اور افریقہ

کی وحشی اقوام کے تراشے ہوئے بت دوسری طرف اس قول کی تائید کے لئے موجود ہیں۔ انسانی تخیل نے ذات ایزدی کو ہندوستان میں اگر چہار دست شیوا یا تری مورتی کی صورت میں پیش کیا تو یونان میں انسانی حسن کے انتہائی امکانات کی صورت میں جس کی مثالیں اپالو زہرہ اور بےشمار دوسرے مجسمے ہیں۔ آج دیکھنے اور غور کرنے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ شوق سجود میں جس درجہ بیتابی اور جبیں سائی ہیں جس درجہ انہماک ایک قوم میں پایا جاتا تھا اسی درجہ اس کی اختراع کردہ اشکال واقعی مظہر ہوتی تھیں ذات خداوندی کی، اس کے جلال، اس کی رحمت اس کی عظمت کی۔ انسان کی صورت میں اوتار ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن ان پتھروں کی صورت میں اوتار ضرور ہوجاتے تھے اور سجدوں کا جو تلاطم ہندوستان کی پیشانی میں مضمر تھا وہ نہ یونان کو نصیب تھا نہ مصر کو اور یہی وجہ ہے کہ جس پائے کی شکلیں ہندوستان نے تراشی ہیں کسی دوسرے ملک سے ممکن نہ ہوئیں اور تخیل کی جو جسارت اس میں پیدا ہوئی کہیں اور پیدا نہیں۔ ملحوظ رہے کہ "ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں" لیکن شوق سجدہ سے جو تخلیق صورت وابستہ ہے اس کی علت و رہنما انسان کے مذہبی ولولے ہوتے ہیں اور اس میں ذہنی عنصر کی رہبری سے حصول حسن اور جمال آفرینی کا دانستہ (conscious) دخل معدوم یا کالعدم ہوتا ہے۔ انکا مسلک حسن آفرینی نہ تھا اور وہ حسن کی لذت حسن کی خاطر متلاشی نہ تھے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ہم کو انکے کارناموں میں اکثر انتہائی حسن کے نمونے نہیں ملتے بلکہ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ دانستہ اس عنصر کے متلاشی نہ تھے برخلاف ان اقوام کے جب ہم مسلمانوں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ الست کے متوالے اپنی وارفتگی توحید میں بتان آذر سے دست و گریباں ہوئے اور یہ نہ سمجھے کہ "مانو تو دیوتا، نہیں تو پتھر" یا نہ مانے تو پتھر نہیں تو دیوتا۔ اسلام میں مذہبًا یعنی بہ حکم قرآن یا بہ حکم حدیث تصویر کشی یا شکل تراشی ممنوع ہو یا نہ ہو لیکن اس کے ولولۂ توحید کا اقتضا شروع شروع لازمی طور پر یہ تھا کہ انسان اپنی شبیہ بنانے سے کنارہ کش رہے۔ چنانچہ ان کی حسن آفرینی کی امنگ جو فطرت انسانی کا ایک

لازمی عنصر ہے، ایک عرصہ تک فن نقاشی، خوشنویسی، خطاطی اور اسی قسم کی دوسری صنعتوں میں ظہور پذیر ہوتی۔ جن میں وہ دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، قلمی کتابوں کے بے شمار نمونے فارس و ترکی قالینوں کے ڈزائن مثال کے طور پر اس قول کے شاہد ہیں مزید براں یہی وجہ ہے کہ جو کامیابی فن تعمیر میں مسلمانوں نے حاصل کی وہ شاید کسی دوسری قوم کو نصیب نہیں ہوتی کیونکہ بڑے پیمانے پر چلکر انکی حسن آفرینی کی امنگ کا بھی ایک جولانگاہ تھا۔ اکثر نادان غیر مسلم مسلمانوں کی بت شکنی پر الزامات کے طومار باندھتے ہیں اور اکثر نادان تر مسلم اپنے اسلاف کی اس دیوانگی پر اس طرح نادم ہوتے ہیں جس طرح انگلستان سے واپس آئے ہوئے ہندوستانی اپنے غیر انگریزی ولی باپ کی ہستی پر نادم ہوتے ہیں۔ ہر شخص اور ہر قوم کا ایک خاص منصب اور مشن ہوتا ہے جس کے حصول میں اکثر بربادکن واقعے پیش آتے ہیں۔ ہر شخص یا ہر تمدن کو ایک ہی نقطہ نظر سے دیکھنا ایک ہی کانٹے پر تولنا اور پرکھنا انسان کی جہالت اور تنگ نظری کی دلیل ہوگی۔ اگر سومنات ٹوٹا اور تاج بنا تو اہل نظر اس کو بنی نوع انسان کے فنی و اشکالی تمول میں ایک بڑا اضافہ تصور کرینگے اہل نظر ہر کامل دیوانگی کیساتھ ہونگے خواہ وہ بت گری آذر کی صورت میں جلوہ پیرا ہو یا بت شکنی خلیل میں۔ اہل نظر تو اس کے قائل ہیں کہ وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے۔ مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو۔ البتہ وائے برحال ما کہ نہ بت گر رہے نہ بت شکن نہ کعبہ رہا نہ بت خانے۔ بہرحال شغف بت شکنی کی چند صدیوں بعد ہی سے مسلمانوں نے خوش نویسی و نقاشی کے ساتھ ہی ساتھ کتابوں میں السٹریشن کے طور پر تصاویر کو جگہ دینی شروع کی اور آٹھویں صدی عیسوی میں ہم کو عراق کے قلمی نسخوں میں سے مصوری کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن کی پرکاری اظہار اور زور قلم پر انسان کو تعجب آئے لیکن خاندان عباسیہ کے انحطاط کے بعد مصوری کی یہ روش بھی مفقود ہوگئی۔ دوسری طرف فارس میں بھی کتابوں کے السٹریشن نے رفتہ رفتہ رواج پکڑا گو ابھی میدان خوشنویسوں کے ہاتھ میں تھا اور مصور بیچارہ ایک ایسی گمنام ہستی رہا جس کا کتاب کے کسی حصہ میں عموماً ذکر نہ ہوتا۔ ترکی میں بھی باتصویر کتابوں کا رواج ہوا لیکن

ترکی اسکول بہت ہی کمتر پایہ پر رہکر ختم ہوگیا۔ البتہ فارس میں اس شعبہ مصوری نے روزافزوں ترقی کی جس کی سب سے بڑی وجہ چین کا اثر تھا۔ چین! جس کا فن نقش و تصویر میں آجتک مقابل نہ نکلا۔ چونکہ مصوری کا مقصد ہنوز یہ تھا کہ کتابوں کے قصوں کو انہیں کی جلدوں کی حدود کے اندر نقش و رنگ میں پیش کریں اس لئے یہ تصویریں لازمی طور پر مختصر ہوتی تھیں اور ان میں مصوروں کو باریکی قلم کی صنعت گری کا خاص طور پر موقع ملا۔ انکی دوسری خصوصیت انکی خوشنمائی تھی اور انکے رنگوں کی گوناگونی ـ لیکن قلب مضطرب کے ولولوں سے ابھی انکو کوئی واسطہ نہ تھا۔ بہزاد، جس کا نام میدان مصوری میں زبان زد خاص و عام ہے پہلا شخص تھا جس نے تصویر کو کتاب کی تنگ چار دیواری سے آزاد کیا اور جس نے اس جذباتی عنصر کو وہ جگہ دی جس کے بغیر تصویر ایک جسم بیجان سے زیادہ درجہ حاصل نہیں کرسکتی خواہ اس جسم میں ہزاروں بناؤ ہوں۔ یہی راز ہے بہزاد کی مجددیت فن کا، نہ کہ اس کی باریکی قلم، جس میں بہزاد سے بڑھ چڑھ کر دوسرے استاد موجود ہیں۔ فارس کے اس اسکول نے شاہان مغلیہ کے سایہ عاطفت میں آکر بہت کچھ دوسرے خط و خال اختیار کئے۔ ایک طرف تصوف اور دوسری طرف شاہانہ اور درباری زندگی کے نہایت پرزور اور نہایت درجہ باریک قلم مرقع اس زمانے کی فنی سطوت اور شان و شکوہ کے لازوال شاہد ہیں۔ معراج اس طرز تصویر کی شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں ہوئی جو فن مصوری کا اپنے زمانے میں سب سے بڑا مبصر تھا۔ مابہ الامتیاز مسلمانوں کی مصوری اور دوسری اقوام کی مصوری میں یہ رہا ہے کہ مسلمان پہلی وہ قوم تھے جس نے جمالیات کو آرٹ میں معیار اول اور معیار آخر قرار دیا اور نہایت دانستہ، اور پورے احساس کے ساتھ حسن آفرینی میں سرگرداں ہوئے۔ تصویر میں خدا پرستی چونکہ مذہبا ناممکن تھی اس لئے انھوں نے حسن پرستی اپنا مسلک ٹھہرایا۔ مسلمان نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے فنی نقاط نظر میں سے خالص جمالیاتی نقطۂ نظر کے بانی ہیں یہی انکا تمغہ امتیاز ہے اور یہی فن کی رو سے انکے وجود کا کفارہ ہے لیکن اس کل

کی بات کو خود ہندوستان کے اکثر تنگ نظر نقاد زبان پر لانے سے گریز کرتے ہیں اور آج وہ دنیا کے لئے ایک بھولا ہوا خواب ہیں اور اس سے زیادہ نہیں۔

مگر ذکر عبدالرحمٰن چغتائی کا تھا کہ ان بھولے ہوئے نقوش کا لیکن چغتائی بلکہ سمیع الزمان کے بھی سمجھنے کے لئے اس داستان کی تھوڑی سی ورق گردانی لازم تھی چغتائی آخرالذکر کی طرح مغل طرز کے مقلد نہیں۔ نہ انکے اندر وہ باریکی قلم ہے نہ انکی تصویروں کی "تیاری" میں وہ دیدہ ریزی، نہ وہ ناک نقشے نہ قد و قامت۔ انکے فن میں تین عنصر پائے جاتے ہیں، ہندی فارسی اور انگریزی۔ انگریزی سے میری مراد انگریزی ہے نہ کہ یوروپی۔ اور انگریزی عنصر میں بھی شاید کانسٹیبل کا اثر انہیں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو انکا کمزور ترین پہلو ہے۔ اور انکا زوردار پہلو انکا فارسی یعنی جمالی پہلو ہے۔ جو داستان میں اوپر بیان کر آیا ہوں اس کی حقیقت ان کی تصویر کے ذرے ذرے میں جھلکتی ہے انکی حسین کلاہ کی حسین نوک سے لیکر انکے حسین جوتے کی حسین نوک تک اور انکی حسین ناک کی نکیلی نوک سے لیکر انکی نکیلی آنکھ کی حسین نوک تک حسن ہی حسن جلوہ گر ہے۔ مگر بدن میں خون چاہو تو خون ناپید۔ ہندی عنصر انکی کوشش ہے۔ انگریزی عنصر ان کی بدمذاقی اور فارسی عنصر انکی سرشت شاید یہ انکے نہ دیکھے پن کی باتیں ہوں کہ ان میں اکثر دولاک[1] جیسے ردی و مبتذل تصویر ساز کے اسٹریشنوں سے سازباز کی ہوس کا احتمال ہوتا ہے۔ جس سے انکا پایہ کہیں بلند تر ہے۔ چغتائی کی سدا نیم باز آنکھیں اور انکے نقشوں کی نوکداری انکی مصوری کا ایسا اٹل ضابطہ ہو کر رہ گیا ہے کہ ان سے انسان کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ انکے یہاں موضوع بدلتے رہیں لیکن شکلیں نہیں بدلتیں۔ یہ انکی بڑی کم مائگی ہے۔ ایک نہ ایک ضابطہ تو خیر بڑے سے بڑے آرٹسٹ اکثر قائم کر لیتے ہیں جن کو پیش نظر رکھکر وہ کتاب یا تصویر تیار کر دیا کرتے ہیں لیکن درآں حالیکہ فن کی بڑی ہستیاں اپنے زوردار پہلوؤں کو دہراتی ہیں اور انپر مصر ہوتی ہیں، کم درجے کے آرٹسٹ اپنی کمزوریوں ہی کو اپنی قوت سمجھتے ہیں اور ان چیزوں کو جو واقعی بڑھکر پرکیف ہونے کی صلاحیت رکھتی

---

(1) Edmund du Lac کے عمر خیام کی رباعیات کے مرقعے مشہور عام ہیں

ہوں، ناقابل توجہ خیال کرتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر چغتائی اپنی مے چشم، افسردہ دل نازنینوں کو چھوڑ کر منصور کی طرح پرند یا فرانز مارک[1] کی طرح چوپائے بنانے میں اپنا وقت صرف کرتے جن میں انکو خاص ملکہ نظر آتا ہے۔ بایں ہمہ چغتائی اپنا ایک نرالا طرز رکھتے ہیں اور انکے ہمعصروں میں سے ہندوستان میں کوئی دوسرا نہیں، جس پر انکا یا جس کا ان پر گمان جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود زور اور قوت سے خالی ہونیکے وہ اس درجہ اہمیت کے مستحق ہیں مگر کاش کہ انہوں نے غالب کو انڈرسن کی کہانیوں کے جیسے مرقعوں کے بغیر چھپایا ہوتا۔ ۱
غالب کے یہاں جذبات کا تلاطم اور انکی سبز سپید بادشاہ زادیاں خون سے خالی۔ لیکن زبان اردو بیچاری جس میں اس حسن و خوبی کی کوئی دوسری کتاب نہیں ہمیشہ کیلئے ان کا احسان مانے گی۔ اور غالب خاک نشیں بھی چاہے تہ خاک تیوریوں پر بل لا کے کہیں کہ "ارے یہ کیا کیا تونے؟" لیکن جی میں خوش ضرور ہوں گے۔ غالب مصوّر کی طباعت کے دلکش خط و خال اور مرقع چغتائی کی جمال آرائیاں احساس سلیم اور احتساب تنقید کے لئے "رہزن تمکین و ہوش" ہیں اور انکے سامنے اپنی انتہائی رشوت پیش کرتے ہیں۔

اب رہے اور تو اوروں کی تعداد بہت ہے اور سب کے سروں پر تھوڑی یا بہت بڑائی کا پشتارہ بھی ہے۔ ٹیگور کے خاندان سے کئی ایک۔ ہلدار۔ اکیل۔ وکیل۔ چودہری اور بنگال کے فنی ٹھیکیداروں میں سے کئی اور۔ سنگھ اور پنجاب سے دو ایک اور حکیم محمد خاں لکھنؤ سے۔ لیکن انپر کسی مفصل تنقید کی اس مختصر سے مضمون میں گنجائش نہیں۔ ان سب میں کچھ نہ کچھ ہے اور ان میں سے ہر ایک کبھی نہ کبھی بڑے کارنمایاں کر جاتا ہے لیکن سب کے

---

(۱) Franz Marc جرمنی کا طرز تمثیلی میں مشہور ترین مصور تھا جس نے جنگ عظیم میں نہایت کم عمری کی حالت میں موت پائی۔ اس طرز میں اسکے موجد پکاسو کے بعد اسکا ہمسر شاید کوئی دوسرا نہ ہو۔ وہ جانوروں اور جانوروں میں بھی بیشتر چوپاؤں کے سوا انسانوں کے مرقع کبھی نہیں بناتا تھا۔

سب زمرۂ مقلدین میں آتے ہیں، اساتذہ میں نہیں۔ سنگھ پوچ احساسات اور ابتذال کیطرف
مائل ہیں۔ اپنے موتعوں کے لحاظ سے بھی اور اپنے رنگوں اور ڈھنگوں کی پسند میں بھی۔
حکیم محمد خاں ان پیدائشی صورت نگاروں میں سے ہیں جو باوجود کمال قوت وبصارت کے
زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں بک جاتے ہیں اور جو وہ مانگتا ہے بنانے لگتے ہیں۔ اور مانگ
ہے ابتذال کی۔ گنگا جمنی چھتر۔ سلمے ستارے کے جوڑ ہندوانتوں کے بجائے انار دانے اور
آنکھوں کے بجائے سرمئی اچھور۔ سبز سرخ پریاں۔ ناٹک۔ نوٹنکی اور۔ میں ہونگا شہ کا باورچی
میں سب کھانے پکاتا ہوں۔ میرے قبضے میں ہے سب کچھ جو چاہوں سو کہلاتا ہوں یا بہت بڑے تو
"یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی
ورنہ حکیم کی ابتلا ابتلا رہی ہے کہ وہ موقلم کا مالک تھا۔ اور بہت کچھ کرسکتا تھا۔ حسرت، کس مپرسی
اور دنیا کی بدمذاقی کا مقابلہ آسان نہیں ہوتا

ایک نام ہے شری متی سنتا دیوی۔ اس نام سے کم لوگ واقف ہونگے لیکن انکی تصویر
"میلے کے بعد"، ایسی ہے کہ ایک مرتبہ دیکھ کر انسان پھر نہ بھولے۔ ہندوستان کے اس دور کی
بہترین تصویروں میں سے ایک تصویر۔ اور بالکل نیا طرز خیال اور طرز ادا اس تصویر کے
رنگ اور جسموں کی حرکت و جنبش نہایت خوب اور حد درجہ مسرور کن ہیں۔ یہ امر غور کرنے کے
قابل ہے کہ ہندوستان کی ان عورتوں میں سے جنکا مصوروں میں شمار مسلم ہے ہم شائد ایک کو
بھی بدمذاق باطنیت، جذبہ فروشی یا نوٹنکی کی طرف مائل نہ پائینگے، جس کے "مردوات" مصور
اتنے گھائل نظر آتے ہیں۔

وہ دن شاد اب لد گئے جب راوی ورما بہزاد وقت سمجھے جاتے۔ لیکن یہ قابل ذکر
ہے کہ راوی ورما کا اثر ہندوستان کے مصوروں اور ہندوستان کی مخلوق پر ایک زمانے
میں ٹیگور سے کہیں زیادہ عام رہا ہے راوی ورما میدان مصوری میں وہ کچھ تھے جو داغ میدان
شاعری میں، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ داغ کا دائرہ شعر تغزل تھا اور راوی ورما کا دائرہ

عمل مذہبی روایات۔ لیکن تھے دونوں چپ چپے، شیر فروش۔ راوی دریا کے گورے
گورے حسین، ہنس مکھ دیوتا کچھ ہوں دیوتا نہیں معلوم ہوتے۔ اور انکے حسن وفن کے معیار
کی ابتدا پارسی تھیٹریکل کمپنی کے ڈراپ سین کی مورتوں سے معلوم ہوتی ہے۔ اور جب استاد
کا یہ حال ہے تو شاگردوں کا کیا ذکر و بیان ہو۔

ایک حضرت ہیں مسٹر فیضی رحیمن ساکن بمبئی۔ انہوں نے اپنے سر یہ قومی خدمت لے لی
ہے کہ قدمائے ہندوستان کے فنی کارناموں کے گیت گایا کریں اور اپنے موقلم کی ترشحات
سے اوراق حال کو اپنا ممنون احسان کرتے رہیں انکا ذکر اگر اس سے زیادہ کیا گیا تو انشاءاللہ
بمبئی کے آرٹ اسکول کے ذکر کے ضمن میں ایک الگ مضمون کی صورت میں کیا جائے گا۔
میں میدان فن میں آزادی اظہار کا شدت سے قائل ہوں لیکن بعض اوقات اسی شدت سے
جی چاہتا ہے کہ فنی احتساب کی رسم قائم ہوتی۔ اس بے پروائی کس کے سر جائے گی۔ ان کے
نہیں بلکہ فن کے سچے پیمبروں کے۔

اسلامی اور مسیحی اخلاق

۱۔ سوال کی وسعت اور اہمیت | آنحضرتؐ اور حضرت عیسیٰؑ میں اخلاق کے لحاظ سے کس کو ترجیح دیجائے؟
اس سوال پر بحث کرنے سے پہلے قرآن اور انجیل کی اخلاقی تعلیم کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دونوں بزرگوں کے اقوال وافعال پر ایک گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اور جن حالات میں انہوں نے تبلیغ دین کا کام شروع کیا تھا ان کو بھی پیش نظر رکھنا لازم ہے تاکہ اس بات کا فیصلہ کیا جا سکے کہ کونسی تعلیم مختص الوقت۔ مختص القوم اور مختص المقام ہے اور کونسی تعلیم دائمی اور عام ہے۔
یہ سوال جیسا اہم ہے ویسا ہی وسیع بھی ہے اگر فرصت ملے تو اس مبحث پر ایک مکمل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ مگر میں کوشش کروں گا کہ حتی الامکان اختصار کے ساتھ ان سوالوں کا جواب بھی ایسے عنوان سے پیش کیا جائے کہ طالب حق کی تسلی کے لئے کافی ہو۔

۲۔ اخلاق کی حقیقت | سب سے پہلے اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ اخلاق ہے کیا چیز؟ میں نے رسالہ معیار الاخلاق میں اس پر بحث کی ہے۔ یہاں چند موٹی موٹی باتیں مختصر الفاظ میں بیان کیجاتی ہیں۔

(الف) اخلاق جمع ہے خلق کی اور خلق نفسِ انسان کی وہ حالت ہے جس کی بدولت افعال بآسانی صادر ہوتے ہیں۔ اگر وہ افعال عقلاً اور شرعاً پسندیدہ ہوں تو حسن خلق یا اچھے اخلاق سمجھے جائیں گے اور اگر ناپسندیدہ ہوں تو بدخلقی یا بُرے اخلاق کہلائیں گے۔

(ب) اخلاق ایک متوسط حالت کا نام ہے یعنی جو کام حد اعتدال پر قائم ہو وہ قابل تعریف اور داخل حسن خلق ہے اور اگر اس میں کمی یا زیادتی ہو جائے اور اعتدال قائم نہ رہے تو وہی کام قابل مذمت اور بدخلقی میں شامل ہو جاتا ہے۔

(ج) اخلاقی فضیلت کو خط مستقیم سے اور اخلاقی رذائل کو خطوط منحنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دو

نقطوں کے درمیان ایک ہی خط مستقیم ہو سکتا ہے مگر خطوط منحنی بے شمار کھینچے جا سکتے ہیں یعنی سیدھا رستہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مگر ٹیڑھے راستے بے شمار ہو سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے ہر ایک نیکی یعنی اخلاقی خوبی کو صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ کہا ہے (دیکھو قرآن مجید کی پہلی سورۃ یعنی سورۂ فاتحہ)

(د) عدالت تمام اخلاقی فضائل کا سرچشمہ بلکہ کل اخلاق کا مجموعہ ہے اور ظلم (جو اس کے برخلاف ہے) تمام رذائل کا سرچشمہ بلکہ کل بداخلاقیوں کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ عدالت کے معنی ہیں تمام انسانی قوتوں کو اعتدال پر رکھنا۔ اور یہ عین اخلاق ہے اور ظلم سے مراد ہے کسی شے کو بے موقع رکھنا یعنی بے اعتدالی اور اسی کو بداخلاقی کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں جا بجا عدل و اعتدال کی مدح اور تاکید اور بے اعتدالی و ظلم کی مذمت اور مخالفت کی گئی ہے بلکہ کل اسلامی احکام صوم و صلوٰۃ۔ حج و زکوٰۃ۔ خمس و جہاد وغیرہ کی بنیاد ہی عدل و اعتدال پر قائم کی گئی ہے۔

اب میں دو اخلاقی فضائل یعنی شجاعت اور عفت کی مختصر سی حقیقت بیان کرتا ہوں تاکہ یہ مطلب واضح ہو جائے۔

۱۔ شجاعت کیا چیز ہے؟ قوت غضبی کے اعتدال سے شجاعت حاصل ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنے غصہ کو قابو میں رکھیں اور بوقت مناسب۔ بطریق مناسب بمقتضائے عقل اس سے کام لیں تو یہ شجاعت ہے جس کو دلیری اور بہادری بھی کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف عمل کرنا شجاعت نہیں ہے مثلاً اگر کوئی شخص خونخوار درندوں کی طرح قتل و غارت پر مستعد اور خواہ مخواہ آمادۂ جنگ و جدال رہے۔ بے موقع اور بے عقلی سے غصہ کو استعمال کرے تو یہ قوت غضبی کی افراط ہے۔ ایسا فعل قابل تعریف نہیں ہو سکتا اور نہ اس کو شجاعت کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص قوت غضبی کو جڑ بنیاد سے مٹا دے کبھی غصہ سے کام ہی نہ لے اپنے نفس کی حفاظت اور شریر کی شرارت کو دفع کرنے کے لئے کبھی کوئی تدبیر عمل میں نہ لائے

ظالم سے کبھی انتقام نہ لے۔ ہمیشہ معافی اور درگذر سے کام تو یہ قوت غضبی کی تفریط ہے۔ یہ فعل بھی اخلاقی حیثیت سے قابل تعریف نہیں ہے اور نہ اس کو شجاعت سے کوئی نسبت ہے کیونکہ اس سے ظلم اور شرارت کو زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور نیکوں کی عافیت تنگ ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے حقوق کی حفاظت۔ ضعیفوں کی اعانت۔ مظلوموں کی حمایت قیام امن وامان۔ دفع فتنہ وفساد اور تائید دین وغیرہ نیک مقاصد کے لئے قوت غضبی سے باعتدال کام لینا اور اپنے نفس پر قابو رکھنا اخلاقی خوبی ہے۔ اور اسی کو شجاعت کہتے ہیں۔ یہی اسلامی جہاد کا فلسفہ ہے کیونکہ آنحضرتؐ کی کل جنگیں دفاعی تھیں اور ان میں یہی مقاصد پیش نظر تھے۔ کتاب تحقیق الجہاد میں جس کو میں نے بزبان اردو شائع کیا ہے قرآن۔ حدیث اور تاریخی واقعات سے اس امر کو ثابت کیا ہے۔

۴۔ عفت کیا چیز ہے؟ | قوت شہوی کے اعتدال سے عفت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی اپنی تمام خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور باعتدال انکے کام لینا عفت ہے جس کو پارسائی بھی کہتے ہیں اس کے برخلاف عمل کرنا عفت نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنی خواہشوں کو پورا کرنے میں آزاد ہو یعنی ہر خواہش کو بغیر اس خیال کے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز۔ حرام ہے یا حلال۔ پورا کرلے۔ تو یہ قوت شہوی کی افراط اور عفت کے خلاف ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص قوت شہوی کو مٹادے اپنی جائز خواہشوں کو بھی پورا نہ کرے۔ جوگیوں کی طرح پہاڑوں اور جنگلوں میں بیٹھکر عبادت کرے۔ جڑی بوٹیاں کھاکر زندگی بسر کرے۔ زن و فرزند کو چھوڑ بیٹھے۔ یا سرے ہی سے ان تعلقات سے منہ موڑ بیٹھے۔ عمر بھر مجرد رہے۔ تو یہ قوت شہوی کی تفریط ہے اور یہ فعل بھی اخلاق سے خارج سمجھا جائے گا۔

۵۔ اصل الاصول اخلاق | قصہ کوتاہ۔ اخلاق ایک ایسے درمیانی طریق عمل کا نام ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے بری ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک نظری قوت کو اعتدال پر قائم

رکھیں۔ تمام خداداد قوتوں سے بمقتضائے عقل کام لیں اور کسی قوت کو معطل نہ چھوڑیں۔ اگر ایسا کریں تو ہم خلیق۔ صاحب خلق یا با اخلاق کہلائیں گے۔ ورنہ اخلاق سے گر جائیں گے یہ ہے اخلاق کا اصل الاصول جس کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اب میں انجیل اور قرآن کے اخلاق کا ایک مختصر سا موازنہ پیش کرتا ہوں۔

۶۔ مسئلہ انتقام اور انجیل | عیسائیوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے کل اخلاق کا لب لباب اپنے پہاڑی والے وعظ میں بیان کر دیا ہے۔ اس وعظ کی ہدایات یہ ہیں :-

۱۔ "لیکن میں تجھ سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے۔ دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کرکے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لیجائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے۔ اور جو تجھ سے قرض چاہے اس سے منہ نہ موڑ۔" (انجیل متی باب ۵ آیات ۳۹-۴۲)

۲۔ "جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اسکی طرف پھیر دے اور جو کوئی تیرا چوغہ لے اس کو کرتا لینے سے بھی منع نہ کر۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے اور جو کوئی تیرا مال لے لے اُس سے طلب نہ کر۔" (انجیل لوقا باب ۶ آیات ۲۹-۳۰)

آج دنیا میں اصلی انجیل کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت عیسےٰؑ کے الفاظ کیا تھے اور آیا انکا یہی مطلب تھا جو اس عبارت میں ظاہر کیا گیا ہے یا کچھ اور مطلب تھا۔ مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ تعلیم فطرت انسانی کے خلاف اور یہ اخلاق بالعموم ناممکن العمل ہیں اگر ظلم اور شرارت کے دفعیہ کے لئے کوئی تدبیر اختیار نہ کیجائے اور ظالموں اور شریروں کو آزادانہ اپنے منصوبے پورے کرنے دئے جائیں تو نیکوں اور پارساؤں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور آخر کار نظم تمدن باطل اور دنیا کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا۔

۷۔ انتقام بابت قرآنی تعلیم | اب اس مسئلہ کے مقابلہ میں اسلامی اخلاق کو دیکھئے جو قرآن مجید نے ہم کو سکھایا ہے۔

وجزآء سیئۃ سیئۃ مثلہا ج فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ۔ انہ لایحب الظلمین ۝ (شوریٰ ۴۰)

"اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے (یعنی جرم کے موافق انتقام لینا) پھر جو شخص معاف کردے اور صلح کرلے اس کا اجر خدا کے ذمہ ہے۔ بے شک خدا ظلم کرنیوالے کو دوست نہیں رکھتا۔"

یہ آیت بتاتی ہے کہ موقع اور محل کے موافق انتقام اور معافی سے کام لو۔ اور انتقام لینا لازمی نہیں ہے اگر مجرم کو مصلحتہً معافی دیدی جائے تو معاف کرنیوالے کو اللہ تعالیٰ اجر دے گا۔ اکثر آیات اور احادیث سے معاف کردینے کی فضیلت ثابت ہے۔ اور آنحضرتؐ کی زندگی میں اس کی حیرت انگیز مثالیں موجود ہیں۔ آپ نے بدترین دشمنوں کے قصور بھی معاف کئے ہیں۔ مگر انتقام کو یک قلم ترک کردیا جائے تو دنیا میں فتنہ وفساد پھیل جائے بلکہ دنیا تباہ اور برباد ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بقدر واجب انتقام لینے کی اجازت دی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عفو اور درگذر کی خوبی بھی جتادی یہ نہیں فرمایا کہ کبھی شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ انتقام کا نام نہ لینا۔ ہمیشہ حلم اور نرمی سے کام لینا۔ یہانتک کہ اگر کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دینا۔ ظالم کی فریاد اور ظلم کی داد خواہی نہ کرنا۔ بلکہ اگر کوئی شخص نالش کرکے تمہارا کرتہ جبراً لینا چاہے تو اپنا چوغہ بھی خوشی سے اس کے حوالے کردینا۔ وغیرہ وغیرہ کیونکہ ایسے احکام فطرت انسانی کے خلاف اور تکلیف مالایطاق ہیں

۸۔ قرآنی تعلیم کی فوقیت | بہرحال مسئلہ انتقام کی بابت انجیل کی تعلیم جو حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب ہے اعتدال سے گری ہوئی اور تفریط کی حد انتہائی کو پہنچی ہوئی ہے۔ فطرت انسانی بھی اس کو قبول نہیں کرتی اور عام طور پر اسکی تعمیل بھی نہیں ہوسکتی۔ مگر قرآنی تعلیم جو آنحضرت نے پیش کی ہے۔ بالکل معتدل۔ فطرت انسانی کے مطابق اور ہر حالت میں قابل عمل ہے۔ جس

پر تمام دنیا عمل کر رہی ہے۔ مگر مسیحی تعلیم کو خود مسیحی قوموں نے بالائے طاق رکھدیا ہے۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ یہ دلفریب اور شاندار مسیحی اخلاق۔ زینت اوراق کتاب مقدس بنائے جانے کے سوا اور کسی مطلب کا نہیں۔ اور ایک مسیحی مشنری کے لب شیریں سے اُس کی شیرینی میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے مگر عملی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اسی سے اسلامی تعلیم اور اخلاق محمدی کی عظمت۔ وقعت اور فوقیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے

۹۔ معاشرتِ زوجین کے متعلق قرآنی احکام | اخلاق کا ایک شعبہ تدبیر منزل ہے یعنی انتظام خانہ داری جو زن و شوہر کے خوشگوار تعلقات پر منحصر ہے۔ اس باب میں بھی اسلام نے نہایت حکیمانہ اصول اور بہترین ہدایات پیش کی ہیں۔ مثال کے طور پر آیات ذیل قابل ملاحظہ ہیں:۔

(۱) وعاشروهن بالمعروف فان كرهتموهن فعسى ان تكرهوا شيئاً ويجعل الله فيه خيراً كثيراً ہ (نساء، ع/۲۳)	اور اُنکے ساتھ (یعنی اپنی بیبیوں کے ساتھ) حسن سلوک سے رہو۔ پھر اگر (کسی وجہ سے) تم انکو ناپسند کرو تو عجب نہیں کہ تم کو ایک چیز ناپسند ہو۔ اور اللہ اس میں بہت سی خیر (برکت) عطا کرے۔"
(۲) وان تصلحوا وتتقوا فان الله كان غفوراً رحيماً (نساء، ع/۱۸۲)	اور اگر تم کو (یعنی میاں بیوی آپس میں) صلح کر لو اور (ایک دوسرے کی حق تلفی سے) بچو تو خدا بخشنے والا اور رحیم ہے۔"
(۳) وان خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكماً من اهله وحكماً من اهلها ان يريدا اصلاحاً يوفق الله بينهما ان الله كان عليماً خبيراً ہ (نساء، ع/۳۹)	اور اگر تم کو انکے درمیان (یعنی میاں بیوی میں) جدائی کا اندیشہ ہو۔ تو ایک پنچ مرد کے کنبے میں سے اور ایک عورت کے کنبے میں سے بھیجو اگر دونوں پنچ اصلاح کا ارادہ کریں گے تو خدا (انکے سمجھانے سے) اُن دونوں میں (یعنی میاں بیوی میں) موافقت کر دیگا۔ بیشک خدا (سب کے دلی ارادوں سے) واقف اور با خبر ہے۔"

(۴) ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف وللرجال علیهن درجۃ ط واللہ عزیز حکیم ہ (البقرہ ۲۲۸)	اور جیسے (مردوں کے حقوق) عورتوں پر ہیں ایسے ہی دستور کے مطابق (عورتوں کے حقوق) مردوں پر ہیں اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فوقیت ہے"

یہ آیات صاف طور پر ہدایت کرتی ہیں کہ زن و شوہر کو سلوک اور محبت سے رہنا چاہئے اور اگر ان میں کوئی جھگڑا ہو جائے تو اس کو رفع کر لیا جائے۔ حسب ضرورت پنچ مقرر کئے جائیں اور صلح و صفائی کرا دیجائے تاکہ فریقین کے خوشگوار تعلقات دوبارہ قائم ہو جائیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق بھی مردوں پر ہیں جن کی تفصیل کتب احادیث میں موجود ہے۔

۱۰۔ طلاق کی بابت قرآن کا حکیمانہ فیصلہ شریعت اسلام نے طلاق یا خلع کے ذریعہ سے زن و شوہر کی جدائی کو بہت ہی ناپسند کیا ہے اور ایسے قواعد و ضوابط مقرر کر دئے ہیں کہ حتی الامکان جدائی کی نوبت نہ آئے۔ (دیکھو سورہ طلاق وغیرہ) اور اگر کبھی ایسی نوبت آجائے اور مصالحت کی کوششیں کارگر ثابت نہ ہوں اور علیحدگی کے سوا چارہ نہ ہو تو ایسی حالت میں فریقین کو عقد ثانی کی اجازت دی گئی ہے۔ تاکہ اُنکی زندگی برباد اور اُنکا اخلاق تباہ نہ ہو۔

۱۱۔ طلاق کے متعلق انجیل کا حکم اب اسکے مقابلہ میں انجیل کو دیکھا جائے تو وہ بالکل ہی مختلف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ سے انکے شاگردوں نے اس مسئلہ کی بابت سوال کیا تو یہ جواب ملا تھا۔

"اُس نے اُن سے کہا جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ اُس پہلی کے برخلاف زنا کرتا ہے اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے (انجیل مرقس باب ۱۰ آیات ۱۱-۱۲)

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات زن و شوہر کی ناموافقت کا دفعیہ ممکن نہیں ہوتا اور اُنکا مل کر رہنا فتنہ و فساد کا باعث ہو جاتا ہے۔ اسکا بہترین علاج یہی ہو سکتا ہے

کہ اُن کو جدا کر دیا جائے اور انکے لئے عقد ثانی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کیجائے جیساکہ قرآن مجید کا حکم ہے۔ مگر انجیل مقدس کہتی ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ فریقین کی ناموافقت سے معاشرت میں خواہ کیسی ہی خرابیاں پڑ جائیں انکا اخلاق کیسا ہی برباد ہو جائے۔ سوسائٹی کی حالت کیسی ہی ابتر ہو جائے مگر انکا اکٹھا رہنا لازم۔ اگر جدائی کے بعد کہیں کسی فریق نے عقد ثانی کر لیا تو وہ مرتکب فعل حرام سمجھا جائے گا!

۱۲۔ اس حکم کی دلیل اور حضرت مسیح کی زبانی اور اس کے نتائج

حکم کی سختی تو ظاہر ہے مگر اس کی دلیل جو حضرت عیسیٰ کی زبانی بیان کیجاتی ہے وہ بھی عجیب وغریب ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اور وہ اور اس کی بیوی دونوں ایک جسم ہوں گے۔ پس وہ دو نہیں بلکہ ایک جسم ہیں۔ اس لئے جسے خدا نے جوڑا ہے اُسے آدمی جدا نہ کرے" (انجیل مرقس باب ۱۰ آیات ۹)

اس عبارت سے مفصلہ ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) عقد کے بعد زن وشوہر حقیقۃً ایک ہو جاتے ہیں دو نہیں رہتے۔

(۲) اگر ان میں جدائی ہوئی تو ایک جسم کٹ جائے گا۔ اور دونوں ٹکڑے (زن ومرد) بیکار ہو جائیں گے۔

(۳) یہ خصوصیت صرف عقد اول میں ہے۔

(۴) عقد اول میں زن ومرد کا جوڑا خدا خود ملاتا ہے اور وہ اپنے اختیار سے عقد نہیں کر سکتے۔

(۵) جدائی کے بعد اگر کوئی فریق عقد ثانی کرلے تو یہ خدائی عقد نہ ہوگا بلکہ انسانی فعل سمجھا جائے گا۔

(۶) پہلا عقد خدا کا باندھا ہوا ہے اس لئے صحیح ہے۔

(۷) دوسرا عقد انسان کا فعل ہے اس لئے باطل ہے

(۸) پہلے عقد سے متزلی اخلاق میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہو سکتی۔

(۹) اگر اُس عقد سے تکلیفیں پیش آئیں تو بھی دم نہیں مارنا چاہئے۔ کیونکہ وہ گرہ خدا کے ہاتھ کی باندھی ہوئی ہے۔

(۱۰) دوسرے عقد میں فریقین کے لئے کوئی خوبی نہیں۔ کیونکہ وہ انسانی فعل اور خلاف حکم خدا ہے۔

مگر معاملات خانہ داری کا روزانہ تجربہ ان نتائج کو صحیح تسلیم نہیں کرسکتا۔ لہذا یہ دلیل ناقابل تسلیم ہے۔

۱۳۔ مسیحی اقوام کا قرآن کیطرف میلان

یہی وجہ ہے کہ جب انجیلی حکم تعمیل سے معاشرت میں طرح طرح کی خرابیاں محسوس ہونے لگیں تو مسیحی قوموں کو اس کو خیرباد کہکر طلاق اور عقد ثانی کے لئے تعلیم انجیل کے برخلاف قانون بنانا اور قرآنی حکم کے آگے سرجھکانا یعنی آنحضرت کی حکیمانہ تعلیم کو قولاً نہ سہی عملاً تسلیم کرنا پڑا۔ بات یہ ہے کہ انسان فطرت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور جس نے ایسا کیا ہے اس کو کبھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

مسیحی اقوام دین خدا (فطرت) کی مخالفت پر ایک مدت تک قائم رہیں۔ آخر سخت نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ ع با دین خدا ہر کہ در افتاد بر افتاد

صاحبان بصیرت دیکھیں کہ قرآن کیسی حکمت سے دنیا کو دعوت اسلام دے رہا ہے۔ اپنی صداقت اور افضلیت کا سکہ دلوں پر بٹھا رہا ہے اور اقوام عالم کو سرکار محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کے در دولت کیطرف بلا رہا ہے۔ اسلام اپنی روحانی قوت سے دنیا میں پھیل رہا ہے۔ اور ایک دن آئے گا کہ اسلام ہی تمام دنیا کا مذہب ہو جائے گا اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

هوالذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون ٥ (صفحہ $\frac{16}{9}$)

وہی (خدا) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا۔ تاکہ اُس دین کو تمام ادیان پر غالب کردے اگرچہ مشرکین کو بُرا لگے۔"

۱۴۔ اخلاق محمدی کی جامعیت اور اخلاق عیسوی کے ساتھ اُسکا موازنہ

میں نے آنحضرت ؐ کی تعلیم اور اخلاق کی عظمت و فوقیت کو چند خاص مثالوں کے ذریعہ سے ثابت کر دیا ہے۔ جس سے کوئی صاحب فہم انکار نہیں کرسکتا۔ اب میں اس مطلب کو عمومی حیثیت سے ثابت کرتا ہوں تاکہ معلوم ہوجائے کہ نبی عربی ؐ کا اخلاق ہر پہلو سے افضل و اعلیٰ ہے۔

(الف) اخلاق کی بنیاد انسانی تعلقات پر ہے اور یہ تعلقات تین طرح کے ہوتے ہیں ہمارا ایک تعلق خالق کیساتھ۔ دوسرا تعلق اپنے نفس کے ساتھ اور تیسرا تعلق مخلوقات کیساتھ ہے۔ لہذا ہر انسان کے اخلاقی فرائض تین قسموں میں محدود ہو سکتے ہیں۔

(۱) وہ فرائض جن کا تعلق خدا سے ہے۔

(۲) وہ فرائض جن کا تعلق خود نفس انسان سے ہے

(۳) وہ فرائض جن کا تعلق دیگر مخلوقات سے ہے۔

(ب) اس مطلب کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ہر شخص کے ذمے تین قسم کے حقوق ہیں حقوق اللہ حقوق النفس، حقوق المخلوقات۔ ان حقوق و فرائض کی بے شمار شاخیں ہیں جن کا باقاعدہ ادا کرنا ہی حسن اخلاق ہے۔ مختلف درجوں اور مختلف طبقوں کے لوگوں کے ساتھ جس قدر ہمارے تعلقات زیادہ ہونگے اُسی قدر زیادہ ہم کو وسعت اخلاق کی ضرورت ہوگی۔ چونکہ ہمارے پیغمبر (صلعم) کے تعلقات نہایت وسیع تھے۔ اسی لئے آپ کا آپ ؐ کا اخلاق بھی نہایت وسیع تھا۔ قرآن۔ حدیث اور سیرہ نبوی کے مطالعہ سے یہ امر صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت ؐ نے مختلف حالات میں مختلف موقعوں پر مختلف قسم کے اخلاقی فرائض کو ایسی خوبی سے ادا کیا ہے۔ جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

(ج) آنحضرت ؐ کل انسانوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے (دیکھو قرآن مجید سورہ سبا ۲۸/۳) اور آپ ؐ کی کتاب تمام دنیا جہان کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی (دیکھو قرآن مجید سورہ

فرقان ۲۵) اور آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں (دیکھو قرآن مجید سورہ احزاب ۴۰)
ان حالات کے لحاظ سے یہ امر ضروری تھا کہ آپ کی تعلیم عام اور آپ کی کتاب جامع ہو
اور آپؐ کا اخلاق (جو در اصل قرآنی تعلیم کی عملی صورت ہے) اس قدر وسیع ہو کہ ہر قوم
ہر ملک، ہر حالت، ہر حیثیت، ہر درجہ، ہر طبقہ اور ہر زمانے کے لوگوں کی ہدایت کے
لئے عمدہ نمونہ ہو۔

(د) اب ہم حضرت مسیحؑ کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو معاملہ بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ آپ ؑ
ایک ہی قوم کے نبی تھے، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا ہے کہ "میں اسرائیل کے گھرانے
کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا" (دیکھو انجیل متی باب ۱۵ آیۃ ۲۴)
اور جب آپ نے اپنے شاگردوں کو منادی کے لئے بھیجا۔ اُس وقت بھی یہی ہدایت کی تھی
کہ صرف بنی اسرائیل کو ہدایت کرنا (دیکھو انجیل متی باب ۱۰ آیات ۵-۶) لہذا ضروری تھا کہ
آپؑ کی تعلیم اور ہدایات بھی مختص القوم، مختص الوقت اور مختص المقام ہوں۔ اور آپ کا
اخلاقی نمونہ بھی اسی قوم کی ضروریات اور حالات کے موافق ہو۔ جس کی ہدایت کے لئے
آپ ایک وقتِ خاص تک مامور تھے۔

۱۵۔ آنحضرت کی زندگی کے چار دور اور ہر دور کی جداگانہ خصوصیات

ہم آنحضرتؐ کی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ہر حصہ کی اخلاقی خصوصیتیں جداگانہ ہیں۔

(الف) ایک زمانہ وہ ہے کہ آنحضرتؐ فعلاً تبلیغ اسلام کرتے ہیں یعنی اپنے پسندیدہ عادات و اطوار
اور آداب و اخلاق کا بہت عمدہ نمونہ قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مگر زبان سے نہیں
کہتے کہ میں پیغمبر ہوں اور تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ اُس زمانے میں ہر فرد بشر
آپؐ کا مداح پایا جاتا ہے۔ کیونکہ آپؐ اخلاق مجسم اور بہمہ صفت موصوف ہیں۔ اور تمام
عرب آپ کو صادق اور امین کے معزز اور ممتاز لقب سے مخاطب کرتا ہے۔ چالیس سال
کی عمر تک یہی کیفیت رہتی ہے۔

(ب) اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے اور آنحضرتؐ قولاً اور فعلاً دونوں طرح دعوت اسلام دیتے ہیں یعنی زبان سے بھی فرماتے ہیں کہ خدا کا پیغمبر ہوں۔ اور آپ کا فعل بھی آپ کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔ آپؐ قوم کی دینی و اخلاقی اصلاح میں ہمہ تن مشغول ہیں اس لئے قوم آپ کی دشمن ہو جاتی ہے۔ جو لوگ آپ کو ہمیشہ صادق اور امین سمجھتے رہے وہی اب آپؐ کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں اور آپ کو اور آپ کے اصحاب کو بڑی بڑی تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ مگر آپؐ صبر و شکر کرتے۔ حلم و درگذر اور رحم و کرم سے کام لیتے ہیں۔ تبلیغ دین میں سعی بلیغ فرماتے ہیں۔ وعظ و نصیحت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے یہ سخت آزمائش کا زمانہ ہی جو متواتر تیرہ سال تک قائم رہتا ہے۔ اور اسی زمانے میں دشمن آپ کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔

(ج) اب تیسرا دور آتا ہے اور آنحضرتؐ ہجرت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مکہ معظمہ جیسے پیارے وطن کو مجبوراً چھوڑتے ہیں اور مدینہ منورہ تشریف لیجاتے ہیں مگر دشمن اب بھی آرام نہیں لینے دیتے۔ مدینہ منورہ پر فوج کشی کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ کو حفاظت اسلام کی غرض سے تلوار کے جواب میں تلوار اٹھانی پڑتی ہے۔ اور بہت سی لڑائیاں پیش آتی ہیں مگر ایسے سخت دشمنوں کے ساتھ بھی جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے اور اسلام کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ آنحضرتؐ کا برتاؤ نہایت شریفانہ ہی اور آپ کا اخلاقی نمونہ ایسا عمدہ ہے جس سے بہتر ایسے حالات میں کوئی شخص اور کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ ان مصائب کا سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک برابر جاری رہتا ہے۔

(د) اب آپؐ کی زندگی کا چوتھا اور آخری دور آتا ہے۔ مکہ فتح ہو جاتا ہے۔ دشمن جو متواتر اکیس سال تک سخت سے سخت جسمانی اور روحانی تکالیف آپ کو اور تمام مسلمانوں کو پہنچاتے رہے ہیں۔ سب کے سب مغلوب ہو چکے ہیں۔ اور معافی کے طالب اور رحم کے ملتجی ہو کر آپ کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔ بجز چند آدمیوں کے جن کے جرائم

کسی طرح قابل معافی نہیں ہو سکتے تھے۔ سب کے قصور معاف کئے جاتے ہیں۔ اور وہ نبی رحمت (جسکا مبارک لقب رحمۃ للعالمین ہے) رحمدلی کی ایسی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ جس کو دیکھ کر دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ الغرض آخری حج سے فارغ ہونے کے بعد جبکہ اسلام کی تکمیل ہو گئی۔ آنحضرتؐ اس دنیائے فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کی طرف تشریف لیجاتے ہیں۔

بیان مذکور کا نتیجہ اور آنحضرتؐ کی افضلیت کا نظارہ

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا۔ آنحضرت کی روحانی زندگی کا نہایت ہی مختصر سا خاکہ ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے اپنی مبارک زندگی کے ہر ایک دور میں اُس دور کے مناسب حال بہترین اخلاقی مثالیں دنیا کے سامنے پیش کیں مگر حضرت عیسیٰؑ کو ایسے مواقع پیش نہیں آئے۔ مثلاً :-

(۱) نہ کبھی یہودیوں سے آپ کا مقابلہ ہوا۔

(۲) نہ کبھی جنگ وجدال کی نوبت آئی۔

(۳) نہ کبھی آپؑ کے شاگردوں پر ایسے شدید ظلم ہوئے۔

(۴) نہ کبھی اتنی طوالی مدت (۲۱ سال) تک آپ نے دکھ پر دکھ اٹھائے

(۵) نہ آپؑ کے دشمن کبھی مغلوب ہوئے۔

(۶) نہ کبھی ہتھیار ڈال کر آپؑ سے رحم کے ملتجی ہوئے۔

لہذا ایسے مواقع کے مناسب حال آپؑ نے کوئی تعلیم نہیں دی اور نہ کوئی ایسا عملی اخلاق پیش کر سکے جس سے مختلف اوقات اور مختلف حالات میں مختلف افراد اور مختلف اقوام کو ہدایت حاصل ہو سکے۔ آپؑ کے اس قسم کے اقوال کہ "شریر کا مقابلہ نہ کرنا" محض وقتی اور عارضی ہدایات ہیں۔ جو ہر موقع پر اور ہر حالت میں مفید نہیں ہو سکتیں۔ مگر خواجہ عالم۔ فخر بنی آدم احمد مجتبیٰ۔ محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نے اپنے قول اور فعل سے خلق کی دائمی ہدایت کا سامان مہیا کر دیا۔ فی الحقیقت قدرت نے یہ ذمہ داری ایسے ذی مرتبہ انسان کے لئے اٹھا رکھی تھی جو تمام پیغمبروں کا سردار بن کر تمام عالم کی ہدایت کے لئے آنے والا تھا جس کی نسبت خود

حضرت عیسیٰؑ نے خبر دی تھی کہ "دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُسکا کچھ نہیں" (انجیل یوحنا باب ۱۴ آیات ۳۰) اور وہ پیغمبر عربی و مکی و مدنی کے سوا اور کون ہوسکتا ہے؟

جواب اعتراضات | عیسائی اس باب میں طرح طرح کی بحثیں پیش کیا کرتے ہیں۔ مثلاً

(۱) آنحضرت نے بہت سے نکاح کئے اور حضرت عیسیٰ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔

(۲) آنحضرت نے مرد کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دی اور حضرت عیسیٰ نے کبھی ایسی اجازت نہیں دی۔

(۳) آنحضرت نے اپنا دین جبر و تعدی سے پھیلایا اور حضرت عیسیٰ نے نرمی و اخلاق کر۔

(۴) آنحضرتؐ نے خونریزی کی مثال قائم کی اور حضرت عیسیٰ نے صلح و امن کی۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس مقالہ میں اخلاق کی بحث میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اصولاً اور ضمناً اس قسم کے اعتراضات کا جواب بھی آگیا ہے۔ اگر مفصل دیکھنا ہو تو بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں انکا مطالعہ کرنا چاہئے۔

باغی

نگارش قلم: سلمیٰ لاگرلاف

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایکدن جبکہ دھوپ نکلی ہوئی تھی، دونوں باغی انہیں تالابوں میں سے ایک کے کنارے مچھلی کا شکار کھیلنے آئے۔ جھاڑیوں میں سے گذر کر وہ ایک اونچی چٹان پر بیٹھ گئے اور وہاں سے انہوں نے اپنے جال پھینکے۔ وہ اُن بڑی بڑی مچھلیوں کو پکڑنا چاہتے تھے جن کی آجکل ان جھیلوں میں بہت کثرت تھی اور جو پانی کے اوپر نیچے تیرتی اور کھیلتی پھر رہی تھیں۔ دونوں باغی دشت وجبل میں عرصہ دراز تک رہنے سے بالکل "فرزندان فطرت" بن گئے تھے۔ "نباتاتی سلطنت" کے ماحول سے انکی روحوں نے پوری وابستگی اور ہم آہنگی پیدا کرلی تھی۔ شمس وقمر کے طلوع وغروب کے ساتھ اُن میں انبساط اور انقباض پیدا ہوتا تھا، اور موسم کے تغیرات کے اشاروں پر انکے قلوب حرکت کرتے تھے! جس کنج میں وہ اسوقت بیٹھے ہوئے تھے وہ ایک ایسی دلکش اور نظر فریب جگہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کسی نے اس کو "سحر بند" کردیا ہے! اس وقت وہ بیرونی دنیا میں بالکل منقطع تھے۔ جھاڑیوں اور پودوں میں نرم ہوا کی جنبش سی ایک ترنم ریز موسیقی پیدا تھی "پتوں کی تالیوں" اور "پھولوں کے جھولا جھولنے" کا عجیب سماں تھا! وہ دونوں اپنے پوستینوں میں ملبوس کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی صحرائی پوشش اردگرد کے پتھروں میں اپنی ہم رنگی کی وجہ سے بالکل وصل ہوئی جاتی تھی! دو سنگین مجسموں کی طرح وہ مقابل کناروں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے! سامنے تالاب کے پانی میں قوس قزح کی ہفت الوانی کے مشابہ رنگا رنگ مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں شکاریوں کی شستیں پانی میں پڑی ہوئی تھیں کہ اُن میں یکبارگی ایک جنبش پیدا ہوئی۔ یہ بہت معنی

خیز اور امید افزا علامت تھی لیکن آخر کار وہ انکا ایک فریب نظر ثابت ہوئی - ایک بڑا آبی جانور پاس ہی پڑا ہوا تھا جس کو انہوں نے نظر انداز کر دیا تھا، چنانچہ کانٹوں کی یہ حرکت اس تموج کا نتیجہ تھی جو یہ جانور اپنے بدن کی نقل و حرکت سے پیدا کر رہا تھا - چنانچہ جب وہ ہٹ گیا تو شستیں بدستور ساکن ہو گئیں۔

موقع بڑا ہی دلفریب اور روح پرور تھا اور وہ دونوں اس منظر کی باصرہ نوازی سے سرشار ہو رہے تھے - انکو اس بہشتی کنج میں طرح طرح کی صورتیں نظر آتی تھیں - جن کی تشریح و تعبیر وہ خود بھی ایک دوسرے سے کرنے سے قاصر تھے مچھلی کا شکار تو برائے نام ہی ہوا، بلکہ سارا وقت اس "خیالستان" کی "خوابوں" کے دیکھنے میں گذر گیا !

اسی اثنا میں یکبارگی کسی کشتی کے پتوار کی آواز جھاڑی کے پیچھے سے سنائی دی دونوں شکاری اپنی "بیداری کی نیند" سے چونک اٹھے - چند لمحوں میں کشتی نظر آئی - یہ ایک درخت کے تنے میں کا نکر بنائی گئی تھی - اس کو ایسے پتواروں سے حرکت دیجا رہی تھی جو چھڑی سے زیادہ موٹے نہ تھے - کشتی کی راکب ایک نوخیز لڑکی تھی جو پانی میں ادھر اُدھر کنول توڑ توڑ کر جمع کر رہی تھی - اُس کے بال گھونگر والے سیاہ رنگ کے تھے - آنکھیں بھی سرمگیں تھیں، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس لڑکی کا رنگ زرد ہو رہا تھا - رخساروں پر خون کی سرخی کا برائے نام شائبہ تھا - لبہائے لعلیں بھی سفید ہو رہے تھے - وہ سفید پوشاک زیب تن کئے ہوئے تھی - کمر میں ایک چرمی پیٹی لگی ہوئی تھی جس کا قفل سونے کا تھا - اس کا سایا آسمانی تھا جس میں چوڑی سرخ رنگ کی گوٹ لگی ہوئی تھی وہ کشتی چلاتی ہوئی پاس سے گذر گئی اور ان باغیوں پر مطلق اُس کی نظر نہ پڑی - یہ لوگ بھی بالکل دم بخود بیٹھے رہتے انکو اپنے دیکھ لئے جانے کا اتنا خوف نہ تھا جتنی یہ بات موجب قلق تھی کہ نوجوان لڑکی ان عجیب الخلقت آدمیوں کو اس ہیئت کذائی سے یہاں بیٹھا دیکھکر ڈر جائے گی - جب کشتی چلی گئی تو یہ پتھر کے بت پھر آدمی بن گئے اور مسکرا کر آپس میں یوں ہمکلام ہوئے -

"ایسی سفید تھی جیسے کہ یہ خود کنول کے پھول!" ایک نے کہا" اور آنکھیں ایسی کالی کالی تھیں جیسا صنوبر کی جڑوں میں ٹھہرا ہوا وہ پانی!"

لڑکی کی کشتی رانی۔ شغل گل چینی، مخصوص حلیہ وہیئت، اُس کی بیخودی و خود فراموشی سے دونوں صحرائی ایسے محظوظ ہوئے کہ خوب قہقہہ مار کر ہنسے، ایسا بلند جناتی قہقہہ جس سے تمام دشت و در گونج اٹھے اور ایسا محسوس ہوا کہ اس کے پرزور ہوائی تموج سے دیوہیکل صنوبر کے درخت اکھڑ کر گر پڑیں گے۔

تمہارے خیال میں کیا یہ کوئی حسین لڑکی تھی؟" برگ نے کہا۔

" میں یقین کے ساتھ کہہ نہیں سکتا، وہ گذر بھی جلدی سے گئی، غالباً تھی تو خوبصورت" ٹارڈ نے جواب دیا۔

شاید تم اُس کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکے" برگ نے کہا، کہیں یہ وہ عجیب الخلقت نکس تو نہ تھی جس کا نصف بدن مچھلی کا اور نصف انسان کا سا ہوتا ہے؟!"

قہقہہ کے ایک ناقابل فہم احساس نے انہیں پھر گدگدایا اور وہ دوبارہ ہنس پڑے!

... .

ٹارڈ نے اپنے بچپن کے زمانے میں ایک آدمی کی لاش کو دیکھا تھا جو سمندر کے کنارے پڑی ہوئی تھی، یہ شخص ڈوب کر مرا تھا۔ یہ منظر کچھ ایسا ہیبت ناک تھا کہ اُس کا خوف ہمیشہ کے لئے ٹارڈ کے دل میں جاگزیں ہوگیا، خاصکر راتوں میں وہ بلا ناغہ کابوسی خواب دیکھا کرتا تھا جن میں ہزار ہا مردے اُس کو سمندر کی لہروں سے نکلتے ہوئے نظر آتے تھے جن سے ایک ایک جزیرہ اور ایک ایک چٹان پٹ جاتی تھی، لاشوں کا یہ انبار خود اس کے قدموں میں بھی جبکہ وہ ساحل بحر پر کھڑا ہوتا تھا، جمع ہو جاتا تھا، اور عالم خواب کے یہ دہشت ناک تماشے اُس کو بُری طرح خوفزدہ کرتے تھے۔

ٹارڈ کے یہی تصوّات و توہمات اسوقت بحالت بیداری عود کر آئے! اور آئندہ سو اُس

کے خوابوں کے مناظر میں اس پراسرار صحرائی لڑکی کی سیر دریا کی تصویر کا اور اضافہ ہوگیا! کوہستانی کنجوں کی مختلف خوابگاہوں میں اس کی اس لڑکی سے ملاقاتیں ہوئیں جہاں اس کو بغور دیکھنے سے اُس نے فیصلہ کیا کہ واقعی وہ حسین ہے! وہ یہ خواب بھی دیکھا کرتا تھا کہ عین جھیل کے وسط میں کھڑے ہوئے ایک صنوبر کی جڑوں پر وہ بیٹھا ہوا ہے جہاں پانی کی لہریں اس کو جھولا جھلا رہی ہیں، اور اسی حالت میں اس کو یہ لڑکی بھی نظر آتی ہے جو ایک ننھے سے جزیرے پر ایستادہ ہے اور ٹارڈ کو دیکھکر مسکرا رہی ہے! ایک رات کی خواب میں تو بالکل "معراج" ہی ہوگئی یعنی اُس نے دیکھا کہ لڑکی نے اُسکا بوسہ لے لیا! مگر "دیا ہے صادقہ" یعنی صبح بھی ہوگئی تھی اور برگ پرشور و کرخت آوازوں میں ٹارڈ کو جگا رہا تھا۔ فریب خوردہ خواب نے اپنی آنکھیں غنودگی کے عالم میں ارادۃً خوب ہی بند کرلیں تاکہ اس لذت انگیز خواب میں جہانتک ممکن ہو طوالت پیدا کرے! مگر صد حیف کہ آخرکار نیند کی اس "سعی بے حاصل" کو اُسے ترک ہی کرنا پڑا۔

یہ عین لطف میں ہم کو جگا دیا کس نے ابھی تھے خواب میں انکو گلے لگائے ہوئے!

ٹارڈ اُٹھ بیٹھا مگر دن بھر اُس پر ایک سرشاری اور وارفتگی کا عالم رہا، لڑکی کے تصوّر میں وہ عملاً اب بھی محو خواب تھا! شام کے قریب اُس کے دل میں ایک خاص خیال آیا! اور اُس نے برگ سے پوچھا:

"آپ اُس کا نام جانتے ہیں؟"

برگ نے تیز نگاہوں سے ٹارڈ کیطرف دیکھا۔ اور پھر فوراً بولا: "ہاں بہتر ہے کہ تم کو اُسکا نام جلد بتا دیا جائے، اُسکا نام آن ہے، یہ ہماری رشتہ دار ہوتی ہے!"

معاً ٹارڈ کو خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی لڑکی ہے جو بالواسطہ برگ کی جلاوطنی اور صحرانوردی کی ذمہ دار ہے! پھر اس نے فوراً اپنے حافظہ کے ذخیرہ کا جائزہ لینا شروع کیا اور جو کچھ چرچے اس لڑکی آن کے متعلق وہ سنتا رہا تھا یک وقت سامنے آگئے:۔

اُن ایک شریف کسان کی چہیتی لڑکی تھی اُس کی ماں مرچکی تھی اور والدہ کی وفات کے بعد وہ اپنے باپ کے گھر کی حکمرانِ مطلق تھی۔ آزادی و خودمختاری کی یہ زندگی اُس کے مذاق کا عین مطالبہ تھا، چنانچہ اس نے عہد کرلیا تھا کہ کبھی شادی نہ کرےگی برگ اور اَن رشتے کے بھائی بہن ہوتے تھے اور تمام آبادی میں معاملہ "افسانہ دبزم وانجمن" تھا کہ برگ کو اَن اور اس کی سہیلیوں سے ملنے جلنے میں خاص دلچسپی ہے اور بمشکل وہ اپنے مکان پر موجود رہتا ہے آخر میلادِ مسیح کی سالانہ ضیافت کا موقع آیا جس میں منجملہ دیگر مہمانوں کے برگ کی بیوی نے ایک راہب کو بھی مدعو کیا جس کے بلانے کی خاص غرض یہ تھی کہ اپنے خاوند سے اس کی زبانی اپنی سفارش کرائے اور اس کو جتائے کہ کس قدر نازیبا بات ہے کہ برگ اپنی بیوی کو چھوڑ کر ایک دوسری دوشیزہ پر نظر رکھتا ہے!

برگ اس راہب سے بہت نفرت کرتا تھا، برگ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے احساسات کا بھی اس شخص کے بارے میں یہی حال تھا۔ وہ ایک کریہہ المنظر آدمی تھا اگرچہ بہت توانا اور تنومند تھا، اُسکا قریباً گنجا سر، کھوپڑی کے گرداگرد کا بالوں کا حلقہ، ابرو، بدن کے بال، ساری جلد، بدن یہانتک کہ اُس کا لباس بھی سب سفید ہی سفید تھے۔ ان سب چیزوں نے اسے بہت بدہیئت بنا دیا تھا۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ راہب ایک بیباک اور بےلاگ آدمی تھا اُس نے برگ کو نصیحت کرنی چاہی اور بہت پرزور قسم کی سرزنش۔ یہ سمجھکر کہ اگر علانیہ اس فعل پر تنبیہہ کیجائے تو زیادہ موثر ہوگی۔ اُس نے وہیں کھڑے ہوکر سارے جلسہ سے اس موضوع پر خطاب کرنا شروع کردیا۔

"حضرات! لوگ کوئل کو "سب سے شریر پرندہ" کہتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنے بچوں کو دوسری چڑیوں کے آشیانوں میں فریب کاری سے پرورش کراتی ہے، لیکن اس مجمع میں اسی طور طریق کا ایک شخص بیٹھا ہوا ہے جس نے اپنے اہل وعیال کو اسی طرح توکل پر چھوڑ دیا

ہے اور خود اپنی ضیافت طبع کا سامان، ایک غیر محرم عورت کی ہم نشینی سے حاصل کرتا ہے! میں اس کو "سب سے زیادہ شریر انسان" کے خطاب سے پکارنا چاہتا ہوں!"

برگ ساکت و صامت بیٹھا رہا! لیکن آن تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئی! اس نے کہا: "برگ! اس تقریر کے مشارٌالیہ تم ہو اور میں! لیکن خیر میں تو یہاں بے یار و مددگار ہوں، میرا باپ حاضر نہیں ہے جو اس وقت میرے نام و ناموس کی حمایت کرتا، مگر سچ یہ ہے کہ میری ایسی ذلت آج تک نہیں کی گئی تھی" یہ کہکر وہ چل کھڑی ہوئی! برگ اس کے پیچھے دوڑا!

"تم وہیں رہو اور میرے درپے نہ ہو، میں نے طے کر لیا ہے کہ آئندہ سے تم کو نہ دیکھونگی!"

لیکن بہرحال برگ نے لڑکی کو برآمدہ میں جا پکڑا اور اس سے کہا:

تم ذرا ٹھہرو تو، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہاری عزت و حرمت کو قائم رکھنے کے لئے مجھکو کیا کرنا چاہیے؟"

"یہ تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ اس وقت تمہارا کیا فرض ہے!" اس نے قہر آلود نظروں اور خون آشام آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔

برگ وہیں سے پلٹا اور ہال میں آکر راہب کو قتل کر دیا!!

... .

یہ ساری گذشتہ داستان ایک لمعہ برق کی طرح ٹارڈ کے ذہن میں تازہ ہوگئی۔ برگ اور ٹارڈ دونوں کے دماغ تھوڑی دیر کے لئے ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہوگئے۔ اس کے بعد برگ نے کہا:۔

"غالباً جس وقت وہ راہب میرا چاقو کھا کر گرا ہے تم وہاں موجود تھے اور اس واردات کے وقت اُن کو بھی تم نے دیکھا ہوگا۔ میری بیوی نے اپنے بچوں کو اپنے گرد سمیٹ لیا تھا اور آن کو کوسنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے ایک ایک بچے سے اُن کو پہچنوایا تھا، گویا وہ چاہتی تھی کہ جس عورت کی بدولت اس کا باپ قاتل بنا اس کی صورت سے آشنا ہو جائیں! اور ہمیشہ اس

کو یا درکھیں! مگر اَنؔ کمال بے پروائی اور وقار کے ساتھ وہاں کھڑی رہی اور اُس وقت اس کے سراپا سے وہ شان جمال و جلال ہویدا تھی کہ لوگ دیکھکر مرعوب ہوگئے! اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں فوراً جنگل کو بھاگ جاؤں، لیکن اس آوارہ گردی کی زندگی میں قزاقی کے پیشہ پر نہ اتر آؤں، البتہ اپنا وہ چاقو اپنے پاس ضرور رکھوں اور اگر کبھی اسی قسم کے جائز انتقام کا موقع آئے تو اُس کے استعمال کرنے سے کبھی نہ چوکوں!"

"آپ کے اس بہادرانہ اور وفاکیشانہ عمل نے اس کی فطرت میں غالبًا ایک رفعت پیدا کردی!" ٹارڈ نے کہا:

"گربرگ نے "حدیث دلبر" کو ٹارڈ ایسی حقیر ہستی کے سامنے دہرانے کے بعد پھر ایک سبکی اور بدمزگی محسوس کی! ٹارڈ ایک لامذہب وحشی تھا بلکہ اس کے دل و دماغ کی حالت اس درجہ سے بھی فروتر تھی! وہ جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں کوئی تمیز نہ جانتا تھا، وہ انسان کے اعمال کے لئے کسی اخلاقی ذمہ داری کا احساس نہ رکھتا تھا، جو کچھ ہوگیا سو ہوگیا، اُس کے لئے گذشتہ افعال پر کسی ندامت کا خیال ایک بے معنی سی بات تھی! اگرچہ وہ خدا سے واقف تھا، مسیح سے بھی بے خبر نہ تھا، اولیا و بزرگان دین سے بھی قدرے آشنا تھا لیکن محض یہ نام ہی اُس کے گوش زد ہوئے تھے اور اس کے آگے وہ کورا تھا۔ دراصل اپنے وطن یعنی جزائر شیرن کے بھوت پریت اس کے خدا تھے اسکی ماں ایک پکی جادوگرنی تھی اور اُسنے ٹارڈ کو مردوں کی ارواح پر ایمان لانے کی تلقین کی تھی۔

برگ سے ایک ناپسندیدہ حرکت سرزد ہوئی تھی لیکن ٹارڈ اس کے عیب و صواب کو سمجھنے کا بالکل نااہل تھا۔ برگ نے اس کندۂ ناتراش کی آنکھیں کھولیں اور خدا کے قہر و جلال سے اس کے دماغ کو آشنا کرنا چاہا۔ اُس نے بتایا کہ خدا ایک قادر مطلق ہستی، ایک احکم الحاکمین ذات ہے۔ بُرے افعال کے مرتکبین اور ریاکار گناہگاروں کو وہ جہنم کے دائمی عذاب میں گرفتار کرتا ہے۔ پھر برگ نے اُس کو حضرت مسیح اور انکی مقدس والدہ کنواری مریم کی محبت اور عظمت کی تبلیغ

کی، اور اُن تمام اولیا، انبیا، کا ذکر کیا جو خدائے ذوالجلال کے تخت کبریائی کے سامنے سر بسجود رہتے ہیں اور خطاکاروں کی بخشش کے لئے شفاعت کرتے رہتے ہیں۔ اس نے وہ تمام آداب و مناسک بتائے جو نوعِ بشر کو خدا کی آتش غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تعلیم کئے گئے ہیں۔ اس نے مقامات مقدسہ کو جوق جوق جانیوالے اُن حجاج کا ذکر کیا جو ہمیشہ وہاں کی زیارت سے مشرف ہوتے رہتے ہیں۔ اس نے اُن استغفار کرنیوالوں کے بھی تذکرے سنائے جو اشک ندامت سے اپنے دامن کو تر کرتے رہتے ہیں اور اُن پاکباز اور خدا پرست بزرگوں کا بھی ذکر خیر کیا جنہوں نے اپنے تقوے کے سلسلے میں ساری لذائذ دنیوی کو خیر باد کہدیا ہے۔

ٹارڈ کا چہرہ ان ترہیبوں اور وعیدوں سے زرد ہوا جاتا تھا۔ خوف و خشیت کی اس حالت میں اُس کو اُسکی خیالی تصویروں کے مناظر پھر نظر آنے لگے۔ برگ اپنے وعظ کو اب ختم کر دیتا لیکن وہ اپنے خیالات کی رو میں بے اختیار بہا چلا جا رہا تھا۔ اسی ذکر و فکر میں رات کا سیاہ پردہ پڑ گیا اور وہ اس تغیر وقت سے قریباً بے خبر رہے۔ جنگل کی کالی رات تھی جس کے ہولناک سکوت کو الو کی عفریتی بولی وقتاً فوقتاً توڑتی رہتی تھی! اس پر ہیبت فضا میں اُنکو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ خدا بالکل اُنکے قریب آ گیا ہے۔ اُس کے تخت جلال نے ستاروں کو ماند کر دیا ہے، اور آسمان کے انتقامی فرشتے کوہستان کی بلندیوں پر نازل ہو رہے ہیں! پہاڑ کے میدانی دامن میں بھی نشیب کے رہنے والوں کی آتشگاہوں کے شعلے اوپر کی طرف لپکتے ہیں اور مجرموں کی اس تنہا جائے پناہ کو بھی جلا ڈالنا چاہتے ہیں!!

... .

خزاں آئی اور اس کے ساتھ طوفان۔ ٹارڈ تنہا جنگل میں گیا تاکہ شکاری کے جالوں کو ٹھیک کر کے بچھا دے۔ برگ گھر ہی پر رہا اور اپنے لباس وغیرہ کی مرمت کرتا رہا۔ ٹارڈ کا راستہ ایک سلامی دار پہاڑی پر سے تھا جس پر خزاں زدہ درختوں کی پتیوں کا فرش تھا جو ہوا کی گردش سے ایک مدور حلقے میں چکر کھا رہی تھیں۔ بار بار ٹارڈ کو یہ واہمہ گزرتا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے

وہ کئی دفعہ ڈرا لیکن جب دیکھا کہ صرف ہوا ہے اور کچھ نہیں، تو پھر آگے بڑھا۔ جب پے در پے کھٹکا ہوتا تو بعض دفعہ وہ اکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور ڈرانیوالے خس و خاشاک کو گھونسہ تانکر ڈانٹتا! لیکن اس کی وہمی صورتوں نے اسکا تعاقب نہ چھوڑا۔ چنانچہ اُس نے دیکھا کہ ایک اژدہا اُس کے پیچھے چھپتا ہوا آرہا ہے، اور اُسی کے پہلو میں ایک بلند قد خونخوار بھیڑیا ہے جو اس موقع کا منتظر ہے کہ ذرا ٹارڈ کی آنکھ جھپکے اور وہ تڑ کیہ اُسکی گردن دبائے! ٹارڈ نے جلدی جلدی قدم اٹھانا شروع کیا لیکن ساتھ ہی ان موذیوں نے بھی اپنی رفتار تیز کی! جب اُس نے دیکھا کہ وہ بالکل اُس کے سر پر آگئے ہیں۔ تو وہ کھڑا ہو گیا اور پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگا، لیکن وہاں سوائے خواب و خیال کے اور کیا تھا؟! آخر وہ سر راہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اس مسلسل وحشت اور تھکاوٹ سے تھوڑا آرام لینا چاہا۔ درختوں کی پتیاں ہوا کی جنبش سے اب بھی اس کے قدموں میں مصروفِ رقص تھیں۔ سارے جنگل پر خزاں کی ہمہ گیری سے ایک عالم فنا طاری تھا۔ سوکھے پتوں اور خشک گھاس کی جڑوں کے انبار در انبار تھے۔

"تم سب گناہگار ہو، سُنا!" ٹارڈ نے خزاں کی تاراج شدہ اس ساری مخلوق کو خطاب کرکے کہا "اور ہم انسان بھی سب گناہگار ہیں! کوئی شے خدا کی نظر میں معصوم نہیں کوئی وجود اتنی پاکی نہیں رکھتا جو آسمانی معیار کو پورا کر سکے! تم بھی خدا کے غصے کی آگ میں جلادی گئی ہو!"

ٹارڈ آگے بڑھا۔ اگرچہ بظاہر کچھ معلوم نہ ہوتا تھا لیکن سارا جنگل اس کے سامعہ کو ایک طوفانی سمندر کی طرح موجیں مارتا سنائی دیتا تھا۔ اس نے اب کچھ ایسی آوازیں سنیں جن سے اس سے قبل اس کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے! تمام جنگل آوازوں سے پرشور تھا! کبھی کچھ سرگوشیاں سی معلوم ہوتی تھیں اور کبھی ایک خفیف درد خیز نالہ سا سنائی دیتا تھا، کبھی ایک زبردست ڈانٹ ہوتی تھی اور کبھی ایک ٹھہرا ہوا گرج! کبھی قہقہے تھے اور کبھی کراہنے کی آوازیں! سینکڑوں ہزاروں گلے آوازیں پیدا کرتے معلوم ہوتے تھے! یہ پُر اسرار اور

ناقابلِ فہم شور و شر ٹارڈ کو دیوانہ بنائے دیتا تھا! اس کا ہر بن مو کانپنے لگا! غیر مرئی تعاقب کرنے والوں کی ہنگامہ خیزی سے سارے جنگل میں ایک غوغا بپا تھا! شاخوں کا ٹوٹنا، آدمیوں کے قدموں کی آوازیں، ہتھیاروں کی جھنکار اور انکی وحشیانہ اور خونخوارانہ چیخ پکار سے ٹارڈ کی روح فنا ہوئی جاتی تھی!

صرف ایک طوفان ہی نہ تھا جو ٹارڈ کے گرد ہیبت بر پا کر رہا تھا بلکہ ایک شے اور بھی تھی یعنی ایسی عجیب و غریب آوازیں اُس کے گوش زد ہو رہی تھیں جن کی تعبیر اُس کے لیے بالکل ناممکن تھی اور یہ بات اُس کی وحشت میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ اس نے اس سے قبل بڑے بڑے محشر سامان طوفان دیکھے تھے، لیکن اس نے کبھی بادِ صرصر کو اس طرح سینکڑوں تاروں اور پردوں پر ساز نوازی کرتے نہ سنا تھا! ہر شجر اپنے برگ و بار میں ایک زبانِ تکلم رکھتا تھا، ہر وادی ایک خاص نغمہ سے ترنم ریز تھی، اور مختلف آوازیں اور شور، پہاڑ کی سنگین دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر اپنی صدائے بازگشت الگ پیدا کر رہے تھے! بیرونی دنیا کے اس شورستان نے ٹارڈ کے دماغ کے اندر بھی ایک سخت تلاطم پیدا کر دیا تھا!

صحرا کی تاریکی اور تنہائی میں اس کو ہمیشہ ڈر لگا کرتا تھا۔ وہ صاف و شفاف سطحِ بحر اور کوہستان کی برہنہ چوٹیوں سے ایک محبت اور عقیدت رکھتا تھا، ایسی فضا میں اُس کو بھوتوں اور روحوں کے سائے ہر طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

اس وقت اُس کے متخیلہ نے محسوس کیا کہ شورشِ آواز اور طوفانِ تکلم کی اس تمام ہنگامہ آرائی میں خود خدا اپنی جلالی گفتگو کر رہا ہے، وہی خدائے منتقم اور مالک یوم الحساب جس کی ذات و صفات کا تھوڑے دن پیشتر برگ نے اُس کے دل و دماغ کو تعارف کرایا تھا۔ یقیناً خدا ہی اس کے تعاقب میں ہے اور گناہ اُسکا یہ ہے کہ وہ برگ ایسے سیاہ کار کا ہمدم و دمساز ہے۔ شاید خدائے قہار کی مرضی اس امر کی تقاضا کر رہی ہے کہ وہ ایک مقدس راہب کے قاتل کی رفاقت کو ترک کر دے تاکہ تنہا اصلی ملزم ہی اس کے عتاب کا

ہدف بنے!

چنانچہ ٹارڈ بلند آواز سے اس معنی خیز طوفان سے خطاب کر کے گفتگو کرنے لگا۔ اس نے خدا سے عرض کی کہ وہ اس کے منشا کی تعمیل کرنے کے لئے تیار ہے لیکن عمل کے میدان میں وہ اپنے کو بہت معذور پا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ "میں نے بارہا یہ جرأت کرنی چاہی ہر کہ برگ کو تنبیہ کروں کہ وہ اپنے خدا سے اپنا معاملہ صاف کرے۔ لیکن مناسب الفاظ کی تلاش میں میری زبان پیچ و تاب کھا کے رہ گئی اور مجھپر ایک اضطراب و انتشار نے غلبہ کر لیا۔ جب سے میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ دنیا پر ایک خدائے عادل کی حکومت ہے اُس وقت سے میں سمجھ چکا ہوں کہ اس برگ کی خیر نہیں۔ میں نے اپنے اس محبوب دوست کے برے حشر کو یاد کر کر کے ساری ساری راتیں نالہ و فریاد کرنے میں گزار دی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کہیں جا کر چھپے خدائے علیم و خبیر کی نظر سے کوئی جائے پناہ اُس کو پناہ نہیں دے سکتی۔ لیکن مجھ میں اُس کے سامنے تاب گفتگو نہیں۔ اس کی محبت میری زبان کو گنگ کر دیتی ہے۔ پس اے خدائے رحیم مجھکو اس فریضہ سے بری کر دے کہ اس معاملہ میں میں اپنی زبان کو اُس کی اصلاح حال کی دعوت کے لئے کھولوں۔ اس حقیر و ناچیز سے یہ عزم و ہمت قطعاً ناممکن ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میدان کی پست سطح بلند ہو کر کوہستان کی چوٹی تک پہنچ سکے؟!"

ٹارڈ اتنا کہکر خاموش ہو گیا، ساتھ ہی طوفان پر بھی جس میں خدا کی زبان گویا تھی ایک عالم خموشی طاری ہو گیا۔ ہوا یکبارگی ساکن ہو گئی اور فی الفور آفتاب نکل آیا! ادھر کشتی کے تپواروں کی آواز آنے لگی، اور جھاڑیوں میں سے ایک ملائم سرسراہٹ سنائی دی۔ لطیف و شیریں آوازوں نے پیدا ہو کر پیاری اَن کی یاد کو تازہ کر دیا!

اب طوفان پھر شروع ہوا اور اب کی دفعہ تازہ شدت سے ٹارڈ نے قدموں کی آوازیں اپنے عقب میں سنیں۔ اُسکا دل سینہ میں تڑپنے لگا! اس مرتبہ اس کو قطعاً ہمت نہ ہوئی

کہ پیچھے مڑکر دیکھے کیونکہ اس کو از روئے یقین محسوس ہونے لگا کہ خود وہ شہید یعنی سفید پوش راہب ہی اُس کے تعاقب میں ہے! وہ برگ کے ہاں کے ایوان ضیافت سے آرہا ہے پیشانی پر تبر کا زخم ہے اور سارا بدن خون میں چور رنگ ہے! اور ٹارڈ کو یہ آواز سنائی دی کہ "قاتل کا پتہ بتادو، اس کو حوالہ کردو، اور اپنی روح کو بچالو!"

ٹارڈ بھاگ کھڑا ہوا! اب دہشت وہیبت کی انتہا نہ رہی تھی۔ لیکن اُس نے اپنے پیچھے ایک خوفناک تعاقب دیکھا۔ خدائے ذوالجلال کی آواز مصروف تنبیہہ تھی، اور مجرم کی حوالگی کا مطالبہ کررہی تھی۔ ٹارڈ کو اپنی اعانتِ مجرمانہ کی سنگین حقیقت بڑی شدت وخشیت سے محسوس ہونے لگی۔ کیوں نہ ہو! ایک معصوم بندۂ خدا قتل کیا گیا تھا۔ کلیسا کے ایک مقدس خادم کے فولاد سے ٹکڑے کردئے گئے تھے! اور پھر غضب یہ کہ یہ جانستان قاتل زندہ سلامت پھر رہا تھا اور ہنوز اپنے گناہ کی پاداش کو نہ پہنچا تھا۔ وہ آفتاب کی روشنی، کرۂ باد کی ہوا، زمین کے باغوں کے پھلوں، ان ساری نعمتوں سے برابر متمتع ہو رہا تھا حالانکہ ناکردہ گناہ راہب خاک وخون میں تڑپا دیا گیا تھا! آخر ٹارڈ کے قدم رک گئے، اس کی مٹھیاں سختی سے بند ہوگئیں، اور وہ ایک ایسی آواز سے چیخ اٹھا جس میں خوف اور دھمکی کا لہجہ ملا ہوا تھا۔ اور ایک لمحہ ٹھہر کر وہ پھر سر پر پاؤں رکھکر فرار ہوا اور آخر کار خوفناک جنگل کی اُس وادی ہلاکت سے نکل گیا!

جب ٹارڈ اپنے غار میں واپس پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ برگ پتھر کی میز پر بیٹھا ہوا اپنا کپڑا سی رہا ہے۔ آگ کی روشنی دُھندلی ہو رہی تھی اور برگ کو سوئی کے اس کام میں دقت محسوس رہی تھی۔ برگ کو دیکھکر ٹارڈ کا سینہ رحم سے لبریز ہوگیا۔ یہ دیو ہیکل اب اس کو ایک حقیر، ناشاد، اور بدانجام ہستی معلوم ہوتا تھا!

"کیوں، کیسے حال ہیں؟ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں؟ یا کہیں ڈر گئے ہو؟" برگ نے پوچھا۔

پہلی دفعہ ٹارڈ نے اپنے روحانی دغدغہ کا اظہار کیا ، اُس نے کہا :-

"آج جنگل میں میں نے عجیب ماجرے دیکھے ہیں ، روحیں دیکھیں ، اُنکے آوازسنے اور اُس سفید راہب کو دیکھا!"

"کیا کہہ رہا ہے ؟ لڑکے!"

"اجی نہیں! انہوں نے سارے راستے میرا تعاقب کیا ہے ، اور شور و غوغا تکلم و نغمہ نے قدم قدم پر مجھکو پریشان کیا ہے ۔ میں بار بار اپنی جان لیکر بھاگا لیکن وہ ایک بلائے مبرم کی طرح ہر دم میرے سر پر سوار رہیں ، میرے پاس کیا چارہ تھا ؟"

"کچھ پاگل ہو گئے ہو آج ؟!" برگ بولا ۔

ٹارڈ اب بے دھڑک ہو کر بولا ، اور اُس نے مطلق اس بات کی پروانہ کی کہ کیا لفظ اُس کی زبان سے نکل رہے ہیں ۔ اسکا تکلف وحجاب سب جاتا رہا اور اس کی تقریر میں خود بخود روانی آگئی ۔ اس نے کہا :

"سنئے! مجھکو کوئی فریب حواس نہیں ہوا ہے ۔ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا کچھ خواب اور افسانہ نہیں تھا ۔ روحیں فی الواقع موجود تھیں اور وہ سب اُس راہب کی ہم رنگ وہم لباس تھیں! ان سب کے کپڑے بھی خون سے داغدار تھے ۔ اور اگرچہ انہوں نے اپنے سروں کے ساتھ گھونگھٹ سے کر رکھے تھے لیکن پھر بھی ہر ایک کی پیشانی پر سرخ زخم نمایاں تھا! تبر کا یہ زخم ایسا ہویدا اور کچھ ایسا فراخ منہ رکھتا تھا کہ کسی پردے کے پیچھے چھپائے چھپتا نظر نہ آتا تھا!

برگ زرد پڑ گیا ، اور کچھ سوچنے لگا!

"ٹارڈ" اُس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا ، "مقدس اولیا ہی اس بات کو بہتر جانتے ہیں کہ تم کو یہ زخم تبر کے زخم کیوں نظر آئے! میں نے تو راہب کو چاقو سے مارا تھا!"

ٹارڈ کھڑا ہوا ہے اور اپنے تخیلات سے خود ہی کانپ رہا ہے ۔ آخر وہ کہتا ہے :

"آپ سنتے ہیں! وہ مجھ سے آپ کو طلب کرتے ہیں! اور غالباً وہ مجھکو مجبور کر دیں گے

کہ میں آپ کا راز فاش کر دوں!"

"کون؟ راہب لوگ؟"

"جی ہاں راہب۔ وہ مجھکو طرح طرح کی صورتیں دکھاتے ہیں، انہوں نے مجھکو کئی بار ان کی صورت بھی دکھائی ہے۔ وہ مجھکو وسیع سمندر کا نظارہ دکھاتے ہیں، وہ مجھکو ماہی گیروں کی قیامگاہیں دکھلاتے ہیں جہاں ناچ کود اور جشن وخوشی ہوتا نظر آتا ہے۔ میں ان مناظر کی دہشت انگیزی سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں لیکن وہ برابر میری چشم تخیل کے سامنے رہتے ہیں۔ میں ان سے التجا کرتا ہوں کہ للّٰلہ مجھے معاف کرو! بیشک میرا دوست قتل کا مرتکب ہوا ہے لیکن وہ آدمی برا نہیں ہے، اگر آپ مجھے اس تعاقب سے آزاد چھوڑ دیں گے تو میں اس سے کہوں گا کہ وہ اپنے قصور پر نادم ہو اور اپنے گناہ کا کوئی کفارہ کرے۔ وہ اپنے جرم کا ضرور معترف ہو جائے گا اور اپنا نامہ اعمال دھونے کے لئے بیت المقدس کی زیارت کر آئیگا۔"

"اچھا پھر اس پر راہبوں نے کچھ جواب دیا؟" برگ نے پوچھا "غالباً وہ مجھے معاف کرنا نہیں چاہتے، وہ مجھکو بہت عذاب انگیز سزا دینا چاہتے ہیں اور مجھکو زندہ آگ میں جھونکدینے کی نیت رکھتے ہیں!"

ٹارڈ بطور خود اس موقع پر یہ گفتگو شروع کرتا ہے:

"ایں! کیا میں اپنے دوست کیساتھ غداری کروں گا؟! وہ روئے زمین پر میری تنہا دولت ہے! اس نے مجھکو ریچھ کے حملے سے اُس وقت بچایا ہے جبکہ اُس خونخوار درندے نے اپنے پنجے میرے گلے پر رکھدئے تھے! ہم دونوں نے اس صحرائی زندگی کی سرد و گرم کو ساتھ ساتھ چکھا ہے۔ جب میں بیمار ہوا تھا تو اس نے خاص اپنے کپڑوں سے میرے لئے بستر تیار کیا تھا! ہاں میں نے بھی کس محبت اور خلوص سے اُس کی خدمتیں کی ہیں! میں اُس کے لئے ایندھن اور پانی لایا ہوں، میں نے راتوں اُس کے بستر خواب پر پہرہ دیا ہے! اُس کے دشمنوں نے جب اسکا تجسس اور تعاقب کرنا چاہا ہے تو میں نے انکو غلط راستہ پر ڈال دیا ہے، اور

اُس کا سراغ لگانے سے انکو باز رکھا ہے۔ اُن کو کیونکر یہ گمان ہو سکا کہ مجھسے اپنے ایسے محبوب اور محترم دوست کے خلاف خیانت کرنا ممکن ہے؟! ہاں میرا دوست خود ہی پادری کے پاس چلا نہ جائے گا، اپنے گناہ کا اُس کے سامنے اعتراف کرے گا، اور پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ نجات و مغفرت حاصل کرلیں گے!"

برگ نے غور و تامل سے ٹارڈ کی تقریر کو سنا، وہ اُس کے چہرے کا بڑی متجسسانہ نظروں سے جائزہ لے رہا تھا!

بہتر یہ ہو گا کہ تم خود پادری کے پاس چلے جاؤ اور اُس سے سارا واقعہ سچ سچ بیان کردو ہاں اچھا ہے کہ نوع بشری میں تم واپس چلے جاؤ"

اکیلے میرے جانے سے بھلا کیا ہو گا؟ میں یہاں سے تنہا کہیں نکلتا ہوں تو مردوں کی روحیں محض آپ کی رفاقت و حمایت کیوجہ سے بُری طرح میرا تعاقب کرتی ہیں، اور کچھ اس طرح میرے در پے اور مجھ سے دست و گریباں ہوتی ہیں کہ جب میں انکے زرغے سے چھوٹکر یہاں آپ کے سامنے آتا ہوں تو میرے سارے بدن پر رعشہ ہوتا ہے! تم نے بھی تو غضب کیا ہے! تم نے گویا خود خدا پر ہاتھ اُٹھایا ہے! تمہارے گناہ سے بڑھکر کون گناہ کبیرہ ہو گا؟! میں جو تم سے اس وقت یہ مواخذہ کر رہا ہوں یہ تمہاری ہی تعلیم و تلقین کا نتیجہ ہے۔ تم نے خدا کے عدل و انصاف اور اُس کے انتقام و سزا کا حال مجھ سے کیوں بیان کیا؟ آج تم ہی ہو کہ مجھکو اپنے سے بیوفائی اور بے مروتی کرنے پر مجبور کر رہے ہو! مجھے معاف کرنا اگر میں ایسا کام کر گزروں! تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ تم خود پادری کے پاس چلے جاؤ!" ٹارڈ یہ تقریر ختم کر کے برگ کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

مجرم قاتل نے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھا اور بغور اس کی طرف دیکھا! وہ اپنے اس رفیق کے جوش و خروش اور خوف و خشیت کو اپنے جرم کی سنگینی کا معیار و میزان سمجھ رہا تھا اور اب ٹارڈ پر اس قسم کے آثار بہت ہی شدید و عمیق ہو گئے تھے! برگ نے محسوس کیا کہ وہ اقعی

خدا کا باغی ہے۔ وہ غم و حسرت سے لبریز ہوگیا!
"حیف ہے مجھ پر کہ میرے ہاتھ سے یہ فعل صادر ہوا! اور یہ کس قدر کوفت اور کلفت کی زندگی ہے جو میں یہاں ان پہاڑوں اور جنگلوں میں شب و روز کی دہشت اور دغدغہ میں بسر کر رہا ہوں! کیا اس وحشی زندگی کی یہ ساری مصیبتیں اور بے سروسامانیاں میری طرف سے کافی کفارہ گناہ نہیں ہیں؟! کیا میرے ہاتھ سے اپنا گھر بار اور ساری دولت نہ گئی؟ کیا میں اپنے دوستوں کی صحبت سے ہمیشہ کے لئے منقطع نہیں ہوگیا؟ کیا زندگی کی اُن ساری مسرتوں کا دروازہ مجھ پر بند نہیں ہوگیا جن کی وجہ سے زندگی زندگی ہوتی ہے؟! مجھ سے اب اور کیا چاہا جاتا ہے؟!"
ٹارڈ یکبارگی اچھل کھڑا ہوا۔ "اچھا! تم کو بھی ندامت ہونے لگی! میرے لفظوں نے آخر کار تمہارے دل میں بھی رقت پیدا کی! اچھا، آؤ میرے ساتھ چلو، ہاں چلو کہ ابھی وقت ہے!"
برگ وحشت زدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا! "ایں یہ لوگ کیسے؟! ٹارڈ! یہ کام۔ تم نے کیا؟"
"ہاں، ہاں میں نے! یہ میں نے ہی تمہارے ساتھ دغا کی ہے! لیکن اب بھاگ چلو! تمہاری گرفتاری اور سزایابی کی اب ضرورت نہیں ہے جبکہ تم کو اپنے کام پر نادم ہونیکی توفیق پیدا ہوگئی ہے! ہاں ہم کو ضرور بھاگ جانا چاہئے اور ہم نکل بھی سکتے ہیں۔"
قاتل برگ زمین پر اس جگہ جھکا جہاں اُسکا آبائی تبر پڑا ہوا تھا۔ "چور کے بچے!" اُس نے زیر لب آواز میں کہا، "میں نے تجھ پر اعتبار کیا! تجھ سے محبت کی!"
ٹارڈ نے برگ کی مخدوش حرکت کو بھانپا! اس نے سمجھ لیا کہ پہلا وار میرے ہی اوپر ہے! چنانچہ جلدی سے اس نے بھی اپنا خنجر کمر سے کھینچ لیا اور قبل اس کے کہ برگ کھڑا ہو اُس کو اُسکے جسم میں پیوست کردیا! دیوہیکل برگ فوراً زمین پر آرہا اور غار کے دہانے سے خون کا ایک چشمہ بہہ نکلا! برگ کی گردن پر اُلجھے ہوئے بالوں کے نیچے ٹارڈ کو ایک گہرا زخم منہ کھولے نظر آنے لگا!

اتنے میں دیہاتیوں نے نرغہ کرکے اُنکا محاصرہ کرلیا۔ انہوں نے ٹارڈ کی اُس کی کارگذاری پر بہت تعریف کی اور اس سے کہا کہ اُس نے اپنے قصور کی معافی کا حق حاصل کرلیا ہے۔

ٹارڈ کو اپنی قید و بند کے دہشت ناک خواب آنے لگے۔ اُس کے قدیم توہمات اس وقت پھر تازہ ہوگئے، اور جنگل کے پُراسرار طوفان میں اس نے جو جو عجائب و غرائب دیکھے تھے اور جو جو ناقابل فہم آوازیں اور نغمے سنے تھے اس ساری واردات کی طرف اُس کا دماغ منتقل ہوگیا۔ سارے شجر و حجر پھر اس سے گفتگو کرتے نظر آنے لگے اور وہ کل حیرت خیز داستان اپنے کو پھر دُہرانے لگی۔

ٹارڈ برگ کی لاش کے سامنے بیٹھکر زار و قطار رونے لگا۔ وہ اس سے بیتاب ہوکر التجائیں کرنے لگا کہ وہ اپنی موت کی نیند سے اُٹھ کھڑا ہو۔ دیہاتیوں نے اپنے نیزوں سے ایک ٹھٹری سی بنائی اور اس پر ڈالکر مقتول قاتل کو لیجانا چاہا۔ خوفناک برگ کی لاش کو اٹھاتے ہوئے انکے دل مرعوب ہوگئے اور اُنکے واہمہ نے اُس کے اعضا میں زندگی کی حرکت دیکھی! جب جنازہ اٹھایا گیا، ٹارڈ کے منہ سے نکلا:

"خدا بہت بڑا ہے!"

رخصتی کے وقت ٹارڈ نے لرزتی ہوئی آواز میں مجمع کو یہ پیام دیا:

"اُن سے کہدینا، اُس اَن سے جس نے برگ کو قاتل بناکر دیس نکالا دلوایا تھا، کہ برگ کو ٹارڈ نے، اُس ٹارڈ نے جس کا باپ طوفان زدہ جہازوں کے مسافروں کو لوٹنے کا پیشہ کرتا ہے اور جس کی ماں ایک جادوگرنی ہے قتل کردیا، کیونکہ برگ ہی نے ٹارڈ کو یہ بتایا تھا کہ عدل و انتقام خدائے ذوالجلال کے زمین و آسمان کا سنگ بنیاد ہے!"

غزل

از حضرت درد کاکوروی

آہ کروں تو کس طرح ضبط فغاں سے کام ہے
عشق کی اصطلاح میں صبر اسی کا نام ہے

یہ تو دل حزیں ترا عشق پہ اتّہام ہے
دید ہو کس طرح تجھے شوق ہی ناتمام ہے

مردم چشم حق ہے جو جلوہ نما ہے ہم میں وہ
ہے یہ وہی کرشمہ ساز، روح اُسی کا نام ہے

شوق جو ہو صفات کا دہر پہ ہو فریفتہ
ذات کا ہو جو شیفتہ اس کو طلب حرام ہے

خلوتِ دل میں میری جاں میرے سوا کوئی نہیں
تارِ نفس پہ آیا آج، یار کا یہ پیام ہے

یار ہے تیرے جلوہ کی، جب نہیں کوئی انتہا
حسنِ وصال بھی ترا، جلوۂ ناتمام ہے

مستوں میں تیرے آجکل بیخودی اس بلا کی ہے
ہوش نثار شیشہ ہے، عقل فدائے جام ہے

حسن ازل کے ناز اٹھا قیدِ مجاز سے نکل
عشق کی یہ تو بوالہوس منزل ناتمام ہے

عاشق خستہ قلب کا حسن کی بارگاہ میں
جذبۂ دل سلام ہے، آہِ رسا پیام ہے

مے کی کسے ہے جستجو، جام کی کس کو ہے ہوس
ساقی کی ہر نگاہ خود گردشِ دورِ جام ہے

دردِ جگر کی ہر کھٹک جاذبۂ وصال ہو
جلوۂ حسن یار سے عشق کا یہ پیام ہے

غزل

از حضرت جلیل قدوائی بی اے

متاعِ[1] حسنِ عیش جاوداں معلوم ہوتی ہے
تری رونق بہارِ بے خزاں معلوم ہوتی ہے

زبانِ عشق چپ ہے راز الفت آشکارا ہے
خموشی ترجمان بے زباں معلوم ہوتی ہے

خوشی کے چند دن تھے جو خوشی میں کٹ گئے لیکن
حیاتِ غم، حیاتِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

کبھی جو آرزو نقش و نگارِ صفحہ دل تھی
وہی سینہ پہ اب سنگ گراں معلوم ہوتی ہے

یہ ڈر ہے راز دل افشا نہ ہو جائے کہیں یارب
نگاہِ دوست اب کچھ مہرباں معلوم ہوتی ہے

ابھی ہے دور سرحد لذت دردِ نہانی کی
ابھی تو لذتِ دردِ نہاں معلوم ہوتی ہے

بھرے آتے ہیں آنسو سن کے حالِ گریۂ بلبل
ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

خدا معلوم کتنے اور کیسے غم اٹھائے ہیں
ہنسی بھی دردمندوں کی فغاں معلوم ہوتی ہے

ہجومِ غم کی دل پر آج کل ایسی کشاکش ہے
متاعِ زندگی بارِ گراں معلوم ہوتی ہے

غمِ دنیا و دیں سے دل کو اس نے کر دیا فارغ
تری الفت انیس بیکساں معلوم ہوتی ہے

زباں پر حالِ دل آئے جلیلؔ اسکی ضرورت کیا
مری ہستی مجسم داستاں معلوم ہوتی ہے

---

(۱) کیٹس کے مشہور شعر :-

A thing of beauty is a joy for ever:
——————— ; it will never
Pass into nothingness ; ———————

کو ذہن میں رکھئے (قدوائی)

تنقید و تبصرہ

کتب :- سیرۃ الرسول - مترجمات - زرگل

سیرۃ الرسول (تاریخ الامت حصہ اول) | جامعہ کی کتابوں میں سے جو سب سے زیادہ مقبول ہوئیں تاریخ الامت کا پہلا حصہ سیرۃ الرسول بھی ہے۔ یہ کتاب دراصل طلبہ کے فائدے کے لئے لکھی گئی تھی لیکن ملک میں اس قدر مشہور ہوئی کہ عام مسلمانوں نے طلبہ سے زیادہ اسکا مطالعہ کیا اور اسی لئے اس کے کئی ایڈیشن ابتک نکل چکے ہیں۔ گذشتہ سال یہ کتاب بہت سے اسلامی مدارس اور گورنمنٹ کالجوں کے نصاب میں داخل ہوگئی تھی اس لئے اب اس کا سائز چھوٹا کرکے نیا ایڈیشن طبع کرانا پڑا ہے۔ قیمت بھی بجائے عمر کے ۱۲ر کردی گئی ہے۔ نیا ایڈیشن بعد ترمیم اور تصحیح شائع ہوا ہے، ہم یہ بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ سیرۃ الرسول طلبہ اور عام مسلمانوں کے کام کی کتاب ہے۔ اور اب جب کہ مکتبہ جامعہ نے قیمت میں بھی تخفیف کردی ہے یہ بہت آسان ہوگیا ہے کہ ہر شخص اس سے فائدہ اٹھائے۔ مکتبہ جامعہ نے سیرۃ الرسول پر بچوں کے لئے جو مفید سلسلہ شائع کیا ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ تمام مدارس کے نصاب میں داخل ہو کہ طلبہ کا بھی اس میں فائدہ اور مکتبہ جامعہ کی بھی ہمت افزائی ہے۔

مترجمات | جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی نے اپنے مختلف مضامین کو جو ملک کے علمی و ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں مرتب صورت میں شائع کرنیکی توجہ فرمائی ہے مترجمات بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس میں انہوں نے اپنے تمام مختصر علمی تراجم کو جمع کردیا ہے ان میں سے اکثر مضامین مرحوم رسالہ زبان منگلور میں مترجمات کے زیر عنوان شائع ہو چکے ہیں مضامین اکثر و بیشتر علمی ہیں اور ان کا مطالعہ اردو داں حضرات کے لئے بہر نہج مفید ہے۔ قاضی صاحب کو ترجمہ

کا اچھا سلیقہ ہے اس کتاب سے اُنکی یہ مہارت آشکارا ہے، البتہ بعض مقامات پر کچھ فروگذاشتیں ہوگئیں جو چنداں قابل لحاظ نہیں مثلاً صفحہ ۴۹ کچھ عرصے کے پہلے صفحہ ۵۰ بجائے اس کے ہندوستان کی گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے مطالبہ کا اسقدر انکار کیا کہ . . . . . ایک جگہ پیداوار کی جگہ پیداواروں لکھدی ہے۔ اسی طرح کے دو چار مسامحات اور بھی ہیں ہمیں توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان تمام خرابیوں کو دور کردیا جائے گا۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۷۲ صفحے۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ دہلی

(زرگل) یہ قاضی احمد میاں صاحب کے ان ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر آگرہ کے مشہور ادبی رسالہ مرحوم نقاد میں شائع ہوچکے ہیں، قاضی صاحب کا ادبی مذاق بہت ستھرا ہے ان مضامین میں انہوں نے سلیم المذاقی کا پورا ثبوت دیا ہے یوں تو اس رسالہ کا ہر مضمون مطالعہ کے لائق ہے مگر "افسانہ قمر"، "عورت سے"، "کہاں ہے ہندوستان"، "داستان حیات"، "خیالات کالیداس" یہ مضامین خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۸۴ کتابت وطباعت معمولی۔ قیمت غالباً ۶ر

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ۔ دہلی

شذرات

پچھلے مہینے کے پرچے میں ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہ امیر جامعہ بھوپال
حیدرآباد اور میسور کے دورے پر تشریف لے گئے ہیں تاکہ ان مقامات پر اپنے احباب کے حلقے میں
جامعہ ملیہ کے مقاصد کی اشاعت کریں اور اس کے لئے مالی امداد فراہم کریں۔ پرچہ چھپنے کے لئے
مطبع میں جا چکا تھا اس کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ممدوح کیساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کے علاوہ
جناب عبدالمجید خواجہ صاحب سابق شیخ الجامعہ بھی تشریف لے گئے ہیں۔ ہم جس طرح ڈاکٹر انصاری
صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے بہت مالی نقصان برداشت کرکے اور بڑی زحمت اٹھا کر جامعہ
ملیہ کی خدمت کے لئے ایک مہینے کا وقت نکالا ہے اسی طرح خواجہ صاحب کے بھی ممنون احسان ہیں کہ وہ
سال بھر کی محنت کے بعد تعطیل کے زمانے میں آرام کرنیکے بجائے جنوبی ہند میں جامعہ کا پیام پہنچانے
تشریف لے گئے ہیں۔

خواجہ صاحب کو جامعہ ملیہ سے جتنی محبت ہے اور اس کے مقاصد کی جتنی قدر انکے دل میں
ہے اسکا اندازہ ناواقف لوگ مشکل سے کر سکتے ہیں۔ موصوف نے کئی سال سے اپنے پیشے کی مصروفیتوں
کے سبب سے سیاسی جدوجہد سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی ہے لیکن ملک و قوم کی تعلیمی ترقی سے انکی
دلچسپی بدستور باقی ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ رہے گی۔

وسط ستمبر میں وہ المناک سانحہ پیش آیا جس کا مدت سے خوف تھا یعنی جتندر ناتھ داس نے لاہور
کی جیل میں مسلسل فاقہ کشی کے صدمے سے جان دے دی۔

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اس جواں مرگ کا ماتم سارے ملک میں کیا گیا۔ تقریباً ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں نے اس حسرتناک موت پر آنسو بہائے۔ اکثر شہروں میں دن بھر دکانیں بند رہیں، ماتمی جلوس نکالے گئے تعزیتی جلسے کئے گئے۔ غرض جن طریقوں سے مجروح دل کے دردِ نہاں کا تھوڑا بہت اظہار ہو سکتا ہے سب اختیار کئے گئے۔

مگر ملک کے تمام ذمہ دار رہنماؤں نے سوائے معدودے چند شعلہ مزاجوں کے ایسے شدید صدمے کی حالت میں بھی اپنا فرض سمجھا کہ تشدد آمیز انقلابی تحریک سے جس کی بدولت وطن پرست بنگالی نوجوان کی جان گئی بے تعلقی اور بیزاری کا اظہار کر دیں۔ اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ جتندر ناتھ داس جو اپنے ملک کی محبت میں موت کے گھاٹ اتر گیا اور اس کے ساتھی جو ابھی تک نیم جانی کے منجدھار میں ہیں حب وطن، خلوص اور ایثار کے مجسمے ہیں لیکن افسوس ہے کہ جوانی کے جوش نے ان لوگوں کو اس راہ پر ڈال دیا جس میں انکے ملک کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے۔

ان لوگوں کا خیال ہے اور بالکل بجا ہے کہ شہیدوں کے خون سے قوموں کی آزادی کا قصر تعمیر ہوتا ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ شہادت کے شرائط کتنے سخت ہیں۔ سیاسی شہادت کیلئے یہ کافی نہیں کہ انسان عارضی جوش، ضد یا غصے میں جان دیدے خواہ کتنے ہی اعلیٰ مقصد کے لئے کیوں نہ ہو بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ پہلے وہ اس کا اطمینان کرلے کہ اسکی قربانی واقعی ملک کے لئے مفید ہوگی اور پھر خالص نیت، پاک ارادے اور بے لوث دامن کے ساتھ ہلاکت کے دریا میں کود پڑے۔ محبت کی دیوانگی میں بے سوچے سمجھے جان دیدینا بیشک بڑی ہمت کا کام ہے لیکن جب انسانوں کے اعمال اعلیٰ اخلاقی اصول کی میزان پر تولے جاتے ہیں تو اسکا پلہ کچھ بہت بھاری نہیں رہتا۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہی کہ داس جیسے منچلے ہونہار نوجوانوں کے یوں مفت میں جان کھونیکا ذمہ دار کون ہی ؟ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کی فضا آج کل سیاسی بے چینی سے معمور ہے۔ ہندوستانیوں کے دل میں غلامی کی شرم اور آزادی کی آرزو نے ایک شورش برپا کردی ہی۔ قدرتی بات ہی کہ نوجوانوں اور خصوصاً طالب علموں میں جن کی طبیعت میں یوں بھی ہیجان وتلاطم رہتا ہے یہ شورش ہنگامہ محشر بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ اب اگران نوجوانوں کے نگران یعنی مدرسوں کے منتظمین ملک وقوم کے خیر خواہ ہوں اور تھوڑی سی عقل بھی رکھتے ہوں تو وہ نوجوانوں کے اس جائز اور مبارک جوش کو سیدھی راہ پر لگانے کی تدبیریں کریں انہیں قومی رہنماؤں سے خلوص وعقیدت کا اظہار کرنے قومی گیت گانے قومی جشن منانے کی اجازت دیں تاکہ انکا حب وطن کا طوفان دریا کے کناروں سے گذر کر آس پاس کی زمین کو برباد نہ کرے بلکہ قعر دریا کو اور گہرا کاٹ کر آگے بہتا چلا جائے۔ لیکن ہوتا یہ ہی کہ حب وطن کے جذبے کو سودا سمجھ کر دبانیکی کوشش کیجاتی ہی، طالب علموں کو قومی مباحث پر گفتگو کرنے بلکہ کہیں کہیں کھدر پہننے تک کی ممانعت کیجاتی ہی ظاہر ہے کہ انہیں ضد پیدا ہوتی ہے اور ہمیشہ بڑھتی جاتی ہی جن کی قوت ارادی کمزور ہی وہ قہر درویش برجان درویش دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتے ہیں مگر جن میں ولولہ حوصلہ اور قوت عمل ہی وہ انقلابی تحریکوں میں شریک ہوکر داس کی طرح جنون الفت کی بدولت دنیا سے ناکام ونامراد گذر جاتے ہیں۔

نوجوانوں میں اس قدر تلخی اور ضد پیدا ہونیکا ایک سبب یہ بھی ہی کہ انہیں ملک وقوم کی حالت دیکھ کر مایوسی پیدا ہوتی ہی اور چونکہ انکے خون میں گرمی ہوتی ہی اس لیے یہ مایوسی غصے کی شکل اختیار کرتی ہی۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان، ہندو اور ہندو، مسلمان اور مسلمان بے شرمی سے ادنیٰ اغراض پر لڑتے ہیں، قومی رہنما بے حمیتی سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر دست وگریباں ہوئے جاتے ہیں تو انکے دل میں امید مرجھا جاتی ہے اور ناامیدی جو خودکشی

کا پیش خیمہ ہی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

اس تاریکی میں ایک روشنی نوجوانوں کی کانفرنس کی بدولت نظر آتی ہے۔ یہ ایک ایسا مرکز قائم ہو رہا ہے جہاں نوجوان اپنے جوش کو مفید قومی کام میں لگانیکی کوشش کرتے ہیں، اپنے بڑوں کے باہمی جھگڑوں سے الگ رہ کر اتحاد و محبت کے جذبے کی پرورش کرنا چاہتے ہیں اور ضبط و انضباط کی عادت ڈال کر آزادی کی جنگ کے لئے تیار ہونے میں مصروف ہیں۔

مگر ان لوگوں کی راہ میں ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر انہوں نے اپنے مقاصد میں کسی سیاسی عقیدہ کو خواہ وہ اشتراکی حکومت ہو یا نراجی مکمل آزادی ہو یا مشروط، داخل کر لیا تو ان میں بھی آپس میں پھوٹ پیدا ہو جائے گی۔ اور انکی ساری ترقیوں کو روک دیگی۔ عملی سیاست اس قدر ہیجان انگیز چیز ہے کہ جب تک انسان کے دل و دماغ میں انتہائی پختگی پیدا نہ ہو جائے، اسے اس کے قریب نہ جانا چاہیے، نوجوانوں کو چاہیئے کہ اپنی پیشرو نسل کی خام کاریوں سے سبق لیں اور گریبان چاک کرنے سے پہلے پختہ مغز جنون بننے کی کوشش کریں۔

اعلان

کچھ عرصہ ہوا ہم نے اعلان کیا تھا کہ "جرمنی سے دیوان غالب کے پانچہزار نسخے آرہے ہیں۔ یہ نسخے جیسے ہی بمبئی پہنچے کچھ عرصے کے لئے قسم اول کی مقررہ قیمت پر ۲۵ فیصدی اور قسم دوم کی مقررہ قیمت پر ۳۲ فیصدی رعایت کا عام اعلان کر دیا جائیگا" چنانچہ خدا کا شکر ہے

پورے پانچہزار نسخے بمبئی پہنچ گئے ہیں

جو صاحب یکم جنوری سنہ ۳۳ء تک طلب فرمائینگے ان سے قسم اول کی قیمت صرف ۳ روپے اور قسم دوم کی صرف ۲ لیجائے گی۔ اور جو

تاجران کتب

پانچ یا پانچ سے زیادہ نسخے منگائیں گے ان سے پچاس فیصدی کی رعایت کی جائے گی۔

یہ دیوان غالب وہی مشہور معروف، خوبصورت جلد، سرخ کیس اور پاکٹ سائز والا شرکت کاویانی (برلین) کا دیوان غالب ہے جو اس سے پہلے بھی دو بار ہم جرمنی سے منگوا کر ہزاروں کی تعداد میں فروخت کر چکے ہیں قسم اول اور قسم دوم میں صرف یہ فرق ہے کہ قسم اول کا کنارہ سونے کا ہے اور قسم دوم کا معمولی زرد رنگ کا۔

یہ یقین رہے

کہ یہ اعلان ہم عام بازاری کتب فروشوں کی طرح نہیں کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اردو کے زندہ جاوید شاعر کی یاد ایک بار پھر تازہ کریں اور دلدادگان غالب کو موقع دیں کہ وہ اس نادر رعایتی اعلان سے فائدہ اٹھا کر اردو کا بہترین چھپا ہوا دیوان خرید سکیں اور ہماری محنت کی داد دیں۔

یقیناً

(۱) یکم جنوری سنہ ۳۳ء کے بعد دیوان غالب قسم اول کی قیمت پھر للعہ ۸ اور قسم دوم کی ۳ روپے ہو جائے گی۔

(۲) یکم جنوری سنہ ۳۳ء کے بعد تاجروں کو حسب سابق ½ ۱۲ فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔

اسلئے اب موقع ہے کہ ہر تاجر کتب اور ہر شخص فائدہ اٹھائے۔ کیا پانچ نسخے بیچ کر دس روپیہ کمانا مشکل ہوگا؟

منیجر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۲۳	بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

۱۔ عرب شمالی و وسطیٰ کی حکومتیں عہد نبوی سے پیشتر	سید حسن صاحب برنی ایم اے ایل ایل بی	۲۵۰
۲۔ من کی موج	سید وہاج الدین صاحب بی اے بی ٹی اورنگ آباد کالج	۲۶۷
۳۔ غزل	حضرت دل شاہجہانپوری	۲۷۲
۴۔ ڈراما کیا چیز ہے ؟	ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ۔ڈی	۲۷۳
۵۔ دلی کا انوکھا پن اور بچپن	میر باقر علی صاحب مرحوم	۲۸۵
۶۔ ہندوستان، فن طب کا اصل مولد	سعید انصاری صاحب بی اے (جامعہ)	۲۹۳
۷۔ سلیم کی یادیں	محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ایل ایل بی	۳۰۵
۸۔ گرفتاری (افسانہ)	محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن)	۳۱۵
۹۔ فتح مبین (نظم)	حضرت اقبال سہیل	۳۲۲
۱۰۔ شذرات	....	۳۲۴

عرب شمالی و وسطی کی حکومتیں

عہد نبوی سے پیشتر

سنہ ۱۹۰۹ء میں قاہرہ کی سرکاری یونیورسٹی میں مشہور اطالوی مستشرق گویدی (Igna Guidi) نے عرب قبل اسلام پر چار بیش بہا لکچر دئے تھے جو سنہ ۱۹۲۱ء میں فرانسیسی زبان میں ایک کتاب کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں L'Aarabie Anteislamique ہم جامعہ ملیہ کی اردو اکادمی کے لئے ان لکچروں کا ترجمہ کر رہے ہیں جو ان شاء اللہ عنقریب مکمل ہو جائے گا۔ فی الحال ناظرین "جامعہ" کی خدمت میں اُس کتاب کے باب اول کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ بہ نظر پسندیدگی و دلچسپی دیکھا جائیگا۔

(سید حسن برنی)

جب اہل عرب کا تذکرہ ہوتا ہے، تو ہمارا خیال خود بخود بانی اسلام، عہد خلافت کی ابتدائی فتوحات، اور خود خلافت کی طرف جاتا ہے، جو اہل مشرق و اہل مغرب دونوں کے نزدیک عروج و شوکت کا ایک خواب پیش کرتے ہیں۔ ہم عرب قبل اسلام کو بآسانی فراموش کر جاتے ہیں، اور یہ ہماری غلطی ہے۔ جنوبی عرب کے تمدن کا جس کا زمانہ کتبات کے رو سے مسیح سے آٹھ سو برس پہلے تک پہنچتا ہے، ذکر چھوڑ کر، وہ حکومتیں جو صحرا کے کناروں پر قائم ہوئی تھیں، اور شمال و مشرق اور جزیرہ نمائے عرب کے وسط میں واقع تھیں، اور جہاں عرب کی قوم کو استقلال و نشو و نما حاصل ہوا، اسلام کی شاندار تاریخ میں حقیر تصور کئے جانے کے لائق نہیں ہیں۔ سپٹی میوس اودیناٹوس (Septimus Odenatus) جس نے سنہ ۲۶۱ء میں شاپور اول کو مغلوب کیا تھا، اور جو کہ شہنشاہ گالین (Gallion) کا شریک سلطنت تھا، رومۃ الکبریٰ کے قیاصرہ میں شمار ہوتا اور کسی نہ کسی طریق پر رومۃ الکبریٰ کی تاریخ

میں حصہ رکھتا ہے، لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ وہ ایک بہادر عرب سردار تھا جو کہ خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن العاص کا پیش رو تھا جنہوں نے چشم زدن میں جرار لشکروں کو شکستیں دیکر سلطنتہائے ساسانی و بازنطینی کے ایک بڑے حصے کو فتح کر ڈالا۔ اسکا اصلی عربی نام اُذینہ تھا، اور اُس کی بیوی مشہور "زینوبیا" کا نام عربی اسم زینب کی مسخ شدہ شکل ہے۔ عرب کی روایت میں اُس عورت کا نام زبّا آتا ہے، لیکن وہ دراصل اذینہ کے ایک سپہ سالار کا نام ہے۔ اذینہ اور زینب کے لڑکے وارث کا نام اوتھینوڈور (Othenodore) یعنی عطائے اتھینیا (دیبی) تھا، جو کہ فی الواقع اس کے اصلی عربی نام وہب علات یعنی عطائے علات (وہب بمعنی ہبہ) کا ترجمہ ہے۔ اور جس کے معنی یہ ہیں کہ اس لڑکے کو علات نے اُس کے والدین کو بخشا تھا۔ علات کی پرستش بطور ایک معبود کے عرب میں بکثرت متداول تھی۔

قدیم عرب کی تاریخ پر، جیسا کہ عام طور پر تمام دیگر ممالک کی تواریخ کا حال ہے۔ اُس کی جغرافیائی ہیئت کا بہت اثر پڑا ہے۔ عظیم صحراؤں نے جو کہ شمال و جنوب میں اس جزیرہ نما کو شام و بابل سے علٰحدہ کرتے ہیں اُس کے باشندوں کو دشمنوں کے حملوں اور اُن کی زبان اور قومی خصائل کو تبدیلیوں سے محفوظ رکھا۔ کلدانیہ کی زبان، جیسا کہ ہم اُسے اُن تحریرات کے ذریعے سے جو شاید مسیح سے چار ہزار برس پہلے ہیں، جانتے ہیں، باوجود اس قدر قدامت کے سامی زبان کی قدیم شکل کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بعض اہم تبدیلیاں اختیار کر چکی ہے، حالانکہ عربی زبان نے چھٹی صدی عیسوی میں بھی اپنی نحوی ہیئت کے بعض حصوں مثلاً فعل میں قدیم زبان سے بہت کم بُعد حاصل کیا ہے اسکا باعث عربوں کی علٰحدگی اور آزادی ہے جب سے اسلام کے بعد عربوں کا دوسری قوموں سے واسطہ پڑا، اُن کی زبان میں بھی کم و بیش بعض اہم تبدیلیاں وقوع میں آئیں۔ یہ صحیح ہے کہ آشوریا کے تاریخی کتبات میں سناشرب، اسٓرہدان، اسٓرنبی پال اور بخت نصر کی فتوحات کا ذکر ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان آشوری اور کلدانی سرکاری بیانات کو پورے طور پر اعتبار کی نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ بہر حال یہ فتوحات محض حملوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان حملہ آوروں کی حکومت محض

زبان نہ ہو، لیکن بول چال کی زبان ضرور تھی - یہ تحریرات بجائے کتبات ہونے کے محض چند کندہ الفاظ کہلائے جانے کے زیادہ مستحق ہیں، جنہیں بعض چرواہوں نے نقش کر دیا تھا - ایسے ہی کندہ کئے ہوئے الفاظ سینا کے وادی مکتب میں بکثرت پائے جاتے ہیں - ان نقوش سے تاریخی نقطۂ نظر سے بہت کم معلومات دستیاب ہوتی ہے، لیکن وہ زبان کے نقطۂ نظر سے قیمتی ہیں - یہ زبان شمال کی اصلی عربی معلوم ہوتی ہے، یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ چند قسم کی زبانیں مروج تھیں، جو ایک طرف تو نبطی بولتے تھے اور دوسری طرف اہل عرب - ان زبانوں کی تین قسمیں ہیں صنعانی لحیانی، اور ثمودی - سب سے اخیر قسم اُس مشہور جماعت میں متداول تھی جنہیں اہل عرب آل ثمود لکھتے ہیں - ایک مختصر کتبہ جو ثمودی زبان میں لکھا ہوا ہے، اور حال ہی میں دستیاب ہوا ہے سب سے پہلا کتبہ ہے جس میں تاریخ دی گئی ہے - یونانی و رومی مصنفوں کے ذریعہ سے بھی ہم آل ثمود کے متعلق کافی واقفیت رکھتے ہیں - رومیوں کی عربی فوج میں ثمودیوں کا ایک خاص دستہ ملازم تھا، جسے رومی Equitessamaceni Thamudeni یعنی "لشکر سری ثمودی" کہتے تھے -

اس شمالی قسم زبان کی ایک خاص خصوصیت حرف "اَل" کی شکل ہے، عبرانی زبان میں "ال" کی جگہ "ھا" آتا ہے "فرس" (گھوڑا) حرف معرفہ شامل کرکے "ہافرس" ہوگا - ان کتبات میں سے ایک کتبہ جو صنعائی زبان میں ہے بتاتا ہے کہ حال بن سلام نامی ایک شخص نے ایک گھوڑا ایک دوسرے شخص حنّائی نامی سے پانچ مینا میں خریدا

"اَخذم حَنَّائی ہا فَرَسُ نجمۃ اُمنی (امانی ؟)" ایک اور شخص انعم بن قاحش اس مال غنیمت کا تذکرہ کرتا ہے جو اُس نے جنگ نبط کے سنہ میں حاصل کیا تھا -

"وغنمہ سنت حَرب نَبَطُ"

یہ کتبہ اُس سنہ کی وجہ سے جو اُس میں پایا جاتا ہے اہم ہے - یہ تاریخ اغلباً (شہنشاہ) تراجن کے عہد میں ۱۰۶ء سے تعلق رکھتی ہے - یہ کتبے اکثر ان الفاظ پر ختم ہوتے ہیں :-

برائے نام تھی، اور بہت تھوڑے دنوں تک رہی، برخلاف اس کے رومیوں نے جنہوں نے کہ اپنے زمانے کی ساری دنیا کو جو انہیں معلوم تھی، منظم کرنے کی کوشش کی، عرب کو فتح کرنے کی صرف ایک کوشش قیصر اغسطس کے زمانے میں کی اور اس میں بھی وہ سراسر ناکام رہے۔ آئی لیوس گالوس (Aelius Gallus) نے جو کہ عرب کے جنوبی حصوں تک پہنچ گیا تھا، "مریابا" (مارب) کا محاصرہ کر لیا، لیکن بالآخر اسے اس محاصرہ کو چھوڑ دینا پڑا، اور ایک لشکر جرار میں سے جس کا پورا اہتمام کیا گیا تھا، وہ صرف معدودے چند افراد کو مصر واپس لے کر پہنچ سکا۔

جس چیز کا شمال کے عربوں پر اثر پڑا وہ ایک آہستہ، لیکن واقعی حملہ تھا، یہ حملہ مذہبی خیالات اور ہمسایہ ممالک یعنی مغرب میں بازنطینی سلطنت اور مشرق میں ساسانی سلطنت کے برتر تمدن کا تھا۔ ایک زمانے میں جسے گذرے ہوئے مدتیں ہو چکی تھیں، اُن حکومتوں پر بھی جو کہ یمن میں قائم تھیں، ان سلطنتوں کے ایسے ہی اثرات پڑے تھے۔ اپنی حکومتوں کی بنیاد پڑ جانے پر شمال وجنوب کے عربوں نے ایک نظم ونسق قائم کر لیا تھا، لیکن اُس سے انہیں اپنی آئندہ ترقی میں بڑی مدد ملی۔ یہ حکومتیں حیرہ اور غسان اور وسط جزیرہ نما میں کندہ کی تھیں ہم مختصر طور پر ان حکومتوں کی تاریخ کے اہم واقعات ان روایتوں سے اخذ کر کے جو ششم صدی مسیحی کی ابتدا سے شعرا و مورخین عرب کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں پیش کرینگے۔ عربی زبان کے قدیم ترین تحریری اسناد اس صدی کے آغاز سے پیشتر کی نہیں ملتیں۔ اور یہ زمانہ بقول رینان (Renan) ہنوز عربوں کا "عہد رزمیہ" ہے

یہیں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہم اب ایسی عربی زبان سے بھی واقف ہیں، جو اشعار جاہلیت سے زیادہ قدیم کہی جا سکتی ہے۔ حوران میں جو دمشق کے جنوب ومشرق میں واقع ہے، ونیز حجاز کے شمالی اقطاع تک اخیر صدی عیسوی کے نصف دوم میں بعض ایسے کتبات دستیاب ہوئے ہیں جو اس قدیم عربی میں لکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ عربی زبان ادبی

" فو ہا (خا) علات سلام"

ان الفاظ کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے "علات کے روبرو سلام" ان الفاظ میں علات نامی معبود کبیر کا ذکر ہے۔ لیکن جو چیز توجہ کی مستحق ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتبات ایک ایسے رسم الخط میں کندہ کئے گئے ہیں، جو کہ جنوبی عرب کے حروف سے وابستہ ہے، نہ کہ آرامی حروف سے جو کہ پنجم صدی قبل مسیح سے دریائے فرات کے تمام اقطاع میں مروج تھے یہ معمولی واقعہ ہمیں یہ نتیجہ نکالنے کی اجازت دیتا ہے کہ ہمارے سنہ مسیحی کے ابتدائی زمانے میں عرب کے تمدن کا خاص مرکز جنوب یعنی یمن میں تھا اور اسکا اثر عرب کی شمالی آبادی تک پہنچا ہوا تھا۔

اب ہم اُن حکومتوں کیطرف متوجہ ہوتے ہیں جو عرب کے شمال میں قائم ہوئی تھیں، بالخصوص حیرہ

حیرہ دراصل ایک سریانی لفظ ہے، جس کے معنی "محدود قطعۂ زمین" یا "فوجی کیمپ" کے ہیں۔ اسکا تلفظ بجائے حِیرہ (بالکسرہ) حَیرہ (بالفتح) تھا۔ وہ محل وقوع کے لحاظ سے اچھے مقامات میں سمجھا جاتا تھا اور اس کی ہوا اتنی عمدہ تصور کیجاتی تھی، کہ ایک مثل مشہور تھی کہ حیرہ میں ایک دن گذارنا، سال بھر دوائیں کھانے سے بہتر ہے۔ ان عمدہ حالات کیوجہ سے حیرہ میں کثیر اور مرفہ الحال آبادی جمع ہو گئی تھی، جس میں سب سے زیادہ قبیلہ تنوخ کے عرب تھے جو خیموں میں رہتے تھے۔ انکے بعد عباد تھے جو مختلف عیسائی قبائل سے تعلق رکھتے اور زیادہ تر شہر کی اصلی آبادی میں رہتے تھے۔ انکے علاوہ اور بعض قبائل تھے جو ان سے اتحاد رکھتے تھے عباد کے معنی "بندگان" ہیں۔ پورا نام شاید عباد اللہ" یا ممکن ہے "عباد المسیح"، یعنی غلامان مسیح ہوگا۔ یہ نام غالباً انھوں نے خود ہی اختیار کیا تھا، تاکہ اُس کے ذریعے سے وہ بددین اور بت پرست آبادی پر جو اُنکے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اپنا تفوق جتائیں۔

ہم حکومت حیرہ کے عہد اولی کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں جانتے۔ حسب معمول اس کی ابتدا کے متعلق بھی دیگر حکومتوں اور شہروں کی طرح بجائے تاریخ کے افسانہ سے سابقہ پڑتا ہے

عدی بن ربیعہ کا عشق رقاش کے ساتھ جوکہ شاہ جذیمۃ الابرش کی بہن تھی، جذیمہ کی اس سے ناراضگی اور بعد ازاں اُس کی اپنے بھتیجے عمرو بن رقاش سے محبت اور ماہ وش زبہ سے جسے متقدمین "زینوبیا" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، یہ سب افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ازاں جملہ اُن تاریخی واقعات کو جو اُن میں مخلوط ہو کر رہ گئے ہیں، علحدہ کرنا نہایت دشوار ہے۔ پھر بھی بجز خاندان لخمیہ یا بنو نصر کے ہم حیرہ کی تاریخ سے بہتر طور پر واقف ہیں۔ حیرہ کے شاہی خاندان کی ابتدا تیسری صدی عیسوی کے نصف دویم میں قرار دیجا سکتی ہے۔ لیکن پہلا بادشاہ جو ہمارے زمانے تک کسی قدر شہرت رکھتا ہے، امراء القیس اول ہے۔ اس لئے کہ یہ وہی بادشاہ ہے جس کی جانب اس کتبہ کو منسوب کیا جاسکتا ہے جو کہ علاقہ صنعاء (واقع وسط شام) میں موسیو دی سو (M. Dissaud) کو تھوڑا عرصہ ہوا دستیاب ہوا ہے۔ یہ کتبہ جوکہ عجائب خانہ لودر (Louvre) واقع پیرس (فرانس) کے عظیم الشان ذخیرہ میں شامل ہو چکا ہے، دو قسم کی اہمیت رکھتا ہے۔ تاریخی و لسانی۔ یہ کتبہ ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے:-

"تی نَفسُ مَرَ لقَیسُ بَرِ عَمرُ مَلِکُ العَرَب کُلّھا"

یعنی "یہ مَرَ لقیس (امرا لقیس) پسر عمر بادشاہ جملہ عرب کی قبر ہے"، یہ عبارت قدیم عربی زبان میں ہے، لیکن اس میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ مثلاً نفس بمعنی سنگِ مزار (یا لوح) بر (بجائے بن) بمعنی پسر۔ لیکن یہ الفاظ اس عہد اور اس ملک کی بول چال کی زبان کی بجائے ادبی اور نیز تحریری زبان کو پیش کرتے ہیں جو کہ ہمیشہ آرامی زبان کے زیر اثر رہی۔ ایک ہی قوم کے لکھنے اور بولنے کی زبان میں اس قسم کا فرق پایا جانا تعجب انگیز نہیں ہے۔ یہی کیفیت نبطیوں کی ہے، جو کہ عرب قوم سے تھے چونکہ اُن کی مادری زبان اُس وقت لکھی نہیں جاتی تھی اس وجہ سے اُنکے کتبات ایک طرح کی آرامی زبان میں پائے جاتے ہیں، لیکن اُس میں جابجا عربی زبان مخلوط ہے۔

شاہ اُمرا لقیس یا مرا لقیس جس کے مزار پر یہ کتبہ لگا ہوا تھا، اپنے آپ کو تمام عرب کا بادشاہ بتاتا ہے۔ وہ مشہور قبائل اسد نزار اور انکے امراء نیز قبیلہ مذحج کا بادشاہ تھا۔ اس نے شامرؔ کے

شہر نجران کا محاصرہ کیا تھا سنین کی مطابقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس شام سے مراد "سبا" کا بادشاہ شام ملکرہ عش ہے جس نے اپنے باپ کے ساتھ ۲۷۰ء سے اور تنہا ۲۸۰ء سے حکومت کی تھی۔ نجران عرب جنوبی کا ایک مشہور شہر تھا۔ اس کتبہ کی تحریر نبطی خط میں ہے، لیکن اس میں بعض قابل غور خصوصیتیں پائی جاتی ہیں مثلاً لام الف جو کہ عربی کے لام الف (لا) سے قطعاً مطابق ہے جس چیز سے اس کتبہ کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے وہ اُس کی تاریخ ہے جو اس میں درج ہے اس کتبہ کے دستیاب ہونے سے قبل بعض فضلا مثلاً آئش ہورن (E. Chhorn) اور کوسین دے پیرسیوال نے امرءالقیس اول کا عہد حکومت چوتھی صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے میں قرار دیا تھا، اور عربی روایتوں میں متفقہ طور پر اُسے عمرو کا بیٹا بیان کیا گیا ہے۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے تاریخ حیرہ کے متعلق یہ امور مسلم سمجھنے چاہئیں کہ نمارہ (Namara) کے کتبہ میں جس مرءالقیس کا ذکر ہے وہ عربی روایات کا بادشاہ امرءالقیس ہے، اور اُس کی وفات کی یقینی تاریخ، ۷ دسمبر ۳۲۸ء شاہان حیرہ کے سنین کو متعین کرنے کے لئے ایک نہایت اہم نقطۂ آغاز ہے۔

امرءالقیس اول کے پرپوتے نعمان اول نے بہت زیادہ شہرت پائی۔ یہاں تک کہ عرب کی شاعری اور کم و بیش فسانہ آمیز نوعیت کی تاریخ میں اسکا نام بہت کچھ زندہ اور رائج رہا۔ اُس کے ماتحت سواروں کے دو دستے تھے جن میں سے ایک "دوسر" اور دوسرا "الشہبا" کہلاتا تھا۔ نعمان کے لئے ان منتخب دستوں کی اہمیت اُن لڑائیوں میں جو ہمسایہ قبائل عرب سے ہوئیں اور جن میں سواروں کا ممتاز حصہ ہوتا تھا محتاج بیان نہیں ہے۔ حیرہ کی بادشاہی یقینی طور پر ساسانیوں کے زیر اقتدار تھی، حتیٰ کہ یزدجرد اول (۳۹۹ء تا ۴۲۰ء) نے اپنے بیٹے بہرام (گور) کو تربیت کے لئے نعمان کے سپرد کیا تھا۔ قصر خورنق و "قصر سدیر" کی تعمیر سے جو نعمان نے بنوائے تھے، اُس کی حکومت کو اور بھی عز امتیاز حاصل ہو گیا۔ خورنق یقینی طور پر ایرانی زبان کا لفظ ہے اور اُس لفظ کی اصلی صورت "ہورنق" ہے جس کے معنی

ہیں" وہ چیز جو اچھی طرح ڈھکتی یا محفوظ رکھتی ہو"۔ یہ محل فن تعمیر کے عجائبات میں سے تھا جسے ایک رومی (یونانی) معمار "سنمار" نامی نے بنایا تھا۔ روایت ہو کہ اس محل کے بالائی بام پر جہاں نعمان اپنے اقبال وعیش کے خواب دیکھ رہا تھا، یکایک اُس کے دل میں ایک اندوہناک خیال پیدا ہوا، اور وہ یہ تھا کہ "یہ جو کچھ بھی ہے آج تو سب میرا ہے، لیکن کل یہ سب دوسرے کا ہوگا" اس خیال کا آنا تھا کہ اُس نے دنیا کو ترک کر دینے کا تہیہ کر لیا، اور اپنی بقیہ زندگی خلوت وعبادت میں گذاری۔ نام آور بادشاہوں کے قصے، جن میں معًا دنیا چھوڑ دینے اور گوشہ نشینی اختیار کر لینے کا ذکر ہو، اور بھی بکثرت مشہور ہیں، مثلاً نعمان کی طرح حبش کے بادشاہ "کالب" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یمن کے بادشاہ کو مغلوب کرنے اور کمال عروج کو پہنچ جانے کے بعد وہ راہب ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں عرب مصنفین تو یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ سقراط و افلاطون بھی اخیر عمر میں زاہدانہ گوشہ نشین بن گئے تھے۔

نعمان بت پرست تھا، اُس نے مذہب عیسوی کے خلاف جبر و تشدد سے کام لیا، اور عربوں کو شمعون نامی ولی (S. Simeon) کے پاس جانے اور اُس کا وعظ سننے کی ممانعت کر دی۔ لیکن وہ ولی اُسے خواب میں نظر آیا، اور اُس کو سخت کلمات سے یاد کیا، اور کئی بار عصا سے مارا۔ نعمان نے بالآخر حیرہ میں عیسائیوں کو اپنے مراسم مذہبی ادا کرنے کی اجازت دیدی۔ اس کی تائید عرب مصنفوں کی شہادت ہی بھی ہوتی ہے۔ اس واقعہ کی ایک اور بھی اہمیت ہو، وہ یہ کہ مذہب عیسوی کا استحکام اس بات کو ظاہر کرتا ہو کہ عباد نے جو کہ حیرہ کی مسیحی آبادی تھے، منتخب اور سربرآوردہ عربوں پر بہت بڑا اثر ڈالا۔

نعمان کا جانشین تقریبًا ۴۱۸ء میں منذر اول اس کا بیٹا ہوا، جو کہ تقریبًا ۴۶۲ء تک حکمراں رہا۔ یونانی (رومی) وسریانی مصنفین اُسے الاموندار وس (Alamoindaros.) منذر (بالفتح ذال) لکھتے ہیں، لیکن عرب ہمیشہ سے اُس کے نام کو اسم فاعل المنذر کی شکل میں لکھتے رہے ہیں۔ نعمان میں بعض غیر معمولی قابلیتیں پائی جاتی ہیں اور اُس کے عہد میں حیرہ کی حکومت

نے اس وقت کے واقعات میں نمایاں حصہ لیا۔ اس نے موبدان ایران کو بہرام گور متذکرہ بالا کو تاج شاہی پہنانے پر مجبور کیا حالانکہ انہوں نے بہرام گور کو نظر انداز کرکے اور ساسانی شاہزادہ کو تخت نشین کردیا تھا۔ بعض عرب مصنفوں نے لکھا ہے کہ بہرام گور کے تخت شاہی حاصل کرنے میں منذر کے باپ نعمان نے مدد دی تھی۔ اس طرح اس واقعہ کی دو مختلف روایتیں ہیں۔ لیکن تواریخ کی مطابقت کی رو سے دوسری روایت صحیح نہیں ہے منذر نے بہرام گور کی مدد اس کامیاب جنگ میں بھی کی تھی جو کہ بازنطینی سلطنت کے مقابلہ میں ہوئی تھی۔ لیکن منذر کی فوج پر معاً ہراس غالب آگیا، اور انہیں یہ خوف ہوا کہ وہ گھر گئے ہیں۔ اس خوف سے وہ دریا میں جا گھسے، اور اُن میں سے اکثر دریائے فرات میں ڈوب کے مرگئے۔ یہ واقعہ ۴۲۱ء میں پیش آیا۔

حیرہ کے بادشاہ اُس کے بعد سے ساسانیوں اور بازنطینیوں (رومیوں) کی لڑائیوں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ نعمان ثانی منذر کا پوتا، ۵۰۳ء میں جنگ خبور (Khabur) میں جو کہ بمقام سرسیوم (Carcesium) ہوئی تھی مارا گیا۔ حیرہ کے بادشاہوں میں بلاشبہ سب سے زیادہ ممتاز منذر ثالث تھا، جو ۵۵۴ء میں پچاس برس حکومت کرنیکے بعد مرا۔ پروکوپ (Procope) کے لکھا ہے کہ وہ نہایت ذہین اور بڑا زبردست سپہ سالار تھا۔ جسٹن (Justin) (۵۱۸ء) کے عہد کو چھوڑ کر ساسانیوں اور بازنطینیوں میں صلح بہت کم رہی، اور منذر سوم جنگ میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیتا رہا۔ اُس نے دو سرداروں کو گرفتار کرلیا۔ تو جسٹن نے حیرہ کے چھوٹے سے بادشاہ کے پاس اپنے سفیر بھیجنے میں اپنی بے عزتی نہ سمجھی، اور اس سے بلاشبہ اس کا منشا یہی تھا کہ اُس کے دونوں سپہ سالار رہا ہوجائیں اُسی زمانے میں منذر کے پاس یمن کی سفارت بھی آئی تھی۔ قباد کے زمانہ میں بھی منذر نے جنگ میں خاص طور پر نمایاں حصہ لیا، رومیوں کی سلطنت میں کئی بار لشکر کشی کی، لیکن ہمیشہ ان کے تعاقب سے بچ کر نکل آیا۔

اسی زمانے میں سلطنت بازنطینی کی سرحد پر ایک دوسری عرب حکومت نے اتنی قوت حاصل کرلی تھی کہ وہ حیرہ کی حکومت کی حریف بن سکے، اور ساسانیوں اور انکے زبردست لخمیوں کے مقابلہ میں سلطنت بازنطینی کی مدد کرے۔ یہ غسان کی حکومت تھی۔ اس حکومت کے ابتدائی عہد کی تاریخ حیرہ کے ابتدائی تاریخ کی طرح افسانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ غسانی جنوبی عرب سے آکر بصریٰ کے علاقہ میں مقیم ہوئے تھے۔ وہاں انہیں دیگر عرب قبائل پہلے سے آباد ملے اور کچھ مدت تک وہ اُن قبائل کے مطیع ونقاد رہے۔ چوتھی صدی عیسوی کے اواسط میں ثعلبہ بن عمرو کو سلطنت بازنطینی کی طرف سے اس علاقہ کی امارت سپرد ہوئی، جو آگے چلکر غسان کی بادشاہت ہوگئی۔ یہ اختیارات بعد میں خاندان جفنہ کے امراء کے ہاتھ میں منتقل ہوگئے لیکن یہ بات چہارم صدی عیسوی کے نصف اخیر میں حاصل ہوئی کہ تاریخ میں غسانی بطور سلطنت بازنطینی کے معاونین کے نظر آتے ہیں۔ ۳۷۳ء میں غالباً شاہ حارث دوم کی وفات کے بعد اُس کی بیوی ماریہ یا ماویہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ ایک روایت کی روسے اُس جنگجو اور فتحمند ملکہ نے سلطنت بازنطینی کو مجبور کردیا کہ وہ اُس ملکہ سے صلح کی جو یا ہو ماریہ اس شرط پر صلح کے لئے راضی ہوئی کہ موسیٰ نامی ایک مسیحی ولی بطور بڑے پادری کے اُس کے ملک میں بھیجدیا جائے گا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب عیسوی نے اس ملک کے عربوں میں کتنی ترقی پیدا کرلی تھی۔ لیز عرب کس حد تک رفتہ رفتہ بت پرستی سے ہٹ کر برتر مذہب قبول کرنیکی طرف مائل ہورہے تھے۔

بعض شاہان حیرہ وغسان، بالخصوص "جفنہ ثانی" کا ایک انوکھا لقب "محرق" تھا۔ اس نام کے معنی وہی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان کی روسے ہوتے ہیں یعنی "ایک ایسا شخص جو کہ تیز آگ میں جلاتا ہے"۔ بعض شاہان حیرہ کے متعلق جن کا یہ لقب ہے، ایسی حکایت بھی بیان کیجاتی ہے جس سے اس اسم کی توجیہ ہوجائے۔ لیکن ان حکایات کا ماخذ فی الواقع لفظ محرق اور اس کے معنی ہیں۔ اسی طرح "معلقات" کے لفظ سے جو لہ سات مشہور نظموں

کے لئے مخصوص ہیں وہ روایتیں ماخوذ ہیں، جن کی رو سے بیان کیا جاتا ہے کہ یہ نظمیں کعبہ میں آویزاں
تھیں۔ لیکن علامت معرفہ "ال" کی عدم موجودگی سے واضح ہوتا ہے کہ محرق اسم علم ہے اور غالباً
کسی دینی پیشوا یا کسی افسانہ کے سورما (ہیرو) کا نام ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کی مدت میں غسان کی حکومت نے سب سے زیادہ شوکت حاصل
کرلی۔ یہی زمانہ حکومت حیرہ کے اقبال کا بھی تھا۔ اس کے بعد سے دونوں حکومتوں میں تصادم
ہونا ناگزیر ہو گیا۔ دو حریف سلطنتوں، یعنی ایران و روما الصغریٰ کے ماتحت ہونے کی وجہ سے
وہ اس پر مجبور تھیں کہ وہ بعض اوقات باوجود چند روزہ ظاہری صلح کے ایک دوسرے سے اظہار
نفرت کریں۔ جبکہ ثالث یا حارث الاکبر کی منذر ثالث سے جنگ ہوتی رہی جس میں جبلہ مغلوب
ہوا۔ اسی جبلہ کی بیوی مریم تھی، جس کے کان کے بندوں میں دو اتنے بڑے موتی جڑے تھے
کہ ہر ایک کبوتر کے انڈے کی برابر تھا۔ لیکن غسان کا سب سے بڑا بادشاہ اور حیرہ کا سب سے بیدرد
دشمن حارث پنجم تھا، جو کہ حارث الاکبر اور مریم کا بیٹا تھا۔ قیصر جسٹنین (Justinien.)
نے اسے بطریق بنا دیا تھا جس کی وجہ سے اُسے بلند ترین مرتبہ حاصل ہو گیا تھا اور معاصرین اُسے
بادشاہ (Banilioz) کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ یہ لقب کبھی کبھی ماتحت امراء کے لئے
بھی استعمال ہوتا تھا۔ جسٹنین نے سرحد کے پاس کے عربوں کی قیادت بھی حارث کے ہاتھوں میں دے دی
تھی، اور اس طرح حیرہ کے بادشاہوں کے جو کہ سلطنت ایران کے رعایا تھے مقابلہ میں ایک قوت قائم کر دی تھی

حارث خامس، اور منذر ثالث دو ایسی شخصیتیں ہیں، جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کی
تاریخ میں خاص طور پر ممتاز نظر آتی ہیں۔ منذر اپنے حریف (حارث) پر اکثر فتحیاب رہا۔ ۵۴۴ھ
میں اس نے حارث کے بیٹے کو جنگ میں گرفتار کرکے عزّیٰ پر قربانی چڑھا دیا۔ ایسے معاملات
میں وہ بالکل وحشی تھا۔ لیکن دس برس بعد وہ مغلوب ہو گیا۔ عربوں کی روایت میں اس جنگ کے
دوران میں تین سخت لڑائیاں پیش آئیں، یعنی جنگہائے عین اُباغ، وحیار، وحلیمہ ان میں سے
پہلی لڑائی بہت عرصہ بعد وقوع میں آئی۔ منذر (جون ۵۵۴ء میں) عین اُباغ میں نہیں بلکہ

حیار میں جو کہ قنیسرین (Kinesrin) کے قریب حلب سے دو دن کے فاصلہ پر ہے فوت ہوگیا۔ جنگ حلیمہ وہی جنگ معلوم ہوتی ہے جو حیار کی لڑائی بتائی جاتی ہے۔ حلیمہ حارث کی بیٹی کا نام معلوم ہوتا ہے، جسے اُس کے باپ نے حکم دیا تھا کہ وہ عطر "خلوق"، سو چیدہ بہادروں کے جسموں پر مل دے۔ "وادی حلیمہ" یا "مرج حلیمہ" کا ذکر قدیم شعرا کے کلام میں، جو اکثر اس کے متعلق ہماری معلومات کا ذریعہ ہیں" آتا ہے۔ "الشعر دیوان العرب" اشعار اہل عرب کا محافظ خانہ ہیں۔ ایک شاعر ابن ابی الرعلہ (؟) غسان کے پادشاہوں اور دیگر بہادر مقتولان جنگ کی اس طرح مدح کرتا ہے :۔

"جو مر گئے اور خاموش ہیں وہ مرے ہوئے نہیں، بلکہ اصلی مرے ہوئے وہ لوگ ہیں جو باوجود زندہ ہونے کے مردہ ہیں :۔

لیس من مات فاستراح بمیت　　　　انما المیت میت الاحیاء

۵۶۳ء میں اپنے حریف کی موت سے بارہ برس بعد حارث قسطنطنیہ گیا، اور اس عرب سردار کا نظارہ رومیوں پر اثر ڈالنے والا ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک رومی نے جسٹینین کو ڈرانے کے لئے کہا "ہوشیار ہو جا! حارث آتا ہے!"

چھٹی صدی عیسوی کے اختتام پر حکومتہائے حیرہ وغسان کا زوال شروع ہوا۔ عمرو بن منذر ثالث اپنے باپ کی جگہ ۵۶۲ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ مستعد لیکن وحشی تھا۔ شعرا نے بھی اُسے بُرا لکھا ہے۔ چبھتی ہوئی ہجو میں اکثر انہوں نے اسے "محرق" یعنی تیز آگ میں جلنے والے کا لقب دیا ہے۔ مشہور شاعر طرفہ اس کے ظلم کا شکار ہوا۔ ایک متداول روایت کی روسے پادشاہ نے اُسے اور اُس کے چچا متلمس کو عمان بھیجا، اور وہاں کے عامل کو ایک خط لکھا، جو ہومر Homer کے اشعار کے دو کلموں سے شروع ہوتا تھا، اور اُس میں اُن دونوں کے قتل کر ڈالنے کا حکم درج تھا۔ متلمس نے اُس خط کا مضمون پڑھ لیا اور اپنی جان بچا لے گیا، لیکن طرفہ مارا گیا۔ عمرو بن منذر نے اپنی مستعدی کا ثبوت قیصر روم کے مقابلہ میں دیا۔ یہ امر شبہ سے خالی ہے کہ قیاصرہ روم نے الصغرے

شاہان حیرہ کو باضابطہ ایک رقم ادا کرتے تھے اور اُس کے بدلے میں شاہان حیرہ کی دوستی، یا وقتاً فوقتاً ساسانیوں کے مقابلے میں لڑائیوں کے موقعوں پر خیر خواہانہ جانبداری مطلوب تھی جسٹن Justin) اس ندامت بخش طریقہ کو دور کر دینا چاہتا تھا لیکن عمرو نے فوراً بازنطینی ماتحت رعایا "غسانیاں" کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ بالآخر عمرو کی کوتاہ نظری اُس کی موت کا باعث ہوئی۔ اُس نے ایک معلقہ کے مشہور مصنف عمرو بن کلثوم کی توہین کی تھی۔ اس نے عمرو کو اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالا۔ مشہور تغلیبی شاعر اختل اپنے چچاؤں کی اس طرح مدح کرتا ہے

"یہ وہ ہیں جنہوں نے پادشاہوں کو قتل کیا، اور اپنی بیڑیوں کو توڑ ڈالا"

عمرو کا جانشین قابوس یا قابوسیس Combus or Combigze ہوا، جو باوجود اپنی بہادری کے جس کا بلاشبہ بعض عرب مصنفوں نے انکار کیا ہے غسانیوں کے خلاف جنگجوئی میں ناکام رہا۔ ۵۸۰ء میں نعمان ثالث ابو قابوس تخت نشین ہوا۔ اکثر شعرائے عرب نے اُس کا ذکر کیا ہے، اور وہ حیرہ کا سب سے مشہور بادشاہ ہوا ہے۔ لیکن فی الواقع وہ سب سے بہتر نہیں ہے۔ وہ اپنے بھائی اسود کے مقابلہ میں عدی بن زید کی مدد سے جو کہ خسرو پرویز کے دربار میں نہایت ذی اقتدار شخص تھا تخت نشین ہوا۔ نعمان کے بعد اپنے محسن کے خلاف اُسے شبہات پیدا ہو گئے اور اُس نے اُسے قتل کر ڈالا لیکن فوراً ہی خسرو کا اعتماد اُس پر سے اُٹھ گیا، اور خسرو نعمان کو ایک دشمن نہ کہ رعایا کی نظر سے دیکھنے لگا۔ خسرو نے نعمان کو گرفتار کر لیا اور سبت (Sabat) میں مرنے تک مقید رہا۔ اُس کی موت کے متعلق ایک روایت تو یہ ہے کہ وہ طاعون میں مرا اور دوسری روایت یہ ہے کہ اُسے زہر دیا گیا، تیسری روایت ہے کہ ہاتھی کے پیروں میں کچلوا دیا گیا۔ خسرو اپنے دشمنوں کو اکثر یہ سزا دیتا تھا۔ شاعر سلمہ بن جندل کہتا ہے :- نعمان نے عرصہ تک خوشنما قبوں کے نیچے پناہ پائی، لیکن اپنی زندگی ایک ایسی چھت کے نیچے گزاری جو ہاتھیوں کے لئے بنی تھی۔ اس طرح خاندان کا خاتمہ ہوا۔ اُس کا جانشین ایاس بن قبیصہ قبیلہ لخم سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ وہ طے کے

قبیلہ سے وابستہ تھا۔ یا یہ کہئے کہ اُس حکومت ہی کا خاتمہ تھا، اس لئے کہ ایاس کے ساتھ ایک اعلیٰ ایرانی عہدہ دار مقرر ہوا، جو اُس کی حکومت کی باگیں اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ بہر حال منذر ثالث کا شاندار اور اچھا زمانہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا اور حیرہ صرف ایک ساسانی صوبہ بن کر رہ گیا۔

نعمان کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد سنہ ۶۰۴ء میں ذو قار کی جنگ ہوئی جس میں عربوں بالخصوص بکر بن وائل نے ایرانی فوج کو شکست دی اس لڑائی نے عربوں کے لئے گویا اُن عظیم الشان فتوحات کا جو انہیں ایرانیوں کے مقابلہ میں بعد میں حاصل ہوئیں دروازہ کھولدیا۔

غسانیوں کا زوال حیرہ کی طرح جلد ہی شروع ہوگیا۔ حارث ششم نے جو کہ حارث اعظم (حارث پنجم) کا جانشین تھا، سنہ ۵۸۳ء کے قریبی زمانہ میں عین اباغ کی جنگ میں منذر چہارم کے مقابلے میں چند بار کامیابی حاصل کی، لیکن غسانیوں کی یہ چھوٹی سی حکومت خود بھی تباہ ہوگئی۔ عمرو چہارم اُن بڑے شاعروں کی بدولت جو کہ اُس کے دربار میں باریاب ہوتے تھے اور جنہوں نے پادشاہ عمرو کے جانشینوں کی مدح سرائی بھی کی ہے، زیادہ مشہور ہے۔ عمرو چہارم کے جانشینوں کے نام اس قدر زیادہ تعداد میں ملتے ہیں کہ انہیں دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض معاصر ہیں، اور ایسے حکمراں نہیں ہیں جن کے تحت سارا رقبۂ ملک تھا۔ ان پادشاہوں کا لقب ہنوز "خیر الفتیان" یعنی "بہترین مردمان" ہے۔ جلد ہی وہ ایسے لوگوں سے جو بظاہر اُن سے زیادہ حقیر لیکن فی الواقع زیادہ قوی تھے مغلوب ہو جاتے ہیں، اور اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں غسانیوں کی پادشاہت ختم ہو جاتی ہے۔

اب ہم چند کلمات اُس تیسری حکومت کے متعلق اور کہنا چاہتے ہیں جس کا تذکرہ ہم نے اوپر حیرہ اور غسانیوں کے ساتھ کیا ہے۔ یہ کندہ ہے، جو پانچویں صدی عیسوی کے اخیر اور چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں جزیزہ نمائے عرب کے وسط میں قائم ہوئی، اور جس کے پادشاہوں میں مشہور شاعر امرء القیس شامل ہے۔

حجر آکل المرار اس حکومت کا بانی بتایا جاتا ہے۔ وہ جنوب کے رہنے والے حمیریوں

کے قریب ہونیکی وجہ سے اُنکے اثر سے نہیں بچ سکتا تھا۔ کندہ کا محل وقوع حمیر کے روبرو بالکل ایسا ہی سمجھنا چاہئے جیسا کہ لخمیوں کا ساسانیوں کے اور غسانیوں کا رومۃ الصغریٰ کے روبرو تھا لیکن کندہ کا ایک زبردست حریف حیرہ تھا۔ کندہ کے ایک پادشاہ حارث بن عمرو نے جو کہ نہایت بہادر تھا حیرہ کے ایک حصہ پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ وہ گاہے حیرہ اور گاہے انبار میں رہا کرتا تھا۔ لیکن منذر نے جلد بالادستی حاصل کر لی۔ ۵۲۹ء میں اُس نے حارث پر حملہ کر کے اُسے بھگا دیا۔ اور محض فتح پر اکتفا نہیں کی، بلکہ کندہ کے بعض امرا اور سرداروں کو جو کہ جنگ میں قید ہو گئے تھے۔ ذبح کرادیا۔ یہ وحشیانہ فعل امرالقیس کے حسب ذیل اشعار جمیلہ کا محرک ہوا۔ امرالقیس اپنے باپ کی کامیابی وناکامی کو کبھی نہیں بھولا:۔

الا یا عین بکی لی شنینا   وبکی لی الملوک الذاہبینا

اے میری آنکھ جلتے ہوئے آنسو بہا   اور شاہان رفتہ کے لئے رو

ملوکا من بنی حجر بن عمرو   یساقون العشیۃ یقتلونا

وہ پادشاہ جو کہ حجر بن عمر کی اولاد سے تھے   اور جو قتل ہو کر رات کے آغوش میں پہنچ گئے ہیں

فلو فی یوم معرکۃ اُصیبوا   ولکن فی دیار بنی مرینا

یہ صحیح ہے کہ وہ میدان جنگ میں مارے گئے   لیکن (ہائے کہاں؟) دیار بنو مرینا میں (جو کہ دشمن ہیں)

تظل الطیر عاکفۃ علیہم   وتنتزع الحواجب والعیونا

پرند اُن (کی نعشوں پر) ہر وقت سایہ کر رہے ہیں۔ اور اُنکے ابرو اور آنکھوں کو اُن سے علیحدہ کر رہے ہیں (یعنی کھائے جاتے ہیں)

کندہ کی بادشاہت بھی جلد ہی تباہ ہو گئی۔ حارث کے لڑکوں سلام اور شراحبیل میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ شراحبیل کلاب میں مارا گیا۔ اس کے پس پردہ متعدد قبائل کی عداوت پوشیدہ تھی۔ ان قبائل نے اسلام سے پیشتر ایام جاہلیت کی مشہور ترین جنگیں اور لڑائیاں چھیڑ دیں۔ امرالقیس نے اپنے اجداد کا انتقام لینے اور کندہ کی بادشاہت کو واپس لینے کی کوشش کی۔ وہ قیصر جسٹنین

(Justinian) کی مدد حاصل کرنے کے لئے قسطنطنیہ بھی گیا۔ اُسے امید تھی کہ حیرہ کا حریف ہونے کے باعث رومۃ الصغریٰ کا قیصر اُسے مہربانی کی نظر سے دیکھے گا۔ لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوا۔ کندہ کی بادشاہت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی

باوجود اپنی چندروزہ میعاد حیات کے یہ بادشاہت عربوں کے مستقبل کے لئے غیراہم ثابت نہیں ہوئی۔ آکل المرار کے عصائے حکومت کے نیچے اتنے قبائل عرب کا مجتمع ہوجانا ہمارے خیال میں جزیرہ نما کے وسطیٰ قبائل کے ایک ہی سردار کے ماتحت مجتمع ہونے کی پہلی مثال ہے۔ یہ اُس تحریک کی تمہید نظر آتی ہے، جو کہ ایک صدی بعد بانی اسلام کے زیراثر مختلف قبائل کے مجتمع ہونے کا باعث ہوئی۔ البتہ ہنوز وہ مذہبی پہلو مفقود تھا، جس نے اسلام کو ایسی عظیم الشان قوت بخشی۔ کندہ کی حکومت محمد صلعم کی وفات کے بعد قبائل عرب کی "ردت" کے زمانہ میں ختم ہوگئی۔ کندہ کی تباہی تو بہر حال نہ رکتی لیکن اُس کے حالات پر غور کرنے سے یہ ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک صدی میں عربوں نے حکومت کا نظام قائم کرنے میں کس حد تک ترقی کرلی تھی۔

حیرہ کے شمال میں اس طرح تین حکومتیں تھیں جنہوں نے عرب کی حکمرانی بانٹ رکھی تھی۔ جن قبائل نے کہ ان حکومتوں کے قائم کرنے میں حصہ لیا وہ اکثر جنوبی عرب سے تعلق رکھتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اُنکے خروج کی وجہ سے اُنکے ہمراہ تمدن کے اصول جن سے کہ شمال کے بادیہ گرد کم وبیش بےخبر تھے، اشاعت پذیر ہوگئے۔ عرب بالخصوص حیرہ وغسان کے عرب ایران ورومۃ الصغریٰ کی جنگوں میں شریک رہتے تھے۔ اُنہوں نے قریب رہ کر ان دونوں سلطنتوں کے تمدنوں کو دیکھا۔ انہوں نے جنگی تجارب حاصل کئے اور اپنے زمانے کے فن حرب کے بہترین اساتذہ سے جنگی تعلیم حاصل کی۔ اس کی عربوں کے لئے جو اہمیت آگے چل کر ثابت ہوئی۔ اُسکا بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے یہ ایک طرح کی بیداری تھی، جو کہ آغاز اسلام کی

فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی - یہ خیال کہ خالد اور مثنیٰ جاہل یا نیم وحشی تھے یا اُنکے لشکر چشم زدن میں اور یک روز بادیہ گردوں کی حالت سے باقاعدہ سپاہیوں کی جماعت میں بدل گئے بالکل غلط ہے - عربوں کی ترقی اُن کی مادی اور ادبی تمدن میں بھی، جیسا کہ ہم اگلے لکچر میں دکھلائیں گے، یکساں نمایاں تھی -

---

کتابخانہ و مطبع بروخیم طہران

انگلیسی دانہا آگاہ باشند

جلد اول فرہنگ جامع انگلیسی بفارسی تالیف اقای س - حئیم کہ کتابخانہ بروخیم مشغول طبع آں بود از طبع خارج شد - ایں جلد دارای ۶۷۰ صفحہ ہر صفحہ دارای دو ستون و ہر ستون دارای ۴۳ سطر میباشد - تعداد لغت و اصلاح ایں فرہنگ تقریباً بہ شصت ہزار بالغ میشود. صحت ترجمہ لغات زیبائی طبع، استحکام صحافی، و ارزانی قیمت است کہ ایں فرہنگ مفصل را بر فرہنگ ہای دیگر کہ در داخلہ و خارجہ بطبع رسیدہ ترجیح میدہد -

قیمت جلد اول ۳ تومان، برای اشخاصیکہ ہر دو جلد را پیش خرید میکنند تومان پس از طبع جلد دوم قیمت آں ۲ تومان خواہد بود -

جلد دوم در تحت طبع و شش ماہ بعد از ایں تاریخ منتشر میشود. مخارج پست ہر جلد در داخلہ ایران ۲ قران و برای خارجہ ۳ قران و نیم است

طہران ۱۵ امرداد ۱۳۰۸

مَن کی موج

(۱)

کل میرے ایک دوست نے کہا "دیکھو یہ پھول کتنا خوبصورت ہے" میں نے سنا اور نفرت سے منہ پھیر لیا، پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے ایک آدمی دکھایا اور کہا "یہ بڑا نیک ہے" میں پھر ادھر سے پلٹ گیا۔ لوگ خوبصورت، نیک، اچھا، بُرا اور اسی قسم کے لفظ بولتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں۔ میں انھیں سنتا ہوں تو رنجیدہ ہوتا ہوں۔ جیسے ہی میرے کانوں میں "خوبصورت" کی آواز آتی ہے، ویسے ہی اندر والا کہتا ہے کہ "پھر بدصورت بھی ہوگا!" جیسے ہی میں "نیک" سنتا ہوں، اندر والا پوچھتا ہے "پھر تو بد بھی کہیں ضرور ہوگا" اگر میں پرندہ ہوتا تو نیک، بد، حسین، کریہہ غرضکہ سب اسمار صفات کی سطح سے اوپر اُڑ جاتا............

میرے ایک دوست نے کہا "پاک اور عقلمند ہو، تو دنیا کو دس گنا زیادہ فائدہ پہونچے" میں نے کہا "تو پاکی کو دور کردے اور عقل مندی کو ہٹا دے تو دنیا کو بیس گنا زیادہ فائدہ پہونچے" وہ خفا ہوگیا۔ وہی اسمائے صفات! کل میں ایک دکان پر گیا، وہاں دیکھا کہ ہر چیز پر رنگ برنگ کی چٹھیاں لگی ہوئی ہیں، جن پر قیمتیں لکھی ہیں۔ کیا انسانوں پر بھی چٹھیاں لگانے کی ضرورت ہے؟ پھر اسمائے صفات کیوں؟ اچھا کیوں؟ برا کیوں؟ نیکی کیوں؟ بدی کیوں؟ ایمانداری، بےایمانی فیاضی، کنجوسی، یہ سب کس لئے؟

میں نے ایک فقیر سے کہا: "لوگ فیاض نہ ہوتے تو اچھا تھا!" اس نے مجھے بہت بُرا بھلا کہا۔ پھر میں نے ایک امیر سے کہا: "لوگ فیاضی کی تعریف نہ کرتے تو اچھا تھا" اُس نے

مجھے اپنے مکان سے نکلوا دیا۔ وہی اسمائے صفات! نیکی پہلے کی گئی، پھر نیکی کہلائی؛ بہادری پہلے دکھائی گئی، پھر صفت بنی؛ فیاضی، ہمدردی، احسان، ظلم، کنجوسی، سب پہلے پیدا ہوئے، پھر ان کو نام دیئے گئے۔ دریا سیدھا بہتا ہو، دیواریں کھڑی کردو تو بہاؤ بدل جائے گا۔ اسی طرح دیواریں کھڑی کرتے جاؤ، تو دریا پانی کی بھول بھلیاں بن جائے گا۔ وہی نام کا پھیرا صفت بندی، درجہ بندی، اسم بندی، سب دراصل دیوار بندیاں ہیں۔ سیدھے راستے سے بہت کم لوگ بھٹکتے ہیں۔ کسی کو نیک مت کہو، کوئی بُرا نہ ہوگا۔ کسی کو سخی مت کہو، کوئی کنجوس نہ ہوگا۔ نفع کی خواہش چھوڑ دو، مکانوں سے پہرا ہٹا لو، چور ڈاکو غائب ہو جائیں گے۔ بہادری مٹا دو، بزدلی بھی مٹ جائے گی۔ حکم اُٹھا لو، عدول حکمی نہ ہوگی، اچھی صفتیں اُٹھا لو، بُری صفتیں آپ جاتی رہیں گی۔ دنیا ان دیواروں کو کیوں پسند کرتی ہے؟

من کی روشنی! یہ بڑی چیز ہے۔ میں اندھیری رات بھی ہو تو من کی روشنی میں سیدھا اپنے گھر چلا جاتا ہوں۔ میرے دوست کے گھوڑے کا بھی یہی حال ہے۔ کل میں نے گلی میں رنگ برنگ کی قندیلیں روشن کیں، فوراً پرچھائیں پڑنے لگی، اور گھوڑا بدکنے لگا۔ رنگین روشنیاں نہ ہوتیں تو رنگین پرچھائیاں بھی نہ ہوتیں۔ دوست نے پوچھا "یہ کیا کرتے ہو؟" میں نے کہا، اسمائے صفات پیدا کرتا ہوں، نتیجہ تم دیکھ لو" رنگین قندیلیں اچھی صفتیں ہیں، پرچھائیاں بُری صفتیں۔ اُس کا نام مٹا دو تو اس کا نام بھی نہ رہے۔ من کی صاف، سفید روشنی سنسار کے ہیر پھیر کے لئے کافی ہے۔ دیکھیں اس پہیلی کو کون بوجھتا ہے؟

---

(۳)

" دنیا بدل رہی ہے "

کل اتفاقاً یہ الفاظ مجھے سنائی دیئے۔ میں حسب دستور اپنے مکان کے دروازے پر

بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ایک نئی عمارت بن رہی ہے۔ مزدوروں نے لکڑی اور بانس کا ایک بڑا اونچا مچان بنایا ہے۔ دو دو تین تین بھاری بھاری پتھر سر پر رکھے ہوئے اس مچان پر چڑھ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا، اور سوچ رہا تھا.......... میں سوچ رہا تھا " کہ کیا اس مکان، اس مچان، ان مزدوروں کی طرح ہم سب اس سنسار میں اپنی بلندی دوسروں کی بلندی کے لئے بناتے ہیں؟...... کیا آتش بازی کی ہوائی کی طرح ہم سب محض اس لئے اوپر اُڑتے ہیں کہ نیچے والے ہمیں دیکھکر خوش ہوں؟........" اتنے میں میرے کان میں یہ الفاظ پڑے:

" دنیا بدل رہی ہے "

میں نے مڑکر دیکھا۔ میرا دوست ہاتھ میں ایک اخبار لئے ہوئے کھڑا تھا، آنکھوں میں چمک، ہونٹوں پر ویسی ہی ہنسی جیسی بالک سپنے میں ہنستے ہیں ـــــ کہنے لگا:- "جانتے ہو یہ کیا بن رہا ہے؟ یہاں بے تار کی خبر رسانی کا اسٹیشن ہوگا۔ ولایت کے گانے، امریکہ کی تقریریں یہاں سنائی دینگی ـــــ دنیا بدل رہی ہے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں جب کبھی "بیسویں صدی" "نیا زمانہ" "نئی دنیا" "نئے خیالات" اور اسی سانچے کے ڈھالے ہوئے دوسرے الفاظ سنتا ہوں، تو بے اختیار ہنس دیتا ہوں، میں نے جواب دیا "ہاں! پُرانی آتما نیا روپ لے رہی ہے، پُرانے چھلکے پر نیا چھلکا نکل رہا ہے، لیکن گودا وہی ہے جو ویدوں کے زمانے سے پہلے تھا۔" میرے دوست نے اپنی عادت کے موافق بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا "تم نے تو دنیا تج دی ہے، جگ کے اُلٹ پھیر تم کیا جانو؟ کل صبح زبردستی تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گا، تب تم کو معلوم ہوگا کہ ہماری دھرتی کروٹ لے رہی ہے یا نہیں۔" یہ کہا اور ہنستا ہوا چلا گیا ـــــ

میں دور تک اسے دیکھتا رہا۔ کیسے بے فکر اور بھولے لوگ ہیں؟ ایک جیب میں ولایتی سونا ہے، دوسرے میں دیسی کسوٹی۔ اُسے اس پر کستے ہیں، زرد لکیر دیکھکر اسے کندن سمجھتے ہیں

اصل بدلنا تو کسوٹی کا ہے! میں پھر مکان، مچان اور مزدوروں کی دھن میں لگ گیا۔ یہ دو ہاتھ دو پاؤں کے پتلے، اسی طرح اپنی ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ نیچے سے اوپر لے جا رہے تھے!

آج میرا دوست مجھے دن بھر شہر میں اِدھر اُدھر پھراتا رہا۔ اس نے مجھے نئی نئی عمارتیں دکھائیں، پرانے اینٹ پتھر کے نئے استھان! پرانی آتما کے نئے چولے!! "یہ نئی سڑک ہے، اس پر ٹریم چلے گی"....... "یہ نیا بنک گھر ہے" "یہ نئی دوکان ہے" "یہ نئے قسم کا مدرسہ ہے"...... خدا معلوم کیا کیا بتاتا رہا، اور باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت خوش تھا، جیسے لڑکیاں ہنس ہنسکر اپنی سہیلیوں سکھیوں کو پرانی گڑیوں کے نئے زیور دکھاتی ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، آنکھیں نئے نئے روپ دیکھ رہی تھیں، کانوں میں اس کی آواز آ رہی تھی لیکن اندر والا گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح یہ کہہ رہا تھا "اصلی بدلنا تو کسوٹی کا ہے" جب تھک گیا تو کہنے لگا "اب بھی قائل ہوئے کہ نہیں! شانتی پور بدل رہا ہے، دنیا بدل رہی ہے" میں ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا ـــ

سامنے ایک حلوائی کی دکان تھی، ترازو ہاتھ میں لئے ہوئے کچھ تول رہا تھا۔ میں اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں لے گیا۔ حلوائی سے کہا:

" لالہ! دنیا بدل رہی ہے، تم اپنے باٹ بدل دو" ہنسنے لگا۔ کہا " ہمارے یہاں اسی کا چلن ہے، گاہک نہیں مانتے ...." پھر ایک بزاز کے یہاں گئے، کپڑا ناپ رہا تھا، میں نے کہا " اپنا گز نہیں بدل دیتے " اس نے منہ پھیر لیا........

راستے میں ایک سپاہی ملا، اُس کے ساتھ ایک بھلا مانس تھا، ہاتھ میں ہتکڑی، آنکھ میں شرافت! میں نے کہا " جمعدار صاحب! اسے کیوں پکڑا ہے؟" کہنے لگا: " اس نے اپنے بھوکے بچوں کے لئے آٹا چرایا ہے" میں نے کہا " کیا کوتوال صاحب نے چوری کا معیار ابھی نہیں بدلا" وہ مجھے بُری نظروں سے گھورتا ہوا چلا گیا ـــ سچا بول اندرائن کا پھل ہوتا ہے!

تھوڑی دور چل کر ایک مکان میں پہونچے، ایک لکڑی کے تختے پر بڑے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا "سیٹھ اشرفی مل کا پُن خانہ" ہزاروں اپاہج اور نکمے جمع تھے۔ زبردستی کے اپاہج! کام کے نکمے!!! میں نے داروغہ سے پوچھا "بھائی! انہیں خیرات کیوں دیتے ہو؟" کہنے لگا "نیک کام ہے، سیٹھ کی دیا معلوم ہوتی ہے، فیاضی ہے۔" نیک کام! دیا!! فیاضی!!! سب وہی پرانے سانچے، کیا واقعی دنیا بدل رہی ہے۔

پرانے باٹ، پرانا گز، پرانا قانونی معیار، پرانا اخلاقی معیار! دنیا میں ہر طرف وہی پرانی کسوٹی! اور اندر سے آتما کی وہی پُرانی گھڑی کی سی ٹک ٹک "اصلی بدلنا تو کسوٹی کا ہے" — میں نے اپنے دوست کی طرف غور سے دیکھا، اُس نے آہستہ سے کہا "معلوم ہو گیا، اب لوٹ چلو۔"

دھرتی آئے دن نیا سونا اُگلتی ہے، سنسار اپنا روپ نت نیا بدلتا ہے، پُرانے باٹ گھس گئے، پُرانے گز چھوٹے ہو گئے، بہت سے پُرانے جرم ہلکے ہو گئے، پُرانی نیکیاں، بدیاں بنیں، پُرانی بدیاں نئے سانچوں میں ڈھلیں، پھر دنیا انہیں کیوں نہیں بدلتی؟ بالکوں کی طرح ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو کلیجے سے کیوں لگائے ہوئے ہے؟ ست جگ کے ست کو کلجگ میں بھی ست کیوں جانتی ہے؟ ایک پُن خانہ بنا کر دس کی بنیاد کیوں رکھتی ہے؟ آج سانپ کی رکھشا کر کے کل نیولا کیوں پالتی ہے؟........ نئے کندن کے لئے نئی کسوٹی کیوں نہیں ڈھونڈھتی؟ وہی حلوائی کی بات:

"گاہک نہیں مانتے"

اب میرا دوست دھرتی کی کروٹ کا قائل نہیں رہا، میں اُس سے کبھی کبھی ہنسی سے پوچھتا ہوں "دنیا کب بدلے گی؟" اس سوال کو سن کر اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ آنکھیں پھیل کر ایسی ہو جاتی ہیں جیسے کوئی شام کے دھندلکے میں دور کی چیز دیکھ رہا ہو، وہ بہت دھیمی

آواز سے جواب دیتا ہے:

"جب گاہک بانیں گے"

(باقی آیندہ)

غزل

جناب دل شاہجہانپوری

جویائے حقیقت ہوں عالم سے جداگانہ
دل مائل کعبہ ہے رُخ جانب بتخانہ

تاثیر بیاں بھر دے اسے گردش پیمانہ
ساقی کو سنانا ہے افسانہ در افسانہ

ہر ذرے میں در پردہ اک شعلہ بھڑکتا ہے
اے اہل نظر دیکھو خاکستر پروانہ

پردے سے عیاں ہوکر پردے میں نہاں ہوجا
چھا جائیگی خود حیرت اے جلوہ جانانہ

ہے مشرب رنداں میں انداز طلب یہ بھی
ہر گردش ساغر پر اک نعرہ مستانہ

جب صاعقہ لہرائے حد جانا منزل کی
چل وادی ایمن تک سن طور کا افسانہ

یوں جل کے سر محفل تصویر وفا کھینچی
پھرتی ہے نگاہوں میں جانبازی پروانہ

حالات الم کہکر بیمار نے دم توڑا
آخر کا یہی ٹکڑا تھا حاصل افسانہ

کیا جانے کہاں سو جیں کھینچے لئے جاتی ہیں
پہنچا ہمیں ساحل تک اے ہمت مردانہ

دنیا حقیقت میں آزاد تعین ہیں
ہم نے کبھی ٹکرایا کعبہ سے نہ بت خانہ

اک مست ابھی اے دل کہتا ہوا گذرا ہے
صد زہد بیک جرعہ نذر مے و میخانہ

ڈراما کیا چیز ہی؟

میں ہندوستانی اکادمی کی فرمائش سے برنارڈ شا کے ناٹک سینٹ جون کا ترجمہ کر رہا ہوں اور اس پر مقدمہ بھی لکھ رہا ہوں۔ یہ اس مقدمہ کا پہلا خاکہ ہے جو مکرمی جناب ڈاکٹر تاراچند صاحب سکرٹری ہندوستانی اکادمی کی اجازت سے جامعہ میں شائع کیا جاتا ہے۔

(۱)

آرٹ کی تعریف | قبل اس کے کہ ہم ڈراما کی ماہیت سے بحث کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آرٹ کی مختصر سی تعریف کر دی جائے۔ آرٹ کا لفظ اب اردو زبان میں کثرت سے استعمال ہونے لگا ہی لیکن اس کا کوئی واضح مفہوم ہم لوگوں کے ذہن میں نہیں ہی۔ اصل میں یہ دو مختلف معانی پر حاوی ہے

(۱) وہ تخلیقی قوت جس کے ذریعے سے انسان مادی اشیا اور ذہنی تصورات کی تشکیل اس طرح کرتا ہی کہ وہ حسین بن جاتی ہیں، یعنی ان میں ایک خاص ترتیب، تناسب یا توازن پیدا ہو جاتا ہی اور وہ مشاہدۂ جمال کے ذوق کو جو ہماری طبیعت کا فطری خاصہ ہی تسکین دیتی ہیں۔ مثلاً مصوری یعنی وہ قوت جس کے ذریعے سے سطح کاغذ پر دلکش اور خوشنما نقوش بنائے جاتے ہیں۔

(۲) حسین چیزیں جو اس وقت قوت تخلیق کے محسوس مظاہر ہیں تصویر، نغمہ، شعر وغیرہ دوسرے الفاظ میں آرٹ صناع کے کمال کو بھی کہتے ہیں اور ان مصنوعات کو بھی جن میں یہ کمال ظاہر ہوتا ہو۔

غرض آرٹ ایک طرح کی صنعت ہی لیکن اس کی خصوصیت یہ ہی کہ اس کا اصل مقصد افادی یا اقتصادی نہیں ہوتا بلکہ جمالیاتی ہوتا ہی یعنی ذہنی ذوق جمال کو تسکین دینا۔ اس کے لئے

یہ ضروری نہیں ہے کہ موضوع صنعت خود حسین ہو بلکہ حسن طرز ادا کی خوبی اور دلکشی سے پیدا ہوتا ہے
البتہ یہ شرط ہے کہ موضوع میں تناسب اور ہم آہنگی کے ساتھ تشکیل پانے کی صلاحیت موجود ہو
اب چاہے صناع اس کی عکسی تصویر پیش کر دے یا اس میں اپنے تخیل سے رنگ آمیزی کرے۔

آرٹ زندگی کی دوسری قدروں یعنی مذہب اخلاق یا علم و حکمت وغیرہ کے مقابلے میں اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے لیکن ان سے بے تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے لئے شعر کو لیجئے۔ اس کے ناقص یا کامل ہونے کا معیار مذہب اخلاق اور علم سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ شعر میں ہم جو چیز ڈھونڈتے ہیں اور جس سے شاعری کی جان سمجھتے ہیں وہ روحانی معرفت یا اخلاقی بصیرت یا علمی حقیقت نہیں بلکہ خیالات اور الفاظ کی خوشنمائی ترتیب، ہم آہنگی، روانی اور دلکشی ہے جس کے ذریعے سے شاعر کا تخلیق حسن کا شوق اور شعر فہم کا شاہدۂ جمال کا ذوق پورا ہوتا ہے
یہ سچ ہے کہ شعر کا موضوع انسانی زندگی اور عالم فطرت کا ہر جلوہ ہے اس لئے اس میں کبھی کبھی مذہبی عقیدت کا اظہار یا نیکی کی تلقین یا علمی حقائق کی تعلیم بھی ہوتی ہے لیکن مخصوص شاعرانہ رنگ میں جس میں خیالات کا وزن اتنا نہیں ہونے پاتا کہ طرز ادا کی سبک روی میں خلل پڑے۔

آرٹ سب سے زیادہ موثر اس وقت ہوتا ہے جب اسکا موضوع انسان کی زندگی اُس کے جذبات، اُس کے خیالات، اُس کی آرزوئیں اور اُس کے کام ہوتے ہیں۔ بعض فنون لطیفہ مثلاً موسیقی، نقاشی، سنگتراشی وغیرہ میں ہمیں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن ادب کے بعض شعبوں مثلاً شعر، ناول، ڈراما وغیرہ میں کبھی کبھی زندگی کا مجموعی مرقع نظر آتا ہے۔ جو ہمارے لئے نہایت دلچسپ ہے اور جس کا اثر ہمارے دل پر بہت گہرا اور بہت دیرپا ہوتا ہے۔ یہ مرقع بظاہر ایک شخص یا چند اشخاص کی زندگی کا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ ایسی قوت محرکہ پنہاں ہوتی ہے کہ انسان کا تصور ساری نوع انسانی کی زندگی پر پھیل کر اس میں یوں جذب ہو جاتا ہے جیسے سمندر میں کنکری پھینکنے سے

لہروں کا ایک دائرہ بنے اور بڑھتے بڑھتے اُس کی بے پایاں وسعت میں محو ہو جائے۔ یہ قطرے میں دریا اور جزو میں کل نظر آنا آرٹ کے اکثر شعبوں میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا اظہار پوری طرح ڈراما میں ہوتا ہے۔

(۲)

ڈراما بہ حیثیت آرٹ کے ایک شعبے کے | ڈراما یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مصدر draō ہے جس کے معنی ہیں کر کے دکھانا۔ یہ ادب کی اس صنف کا نام ہے جس کے ذریعے سے انسانی زندگی کے واقعات محض بیان کئے جانے کے بجائے کر کے دکھائے جا سکیں۔ ڈراما میں شاعر کو جو قصہ بیان کرنا ہوتا ہے اسے چند اشخاص کی گفتگو کے پیرائے میں بیان کرتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ان اشخاص کا بھیس بدل کر انکی گفتگو اور انکے کاموں کو دہرائیں تاکہ دیکھنے والوں کو سارا ماجرا آنکھوں کے سامنے گزرتا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ بہت دلپذیر اور موثر ہے اور ادب کے کسی اور شعبے کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی۔

پہلے ڈراما شاعری کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا اور ہمیشہ نظم میں لکھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس نے ایک مستقل ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اب اس کے لئے نظم کی شرط نہیں رہی بلکہ نظم میں ڈراما لکھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

ڈراما اور ناول میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں انسانی زندگی کے مختلف جلوے دکھاتے ہیں۔ لیکن ناول کا اثر صرف تخیلی مشاہدے پر پڑتا ہے اور ڈراما کا حسی مشاہدے پر بھی۔ ناول میں مصنف دوسروں کی سرگزشت بیان کرتا ہے مگر ڈراما میں وہ خود اشخاص کو گفتگو کرنے دیتا ہے اور اسی گفتگو میں ان کی جذبات، انکے خیالات، ان کی سیرت ان کا عمل غرض ان کی ساری زندگی دکھاتا ہے۔ ناول لکھنے والا آزاد ہے کہ اپنی کہانی کو سو صفحے میں لکھے یا ہزار صفحے میں کیونکہ ناول پڑھنے والے کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں مگر ڈراما لکھنے والے کو یہ اندازہ کرنا پڑتا ہے کہ قصہ ٹھیک اتنا بڑا ہو کہ تین یا ساڑھے تین گھنٹے میں دکھایا جا سکے۔ اس سے زیادہ یا اس سے کم نہ ہو

۔ناول میں واقعات چاہے جتنے زمانے پر پھیلا دئے جائیں اُس کے اثر میں کوئی خلل نہیں پڑتا کیونکہ وقت کے طول کو صرف تخیل کے سامنے پیش کرتا ہے مگر ڈراما میں قصے کا زمانۂ وقوع کم سے کم رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہاں وقت کے طول کا مشاہدہ کرانا ہے۔ ناول میں ایک شخص کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے مرنے تک کے حالات تفصیل سے بیان کئے جا سکتے ہیں مگر ڈراما میں چند دنوں یا چند ساعتوں کے واقعات میں اس کی زندگی کی مکمل تصویر دکھانا پڑتی ہے۔ غرض بمقابلہ ناول کے ڈراما میں کہیں زیادہ پابندیاں اور دشواریاں ہیں۔ یہاں بہت محدود ذرائع سے کام لیکر بہت گہرا اثر پیدا کرنا ہے اس لئے نہایت واضح مشاہدے، صحیح قوت انتخاب اور موثر طرز ادا کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کوئی شخص اکبر اعظم پر ایک ڈراما لکھتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اکبر کے سوانح حیات پر اتنا عبور رکھتا ہو اور اس کا تصور اتنا واضح ہو کہ قصہ لکھتے وقت اس بادشاہ کی ساری زندگی متحرک تصویروں کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر جائے۔ اب اس کی قوت انتخاب کا کام ہے کہ ان میں سے چند تصویریں چھانٹ لے جو اتنی موثر اور اتنی معنی خیز ہوں کہ دیکھنے والا ان کے بیچ کے خلو کو آسانی سے پر کر سکے اور اسے پورا سلسلہ نظر آجائے۔ ظاہر ہے کہ ان تصویروں کو دکھانے کے لئے اس کے پاس صرف دو ذریعے ہیں گفتگو اور عمل، انہیں دونوں چیزوں کے ذریعے سے اُسے اکبر اور اُس کے زمانے کے لوگوں کی سیرت، اُنکے جذبات وخیالات اُنکے اغراض ومقاصد، اُن کے آپس کے تعلقات، اُن کی باہمی کشمکش، ان کی کامیابی اور ناکامی کا نقشہ کھینچنا ہے۔ اس لئے وہ ایسے الفاظ اور ایسے اعمال اختیار کرے گا جو چشم وگوش کو فوراً متوجہ کرلیں، ادراک میں سما جائیں دل میں بیٹھ جائیں، وہ اس کا بھی خیال رکھے گا کہ گفتگو اور عمل میں صحیح تناسب قائم رہے۔ جہاں تک اسٹیج کے ذرائع اور اثر آفرینی کے اصول اجازت دیتے ہیں وہ واقعات کو عمل کے ذریعے سے دکھائے گا لیکن جب ان کا دکھانا ناممکن یا نامناسب ہو تو ان کا ذکر گفتگو میں لے آنے پر اکتفا کرے گا غرض اُس کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کے ناٹک کا پڑھنے والا دو گھنٹے کے مطالعے میں اور اس کا تماشا دیکھنے والا تین چار گھنٹے کے مشاہدے میں اکبر اور اُس کے

عہد کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دیکھ لے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ڈراما کو آرٹ کے معیار پر پہنچانے کے لئے ابھی ایک شرط باقی ہے جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ قطرے میں دریا اور جزو میں کل دکھانا یعنی انفرادیت میں عمومیت پیدا کرنا ڈراما کا اہم ترین مقصد ہے اس لئے جس ناٹک کا ذکر اوپر کی مثال میں ہے وہ کامیاب اس وقت کہلائے گا جب اس میں اکبر اور اس کے ساتھیوں کے حالات اس طرح دکھائے جائیں کہ دیکھنے والے پر زندگی کے گہرے راز جو اکبر میں اور نوع انسانی کے ہر فرد میں مشترک ہیں کھل جائیں۔

ابتک ہم نے ڈراما پر بہ حیثیت آرٹ کے ایک شعبے نظر ڈالی ہے اور یہی اس کی اصلیت ہے جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ذوق مشاہدہ کو انسانی زندگی کا دلکش جلوہ دکھا کر تسکین دے۔ اس سے ضمنی طور پر کسی خاص اخلاقی، سیاسی، معاشی نظرے کی تبلیغ، یا عام اصلاح اور تعلیم کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور ہمیشہ لیا گیا ہے۔ لیکن اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس ضمنی مقصد کے لئے کھلی ہوئی کوشش نہ کیجائے بلکہ وہ تماشے کے لطف کے ساتھ پردے پردے میں حاصل ہو جائے۔ اگر اصلاحی یا تعلیمی رنگ غالب آگیا تو پھر ڈراما ڈراما نہیں رہتا بلکہ ایک اخلاقی قصہ بن جاتا ہے اور خالص آرٹ کے دائرے سے باہر ہو جاتا ہے۔

(۳)

<u>ڈراما کے بنیادی عناصر</u> | ڈراما دو بنیادی عناصر سے مرکب ہے جو مساوی اہمیت رکھتے ہیں (۱) قصہ (۲) اشخاص۔

ڈراما کے قصے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کے واقعات بہت موثر اور جاذب نظر ہوں، ہر چیز کر کے دکھائی جا سکے، کوئی جزو ایسا نہ ہو کہ مصنف کو الفاظ میں سمجھانے یا بیان کرنے کی ضرورت ہو۔ قصے کے کچھ اجزا خصوصاً ایسے حصے جن کے دیکھنے سے کراہت ہو اگر عمل کے ذریعے سے نہ دکھائے جائیں بلکہ اشخاص کی گفتگو میں انکا ذکر آئے تو کوئی حرج نہیں لیکن ایسے حصے ڈراما میں جتنے کم ہوں اچھا ہے، کیونکہ جب کوئی ناٹک تھیٹر میں دکھلایا

جاتا ہے تو دیکھنے والے سارے قصے کو آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُس کا بیان کانوں سے سن کر انہیں اطمینان نہیں ہوتا۔

قصے کو زیادہ دلچسپ اور دلنشیں بنانے کے لئے ضروری ہے کہ واقعات کا رخ بالکل سیدھا اور یک رنگ نہ ہو بلکہ اُن کا رجحان کم سے کم دو مختلف سمتوں میں ہو، تاکہ دیکھنے والے کو آخری سین تک یہ اشتیاق رہے کہ انجام کیا ہوگا۔ اس اثر کو گہرا کرنے کے لئے ڈراما میں دو یا زیادہ قوتوں کی باہمی نزاع اور کشمکش دکھائی جاتی ہے خواہ یہ مجرد قوتیں مثلاً تقدیر، وتدبیر نیکی اور بدی وغیرہ ہوں یا اشخاص اور جماعتیں ہوں۔

سب سے اہم بات جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ ہے کہ قصے کے واقعات سے عمومیت ظاہر ہو یعنی دیکھنے والے پر یہ اثر پڑے کہ زندگی کے جو نشیب و فراز، قصے کے اشخاص کو پیش آئے ہیں وہ دنیا میں سب کو پیش آیا کرتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو ڈراما محض تھوڑی دیر کے لئے ہمیں متوجہ کر سکے گا اور ہمارے دل پر اس کا کوئی گہرا نقش نہ بیٹھنے پائے گا۔

اشخاص کی اہمیت ڈراما میں ناول سے اور افسانے کی دوسری اصناف سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں مرقع کی مرکزی تصویر انسان کی ذات ہے اور خارجی دنیا محض پس منظر کا کام دیتی ہے۔ عالم فطرت کے جلوے دکھائے جاتے ہیں انکا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے آئینے کے لئے زنگار کا کام دیں۔ اور چونکہ ڈراما کو فوری اور قوی اثر پیدا کرنے کے لئے ہر نقش میں گہرا رنگ بھرنے کی ضرورت ہے اس لئے اشخاص کی سیرت میں جیتی تازگی اور زندگی پیدا کرنے میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

ڈرامانگار کے لئے اشخاص کی اندرونی زندگی کی واضح اور جاذب نظر تصویر کھینچنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اُسے اس کی اجازت نہیں کہ ناول لکھنے والوں کی طرح کسی شخص کی نفسی کیفیات کی تحلیل اپنی طرف سے کر سکے۔ اس کے اشخاص خود اپنی گفتگو اور اپنے عمل سے اپنی سیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس اظہار کے لئے مناسب موقعے پیدا کرنا ایک دوسرے سے

مشابہ اور متضاد اشخاص کو اس طرح جمع کرنا کہ ان کی گفتگو سے ہر ایک کے دل کی گہرائی پر روشنی پڑے، ان میں باہمی کشمکش پیدا کرنا تاکہ ان کی خصوصیات اچھی طرح ابھر آئیں یہی ڈراما نگاری کا کمال ہے۔

مگر اس سے بھی زیادہ کمال یہ ہے کہ اشخاص میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ جو اُن کی ناگزیر صفت ہے ایک طرح کی عمومیت پیدا کیجائے۔ شخص یا کیرکٹر کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ اپنی سیرت میں جداگانہ اور مخصوص صفات رکھتا ہو جو اُسے دوسروں سے ممتاز کریں۔ ڈراما نویس مجبور ہے کہ اکثر صورتوں میں اس شان کو قائم رکھے۔ لیکن اسی کے ساتھ اُس سے یہ بھی توقع کیجاتی ہے کہ وہ اپنے قصے کے اہم اشخاص کو کسی طبقے، کسی جماعت یا پوری نوع انسانی کے نمائندوں کی حیثیت سے پیش کرے تاکہ اُس کی مثال دوسروں پر بھی صادق آسکے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔

اوپر کے صفحوں میں ڈراما کے بنیادی عناصر کا عام حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ڈراما کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور ہر قسم میں یہ عناصر ایک خاص صورت اختیار کرتے ہیں اس لئے ان سے کسی قدر تفصیلی بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اقسام ڈراما کے ذکر کے سلسلے میں ان پر جدا جدا نظر ڈالی جائے۔

(۴)

ڈراما کی قسمیں ڈراما کے قصے کا پڑھنے والوں اور دیکھنے والوں کے احساس و جذبات پر جو عام اثر پڑتا ہے اُس کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں (۱) المیہ (۲) فرحیہ۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ ڈراما میں جذبات پر بہت گہرا اثر ڈالنا ہوتا ہے تاکہ تھوڑی سی دیر میں دیکھنے والے کا احساس و مشاہدہ کافی لطف اندوز ہو سکے۔ جس طرح انسان کے سارے جذبات میں احساس کی دو بنیادی کیفیتوں راحت والم میں سے کوئی کیفیت ضرور موجود ہوتی ہے اُسی طرح ڈراما کے پڑھنے یا دیکھنے سے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں اُن میں بھی راحت یا الم کا

رنگ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی ڈراما زندگی کا المناک پہلو دکھاتا ہے اور دیکھنے والے کے دل پر لطف مشاہدہ کے ساتھ حسرت والم کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ کبھی فرحناک پہلو کا منظر دکھاتا ہے اور انسان کو محظوظ ہی نہیں بلکہ مسرور بھی کرتا ہے۔ یوں تو ہر ڈرامے میں یہ دونوں رنگ موجود ہوتے ہیں لیکن کسی میں ایک غالب ہوتا ہے اور کسی میں دوسرا۔ جس ڈرامے میں الم کا رنگ زیادہ گہرا ہو وہ المیہ کہلاتا ہے جس میں راحت کا ہو اُسے فرحیہ کہتے ہیں۔ بعض وقت المناک اور فرحناک عناصر کا پلہ برابر ہوتا ہے۔ ایسے ڈراما کو ہم المفرحیہ کہہ سکتے ہیں اور اسے ایک تیسری قسم قرار دے سکتے ہیں لیکن زیادہ رواج ڈراما کی دو ہی قسموں نے پایا ہے۔ اس لئے ہم صرف انہیں ذکر کرینگے۔

المیہ جو شخص شاہدۂ نفس سے کام لیتا ہے وہ جانتا ہے کہ الم کا جذبہ راحت سے زیادہ قوی گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ راحت و مسرت سے انسان کے جسم و روح پر ایک مستی سے چھا جاتی ہے ایک نشہ سا مسلط ہو جاتا ہے اس لئے اس کا احساس کسی قدر کند ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انتہائی خوشی کے عالم میں انسان کو اپنی کچھ خبر نہیں رہتی۔ اور جب یہ کیفیت گذر جاتی ہے تو اسے ہوش آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا خوش تھا۔ بہ خلاف اس کے الم حس اور ادراک کو اس قدر تیز کر دیتا ہے کہ انسان کو اس کی ہر خلش، ہر کسک، صاف محسوس ہوتی ہے۔ جب تک ہم کسی جسمانی یا روحانی کرب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کا احساس ہمارے دل پر چھایا رہتا ہے۔ کسی دوسرے احساس کو ابھرنے نہیں دیتا۔ اس لئے ڈراما کی دو خاص قسموں میں سے المیہ اثر کے لحاظ سے فرحیئے سے بہت بڑھا ہوا ہے چنانچہ پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ڈراما کا اصل آرٹ المیئے میں ظاہر ہوتا ہے اور فرحیہ محض ایک دل بہلانے کا کھلونا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال مبالغے پر مبنی تھا اور جدید زمانے میں غالبًا شیکسپیر کے فرحیوں کے دیکھنے کے بعد اہل نظر سے بدلنے پر مجبور ہوئے لیکن اس میں اب بھی اسی کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی ہر زبان میں بہترین ناٹک تقریبًا سب کے سب المیئے ہیں۔

المیے کے پڑھنے یا دیکھنے سے جو کیفیت لوگوں کے قلب میں پیدا ہوتی ہے اس میں

سب سے نمایاں حسرت والم کے جذبات ہیں لیکن انکے ساتھ خوف و عبرت، ہمدردی اور تعریف بھی ملی جلی ہوتی ہے۔ جو ڈراما محض رنج و مصیبت کی تصویر ہو جس کے دیکھنے سے سوائے غم اور اندوہ افسوس اور رقت کے اور کوئی اثر دل پر نہ ہو وہ المیہ نہیں بلکہ میلوڈراما (رقت انگیز ڈراما) کہلاتا ہے۔ کسی شرابی کا شراب خوری کی بدولت، تباہ ہو جانا، کسی جواری کا قمار بازی کے پیچھے گھربار لٹا دینا، ایسے واقعات ہیں جنہیں دیکھ کر رنج ہوتا ہے تکلیف پہنچتی ہے لیکن سوائے ان لوگوں کے جن کی طبیعت میں غیر معمولی درد ہو کسی کو ان بدنصیبوں سے ہمدردی نہیں ہوتی اس لئے یہ واقعات میلوڈراما کے موضوع ہو سکتے ہیں مگر المیے کے نہیں۔ کسی بیمار کے جسمانی یا دماغی آلام، کسی مفلس کی فاقہ کشی کی مصیبت دیکھنے والوں کے دل میں افسوس کے ساتھ ہمدردی کے جذبات بھی پیدا کرتی ہے لیکن بجائے خود تعریف کی مستحق نہیں اس لئے جو قصہ محض ان چیزوں کے ذکر پر مبنی ہو اس میں المیئے کا رنگ پیدا نہ ہوگا۔ المیے کی شان یہ ہے کہ اُس کا ہیرو بلند ہمت اور بلند سیرت ہو اُس پر کوئی ایسی مصیبت پڑے جو دل میں رعب اور دہشت پیدا کرتی ہو، جس میں خود ہیرو کا قصور نہ ہو یا ہو بھی تو نیک نیتی سے، وہ ہمت اور شجاعت سے اس مصیبت کا مقابلہ کرے۔ مگر آخر میں مغلوب ہو کر ہلاک یا تباہ ہو جائے۔ مثال کے لئے شکسپیر کا المیہ آتھیلو لے لیجئے۔ آتھیلو ایک عرب نسل کا سپاہی ہے جو وینس کی جمہوری ریاست میں سپہ سالاری کی خدمت پر مامور ہے۔ وینس کے ایک امیر کی لڑکی ڈیسڈیمونا اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور آتھیلو بھی اس کی محبت میں وارفتہ ہو جاتا ہے۔ باوجود ڈیسڈیمونا کے باپ کی مخالفت کے وینس کے فرمان روا ڈیوک کے حکم سے ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ آتھیلو کا ایک بدنفس ماتحت ایاگو کچھ کینہ پروری سے اور کچھ مقتضائے طبیعت سے اُس کے دل میں یہ شبہ پیدا کر دیتا ہے کہ ڈیسڈیمونا ایک اور فوجی افسر کیسیو سے ناجائز محبت رکھتی ہے۔ ایاگو کی شیطانی چالوں سے آتھیلو کا یہ شبہ یقین کے درجے تک پہنچ جاتا ہے وہ ڈیسڈیمونا کو قتل کر دیتا ہے اور اس کے بعد خود بھی جان دیدیتا ہے۔ اس ڈراما کو پڑھئے تو آپ دیکھیں گے کہ آتھیلو کی بہادری، بلند حوصلگی، عالی ظرفی، سادگی

اور ڈیسڈیمونا کا حسن، اُسکا بھولا پن اُس کی محبت عصمت وعفت وفاداری، ہمارے دل کو ابتداء سے موہ لیتی ہیں اور ہم ہیرو اور ہیروئن سے سچی محبت اور انکا سچا احترام کرنے لگتے ہیں - پھر رقابت کا جذبہ جو آتھیلو کے سینے میں جہنم کی آگ کی طرح بھڑکتا ہے اور اس کے جسم و روح کو جلائے ڈالتا ہے ہماری طبیعت میں ایسی گہری دہشت پیدا کرتا ہے جو شائد سخت سے سخت جسمانی اذیت کا منظر دیکھ کر بھی نہ پیدا ہوتی - آتھیلو جس جوانمردی اور عالی ظرفی سے اس جذبے کو دبانے کی کوشش کرتا ہے - اسے دیکھ کر ہم بے اختیار اس کی تعریف کرتے ہیں، مگر آخر میں جب ہم پر یہ دردناک حقیقت کھلتی ہے کہ اس دنیا میں اتھیلو کا سا ہیرو غصے اور غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے ڈیسڈیمونا کی سی ہیروئن اپنے چہیتے اور چاہنے والے شوہر کے ہاتھوں بےگناہ قتل ہوتی ہے تو ہم رنج والم، افسوس اور ہمدردی کے جوش سے بیتاب ہو جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ہم پر ایک پراسرار رعب چھا جاتا ہے، ایک گہری عبرت طاری ہو جاتی ہے اور یہی المیے کی جان ہے -

المیہ لکھنے میں یہ اثر مختلف طریقوں سے پیدا کیا جاتا ہے کبھی اس کا ہیرو باوجود اپنی اعلیٰ سیرت کے کسی خلقی کمزوری یا غلط فہمی کے سبب سے خود اپنی تباہی کا باعث ہوتا ہے، کبھی وہ مافوق الافراد یا مافوق الفطرت قوتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر ہلاک ہوتا ہے اور کبھی اس کے پیش نظر دو متضاد مقاصد یا نصب العین ہوتے ہیں جن میں سے وہ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا اور اسی کشمکش میں مارا جاتا ہے -

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ڈراما کا ایک بڑا اہم عنصر عمومیت ہے یعنی قصے کو اس طرح بیان کرنا کہ ایک خاص شخص کی زندگی پر عام انسانی زندگی کا قیاس کیا جا سکے- اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ڈراما لکھنے والے بہت سے ذرائع اختیار کرتے ہیں، ایک ذریعہ یہ ہے کہ قصے کا ہیرو بادشاہ یا کوئی اور بلند مرتبہ شخص بنایا جائے جس کا انجام ایک پورے ملک یا پوری قوم کی زندگی پر اثر ڈالے اور سارے انسانوں کے لئے سرمایہ عبرت ہو یا پھر اس کی ذات ایک علامت

(Symbolism) ہو جس سے پوری نوع انسانی یا ایک پوری قوم مراد لی جا سکے۔ مثلاً ٹیگور کے ڈرامے پوسٹ آفس کا ہیرو اامال مشرقی انسان کی روح کی علامت مجسم ہے اور اس کی تمنائے آزادی نوع انسان کی اس ابدی آرزو کی علامت ہے کہ وہ عالم مجاز سے نجات پاکر عالم حقیقت تک پہنچے۔

دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ قصے کے ہیرو پر جو مصیبت آئے اس کا ذمہ دار مافوق الفطرت قوتوں مثلاً تقدیر کو یا دیوتاؤں کو یا شیطانی روحوں کو قرار دیا جائے۔ اس سے قصے کے پڑھنے والوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان قوتوں نے جن کا اثر سب انسانوں پر عام ہے جو ایک شخص کے ساتھ کیا وہی سب کے ساتھ کر سکتی ہیں۔ جدید زمانے میں لوگ ان چیزوں کے قائل نہیں اس لئے ڈراما نویس عموماً ان کی جگہ وراثت سے کام لیتے ہیں یعنی کسی شخص کی مصیبتوں کا ذمہ دار اس کے اسلاف کے موروثی اثر کو قرار دیتے جیسے ابسن کے ڈرامہ ”خبیث روحیں“ کے ہیرو کا جو افسوسناک انجام ہوا وہ اس روگ کی بدولت ہوا جو اس نے اپنے باپ سے ترکے میں پایا تھا۔

تیسرا ذریعہ یہ ہے کہ ڈراما کے اصل قصے میں ڈراما نویس ایک ضمنی قصہ بھی داخل کر دیتا ہے اس میں وہی افسوسناک واقعات جو اصل قصے میں پیش آئے تھے کسی قدر اختلاف کے ساتھ دہرائے جاتے ہیں مثلاً شیکسپیر کے کنگ لیر میں جو ناشکر گذاری کا برتاؤ لیر کی بیٹیاں لیر کے ساتھ کرتی ہیں وہی گلوسٹر کے بیٹے گلوسٹر کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس تکرار کا اثر دیکھنے والوں پر یہ پڑتا ہے کہ نیکی کا بیج بونا اور بدی کا پھل پانا کچھ لیر ہی کے لئے نہ تھا بلکہ دنیا میں سبھی کو یہ دن دیکھنا پڑتا ہے۔ ایسے کے قصے کی یہ عمومیت عبرت کے اثر کو بڑھاتی ہے مگر رنج والم کے اثر کو گھٹا دیتی ہے۔ مصیبت کا کوئی منظر دیکھتے وقت اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ یہ حالت زندگی میں ہر شخص پر گذرتی ہے تو نیش الم کی کھٹک بہت کچھ کم ہو جاتی ہے اور آرٹ کے نقطہ نظر سے ایسے میں اس کی بہت ضرورت ہے۔ آرٹ جو کیفیت دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اس کی

گنجایش نہیں کہ کوئی جذبہ خواہ رنج والم ہو یا راحت و مسرت حد سے بڑھ جائے کیونکہ پھر احساس میں جمالیاتی رنگ نہیں رہتا جس کے لئے تناسب اور موزونیت لازمی ہے۔ اگر فریاد کی کوئی لے نہیں ہے۔ نالہ پابند نے نہیں ہے تو وہ فریاد اور وہ نالہ چاہے آرٹ سے بڑھ کر ہو مگر آرٹ نہیں کیونکہ وہ سننے والے کے دل کے تاروں کو چھیڑتا تو ہے مگر اس طرح کہ ان سے ہم آہنگ نغموں کی جگہہ بے سری صدائیں نکلتی ہیں۔

اسی وجہ سے باکمال المیہ نویس مصیبت اور تکلیف کے مناظر بہت بڑھا کر یا بہت دیر تک نہیں دکھاتے اور جو کچھ دکھاتے بھی ہیں اس کے المناک اثر کو کم کرنے کے لئے یا تو عمومیت سے کام لیتے ہیں جس کا ابھی ذکر ہوا ہے یا بیرونی عظمت اور شجاعت پر زور دے کر ایک تسکین کا پہلو نکالتے ہیں یا طرز بیان میں تشبیہ و استعارے کی لطافت و ندرت اور دوسری شاعرانہ خوبیاں پیدا کرنے میں غیر معمولی اہتمام کرتے ہیں تاکہ خیال کسی قدر بٹ جائے۔

اس سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ المیہ لکھنے کے لئے بہ مقابلہ نثر کے نظم زیادہ مناسب ہے اور یہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ عہد قدیم میں المیہ ہمیشہ نظم میں لکھا جاتا تھا۔ جب سے نثر میں لکھنے کا رواج شروع ہوا اسی وقت سے ادب میں المیے کا معیار بھی کم ہونے لگا چنانچہ نثر میں اعلیٰ درجے کے فرحیے بہت کثرت سے ہیں مگر المیے معدودے چندہی ہیں ان میں سے غالباً سب سے بلند درجہ گوئٹے کے فاؤسٹ کا ہے۔ گوئٹے نے اپنے زمانے کے مذاق سے متاثر ہو کر فاؤسٹ کو نثر میں لکھا لیکن اسمیں گیتوں اور سنگتوں کے نام سے نظم کا حصہ بہت کافی ہے اور خصوصاً زیادہ المناک ٹکڑے سب کے سب نظم میں ہیں اور جتنے اچھے المیے نثر میں ہیں انکا مقصد زیادہ تر اخلاقی اور اصلاحی ہے۔ جمالیاتی عنصر ان میں بہت کم ہے۔ (باقی)

دلّی کا انوکھا پن اور بھبن

میر باقر علی صاحب مرحوم دلی کے آخری داستان گو تھے۔ سات مہینے ہوئے
انکا انتقال ہوگیا۔ جن لوگوں نے انکی داستان سنی ہے۔ ان کا دل اب تک دلی
کی اصلی زبان کی گھلاوٹ اور حلاوت کے مزے لیتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اُن کا
سارا کمال تقریر میں تھا تحریر میں وہ بات نہیں ہے۔ لیکن تقریر تو مرحوم کے
ساتھ گئی اب تو جو کچھ ہے تحریر ہی ہے۔

یہ مضمون میر صاحب مرحوم نے ہمدرد مرحوم میں شائع ہونے کے لئے دیا تھا
مگر کسی وجہ سے چھپ نہ سکا ہم اسے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔
ممکن ہو کہ بہت پڑھے لکھے حضرات میر صاحب کی زبان میں مین میکھ نکالیں یا ان کے
فلسفے پر ناک بھوں چڑھائیں لیکن وہ یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے مرحوم کی زبان پر
حرف گیری کی تو انکی روح جنت سے کہے گی "یہ ہماری زبان ہے پیارے" اور اگر
انکے فلسفیانہ مسائل پر معترض ہوئے تو جواب ملے گا "شعرم را بہ مدرسہ کہ برد"

میں دلی کا رہنے والا ہوں بچپن سے بڑھاپا آیا لیکن میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ دلی
کی مڑک کیا ہو۔ شہر تو سبھی بنتے بھی ہیں بگڑتے بھی ہیں۔ بن گئے بن گئے بگڑ گئے بگڑ گئے
مگر واہ ری دلی تیری ادائیں کہ سبھی قوموں نے تیرے چکر کاٹے ہتھورا نے برکما کی مسلمانوں
نے طواف کئے اب انگریزوں نے بپ ٹسما دیا تو ذرا چین سے کونے میں گھونگھٹ نکالکر
بیٹھیں لیکن بیٹھنا کیسا اب پھر اپنے بناؤ میں لگی ہوئی ہیں اور کیوں نہ بناؤ کریں کہ دلی کی
جوانی بڑھاپا اپنے ہاتھ ہے جب بڑھاپے سے جی گھبرایا اور اکتایا پھر نئے سرے سے جوانی
بکالی اور کسی وضع دار کی تلاش شروع کی لیکن دلی کی اب کی دفعہ اس کو خدا نظر بد سے بچائے

جوانی پھکی ہے اور جوبن پھٹا پڑتا ہے۔ ہیں کسی عاشق کی چھاتی پر بال جو دلی کی نکیلی چھاتیاں جواب ابھر آئی ہیں انکی طرف نگاہ اٹھاکر بھی دیکھے۔ دلی ہمیشہ بسکر بنی اور اب کی بار تو بنکر بسی ہے۔ ورنہ اس ست خصمی اور ہرجائی نے طرح طرح کے نام اپنے رکھے پتھورا کے زمانے میں کچھ بھیر سیری تغلق آباد، عادل آباد، جہاں پناہ، فیروز آباد، پرانا قلعہ، شاہجہاں آباد غرض طرح طرح کے ناموں سے پکاری گئی اور اب کے تو کمال ہی کیا ہے چونکہ نئی نویلی ہیں تو نام بھی نئی دلی رکھا گیا ہے۔

ایک دفعہ دنیا کی تارک ہو کر سو دو سو برس تک ایسی لا پتہ ہوئیں کہ کوئی مورخ بھی پتہ نہ لگا سکا اور ۱۸۵۷ء کے بعد سے جو مجھ جیسے دلی میں آباد ہیں انہوں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ سو دو سو برس کے واسطے ہم دلی والے بھی ایسی گمنام زندگی بسر کریں کہ کوئی ہمارا نام بھی نہ جانے کہ دلی میں کون کون آباد تھے خیر جو چاہیں سو کریں دلی والے ہیں اپنے افعال کے مختار ہیں۔ لیکن ایسوں کے واسطے دلی نے بھی کہدیا ہے کہ تم جیسا میں چاہتی ہوں ویسے نہ ہو تو میں بھی تمہارا نام نہ بدل دوں تو مجھے دلی نہ کہنا۔ ورنہ دلی نے بادشاہ پیدا کئے عالم بنائے خلیق بہادر سچے ایماندار کاریگر نمک خوار، اگر اس زمانے کے واقعات لکھوں تو مضموں کا طومار ہو جائے گا۔ صرف ایک نمکخوار کا تذکرہ پیش کرتا ہوں ناظرین اندازہ فرمالیں گے۔ شاہجہاں نے جب لال قلعہ بنانیکا ارادہ کیا تو اُستا حامد مستری کو بلا کر نقشہ دیا اور فرمایا کہ جلد یہاں قلعہ بنادو اُستا حامد مستری نے عرض کی بہتر۔ اب یہ حال عرض کردوں کہ آج کل علما اور مشاہیر عالم نے تو قلعہ کے واسطے تال کٹورا انتخاب فرمایا اور شاہجہاں کا دماغ تو ماٹا ہوا ہے یہ جمنا کے کنارے کیوں ڈوبا یہ بحث نہایت فلسفیانہ ہے مگر طویل اور نہایت دلچسپ کہ شاہجہاں نے یہی جگہ کیوں پسند کی کیا اس وقت تال کٹورہ نہ تھا؟ بات یہ ہے کہ دلی گرم جگہ ہے اور یہاں کی زمین شور ہے شاہجہاں نے وہ جگہ پسند کی جہاں سے جمنا سیکڑوں برس سے شورہ دھو دھو کر لے گئی گو زمین نمناک ہے لیکن آپ ملاحظہ فرمائیں کہ شاہجہاں کے قلعہ کو تین سو برس گذرے اور پتھر بھی سنگ سرخ لگا ہے کہ جو جلد لونی لگ کر برباد ہو جاتا ہے لیکن شاہجہاں کا قلعہ جوں کا توں کھڑا ہے۔ ٹس سے مس نہیں ہوا نہ کوئی پتھر چٹخا نہ لونی لگی اور

آج کل کی نئی عمارتیں کہ جن کو بنے ہوئے جما جما آٹھ دن ہوئے ان میں ٹوٹ شروع ہوگئی اُس زمانے میں کوئی مشین ایسی نہ تھی کہ پتھر کو ٹھوک بجا کر کان سے لیتی۔ اب سنئے کہ تمام قلعہ کا پتھر آگیا اور اوستا حامد غائب۔ دو برس گذر گئے اور اوستا حامد کا پتہ نہ لگا تو شاہجہاں نے حکم دیا کہ دوسری بنیادیں کھودو جب بنیادیں کھدنی شروع ہوئیں تو اوستا حامد نے حاضر ہوکر آداب بجایا بادشاہ نے فرمایا کہ تم کہاں تھے تو اوستا حامد نے دست بستہ عرض کی کہ حضور کا شوق تو مقتضی اس امر کا تھا کہ قلعہ شام تک بن جائے اور نمکخوار بنا دیتا لیکن سو دو سو برس کے بعد دیواریں شق ہوتیں۔ بال پڑتے تو اس وقت کے لوگ کہتے کہ بادشاہوں کے ایسے نمک حرام نوکر تھے کہ اپنے فائدے کے واسطے جلد از جلد ایسی بودی عمارت بنائی اب خادم نے نیو کو چھوڑا برساتیں پڑیں پانی بھرا جہاں سے نیو کو جھومنا تھا جھومی دبنا تھا دبی اور یہ پتھر دو برس تک برسات میں بھیگے جاڑے میں سکڑے گرمی میں پھیلے جس کو ٹوٹنا تھا ٹوٹا ٹوٹی لگنی تھی لگی اب نمکخوار شام تک قلعہ بنا دیتا ہے۔

یا تو دلی والے ایسے تھے اور اب جو جیسے آکر آباد ہوئے تو انہوں نے ایمانداری انصاف خدا ترسی کاریگری وغیرہ کو پرانا سمجھ کر اور یہ کہکر چھوڑ دیا کہ پرانی باتوں کو کیوں کام میں لائیں وہ اگر معاملے کے صاف تھے تو ہم معاملہ کیوں صاف رکھیں۔ جو جو واقعات میں دیکھ رہا ہوں اگر دو چار واقعات بھی لکھوں تو طول ہوگا۔ غرض دلی یوں ہی کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ اسی طرح سے دلی کی اللہ بخشے ایک ہنیلی تھیں اور انکی بھی تمام عادتیں قریب قریب ایسی ہی تھیں جیسے دلی کی۔ اب یہ جوان ہوئیں تو انکی شادی ہوئی اللہ نے فرزند نرینہ عطا فرمایا یہ اپنے بچہ کی محبت میں دموں دیوانی تھیں بعض انسان بعض حیوانوں میں اولاد کی محبت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اتفاق سے بچہ کا باپ مرگیا اب جو بڑے کو آیا اُس نے افسوس کیا کہ افسوس اس سن میں اور یتیمی اس نیک بخت کو بچہ کا یتیم بنا ناگوار گذرا اس نے عدت کے اندر ہی نکاح کر لیا وہ خاوند بھی قضائے الٰہی سے فوت ہوگیا اب کی دفعہ اس نے پھولوں کے دوسرے ہی دن نکاح کیا اور اس خاوند کی موجودگی میں اوروں سے بھی ساز باز رکھا غرض وہ بھی مرا اسی طرح اس نیک بخت نے سات

نکاح کئے جب ساتواں خاوند بھی جاں بحق ہوا تو اس نے رو رو کر کہا کہ واہ اللہ میاں اب کی بیوگی تو یاد رہے گی لیکن میں اپنے بچہ کو یتیم کہواؤں یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ دلی کی انوکھی اداؤں کا لکھنا تو مشکل ہے۔ دلی نے اردو زبان بنائی اور اس میں بھی تمام زبانوں سے انوکھا پن رکھا وہ کیا دنیا میں جتنی زبانیں ہیں وہ وہاں کے رہنے والوں نے اپنے جذبات کا اظہار کرنیکے واسطے اصوات بسیطہ سے جملے بنائے انکا نام زبان ہو گیا لیکن دلی نے اردو کے گوہر سخن کے واسطے دو دریائے زخار اور ناپیدا کنار تلاش کئے اور وہ دونوں دریا کونسے دریا ہیں ایک سنسکرت اور دوسرا عربی اور یہ دونوں دریا وہ دریا ہیں کہ جن سے تمام دنیا کی زبانیں سیراب ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو کسی زبان سے پیچھے رہنے والی نہیں معلوم ہوتی علاوہ اس خوبی کے یہ زبان امانت دار ایسی ہے کہ جس زبان کا جو لفظ لیتی ہے اس کو اپنے گھر میں ایسا اچھوتا رکھتی ہے کہ اس کی شکل وصورت میں کوئی خرابی نہیں آنے دیتی۔ جیسا وہ لفظ اپنے گھر میں تھا اسی طرح سے اردو میں رہتا ہے اور لفظوں ہی پر کیا موقوف دلی میں جو آیا اس کو دلی نے ایسا آرام و آسایش سے رکھا کہ دنیا کے کاموں سے اس کو کوئی غرض ہی نہ رہی لیکن ایسا کیوں ہوا آپ غور فرمائیں کہ ہندوستان مثلث کھونٹا ملک ہے اگر بفرض محال آپ ہندوستان کو کاٹ چھانٹ کر گول سمجھ لیں تو دلی قریب قریب مرکز ثابت ہوگی اور اور مرکز کو گو ہم کسی متحرک جگہہ بیٹھ کر یہ سمجھ لیں کہ ہم ساکن ہیں مگر کیا سکون ہوگا ہرگز نہیں۔

اور دلی میں تو مرکز ہونے کی وجہ سے حقیقی سکون ہے یہاں جو آیا ایسا ساکن ہوا کہ دنیا نے اس کے نام کو بھی حرکت نہ دی کہ دلی میں فلاں فلاں آباد تھے۔ دلی نے بہت سے نکاح کئے لیکن اس شرط پر کہ میں یہاں سے کہیں نہ جاؤں گی۔ اگر دلی کے نئے دولھا کو پرانی سیج گوارا نہ ہوئی تو دلی ذرا کھسکیں اور کہا بس چنانچہ اب کی دفعہ بھی بنے بنائے گھر کو چھوڑا۔۔
۔۔۔۔۔۔ لال حویلی ہر طرح کے آرام کا ٹھیا تھی اور کیسی عمارت جو سونے کے پانی سے گندھی ہوئی اور جواہر کے ریزوں سے چنی ہوئی۔ اور ہر نگینہ جواہر کا جہاں جڑا ہوا تھا اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ معمار قدرت نے اس نگینہ کو یہیں کے واسطے بنایا ہے مثلاً ایک پتہ کسی بیل یا بوٹے کا بنانا

ہے اور یہ دکھانا ہے کہ وہ پتہ درخت میں لگا ہوا اُڑ گیا ہے تو جہاں سے مڑا ہے کچھ خشک سا ہو گیا ہے اور بدرنگ ہے اور آدھا تر و تازہ ہے مگر ایک ہی نگینے میں یہ دونوں حالتیں دکھائی ہیں جوڑ نہیں ہے علاوہ اس خوبی کے ہر بیل ہر پودے کا رو ربل نوک پلک کا لطف جاننے والا ہی کہہ سکتا ہے اور اس کے منہ سے بے ساختہ داد نکل جاتی ہے۔ عقب حمام جتنی خوبیاں حمام میں ہونی مناسب ہیں سب موجود حمام کشادہ ہو روشن ہو، معتدل ہو پرانا ہوا ور گنبد کے بیچ میں سے کبھی کبھی ٹھنڈی بوند پانی کی ٹپکے لیکن ایک حمام سب مزاجوں کے موافق نہیں ہوتا ہر شخص کے مزاج کے موافق بنایا جاتا ہے حمام کا فرش دیواریں نہ ٹھنڈی ہوں نہ گرم حوض کا پانی اتنا گرم ہو جو بدن پر سیال نہ معلوم ہو چنانچہ اس حمام کا پانی آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی یکساں رہتا تھا دیوان خاص کی تو ایسی خوبی تھی کہ جس کے بیان سے زبان قاصر کسی شاعر نے مجبور ہو کر لکھدیا کہ۔ شعر۔

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است وہمین است وہمین است

تخت طاؤس اپنی خوبیاں اپنے منہ سے بول رہا تھا ایران میں جو اُس کی درد سا ہوئی یہ تخت اپنی اُس عزت کو جو دلی میں تھی اُس کو یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے دونوں آنکھوں سے ساون کی جھڑی اور بھادوں کی بھرن ہے کہ برس رہی ہیں برسات میں مور کو مستی ہوتی ہے اور پر نکل آتے ہیں لیکن یہ بیچارہ لنڈ منڈ پر نچا دلی کی طرف ٹڈیاں بھرتا ہے تو چوٹ کھاتا ہے اس وقت یہ دوہا بصد حسرت دیاس زبان سے نکل جاتا ہے۔ دوہا۔ نا مورے پنکھ نہ پاؤں بل ہیں اینکھ پیا دور۔ اُڑ نہ سکوں گر گر پڑوں رہوں بسور بسور۔ اور کبھی کہتا ہے اُڑ کے پہنچوں لیکن۔ بے پر و بال اڑا نہیں جاتا۔ میزان عدالت اب بھی یہ کہہ رہی ہے کہ یہاں کسی زمانے میں عدالت تھی اور نہر سعادت خاں اسی کے نیچے بہہ کر یہ بتا رہی ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے، جھروکہ جس میں بادشاہ بیٹھ کر جمنا کی موجیں اور سرسبز میدانوں کا ملاحظہ فرماتا تھا۔ دیوان عام موتی مسجد مہتاب باغ جل محل ساون بھادوں نقار خانہ، بنجاری کنواں۔ یہ کنواں اس وقت بنا تھا کہ جب دلی یہاں آباد نہ تھی بلکہ اُس زمانے

کی دلی کا دروازہ جو دہلی دروازے کے سامنے دہلی جیل کے مشرقی سمت اور سڑک کے کنارے دلی کو آباد اور اپنے کو برباد دیکھ کر شرم سے زمین میں دھنسا جاتا ہے یہاں دلی آباد تھی اُس زمانے میں بنجارے ناج وغیرہ لایا کرتے تھے اور جہاں لال قلعہ اس وقت ہے یہ بنجاروں کا پڑاؤ تھا یہاں کنواں نہ تھا ایک بنجارے نے کنواں کھدوا دیا اس وجہ سے بنجاری کنواں کہتے ہیں۔ اب کی دفعہ دلی نے نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھے ہیں کیونکہ ہر دفعہ کی بربادی سے دلی کا بھی دل اکتا گیا ہے اور مدت کی پیشین گوئی کا خیال آگیا۔ کسی نے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ۔ نو دلی دس بادلی قلعہ وزیرآباد۔ آٹھ دلیاں تو میں نے گنوائی ہیں اب نویں دلی کی بنیاد ہمارے شہنشاہ نے رکھی لیکن یہ بنیاد بدلی اور اب دسویں دلی رائے سینا میں آباد ہو رہی ہے بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے وہ کسی قوم یا مذہب کا ہو لیکن بادشاہ ہے، شاہی بنیاد یہاں سے بدلی اب کچھ اسباب اس پیشین گوئی کے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ قلعہ وزیرآباد آباد ہو لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وزیرآباد نشیب میں واقع ہوا ہے اور نشیب کی آب و ہوا مرطوب اور دلی کی عادت شمال کیطرف کھسکنے کی ہے اور دلی ہی بیچاری پر کیا موقوف ہے فیصدی پچانوے شہر شمال کی طرف بڑھ رہے ہیں وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شمال ٹھنڈا روح گرم اس وجہ سے طبیعت شمال کی طرف جاتی ہے۔ ہونہوالی بات کو خدا ہی جانتا ہے لیکن یہ پیشین گوئی یہ خبر دیتی ہے کہ وزیرآباد آباد ہوا اور اُس کی آبادی کو قیام و دوام ہو دلی کئی دفعہ بدلی اور آباد ہوئی جو آیا اس نے دلی کی اکھیڑ پچھاڑ کی اور اب کے تو چین سے بیٹھے بٹھائے دلی نے اپنا گھر چھوڑا اسکی وجہ میرے خیال میں تو یہ آتی ہے کہ مجھ جیسے دلی والوں نے غدر کے بعد دلی کو ایسا لتاڑا کہ دلی نے تنگ آکر یہاں کی بود و باش چھوڑ دی۔ پہلے دلی کو دلی والوں پر ناز تھا اور اب تو دلی والوں نے جمنا کے کنارے وہ اُلٹی گنگا بہائی کہ دلی پانی پانی ہو کر شرم سے ڈوب گئی بسا بسایا گھر چھوڑا اور اپنوں سے منہ موڑ پردیسیوں سے دل لگا بیٹھی اب دلی والوں کو مناسب ہے کہ جیسے آبرودار شہر میں اپنے آپ کو دلی کے رہنے کے قابل بنائیں ورنہ تعلق آباد کے گنوار نکر

رہجائیں گے میں نے بچپن میں سنا ہے کہ تغلق آباد کے گنوار ساری دنیا میں اپنے سر پر رکھ کر بیچتے
تھے لیکن یہ انکی آن تھی کہ دلی دروازے کے اندر سر پر بوجھ نہیں رکھتے تھے کسی نے پوچھا کہ یہ
کیا تو تغلق آباد والے جواب دیتے ہیں کہ میاں دلی ہماری تھی اب اگر دلی ہم سے بدل گئی تو بدل گیا
لیکن ہم اس کے آگے کیوں گردن جھکائیں ایسے موقعے کے واسطے کسی نے خوب کہا ہے کہ۔ رسی تو
جل کے خاک ہوئی پر بل نہ گیا۔ اب دلی ایسے دلی والوں کی طرف منہ بھی نہیں کرتی۔ وہ پانی
ملتان گئے۔ ورنہ دلی ایسی مسافر نواز تھی کہ جو دلی میں آیا دلی نے اُسے اپنے میں جذب کرلیا۔
دلی کی خاص بات مرکز ہونے کے لحاظ سے عجیب ہے آپ اجمیری دروازے سے ذرا باہر نکلیں
تو آپ اجمیر کا رنگ دیکھیں گے اور لاہوری دروازے سے پنجاب اپنا پتہ دیتا ہے۔ کشمیری دروازہ
کشمیر کی جھلک دکھاتا ہے ذرا جمنا پار ہوئے تو پورب نظر آتا ہے۔ غرض دلی اپنی وضع کی پابند
ایسی ہے کہ اپنی چال سے باز نہیں آتی۔ انسان تو ذکی الحس ہے۔ آپ پودوں کو ملاحظہ فرمائیں
ہم نے لکھنو کے خربزے کا دلی میں بیج بویا تو اُس سال دلی میں جو خربزہ پیدا ہوا ہر خربزے کا رنگ
قد مزا قریب قریب ویسا ہوا اب دلی کے پیدا ہوئے خربزے کا بیج بویا تو رنگ قد مزا کچھ
بدلا اور تیسرے سال کے خربزے کو دلی نے اپنے رنگ میں رنگ لیا وہی جال دار، قد بڑا
دل موٹا اور پھیکا پیدا ہوا۔ لیکن دلی کے خربزے بیچنے والوں نے آواز پکارا کہ شکر سے میٹھے
یعنی شکر سے کھاؤ تو میٹھے۔ پہلے دلی ہی کے خربزے میں نے کھائے ہیں اچھے میٹھے خوشبودار
ایک خربزہ گھر میں آیا بال بچے چھک گئے اور بیج رہا۔ دلی میں قدرت نے مسلمانوں کو بادشاہ
اور ان داتا بنا کر بھیجا تھا۔ اس وقت دلی نے اپنے مہمانوں کی وہ آؤ بھگت کی طرح طرح کی
دلچسپیاں پیدا کیں اچھے اچھے باکمال پیدا کئے۔ بڑے بڑے بہادر بنائے اور خلیق ایسے کہ
چاردانگ عالم میں مشہور کہ دلی والوں کو ہندوستان نے سراہا کاریگر ایسے بنائے گو جاہل
تھے مگر اُنکے دماغ کام کر رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں بے دھرمی بندوقیں چل رہی تھیں اور ان
بندوقوں کا نام بے دھرمی میرٹھ کے کارتوس کی وجہ سے فوج نے رکھا تھا یہ بندوقیں تانبے کی

ٹوپیوں سے چلتی تھیں اب غدر ہوا تو ٹوپیاں نہ رہیں اب بندوقیں بیکار ہوگئیں تو بادشاہ سے عرض کی بادشاہ نے خانم کے بازار میں جو کاریگر تھے انکو بلایا اور فرمایا کہ بندوقیں بیکار رہیں اب کیا کریں کاریگروں نے دست بستہ عرض کی کہ حضور یہ کیا بات ہے حضور کے اقبال سے اب بندوبست ہوا یہ کہکر کاریگروں نے کاغذ کے پٹاخے بنائے جو بچے تینچیوں میں رکھ کر چھوڑتے ہیں۔ اس زمانے میں قدرت کی خاص نظر رحمت دلی پر تھی اب جب دلی والوں نے اپنے آپ کو بھولا اور یہ نہ سمجھا کہ قدرت نے ہم کو کیسا مالا مال پیدا کیا ہے لیکن ہم نے اُس کی کسی نعمت سے کام ہی نہیں لیا۔ تو قدرت کی رفتار سست ہے اس وجہ سے کہ کوئی کسر نہ رہجائے پھر جب قدرت ہاتھ ڈالتی ہے تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ یا تو یہ شہر ایسا تھا کہ جس کی تعریف ناممکن تھی یا اب دلی کے پہاڑ بدلے زمین بدلی آخر بدلا کیا کچھ نہیں۔ مجھ جیسے دلی والوں نے تمام خوبیوں سے اپنے آپ کو بال بال بچا رکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ آپ دلی میں ایک شے کھانے کی پینے کی برتنے کی چاندی سونے کی ڈھونڈیں تو ملنا مشکل۔ اب چاندی والوں کا کیا قصور ہے چاندی خود تو سفید ہے لیکن جو شے اسے مس کرتی ہے وہ سیاہ ہوجاتی ہے۔ کاریگر تو کاریگر ہیں انہوں نے بھی چاندی سے کہا کہ تو ٹھہرا اگر تجھ کو کالا کر کے نہ چھوڑا تو نام نہ پایا۔ چاندی بیچاری ہلکی ہونے کی وجہ سے اتنی شریف ہے کہ تولہ بھر چاندی میں آپ ایک ماشہ تو چاندی لیں اور گیارہ ماشہ میل تو چاندی تیزاب کے اجال پر سفید نظر آئے گی۔ اب کاریگروں نے سونے کو دیکھا کہ یہ ظالم تو ہمارا کہنا مانتا ہی نہیں۔ تولہ بھر سونے میں ایک رتی میل ملاتے ہیں اور وہ میل رتی بھر اپنی جھلک دیتا ہے تو کاریگر بولے اچھا ہم بھی تیرا قائم مقام بناتے ہیں چنانچہ چاندی اور تانبا ملا کر سونے کا ہم شکل بنایا اور ہنجوں نام رکھا۔ اگر ہم اب بھی نہ سنبھلے اور نہ سمجھے تو ہماری صورتیں بھی بدل جائیں گی کہ شریف اور پاجیوں کے باوا آدم الگ الگ نہ تھے بداعمالیوں نے شکلیں بدل دیں اللہ رحم فرمائے۔

ہندوستان، فن طب کا اصل مولد

"ہندوستان کے فن طب و جراحت" پر ایک مضمون دو نمبروں میں اب سے کچھ عرصہ پیشتر اسی رسالہ "جامعہ" میں شائع ہو چکا ہے۔ آج عنوان بالا سے کیپٹن پی جانسٹن سینٹ نامی ایک انگریز مصنف کے نہایت فاضلانہ اور پُراز معلومات خطبہ کا خلاصہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جو انگلستان کی مشہور "رائل سوسائٹی آف آرٹس" کے ہندوستانی شعبہ کے زیر اہتمام ابھی حال میں پڑھا گیا ہے۔ ہندوستان کی گذشتہ قدیم تاریخ کے متعلق اب تک عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ یہ ایک تاریکی و ظلمت اور وحشت و جہالت کا دَور رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی علم کا کبھی کوئی چرچا تھا تو وہ فلسفہ و الٰہیات کا تھا۔ مضمون بالا سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہندوستان نے اپنے قدیم زمانے میں سائنس میں بھی اسی قدر ترقی کی تھی جس قدر فلسفہ میں فن طب اور اس کی مختلف شاخوں میں اس نے اس قدیم زمانے میں جو کمال پیدا کیا تھا، اس سے آج کی جدید سے جدید تحقیقات و معلومات بھی کچھ بہت آگے نہیں ہیں۔ سعید

ہندوستان کی تاریخ کا آغاز ہندوستان کی تہذیب کا آغاز کب سے ہوتا ہے؟ اس کے متعلق بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ باوجود تمام تحقیق و تدقیق کے حقیقت پھر بھی اسی قدر مستور رہتی ہے۔ یہ کوئی تقریباً سوا سو سال کی بات ہے کہ بعض اہل مغرب نے سنسکرت زبان کے مطالعہ کی طرف توجہ کرنی شروع کی اور اگرچہ اس وقت سے دفتر کے دفتر آرین قوم کی اصل کے متعلق لکھے جا چکے ہیں پھر بھی یہ اطمینان کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی صحیح حقیقت تک پہونچ گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آرین قوم وسط ایشیا کے کوہستانی علاقے سے پیدا ہوئی، بعضوں کا خیال ہے کہ انکا مولد جرمنی کا شمالی علاقہ یا ناروے اور سویڈن کا خطہ ہے۔

تاہم ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سب سے قدیم ویدوں کی تاریخ تقریباً ۲۰۰۰ سال قبل مسیح ہو۔ ہوٹنی (Whitney) گراس مان (Grassman) اور بنفے (Benfey) کا یہ خیال ہے، کہ ۲۰۰۰ سال قبل مسیح ہندو لٹریچر کے آغاز کا زمانہ ہے۔ برون ہوفر (Brunnhofer) اسے ۲۸۰۰ ق۔م بتاتا ہے۔ پروفیسر جیکوبی اس مدت کو ۴۰۰۰ قبل مسیح قرار دیتا ہے اور ایک گروہ کے خیال کے مطابق یہ زمانہ اس سے بھی قدیم تر ہے جبکہ اس وقت کی دنیا یہ کرۂ زمین نہ تھی جس پر آج ہم لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ اوستا میں ایک ایسی آریوں کی بہشت کا ذکر ہے جو صرف قطب شمالی ہی میں ممکن ہو سکتی ہے۔

طب کے متعلق قدیم روایات بہرحال اصل حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، یہ مسائل ایسے نہیں جن کا تصفیہ گھنٹے دو گھنٹے کی صحبت میں ہو سکے۔ ہم کو صرف ویدوں کے ان اشلوکوں سے غرض ہے جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں۔ رگ وید یا اس کے ساتھ کی دوسری کتابیں خواہ ۱۵۰۰ ق۔م، ۲۵۰۰ ق۔م، ۴۵۰۰ ق۔م یا اس سے بھی قدیم تر کسی ایسے زمانے سے شروع ہوتی ہوں جبکہ تاریخ کا کوئی پتہ نشان بھی نہ تھا موجودہ اغراض کے لئے اس سے بحث نہیں۔ ہم کو اس واقعہ کو اس طرح تسلیم کر لینا چاہئے، جس طرح ایک چھوٹا بچہ راجہ کے قصے کو صحیح سمجھتا ہے بلالحاظ اس کے کہ وہ راجہ کون تھا؟ اور کس زمانے میں وہ حکومت کرتا تھا؟ اس لئے کہ قدیم تاریخ میں اس قسم کے قصوں اور افسانوں کو بھی کچھ کم اہمیت حاصل نہیں۔

لسانیات کا ایک عالم ان قدیم قصوں اور افسانوں کو اس نظر سے دیکھتا ہے تاکہ وہ تخیلات انسانی کے ٹوٹے ہوئے سلسلوں کو جوڑ دیں۔ مورخ ان افسانوں کو انکے اصل سرچشمے تک لیجاتا ہے اور ایک ایسی بنیاد تلاش کرتا ہے جہاں سے کہ وہ اصل حقیقت کی تلاش شروع کر سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خالق اول برہما نے یہ چاروں وید کائنات کی ہدایت کے لئے بنائے اور ان میں سے اتھر وید کو دوسرے دیوتاؤں کے پاس بھیجا۔ اور دیواسونیوں یا سورج کے دو بیٹوں کو اس کا حامل قرار دیا اور اس طرح یہ دونوں آسمانی دیوتاؤں کے

نگراں مقرر ہوئے

آیورویدکی ابتدا | اس کے بعد اُپوید پیدا ہوا جو بنی نوع کی اور زیادہ تعلیم کے لئے مزید منتروں کا مجموعہ ہے۔ پھران منتروں سے برہمانے انسان کی خراب خستہ اور زوال پذیر حالت پر رحم کھاکر آیوروید پیدا کیا جس میں زندگی کے علم سے بحث کی گئی ہے۔

یہ منتر بذات خود نیست و نابود ہوگئے ہیں اور ان کا جو کچھ بھی علم ہمکو ہوا ہے، وہ انکے بعض اجزا سے یا ان تبصروں سے جو بعد کے لٹریچر میں ہمیں ملتے ہیں لیکن ان بالواسطہ ماخذوں کی بنا پر بھی ہمیں یقین ہے کہ یہی آیوروید مدتہائے دراز تک ہندو فن طب کا سنگ بنیاد رہا ہے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ان ویدوں کا بھی پتہ نشان باقی نہ رہا اور تمام لوگ پھرایک بار رنج ومصیبت میں گرفتار ہوگئے۔ بنی نوع کی یہ حالت دیکھکر دیوتاؤں اور راکششوں نے مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں اکٹھا کیں اور انہیں سمندر میں ڈال دیا اس کے بعد اسے چلانے کے لئے مُندرا پہاڑ لیا اور وشنو دیوتا کچھوے کی شکل میں دُھرا بنے جس پر وہ لکڑی گھومتی تھی شیشؔ جو سانپ کی شکل کا ہے، ایک رسی بنا جسے ایک طرف سے تمام دیوتا اور دوسری جانب سے راکشش کھینچتے تھے۔ اس طریقہ سے گویا سمندر سے چودہ رتن پیدا ہوئے جن میں سے دھنوتری امرت یا آب حیات لیکر نکلا اور وہی ان دیوتاؤں کا طبیب اول اور فن طب کا سب سے پہلا موجد مانا جاتا ہے۔

دھنونتری، فن طب کا موجد | دھنونتری کا ظہور جو ہندوستان کا ایسکولیپیس مانا جاتا ہے، دنیا میں اس غرض سے ہوا کہ وہ لوگوں کے امراض وتکالیف کا ازالہ کرے اور انہیں علم حیات کی تعلیم دے۔ یونانی ایسکولیپیس کی طرح اس کے ساتھ کوئی سانپ وغیرہ نہیں ہے بلکہ وہ عام طور سے ایک نہایت ضعیف شخص کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں صرف ایک کتاب ہے۔ رشیوں نے دھنونتری کے پاس ایک وفد بھیجا اور اُس سے یہ درخواست کی کہ وہ انہیں علم حیات کی تعلیم دے۔ اس وفد میں، سوشرت بھی شریک تھا جو قدیم فن جراحت کا بانی ہے

اور جسے دھنونتری نے آیور وید سکھانے کے لئے منتخب کیا تھا۔ اسی سوشرت نے بعد میں "سوشرت سمہیتا" کے نام سے فن جراحت پر ایک کتاب لکھی ہے۔

جس طرح سوشرت فن جراحت کا بانی سمجھا جاتا ہے، اسی طرح چرک علم طب کا بانی ہے اور اس نے بھی "چرک سمہیتا" کے نام سے علم طبعیات پر ایک کتاب لکھی۔ سوشرت فن جراحت کا عالم تھا اور چرک طب کا اور انہی دو ہستیوں سے ہندوستان میں فن جراحت و طب کا رواج ہوا۔

ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا چرک پہلے پیدا ہوا یا سوشرت۔ علمی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو چرک کی تصانیف زیادہ قدیم نظر آتی ہیں لیکن قدما میں یہ بات بطور ایک مسلمہ امر کے سمجھی جاتی ہے کہ فن جراحت طب سے پہلے وجود میں آیا۔ ڈاکٹر وائز (Wise) نے اپنی کتاب "ہندو طب" میں لکھا ہے کہ ایکبار دھنونتری نے اپنے شاگردوں سے دریافت کیا کہ "سب سے پہلے میں کس چیز پر لکچر دوں؟" شاگردوں نے کہا "جراحت پر" اس لئے کہ پہلے دیوتاؤں میں امراض نہیں ہوتے تھے اور سب سے پہلے جس چیز کے لئے علاج کی ضرورت پیش آئی وہ زخم تھے۔ علاوہ اس کے فن جراحت اس حیثیت سے بھی زیادہ مقدم ہے کہ اس سے فوری آرام ملتا ہے اور اس کا تعلق طبابت سے بھی ہے گو موخر الذکر کو جراحی سے کوئی نسبت نہیں۔ سب سے پہلے انسان کو جراحی کی ضرورت ہوئی، امراض بعد میں پیدا ہوئے اور اس وقت جب انسانوں میں بہت ساری خرابیاں آچکی تھیں اور سچ پوچھئے تو یہ خرابیاں ایک طرح سے انکے حد سے زیادہ گناہوں ہی کا نتیجہ تھیں۔

ان وجوہ کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوشرت، چرک سے پہلے پیدا ہوا لیکن انکا صحیح زمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ انکا زمانہ اتنا قدیم ہے کہ دوسری قومیں اولاً تو ان سے واقف نہ ہو سکیں اور اگر واقف بھی ہوئیں تو ان کمالات کو پورے طور پر سمجھ نہ سکیں۔

مثال کے طور پر عربوں کو لیجئے انکے ہاں انکا ذکر آتا ہے جن سے کہ بعد میں رومیوں

نے لیا۔ کچھ عرصے کے بعد ہمیں اس چیز کا ذکر ملتا ہے جس کا تذکرہ پروفیسر ڈیتیز ([illegible]) نے اپنی کتاب " ہندو طب کی قدامت کے دلائل " میں کیا ہے۔ غرض ہمیں ایک غیر متعین لیکن بلاشبہ بہت ہی قدیم زمانے میں سوشرت کا ذکر فن جراحت کے بانی کی حیثیت سے اور چرک کا فن طب کے موجد کی حیثیت سے ملتا ہے۔

ان تذکروں میں ہمیں ہندو فن طب کی ان دو بڑی شاخوں کی بنیاد نظر آتی ہے، جس کے ساتھ ہی ساتھ تیسری شاخ 'ندان' یعنی تشخیص امراض کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی بنیاد آیوروید پر ہے، جس سے نہایت کثرت کے ساتھ اقتباسات لئے گئے ہیں اور پھر انہی کی تشریح برہمنہ، اور بعد کے قرون وسطے کی شرحوں میں بھی کی گئی ہے۔

آیوروید کی تقسیم | خود آیوروید جیسا کہ اس کے مفسرین نے لکھا ہے، آٹھ حصوں میں منقسم ہے۔ دو حصے خاص فن جراحت کے متعلق ہیں، پانچ طب کی کسی نہ کسی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک حصہ فن جراحت کے پہلے باب میں اجسام غریبہ کے نکالنے، چھری وغیرہ کے زخموں کے بھرنے، پٹیاں باندھنے کے طریقے اور آبلے آماس اور ورم وغیرہ کے علاج سے بحث کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں آنکھ، کان، ناک اور منہ کے امراض سے بحث ہے تیسرے باب میں جو طب کے شعبہ کا پہلا حصہ ہے، ایسے امراض سے بحث ہے جن کا تمام جسم پر اثر ہوتا ہے مثلاً بخار وغیرہ۔ چوتھا باب دماغ کے علاج، پانچواں بچوں کی خبرگیری، چھٹا تریاق کے استعمال ساتواں جوانی دوبارہ عود کرانے اور آٹھواں نسل انسانی کے تحفظ و بقا پر مشتمل ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کیمیا کا لفظ عربی زبان سے نکلا ہے لیکن خود یہ علم عربوں سے بہت پہلے ہندوستان میں موجود تھا، اس لئے کہ آیوروید کے ساتویں باب میں اس علم سے بہت کچھ بحث کی گئی ہے۔

آیوروید کے یہی آٹھوں باب کم وبیش اسی ترتیب کے ساتھ سوشرت اور چرک نے اپنی تصانیف میں بیان کئے ہیں۔

سوشرت کون تھا؟ | ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق سوشرت، وشوامتر کا لڑکا تھا جو رامچندر جی کا ہمعصر ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ متعین طور پر کس زمانے میں تھا۔ سر ولیم جونس (بانی رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال) نے رامچندر کے ہندوستان فتح کرنے کا زمانہ تقریباً ۲۰۰۰ قبل مسیح متعین کیا ہے۔ برعکس اس کے بعض علما نے فلسفہ سوشرت کو گوتم بدھ کا ہمعصر قرار دیے ہیں چونکہ ویدکے بہت سے منتروں میں اس کا ذکر آتا ہے، اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ویدوں کے زمانے میں رہا ہوگا۔ علاوہ اس کے اتھر وید کی آٹھویں کتاب کا ایک منتر انسان کی تخلیق کے متعلق ہے جس میں جسم کے ڈھانچہ کا اس طرح ذکر ہے جس طرح ایتریہ اور سوشرت کے ہاں ملتا ہے۔ اتھر وید کا ایک بڑا حصہ مسلمہ طور پر ۱۰۰۰ ق۔م کے قریب کا ہے اور منتر مذکورہ بالا اس سے بھی قدیم حصہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے اتنی بات تو صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ سوشرت ۱۰۰۰ ق۔م سے بعد کا کس طرح نہیں ہوسکتا۔ اور علاوہ اس کے ہمیں اس کا اصل مسودہ بھی دستیاب نہیں ہوا ہے۔ سنسکرت کی جس کتاب کو ہم "سوشرت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، وہ نہ جانے کتنی تقریظوں کی تقریظ ہوگی جو اصل تصنیف کے زمانے سے بعد میں کی گئی ہے۔

اپنی اس کتاب میں اس نے آیورویدکے آٹھوں ابواب کا چھ بڑے بڑے عنوانات کے ماتحت ذکر کیا ہے۔ وہ ویدکے انہی دو ابواب سے جن میں فن جراحت کا ذکر کیا گیا ہے، خاص طور سے بحث کرتا ہے، اگرچہ کسی قدر طبیات سے بھی تعلق ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ آج کل بھی دستور ہے۔ ان چھؤں ابواب میں سے پہلے باب میں خاص طور سے فن جراحت سے بحث کی گئی ہے، اگرچہ اس میں کسی قدر آب و ہوا اور غذا کا بھی ذکر ملتا ہے جس کا صحت پر بہت کچھ اثر پڑتا ہے۔ دوسرے باب میں ان امراض کا علاج ہے جو خراب طوبتوں سے پیدا ہوتے ہیں، اس کے تیسرے باب کو ہم تشریح الابدان سے تعبیر کرسکتے ہیں، چوتھے کو علم العلاج سے پانچویں کو علم السموم سے۔ چھٹا اور آخری باب بطور ضمیمہ کے ہے جس میں زیادہ تر اکثر مقامی بیماریوں

سے بحث کی گئی ہے۔

غرض سوشرت نے صرف فن جراحت پر اپنی توجہ رکھی ہے اور جسے وہ علوم طبی میں اولین اور بہترین علم قرار دیتا ہے، اور جس میں دوسرے علوم کی بہ نسبت قیاسی اور استنباطی طریقہ کی بنا پر بہت کم غلطیوں کا امکان ہے، جو خالص اور بے آمیز ہے، آسمان کا بہترین ثمر ہے اور شہرت کا یقینی ذریعہ۔ اس کے بعد ایک عام بے تعلق شخص بھی صحیح طور پر اندازہ کر سکتا ہے کہ موجودہ مغربی نظریوں کی کس درجہ جھلک اس میں نظر آتی ہے۔

چرک کون تھا؟ | چرک کے متعلق غور کرنے کے بعد بھی ہم کم و بیش اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ متعین طور پر یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون تھا اور کس زمانے میں تھا؟۔ اس کی تصنیف مکالمہ کی صورت میں ہے جو ایک استاد اور شاگرد کے درمیان ہے۔ مضامین سے جس انداز میں بحث کی گئی ہے اس میں کوئی خاص نظام نظر نہیں آتا بلکہ بلکہ جوں جوں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے نئے نئے مضامین کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مکالمہ کا ایک بڑا حصہ غیر دلچسپ ہے لیکن عموماً ایسے مضامین کا ذکر ہے جو انسان کے لئے بہت ضروری ہیں۔

سب سے پہلی کتاب میں جو تین عنوانات پر مشتمل ہے، فن طب کی اصل اور طبیب کے فرائض سے گفتگو کی گئی ہے۔ دواؤں کی ترتیب، انکے خواص اور استعمال، ان میں سے ہر ایک سے بہ تفصیل بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح امراض کے اسباب، نوعیت اور انکے انسداد و علاج سے بھی بحث ہے۔ غذا، بخارات کے ذریعہ غسل، کھانوں کی بڑی تقسیمیں یہ اُن بے شمار مسائل میں سے صرف چند ہیں جن کا ذکر اس پہلی کتاب میں آتا ہے۔

امراض | دوسری کتاب میں امراض کا بیان ہے مثلاً بخار، جدرہ یا ورم، جذام، جنون صرع یا مرگی۔ تیسری کتاب میں وبائی امراض کی نوعیت، جسم کے اندر رقیق مادوں کی خصوصیت اور دوسرے مسائل سے بحث ہے۔ چوتھی میں استقرار حمل، مخلوق کی قسموں اور جسم و روح کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔

پانچویں کتاب میں اعضائے حسی، ان کی خصوصیات اور امراض، گویائی، اعضائے جسمی میں بیماریوں کے اسباب، قوت کا یکبارگی زائل ہوجانا اور موت کا بیان ہے۔ چھٹی کتاب میں زیادہ قوت اور طویل عمر حاصل کرنے نیز مختلف قسم کے امراض کی تکالیف سے بحث کی گئی ہے مثلاً استسقا، یرقان، جلد کا صفراوی ورم، دمہ، تشنگی، زہر خوری، التہاب یا ورم، سکرات، گٹھیا اور فالج وغیرہ اس قسم کے تمام امراض بھی ہیں۔ ساتویں کتاب میں مقئی و مسہل کا ذکر ہے اور اس کے بارہویں باب میں اس قسم کی بہت سی دواؤں کا ذکر ملتا ہے جو اس زمانے کے ہندوؤں کو معلوم تھیں۔ سب سے آخری اور آٹھویں کتاب میں جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے بخار کے علاج، مختلف اغراض کے لئے انجکشن اور پچکاریوں وغیرہ کے دینے کا ذکر ہے۔ اگرچہ اس زمانے کی طب کے ساتھ بہت کچھ قصہ کہانیوں کا رنگ بھی ملا ہوا ہے، اور یہ ترتیب نظام آج کل عام طور پر لوگوں کو نظر نہیں آتا، پھر بھی اس زمانے کی غیر معمولی طبی معلومات سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج بہت سی باتوں کو جنہیں دور جدید کی اکتشافات شمار کیا جاتا ہے وہ حقیقت میں اس زمانے کے لوگوں کو عام طور پر معلوم تھیں۔

ان دو اشخاص یعنی سوشرت اور چرک سے مختلف گروہ پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر وائز نے اپنی کسی تحریر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ دو مختلف طریقے فن جراحت کے ہیں، نو طب کے، تین علم الادویہ کے، ایک تشخیص امراض کا، ایک دواسازی کا اور تین معدنیات سے متعلق ہیں۔ ان میں سے چار کا تو کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن باقی طریقوں سے ہم ہندوستان کے قدیم فن طب و جراحت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ جراحی سے متعلق جتنے آلات و اوزار تھے، ان کی بھی مختلف شاخیں اور قسمیں ہیں جن کی مجموعی تعداد کوئی سوا سو ہے۔ ان میں بڑی بڑی دو ہیں (۱) 'یانترا' یعنی بغیر دھار کے آلات، (۲) 'شاسترا' یعنی دھار والے آلات جن کا کسی قدر تفصیل سے ذکر آئندہ آئے گا۔

علم تشریح | مذکورہ بالا سطروں سے یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ قدیم جراح علم تشریح سے بھی کچھ نہ کچھ واقف رہے ہوں گے لیکن آجکل کا یہ حال دیکھکر کہ ہندو طلبہ لاش کے قریب جانے سے کس قدر بھاگتے ہیں، شبہ ہوتا ہے کہ آیا یہ سچ بھی ہے۔ ۱۸۳۶ء میں جب انگریزی طریقہ چیر پھاڑ ہندوستان میں سب سے پہلی بار رائج ہوا، تو اُس وقت بمشکل دس طالب علم اس کے لئے دستیاب ہو سکے اور بہ دقت تمام اس کام کو شروع بھی کرنا چاہا تو بکری کے ڈھانچوں اور خشک ہڈیوں سے شروع کیا گیا۔ انسان کی لاش پر چیر پھاڑ کرنا تو قطعًا بعید از قیاس تھا۔ یہ صرف ایک بنگالی طالب علم تھا جس نے ہمت کر کے سب سے پہلے یہ راہ کھولی، پھر بھی اس کے لئے سب سے پہلا کمرہ جو تیار ہوا، اس کی دیواریں خاص طور سے بہت بلند رکھی گئی تھیں اور ہر وقت اس کے گرد پولیس کا پہرہ لگا رہتا تھا تاکہ کسی وقت عوام کے جذبات مشتعل نہ ہو جائیں اور لوگ حملہ کر بیٹھیں۔ اس کے متعلق عام خیال یہ بھی پھیلا ہوا تھا کہ ادھر اُدھر سے لڑکے پکڑ لائے جاتے ہیں اور مریضوں کو بعض اوقات قصدًا مار ڈالا جاتا ہے تاکہ چیر پھاڑ کے لئے لاشیں مل سکیں، لیکن یہ کوئی خاص ہندوستان ہی کے لئے تعجب کی بات نہیں ہے۔ ایک صدی پہلے انگلستان میں بھی یہی حال تھا۔

بہرحال علم تشریح کے تین بڑے گروہ ہیں جن میں سے ایک اتیریہ (Atreya) کا ہے جس کا زمانہ ۱۲۰۰ قبل مسیح ہے، دوسرا سوشرت کا اور تیسرا واگ بٹ (Vagbata) کا جو دوسری صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اگرچہ ان گروہوں کی تشریح میں مستقل تصنیفات درکار ہیں لیکن مختصر طور پر انکے اصولوں کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چرک کو لیجئے وہ کہتا ہے کہ "جسم میں حسب ذیل حصے ہوتے ہیں: دو بازو، ۲ ٹانگیں، سر اور گردن، اور جسم کے بیچ کا حصہ۔ یہ کل جسد انسانی ہے جس میں دانت اور ناخن کو لیکر کل ۳۶۰ ہڈیاں ہوتی ہیں"، اس کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سر اور گردن کو ملا کر ایک رکھا ہے برعکس اس کے سوشرت کی فہرست میں ہم کو صرف ۳۰۰ ہڈیوں کا ذکر ملتا ہے، جیسا کہ وہ خود

لکھتا ہے کہ "علم جراحت کے مطابق صرف ۳۰۰ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ۱۰۶ اسر میں ہیں، ۱۲۰ شکم کے جھکاؤ، اس کے ہر دو پہلوؤں، پشت، شانوں اور سینہ میں، اور ۶۶ گردن سے اوپر ہیں۔ اس طرح سے مجموعی تعداد ۳۰۰ کی ہو جاتی ہے" اور پھر اس کے علاوہ ہر ایک حصہ کی مزید تفصیل کرتا ہے۔

سوشرت اور چرک کے بیانات میں جو فرق ہے وہ غالباً اس وجہ سے ہے کہ چرک نے ۳۲ دانتوں اور ۲۰ ناخنوں کو بھی علٰحدہ ہڈیوں میں شمار کیا ہے۔ بہرحال انکے اعداد وشمار میں خواہ کچھ ہی فرق کیوں نہ ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کے طریقوں سے فن تشریح کے نہایت وسیع اور جامع ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور بڑے سے بڑے اور نازک سے نازک اپریشنوں کے لئے جن کا کہ اس زمانے میں اکثر رواج تھا، ایسے ہی جامع اور وسیع علم کی ضرورت تھی۔ اس لئے کہ اس زمانے کے اپریشن میں صرف جسم کے حصہ کا کاٹنا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ شکم کے اندرونی حصہ میں بھی اپریشن دئے جاتے ہیں، ٹوٹی ہوتی ہڈیاں جوڑی جاتی تھیں، جوڑ بٹھائے جاتے تھے اور فاسد مادہ نہایت خوبی سے نکال لیا جاتا تھا۔ موتیا بند کے علاج کا سہرہ بھی سوشرت ہی کے سر ہے علاوہ اس کے چمڑے کا ٹکڑا اعضا کے جوڑنے اور علاج کا طریقہ بھی جو یورپ کو ابھی حال میں معلوم ہوا ہے، ان قدیم جراحوں کے ہاں برابر جاری تھا۔

چیر پھاڑ کے لئے جو کمرہ ہوتا تھا اس کے لئے بھی مختلف قواعد مقرر تھے۔ اس کو بعض دافع جراثیم بخارات سے صاف رکھا جاتا تھا۔ بعض اپریشنوں سے قبل مریض کو کوئی ہلکی غذا دیجاتی تھی، اور بعض حالتوں میں اسے بالکل فاقہ کرایا جاتا تھا، جراح کے لئے قاعدہ تھا کہ وہ اپنے سر اور داڑھی کے بال چھوٹے رکھے اور اپنے ناخنوں کو بھی صاف اور ترشے ہوئے رکھے جن پر آج کل کے ماہرین علم جراثیم بہت زور دیتے ہیں۔ علاوہ اس کے وہ صاف ستھرے اور خوشبودار کپڑے پہنے۔ نشتر دینے سے پہلے بیہوش کرنے والی دواؤں کے استعمال کا

بھی کہیں کہیں پتہ چلتا ہے ۔ آخر زمانے میں ۹۰۰ء کی لکھی ہوئی ایک کتاب ملتی ہے جس میں نشتر دینے سے پیشتر ایک دوا سنگھانے کا ذکر ہے جسے 'سموہنی' کہتے تھے اور جو گوتم بدھ کے زمانے میں بھی استعمال ہوتی تھی ۔

بعض قدیم تصانیف سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں نیوٹن کی پیدائش سے سیکڑوں برس پہلے لوگوں کو "کشش اجسام" کا مسئلہ بھی معلوم تھا نیز ہاروے کا نام سننے سے بہت پیشتر وہ دوران خون کے علم سے بھی واقف تھے ۔ ہریت نامی ایک ماہر فن اپنی کتاب میں انیمیا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ بیماری رگوں کے درمیان میں مٹی کے آجانے سے پیدا ہوتی ہے جس سے کہ خون کا دوران بند ہو جاتا ہے ۔ جز لاینجزی کے نظریہ پر حضرت مسیح کی پیدائش سے صدیوں پہلے بحث و مباحثہ ہوتا تھا ، اس کے علاوہ ریاضی و ہیئت میں انکے معلومات بہت وسیع تھے ۔

جسم کے بعض حصوں کے کاٹنے کے ساتھ لوگوں کو بعض اعضا کے از سر نو لگانے کا طریقہ بھی معلوم تھا اور رگ وید میں اسکا بعض بعض جگہ ذکر ملتا ہے ایک موقع پر لوہے کے پاؤں کا ذکر آیا ہے ۔ اسی طرح مصنوعی آنکھوں کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ چمڑے کے پیوند لگانے کا ذکر پہلے آچکا ہے جس کا اعتراف ایک جرمن مصنف ڈاکٹر ہرش برگ (Dr. Hirsch Berg) اپنی کتاب میں کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ "یورپ کے اس قدیم فن میں نئے سرے سے ایک جان پڑ گئی جبکہ ہندوستانی جراحوں کے ان کمالات کا ہمیں علم ہوا ،، ذی روح جسم سے چمڑا کاٹکر جوڑ لگانا بھی خالص ہندوستانی ہی طریقہ ہے ۔

ان قدیم جراحوں کو چمڑے سے نئے کان اور نئی ناک بنانے میں بھی دسترس تھا ۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انکے ہاں مجرموں یا بیوفا بیویوں کو اکثر ناک اور کان کاٹنے کی سزائیں دیجاتی تھیں جس کی وجہ سے ان کے جوڑنے اور لگانے کا طریقہ بھی لوگوں نے حاصل کیا ۔

موہ واگ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ گوتم بدھ کا طبیب جیوکا کھوپری کی ہڈیوں

کے جوڑ کا علاج بھی کس خوبی سے کر سکتا تھا، علاوہ اس کے جینر (Jenner) سے بہت پہلے یہاں کے گوالے چیچک کا ٹیکہ لگانا جانتے تھے۔ وہ آبلوں کے خشک کھرنجوں کو لیکر کسی قدر اپنے بازو پر رکھتے اور پھر اس کے بعد جسم میں سوئی چبھوتے اور اس طرح گویا وہ چیچک کے حملے سے محفوظ ہو جاتے۔ پانڈی چری کے ایک فاضل ڈاکٹر ہویلٹ (Dr. Hewlett) کا خیال ہے کہ ہندو اطبا اس قسم کا بھی ٹیکہ لگانا جانتے تھے جسے آج کل ویکسی نیشن کہتے ہیں یہاں تک تو فن جراحت کا ذکر تھا۔ آئندہ سطروں میں فن طب کا تذکرہ کیا جائیگا۔

سلیم کی یاد میں

۱۹۰۷ء کو یادش بخیر بائیس سال ہو گئے۔ وہ بھی کیا وقت تھا جب میں کوہ نینی تال سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علیگڑھ میں داخل ہونے کے لئے چلا اور نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں مرحوم نے مجھ سے کہا کہ علیگڑھ پہنچکر مولوی سید وحید الدین سلیم اڈیٹر علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے ضرور ملنا چونکہ رسالہ معارف مرحوم جس کے وہ اور حاجی صاحب مرحوم جوائنٹ اڈیٹر تھے میری نظر سے گزر چکا تھا اسلئے مجھے خود سلیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا بہت شوق تھا مگر میں علیگڑھ پہنچکر کالج کی ایف۔اے کلاس میں داخل ہوتے ہی بیمار پڑ گیا۔ ایک ماہ تک صاحب فراش رہا جب کچھ افاقہ ہوا تو اس سال کثرتِ طلاب کی وجہ سے جو جگہ کچی بارک میں مجھے ملی تھی اس پر دوسروں کا قبضہ ہو گیا تھا اور میں تندرست ہو جانے کے باوجود کرزن ہسپتال ہی میں رہنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ آخر کار کالج کے ارباب حل وعقد نے جعفر منزل کرایہ پر لی اور مجھ جیسے اور ستم رسیدوں کو بھی وہاں رہنے کا حکم ہوا۔ از آنجملہ اقتدار عالم صاحب بھی تھے جو تھرڈ ایر کلاس میں تھے اور آج کل غالباً بدایوں میں وکیل ہیں۔ ان حضرت سے صاحب سلامت ہو کر کافی شناسائی ہو گئی تھی۔ جعفر منزل اس وقت زیر تعمیر تھی اور اُسی کے جو کمرے تیار ہو گئے تھے وہ بھی آرام دہ نہ تھے۔ اقتدار صاحب کالج کے پرانے طالب علم تھے۔ جوڑ توڑ لگا کر سوسائٹی کو منتقل ہو گئے مگر میں اور دیگر طلبہ کچھ عرصہ تک جعفر منزل ہی میں رہے۔ اب مجھے یہاں رہتے ہوئے دو تین ماہ گذر چکے تھے۔ ایک روز خیال آیا کہ سلیم صاحب سے ملنا چاہئے۔ میں بڑے اشتیاق کے ساتھ جعفر منزل سے سوسائٹی کی طرف جہاں سلیم صاحب رہتے تھے پا پیادہ روانہ ہوا۔ ان دونوں میں کم از کم ایک میل کا فاصلہ ہوگا۔ شام کے کوئی چار بجے ہونگے اور غالباً آخر نومبر یا شروع دسمبر کا زمانہ تھا۔ سوسائٹی پہنچکر سلیم صاحب کا کمرہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دکن کی جانب کے کمرے میں مقیم ہیں

اُس کمرہ میں پہنچا تو وہاں دو تین اصحاب اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سلام کرکے ایک کرسی پر خاموش بیٹھ گیا اور منتظر رہا کہ اور لوگ اٹھ جائیں تو سلیم صاحب سے اظہار عقیدت کروں۔ خوش قسمتی سے دس پندرہ منٹ کے بعد جس موقع کا میں متلاشی تھا وہ مل گیا۔ میں اور سلیم صاحب رہ گئے باقی اصحاب اُٹھ کر چلے گئے۔ اب میں نے از اول تا آخر حاجی محمد اسمٰعیل خاں کا ارشاد اور بیماری کی وجہ سے جلد نیاز نہ حاصل کرنے کی مجبوری وغیرہ وغیرہ تمام قصہ کہا اور اُن کی ملاقات پر فخر کا اظہار کیا۔ اُس وقت تک میں نے دو چار نظمیں ضرور لکھی تھیں مگر وہ سلسلے سے یاد نہ تھیں اس لئے میں نے غزل کے کچھ اشعار سلیم صاحب کو اپنے ادبی مذاق کے ثبوت میں سنانے شروع کئے۔ عرصہ زیادہ ہوگیا ہے لیکن جہانتک خیال ہے میں نے اپنا یہ شعر پڑھ کر سنایا تھا۔

کہانتک دل کو سمجھاؤں نہ آج آیا نہ کل آیا ہمیشہ نامہ بر سے وہ یہی کہتا ہے "چل۔ آیا"

سلیم صاحب۔ لغو۔

(مجھے تعجب تو ہوا لیکن میں سلیم صاحب کے "لغو" کہدینے سے ابھی اپنی شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا)

میں۔ ارے نادان! تو فکر دنیا میں کیوں سر کھپاتا ہے دھرا رہجائیگا سب کچھ جو پیغام اجل آیا

سلیم صاحب۔ واہیات۔

اب میں سٹی بھوگیا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سلیم صاحب کو اپنی خوش مذاقی کا کیسے یقین دلاؤں میں نے دل میں کہا کہ ۱۹۰۵ء ایک قطعہ مولانا حالی کو سنایا تھا جب وہ میرٹھ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے یہاں تشریف لائے تھے اور انہوں نے اُس کی زبان کی تعریف کی تھی۔ آؤ اُسے سنائیں چنانچہ اس تمہید سے کہ مولنا حالی سے میرٹھ میں مجھے نیاز حاصل ہوا تھا اور یہ قطعہ اُنہیں بھی سنایا تھا میں نے پڑھنا شروع کیا۔)

آئے ہو، بیٹھو، جاؤ جلدی ہے ایسی کیا مدت میں آج ہوئی ہے زیارت حضور کی
تشریف لائے اور کیا مورد کرم تکلیف میرے واسطے اتنی ضرور کی

شب کو قیام کیجئے یہ ہو آپ ہی کا گھر میں، آپ ایک ہیں نہیں نسبت ہے دور کی
یہ رات تو ہے خوب ولیکن سحر نہ ہو جبتک کہ ہم نے نہیں آواز صور کی

سلیم صاحب - خرافات -

اب مجھے کچھ اور کہنا باقی نہ تھا اور دل ہی دل میں پشیمان تھا کہ سلیم صاحب نے نصیحتاً کہا کہ "شاعری بیکار شے ہے اسے چھوڑنا چاہئے" اور مجھ سے دریافت کیا۔

سلیم صاحب - تم مولانا حالی سے کہاں ملے تھے ؟

میں - میرٹھ میں -

سلیم صاحب - کب ؟

میں - ۱۹۰۵ء میں -

سلیم صاحب - تم انہیں پہچان سکتے ہو ؟

میں - (ذرا ہچکچاتے ہوئے) جی ہاں !

(اُسی کمرے کے اندر لکڑی کے تختوں سے ایک حدِ فاصل بنا کر علیحدہ چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا اور دروازہ بھی لگا تھا تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور ایک صاحب باہر تشریف لائے۔ سلیم صاحب فوراً اٹھے، اُنکے اٹھتے ہی میں بھی کھڑا ہو گیا۔ غالباً سلیم صاحب سے انہوں نے دیا سلائی طلب کی اپنا سگار روشن کیا اور کھڑے کھڑے دو ایک کش لیکر جہاں سے آئے تھے وہیں چلے گئے اور دروازہ بدستور بند ہو گیا۔ سلیم صاحب پھر اپنی جگہ پر آبیٹھے)

سلیم صاحب - (مجھ سے مخاطب ہو کر) تم جانتے ہو کہ یہ کون صاحب تھے ؟

میں - (بالکل بے پروائی سے) جی نہیں !

سلیم صاحب - یہ مولانا حالی تھے -

سلیم صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ میرے دل کی عجیب کیفیت ہو گئی اور وہاں سے اٹھنے کے لئے بے قرار ہو گیا - میری بیقراری کو سلیم صاحب نے مولانا حالی سے ملنے کی خواہش پر محمول کیا اور

فرمانے لگے " یہ وقت اُن سے ملنے کا نہیں ہے۔ وہ کراچی ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے اپنا خطبہ تیار کررہے ہیں ۔ انکو ملنے ملانے کی فرصت نہیں ہے "

میں ۔(کھڑا ہوکر) السلام علیکم

سلیم صاحب ۔ (بہت بے پروائی سے) وعلیکم السلام

اب دن چھپنے ہی کو تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر مجھے معلوم نہیں ہوا کہ میرا پاؤں کہاں پڑ رہا ہے اور میں کدھر چلا جا رہا ہوں ۔ اپنے اوپر لعن و نفرین اور افسوس کرتا ہوا کہ کیوں اس شخص سے ملنے آیا اور قریب قریب روتا ہوا چلا جا رہا تھا ۔ بار بار کہتا تھا وہ یہ عجیب آدمی ہے میں نے مانا مجھے شعر کہنا نہیں آتا ۔ میرے اشعار بھی لغو ہیں لیکن یہ کیا انسانیت ہے کہ اس طرح آدمی کو ذلیل کیا جائے ۔ کیا اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کے لئے کوئی اور مستحسن طریقہ نہ تھا ؟ اور لیجئے آپ پوچھتے ہیں تم مولنا حالی کو پہچان سکتے ہو ۔گویا میں جھوٹا ہوں ، میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں کوئی پوچھے کہ ایک ہی بار تو میں نے مولنا حالی کو دیکھا تھا ۔ پھر دو برس تک دیکھنے کا موقع نہیں ملا (اور تصویر انکی کہیں شائع نہیں ہوئی تھی ۔ کیا یاد رہ سکتا ہے اور ان کو کیسے پہچانا جاسکتا ہے ۔ مگر اس شخص کو ذلیل کرنا مقصود تھا ۔ بھئی ! ہم تو اب اس شخص کے یہاں کبھی نہ جائینگے خدا اس سے پناہ میں رکھے ۔ توبہ ! توبہ ! ایسے یہ شخص تو ملنے کے لائق ہی نہیں ہے " غرض جو میرے منہ میں آیا کہتا چلا گیا ۔ اپنے آپ کو بھی برا کہا اور سلیم صاحب کو بھی ۔ جب جعفر منزل پہنچا تو میں اس قدر رنجیدہ اور ملول تھا کہ اس روز میں نے کھانا بھی نہیں کھایا اور نہ رات کو کچھ لکھا پڑھا دو تین روز تک میں چپ چپ اور خاموش رہا ۔ اس کے بعد یہ جانگزا سانحہ دل سے محو ہوگیا۔

ایک روز اقتدار صاحب ملے ، اس واقعہ کے ایک یا ڈیڑھ ماہ بعد اور میری نظم موسوم بہ "ایک طائر وحشی کی فریاد " علیگڑھ منتھلی دسمبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوچکی تھی ۔ کہنے لگے "سلیم صاحب آپ کو یاد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تنہا صاحب سے ہمیں ملاؤ "

میں ۔ (دل میں) شاید ان کو میری اور سلیم صاحب کی اس ملاقات کا حال معلوم ہوگیا ہے اور

یہ تمسخراً کہہ رہے ہیں۔ (اقتدار صاحب سے) میری اور سلیم صاحب کی کوئی واقفیت نہیں وہ مجھ کیوں یاد کرتے؟

اقتدار صاحب۔ (کسی قدر مسکرا کر جس سے مجھے یقین ہوگیا کہ یہ ضرور میری ہنسی اڑا رہے ہیں) نہیں! میں قسمیہ کہتا ہوں وہ آپ کو پوچھ رہے تھے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میری اور آپ کی ملاقات ہے تو مجھ سے باصرار کہا کہ تنہا صاحب سے ضرور ملانا۔ مجھے تو آپ سے کہنا بھی یاد نہ رہا اور وہ کئی بار تقاضا کر چکے ہیں۔ (اپنے ساتھی کی طرف دیکھکر) اگر تمہیں میرا یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو۔

اقتدار صاحب کے ساتھی۔ واقعی سلیم صاحب نے مجھ سے اور ان سے کئی بار کہا ہے کہ تنہا صاحب سے ہمیں ملاؤ۔ اور ہم نے اُن سے کہدیا ہے کہ وہ اکثر یہاں تاش کھیلنے آیا کرتے ہیں آپ سے ملادیں گے۔ آپ سوسائٹی ہم سے ملنے اور تاش کھیلنے اکثر جاتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ ہمیں یاد نہیں رہتا۔

میں۔ (دل میں) آپ کے ساتھی ہی کیا قابل اعتبار ہیں۔ اس کالج میں تو ایک سے ایک چھٹا ہوا لڑکا بھرا ہوا ہے۔ بیوقوف بنانا اور ہنسی اڑانا معمولی بات ہے۔ (اقتدار صاحب سے) اچھی بات ہے۔ جب آپ سے ملنے آؤں گا تو سلیم صاحب سے بھی مل لوں گا۔

درحقیقت اقتدار صاحب سے میں نے یہ بات کہنے کو تو کہہ دی مگر دل میں یہی ارادہ تھا کہ سلیم صاحب سے ہرگز نہ ملوں گا اگر اقتدار صاحب فی الواقع سچ بھی بول رہے ہوں۔ علیگڑھ منتھلی جنوری ۱۹۰۸ء میں اب میری ایک اور نظم "دربلبل سے دو دو باتیں" چھپی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری یہ دونوں نظمیں دیکھکر سلیم صاحب کو مجھسے ملنے کا اشتیاق ہوا اور وہ اپنی اور میری اُس ناگفتہ بہ ملاقات کو بھول گئے تھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ اقتدار صاحب جب کبھی ملتے، مجھسے ضرور تقاضا کرتے کہ سلیم صاحب سے ملنے چلو اور میں ٹالدیتا۔

ایک روز تعطیل تھی اور میں کھانا کھا کر سیدھا سوسائٹی پہنچا۔ شاید بارہ بجے ہوں گے آخر جنوری یا شروع فروری کا زمانہ تھا۔ اقتدار صاحب کے کمرے میں تاش کھیلا جارہا تھا۔ میں بھی

شریک ہوگیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد اقتدار صاحب کے ساتھی کو سلیم صاحب نے آدمی بھیجکر کسی ضرورت سے بلایا۔ وہ واپس آئے تو کہنے لگے کہ "تنہا صاحب! چلئے۔ آج تو پکڑے گئے۔ سلیم صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں" میں بہت جزبز ہوا مگر چارہ کار کچھ نہ تھا۔ میں نے کالج واپس آنے کا بھی ارادہ کیا لیکن اقتدار عالم صاحب نے مجھے پکڑ لیا اور کشاں کشاں سلیم صاحب کے کمرہ تک لے گئے۔ وہاں پہنچکر مجبوراً میں نے بھی متانت اختیار کی اور کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں چلتا ہوں۔ چنانچہ اسی حد فاصل والے چھوٹے کمرہ میں ہم سب لوگ جو چار یا پانچ تھے داخل ہوئے۔ سلیم صاحب باں ریش مبارک ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دو تکئے جن کے غلاف میلے تھے ایک سرہانے اور ایک اُن کے زانو کے نیچے تھا۔ پان چبا رہے تھے۔ پاندان چھوٹا سا ایک اسٹول پر تھا اور ایک بوسیدہ ڈبیہ بھی تھی جس میں بہت سے پان بنے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں پڑی تھیں، ایک آدھ کی جو کمی تھی وہ نوکر نے باہر سے لاکر پوری کردی اور ہم میں سے ایک صاحب سلیم صاحب کی پائینتی بیٹھ گئے۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ اقتدار صاحب نے سلیم صاحب سے میرا تعارف کرایا۔

سلیم صاحب۔ (مجھ سے مخاطب ہوکر) آپ کی نظمیں علیگڑھ منتھلی میں دیکھ کر بیحد طبیعت خوش ہوئی آپ بہت اچھی نظمیں لکھتے ہیں۔ افسوس ہے آپ سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

میں۔ (دل میں) ارے ظالم! میں ہی جانتا ہوں، میں جیسی اچھی نظمیں لکھتا ہوں (سلیم صاحب سے) کچھ عرصہ ہوا میں آپ کی خدمت میں حاضر تو ہوا تھا۔

سلیم صاحب۔ مجھے بالکل یاد نہیں۔ آپ ایک مرتبہ کے بعد پھر شاید نہیں آئے

میں۔ (دل میں) کون ایسا کمبخت بے غیرت ہوگا جو ایسی ملاقات کے بعد دوبارہ آئے (سلیم صاحب سے) جی ہاں! پھر میں نہیں آیا۔

سلیم صاحب۔ کبھی کبھی تشریف لایا کیجئے۔ آپ کے کالج کے اکثر طلبہ جن کو ادبی مذاق ہے تقریباً روزانہ آتے رہتے ہیں۔ مجھے بلکہ تعجب ہے کہ آپ ادھر کا رخ نہ کریں

میں - (دل میں) میں تو بڑے اشتیاق سے آیا تھا لیکن نتیجہ نفرت انگیز نکلا (سلیم صاحب سے) کچھ ایسا ہی اتفاق ہوا، انشاء اللہ اب حاضر ہوا کروں گا۔

ہم سب لوگ دس پندرہ منٹ اور بیٹھے اور سلیم صاحب نے سب کو اپنی ڈبیہ میں سے پان عنایت فرمائے۔ اس کے بعد ہم سب رخصت ہو کر چلے آئے۔ میں جعفر منزل یا غالباً کچی بارک کمرہ نمبر ۱ کو چلا آیا کیونکہ میں ۱۹۱۰ء تک جب کہ میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا اسی کمرہ میں رہا۔ اب میں کبھی کبھی سلیم صاحب کے یہاں جانے لگا اور اُن سے ایک قسم کی بے تکلفی ہوگئی ایک روز سلیم صاحب نے فرمایا "بھئی تم نثر نہیں لکھتے نظمیں ہی لکھا کرتے ہو! اب زمانہ نثر کا ہے کوئی مضمون ہمارے اخبار کے لئے لکھو"، میں اُن سے مضمون لکھنے کا وعدہ کرکے چلا آیا چار پانچ روز بعد میں ایک مضمون لکھکر لے گیا۔ اُس کا عنوان "شہرت سے خطاب"، تھا۔ دیکھکر بہت خوش ہوئے۔ اور اُسے تمام و کمال پڑھکر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہنے لگے "یہ مضمون تم نے لکھا ہے"، میرا اب وہ زمانہ تو رہا نہیں تھا کہ جب انکے الفاظ "لغو، واہیات، خرافات" سنکر لہو کے سے گھونٹ پی کر چلا گیا تھا اب میں ان سے مقابلے کے لئے بھی تیار تھا۔

میں - جی نہیں کسی اور سے لکھوا کر لایا ہوں -

سلیم صاحب - واقعی خوب مضمون لکھا ہے۔ تم نظم لکھنا چھوڑ دو۔ نثر لکھا کرو۔ نثر تم بہت اچھی لکھتے ہو۔ (میرے چہرے کی طرف دیکھکر) تمہاری صورت پر علمیت نہیں برستی۔ لیکن آگے چل کر عالمانہ شان بھی پیدا ہو جائے گی۔

سلیم صاحب نے وہ مضمون علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھاپا اور ایک ہفتہ تک جو کوئی آتا اُس سے میرا تعارف کراتے اور کہتے کہ آپ نے "شہرت سے خطاب"، والا مضمون پڑھا ہے۔ وہ تنہا صاحب یہی ہیں جنہوں نے وہ مضمون لکھا ہے۔ دو تین ہفتہ کے بعد سلیم صاحب نے اور مضمون لکھنے کے لئے کہا۔ اور میں نے ایک ہفتہ کے بعد "اعتماد"، پر مضمون لکھا۔ اُسے لیکر سلیم صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ پہلے دو پیراگراف دیکھکر کہا کہ یہ اچھے ہیں لیکن آخر کے حصہ مضمون کو پڑھکر کہا کہ یہ کچھ

نہیں اس کو بدلو۔ میں اگلے روز اُسے بدل کرلے گیا۔ پڑھکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے بغلگیر ہوئے بیحد تعریف کی اور کہا کہ تم نے آخر کے حصہ کو خوب ہی بدلا ہے تعریف نہیں ہو سکتی۔ اُس مضمون کو بھی علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھاپا اور لوگوں سے اُس کی تعریف کرتے رہے۔

ایک روز میں ایک انگریزی نظم کا اردو نثر میں ترجمہ کرکے لے گیا۔ بہت داد دی اور کہا کہ بہت سی انگریزی نظموں کا ترجمہ کرکے ایک کتابی شکل میں چھپواؤ چنانچہ انکے ارشاد کے مطابق شاعرانہ خیالات کے نام سے میں نے اس قسم کی کتاب ۱۹۱۲ء میں چھپوائی تھی۔ سلیم صاحب اس وقت لکھنؤ کے مسلم گزٹ کے اڈیٹر تھے۔ اُس اخبار میں آپ نے اس کتاب پر ریویو کیا اور لکھا کہ ایک شخص نے فرانسیسی نظموں کا ترجمہ عربی میں چھاپا ہے۔ وہ ترجمہ میں ایسا کامیاب نہیں ہوا جیسے کہ تنہا صاحب اس کے علاوہ اور بہت کچھ تعریف لکھی۔

ایک روز چند طلبہ انکے پاس بیٹھے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ گرمی کا موسم۔ مجھے سوسائٹی کے دروازے سے آتا دیکھکر بڑے زور کے ساتھ ہاتھ سے اشارہ کرنے لگے کہ فوراً آؤ۔ انیس احمد صاحب بھی تھے جو شیخ الہند مولوی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہونے کی وجہ سے مولوی انیس احمد صاحب مشہور ہیں اور ہندوستان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے بھی اشارہ کیا کہ فوراً آؤ۔ میں تیز قدمی کے ساتھ ان لوگوں کے پاس پہنچا اور حیران تھا کہ کیا ایسا ضروری کام ہے جو اس قدر جلد بلاتے ہیں۔ فوراً مجھے بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ میں بیٹھ گیا۔ اب سلیم صاحب نے کہا۔

سلیم صاحب۔ اس وقت ہم سب آدمی مشددآباد کے رہنے والے موجود ہیں۔ ہم میں کوئی غیر شخص نہیں۔ مشددآباد سے اضلاع سہارنپور، کرنال، مظفرنگر اور میرٹھ کا کچھ حصہ مراد ہے۔ اس حلقہ کو مشددآباد کیوں کہتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگ ہر لفظ تشدید کے ساتھ بولتے ہیں۔ مثلاً روٹی کہنا ہو تو کہیں گے روٹّی۔ لوٹا کہنا ہے تو کہیں گے لوٹّا۔ ایک لطف اور ہے جن الفاظ پر تشدید ہے، اُس تشدید کو حذف کر دیتے ہیں مثلاً کتّا کہنا ہے تو کہیں گے کتے! بلّی کہنا ہو تو کہینگے بلی۔ بعض اوقات اکثر الفاظ میں سے الف حذف کر دیتے ہیں مثلاً کہنا ہو ابے! اُٹھا تو کہیں گے کہ بے! ٹھا

حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ آ گئے اور مزاح موقوف ہو گیا۔

۱۹۰۹ء میں مسٹر آرچبولڈ پرنسپل نے براہ راست ہیوٹ صاحب لفٹننٹ گورنر کو استعفا بھیجا اور انگریزی اسٹاف نے بھی ایسا ہی کیا۔ نواب وقار الملک کا زمانہ تھا لیکن ٹرسٹیوں کی جیسی کچھ اس وقت جماعت تھی خوف تھا کہ شاید نواب صاحب کا ساتھ نہ دیں اور لفٹننٹ گورنر کے منشا کی مطابق کام کریں۔ میں نے ایک نظم اس اندیشہ کی بنا پر ایک گمنام سولن کی صدا "کے عنوان سے لکھی۔ سلیم صاحب کو دکھلائی۔ بعض اشعار سلیم صاحب نے پسند کئے اور بعض کی نسبت کہا کہ انہیں بدلو۔ میں روزانہ دو چار شعر بدلکر لیجاتا تھا اور وہ پسند کر لیتے تھے۔ نظم بڑی تھی اس لئے ایک ہفتہ تک تو یہی سلسلہ رہا۔ ایک روز دوپہر کا وقت تھا جب میں سلیم صاحب کے پہنچا۔ کہنے لگے کہ اب اشعار تھوڑے رہ گئے ہیں جن کو بدلنا مقصود ہے، اس لئے تم ان کو میرے سامنے یہیں بدلو۔ چنانچہ میں نے ترمیم و تنسیخ شروع کر دی۔ ایک مصرع جو بدلکر سنایا تو ہاتھ کے اشارے، جیسے کوئی کسی کو بلاتا ہو، جلد جلد کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ اس سے کیا مطلب ہے فرمایا کہ اس مصرع پر "نثلو جوتے" اور یہ کہکر خوب ہنسے۔ اس وقت تو میں چپ ہو رہا۔ حضرت بھی میرے مصرعوں کی بجائے دوسرے مصرعے رکھتے جاتے تھے اور جب ہم دونوں پسند کر لیتے تھے اس مصرع کو لکھ لیتے تھے۔ سلیم صاحب نے ایک مصرع میرے مصرع کی بجائے کہا وہ اچھا نہ تھا میں نے بھی ہاتھ کا وہی مخصوص اشارہ کیا جو ان سے سیکھا تھا اس وقت سلیم صاحب کی ہنسی کا کہیں پتہ نہ تھا بالکل متین بن گئے تھے اور میں ہنس رہا تھا فوراً کہا کہ اچھا یہ مصرع پسند نہیں اور لو۔ غرض اسی ہنسی دل لگی میں وہ نظم اسی وقت پوری کر دی گئی۔

ایک روز جو میں حسب عادت سلیم صاحب کے یہاں حاضر ہوا تو کہنے لگے "میری دعا ہے کہ تم کبھی بی۔ اے پاس نہ ہو"۔ میں اس بد دعا کو سنکر سہم گیا اور میں نے سلیم صاحب سے کہا کہ مجھ سے ایسا کیا قصور ہوا ہے جو آپ یہ بد دعا دیتے ہیں۔ فرمایا "بھئی! تم سے پہلے بھی اور لوگ ادبی ذوق رکھتے تھے لیکن جب سے کمبخت بی۔ اے پاس ہوئے اور ان کو ڈپٹی کلکٹری ملی پھر لکھنا پڑھنا کیسا

کو چہ کیطرف بھول کر نہیں آئے۔ تم بی اے پاس ہو جاؤ گے تمہارا بھی یہی حال ہو گا۔ اس لئے میں کہتا ہوں خدا تمہیں بی اے پاس نہ کرے تاکہ یہ ادبی شوق تو برقرار رہے"۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ مطمئن رہئے میں ہرگز یہ ادبی شوق نہ چھوڑوں گا لیکن آپ میرے لئے دعا کیجئے کہ میں بی اے پاس ہو جاؤں تاکہ یہ شوق اچھی طرح پورا کر سکوں۔ سلیم صاحب نے کہا کہ میں تو اسی خیال سے کہتا تھا ورنہ کوئی مجھے تم سے دشمنی نہیں ہے۔ خدا تمہیں بی اے کرے لیکن تم کو ادبی شوق بھی برابر رہے۔

میں ایف اے پاس کر کے میرٹھ کالج کی تھرڈ ایر کلاس میں داخل ہو گیا اور اُس کے بعد سلیم صاحب سے جو روزانہ ملاقاتیں ہوتی تھیں اُنکا لطف جاتا رہا۔ ۱۹۱۱ء میں پانی پت گیا تو سلیم صاحب سے وہاں نیاز حاصل ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں بھی پانی پت اُن سے ملنے کے ارادہ سے گیا اور ملاقات کی۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۲۵ء میں بہت فرق پایا۔ ۱۹۱۱ء میں تو حالت بدستور تھی۔ سلیم صاحب مرنجان مرنج آدمی تھے۔ ۱۹۰۹ء بلکہ ۱۹۱۱ء تک دہریت کیطرف راغب تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ انکا یہ رجحان کیوں اور کیسے جاتا رہا لیکن ۱۹۲۵ء میں وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو گئے تھے اور انکے عقائد بہت درست اور صحیح ہو گئے تھے۔ مسلمانوں اور اسلام کے ہمیشہ سچے بہی خواہ رہے۔ مزاج میں ظرافت بہت تھی۔ اُردو کے فاضل ادیب تھے۔ جدّت پسند تھے۔ آزاد طبع تھے۔ مولانا حالی کا بہت ادب کرتے تھے اور انکو بیحد مانتے تھے۔ افسوس ۱۹۲۸ء میں انتقال فرما گئے۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے۔

گرفتاری

حلقۂ گردِ من زنید اے پیکران آب و گل　　آتشے در سینہ دارم از نیاگان شما

مجھے یاد ہے کہ میں نے بچپن میں ایک مرجھایا ہوا سا پودا دیکھا تھا، اور اُسے بالکل سوکھا
سمجھ کر میں اس کی ننھی ننھی شاخیں توڑنے لگی، شاخیں واقعی سوکھی تھیں، اور ایسی طرح چٹ چٹ
ٹوٹ گئیں گویا انہیں میرے توڑنے کا انتظار تھا میں نے ایک ایک کر کے سب شاخیں زمین پر بکھیر دیں
اور پودے کا نازک تنا بالکل لُنڈ منڈ ہو کر رہ گیا اس کی یہ حالت دیکھکر مجھے ترس آیا اور شرارت نے یہ
مشورہ دیا کہ اگر شاخیں توڑ دالیں تو تنے کو کھڑا چھوڑ دینا اور زیادہ ظلم ہے۔ میں نے اس کا پتلا سرا اپنے
ہاتھ میں لپیٹا اور ذرا سا جھٹکا دیا۔ تنا نہیں ٹوٹا، اس کے تیور دیکھ کر میں نے بھی پوری طاقت آزمائی
کی اور پورا جڑ سے ٹوٹ گیا۔ لیکن جڑ جہاں سے ٹوٹی وہاں تری تھی اور ہلکی سی سبزی، وہاں زندگی
کا رشتہ ابھی قائم تھا۔ اس رشتے نے اپنے ٹوٹنے پر فریاد کی اور آنسو بہائے۔ یوں ہی میں بھی، جب
عمر کے بیس بائیس سال گذر گئے ہیں، اپنی ہستی کو تصور کرتی ہوں۔ میں ایک قصبہ میں رہتی ہوں۔
جہاں کے وہ بسنے والے جنہوں نے اسے اپنا آشیانہ بنایا تھا اور اپنے فلک پیما حوصلوں کی بنیاد
پر وہاں ایک زندگی تعمیر کی تھی اب بے نشان قبروں میں آرام کر رہے ہیں اور انکے بعد سے سارے
قصبہ پر موت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ میں ایک مکان میں رہتی ہوں جس کے در و دیوار زمین
کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اور اس زندگی سے شرمندہ ہیں جس میں اُن کی
رسوائی ہی رسوائی ہے۔ اس مردہ بستی اور اجڑے مکان میں صرف میں زندہ ہوں، میرا جسم میری
روح، میری امیدیں۔ اُس سوکھے پودے کی شاخوں کی طرح یہ سونی بستی اور یہ ویران گھر اس کے
منتظر ہیں کہ کوئی شوخ شریر ہاتھ انہیں گرادے اور وہ مٹی میں ملجائیں۔ میں اس کھنڈر میں گرفتار
ہوں اور میری گرفتاری وہ سلسلہ قائم کئے ہے جسے زندگی کہتے ہیں، مگر اُس پودے کی تری

اور ہلکی سی سبزی اور آنسوؤں کی طرح میں بھی نظر سے چھپی ہوں۔ مجھے وہی دیکھ سکتا ہے جس کے شوخ
شریر ہاتھ اس کھنڈر کی آرزو پوری کریں، اسے رسوائی سے بچائیں، اور موت کے دامن میں
پناہ لینے دیں۔ اس کھنڈر کے ساتھ ممکن ہے میں بھی دفن ہو جاؤں، لیکن میں فریاد کروں گی،
اور ممکن ہے یہ پھٹے کپڑوں کی مانند زمین پر گر جائے، میری ہستی اور دنیا کی نظروں کے درمیان
کوئی پردہ باقی نہ رہے تب بھی مجھے شکایت نہ ہوگی، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ میں ایک بجھی ہوئی
آگ کی آخری چنگاری ہوں، یا ایک آتش جہاں سوز کا پہلا شعلہ، اور مجھے حوصلہ فنا کا کرنا چاہئے
یا بقا کا، موت کی تاریکی سے بغل گیر ہونا چاہئے یا روشنی میں جلوہ افروز۔ مجھے صرف اتنا معلوم
ہے کہ میں زندہ ہوں، مجھ میں زندگی کا سامان ہے اور زندہ رہنے کی آرزو۔ مگر میں گرفتار ہوں
اور میری گرفتاری عشق کی نہیں اور ہوس کی تھیں۔ اس گرفتاری میں میری ہستی مرجھاتی ہے،
سرسبز نہیں ہوتی۔ میں ہر حالت میں راضی برضا ہوں، مگر میرا دل یہ کہتا ہے، ممکن ہے اُسے
محض مغالطہ ہو۔ کہ یہ آگ بجھنے کے لئے نہیں جلائی گئی تھی۔

میں جس مکان میں رہتی ہوں اُس کی بنیاد علاؤالدین خلجی کے ایک سردار نے ڈالی
تھی، اس نے یہ قصبہ بھی آباد کیا تھا۔ اُس کے زمانے سے اس وقت تک اس خاندان نے
عجیب عجیب جوہر دکھائے ہیں۔ اس نے کوئی ایسی شخصیت نہیں پیدا کی جو تمام ہندوستان
میں مشہور رہی ہو لیکن قوم اور ملت کو صرف بڑی شخصیتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آئین
پر استقلال سے قائم رہنے پرانے اصولوں میں جوش عقیدت سے ہر دم نئی جان پھونکنے تے
ایسی ہستیاں درکار ہیں جن کو عوام بہت بلند پایہ نہ سمجھیں، اور خدا کے خاص بندے انہیں
محض مٹی کے پتلے دیکھ کر مایوس نہ ہو جائیں۔ یہ وہ زنجیریں جو سکون کی حالت میں جہاز کو لنگر
سے علیحدہ نہیں ہونے دیتیں وہ بادبان جو جہاز کو چلانے کے لئے اپنا سینہ پھیلا دیتے ہیں۔
اس خاندان میں ایک نصرت خاں تھے جنھوں نے شاہان دہلی کے لئے ہزاروں لڑائیاں
لڑی تھیں، اور بعد کو جب انہیں احساس ہوا کہ شاہان دہلی خود کو آئین اسلام کے پابند نہیں

سمجھتے تو انہوں نے بغاوت کی اور اسی میں شہید ہوئے۔ اسی خاندان میں شجاعت خاں تھے جن کی تمام عمر ایک غریب کسان کو ایک کھیت واپس دلانے میں گذری جو کسی مقدم نے اُس سے جبرًا چھین لیا تھا۔ غریب کسان کے کھیت کے لئے وہ اپنے باپ سے خفا ہوگئے، گھر بار چھوڑ کر انصاف کی تلاش میں دہلی پہنچے، وہاں کوئی پرسان حال نہ ہوا تو فوج میں نوکری کی، رفتہ رفتہ رتبہ حاصل کیا، بادشاہ کے مشیر بنے، اور خدمت کا حق ادا کرکے شاہی فرمان کے ذریعہ سے کھیت واپس لیا۔ انہیں درباری زندگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، علمی ذوق کے آدمی تھے لیکن جو بات جی میں ٹھان لی تھی اُس پر قائم رہے، اُس کے لئے تمام عمر صرف کرنا گوارا کیا جب وہ واپس آئے تو کسان اور مقدم دونوں مرچکے تھے، انہوں نے فرمان کی بنا پر کسان کے وارثوں کو وہ کھیت واپس دلوایا، جب وہ کسان کے وارثوں کو فرمان سنا رہے تھے، تو انہیں اپنی عمر کی بربادی کا خیال آیا اور فرمان پر دو آنسو ٹپک پڑے۔ کھیت اور فرمان دونوں انکے بیٹے نے انکے مرنے کے چند مہینے بعد کسان سے خرید لئے۔ یہ فرمان ابتک موجود ہے، اور اس پر آنسوؤں کے دھبے بھی اب تک نظر آتے ہیں۔ ہمارے خاندان ہی میں ایک رنگیلے میاں تھے جو بعد کو رنگیلے شاہ کے نام سے کافی مشہور ہوئے؛ انہوں نے ساری جوانی عیاشی اور ہوس پرستی میں گذاری تھی، ایک روز جب وہ شراب پئے بیٹھے تھے تو لوگوں نے خبر دی کہ بیوی کا دم نکل رہا ہے، اور وہ اُسی طرح سے بدمست اُن سے آخری بار رخصت ہونیکے لئے پہنچے بیوی کا دائمی آخری وقت تھا، لیکن وہ محبت کیش عورت شوہر کو پاس کھڑا دیکھ کر اپنی تمام مصیبتیں بھول گئی، جو کچھ جسم میں طاقت باقی تھی اُسے جمع کرکے شوہر پر ایک لمبی پر اسرار نظر ڈالی مسکرائی، اور آنکھیں بند کرلیں، رنگیلے میاں محبت کا یہ جلوہ دیکھکر سودائی ہوگئے کئی روز تک بیوی کی قبر کے پائینتی کھڑے رہے، جب کھڑے رہنے کی طاقت نہ رہی تو گر پڑے، لیکن اُس جگہ سے نہ ہٹے۔ دنیا کی نعمتیں رنگیلے میاں کے جی سے اتر گئیں، انہوں نے وہیں اپنی بیوی کی قبر کے پائینتی ایک جھونپڑی بنائی، رات بھر عبادت کرتے اور دن کو غریب عورتوں کی خدمت

سے لئے نکلتے۔ سال دو سال میں انہیں عوام نے رنگیلے شاہ کا خطاب دیا اور اُنکے مرید ہونے لگے۔ رنگیلے شاہ اگر سودائی نہ سمجھے جاتے تو اُن پر کفر کا فتوی دیا جاتا، کیونکہ وہ لوگوں کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ خدا کی خدائی بغیر عورت کی محبت کے قائم نہیں رہ سکتی۔

لیکن یہ صورتیں مدت ہوئی خاک میں مل گئیں۔ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف صورتیں ہی اور نہیں بلکہ خود صورتگر بدل گیا ہے۔ میرے والد مقدمہ بازی کی فضا میں پیدا ہوئے بچپن سے انکا حوصلہ مقدمہ طیار کرنا، لڑنا اور جیتنا رہا ہے۔ روزہ نماز کے نہایت پابند ہیں، قرآن شریف کی روزانہ تلاوت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی جب کوئی آبا و اجداد کا ذکر چھیڑتا ہے تو اعتقاد سے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں۔ اپنی حالت پر انہیں رونا آتا ہے، لیکن وہ ہمت جو زندگی تعمیر کرتی ہے، جس سے ویرانے آباد ہوتے ہیں اُن میں نہیں ہے، اور کوئی اثر اُسے پیدا نہیں کر سکتا۔ دوسرا کوئی مانے نہ مانے مجھے اس کا پورا یقین ہے، کیونکہ اگر اُن میں ہمت ہوتی تو وہ میری آرزوئیں محسوس کرتے، میری نظر سے نظر لڑتی تو میرے دل کی کیفیت سمجھ لیتے، میری خاموشی اُنکے لئے ایک معمہ ہوتی، میرے معمے ایک پر کیف کہانی۔

میرے بھائی کی چودہ برس کی عمر میں شادی کر دی گئی، ورنہ اچھی خاصی جائداد ہاتھ سے جاتی رہتی، میری چوبیس سال تک شادی نہیں ہوئی، لڑکیوں کے بیاہنے میں خرچ ہی خرچ ہے، اور سمجھدار والدین، آمدنی کا خانہ خالی نہیں رکھنا چاہتے۔ میرے لئے ایک شوہر چاہیے تھا جو خود امیر ہو اور بیوی کی غریبی کا مطلق خیال نہ کرے، جس کی اطمینان بخش آمدنی ہو اور سسرال کی جائداد حاصل کرنے کی ہوس سے اُسکا نفس بالکل پاک ہو، اس سے برتر حوصلہ جب دنیا میں کسی کو نہ تھا تو میری گرفتاری میں تڑپنے کا کسے قلق ہوتا، اور یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ جس مرغ کے گلے پر چھری پھیر دی گئی ہو وہ زیادہ عرصہ تک تڑپ بھی نہیں سکتا۔ میں تڑپتی رہی، زمانہ گذرتا گیا۔

میرے بھائی کی شادی چودہ برس کی عمر میں ہوئی۔ شادی کے بعد وہ اسکول کیسے واپس جاتے "وہ ہم نہیں جاتے، وہاں ہمارا سب مذاق اڑائیں گے"، یوں تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے والد

نے تعلیم کے فوائد پر اکثر تقریریں کیں، ایک بار اس شرط پر کہ داخلہ کسی دوسرے اسکول میں ہو انہوں نے میرے بھائی کو راضی کرلیا۔ ایک اسکول میں نام لکھوا دیا، گاڑی کے وقت سے تین چار گھنٹے پہلے ناشتہ، اسباب، سب تیار کرا دیا، لیکن جب جدائی کا وقت آیا تو انکی آنکھوں میں آنسو تھے، میری بھاوج بھائی سے چمٹ کر زار و قطار رونے لگیں، باہر لوگ چلاتے رہ گئے اور گاڑی چھوٹ گئی۔ وہ عمر جس میں بھائی تعلیم حاصل کر سکتے تھے یوں گذر گئی، کچھ مہینہ بعد اولاد کی پہلی قسط عطا ہوئی، ماں باپ، دادی، دادا کے بلند حوصلے پورے ہوئے جسے صاحب اولاد ہونے کا فخر حاصل ہوا اور کسی فن میں طبع آزمائی کی حاجت نہیں۔ یہ کارنامہ تمام عمر کے لئے کافی ہے۔ لوگوں کے اصرار سے بھائی کے لئے نوکری تلاش کیجا رہی تھی لیکن وہ خود بچے کو کھلانے میں اس قدر مصروف تھے کہ لوگوں پر صاف ظاہر ہوگیا کہ وہ نوکری کی شرطیں پوری نہیں کر سکتے، اور اگر ماں باپ کی محبت آمیز نظروں سے دیکھا جائے تو وہ نوکری سے ہزار درجہ بہتر کام میں مشغول ہیں، وہ غالبًا تمام عمر اسی مبارک کام میں مشغول رہتے لیکن فطرت کے بھی کچھ احکام ہیں جن کے خلاف عمل کرنے کی سزا ملتی ہے۔ اٹھارہ برس کے سن تک میری بھاوج کے تین بچے ہو چکے تھے یوں وہ مجھ سے صرف ایک سال بڑی تھیں مگر دیکھنے میں دس سال کا فرق معلوم ہوتا تھا، آنکھوں کے گرد حلقے، گالوں پر جھریاں، کمر میں خم، بڑھاپے کے تمام آثار نوجوانی میں دیکھنا انکی قسمت میں لکھا تھا، انہوں نے دیکھا اور گھبرائیں، میرے بھائی نے دیکھا اور اپنی پرانی محبت بھول گئے۔ کمسنی میں شادی کرنے سے انکی صحت کچھ دنوں خراب رہی جسمانی نشو و نما رک گئی، ہوس میں کوئی فرق نہیں آیا، میری بیچاری بھاوج کو انکے ہوس کی شدت، اور طبیعت پر ہوس کا بوجھ ہلکا کرنے کی ترکیبیں چند دنوں میں معلوم ہوگئیں، اور بڑھاپے کے آثار موت کا پیش خیمہ بن گئے۔

کبھی کبھی مجھے انسان کی قوت برداشت دیکھ کر اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم ذی روح نہیں۔ اگر ہوتے تو یہ چند روزہ تماشا ہمیں ہرگز اتنا عزیز نہ ہوتا، اور ہم خوشی سے اپنی آنکھیں بند کر لیتے۔ بھائی کا رنگ دیکھ کر بھاوج کو یا تو زندگی کا نیا سامان کرنا چاہئے تھا، یا موت میں پناہ لینا۔ مگر وہ علاج کرا کر موت کو

ٹالتی رہیں، انہیں مرتے مرتے کئی سال گذر گئے، حالانکہ اُنکے مرنے سے بہت پہلے انہیں لوگ
دفن کر چکے تھے۔

بیوی سے لطف اٹھانے کی امید جاتی رہی تو میرے بھائی کو نوکری کی پھر فکر ہوئی۔ علاوہ
کسب معاش کے اس میں اور مصلحتیں بھی تھیں۔ آزادی، اطمینان، بیمار بیوی کے پنجے سے رہائی
بھاوج کی تیمارداری میرے حصہ میں آئی، بچوں کا دلار میرے والد کے۔ بھائی جب جانے لگے
تو ایسی عجلت تھی کہ بیوی سے رخصت ہونا بھی بھول گئے۔ کوئی ڈیڑھ سال بعد جب وہ بیوی
کی قبر میں مٹھی بھر خاک ڈالنے آئے تو اُن کی آنکھوں میں ایک نئی، اور میرے نزدیک، ایک
بیہودہ مستی کا خمار تھا، طبیعت میں بے پروائی اور ایک خاص قسم کی صحبت کا شوق، جس
میں بہن یا باپ کی موجودگی نامناسب تھی۔ دوسرے کچھ بھی کہیں، میں ایسے لوگوں کو زندہ
نہیں سمجھتی۔ ان میں وہی بدبو ہوتی ہے جو سڑے گوشت میں۔ میرا رویہ تو نہایت درست
رہا۔ مگر معلوم ہوتا ہے میری آنکھیں میرا راز چھپا نہ سکیں، میرے بھائی مجھ سے شرمانے لگے،
مجھ سے چھپنے لگے اور میں نے کوئی شکایت نہیں کی۔ ہم دونوں میں محبت ہوتی تو کس بنا پر؟
یہی بہتر تھا کہ ہم یہ حوصلہ ہی نہ کریں۔

لیکن میرے باپ کی محبت کے ساتھ حوصلے کی شرط نہیں تھی۔ اُن کو بہو کے انتقال
کا بہت صدمہ ہوا، اس صدمے نے یہ خواہش پیدا کی کہ لڑکے کو اپنی نظروں کے سامنے رکھیں
بھائی کو بھی گھر پر رہنے کی کوئی مصلحت سوجھی، اور انہوں نے ایک روز باقاعدہ استعفا بھیجا
میرے والد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بوڑھے باپ کی اور کیا آرزو ہو سکتی ہے؟ میرے بھائی
سویرے اٹھ کر کسی سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ دن کو کھانا کھا کر تین چار گھنٹے سوتے ہیں شام
اور رات کو کون جانے کب گئے کب آئے۔ کوئی پوچھے بھی تو بتائے کون؟ بوڑھا باپ
بڑھاپے کے حوصلے پورے کر رہا ہے، جوان بیٹا جوانی کے۔ یہی ہمارے آئین حیات ہیں۔ جو
زمانے آئے دو چار اور باپ بیٹوں کی داستان سنا دیجئے۔ اگر نہ سمجھے تو بیوقوف ہے اس

کی ہنسی اڑائے . . .

ایک عمر تھی جب میں نے صبر کرنا نہیں سیکھا تھا، لیکن اب میں اسی فن میں دوسروں کو سبق دینے پر تیار ہوں، بغیر اپنی بیقراری کھوئے ہوئے دنیا کو اُس کے رنگ پر چلتے دیکھ سکتی ہوں، اور فریاد نہیں کرتی، شکایت نہیں کرتی۔ میں نے جن حوصلوں سے زندگی شروع کی تھی، جس آزادی کی ہوس میں میں نے اپنی گرفتاری منظور کی تھی وہ اب ایک دھندھلا سا خواب ہو گئی ہے، کبھی کبھی جی بہلانے کے لئے میں دل آزار حقیقتوں سے منہ پھیر لیتی ہوں، میری تمنائیں زندگی کا نقشہ ایسا بگاڑ دیتی ہیں کہ میں اس سے ایک نئی زندگی بنا سکوں لیکن میں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتی کہ یہ بگاڑنا اور بنانا محض تصور کی اٹھکیلیاں ہیں جنہیں ہستی کا جامہ پہننا کبھی نصیب نہ ہوگا . . . لیکن اگر میں نے یہ تسلیم کر لیا تو میں اپنی زنجیریں کیوں نہیں توڑ ڈالتی، اپنی تمناؤں کی طرح ہستی سے مایوس ہو کر، مگر ہستی کی حسرت دل میں لئے ہوئے نیستی میں کیوں پناہ نہیں لیتی؟ ہونا تو یہی چاہئے، ہوگا بھی یہی، مگر اُس وقت جب میں زندگی کی ساری رسوائی جو میری قسمت میں لکھی معلوم ہوتی ہے، برداشت کر چکوں گی، کیا کروں کیا کہوں، انسان مٹی سے بنا ہے۔

کبھی کبھی جب پوتوں کو دیکھتے دیکھتے نواسے بھی دیکھنے کو جی چاہتا ہے تو میرے والد ان چند احباب سے جو شام کو اُنکے پاس آ بیٹھتے ہیں، میری شادی کے امکان پر گفتگو کر لیتے ہیں۔ ابھی تک تو یہ محض ایک گفتگو کا موضوع ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسکا کوئی نتیجہ نکلے میں اسی اندیشہ میں اپنی سرگذشت لکھ رہی ہوں، شاید کبھی، جب میری زنجیریں مجھ میں جنبش کی کوئی طاقت نہ چھوڑیں تو میرا یہ جوش میری یہ حسرتیں مجھے اس شدت سے یاد آئیں کہ میں اپنے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالوں یا اپنی زنجیریں، انسان کا دل بھی خود انسان کی طرح مٹی کا ہوتا ہے، میں یہ بھی ڈرتی ہوں کہ کبھی اسے نجس یا تنگ پاکر میری تمنائیں اُسے چھوڑ نہ دیں۔

سچ پوچھئے تو مجھے سب سے زیادہ اسی کا خوف ہے۔ اپنے قصبہ اور اپنی زندگی کو دیکھتے

ہوئے اس کی امید کرنا فضول ہے کہ مجھے ایک رفیق اور ہمدم ملے گا جو میری فطرت سے واقف ہو، یا واقف ہونا چاہئے، مجھے اس امید پر بھی کوئی اعتبار نہیں کہ میری بیقراری ایک حیوانی سکون میں تبدیل نہ ہو جائے گی۔ میری دعا یہی ہے کہ میرے توسط سے جو ہستیاں اس دنیا میں آنکھیں کھولیں وہ میری تڑپ، میری بیقراری اپنے میں لے کر آئیں، میری آرزوؤں کو ورثے میں طلب کریں۔ اُس آگ کو لے کر جو میرے سینے میں دہک رہی ہی، اُس مٹی سے جس کے آس پاس ڈھیر لگے ہیں پکی، دلدار اینٹیں بنائیں اور ان اینٹوں سے زندگی کی ایک نئی عمارت کریں، ہمت کی طرح مضبوط، حوصلے کی طرح بلند اور دل کی طرح کشادہ۔

فتح مبین

یہ نظم جناب اقبال سہیل صاحب نے ۱۹۲۲ء میں لکھی تھی جب ترکی نے یونان پر فتح عظیم حاصل کی بات پرانی ہوگئی لیکن نظم ابھی نئی ہے اس لئے کہ ابتک کہیں شائع نہیں ہوئی۔

صبح آمد و از فیض سحر نغمہ سرا شد — ہر غنچہ کہ وا شد
گلبرگ تو گوئی ہمہ تن دست دعا شد — بہ بہ چہ بجا شد

صد شکر شب تیرۂ آفات سر آمد — صبح ظفر آمد
ہر طرب از پردۂ شب جلوہ نما شد — بہ بہ چہ بجا شد

صد شکر کہ باز آں قدح بادہ بگردید — پر از مے توحید
گوئید بمستاں کہ در میکدہ وا شد — بہ بہ چہ بجا شد

ہر اشک کہ از دیدہ فرو ریخت گہر شد — ہمدوش اثر شد
ہر نالہ کہ از سینہ بروں جست رسا شد — بہ بہ چہ بجا شد

ہر عقدہ کہ در حیطہ تدبیر نبودہ — تقدیر کشودہ
ہر کام کہ ملت ز خدا خواست روا شد — بہ بہ چہ بجا شد

خون امرا ریختہ از غصہ چو دونان — عدلیہ یونان
خود تیغ ستمگر بسر شس برق بلا شد — بہ بہ چہ بجا شد

صد چاک بشد سینہ سر عسکر یونان — از خنجر یونان
انجام جفا عاقبت الامر جفا شد — بہ بہ چہ بجا شد

عیار اروپا کہ بس از پردہ فسوں کرد — تجہیز فسوں کرد
حیرت زدۂ بوالعجبہائے قضا شد — بہ بہ چہ بجا شد

آن گرگ فسوں ساز کہ بینہ بدر شد — وانعش بجگر شد
برہم ہمہ شیرازہ دارالوزرا شد — بہ بہ چہ بجا شد

شذرات

ہمیں نہایت ندامت ہے کہ ہم نے رسالے کی اشاعت کو وقت پر لانے کے لئے جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا نہیں کر سکے۔ اگست اور ستمبر کے نمبر پچھلے مہینے میں تیار ہو چکے تھے لیکن طباعت کی مشکلات سے اگست کا پرچہ ۱۵ر اکتوبر کو شائع ہوا اور ستمبر کا اب چھپ رہا ہے۔ اکتوبر کے پرچے کو نومبر کے پہلے ہفتے میں شائع کرنے کی کوشش ہے خدا کرے اب کے ہمیں قارئین کرام سے ندامت نہ اٹھانا پڑے۔

جامعہ ملیہ کے سرپرستوں اور بہی خواہوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ بھوپال اور حیدرآباد میں ہمارے وفد کو شاندار کامیابی ہوئی۔ افسوس ہے کہ ہم تفصیلات شائع نہیں کر سکتے کیونکہ جناب شیخ الجامعہ نے ابھی باضابطہ روداد نہیں بھیجی ہے۔ انشاءاللہ آئندہ مہینے میں ہم وفد کی رپورٹ شائع کرینگے

اس مہینے کے وسط میں افغانستان سے جو خبریں آئی ہیں انھوں نے سب ہندستانیوں کے دلوں کو خوشی سے معمور کر دیا ہے۔ افغانستان کے مایہ ناز فرزند امان اللہ خاں کی بدولت نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ہندوؤں کو بھی اپنی ہمسایہ قوم سے سچی محبت ہے اور وہ اس کی فلاح و بہبود کے دل سے خواستگار ہیں۔ اس لئے جب انھوں نے سنا کہ افغانیوں نے آخر کار جاہل اور ظالم بچہ سقہ کے پنجۂ غضب سے چھوٹ کر جنرل نادر خاں کے سایہ عاطفت میں پناہ لی تو انہیں ایسی مسرت ہوئی کہ اس سے بڑھ کر اگر کبھی ہوگی تو خود اپنے ملک کی آزادی سے ہوگی۔ کسی قوم کو عقل سلیم اور عزم مستقیم کی بدولت آزادی اور ترقی کے نصب العین کی طرف بڑھتے دیکھ کر

دل میں اس جوش اور ولولے کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے

اس سے بھی زیادہ مسرت ہندوستانیوں کو ہوتی اگر اہل افغانستان امان اللہ خاں کو اطالیہ سے بلا کر اپنا بادشاہ بناتے۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ افغانستان میں اندرونی پیچیدگیاں بہت بڑھ گئی ہیں اور کوئی شخص باہر سے بیٹھ کر صحیح اندازہ نہیں کر سکتا کہ ان دونوں سرداروں میں سے کون اپنے ملک کی عنان حکومت ہاتھ میں لے کر ملک و قوم کی زیادہ مفید خدمات انجام دے سکتا ہے۔ اس لئے وہ حسن ظن سے کام لے کر کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا غالباً موجودہ صورت میں وہی سب سے مناسب ہے۔

لیکن ابھی افغانستان کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا۔ جن عناصر نے امان اللہ خان کی حکومت کی بنیاد متزلزل کر دی تھی یعنی امرا کی خودغرضی اور علمار کی ناعاقبت اندیشی اور مالی دقتیں وہ سب بدستور باقی ہیں۔ نادر خاں سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے ملک کو دوبارہ ذلت اور غلامی کی پستی سے عزت و آزادی کی بلندی پر پہنچا چکے ہیں مگر یہ معلوم نہیں کہ ان میں ملک گیری کے ساتھ ملک داری کی قابلیت بھی ہے یا نہیں۔ اسی لئے افغانستان کے بہی خواہ وہاں کی حالت سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ اور واقعات کی نشو و نما کا بہت تردد کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں خدا کرے وہ دن جلد آئے کہ افغانستان میں امن و آسایش کا دور دورہ ہو اور یہ ملک جس نے حصول آزادی کی کوشش میں ابتک صرف مصیبتیں جھیلی ہیں آزادی کی برکات سے پورا فائدہ اٹھا سکے۔

ہندوستانی اکادمی نے اپنے ممبروں اور دوسرے اہل قلم کے پاس ایک گشتی مراسلہ بھیجا ہے جس میں اپنا لائحہ عمل بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اکادمی چاہتی ہے کہ اردو اور

ہندی میں تین طرح کی کتابیں شائع کرائے

(۱) ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اوسط درجے کی تعلیم پائی ہے اس طرح کی کتابیں جن کے پڑھنے سے ان کی معلومات میں وسعت ہو اور وہ ذاتی مطالعے کے ذریعے اعلیٰ معیار تعلیم تک پہنچ جائیں۔

(۲) ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ابتدا سے انگریزی مدارس میں تعلیم پائی ہو اور اسے تکمیل کے درجے تک پہنچایا ہے ایسی کتابیں جنہیں پڑھ کر وہ اپنی مادری زبان کے ادب اور اپنے قومی تمدن سے گہری واقفیت حاصل کر سکیں۔

(۳) کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے عام فہم کتابیں۔

اکادمی نے ان موضوعوں کی فہرست شائع کی ہے جن پر کتابیں لکھی جائیں گی۔ یہ فہرست بہت طویل ہو اور اس میں تقریباً کل علوم و فنون شامل ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ اس وقت ہندوستان میں متعدد ادارے اردو اور ہندی کی ترقی کے لئے موجود ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں ان کی خدمت کر رہے ہیں مگر افسوس ہو کہ ان میں اب تک پوری طرح تقسیم عمل نہیں ہوئی ہے۔ اردو میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دارالترجمہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکادمی الہ آباد اور اردو اکادمی دہلی اور بعض دوسرے ادارات تقریباً ایک ہی قسم کا کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کے مقاصد مخصوص ہیں لیکن ان مقاصد کی پوری طرح پابندی نہیں ہوتی۔ غالباً یہی حال ہندی کی اشاعت کے ادارات کا بھی ہو اس بات کی بہت سخت ضرورت ہے کہ ان متفرق کوششوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے تاکہ اتحاد عمل بھی ہو سکے اور تقسیم عمل بھی۔ یہ کام کسی عام کانفرنس میں انجام پانا ناممکن ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ صرف

مختلف اداروں کے نمائندے ہر سال کسی جگہہ جمع ہوکر تبادلہ خیالات کیا کریں۔ خواہ اس کا مرکز کوئی ایک ادارہ قرار دیا جائے یا باری باری سے ہر ادارہ دوسروں کو جمع کیا کرے۔

ہمیں امید ہے کہ ان سب اداروں کے مدیر اس تجویز پر غور فرمائیں گے اور اسے عمل میں لانے کے لئے بہت جلد مناسب تدابیر اختیار کریں گے۔

جامعہ کے ایک طالب علم نے ۱۳ ستمبر ۲۹ء کا اخبار "سچ" مجکو لاکر دکھایا جس میں مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے لکھا ہے "روضۂ اقدس (رسول) زمین، آسمان، کعبہ، عرش اور کرسی سے افضل ہے" جس کے صریح معنے یہ ہوئے کہ رسول کا روضہ جب عرش الہی سے بڑھکر ہوا تو رسول اللہ سے بڑھکر ہے (نعوذ باللہ)

کیا یہ اللہ تعالی کی کھلی ہوئی اہانت نہیں ہے!!

بریلی اور بدایوں کے رسول پرستوں نے تو اسی پر اکتفا کی تھی کہ

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہوکر اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفے ہوکر

مگر مولوی عبدالماجد صاحب نے اس سے بھی آگے قدم اٹھایا اور رسول کا رتبہ اللہ سے بھی بڑھا دیا۔

مولوی صاحب کا بیان ہے کہ فقہا نے ایسا کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فقہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عقیدہ کا ہے جسکے لئے نص صریح کی ضرورت ہے۔ اگر کسی نے جذبہ کی حالت میں ایسا لکھا بھی ہو تو وہ شطحیات میں شمار ہوگا سند نہیں ہو سکتا

قرآن میں ہے

وَاِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (دنیا کے زمین کے اکثر لوگ اگر تو انکی اطاعت کرے تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دینگے)

رسول بندہ ہے اور بشر۔ یہی قرآن میں اسکو حکم دیا گیا ہے کہ "قل انما انا بشر مثلکم" اسکی عظمت کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ اللہ کا پیغامبر ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ خوامخواہ اسکا رتبہ اللہ سے بڑھایا جائے اور ایسی بے ادبی کا ارتکاب کیا جائے جس کی نظیر زمانہ جاہلیت میں بھی نہیں مل سکے گی۔

آپکے بچوں کیلئے ایک نہایت ہی مفید اور باتصویر رسالہ

ہونہار

زیرسرپرستی جناب حکیم محمد یوسف حسن صاحب اڈیٹر نیرنگ خیال

ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی سے شائع ہوا ہے

اس رسالہ کے اجرا کا مقصد یہ ہے کہ بچوں میں صحیح مذہبی، قومی اور اخلاقی تعلیم پھیلائی جائے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قابل اور تجربہ کار پروفیسر اور اساتذہ کے مضامین اس رسالہ میں شائع ہوں گے ملک کے بڑے بڑے اہل قلم اس کے معاون ہیں۔ کتابت وطباعت کا بہترین انتظام کیا گیا ہے۔ بچوں کے مذاق کے مطابق فوٹو بلاک کی اور دستی تصویریں شائع ہوں گی۔ یہ رسالہ آپ کے بچوں کا اتالیق ہوگا۔ کم پڑھے لکھے مرد اور عورتیں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

رسالہ کا سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۴۰ صفحے علاوہ ٹائٹیل وتصاویر قیمت تین روپیہ سالانہ
نمونہ تین آنے کے ٹکٹ بھیجکر منگوایا جاسکتا ہے

ملنے کا پتہ

دفتر رسالہ ہونہار۔ صدر بازار متصل نشنل وائسنگ فیکٹری

دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۳	بابتہ ماہ نومبر ۱۹۲۹ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

۱۔ تاریخ عثمانیہ پر ایک نظر — مولنا اسلم جیراجپوری — ۳۳۰

۲۔ ڈراما کیا چیز ہے؟ — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ ڈی — ۳۴۳

۳۔ لندن اور پیرس وغیرہ میں باقرآگاہ کی تصنیفات — نصیر الدین ہاشمی از پیرس — ۳۵۸

۴۔ ادبیات ایران کی ترقی میں سلطان محمود کا حصہ — حسین حسان صاحب ندوی متعلم جامعہ — ۳۸۳

۵۔ غزلیات — جناب احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل اعظم گڈھ — ۳۹۶

۶۔ دو عینکیں (افسانہ) — ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب — ۳۹۸

۷۔ غزل — جلیل قدوائی صاحب بی اے (علیگ) — ۴۰۰

۸۔ شذرات ۴۰۶

تاریخ عثمانیہ پر[1] ایک نظر

آل عثمان کی حکومت غازی عثمان خاں کے عہد سے جس نے سلطان علاء الدین سلجوقی کے تاتاریوں کے ہاتھ سے مارے جانے کے بعد سنہ ۷۰۰ھ میں بالاستقلال سلطنت حاصل کر لی تھی اس خاندان کے آخری فرمانروا عبدالمجید ثانی کے عہد تک جو ۱۳۴۲ھ میں معزول کیا گیا چھ سو بیالیس سال رہی۔ یہ ایسی طویل مدت ہے جو کسی اسلامی حکمراں خاندان کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس مدت میں ۳۷ فرمانروا ہوئے جن میں سے پہلے ۹ بایزید ثانی تک سلطان تھے اور بقیہ سلیم اول سے لیکر عبدالمجید ثانی تک سلطنت کے ساتھ خلافت کے منصب سے بھی ممتاز تھے۔

آل عثمان کا یہ کل عہد دو دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک دور ترقی دوسرا دورِ زوال غازی عثمان خاں کے استقلال یعنی سنہ ۷۰۰ھ سے لیکر سلیمان اعظم کی وفات یعنی ۹۷۴ھ تک دور ترقی رہا جس میں یہ سلطنت قوت۔ شوکت اور مقبوضات کی وسعت کے لحاظ سے برابر بڑھتی رہی اور اس کے بعد سے آج تک دورِ زوال ہے جس میں سلسلہ وار اس کے حصے نکلتے جا رہے ہیں۔

عین عروج کے زمانے میں بایزید ایلدرم کے عہد میں جبکہ وہ یورپ میں فتوحات کر رہا تھا ۸۰۴ھ میں تیمور لنگ کے ناگہانی حملے سے اس سلطنت کو کاری زخم لگ گیا تھا مگر چونکہ اس وقت اقبال کا دور تھا اور ترکوں کے فاتحانہ جذبات جوش پر تھے اس لئے بہت جلد یہ زخم مندمل ہو گیا۔

سلطنت

جس وقت آل عثمان نے اپنی سلطنت قائم کی اس وقت تاتاریوں کے حملے سے بغداد کی عباسی خلافت کا چراغ گل ہو چکا تھا اور جملہ اسلامی مشرقی ریاستیں انکے پنجۂ ستم میں نیم جان ہو رہی

---

[1] یہ مضمون تاریخ الامت حصہ ہفتم کا آخری باب ہے جس پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے

تھیں۔ خود ایشائے کوچک میں سلجوقی سلطنت کو بھی انہوں نے فنا کر ڈالا تھا اور طوائف الملوکی کی حالت میں چند چھوٹی چھوٹی امارتیں رہ گئی تھیں جو باہمی جنگ و پرخاش سے فنا کے ساحل سے آلگی تھیں۔

آل عثمان نے اپنی شجاعت اور فرزانگی سے ان متفرق ریاستوں سے جو سلجوقی سلطنت کے کھنڈر پر قائم تھیں ایک زبردست سلطنت تعمیر کی۔ اور پھر اولوالعزمی سے مقبوضات کا دائرہ یہاں تک وسیع کیا کہ یورپ میں داخل ہو گئے اور رفتہ رفتہ بلقان کے اکثر حصہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو بھی فتح کر لیا جو اسلام کی ایک پرانی آرزو تھی اور سلطان سلیم نے شام و مصر کو جس سے حرمین شریفین بلکہ سارا عرب عثمانی قلمرو میں آ گیا۔ اس کے بعد سلیمان اعظم وسط یورپ میں ویانا کی فصیل تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف افریقہ میں الجزائر اور مراقش تک ہلالی پرچم کے نیچے آ گئے اور عثمانی سلطنت نہ صرف اپنی وسعت بلکہ بری اور بحری قوت و شوکت کے لحاظ سے بھی اپنے زمانے کی سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت ہو گئی جس کے حدود بوڈاپسٹ سے دریائے نیل تک اور فرات سے جبل طارق تک پھیلے ہوئے تھے۔

شاہان یورپ اس زمانے میں بجائے سلطان کے اس کے صدر اعظم کو مخاطب کرتے تھے اور اپنی مشکلات میں امداد مانگتے تھے ۱۵۸۳ء مطابق ۹۹۰ھ میں جب ہسپانیہ کا گریٹ آرمیڈا انگلستان پر حملہ کی تیاری کر رہا تھا ملکہ الزبتھ نے مسٹر ہیربرن کو سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیجا اور سلطان مراد ثالث کے وزیر محمد پاشا صقلی سے ان "کیتھولک کفار" کے مقابلہ میں مدد چاہی مگر اس وقت جنگ ایران کی وجہ سے امداد نہ دی جا سکی۔ سلیمان اعظم کے عہد میں شاہ فرانس فرینسس اول نے شارلکان کے مقابلہ میں امداد کی دو بار درخواست کی اور دونوں مرتبہ سلطان نے بری اور بحری مدد دی۔

خلافت

۹۲۴ھ میں اسلامی خلافت آل عثمان کے ہاتھ میں آئی۔ ترک چونکہ حنفی المذہب تھے

اس وجہ سے حنفیہ نے بالعموم انکی خلافت کو تسلیم کرلیا۔ اور جا بجا ملکوں میں انکے نام کے خطبے پڑھے جانے لگے۔ لیکن مالکیہ ایک مدت تک بوجہ قریشی نہ ہونے کے عثمانیوں کی خلافت کے قائل نہ ہوئے۔

چونکہ آل عثمان کو خلافت فتح مصر سے ملی تھی اس لئے بالطبع وہ اپنے اس رتبہ سلطنت کو جس کی بدولت انہوں نے مصر کی سلطنت اور خلافت دونوں کو حاصل کیا تھا ہمیشہ اہم سمجھتے رہے لیکن خلافت کی مذہبی وقعت انکی نگاہ میں تھی چنانچہ سلطان محمود نے ۱۲۴۱ھ میں انکشاریہ کی بغاوت میں علم نبوی کو نکالکر اسکی روحانی قوت سے کام بھی لیا مگر انہوں نے شروع سے آخر تک بجز حرمین شریفین کے خادم اور عرب کے محافظ ہونے کے کہ وہ انکی سلطنت کا ایک جزو تھا فرائض خلافت کا خیال نہ رکھا۔ نہ عالم اسلامی کی دینی یا دماغی رہنمائی کی اور غالبًا یہ ان سے ہو بھی نہیں سکتی تھی اور نہ کبھی انکی وحدت کا کوئی ذریعہ تلاش کیا۔ یہانتک کہ حج جس میں جملہ اقطار عالم سے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں اس میں بھی وہ کبھی نہیں آئے۔ آخری زمانے میں سید جمال الدین افغانی کے اثر سے عبدالحمید ثانی نے وحدت ملت کی طرف توجہ کی اور حجاز ریلوے کو امت کی مشترکہ ملکیت قرار دیکر عالم اسلامی کے اندر ترکی خلافت کا احساس پھیلایا جس سے ممکن تھا کہ اچھے نتائج مترتب ہوتے کہ ۱۳۴۲ھ میں جمہوریہ ترکیہ نے خلافت ہی کا انکار کردیا جس سے یہ منصب معہ اپنے عظیم الشان فوائد کے نہ صرف ترکوں بلکہ امت کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔

ولی عہدی

آل عثمان میں اگرچہ شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ خاندان کا بڑا شخص سلطنت کا متولی ہو لیکن پھر بھی اکثر تخت نشینی پر نزاعیں برپا ہوتی رہیں۔ اس وجہ سے ایک بھائی جب تخت پر آجاتا تھا تو اپنے دوسرے بھائیوں کو قتل کرادیتا تھا۔ چنانچہ بایزید اول نے اپنے بھائی یعقوب کو علماء سے فتویٰ لیکر اور سلیم اول نے اپنے دونوں بھائیوں احمد اور کرکود کو گرفتار کرکے مار ڈالا۔ مراد ثالث نے اپنے پانچ بھائیوں کو قتل کیا اور اس کے بیٹے محمد ثالث نے چھوٹے

بڑے ۱۹ بھائیوں کو جو سب کے سب مراد کے ساتھ ہی دفن کیے گئے۔

آخر میں یہ صورت اختیار کی گئی کہ محروم شاہزادے محلات میں نظر بند رکھے جانے لگے تاکہ کوئی خطرہ بھی نہ رہے اور خون ناحق بھی نہ بہے۔

نظام سلطنت

مہمات سلطنت میں سلطان فرمانروائے مطلق تھا جس کی اطاعت لازمی تھی اور بشرط رعایت نصوص قرآن اس کو رعایا کے جان و مال اور سلطنت کے سیاہ سفید پر کلی اختیارات حاصل تھے۔

حکومت کے سب سے بڑے دو عہدہ دار تھے ایک صدر اعظم جو امور ملکی و فوجی کا کفیل ہوتا تھا دوسرا شیخ الاسلام جو شرع شریف کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ صدر اعظم کے ماتحت جملہ وزرا اور ملکی دفاتر تھے اور شیخ الاسلام کی نگرانی میں جملہ قضاۃ اور محکمہ جات شرعی۔ علاوہ مذہبی امور کے مہمات سلطنت مثلاً اعلان جنگ۔ معاہدہ۔ عزل و نصب سلاطین وغیرہ میں بھی شیخ الاسلام کا مشورہ یا فتوی ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

فریق علما یعنی رجال شرع میں سے دو شخص خاص امتیاز رکھتے تھے۔ ایک قاضی عسکر روم ایلی دوسرا قاضی عسکر اناطولیہ۔ یہ دونوں جنگ اور سفر میں سلطان کے ہمراہ رہتے تھے تاکہ فوج میں کوئی اختلاف پیدا ہو تو رفع کریں۔ انہیں میں سے کوئی شیخ الاسلامی کے منصب پر آیا کرتا تھا۔ سلطان اگرچہ شیخ الاسلام کو برطرف کر سکتا تھا مگر جب تک وہ اپنے عہدہ پر ہو اس کو سزا نہیں دے سکتا تھا۔ نہ اس کے فتوے کی مخالفت کا اختیار رکھتا تھا چنانچہ سلطان سلیم اول نے جو اپنے عقیدہ اور عزم دونوں میں بہت سخت تھا عثمانی قلمرو میں شیعوں کے استیصال کے بعد یہ ارادہ کیا کہ سلطنت کے جملہ مشرکوں۔ کافروں۔ یہودیوں۔ عیسائیوں کو قتل کر کے انکے معبدوں اور کنیسوں کو مسجد بنالے تاکہ ملک میں صرف ایک ہی دین رہ جائے۔ مشورتاً ایک دن شیخ جمالی سے جو اس کے عہد میں مفتی اعظم تھے پوچھا کہ دنیا کو فتح کرنا بہتر

ہے یا قوموں کو مسلمان بناتا ؟ - شیخ مذکور نے جواب دیا کہ مسلمان بنانے میں زیادہ ثواب ہے - اس کے بعد سلطان نے صدر اعظم کو لکھا کہ سلطنت کے ہر گوشہ میں اعلان کر دیا جائے کہ جو اسلام نہ لائے گا قتل کر دیا جائے گا -

اس سخت فرمان سے صدر اعظم کو تردد ہوا - اس نے شیخ جمالی سے کہا کہ سلطان نے اس حکم میں تمہارے قول سے سند لی ہے - شیخ مذکور آستانہ کے بطریک کو لیکر سلطان کے پاس جو اس وقت ادرنہ میں تھا پہنچے - اور وہ عہد نامے پیش کرائے جو قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان محمد نے نصارا کے ساتھ کئے تھے - نیز قرآن کا حکم سنایا کہ اہل کتاب جزیہ لیکر مذہب میں آزاد چھوڑے جائیں - سلطان کو مجبوراً اپنا فرمان واپس لینا پڑا -

داخلی نظم و نسق کے لئے جو دفتر تھا اس کو دیوان دولت کہتے تھے - اس میں پہلے تین وزیر ہوتے تھے لیکن سلطان احمد ثالث نے ان میں منافست دیکھکر جس کی وجہ سے اکثر کاموں میں ابتری واقع ہو جاتی تھی ان کی تعداد آٹھ کر دی جن کا رئیس صدر اعظم ہوتا تھا - انہیں کی مشاورت سے مہمات سلطنت طے پاتے تھے اور ماتحت دفاتر نیز سلطنت کے صوبوں اور ایالتوں کے حکام و عمال کی نگرانی بھی انہیں کے ذمہ تھی -

بحری فوج قبودان پاشا کے ماتحت ہوتی تھی اور بری صدر اعظم کے - ان افواج کی تربیت و تنظیم میں ترک اپنے دور ترقی میں دیگر اقوام عالم سے فائق رہے

یہ ارکان دفاتر - حکام ولایات - جاگیرداران - امرا لشکر بلکہ بالعموم متوسلین سلطنت بوجہ دولت کی فراوانی کے رئیسانہ بلکہ شاہانہ عیش و آرام سے زندگیاں گزارتے تھے - چونکہ غلامی کا بھی رواج تھا اس وجہ سے انکے گھروں میں غلاموں اور کنیزوں کی اچھی خاصی تعداد ہوتی تھی -

ترک

اصلی اوغوز ترک جو ارطغرل اور دوندار کے ساتھ ارض روم میں آئے تھے دو ہزار نفوس سے زیادہ نہ تھے لیکن رفتہ رفتہ دیگر قبائل جو سلجوقی عہد میں وسط ایشیا سے گئے تھے انکے ساتھ شامل

ہوتے گئے۔ اور پھر انکی سلطنت کے عروج کے ساتھ ساتھ مفتوح اقوام رومی اور صقلابی وغیرہ کثیر تعداد میں اسلام لاتی گئیں جو سب کے سب ترک بولے جانے لگے اور یہ لفظ مسلمانان سلطنت ترکی کے مرادف ہو گیا جن میں مختلف قومیں شامل تھیں۔

اسلام

ترکوں نے شعائر اسلامی کا ہمیشہ احترام رکھا۔ یہ انکے بے ریا اور مخلصانہ اسلام کا اثر تھا کہ مفتوحہ قومیں جن کو پوری مذہبی آزادی تھی اپنے دلی شوق سے اسلام قبول کرنے لگیں۔ بلغاریا۔ رومانیا اور یونان خاصکر البانیا میں بلا جبر و اکراہ بے شمار عیسائی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ انکشاری فوج جس میں وہ نصرانی جوان لئے جاتے تھے جو مسلمان ہو جاتے تھے اس کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی اور بلقان کے عیسائی رؤسا اپنے اپنے بیٹوں کو خود خوشی سے لاکر اس میں بھرتی کراتے تھے۔

ترک بالعموم مجاہد اور سرفروش ہونے کے ساتھ عقائد کے پکے اور عبادات کے پابند تھے اور اپنی خانگی زندگی روزمرہ کے معاملات اور اخلاق میں خالص مسلمان۔ اُن میں بخلاف دیگر اقوام کے باہمی محبت اور اخوۃ بھی زیادہ ہے۔

ترک سلطان و رعایا ہمیشہ سے ایک مذہب حنفی کے پابند رہے اس وجہ سے ان میں اختلافی جھگڑے بہت کم پیدا ہوئے لیکن تصوف کے ساتھ بھی انکو عقیدت تھی اور پیری و مریدی کا سلسلہ بھی رائج تھا جس کے باعث کبھی کبھی فتنوں کا ظہور ہوتا رہا۔

سلاطین آل عثمان میں سے سلیم اول مذہب حنفی کا سب سے بڑا علمبردار تھا جس کی خواہش یہ تھی کہ اس کے قلمرو میں بجز اس مذہب کے اور کوئی دوسرا مذہب نہ رہنے پائے۔

رواداری

ترکوں کے اوصاف میں جہاں شجاعت سب سے نمایاں وصف ہے جس کو ان کے دوست دشمن سب تسلیم کرتے ہیں وہاں انکی رواداری کی صفت بھی اقوام عالم سے بڑھکر ہے

انہوں نے ہمیشہ غیر جنس اور کمزور قوموں کے ساتھ نہ صرف عادلانہ بلکہ مساویانہ سلوک کیا۔ اور اپنی محکوم قوموں کے مذہب میں کبھی دست اندازی نہیں کی۔ یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں یہودی مقہور اور مظلوم تھے اور ترکوں کے سایہ میں انکو امن و آرام نصیب ہوتا تھا۔ سلطان محمد نے فتح قسطنطنیہ کے بعد بطریک کے عہدہ اور عیسائیوں کے حقوق کو محفوظ رکھا جس کی وجہ سے رومی جو وہاں سے بھاگ گئے تھے پھر واپس آکر امن سے رہنے لگے۔

سلطان مراد ثانی کے مقابلہ میں جب صلیبی لشکر ھونیاد کی قیادت میں جو کیتھولک تھا میدان قوصوہ میں صف آرا تھا اس وقت اس کے ساتھی شاہ سربیا نے اس سے پوچھا کہ اگر تم کو فتح حاصل ہوگئی تو کیا کرو گے؟ اس نے کہا کہ سب کو کیتھولک بنا کر چھوڑوں گا لیکن یہی سوال جب شاہ سربیا نے سلطان مراد کے پاس بھیجا تو اس نے جواب میں لکھا کہ میں اگر کامیاب ہوا تو ہر مسجد کے پہلو میں کنیسہ بنوا دوں گا کہ جسکا جی چاہے مسجد میں آئے اور جس کا جی چاہے کنیسہ میں جائے۔ چنانچہ شاہ سربیا نے جو یونانی چرچ کا تابع تھا ھونیاد کا ساتھ چھوڑ دیا اور مورخین لکھتے ہیں صلیبیوں کی شکست کھانے کی یہی وجہ ہوئی۔

ایک بار عثمانی مفتی سے کسی نے سوال کیا کہ اگر دس مسلمان کسی ایک یہودی یا عیسائی ذمی کے قتل میں شریک ہوں تو کیا وہ سب کے سب قتل کر دئے جائیں گے؟ مفتی نے جواب دیا بے شک۔ دس نہیں ایک ہزار بھی۔

ان رواداریوں کی وجہ سے باوجود بیرونی سلطنتوں کی ریشہ دوانیوں کے بھی غیر مسلم خاصکر ان عیسائیوں کے دلوں میں جن کو ترکوں سے واسطہ پڑا تھا ترکوں کی وقعت اور عظمت تھی چنانچہ عبدالحمید ثانی کے آغاز جلوس ۱۸۷۷ء میں جب روسیوں نے دولت علیہ کے خلاف جنگ شروع کی اس وقت ہنگری کے عیسائیوں نے جو ایک مدت سے عثمانی سلطنت سے مطلقاً آزاد تھے اپنے اخلاص کا اس طرح اظہار کیا کہ ایک وفد بھیجکر مرصع تلوار عبدالکریم پاشا کی خدمت میں پیشکش کی جو روس کے مقابلہ کے لئے مامور ہوئے تھے۔

ترکی ادب

عثمانی ترکی چغتائی کی ایک شاخ ہے۔ اس میں سلطنت عثمانی کے قیام سے پیشتر کوئی تصنیف یا تالیف نہ تھی۔ چونکہ ترک سلجوقی سلطنت کے وارث ہیں جن کا علم ادب فارسی تھا اسلئے ترکی ادب کی بھی بنیاد فارسی ہی ادب پر پڑی۔ اور مذہبی علوم براہ راست عربی سے اخذ کئے گئے۔ اس وجہ سے عثمانی ترکی میں فارسی اور فارسی سے زیادہ عربی الفاظ کی کثرت ہوگئی۔

نویں صدی ہجری کے وسط میں جب سلطان حسین والی ہرات کے وزیر امیر علی شیر نوائی کا ترکی دیوان قسطنطنیہ میں پہنچا اس وقت سلطان محمد فاتح کے وزیر احمد پاشا نے جو ادب سے ذوق رکھتا تھا ترکی میں شعر گوئی شروع کی جس کی وجہ سے نہ صرف عوام بلکہ خود سلطان کو بھی اس سے دلچسپی ہوگئی اس کے بعد رفتہ رفتہ ترکوں میں شعر کا ذوق بڑھتا گیا۔ اور بڑے بڑے شعراء مثلاً ابن کمال ، فضولی ۔ نابی ۔ ندیم اور غالب وغیرہ پیدا ہوئے جنہوں نے غزل ، قصیدہ اور مثنوی میں نام پایا۔ خود بعض سلاطین آل عثمان بھی شعر کہتے تھے جن میں سے سلیم اور مراد خاص طور پر مشہور ہوئے لیکن ترکوں کی یہ شاعری نہ صرف وزن و بحر بلکہ معنی اور روح کے لحاظ سے بھی فارسی شاعری کے مشابہ تھی جس کے تمام رشتے حیات اور عمل سے منقطع ہو چکے تھے۔ آخری دور میں جب مغربی خیالات کے اثر سے ترکی میں نئی ذہنیت پیدا ہوئی تو انکی شاعری نے بھی نیا رنگ اختیار کیا جس کے علمبردار نامق کمال ۔ حامد ۔ توفیق فکرت اور محمد عاکف وغیرہ ہیں جنہوں نے حسن و عشق کے فرسودہ افسانے چھوڑ کر اثبات زندگی اور ذوق عمل کے نغمے گائے اور عقل و تدبیر کی تحقیر اور توکل و تقدیر کی غلط تعبیر جو تصوف کے اثر سے دلوں میں جاگزیں ہوگئی تھی دور کر کے حریت فکر اور سعی پیہم کی طرف راہنمائی کی۔ ترکی میں بھی فارسی کی طرح نظم نے بہ نسبت نثر کے زیادہ ترقی پائی۔ نثر کی پہلی کتاب انوار سہیلی کا ترجمہ ہے جو سلطان محمد فاتح کے وقت میں کیا گیا۔ اس کے بعد سے دینیات ، تاریخ اور ادب میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔

ترکی میں پہلا مطبع وزیر اعظم ابراہیم پاشا نے جو ندیم شاعر کا ممدوح تھا قائم کیا۔ اس میں

ترکی کی پہلی مطبوعہ کتاب ترجمہ قاموس ۱۷۲۸ء میں چھاپکر شائع کی گئی۔

عثمانی ترکی جب سے کتابت میں آئی اسی وقت سے عربی حروف میں لکھی جاتی تھی سال گذشتہ سے جمہوریہ ترکیہ نے اس کو لاطینی حروف میں کر دیا ہے

انقلاب

ترکوں میں بھی دوسری مسلما قوموں کی طرح بجزذات شاہانی کے کوئی ادارہ سیاسی نہ تھا۔ یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد چپہ چپہ میں آزادی کے خیالات پھیل گئے تھے جن سے عثمانی عیسائی رعایا بھی متاثر ہوئی اور اپنی آزادی کے لئے مختلف طریقوں سے جد وجہد کرنے لگی جس میں آخر کار وہ کامیاب بھی ہوئی مگر ترکی طبائع پر اسکا اثر بہت کم پڑا تھا۔

سب سے پہلا شخص جس نے ترکوں میں حریت کا احساس پیدا کیا **مدحت** پاشا تھا جس کی کوششوں سے سلطان عبد الحمید ثانی نے اپنے آغاز جلوس میں دستوری حکومت کا اعلان کیا مگر یہ احساس اس قدر کمزور تھا کہ سلطان نے دستور کو توڑ کر مدحت پاشا کو طائف میں نظر بند کر دیا اور احرار ترکوں کو ملک بدر کرنے لگا اور کوئی بغاوت رونما ہوئی۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ عبد الحمید کے استبداد سے حریت کے شعلے بڑھکے اور اس کی سختیوں نے جو اس نے دستور کے حامیوں پر کیں اس آگ پر تیل کا کام دیا چنانچہ جمعیۃ اتحاد و ترقی نے جس کے سرگرم ارکان **نیازی بک** ۔ **انور بک** اور **محمود شوکت پاشا** جیسے لوگ تھے۔ ۱۳۲۸ھ میں قوت کے ساتھ دستوری حکومت حاصل کر لی۔ اور اب جنگ عمومی کے بعد سے تو **مصطفٰے کمال** پاشا نے اس کو کامل جمہوری بنا دیا ہے۔

اسباب زوال

ترکوں کی جس طرح ترقی بتدریج ہوئی اسی طرح انکا تنزل بھی رفتہ رفتہ ہوا اور یہ "وتلک الایام نداولہا بین الناس" کا فطرتی قانون ہے جو اٹل ہے خاصکر شخصی اور استبدادی حکومتوں کا زوال جن میں لازماً نقائص موجود رہتے ہیں۔ ہم اس جگہ مختصراً ترکوں کے اسباب زوال کو لکھتے ہیں

(۱) ترکی قوم ایک سپاہی اور شجاع قوم ہے۔ اس نے ملک داری میں ہمیشہ دماغی تدبر اور انتظامی ادارہ کی بہ نسبت اپنی بہادری اور شمشیر پر زیادہ اعتماد رکھا۔ اس وجہ سے اپنی مفتوحہ اقوام سے نہ خود زیادہ نفع اٹھا سکے نہ انکو زیادہ نفع پہنچا سکے۔ غیر قوموں کو چھوڑکر خود مسلمان قومیں جو انکی حکومت میں آئیں انکی بھی جنسیت اور عصبیت کو یہ اپنے ساتھ موافق نہ کر سکے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باوجود صحابہ کی کوششوں کے عراق اور مصر کے علاقوں کو فوج میں نہیں تقسیم ہونے دیا بلکہ براہ راست خلافت کا محکوم رکھا جس سے تھوڑے ہی دنوں میں ان مقامات کے باشندوں کی عصبیت فنا ہوگئی اور وہ اسلامی قوت کا جزو بن گئے مگر ترکوں نے مفتوحہ اقوام کے علاقے سپاہیوں میں بانٹ دیئے۔ ان جاہل آقاؤں کے مظالم سے ان قوموں میں حکومت کی ہمدردی نہ پیدا ہو سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں جس قدر ضعف آتا گیا اسی قدر ان میں اپنی جنسیت کا احساس اور آزادی کا خیال بڑھتا گیا۔ چنانچہ سلطان عبدالحمید اول کے عہد میں ۱۱۸۸ھ میں جب روس و آسٹریا نے دولت علیہ پر حملہ کیا اس وقت بلقان کے بہت سے اصلی باشندے جاکر ترکوں کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔ جب لڑائی ختم ہو گئی تو واپس آ گئے۔ جاگیرداروں نے بوجہ باغی ہونے کے ان پر سختیاں شروع کیں جس سے شورش برپا ہو گئی۔ باب عالی نے آخر میں عفو عام کا اعلان کرکے فوج کے ہاتھوں سے انکے علاقے نکال لئے۔ اس پر انکشاریہ نے بغاوت کر دی۔ بازنداوغلی نے کوشش کرکے پھر وہ علاقے فوج کو دلوا دیئے۔ انہوں نے پھر وہی مظالم شروع کئے۔ اب اصل باشندے جو جنگ و پیکار سے واقف ہو چکے تھے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو گئے اور مشہور سربی زعیم پیٹر وفتش کی قیادت میں حزب وطنی قائم کی اور سلسلہ وار جدوجہد کرنے لگے یہانتک کہ آخر میں استقلال حاصل کرکے رہے۔

(۲) بعض ترکی وزراء اور امراء کی خیانت۔ جنہوں نے نازک سے نازک موقعوں پر دشمنوں سے رشوتیں لیکر فتوحات کو شکستوں میں تبدیل کر دیا۔ اور سلطنت کو عظیم الشان نقصانات

اسی جمود کا یہ ردعمل ہے کہ جمہوریہ ترکی نے اب ہر بات میں مغرب کی تقلید شروع کی ہے۔ یہاں تک کہ جملہ باشندوں کے لئے یوریپین لباس کو بھی لازمی قرار دیا ہے ترکی زبان کو بھی حکماً لاطینی حروف میں منتقل کر دیا ہے اور مشرقیت سے اپنے رشتے توڑ رہے ہیں تاکہ وہ قدیم ذہنیت بدل جائے لیکن اصل چیز جس نے یورپ کو یورپ بنایا ہے وہ سائنس ہے جب تک اس کو قابو میں نہ لائیں گے ان تبدیلیوں سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

بعض پرانے خیال کے مسلمان ترکوں کے مغربی تہذیب اختیار کر لینے کی وجہ سے یہ کہنے لگے ہیں کہ وہ اسلام ہی سے بیزار ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام مغربی یا مشرقی تہذیبوں سے بالاتر ہے وہ کسی خاص ملکی یا مقامی طرز اور وضع میں محدود نہیں بلکہ اس کا تعلق قلب و عمل کے ساتھ ہے۔ اگر نوجوان ترکوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ وہ قرآن کریم کو جو اصل الاصول ہے مضبوط پکڑے ہوئے ہیں تو پھر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ انکا یہ زوال جس میں جمہوریت پیدا ہوگئی ہے ایک نئے دور اقبال کا فاتحہ ہو۔

ڈراما کیا چیز ہے؟

(گذشتہ سے پیوستہ)

(ب)

فرحیہ   جس ڈرامے میں واقعات کی عام رفتار اور قصہ کا انجام خوشگوار ہو یعنی جس سے دیکھنے والوں کے دل پر فرحت و مسرت کا اثر ہو اُسے فرحیہ کہتے ہیں۔ مگر جس طرح وہ المیے کی شان نہیں رکھتا بلکہ ایک کمتر درجے کی چیز ہے اور میلوڈراما (رقت آمیز ڈراما) کہلاتا ہے۔ اسی طرح وہ کھیل جو محض تفریح اور دل لگی کا باعث ہوتا ہے فرحیے کے معیار سے پست ہوتا ہے اور فارس (نقل) کے نام سے موسوم ہے۔ فرحیے سے راحت و مسرت کے علاوہ دیکھنے والے کی طبیعت کو اطمینان اور آزادی کی ایک مستقل کیفیت محسوس ہوتی ہے اور زندگی کا بوجھ اس کے دل پر سے ہٹ جاتا ہے

عموماً اس کیفیت کا اظہار ہنسی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اس پر غور کریں کہ ہنسی عموماً کن چیزوں پر آتی ہے تو ہم یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ فرحیے کے کیا عناصر ہونا چاہئیں نفسیات کے ماہروں کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ ہنسی کی محرک تین چیزیں ہوتی ہیں کسی شخص کی خفت یا ذلت، اسکا بھونڈا پن یا بے تکا پن۔ اسکا شخصیت سے محروم اور مشین نما ہونا۔ مثلاً جب کسی کا خصوصاً کسی خواہ مخواہ مرد آدمی کا پیر پھسلے اور وہ گرے تو ہمیں ہنسی ایک تو اس لئے آتی ہے کہ یہ اُفتاد اس شخص کی خفت کا باعث ہو دوسرے اس لئے کہ گرتے وقت اور گرنے کے بعد اس کی قطع بے تکی ہو جاتی ہے۔ چہرے کی عجب برزخ ہو جاتی ہے۔ مُنہ پھیل کر رہ جاتا ہے ٹانگیں اوپر اٹھ جاتی ہیں۔ تیسرے اس لئے کہ اس کی بے بسی دیکھ کر ایک دم کے لئے گویا ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حضرت اشرف المخلوقات ہیں۔ جن سے ہمیں ہمدردی کرنا

چاہیے بلکہ سمجھتے ہیں کہ یہ گوشت اور چربی کا ایک تودہ ہے جسے تکلیف کا کوئی احساس نہیں۔

فرانسیسی فلسفی برگساں نے ہنسی کے محرکات کی تحلیل جو کی ہے وہ زیادہ مکمل ہے۔ وہ کہتا ہے ہنسی کے لئے تین شرطیں ہیں (۱) اس کا موضوع شکل صورت وضع قطع یا طرز معاشرت میں سوسائٹی کے عام رنگ سے مختلف ہو (۲) جس حالت میں وہ پایا جائے اس میں اس کی شخصیت چھپ جائے اور وہ مشین یا کٹھ پتلی کی طرح معلوم ہو (۳) دیکھنے والے کو اس وقت اس کے انسانی جذبات کا احساس نہ ہو۔ مثلاً اوپر کی مثال میں موٹا ہونا سوسائٹی کی عام روش سے ہٹی ہوئی چیز ہے۔ پیر پھسل کر گرنے میں ہر شخص کٹھ پتلی کی طرح مجبور ہوتا ہے اور پھر موٹے آدمی کی بے بسی کا تو کیا پوچھنا ہے، رہی تیسری شرط تو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں بیچارے الفربہ کے جذبات کا کسے احساس ہوتا ہے۔

لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک اور چیز ہنسی کی محرک ہوتی ہے جس کا برگساں نے ذکر نہیں کیا اور وہ تہذیب اور ثقاہت کے تکلفات سے آزادی کا احساس ہے مثلاً ایک مجمع میں جہاں سب مقطع اور ثقہ لوگ بیٹھے ہیں اور انسان وہاں بات کرنے بلکہ سانس لینے میں بھی تکلف محسوس کرتا ہے کوئی شخص کوئی موٹی سی گالی بک دے یا پھکڑ مذاق کر بیٹھے تو حالانکہ خوش مذاق لوگوں کے لئے گالی یا بیہودہ مذاق بجائے خود کوئی ہنسی کی چیز نہیں مگر ایسے موقع پر انہیں بے اختیار ہنسی آجائے گی۔

ہنسی کی اس نفسیاتی تحلیل کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرجیے میں وہ کیفیت جس پر ہنسی آتی ہے پانچ طرح سے پیدا ہوسکتی ہے۔

(۱) ایک تو کسی شخص کی بے تکی جسمانی صفات سے مثلاً ناک کا بڑا ہونا۔

(۲) اُس کی انوکھی ذہنی اور روحانی صفات سے مثلاً سیج مچ کا مراق یا خبط، یا کسی معمولی صفت میں اس قدر مبالغہ جو مراق کی حد تک پہنچ جائے۔

(۳) اُس کی نرالی عادتوں اور حرکتوں سے مثلاً کندھے اچکانا، منہ چڑانا۔

(۴) کسی مضحک حالت کے دکھانے سے۔

(۵) مضحک الفاظ اور فقرے استعمال کرنے سے۔

فرحیہ نگار ان سب ترکیبوں سے کام لیتا ہے لیکن انکے استعمال میں تناسب کو مدنظر رکھتا ہے۔ جس ناٹک میں محض بے تکی جسمانی صفات یا نرالی عادتیں اور حرکتیں دکھائی جائیں وہ فرحیہ نہیں رہتا بلکہ نقل (فارس) بن جاتا ہے۔ فرحیے میں یہ چیزیں اسی حد تک کھپتی ہیں جہاں تک یہ ذہنی اور روحانی بے آہنگی کی علامت ہوں۔ البتہ انوکھی ذہنی صفات کو نمایاں کرنا مضحک حالتوں کا پیدا کرنا مضحک الفاظ اور فقرے استعمال کرنا فرحیے کا اصل جوہر ہے۔

یہاں تک ہم نے فرحیے کے عناصر مضمون کے لحاظ سے بیان کئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہنسنے ہنسانے کے لئے طرز ادا کیا اختیار کیا جاتا ہے۔

انسان اپنی خوش طبعی کا اظہار ان تین طرزوں میں سے کسی طرز سے کرتا ہے۔ مذاق یا دل لگی، ظرافت، طنز۔

مذاق یا دل لگی اسے کہتے ہیں کہ آدمی اپنی فطری شگفتہ طبعی سے ہر بات میں ہنسی کا پہلو ڈھونڈھے، خود ہنسے اور جس پر ہنسے اُسے بھی ہنسائے۔ اس کی بنیاد ہمدردی، یار باشی، کشادہ دلی پر ہوتی ہے۔ مذاق کرنیوالے کا مقصد کسی کو خفیف کرنا نہیں بلکہ سب کو خوش کرنا ہوتا ہے وہ جس طرح دوسروں پر چوٹ کرتا ہے اسی طرح اپنے آپ پر بھی فقرے کستا ہے۔ اُس کی طبیعت میں یا اس کی باتوں میں کوئی خاص نفاست یا باریکی نہیں ہوتی لیکن وہ تناسب کا کسی قدر احساس رکھتا ہے، اُس کی نظر بے ڈول یا بے تکی چیز پر فوراً پڑتی ہے، وہ بیساختہ ہنس پڑتا ہے اور اس کے ہنسنے پر دوسروں کو ہنسی آجاتی ہے مذاق کرنے والا اگر متانت اور خودداری سے بالکل خالی ہو اُس کی باتوں میں بازاری پن کی جھلک اور خوشامد یا مطلب براری کا پہلو ہو تو وہ مسخرا اور اسکا مذاق مسخراپن کہلاتا ہے۔

وہ مذاق جو پستی کی طرف جھکنے کی بجائے بلندی کی طرف ابھرتا ہے جس میں نفاست، ندرت

ستھرا پن پایا جاتا ہے اسے ظرافت کہتے ہیں۔

ظرافت کی بنیاد شوخ طبعی، نکتہ سنجی اور ذہنی رعونت پر ہوتی ہے۔ ظریف آدمی کا احساس تناسب اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ ذرا سا بے تکا پن بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ جب وہ بیڈول چیزوں اور بے تکے لوگوں کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں ہمدردی کی جگہہ ایک طرح کی حقارت پیدا ہوتی ہے۔ وہ دل لگی باز کی طرح کھلے دل سے اور کھلے الفاظ میں مذاق نہیں کرتا بلکہ برتری کے احساس کے ساتھ اپنے آپ کو لئے دیئے ہوئے لطیف اشاروں اور کنایوں میں چوٹیں کرتا ہے اور اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ اسکا مقصد کمتر ہنسنا اور زیادہ تر بیوقوفوں اور سادہ لوحوں کو بنانا اور خفیف کرنا ہوتا ہے۔

اگر ظرافت حد سے زیادہ تلخ اور ترش ہو جائے تو وہ طنز کے درجے پر پہنچ جاتی۔ طنز کرنیوالا عموماً اکل کھرا اور مردم بیزار ہوتا ہے۔ اس کی نظر حماقت اور بے تکے پن کے علاوہ اخلاقی کمزوریوں پر بھی ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اُسے تکلیف ہوتی ہے اور وہ ان کی پردہ دری کر کے دوسروں کو بھی تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ اس کی ہنسی زہرخند کی شان رکھتی ہے، اور اس کی ظرافت غم اور غصے میں ڈوبی ہوتی ہے۔

ان میں سے فرحیے کا مخصوص طرز ادا مذاق اور دل لگی ہے۔ ظرافت کا استعمال محدود ہے اس کی باریکی اور شوخی سے کام لیا جاتا ہے لیکن رعونت کا انداز اختیار نہیں کیا جاتا۔ اکثر اعلیٰ درجے کے فرحیہ نگار مثلاً شیکسپیر جن لوگوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں ان کی تحقیر نہیں کرتے بلکہ ان سے ایک حد تک محبت رکھتے ہیں۔ شیکسپیر کی ہنسی میں تلخی نہیں ہوتی۔ اس کی پھبتیوں میں نیش نہیں ہوتا۔ اُس کے سب سے مشہور مضحک کیرکٹر فالسٹاف کی حماقت، لالچ، شیخی پر ہم جی کھول کے ہنستے ہیں لیکن جب وہ اپنے کئے کی سزا پاتا ہے تو ہمیں اُس پر رحم آجاتا ہے۔ مولیر جو غالباً فرحیہ نگاری کا سب سے بڑا استاد ہے شیکسپیر سے زیادہ سخت گیر ہے لیکن اس کا دل بھی رعونت اور تحقیر کے جذبات سے خالی ہے۔ وہ جن لوگوں کا خاکہ اڑاتا ہے انہیں اپنے سے کم درجے کا مخلوق نہیں بلکہ

اپنی طرح انسان سمجھتا ہے۔

بقیہ دو طرز یعنی مسخرا پن اور طنز فرسے کے لئے مناسب نہیں۔ مسخرے پن پر ہنسی ضرور آتی ہے لیکن خوشی کی جو کیفیت اس سے پیدا ہوتی ہے وہ سطحی اور عارضی ہوتی ہے اس سے تھوڑی دیر دل بہلتا ہے لیکن زندگی کی دشواریوں میں کوئی مستقل سہولت حاصل نہیں ہوتی اس طرز کا محل استعمال نقل (فارس) ہے جو عوام میں بہت مقبول ہے لیکن خوش مذاق لوگوں کی نظر میں زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

طنز کی گنجائش فرسے میں اور بھی کم ہے۔ فرسے کی سبک روی اس کی تلخی اور ترشی کا بار نہیں اٹھا سکتی۔ طنز کی جان غم و غصہ اور نفرت کے جذبات ہیں جو مذاق کے ہلکے سے پردے میں چھپے ہوتے ہیں۔ تنقید اور تضحیک کے لئے یہ بہت اچھا آلہ ہے لیکن فرسے میں جس کا اصل مقصد تفریح اور خوش وقتی ہے۔ اس کی آشفتہ نوائی سارے عیش کو تلخ کر دیتی ہے۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہنسی زیادہ تر ان لوگوں پر آتی ہے جس میں شخصیت نہ ہو بلکہ جو کٹھ پتلی کی طرح کسی بیرونی قوت کے اشارے پر حرکت کرتے ہوں اس لئے فرسے میں جس کا دار و مدار ہی اس پر ہے کہ ہر شخص کو مضحک حالت میں دکھایا جائے عموماً کوئی نمایاں شخصیت رکھنے والا کیرکٹر یعنی کوئی ہیرو نہیں ہوتا۔ اگر کسی کیرکٹر کو خاص طور سے مضحک بنایا جائے تو اس کی شخصی حیثیت پر زور نہیں دیا جاتا بلکہ اس سے کسی جماعت یا طبقے کی مثال (Type) کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً مولیر کے ڈراموں میں جہاں کہیں ایک طبیب یا ایک کنجوس آدمی کی خبر لی گئی ہے تو اس سے کوئی خاص شخص مراد نہیں بلکہ سارے طبیب اور سارے کنجوس آدمی۔ اکثر فرسوں میں اصل قصے کے ساتھ ایک یا زیادہ ضمنی قصے بھی ہوتے ہیں جن کے اشخاص کی اہمیت قریب قریب مساوی ہوتی ہے۔ اس طرح فرسے میں عمومیت کا رنگ جس کے لئے المیے میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ عمومیت پیدا کرنے کی اور ترکیبیں مثلاً مافوق الفطرت قوتوں کا ذکر فرسے میں کام نہیں دیتا کیونکہ ان سے خوف اور دہشت کا اثر پڑتا ہے۔ اور یہ فرسے کی

انتشار کے خلاف ہے۔

(۶)

ڈراما کی نشو ونما عہد قدیم سے عہد جدید تک | انسانی زندگی کی تمثیلیں ناٹک کے ذریعے دکھانے کی رسم اکثر قوموں میں قدیم زمانے سے پائی جاتی ہے لیکن اسے ادبی اور شاعرانہ حیثیت پہلے پہل چینیوں یونانیوں، اور ہندؤں نے دی۔ ان تینوں قوموں نے ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر الگ الگ اس صنف شاعری کو ایجاد کیا یونانیوں میں اس رسم کی بنیاد اس طرح پڑی کہ انکے یہاں ابتدا سے ڈایونی سیس[1] دیوتا کے پوجا کے سلسلے میں مذہبی روایات ناٹک کی شکل میں دکھائی جاتی تھیں۔ جب یونانی تمدن نے ترقی کی تو شعرا اس رسم کے لئے خاص ڈرامے تیار کرنے لگے عام دستور یہ تھا کہ اس موقع پر ایک فرحیہ اور تین المیے دکھائے جاتے تھے جو ڈراما نگار چوٹی کے سمجھے جاتے تھے انکے ڈرامے اس کام کے لئے منتخب ہوتے تھے یونانی زبان کے اکثر بہترین ڈرامے اسی تقریب سے لکھے گئے۔

یونانیوں میں ڈراما کے اصول وضوابط سب سے پہلے ارسطو نے اپنی شعریات (poetics) میں مرتب کئے۔ ارسطو کی خصوصیت یہ ہے کہ یونانیوں کے ذہن نے اپنی فطری تخلیقی رو میں علم وادب اور فنون لطیفہ کے جو نمونے پیدا کئے تھے اس نے انکا غور و فکر سے مطالعہ کیا اور انکے اہم عناصر دریافت کر کے علمی قوانین بنا دئے تاکہ آئندہ نسلیں اپنے بزرگوں کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں اور نئے بنائے راستوں پر چل کر کم وقت میں زیادہ ترقی کر سکیں اس کے عہد میں باکمال شعرا صرف المیے لکھتے تھے۔ اچھے فرحیے یا تو اس سے پہلے لکھے گئے یا

---

(۱) اس دیوتا کے متعلق ابتدا میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ سارے نباتات کے اُگنے اور بڑھنے کا کفیل ہے لیکن آگے چل کر اسکا کام محض یہ سمجھا جانے لگا کہ انگور میں شراب پیدا کرے۔ اسی کو Bacchus کہتے ہیں۔

اُس کے بعد۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اپنی فطری سنجیدگی اور خشک مزاجی کی بدولت اُس نے اعلیٰ ڈراما صرف المیے کو قرار دیا اور فرحیے کو ادنیٰ درجے کی چیز سمجھ کر اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس کے عہد میں اسٹیج بالکل ابتدائی حالت میں تھی، فنی (Technical) ذرائع بہت محدود تھے، پردوں کے بدلنے میں بڑی دقت ہوتی تھی، اس لئے اس نے یہ اصول قرار دیا کہ ہر ڈرامے میں صرف ایک قصہ ہو، ہر قصے کا محل وقوع ابتدا سے آخر تک ایک ہو اور زمانۂ وقوع جہاں تک ممکن مختصر رکھا جائے یہ سہ گونہ وحدت کا قانون کہلاتا ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کا نظریہ یونانی حالات کا پابند تھا اور اُس نے جو اصول بنائے تھے وہ ہمیشہ کے لئے نہ تھے۔

مگر جب یونانیوں کے تمدن کا زوال ہوا اور انکی وراثت اہل روما کو ملی تو انھوں نے اپنی فطری تقلید پرستی کی بدولت فنون لطیفہ میں یونانیوں کے بنائے ہوئے اصولوں کو دوامی قانون سمجھا جس کی مخالفت اُن کے نزدیک کسی طرح جائز نہ تھی۔ ہورَیس نے ارسطو کے ضوابط کی تشریح کی اور انکی پابندی کو ہر ڈراما نگار کے لئے لازمی قرار دے دیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کے ڈراما کی آزاد نشوونما رک گئی اور وہ زیادہ ترقی نہ کر سکا۔ قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کی مذہبی سختیوں کے سبب سے ڈراما کو اور تنزل ہوا۔ اس زمانے میں زندگی پر مذہب اور کلیسا کا رنگ چھایا ہوا تھا اس لئے ڈراما بھی اسی رنگ میں رنگ گیا۔ لوگ اپنے ذوقِ تمثیل کو مذہبی سوانگ سے پورا کرتے تھے جس میں مسیح کی ولادت اور شہادت اور اولیا کی زندگی کے سیدھے سادے قصے ہوتے تھے مگر اصول فن میں بدستور یونانیوں کی تقلید ہوتی تھی۔ عہدِ جدید میں سب سے پہلے شکسپیر نے جو قدیم علوم سے تقریباً بالکل ناآشنا تھا اپنی فطری قوتِ تخلیق کی بدولت ڈراما کو فرسودہ قوانین کی پابندی سے آزاد کر کے آسمان تک پہنچا دیا۔ مگر سولھویں صدی کے نقاد ابتک پرانے ضوابط کے قائل تھے اور شکسپیر کے ڈراموں کو بے اصول سمجھ کر رد کر دیتے تھے۔ جو لوگ اس بادشاہ سخن کے فطری جوہر کے قائل تھے انھوں نے بھی اصول فن میں

کسی طرح کی تبدیلی گوارا نہیں کی ہاں اتنا کیا کہ شیکسپیر کو مستثنےٰ قرار دے دیا۔ ڈراما کی تنقید میں
یہ قدامت پرستی اٹھارہویں صدی تک جاری رہی۔ البتہ سترھویں صدی میں ڈرائیڈن اور
اٹھارھویں صدی میں ڈاکٹر جانسن نے لوگوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ ارسطو کے اصول
بہت سی باتوں میں اس کے عہد کے حالات کے پابند تھے اور جب وہ حالات بدل گئے تو
ان اصولوں کی پابندی بھی لازمی نہیں رہی۔ ان نقادوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ
شکسپیر کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ اس کی قوت تخلیق نے فرسودہ ضوابط کی زنجیروں کو توڑ کر
اپنے دائرہ عمل کو وسیع کر لیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں رومانی تحریک کے بانی ہرڈر
نے تو فن تنقید میں بالکل کایا پلٹ ہی کر دی۔ اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ہر قوم اور ہر دور
کی ایک مخصوص شاعرانہ روح ہوتی ہے جو اپنے اظہار کے لئے خود راہ نکالتی ہے۔ اس
کے خیال میں ادب اور شاعری کو دوامی قواعد و ضوابط کا پابند بنایا گویا انکی روح کو طوق و
سلاسل میں جکڑ کر رکھنا ہے۔ رومانی دور کے ڈراما میں جو جدتیں پیدا کی گئیں انہیں دیکھ کر
سولھویں اور سترھویں صدی کے نقاد آپے سے باہر ہو جاتے۔ سہ گونہ وحدت کا قانون بالکل
پس پشت ڈال دیا گیا۔ ڈراما کے طول میں کسی طرح کی پابندی نہ رہی۔ المیہ کا موضوع بجائے بادشاہوں
کی زندگی کے عوام کی زندگی بن گئی۔

شکسپیر کے عہد اور رومانی دور کے ڈراما میں قدیم یونانی رومی ڈراما یا قرون وسطےٰ
کے فن تمثیل کے مقابلہ میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ محض قانون صورت اور اصول فن
کے لحاظ سے نہ تھیں بلکہ عہد جدید میں شاعری کی اور اصناف کی طرح ڈراما کا بھی مزاج
ہی بالکل بدل گیا۔ یہ تغیر اصل میں انسان کے نفسی انقلاب کا نتیجہ تھا۔ یونان کے سقراطی دور
اور روما کے شاہنشاہی دور کا انسان ایک ایسے تمدن کا حامل تھا جو بڑھاپے کی منزل میں پہنچ چکا تھا۔ اسکے خیالات
میں پختگی تھی اور سادگی جو پختگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی پختگی اور یہی سادگی اس زمانے کے فلسفے میں، آرٹ
میں خصوصاً ڈراما میں پائی جاتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسیحی مذہب نے رومی اور المانی قوموں میں

پہنچ کر ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالی جسے ہم مغربی تمدن کہہ سکتے ہیں۔ صدیوں تک یہ تمدن بچپن کی حالت میں رہا۔ لوگوں کے دلوں پر بھولے پن، عقیدت، تقلید کا رنگ غالب تھا جس کا اثر اس عہد کے طرز تعمیر شاعری، ڈراما سبھی چیزوں پر پڑا۔ شیکسپیر کے زمانے میں اس تمدن نے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ اس کے ہمعصروں کے جذبات میں تلاطم برپا تھا۔ ان کے تخیل میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا کیونکہ اس کے نفس میں نئی قوتیں، امنگیں، آرزوئیں پیدا ہو رہی تھیں یا بہ قول افلاطون کے اُن کا مرغ روح پر پرواز پیدا کر رہا تھا۔ اس سیلاب تخیل، طوفان آرزو، جوش جوانی کو راہ پر لگانے کے لئے اٹھارہویں صدی کی نئی روشنی کی تحریک نے عقلیت کے پشتے تیار کئے لیکن یہ دریا ان کے روکے نہ رُکا، اٹھارہویں صدی کی شاعری اور ڈراما میں لیسنگ اور اُس کے ہمعصروں کی کوششوں سے کچھ دن تک پختگی، سنجیدگی، ضبط کا چلن رہا لیکن رومانی تحریک نے وضع احتیاط سے اکتا کر گریبان عقل کا چاک کر دیا اور جذبات پرستی کا دور دورہ ہو گیا۔ قلب انسانی کی گہرائی سے احساس اور تخیل کے چشمے ابل پڑے اور بحر ذخار کی طرح پھیل گئے۔

مگر انسانی تمدن اور انسانی روح کو پھیلنے کے بعد اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپ کو سمیٹے۔ جوانی کی شوریدہ سری اور مطلق العنانی، تھوڑے دن رہتی ہے پھر خود بخود یہ احساس ہوتا ہے کہ بس اب سنبھلنے کا وقت ہے۔ یہ صورت مغربی تمدن کو انیسویں صدی کے نصف اول میں پیش آئی۔ رومانی دور کی جذبات پرستی نے تخیل کو بڑی وسعت دی تھی اور احساس کو بہت تیز کر دیا تھا لیکن بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ محض تخیل احساس اور جذبات کی بنا پر مکمل تمدنی زندگی کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اہل نظر تنقید اور غور سے کام لینے لگے اور ایک با اصول اور مستحکم عقیدۂ زندگی تلاش کرنے لگے۔ اس جستجو کا پہلا علمبردار شاعری اور ڈراما میں جرمن شاعر گوئٹے ہے۔ گوئٹے ابتدائی عمر میں رومانی شاعر تھا لیکن مدت تک زمانے کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد اس کے عقائد بہت کچھ تبدیل ہو گئے اور وہ زندگی کا ایک برتر اور بہتر نصب العین تلاش کرنے لگا۔

لیکن گوئٹے انقلاب کا قائل نہیں تھا بلکہ ارتقا کو مانتا تھا۔ وہ تاریخ کے ہر دور کو تمدنی نشو
کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھتا تھا اور کسی کڑی کو توڑنا اُسے گوارا نہ تھا۔ رومانی خیالات کا اس پر بڑا
گہرا اثر تھا اور انکی خامیوں سے واقف ہو جانے کے بعد بھی اس نے انہیں بالکل رد نہیں کیا۔
بلکہ ان کے ایک اہم عنصر کو اپنے فلسفہ زندگی میں جذب کر لیا۔ اُس کے نزدیک رومانیوں کی جذبات
پرستی، انفرادیت، بے اصولی، بے راہ روی سطحی اور عارضی چیزیں تھیں لیکن انکی باطنیت بڑی گہری
حقیقت پر مبنی تھی۔ اس باطنیت کو اس نے لے لیا لیکن یوں نہیں کہ حواس ظاہری اور عقل کو
معطل کر کے نامعلوم قوتوں کے آگے سر جھکا دیتا بلکہ اس طرح کہ انسانی زندگی کو اس نے ایک
مجازی چیز قرار دیا جو عقل و ادراک کے مرحلوں سے گذرتی ہے اور ایک منزل پر پہنچ کر حقیقت کے
آغوش میں چلی جاتی ہے اس کے آگے جو کچھ ہوتا ہے اس کی کسی کو خبر نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔

مگر گوئٹے کے بعد انیسویں صدی کے نصف دوم میں یوروپ کی زندگی اور خیالات میں
بڑا انقلاب ہو گیا۔ سائنس کی ترقی اور اس کے استعمال سے صنعت کو بیحد فروغ ہوا۔ بڑے بڑے
کارخانے کھل گئے۔ دیہات کی آبادی کھنچ کر شہروں میں آگئی۔ زندگی کی ضروریات بڑھ گئیں
اور انکے پورا ہونے میں دقت ہونے لگی۔ کارخانے کے مزدور جب دفعۃً ایک نئی فضا میں آئے
تو انکی سماجی زندگی کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ ان معاشی اور سماجی پیچیدگیوں کے سبب سے لوگوں
میں ایک عام بے چینی پیدا ہوئی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ نئے مادی حالات سے مطابقت پیدا
کرنے کے لئے حکومت و سیاست، مذہب و اخلاق، ہر چیز میں انقلاب کی ضرورت ہے۔

قدرتی بات تھی کہ اس زمانے میں روزمرہ زندگی کے واقعات نے لوگوں کو اس قدر متوجہ کر لیا
کہ زندگی کی حقیقت اور اُس کے آغاز و انجام پر غور کرنے کی فرصت نہیں رہی۔ ادھر نظری فلسفے پر تجربہ
کا رنگ چھا گیا۔ یعنی علم کا تنہا معیار تجربہ اور مشاہدہ قرار پایا اور تخیل وجدان اور باطنی احساسات ناقابل
اعتبار سمجھ کر ترک کر دیے گئے۔ ادھر عملی فلسفے میں افادیت دخیل ہو گئی۔ زندگی کا اعلیٰ مقصد حصول
راحت ٹھہرا اور اس کے حصول کا ذریعہ سائنس۔

عام خیال یہ تھا کہ زندگی کی تشکیل اور تہذیب کو مذہبی عقائد یا فلسفیانہ تخیلات پر نہیں چھوڑنا چاہئے بلکہ تجربے اور مشاہدے کے ذریعے سے اسکا ایک صحیح علم مرتب کرنا چاہئے۔ اس علم کا نام عمرانیات (Sociology) رکھا گیا اور یہ سارے علوم کا سرتاج سمجھا جانے لگا۔

اس انقلاب کا اثر ناول نویسی اور ڈراما پر بھی بہت گہرا پڑا۔ ان فنون کا اصل مقصد اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کے ذوق جمال اور ذوق مشاہدہ کو پورا کریں۔ ان سے زندگی کی تنقید یا اصلاح کا کام اگر لیا جاتا تھا تو محض ضمنی طور پر۔ اب انکا سب سے بڑا فرض یہ قرار دیا گیا کہ فرسودہ اصولوں اور عقیدوں کی چیھاڑ کریں اور زندگی کے نئے نصب العین پیش کریں۔ عمرانیات کے جو مسئلے اس زمانے میں عام طور پر چھڑے ہوئے تھے مثلاً فرد کی جسمانی اور روحانی آزادی، عورتوں اور مردوں کی مساوات، مروجہ اخلاق کی تنقید وغیرہ وہی ناولوں اور ڈراموں کے بھی موضوع بن گئے۔

بے قید تخیل اور بے روک جذبات پر اب بڑی قدغن ہونے لگی۔ ایسی باتیں جن میں واقعیت کا رنگ نہ ہو بالکل ترک کر دی گئیں۔ مافوق الفطرت عناصر جیسے دیوتا، تقدیر، جن، پری، وغیرہ جن سے پہلے ڈراما میں بہت کام لیا جاتا تھا اب صرف بچوں کی کہانیوں تک محدود رہ گئے۔ ان سے جو تخیلی اثر پیدا ہوتا تھا وہ اب زندگی کی ظاہری قوتوں مثلاً وراثت، قوت حیات، اور نفسیاتی عناصر سے پیدا کیا جانے لگا۔ یوں بھی صنعتی ترقی نے اسٹیج پر ہر طرح کے مناظر دکھانے میں اتنی آسانی پیدا کر دی تھی کہ ڈراما کے زور اور اس کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں ہونے پائی۔

یہ نئی روح ناروے کے ڈراما نگار ابسن کی تصانیف میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اس لئے وہی نئے ڈراما کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ابسن یہ محسوس کرتا تھا کہ مغربی سماج کے اصول وقواعد اور اخلاق ورسوم فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ان میں اتنی جان نہیں ہے کہ نئے زمانے کیساتھ چل سکیں اور نئی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ لوگ محض قدامت پرستی کے سبب سے ان سے اب تک مانوس ہیں۔ اور وہ ان میں اتنی بصیرت پیدا کرنا چاہتا تھا کہ اپنے پرانے خیالات اور

اور رسم و رواج کی کمزوریوں کو سمجھ لیں اور اتنی ہمت کہ ان زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیں۔ جب وہ اصلاح کے جوش میں اپنے عہد کے اصول اخلاق پر پے در پے حملے کرتا ہے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے اجتماعی اخلاق ہی کا قائل نہیں اور اس کے نزدیک فرد انسانی پر باہر سے یعنی مذہب یا تمدن کی طرف سے کسی طرح کی قیود عائد نہیں کرنا چاہئے بلکہ اُسے اس کی حالت پر چھوڑ دینا چاہئے تاکہ اُس کی جبلتیں اور صلاحیتیں آزادی سے نشوونما پاسکیں۔ لیکن اس کی تصانیف کو غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حد تک زاجی نہیں ہے۔ اس کا منشا اصل میں یہ ہے کہ اخلاقی اصول اور رسوم جو انسان کی مادی اور روحانی ترقی میں مدد دینے کے لئے وضع کئے گئے ہیں اسی حد تک قابل عمل ہیں جب تک وہ زمانے کے حالات، فرد کے فطری رجحانات اور اس کی مخصوص ضرورتوں سے نہ ٹکرائیں۔ جہاں یہ تصادم پیدا ہو تو جیتے جاگتے انسان کی راحت و عافیت کو مقدم سمجھنا چاہئے اور بےرنگ اور بےجان اصولوں کی پروا نہ کرنا چاہئے۔ اگر یہ کشمکش اکثر پیدا ہونے لگے تو سمجھنا چاہئے کہ اب ہمارا مروجہ اخلاق زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔

ابسن کا کمال یہ ہے کہ باوجود تنقیدی اور مصلحانہ طرز اختیار کرنے کے وہ آرٹ کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس کے اصلاحی جوش اور اُس کی انقلاب پسندانہ شورش نے اس کی شاعری کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس کے کلام میں اور زیادہ زور اور اس کے انداز بیان میں اور زیادہ سوز و گداز پیدا کر دیا وہ اپنے عہد کی معاشرت کا نقاد ہے، نئی سماجی تحریک کا علم بردار ہے مگر اسی کے ساتھ وہ شاعر ہے اور اسکے یہاں رومانی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ آگے چل کر یہ رنگ ہلکا ہو گیا مگر پھیکا نہیں پڑنے پایا۔ آغاز صدی کے رومانیوں میں اور ابسن میں بس اتنا فرق ہے کہ اُن لوگوں کی نظر کو جذبات پرستی نے دھندلا کر دیا تھا اور انہیں انسانی زندگی گویا کہر میں چھپی ہوئی نظر آتی تھی مگر ابسن کو بس اتنا نشہ تھا کہ اس کا احساس تیز ہو گیا تھا اور ادراک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس میں وہی خلیت تھی اور وہی انفرادیت مگر تنقید اور تحلیل کے ساتھ سموئی ہوئی۔ یہ تحلیل منطقی

تحلیل نہ تھی جو زندگی کے پھول کو پہچان سمجھ کر اس کی پتی پتی الگ کر کے دیکھتی ہو بلکہ نفسیاتی تحلیل جو اس کے اندر سما کر اس کے رنگ و بو، اس کی تازگی اور خوشنمائی کا جائزہ لیتی ہے اور اس کے خون دل اور چاک جگر کا بھید پاتی ہے۔

ابسن نے "دشمن مردم" میں فرد اور جماعت کے تعلقات سے بحث کی ہے۔ "گڑیا کا گھر" اور "سمندر کی خاتون" میں مرد اور عورت" کے تعلقات پر تبصرہ کیا ہے۔ لیکن "بحث" اور یہ "تبصرہ" خشک علمی مذاکرے نہیں ہیں بلکہ ان میں آرٹ کی سبکدستی نے دلکشی اور دلربائی پیدا کر دی ہے۔ "دشمن مردم" جماعت کے خلاف۔ فرد کا نعرۂ جنگ "سمندر کی خاتون" اور اس سے بھی بڑھ کر "گڑیا کا گھر" مرد کے مقابلے میں عورت کا اعلان آزادی ہے۔ مگر ان میں سے کسی میں مناظرے کی درشتی اور تلخی شاعری کی نرمی اور حلاوت پر غالب نہیں آئی۔

آخری عمر میں ابسن کے شاعرانہ تخیل نے واقعیت نگاری میں استعاریت کا رنگ پیدا کر دیا اسکا عمدہ نمونہ اسکا مشہور ڈراما "ماہرین فن تعمیر" ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک ذکی الطبع ماہر فن تعمیر سولینس کچھ خود غرضی اور کچھ رشک کے سبب سے اپنے نوجوان نائب راگنر کی ترقی کو روکنا چاہتا ہو وہ سمجھتا ہو کہ اگر راگنر اس کی ملازمت ترک کر کے اپنا کاروبار الگ جاری کر دے گا تو اس کے گاہک ٹوٹ کر راگنر کی طرف چلے جائیں گے۔ اور اس میں اسکا بڑا نقصان ہے۔ علاوہ اس کے اسے یہ گوارا نہیں کہ شباب کا بڑھتا ہوا زور بڑھاپے کی گھٹتی ہوئی قوت پر فتح پائے۔ اس لئے ایک طرف تو راگنر کے بنائے ہوئے نقشوں میں خواہ مخواہ عیب نکال کر اس کی ہمت کو پست کرتا ہے اور دوسری طرف راگنر کی منگیتر کے بھولے دل کو اپنے دام الفت میں گرفتار کرلیتا ہے تاکہ نہ وہ خود اس کی نوکری چھوڑے اور نہ راگنر کو چھوڑنے دے مگر شباب ایک نوجوان سیلانی لڑکی ہلڈا کی شکل میں آتا ہے اور اس کے دل کو پر اسرار طریقے سے تسخیر کرلیتا ہے۔ ہلڈا اسے اس پر آمادہ کرتی ہے کہ اپنی بنائی ہوئی عمارت کے مینار پر جاکر ہار چڑھائے۔ سولینس لکڑی کے ڈھانچے پر جو معماروں نے مینار کے گرد کھڑا کر دیا ہے چڑھتا ہے۔ مگر آخری زینے پر پہنچ کر اس کا سر چکرا جاتا ہے اور وہ

اس بلندی سے زمین پر گر کر مر جاتا ہے۔ اس طرح بیری کی شکست ہوتی ہے مگر بڑی شاندار شکست۔ اِبسن کو اس ڈرامے میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ موجودہ نسل کا آئندہ نسل کی اٹھان کو روکنا گویا قانون فطرت کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس کا انجام ناکامیابی ہے مگر یہ ناکامیابی بیری کے لئے باعث ذلت نہیں۔

اس ڈرامے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما کے جدید دور میں رومانیت روح معدوم نہیں ہوئی بلکہ نئے روپ میں استعاریت (Symbolism) کی نام سے تخیل کی آگ کو ہوا دیتی رہی۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ رومانیت تو عجائب پسندی کی دھن میں واقعیت کے قوانین سے صریحی انحراف کرتی ہے، جذبات پرستی کے جوش میں اعتدال کے اصول کو کھلم کھلا توڑتی ہے مگر استعاریت عقل اور عادت کے پردے کو قائم رکھتی ہے اور اس کے پیچھے سے رموز و اسرار کی جھلک دکھلاتی ہے۔ یہ طرز بیان جو اِبسن کے یہاں صرف آخری دور میں نظر آتا ہے۔ اسٹرنڈبرگ، میٹرلنک، روستان کے یہاں عام ہے آئرلینڈ کے ڈراما نگاروں خصوصاً ئیٹس کی تمثیلوں میں یہ استعاریت اور گہری ہو کر باطنیت بن گئی ہے۔

روستان میٹرلنک اور ہاؤٹپمان کی بعض تمثیلوں اور خود اِبسن کے نوجوانی کے ڈراموں میں رومانیت اپنی اصلی حالت میں بھی نظر آتی ہے۔ مگر یہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں ہیں جن سے شام مغرب کی سنجیدگی اور افسردگی کم نہیں ہوتی۔

زمانے کا عام رجحان، جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں، واقعیت نگاری اور اخلاق و معاشرت کی تنقید کی طرف تھا۔ ڈرامے عموماً اس قسم کے موضوعوں پر لکھے جاتے تھے جیسے شادی اور اس کے بعد کی زندگی، طلاق کا مسئلہ، مرد اور عورت کے جنسی تعلقات، عشق و محبت، عزت و وقار اور غیرت و حمیت کے موجودہ نصب العین کی تنقید، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش وغیرہ وغیرہ۔ خوف تھا کہ ان خشک اور سنجیدہ مسائل پر تنقیدی بحث کرنے سے ڈراما میں آرٹ کا عنصر کم ہو جائے گا لیکن اس دور کے تمثیل نگاروں کا کمال تھا کہ انہوں نے اپنی تصانیف میں اُن کی خوبی

اور دلکشی کو قائم رکھا۔ ابسن علاوہ اس کے ہمعصر اسٹرنڈ برگ، جرمنی کے ہاؤپٹمان اور زوڈرمان، آسٹریا کے اشنتسلر، انگلستان کے گالسورڈی کے قلم میں یہ جادو تھا کہ انہوں نے زندگی کی عکسی تصویروں میں بھی نقاشی کا لطف پیدا کر دیا۔

لیکن فرانس کے زولا اور بریو کی تصانیف کو دیکھ کر یہ انداز ہوتا ہے کہ واقعیت نگاری اور سماجی تنقید کو آرٹ بنا دینا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ زولا کی فحش اور بیرنگ اور بریو کی خشک اور پھیکی تمثیلیں نہ صرف آرٹ سے خالی ہیں بلکہ شہوانی جذبات اور خبیث امراض کی بے حیا یا نہ نمائش سے ذوق سلیم کو اس قدر آزردہ کر دیتی ہیں کہ تنقیدی اور اصلاحی مقاصد میں بھی انکی کامیابی بہت محدود ہے۔ بات یہ ہے کہ سماجی تنقید اور مصلحانہ تبلیغ کو کامیابی کے انتہائی درجے پر پہنچانے کے لیے جن عناصر کی ضرورت ہے یعنی اخلاقی خلوص اور جوش، سوز درد اور طنز و ظرافت انکی زولا اور بریو میں بہت کمی تھی۔ دوسرے ڈراما نگاروں میں جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں یہ چیزیں موجود تھیں مگر اسی حد تک کہ آرٹ کی سبک روی میں خلل نہ پڑے۔ اخلاقی مقاصد کے آگے آرٹ کی پروا نہ کرنا اور اس کے باوجود لوگوں کے قلوب کو تسخیر کر لینا صرف دو شخصوں کے حصے میں آیا جن میں ایک روس کا ناول نویس ٹالسٹائے تھا اور دوسرا انگلستان کا ڈراما نگار برنارڈ شا۔ ٹالسٹائے نے سوز و درد سے اور برنارڈ شا نے طنز و ظرافت سے یورپ کی ادبی دنیا میں قیامت برپا کر دی۔ ان دونوں کے فلسفۂ زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن یہ بات دونوں میں مشترک ہے کہ انکے اصلاحی جوش اور خلوص نے آرٹ کی خوشنما زنجیروں کو توڑ کر اور گلا کر اخلاقی تبلیغ کی تلواریں بنائیں جن کی چمک نے آرٹ کے قدردانوں کی نظروں میں چکا چوند ڈال دی۔ ٹالسٹائے کو ڈراما سے سروکار نہیں اس لیئے اسکا ذکر ہم نظر انداز کرتے ہیں اور اپنے مضمون کے تیسرے حصے کو برنارڈ شا کی زندگی اور اس کے ڈراما کی نشو و نما کے بیان کے لیئے وقف کرتے ہیں۔

لندن اور پیرس وغیرہ میں باقر آگاہ کی تصنیفات

رسالہ اُردو جلد ۹ حصہ (۳۴) میں مولانا باقر آگاہ کے متعلق ایک دلچسپ اور پراز معلومات مضمون شائع ہوا ہے۔ مگر اس میں زیادہ تر ان کی لائف اور دیوان سے بحث کی گئی ہے۔ دیگر تصانیف کے متعلق پوری صراحت صحت کے ساتھ نہیں ہے۔ چونکہ مصنف مضمون کو ان کی تمام تصنیفات نہیں ملی ہیں اس لئے انکے متعلق فروگذاشتوں کا ہونا ناگزیر ہے

یہاں اس امر کا موقع نہیں ہے کہ اُس مضمون پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ البتہ یورپ میں ان کی جو کتابیں ملی ہیں انکے لحاظ سے ایک سرسری نظر ان کے تصنیفات پر ڈالی جاتی ہے۔ میرا مقصد باقر آگاہ کی لائف بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ رسالہ اردو میں اس پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے مگر چند امور کا بیان بطور تمہید ضروری ہے تاکہ ناظرین جامعہ باقر آگاہ کی شخصیت سے واقف ہو جائیں۔

آگاہ کا نام محمد باقر ہے انکے اجداد بیجاپور کے رہنے والے تھے ان کے والد محمد مرتضیٰ ویلور (احاطہ مدراس) آئے اور اسی کو وطن بنالیا آگاہ کی پیدائش ۱۱۵۸ھ میں یہیں ہوئی۔ اس طرح آگاہ ویلوری ہیں مگر اپنی تصنیفات میں ویلور کے ساتھ ساتھ بیجاپور کی نسبت بھی ضرور دی ہے اس سے آگاہ کی وطنی محبت بیجاپور کے ساتھ (جو دکن کا گویا بغداد تھا) بخوبی ثابت ہوتی ہے۔

آگاہ عربی فارسی اور اردو کے جیّد عالم اور بڑے پرگو شاعر تھے۔ نہ صرف اردو بلکہ عربی اور فارسی میں اشعار کہا کرتے۔ عربی اور فارسی میں آگاہ اور اردو میں باقر تخلص تھا۔ ان کی عربی قابلیت کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے۔ انہوں نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی عربی تصنیف "سبحۃ المرجان" پر چار سو اعتراض کئے تھے۔

آگاہ کے علم و فن کی انکے زمانے میں بڑی قدر و منزلت ہوئی مدراس کے نواب محمد علی والاجاہ نے انکی اچھی توقیر کی۔

آگاہ نے ۹۲ سال کی عمر پائی سنہ ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ مدراس میں دفن ہوئے

ان کی تصنیفات عربی فارسی اور اردو ہیں جن کی صحیح تعداد معلوم کرنی دشوار ہے۔ تقریباً ۳۰۲ بتائی جاتی ہیں۔ اس میں سے ۱۶ اُردو ہیں جن کی فہرست ذیل میں دیجاتی ہی۔

(۱) ہشت بہشت (۲) فرائد در عقائد (۳) ریاض الجنان (۴) تحفۂ احباب (۵) محبوب القلوب (۶) تحفۃ النسا، (۷) گلزار عشق عرف قصہ رضوان شاہ و روح افزا (۸) روضۃ السلام (۹) خمسۂ منجرہ (۱۰) مثنوی روپ سنگار (۱۱) ہدایت نامہ (۱۲) فرقہ ہائے اسلام (۱۳) معراج نامہ (۱۴) دیوان اردو (۱۵) ریاض السیر (۱۶) رسالہ عقائد۔

رسالہ اردو والے مضمون میں اُردو تصنیفات کی تعداد ۱۴ ظاہر کی گئی ہے مگر نمبر ۹ جسے مضمون نگار نے تین کتابوں کا مجموعہ سمجھا ہی اصل میں ایک ہی کتاب ہی۔ اس کے علاوہ نمبر ۱۱ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۶ کا ذکر اس مضمون میں نہیں ہے۔

ان میں سے دس کتابیں یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں آئندہ صفحات پر ان کے نام گنائے جاتے ہیں۔

(۱) "ہشت بہشت" یہ دراصل آٹھ رسالوں کا مجموعہ ہی جس کی تصنیف ۱۱۸۵ھ سے ۱۲۰۱ھ تک ہوئی ہے۔ ہر رسالہ کا نام علٰحدہ ہی اور ان میں آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ تصنیف چند خصوصیتیں رکھتی ہی اول تو یہ کہ اس وقت تک دکھنی زبان میں اس قسم کی کتابیں تصنیف نہیں ہوئی تھیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے مضمون کے لحاظ سے پہلی کتاب تھی۔ اس سے پہلی ایک کتاب شیدا حیدرآبادی کی تصنیف سے تھی مگر وہ چھوٹے چھوٹے قصوں سے مملو تھی۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہی کہ اس میں عربی اور فارسی کی معتبر کتابوں سے مواد

(۲) ریاض الجنان۔ اسکا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر 6765ء پر اور ایک نسخہ پیرس میں نمبر ۸۷۲ پر موجود ہے۔

یہ مثنوی ہے جو اہل بیت کے فضائل میں لکھی گئی ہے اس کی تصنیف ۱۲۰٦ھ میں ہوئی ہے اس کے دیباچہ سے کئی ایک امور پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس سے کسی قدر انتخاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

دیباچہ میں حمد و نعت اور ان کتابوں کی تفصیل کے بعد جن سے اس کو مرتب کیا گیا ہے لکھتے ہیں :۔

" بعضے علماء اُن مناقب اشرف کو فارسی کتابوں میں سیر کے درج کئے ہیں لیکن کوئی کتاب مستقل اس بیان میں اب تک دیکھنے میں نہیں آئی پس تصنیف ہونا اسکا ہندی زبان میں معلوم۔ مگر یہ کہ ولی ایلوری وشیدائے حیدرآباد دکھنی زبان میں دو نسخے منظوم لکھتے ہیں اُن کا نام روضۃ الشہدا اور روضۃ الاطہار مناقب عترت اخیار کے اُن دونوں میں بہت کم ہیں بلکہ نہیں ہیں واقعات شہادت کے کچھ تفصیل کئے ہیں اور اکثر بیان دونو کا غلط اور بے اصل ہے جیسا انتقام چہنا عکاشہ کا آنحضرت صلعم سے ۔ ۔ ۔ ۔ "

" ۔ ۔ ۔ ۔ اکثر اہل سیر اس فن کے تساہل و سہل انکاری کیتئیں شیوہ اپنا کیا کر کر تواریخ کی لکھنے میں ضبط و تدقیق نہیں کئے بلکہ رطب و یابس جو پائی سو لکھ گئے اس جہت سے ان کی کتابوں میں غلط باتیں اور بے اصل روائتیں بہت پائی جاتی ہیں جیسا حبیب السیر اور روضۃ الصفا اور روضۃ الشہدا بخلاف ثقات حدیث کے کہ تصانیف انکی نہایت تحقیق سے موزوں اور نہایت تدقیق سے مشحون ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ "

" ۔ ۔ ۔ ۔ اور بوجہ اسے بھائی کہ یہ عاصی پندرہ دس سال سے شعر کے ساتھ الفت اور ارتباط رکھتا ہے اگرچہ شعر کم کہتا تھا اسیی واسطے تخلص اپنا مدت تک مقرر نہیں کیا

تھا جب سنہ ۱۱۸۴ھ اور ۱۱۸۵ھ میں بعضے رسائل ہشت بہشت کی منظوم کیا لفظ باقر کا جز

نام ہے بجائے تخلص رکھا من بعد ۱۱۹۴ء وقت نظم کرنے دیوان عربی کے تخلص اپنا

آگاہ مقــــرر کیا اس تخلص کو عربی فارسی میں لایا اور اکثر مراثی اور ریختیوں میں بھی

اُسی تخلص کو اختیار کیا اور تتمہ رسائل ہشت بہشت میں کہ بیچ سنہ ؟ کے منظوم ہوتی

اور بیچ کتاب محبوب القلوب کے در ۱۲۰۶ھ کی منظوم ہوے اور اس رسالہ میں کہ

ریاض الجنان نام رکھتا ہے تخلص اپنا وہی باقر رکھا ہے کیا واسطے کے رسائل اول

کے جابجا شہور ہوئی تھی اگر بعد ہوئی سو رسالوں میں تخلص آگاہ لاتا تو دو تخلص

ہوتے اس واسطے وہی تخلص باقی رکھا تا سب مثنویات دکھنی میں ایک تخلص رہے"

اس صراحت سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) مناقب کے متعلق کوئی مستقل کتاب فارسی میں نہیں تھی آگاہ نے اس مضمون کو اُردو میں ایک مستقل کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔

(۲) ولی ویلوری اور شیدائے حیدرآبادی نے دو کتابیں شہادت امام حسین میں مرتب کی تھیں مگر وہ صداقت سے دور غلط واقعات پر مبنی تھیں۔

(۳) اس وقت کی جتنی کتابیں سیر وغیرہ پر لکھی گئی تھیں وہ بھی اسی طرح غلطیوں سے خالی نہیں تھیں۔

(۴) آگاہ نے پندرہ سال کی عمر سے شاعری شروع کی۔

(۵) ۱۱۸۴ھ میں جبکہ ہشت بہشت کے چند رسالے مرتب ہوئے اپنا تخلص باقــــر قرار دیا۔

(۶) ۱۱۹۴ھ میں عربی دیوان مرتب ہوا جس میں آگاہ تخلص رکھا گیا۔

(۷) اسی زمانے میں فارسی کلام میں اسی تخلص کو اختــــیار کیا گیا۔

(۸) آگاہ نے مراثی اور اردو غزلیں بھی کہیں جن میں آگاہ تخلص ہے۔

(۹) محبوب القلوب اور ریاض الجنان ۱۳۰۶ھ میں مرتب ہوئے جس میں باقر تخلص ہے

---

(۳) "محبوب القلوب" اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر ۶۷۶۵۵ پر موجود ہے
یہ ایک مثنوی ہے جس میں تقریباً ۳۰۰۰ شعر ہیں۔ اسمیں شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات
بیان کئے گئے ہیں ابتدا میں چھ ورق نثر میں دیباچہ بھی درج ہے۔ اس کے سنہ تصنیف کے
متعلق رسالہ اردو میں حسب ذیل شرح کی گئی ہے:۔

"اس کی تصنیف کا سال خود مخطوطہ سے ۱۱۳۶ھ معلوم ہوتا ہے لیکن ریاض الجنان
کے دیباچے میں ۱۱۲۰ھ لکھا ہوا ہے جو درحقیقت ایکہزار ایک سوتانیس ہے اگر یہ
آخری تاریخ صحیح ہو اور کاتب کی غلطی سے بجائے ۳ کے ۲ نہ لکھ دیا گیا ہو تو غالباً یہ
۱۱۲۷ھ میں شروع ہوا ہو گا اور دس سال بعد ختم ہوا"

صاحب مضمون سے اس میں سہو ہوئی ہے کیونکہ ۱۱۲۷ھ یا ۱۱۳۷ھ کوئی بھی صحیح نہیں
ہو سکتا کیونکہ اس زمانے میں آگاہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے چنانچہ خود اسی مضمون میں انکی
پیدائش کو ۱۱۵۸ھ میں لکھا گیا ہے (صفحہ ۲۰۲ سطر ۵) ریاض الجنان کے دیباچے سے صاف
طور پر ۱۳۰۶ھ ظاہر ہوتا ہے اس کی تصنیف اسی سنہ کو قرار دینا چاہئے۔ علاوہ ازیں مصنف
نے ۱۱۸۴ھ سے اپنی تصنیفات آغاز کی ہیں۔ اس لئے ۱۱۲۷ھ کسی طرح درست نہیں ہو سکتا
اور ۱۲۲۷ھ میں وہ زندہ نہیں تھے۔

(۴) "تحفہ احباب" اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر ۶۷۶۵۴ پر موجود ہے
یہ بھی مثنوی ہے جس میں تقریباً ۳۵۰۰ شعر ہیں۔ اس میں اصحاب کی تفضیلت اور مناقب بیان
کئے گئے ہیں کتاب میں چھ باب ہیں اور ہر باب میں کئی کئی فصلیں۔
رسالہ اردو والے مضمون میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی گئی۔ برٹش میوزیم
والا مخطوطہ ۱۲ محرم ۱۲۶۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کاتب عبدالواحد ہے۔ اس مثنوی کے ابتدا میں

بھی ایک دیباچہ نثر میں لکھا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے علما، دکھنی زبان کو زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"اے بھائی اکثر بلکہ سب دکھنی کتاباں بنانے والے بیان میں ایسی بہت غلط کئے ہیں کہ اس زبان کو بے اعتبار کر دئے اس لئے علما، اُن کتابوں طرف التفات نہیں کرتے آج لک کوئی کتاب دکھنی صحیح و معتبر میری نظر میں آئی نہیں۔ بعضے اُن سے سر تا پا جھوٹ سے بھری ہیں اور بعضوں میں جھوٹ زیادہ ہے اور بعضوں میں جھوٹ کم ہے روایات موضوع کا سننا اور سنانا اور پڑھنا اور پڑھانا اشد حرام ہے اس بات پر سب علما، کا اجتماع ہے شکر خدائے تعالیٰ کا کہ میرے تمام رسائل بہت صحیح و معتبرو نہایت مضبوط و مدلل ہیں کوئی محدث اور صاحب علم کو مقدور نہیں کہ اُس کی کوئی روایت پر حرف رکھ سکے۔"

(۵) "تحفۃ النسا،" اس کا ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانہ میں نمبر ۸۷۲ پر موجود ہے۔ یہ بھی مثنوی ہے جس میں ۸۰۰ شعر ہیں اور اُسکی تصنیف ۱۱۸۵ھ میں ہوئی ہے ان دونوں امور کو خود مصنف نے بیان کیا ہے :۔

ہیں اٹ سو اُس کے جیلے ابیات — پڑنے میں ہے اسکی بہوت برکات
گیارہ سو اوپر تھے پنج و ہشتاد — ہجرت سے بنا ہے تب یہ رکھ یاد

(ص ۴۵ ب)

اس کتاب میں اول تو حمد و نعت ہے اس کے بعد اپنے مرشد ابو الحسن کی مدح کرتے ہیں :۔

اس ملک منی تھا پیر میرا — ہر کام میں دستگیر میرا
تھا نام شریف ابو الحسن جس — اس خلق حسین ہوا حسن جس
اس دہر کا ہو جنید آیا — الحاد کی حرف کون مٹایا

وصف اسکا ہے بے شمار باقر — بیان مدح کوں اسکی کر کوئی آخر

(ص ۲۲۸)

اس مثنوی میں ازواج مطہرات اور دیگر خواتین کی فضیلت بیان کی گئی ہے مثنوی کے مضمون کو خود بیان کر دیا ہے :-

امت میں نبی کی جو ہیں عورات — افضل ہیں سب عورتاں سوں بات

لکھتا ہوں میں اس کتاب اندر — احوال نار کا اے برادر

اس شاہ کی دختران کا احوال — اس شاہ کی عورتاں کا احوال

امت میں جو عورتاں تھے کامل — تھا قرب خدا کا ان کو حاصل

(ص ۲۲۸ ب)

سب سے پہلے فاطمہ زہرا کی فضیلت ہے اس کے بعد دیگر صاحبزادیوں پھر ازواج اور اس کے بعد رابعہ بصری وغیرہ دیگر خواتین کا بیان ہے۔

یہ مثنوی مصنف کے ابتدائی زمانے کی تالیف ہے کیونکہ انہوں نے اس قسم کے کام کی ابتدا ۱۱۸۴ھ میں کی ہے اور یہ تصنیف ۱۱۸۵ھ میں ہوئی ہے۔

(۶) "رسالہ فرقہ ہائے اسلام" یہ بھی پیرس میں موجود ہے نمبر ۸۰۲ - اس مثنوی کے اشعار تقریباً ۳۲۵ ہیں اس میں صرف فرقہ ہائے اسلام کا ذکر نہیں ہے بلکہ عقائد مثلاً اسما صفات رویت حسن و قبح عفو - ایمان - توبہ فاسق وغیرہ کا بیان بھی ہوا ہے۔

پہلا شعر حسب ذیل ہے۔

خدا کوں سزاوار حمد و ثنا — کہ ہے گا مبرا ز نقص و فنا

آخر پر لکھتے ہیں :-

نہ تھا شان میرے کا یہ اقتضا — کہ ہندی زباں کا کرے اصطفا

ولے بعض یاروں کا ایما ہوا — سو ہندی زباں یہ رسالہ ہوا

اس امر کا خیال رہے کہ مصنف نے اکثر جگہ اردو کے بجائے ہندی کا استعمال کیا ہے اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ آج کل کی "ہندی" ہو، نہیں بلکہ جنوبی ہند میں عام طور سے زمانہ حال تک اردو کو ہندی ہی سے موسوم کیا گیا ہے۔ باقر آگاہ کے بعد قاضی بدرالدولہ کی اردو تصنیفات میں بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے

(۷) "ہدایت نامہ"، یہ بھی پیرس میں نمبر ۸۷۲ پر موجود ہے۔ اس مثنوی کے اشعار تقریباً ۲۵۰ ہیں اور اس میں گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلا شعر :۔

کروں آغاز حمد حق سوں اول — کہ تا نامہ ہووے یگی مکمل

کتاب کا نام بھی اشعار میں بیان ہوا ہے :۔

ہدایت نامہ یو پورا کیا میں — ہدایت خلق کوں پورا دیا میں

الٰہی یو ہدایت نامہ میرا — حقیقت میں سخن یو سب ہو تیرا

(ص ۱۰۴۳۰)

(۸) "معراج نامہ"، پیرس میں ہے نمبر وہی ۸۷۲ اشعار کی تعداد ۱۵۴۵ ہے قدیم دکھنی شعرا کی مثنویوں میں حمد و نعت کے بعد ضرور معراج کا عنوان قائم کیا جاتا تھا جس میں آنحضرت کے معراج کے حالات بیان کئے جاتے تھے۔ بعض شاعروں نے معراج کے متعلق علیحدہ مستقل تصنیفیں کی ہیں جن کے منجملہ یہ بھی ایک ہے۔ پہلا شعر حسب ذیل ہے :۔

سرانا خدا کوں سزاوار ہے — ہر ایک ذرہ اس کا نمودار ہے

خاتمہ :۔

کیا ختم میں ذکر معراج کا — بنام محمد نبی مصطفٰے

کیا ختم میں لے محمد کا نام — علیہ الصلوٰۃ وعلیہ السلام

کتاب کے آخر میں کاتب کا نام اور اشعار کے تعداد کی صراحت ہو :-

"جملہ ابیات این کتاب یکہزار پانصد چہل و پنج است از دست عاصی محمد زاہد در باغ نواب والاجاہ"

(۹) "رسالہ عقائد" پیرس کے ۸۷۲ نمبر پر موجود ہے۔ اشعار کی تعداد تقریباً ۶۰۰ ہے۔ اس مثنوی میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عقائد کا ذکر ہے جس کو خود مصنف نے بیان کردیا ہے :-

کیا ہیں اس لئے یہ نسخہ منظوم | کہ تا ہر یک کوں ہوے جلدی سوں مفہوم
کیا ہوں میں بیان اس نظم اندر | عقائد اہل سنت کا سراسر
کہا نہیں میں کبھی دکھنی میں اشعار | منجی ہے شعر کہنے سوں بہت عار
ولی یو نظم ہو لیا بالضرورت | پڑی تا اس کو ہر امی و عورت

(ص ۲ ۴)

غالباً یہ بھی ابتدائی زمانے کی تصنیف ہو۔ سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا۔

(۱۰) "مثنوی گلزار عشق (عرف قصہ رضوان شاہ و روح افزا) یہ مصنف کی معرکہ آرا تصنیف ہو۔ رسالہ اردو والے مضمون میں صراحت اس کے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کو تین علیحدہ کتابوں سے موسوم کیا گیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ تینوں نام ایک ہی مثنوی کے ہیں۔ اسکا ایک نسخہ آکسفورڈ کے بوڈلین لائبریری میں موجود ہے۔ کٹلاگ میں اسکے متعلق حسب ذیل صراحت ہو۔

(۶۷۶۶۶) ایک مثنوی جو عشقیہ داستان رضوان شاہ و روح افزا ہے مصنف مولوی محمد باقر جنہوں نے اس کو ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں لکھا ہو۔ ابتدا میں ایک دیباچہ ہو گارساں دو تاسی کی فہرست میں یہ شریک ہے اور کسی نے نہیں بیان کیا۔ ورق ۱۳۰۔ سطر ۱۱ تا ۱۷ سائز ۱۰×۱۰ ۱/۲"

کتاب میں سب سے پہلے بہ صفحے کا نثر میں دیباچہ ہے جو اپنے بیان کے لحاظ سے قابل قدر

ہے جس کی صراحت آگے آئے گی۔

مثنوی میں اول حمد ہے جس کے ۵۳ شعر ہیں اس کے بعد مناجات میں ۴۵ شعر، پھر نعت میں ۲۹ شعر۔ اس کے بعد معراج کے بیان میں ۸۹ شعر اس میں منقبت بھی ہے پھر "عرض حال از رسول" کا عنوان آتا ہے جس میں ۱۰۲ شعر درج ہیں اس کے بعد محبوب سبحانی کی مدح میں ۹۰ شعر۔ امام حسین کی مدح میں ۴۳ شعر سبب تالیف کتاب اور اپنی ستایش میں ۱۹۲ شعر۔ اس کے بعد اصل قصہ کا آغاز ہے جس کے تقریباً ۲۸۹۰ شعر ہیں قصہ کے ختم ہونے کے بعد خاتمہ کا عنوان ہے جس میں ۵۹ شعر ہیں اس طرح کل مثنوی تقریباً ۳۵۰۱ شعر پر ختم ہوتی ہے۔

یہ مصنف کے آخری زمانے کی تصنیف ہو جو ۱۲۱۱ھ میں تصنیف ہوئی ہے اور انکا انتقال ۱۲۲۰ھ میں ہوا ہے۔

مصنف کٹلاگ کو اس کے سنہ کے متعلق کسی قدر غلط فہمی ہوئی ہے خود مصنف نے صاف طور پر عبارت کی تشریح کر دی ہے چنانچہ دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"الحال کہ تاریخ ہجرت باجاہ وجلال کے یک ہزار دو سو پر گیارہواں سال ہے قصہ عنوان شاہ و روح افسرا کا پسند کر کے اُسے نظم کیا"

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے اس کتاب کا دیباچہ بھی خاص حیثیت رکھتا ہے جس میں پہلے حسب رواج حمد نعت وغیرہ کے بعد اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ زبان کو خدا نے اپنی قدرت کی بڑی علامت قرار دی ہے اس کے بعد نصرتی کی تصنیفات پر بحث کرتے ہوئے شعرا عادل شاہی وغیرہ کے ذکر کے ساتھ اُردو کی ابتدا اور اس کی ترقی بتائی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:-

"مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان بے معنی اور ہرزہ درایاں لایعنی زبان دکھنی پر اعتراض اور گلشن عشق۔ وعلی نامہ کے پڑھنے سے اعتراض کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب لک ریاست سلاطین دکن کے قائم تھے زبان انکی درمیان

اُنکے خوب رائج اور طعن شمات سے سالم تھی اکثر شعرا وہاں کے مثل نشاطی، فراقی شوقی، خوشنود، غواصی، ذوقی، ہاشمی، شغلی، بحری، نصرتی، جہتاب وغیرہم کے بےحساب ہیں اپنی زبان میں قصائد و غزلیات و مثنویات و مقطعات نظم کئے اور داد سخنوری کا دئے لیکن نصرتی ملک الشعرا تنگ نظری سے مبرا ہے۔

جب شاہان ہند اس گلزار جنت نظیر کو تسخیر کئے طرز روزمرہ دکھنی نہج محاورہ ہندی سے تبدیل پانے لگے تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی اور ہندوستان مدت الک زبان ہندی کہ آسے برج بھاکا بولتے ہیں رواج رکھتی تھی اگرچہ لغت سنسکرت اُنکی اصل اصول اور مخرج تنوان فروع و اصول ہے پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب خاص کو اُس کی کھونے لگے۔ سبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمی ہوئی۔ جب ثنائی وظہوری نظم ونثر فارسی میں باقی طرز جدید کے ہوے ہیں۔ ولی گجراتی غزل ریختہ کی ایجاد میں سبھوں کا مبتدا اور اُستاد ہے بعد اُس کے جو سخن سنجان ہند بروز کئے (؟) بے شبہ اس نہج کو اُس سے لئے اور من بعد اس کو باسلوب خاص مخصوص کردئے اور اُسے اردو کے بھاکے سے موسوم کئے اب یہ محاورہ معتبر شہروں میں ہند کے جب شاہجہاں آباد لکھنؤ واکبرآباد وغیرہ رواج پایا اور جون چاہی سبھوں کی من بھایا۔

اواخر عہد محمد شاہی سے اس عصر تک اس فن میں اکثر مشاہیر شعراء صہ میں آئی اور اقسام منظومات کو جلوے میں لائے ہیں مثل درد۔ مظہر۔ فغاں۔ دردمند یقین۔ سوزاں۔ ابر۔ آرزو۔ سودا۔ تاباں وغیرہم لیکن ان سبھوں سے کوئی بھی مثنوی ستعد (؟) بھی نہیں کیا فقط غزلیات و قصائد و مقطعات پر اکتفا کیا۔ بارے اس عصر میں حسن دہلوی یک مثنوی مختصر لکھا دریافت اس کی میز مصنف پر موقوف

رکھنا اول ہے۔ برخلاف شعراء دکن کے کہ اکثر مثنویات کہے ہیں۔ بالاتفاق غزل بولنا
آسان ہے اور مثنوی کا کہنا دشوار وگراں ہے اس نے ملک شعرا دکن بطور تعریض
کہتا ہے ؎

دس پانچ بتیاں کہ لئے شوقی اگر تو کیا ہوا معلوم ہوتا شعر اگر کہتے تو اس بتاز ؟ کا

اس کے بعد وہ شعرا کے اقسام بتاتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں :۔

"اور بوجھ اے بھائی کہ ان سب شعرا میں بعضے فقط شاعر ہیں اور بعضے شاعر کے
سات چاشنی عشق۔ عرفان میں بھی ماہر ہیں مثلاً مولنا شاہ ندیم اللہ ندیم تخلص
وقاضی محمود بحری تخلص صاحب من لگن شعرائے دکن سے اور مرزا مظہر جان جاناں
وخواجہ میر درد شعراء ہند سے بعد ازیں مخفی نہ رہے تمام ریختہ گویوں میں سودا
اعتبار نمایاں پایا"

اس بیان کے بعد سودا اور نصرتی سے بحث کی ہے اور انکا مقابلہ کیا ہے چنانچہ لکھتے
ہیں :۔

"بعضے اس قدر اس کے باب میں دفتر اغراق کا کھولتے ہیں کہ اس بیچارے کو
سب شعرائے ریختہ گو بلکہ تمام ادبائے فارسی سے افضل وبہتر بولتے ہیں اور واعجباً ملک
واحسرتا ملک شعرا نصرتی کو نہیں مانتے اور قدر اس کے سحر حلال کی نہیں جانتے
بڑی دستاویز انکی یہ ہے کہ زبان اس کی کج مج ہے۔ زہی دریافت وخوشا
سخن فہمی وعجب سمجھ آیا نہیں جانتے کہ اتفاق سے شعرائے عرب وعجم وہند کے معنی
جان سخن آبدار اور لباس مستعار ہے۔۔۔۔"

اس کے بعد گلشن عشق سے نصرتی کا کچھ کلام درج کر کے لکھتے ہیں:
"تعصب کو یک طرف رکھ کر سب کلیات سودا کو بغور ملاحظہ کر کر انتخاب کرے
اور ان سبھوں کو یک داستان گلشن عشق یا علی نامہ سے مقابلہ دیوے تا انداز

سے اُس کی اور اس کی بواقعی واقف ہوئے۔ سودا کو چھوڑ دے جس شاعر فارسی
گو سے چاہے خواہ قصائد میں خواہ مثنوی میں اُسے موازنہ میں لا دے بالفعل
بھی مہر و ماہ یکتائی فن طرازی عاقل خان رازی کیتیں قصہ منہر و مد مالتی کا گلشن
عشق سے مواجہہ کر دیکھے تا معنی شل دکھنی کے ہات کنگن کو آرسی کیا درکار خوب
سمجھے سہ

کبھی نصرتی سن کے یہ دلولہ ملا بعد مدت کے مجکو صلہ
کہا سودا کتیں انصاف سے کہ صدقے کرو مجکو آگاہ کے "

بیان بالا سے یہ بھی واضح ہوتا ہے آگاہ گلشن عشق کو مہر د ماہ کا ترجمہ نہیں خیال کرتے
یہی رائے میں نے اپنے ایک جداگانہ مضمون میں دی ہے۔ میرے بیان کی آگاہ کے
قول سے تائید ہوتی ہے حالانکہ میں آگاہ کے اس بیان سے اس وقت لاعلم تھا۔
نصرتی کو سودا سے فوقیت دینے کے بعد وہ سودا کے کمال کے بھی انصاف کیساتھ
معترف ہیں چنانچہ کہتے ہیں:۔

" باوجود ان سب مراتب کے ہم انصاف کرتے ہیں کہ مرزا رفیع سودا قصائد و
غزل میں بڑا سخن تراش و صاحب تلاش ہے محاورہ شستہ و صاف ہیں یگانۂ
زمانہ اور شوق مزاج و رنگینی طبیعت میں ہر کہیں افسانہ پر افسوس کہ ہجو ہائے
رکیک سے آشنا نہ[؟] اور از مدین[؟] و کین سے بیگانہ تھا "

اس کی صراحت کے بعد وہ اس امر کو بیان کرنے میں کہ گلشن عشق اور علی نامہ کو
دیکھکر کسی مثنوی کے لکھنے کا شوق ہوا اور اس مثنوی کی ابتدا کی گرچہ سواشعار کے بعد
دیگر تصنیفات میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد اپنی کتابوں کی تفصیل دی ہے جن کا ذکر صفحات
بالا میں ہو چکا ہے۔ اس دیباچہ میں بھی اپنے تخلص کی صراحت کی ہے ان امور کے بعد بتایا ہے
کہ اس مثنوی کو دکھنی زبان کے بجائے شمالی ہند کی اردو میں لکھا گیا ہے اور پھر اس کی وجہ بتائی

ہے چنانچہ لکھتے ہیں :-

"ابیات ان بہوں کے تخمیناً چوبیس ہزار ہیں اس لئے تکمیل قصہ عشق کی نہیں ہوئی الحال کہ تاریخ ہجرت باجاہ وجلال کے یکہزار دو سو پر گیارواں سال ہے قصہ رضوان شاہ وروح افزا کا پسند کر کر اُسے نظم کیا جب زبان قدیم دکھنی اس سبب سے کہ آگے مرقوم ہوا اس عصر میں رائج نہیں ہے اُسے چھوڑ دیا اور محاورہ صاف و شستہ کو قریب روزمرہ اردو کی ہے اختیار کیا صرف اس بہا کے ہیں کہنے سے دو چیز مانع ہوے اول یہ کہ تاثیر وطن یعنی دکن اس ہیں باقی ہے کیا واسطے کہ اجداد پدری ومادری اس عاصی کے اور سب قوم اس کی بیجاپوری ہیں دوسرے یہ کہ بعضی اوضاع اس محاورہ کے میرے دل میں بھاتے نہیں ازاں جملہ یہ کہ تذکیر و تانیث فعل نزدیک اہل دکن کے تابع فاعل ہے اگر یہ مذکر ہے تو وہ بھی مذکر ہے اور اگر مونث ہے تو مونث یہ قاعدہ موافق قاعدہ عربی کے ہے کہ سید السنہ ہے اور قیاس صحیح بھی اس کی تائید کرتا ہے برخلاف محاورہ اردو کے کہ اس میں نسبت فعل کی مفعول کی طرف کر مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر کرتے ہیں"

اس وضاحت سے امید ہے کہ دیباچہ گلزار کی حقیقت ظاہر ہو جائے۔ اب میں اصل مثنوی کی جانب متوجہ ہوتا ہوں۔

قبل ازیں اس کی صراحت ہو چکی ہے کہ مثنوی میں عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور اس کے تحت بیان ہوا ہے۔ مگر عنوانات بھی گلشن عشق کی تقلید میں شعر میں لکھے گئے ہیں، مثلاً

مناجات کا عنوان :-

غنچہ دل کی عرض حیرانی   در حضور نسیم رحمانی

معراج کا عنوان ہے :-

ذکر معراج صاحب لولاک   پائیں جس کے سپر کی تئیں افلاک

شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کا عنوان :-

وصف محبوب بارگاہ قدم　　　سر افراد پر ہے جس کا قدم

اپنی تعریف کا عنوان :-

فخریہ کا ہے اس میں کچھ انداز　　　اور تصنیف کے سبب کا راز

اس میں کوئی شک نہیں شعرا خود ستائش میں حد سے بڑھ جاتے ہیں مگر پھر بھی اُن سے ایک حد تک انکے کلام پر روشنی پڑتی ہے ۔ آگاہ اول اپنے عربی نظم و نثر کا فخر اس طرح کرتے ہیں :-

میری نظم دلکش کو وہ فیض ہے　　　کہ اس سے ہوا نام طائی کا طے

ابوطیب اس خوف و ہیبت ستی　　　کیا توبہ لاف نبوت ستی

میری نثر میں ہوئی صابی صبی　　　نظر آوے وہاں ابن عتبی غبی

گر انشا کا بانی ہے عبدالحمید　　　دلے میں ہوں خاتم بوجہ سدید

اگر قاضی مصر ہوتا یہاں　　　یہ دعویٰ اد پر حکم کرتا عیاں

بھیجے گر انشا میری تا رشید　　　مقامات کی بھیج دیتا رسید

اگر ابن عباد ہووے حکم　　　نہ سمجھے مجھے بو محمد سے کم

اس کے بعد انہوں نے اپنی فارسی نظم اور اس کے جملہ اقسام میں اپنی مہارت کا ذکر اس طرح کیا ہے :-

ہے جیسا عرب میں مجھے دار و گیر　　　ہوں ویسا ہی ملک عجم کا امیر

سنے شعر کا میری گر یک نوا　　　تو کہتا اٹھے رودکی مرحبا

کہوں گر قصائد تو افضل کہے　　　کہ سلمان و مسعود عرفی رہے

ثنائی کرے یوں ثنا گستری　　　ہے اس بدر کے پاس کیا انوری

غزل پر اگر دوں رقت سے داد　　　تو حافظ پڑھے آیت ان یکاد

نبھاؤں بلفظ معنی میں حسن و تلاش — حسن اور خسرو کہیں شاد باش
کہوں مثنوی گر تو ہے دل گواہ — نظامی و سعدی کہیں واہ واہ
لکھوں گر معارف کہیں خاص و عام — ہوا پھر کے گردش میں جامی کا جام
کروں نظم اگر قطعہ ہائے متیں — پڑی رشک میں جان ابن یمیں
کہوں گر رباعی تو کھا پیچ و تاب — سحابی کی آنکھیں ہوں مثل سحاب
بہ فرد و بہ تسمیط و ترجیع بند — میری فکر ہے مستزاد و بلند
میرا نثر وہ چشمہ صاف ہے — عیاں جس میں اوصاف وصاف ہے
عبارت ہے میری وہ رنگیں بہار — کہ جان ریاض اس پہ ہے خار خار

اپنے دکھنی اور اردو شاعری پر فخریہ کہتے ہیں :-

ہے دکھنی میں مجکو مہارت یتی — کہ النصر منکم کہے نصرتی
گر اردو کی بہاکے میں کھولوں زباں — تو سودا کا سب سود ہووے زیاں

وہ اپنے علم و فن کا ذکر کرتے ہوئے فلسفہ سے ناواقف ہونے کا صاف طور سے اظہار کرتے ہیں مثلاً۔

غرض در علوم فروع اصول — خدا کی عنایت سے ہوں با حصول
نہیں فلسفہ کا مجھے کچھ بھی پاس — وگرنہ وہ کیا چیز ہے میرے پاس

آگاہ اگرچہ مدراس کی ریاست میں صاحب عزت اور مرتبہ تھے مگر معلوم ہوتا ہے عام طور سے لوگ علم کے قدردان نہیں تھے چنانچہ آگاہ نے اسکا گلہ کرتے ہوئے زمانے کی حالت کو بیان کیا ہے :-

یہ سب کچھ ہے لیکن کروں کیا علاج — نہ اس دور میں ہے ہنر کا رواج

مزید تفاخر کے بعد لکھتے ہیں :-

ہے اب ہزل اور مسخرے کو قبول — ہنر ہے پتھر اور فضیلت فضول

تفاخر میں ارذال ہیں جا بجا — ندامت میں اشراف ہیں مبتلا
جہاں لگ جو نوع مسلمان ہیں — سو تکلیف و محنت سے حیران ہیں
سب ہی ہات سوں غم کے پامال ہیں — اراذل جو ان میں ہیں بامال ہیں
پر اہل نجابت اوپر قہر ہے — حیات آنکی تلخی سوں جوں زہر ہے
کرے کوئی اس وقت کیا فکر شعر — کہ بدتر ہے دشنام سے ذکر شعر
کرے کوئی کیوں عزم تصنیف کا — ہو کس طرح سے شوق تالیف کا

آگاہ نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی تصنیف پر اعتراض کیے تھے جس سوں خیال ہوتا ہے دونوں میں صفائی نہ ہوگی مگر آگاہ اپنے دوستوں کے ذکر میں نہایت خلوص کے ساتھ انکا ذکر کرتے ہیں۔

جیسا رازدان خفی و جلی — ندیم سخن میر امداد علی (۴)
سیادت کی میزان کا حرف صحیح — نجابت کے انشا کا لفظ فصیح
زہی سرو موزوں باغ سخن — حسینی نسب بلگرامی وطن
ہے اہل سخن سے اُسے اتحاد — میرے سات الفت ہے اُسکی زیاد
دگر دوست میرا ہے عبد السلام — مروت میں کامل وفا میں تمام

اصل قصہ فارسی زبان میں ہے اس کو آگاہ سے بہت پہلے سنہ ۱۱۰۴ھ میں فائز نے دکھنی نظم میں منظوم کیا ہے۔ آگاہ اس سے واقف ہیں اور اس دکھنی قصہ کو مکمل تصور نہیں کرتے

لکھے ہیں اُسے فارسی نثر میں — یہ مجمل وہ نہیں رائج اس عصر میں
کیا نظم دکھنی میں فائز اُسے — سخن میں نہ تھی راہ ہرگز اُسے
نہیں شعر کا برگ و ساز اُس میں کچھ — نہ مضمون تلاشی کا راز اُس میں کچھ
مضامیں ہیں اُس کے پر بے اثر — ہیں الفاظ سب اُس کے زیر و زبر

جو تھا عقل اور نقل کے دھاں خلاف — کیا ہوں ہیں انصاف سے اسکو صاف

جہاں اسمیں ایجاز سے تھا خلل — کیا اس کو اطناب سے میں بدل

جہاں عشق کے جوش کا ہے مکاں — کیا ہوں وہاں اُسکا پورا بیاں

نکات اسمیں عرفاں کے لایا ہوں میں — مجازی ہیں اس کو چھپایا ہوں میں

کیا نام میں اُسکا گلزار عشق — کہ گل جوش ہیں اس سے اسرار عشق

اصل قصہ کا لب لباب اس طرح ہے :-

چین کے بادشاہ کا لڑکا رضوان شاہ علم و ہنر میں سرآمد روزگار تھا۔ باپ کے انتقال پر سلطنت کا مالک بنا ایک دن شکار کو روانہ ہوا۔ اور ہرن کا تعاقب کیا مگر ہرن ایک چشمہ میں غائب ہو گیا۔ رضوان شاہ نے اس ہرن پر فریفتہ ہو کر خود غوطہ لگانا چاہا مگر ارکان سلطنت مانع ہوئے۔ نجومی اور رمال اسکا سراغ لگانے کا وعدہ کر کے بادشاہ کو واپس لائے۔ رضوان شاہ ہرن کے عشق سے از خود رفتہ ہو گیا آخر کار اس چشمہ پر ایک محل تعمیر کر کے رہنے لگا روز محل روشنی سے جگمگا جاتا اور عطر و گلاب کی خوشبو سے معطر ہوا کرتا ایک رات روح افزا پری اس چشمہ سے باہر آئی دونوں کا وصال ہوا مگر جدائی ہو گئی اور ایک زمانے تک فراق میں بسر ہوئی۔ مصیبتوں میں گرفتار رہوئے اور پھر ایک مدت کے بعد دونوں کی شادی ہوئی اور اس طرح بامراد چین کو واپس ہوئے۔

اب مختلف مقامات سے مثنوی کا انتخاب[1] پیش کیا جاتا ہے۔ قصہ کی ابتدا:-

محبت کے گلزار کا باغباں — جو تھا اُس کے اخبار سے گل فشاں

ہلا اپنے خامہ کے شاخ نول — جیوا یا یہ قصہ کا او تار پھل

کہ تھا ملک میں چین کے ایک شاہ — تھا حکم اُسکا ماہی سے تا باہ

---

(۱) انتخاب میں میں نے کوئی خاص بات مدنظر نہیں رکھی ہے بلکہ یوں ہی کچھ نمونہ دیا گیا ہے۔

رضوان شاہ کی تعلیم و تربیت کا حال :-

بلا بھیج ہر علم کے اوستاد — کئے اُس کی تعلیم کو دل نہاد
کئے اُس کو جوں چاہی (۱۹) تربیت — ہوے پوری تا اُس کے تئیں معرفت
طبیعی الٰہی میں فاضل ہوا — ریاضی کے ہر فن میں کامل ہوا
ہوا ہیئت و ہندسہ میں خبیر — حساب و مساحت میں (۲۰) بے نظیر
ہوا موسقی میں وہ یوں اوستاد — کہ زہرہ کرے اس سے اس فن کو یاد

رضوان شاہ کی بےقراری :-

ہوا رنج ضائع میرا سال کا — عجب ہی کہا را مرے حال کا
میرا سینہ حسرت سے ناشاد ہے — گنہ لازم و رنج برباد ہے
نہ اب جان نہ جاناں میری بات ہیں — مجھے بخت ڈالے ہیں کس گھات میں
کہاں سے گیا کھیلنے میں شکار — کہاں سے وہ ہرنی کئے وہاں کنار
میں کیا کیا سہانگ و ناموس کھو — بس ایک تک تشکل او داس ہو

کشتی میں سوار ہو کر تلاش میں روانہ ہوتا :-

بہر حال دو نو ہو کشتی سوار — چلے تن بہ تقدیر بے اختیار
اوپر انکے تھا نیلگوں آسماں — تلے انکے دریائے دور از گراں
ہو دونوں بھی جینے سے اپنے ملول — گئے یک قلم اپنی ہستی کو بھول
کئے قطع اس طرح کئی روز جب — سمایا کھرا ہوا ایک اژدہر عجب
نمایاں ہوئی رات کو یک نہنگ — اوڑے کوہ کا جس کے ہیبت سے رنگ

رضوان شاہ روح کو نامہ تحریر کرتا ہے :-

ہیں یک جزری کالعدم اے صنم — سہا ہوں تیرے غم سے کیا کیا ستم

کہ تیرا نگہبان ہونت ذوالجلال	رکھے تجکو دائم بلا سے سنبھال
نہ دیوے پہنچنے تجھے کچھ بھی غم	سلم رکھے دل تیرا از الم
تیرے تن پہ وہاں جو جو آزار ہے	میری جان پر اُسکا سب بار ہے
پڑی جیسے پاؤں میں بیڑی تجھے	میرا دم ہوا پاؤں بیڑی مجھے
رگ رگ ہوئی میری زنجیر اب	کروں کیا میں اس غم کی تدبیر اب

رضوان شاہ کے متعلق دیو سے اظہار واقعہ :۔

محبت میں کیا کیا مصیبت سہا	عجب ہے کہ اب لگ وہ جیتا رہا
اگرچہ ضمیر اُسکا ہے گا ز خاک	ولے آتشی سے ہوا جل کے راک
تیری شاہزادی کہ ہے شہ پری	اوسے داغ سے غم کے بریاں کری
کبھو وحش صحرا کی فوجوں میں پھر	کبھو جوش دریا کی موجوں میں پھر
بہرحال پہنچا ہے اب وہ یہاں	ہلاکی سے مجکو دیا ہے اماں
تو جو ہو سکے تجھ سے تدبیر کر	اعانت میں اُس کی نہ تقصیر کر
دے اول خبر اس کے محبوب کی	سپس فکر کر اس کے مطلوب کی

رضوان شاہ کامیاب ہو کر وطن کو واپس ہوتا ہے :۔

خبر شہر میں یوں پہنچتی ہے تب	بنی لیکے رضوان آیا ہے اب
یہ مژدہ سنے جب صغار و کبار	چلے اب ہیں سب دوڑ دریا کنار

بصد شان و شوکت کے انکو لئے	تھے چھوٹے بڑے جو محل میں ملے

خاتمہ کتاب میں لکھتے ہیں :۔

اگر دیکھے اس نظم کو طمطراق	تپ دق سے سودا کو ہو احتراق
مجھے نصرتی ساتھ ہے گفتگو	اُسے کیا ہے طاقت کہ ہو رو برو

اگر جاوے چالیس میں یہ تو رتن — ملک اس کو اپنا کرے من وموہن
جو دل عشق کی شمع کا ہے لگن — یہ نسخے کو اپنا کرے من لگن
جو ہو شوق شغل اور شور عزام — نشاطی ہو اس پھول کا وہ مدام
نہ کرتا ہوں ہرگز مباہات میں — کہاں راست ہو شباس بات میں
اگر شعر کے فن میں ساحر ہے تو — بھی عشق اور عرفاں میں ماہر ہو تو
بھی ہے اُنکا بھید میں تجکو راہ — کبت اور دوہرتا میں ہو دستگاہ
تو باور کرے گا تو یہ حرف صاف — وگرنہ کہیگا ہے لاف وگذاف
تھے جب یکہزار اور نوکم دوسو — بنا اُسکا دیباچہ لے گرم رو
گذر گئے ہیں جب اسپر ایس سال — ہوا بدر کامل یہ زیب ہلال
کیا اس کی بیتوں کو جب میں عدد — ہوئے سہ ہزار اور پانسو نو و

بھی محبوب سبحاں کے اوپر سدا
محب جس کے ہینگے تمام اصفیا

اگرچہ ان اشعار سے سنہ تصنیف ۱۲۱۱ھ ہوتا ہے ممکن ہو مثنوی کا اختتام اس سنہ میں نہ ہوا ہو کیونکہ دیباچہ جو نثر میں لکھا گیا۔ اسمیں صراحت سے ۱۲۱۱ھ کا ذکر ہے۔

آگاہ کی تصنیفات پر آجکل کے نقطۂ نظر سے غور نہ کرنا چاہئے۔ ڈیڑھ سو سال پیشتر کا ماحول آج کل کے ماحول کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ آگاہ نے جس زمانے میں اپنی تصنیفات شروع کیں اسوقت ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی کلایو اور وارن ہسٹنگز کا دور دورہ تھا مغلیہ خاندان پر زوال آچکا تھا اور اس کا چراغ گل ہو رہا تھا اہل قلم دنیا سے گزر رہے تھے اور انکی جگہ پُر کرنے والا نظر نہ آتا تھا۔ سلطنت کی زبان فارسی باقی نہ رہی تھی اس لئے اس کے جاننے والوں کا کال ہو رہا تھا۔ ملک کی عام زبان بھی فارسی تھی اس کے بجائے عام طور سے اردو کا رواج ہو رہا تھا مگر اقلیم اردو میں علم و فن کا ذخیرہ نہ تھا بلکہ نایاب تھا۔ شمالی میں صرف غزل نویسی کا زو

تھا جنوب میں مثنویوں کا رواج تھا مگر اس میں بھی علمی مواد بہت کم تھا۔

دانایان فرنگ ہنوز اردو کی سرپرستی کی جانب متوجہ نہیں ہوئے تھے نہ تو کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات شائع ہوئی تھیں اور شاہ عبدالقادر نے قران کی تفسیر قلمبند کی تھی۔ عام طور سے تعلیم کی کمی تھی خصوصاً عورتوں کی تعلیم کا دروازہ بالکل بند تھا اور یہ ناممکن تھا کہ فارسی میں جو اب مادری زبان نہ رہی تھی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس نقص کے باعث سوسائٹی کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ اور حالت   سے بدتر ہوتی جا رہی تھی

اس نقص کو معلوم کرنے والا۔ اس مرض کو دریافت کرنے والا۔ اس کے علاج پر کمر ہمت باندھنے والا۔ اور اپنی تصنیفات سے اسکا علاج کرنے والا آگاہ اور صرف آگاہ ہے۔

آگاہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کو ضروری تصور کیا اور انکے لئے خاص کتابیں لکھیں۔ آگاہ نے اپنی تصنیفات میں صاف طور سے اس امر کی صراحت کی ہے کہ انکا مقصد خاص طور سے صنف لطیف کی بہبودی ہے۔ دیباچہ ہشت بہشت میں لکھتے ہیں :۔

"بعض علما متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ہیں ان سے فائدہ پاویں لیکن اکثر عورتاں اور تمام امیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں اس لئے یہ عاصی مطلب قسم دل کا بہت اختصار کے ساتھ لیکر دکھنی رسالوں میں بولا ہے"

اسی کتاب میں بیان کرتے ہیں :۔

"دکھنی میں کہا ہوں اس لئے میں | تا ہوے سہج عوام کے تیں
تا سر بسر امیاں ہور عورات | پڑنے ستی اُسکی پاویں لذات"

رسالہ عقائد میں لکھتے ہیں :۔

وے یو نظم بولیا بالضرورت | پڑے تا اُسکو ہر امی و عورت

غرضکہ آگاہ کا سب سے پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو زبان میں سیر، فقہ، عقائد پر متعدد کتابیں تصنیف کیں اور انکو خاص طور سے عورتوں کی تعلیم کے لئے مرتب کیا۔

آگاہ کے زمانے میں مبالغہ اور دروغ گوئی کلام کا خاص امتیاز تھا اور جو کتابیں واقعہ کربلا وغیرہ پر لکھی گئی تھیں وہ صداقت سے دور تھیں اس کے برخلاف آگاہ نے دروغ گوئی اور مبالغہ سے پرہیز کیا اور پھر عام طور سے اس وقت کی عام فہم اور سلیس زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا۔

آگاہ نے آنحضرت کی لائف میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا ہے کہ آپ کے بہترین اخلاق اور پاکیزہ سیرت کو صداقت کے ساتھ پیش کیا جائے اور بعض بعد کے مصنفین کی طرح معرکہ آرائی اور جنگ کو پیش نہیں کیا۔ آگاہ اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ آنحضرت کی مبارک زندگی میں اخلاق اور عادات ہی امت کے لئے چراغ ہدایت ہیں اور ان کی پیروی صراط مستقیم پر گامزن کرا سکتی ہے۔

آگاہ آج دنیا میں موجود نہیں ہے اس کی تصنیفات ہندستان سے معدوم ہو چکی ہیں مگر جب تک زبان اردو قائم ہے اس کے محسنوں کی پہلی صف میں آگاہ کو جگہ دی جائیگی اور اس کے کارنامے گو پوشیدہ ہیں مگر فراموش نہیں ہو سکتے۔

ادبیات ایران کی ترقی میں

سلطان محمود غزنوی کا حصہ

(بسلسلہ گذشتہ)

ایک دیہاتی رئیس نے بوڑھے بوڑھے پر اتم جمع کئے اور پرانی روایتوں کی مدد سے ان منتشر اجزا کو ترتیب دیکر ایک مکمل کتاب تیار کرائی۔ مولانا شبلی نے اس کی تردید میں متعدد دلائل سے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ درحقیقت شاہنامہ کا ماخذ وہی عربی تراجم ہیں۔

اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہنامہ ایک تاریخی نظم ہے اور فردوسی کا ان داستانوں کے نظم کرنیکا مقصد بھی یہی تھا کہ ایران کی قدیم تاریخ کے منتشر اوراق یکجا ہو جائیں اور ایرانیوں کو بھی عربوں کے مقابلہ میں اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنیکا موقع ملے لیکن ان قصوں میں اس قدر تخیل آرائی اور مبالغہ سے کام لیا گیا ہو اور ایسے دور دراز کار افسانے اس میں درج ہیں۔ کہ مہابھارت کے قصے بھی انکے سامنے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کی تاریخی وقعت و اہمیت بالکل نظروں سے گر جاتی ہو لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ ایران کی تاریخ کا جو کچھ سرمایہ ہے وہ یہی ہو اس سے زیادہ صحیح تاریخ مل بھی نہیں سکتی۔ سرجان مالکم تاریخ ایران میں لکھتے ہیں:۔

"در کتاب فردوسی اگرچہ افسانہ وخیالات شاعری بسیار دارد لکن تقریباً جمیع اخبارے کہ در تاریخ قدیم ایران و توران در ملک آسیا یافت می شود دراں مندرج است"

ایک بڑی وجہ اس کی بے اعتباری کی یہی بتلائی جاتی ہے کہ اس میں فرضی افسانے اور دور ازکار قصے شامل ہیں لیکن فردوسی نے جن کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے وہ ابتدائی عہد کی لکھی ہوئی ہیں اور آپ ہر قوم کے ابتدائی عہد کی تاریخوں میں اسی قسم کے وہمی و خیالی افسانے پائیں گے

علاوہ بریں فردوسی نے جن ماخذوں کی مدد سے اپنی کتاب تیار کی ہو ان میں یہ قصے اسی طرح درج تھے۔ فردوسی نے فرض سمجھکر ان قصوں کو جوں کا توں نقل کر دیا۔

مستشرقین نے زمانہ ماقبل اسلام کی کتابیں بڑی کاوش کے بعد ڈھونڈھ کر نکالی ہیں۔ ان میں سے بعض شائع بھی ہو چکی ہیں۔ شائع شدہ کتابوں میں کچھ شاہان عجم کی تاریخ سے متعلق بھی ہیں غالبا فردوسی کا ماخذ بھی یہی کتابیں تھیں۔ ان تاریخوں اور فردوسی کے بیان میں مطلق فرق نہیں ہے کارنامگ ارتخشتر جو کچھ عرصہ قبل اسلام کی تاریخ ہے اور پہلوی زبان میں جرمن ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے مولانا شبلی نے اس کے متعلق پروفیسر براون کا حسب ذیل بیان نقل کیا ہے۔

"اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے بڑی ایمانداری برتی ہے اور نظر میں اس کی وقعت یہ دیکھکر اور بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے، ان سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے" (۱)

غرضکہ مستشرقین نے اس امر کا پورے طور پر اعتراف کیا ہے کہ فردوسی نے جو کچھ لکھا ہے وہ قدیم ایرانی تاریخوں سے حرف بحرف مطابق ہے خود فردوسی کو اپنی ذمہ داری کا اس قدر خیال ہے کہ وہ ماخذ کا بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہے (۲)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہنامہ قدیم ایران کا مرقع ہے۔ وہ صرف ایک رزمیہ مثنوی ہی نہیں ہے بلکہ آپ اس سے اس زمانے کی تہذیب و تمدن کا بھی بخوبی پتہ لگا سکتے ہیں۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

"شاہنامہ اگرچہ بظاہر صرف رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے لیکن عام واقعات کے بیان میں اس تفصیل سے ہر قسم کے حالات آجاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہنامے

---

(۱) شعر العجم حصہ اول (۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شعر العجم حصہ چہارم

کی مدد سے اُس زمانے کی تہذیب و تمدن کا پورا پتہ لگا سکتا ہے۔

"بادشاہ کیونکر دربار کرتا تھا۔ امرا کس ترتیب سے کھڑے ہوتے تھے عرض و معروض کرنے کے کیا آداب تھے۔ انعام و اکرام کا کیا طریقہ تھا۔ بادشاہ اور امرا کا درباری لباس کیا ہوتا تھا۔ فرامین اور توقیعات کیونکر اور کس چیز پر لکھے جاتے تھے۔ نامہ و پیام کا کیا انداز تھا۔ مجرموں کو کیونکر سزائیں دیجاتی تھیں بادشاہی احکام پر کیونکر نکتہ چینی کیجاتی تھی وغیرہ وغیرہ"

"شادیوں کے کیا مراسم تھے۔ جہیز میں کیا دیا جاتا تھا۔ عروسی کی کیا کیا رسمیں تھیں دولھا دلہن کا کیا لباس ہوتا تھا۔ پیش خدمت غلام اور لونڈیوں کی وضع اور انداز کیا تھا"

"خط و کتابت کا کیا طریقہ تھا، کس چیز سے ابتدا کرتے تھے۔ خاتمہ کی کیا عبارت ہوتی تھی، خطوط کس چیز پر لکھے جاتے تھے۔ ان کو کیونکر بند کرتے تھے۔ کس چیز کی مہر لگاتے تھے"

"مالگذاری کے ادا کرنے کا کیا دستور تھا۔ زمینوں کی کیا تقسیم تھی مالگذاری کی مختلف شرحیں کیا تھیں ٹیکس کیا کیا تھے۔ کون کون لوگ ٹیکس سے معاف ہوتے تھے"[1]

مولانا نے اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں بھی پیش کی ہیں لیکن مضمون اس قدر تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لئے ہم نظر انداز کرتے ہیں۔

شاعری کی حیثیت سے بھی شاہنامہ کا جو مرتبہ ہے اس پر حرف رکھنے کی گنجایش نہیں، مولانا شبلی نے شعرالعجم کے پہلے اور چوتھے حصے میں فردوسی کی خصوصیات شاعری پر مفصل بحث کی ہے نظامی کے تذکرہ میں انہوں نے فردوسی اور نظامی کا موازنہ بھی کیا ہے اور اس میں اگرچہ انہوں نے

---

(۱) شعرالعجم حصہ اول صفحہ ۱۴۶

نظامی کو اکثر مقامات پر ترجیح دی ہے لیکن آخر میں انہیں لکھنا پڑا ہے کہ

"ان سب باتوں پر بھی فردوسی فردوسی ہے اور نظامی نظامی"[1]

عنصری

محمود کے دربار کا یہی نامور شاعر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود کو بقائے دوام اسی کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ دولت شاہ اس کے متعلق لکھتا ہے۔

"مناقب و بزرگواری او اظہر من الشمس است و سر آمد شعرائے روزگار سلطان محمود بودہ و اورا، ورائے شاعری فضائل است بعضے اورا حکیم نوشتہ اند"[2]

حسن بن احمد نام ابوالقاسم کنیت اور عنصری تخلص ہے۔ بلخ اصلی وطن ہے ابتداء میں مروجہ علوم و فنون حاصل کئے لیکن شاعری کا ذوق سب پر غالب آگیا۔ اس نے اسی فن کو اپنے لئے منتخب کیا اور اس قدر ترقی کی کہ سلطان محمود کی ندیمی کا منصب ملا۔

"اورا در مجلس سلطان منصب ندیمی با شاعری ضم بودہ و پیوستہ"

سلطان محمود کے دربار میں چار سو شاعر تھے اور عنصری کی حیثیت ان سب سے بلند تر تھی وہ گویا انکا افسر اور استاد تھا[3] محمود نے اسے ملک الشعرا کا خطاب عطا فرمایا تھا اور تمام شعرا کو حکم تھا کہ پہلے اپنا کلام اصلاح کی غرض سے عنصری کو دکھائیں بعد کو بارگاہ سلطانی میں پیش کریں۔ اس کے انہیں اعلیٰ مناصب کی وجہ سے اکثر بڑے بڑے شعرا نے انکی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ وہ خود بھی شاعروں کا قدردان تھا اور ہر طریقہ سے انکی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ دولت و ثروت کا

---

(۱) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۳۵۶

(۲) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۴

(۳) " " " "

یہ حال تھا کہ چار سو زریں کمر غلام رکاب میں چلتے تھے۔ اس کی شاعری کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ درباری شعرا کا افسر تھا اور دیگر شعرا کے قصائد سلطان کی خدمت میں پیش ہونے سے پیشتر اس کو دکھائے جاتے تھے اس کے دیوان میں تیس ہزار اشعار تھے۔ دولت شاہ لکھتا ہے:-

"دیوان استاد عنصری قریب سی ہزار بیت است مجموع آں اشعار مصنوع و معارف و توحید و مثنوی و مقطعات"(1)

مگر اب صرف تین ہزار شعر باقی ہیں اس وقت شعرا کی طبائع کا رحجان زیادہ تر قصائد کی جانب تھا لیکن جیسا کہ مندرجہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے اس کی شاعری صرف قصائد تک محدود نہ تھی بلکہ اس میں قطعات و مثنویاں وغیرہ سبھی شامل تھیں اس نے متعدد مثنویاں لکھی تھیں جواب ناپید ہیں۔ بدیہہ گوئی شاعری کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا شاہی درباروں میں درخور حاصل کرنے کے لئے بدیہہ گوئی میں کمال پیدا کرنا ناگزیر تھا۔ عنصری اس وصف میں سب سے آگے تھا۔ مولنا شبلی نے عنصری کی بدیہہ گوئی کے متعدد واقعات لکھے ہیں(2)۔ اس کی طبیعت

---

(1) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۶

(2) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۶۲ نظامی عروضی نے بھی عنصری کی بدیہہ گوئی کا ایک واقعہ لکھا ہے یہ محمود و ایاز کے متعلق ہے وہ لکھتا ہے ایک رات محمود نے شراب بہت پی لی اسی حالت بدمستی میں ایاز کی طرف نگاہ اٹھائی اس کی پیچ در پیچ زلفیں دیکھکر بے قرار ہوگیا اور والہانہ اس کی طرف بڑھا لیکن یک بیک اس کی حالت سنبھل گئی اور تقوے کا جوش بدمستی پر غالب آگیا۔ فوراً قینچی ایاز کی طرف بڑھائی اور زلفیں کاٹنے کا حکم دیا۔ اسی حالت میں خوابگاہ کو چلا گیا صبح کو اٹھا تو ایاز کی یہ حالت دیکھکر بہت بدمزہ ہوا اپنے کئے پر نادم و پشیمان تھا اور بے قراری میں اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ درباریوں میں کسی کی ہمت نہ تھی کہ دریافت کرتا آخر حاجب علی قریب کے حکم سے عنصری اس کی خدمت میں حاضر

کا رجحان زیادہ تر قصیدہ گوئی کی جانب تھا۔ قصیدہ میں اس نے نت نئی خوبیاں پیدا کی ہیں۔ ان قصائد میں اس نے اپنا زور صرف ممدوح کی مبالغہ آمیز تعریفوں ہی پر صرف نہیں کیا ہے بلکہ اکثر قصیدوں میں سلطان کی لڑائیوں کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ میں شروع سے آخر تک دو دو چیزوں کا مقابلہ کیا ہے ایک دوسرا قصیدہ سوال و جواب سے شروع کیا ہے اور آخر تک اسے بنا ہا ہے (۱)

فرخی

علی نام[۲] ابوالحسن کنیت فرخی تخلص سیستان وطن (تذکرۃ الشعرا میں ترمذی لکھا ہے) باپ کا نام جولوغ یا قلوع، نہایت نیک، سلیم الطبع اور ذہین تھا۔ شاعری میں خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ چنگ بجانے میں کمال پیدا کیا تھا۔ سیستان کے ایک دہقان کا ملازم تھا۔ دو سو کیل

ہوا۔ سلطان نے کہا میں تیرے ہی انتظار میں تھا تجھے معلوم ہے کہ کیا واقعہ ہوگیا ہے کچھ ایسے شعر کہہ جو حسب حال ہوں۔ عنصری نے برجستہ کہا

کے عیب سر زلف بت از کاستن است	چہ جائے بغم نشستن و خاستن است
جائے طرب و نشاط و مے خواستن است	کار استن سرو زپیراستن است

سلطان یہ اشعار سنکر بے انتہا خوش ہوا اور حکم دیا کہ تین مرتبہ عنصری کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے۔ (چہار مقالہ صفحہ ۳۵) یہ واقعہ شعرالعجم میں بھی کم و بیش اسی طرح مذکور ہے لیکن مولانا نے چہار مقالہ کا حوالہ دیکر لکھا ہے کہ اس میں بجائے منہ کے دامن ہے لیکن (مولنا کو غالباً کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے ورنہ) جو نسخہ اسوقت ہمارے پیش نظر ہے اس میں بجائے "دامان" کے "دہان" ہی لکھا ہے۔

(۱) تفصیل کے لئے شعرالعجم حصہ اول تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۸ و ۴۹ لباب الالباب صفحہ ۲۹ و ۳۰ و ۳۱ و ۳۲

(۲) فرخی کے ابتدائی حالات لکھتے وقت ہم نے چہار مقالہ اور شعرالعجم دونوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ مولنا شبلی نے بھی ابتدائی حالات تمام تر چہار مقالہ سے اخذ کئے ہیں۔

غلہ اور سو درہم سالانہ معاوضہ مقرر تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ایک امیر عورت سے شادی کی جس کی وجہ سے خرچ میں زیادتی ہوئی اور موجودہ آمدنی ناکافی ہونے لگی فرخی نے زمیندار سے مقررہ معاوضہ میں اضافہ کی درخواست کی۔ زمیندار نے معذوری کا اظہار کیا اس سے فرخی کو بہت مایوسی ہوئی اور اب وہ اس تلاش میں رہنے لگا کہ کسی امیر کے دربار تک رسائی ہو جائے تاکہ اس کی موجودہ مشکلات کے حل ہونے کی کوئی صورت نکل آئے لوگوں نے اسے بتلایا کہ امیر ابوالمظفر چغانی بہت بڑا سخن سنج اور قدر دان علم و فن ہے۔ شعرا کی جماعت کو بیش قرار انعامات اور صلے دیتا ہے اور معاصر امرار میں اس بارے میں اسکا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ سنکر اس نے ایک قصیدہ کہا جسکا پہلا شعر یہ ہے۔

با کاروان حلہ رفتم زسیستان   با حلۂ تنیدہ ز دل بافتہ زجان

اور بلخ کی جانب روانہ ہو گیا جہاں ابوالمظفر محمود کی جانب سے گورنر تھا۔ اسے گھوڑوں سے بہت شوق تھا۔ اس کے چراگاہ میں اٹھارہ ہزار گھوڑیاں اور بچھیرے تھے ہر سال وہ انکا جائزہ لیتا تھا اور داغ کرتا تھا۔ فرخی جس وقت بلخ پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر "داغگاہ" میں ہے اسکا مختار کل حمید اسعد بھی وہیں موجود تھا فرخی اس کے پاس پہنچگیا۔ اور قصیدہ جو لکھکر لایا تھا اسے سنایا اور امیر ابوالمظفر کی خدمت میں پیش کرنے کی درخواست کی خواجہ اسعد ایک فاضل اور "شاعر دوست" آدمی تھا قصیدہ سنکر اور اس کی صورت دیکھکر اسے سخت تعجب ہوا اس لئے کہ قصیدہ بہت اچھا تھا اور فرخی کی صورت بالکل دیہاتی گنوار کی سی اس لئے حمید اسعد کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ قصیدہ اسی گنوار کا لکھا ہوا ہے جس کو شاعری سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ امتحاناً کہا کہ میں تمہیں امیر کی خدمت میں باریاب کر دوں گا مگر پہلے تم داغگاہ کی توصیف میں ایک قصیدہ لکھکر لاؤ اس نے داغگاہ کا نقشہ کھینچکر بتلایا کہ یہ بہت خوش منظر مقام ہوتا ہے کوسوں تک سبزہ زار چلا جاتا ہے۔ خیموں کی قطار لگی ہوئی ہے چاروں طرف چشمے بہتے ہیں احباب ایک ساتھ بیٹھکر شراب پیتے ہیں۔ جشن کرتے ہیں بادشاہ کے

ایک ہاتھ میں شراب اور دوسرے ہاتھ میں کمند ہوتی ہے شراب پیتا جاتا ہے اور گھوڑے
بخشتا جاتا ہے۔ فرخی نے رات بھر میں یہ قصیدہ کہہ ڈالا۔ اور دوسرے دن عمید اسعد کے سامنے
پڑھا اس قصیدہ کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

چون پرند نیلگوں بر روے پوشد مرغزار — پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار

خاک را چون ناف آہو مشک زاید بے قیاس — برگ را چون پر طوطی برگ روید بیشمار

دوش وقت صبحدم بوئے بہار آورد باد — حبذا باد شمال و خرما بوے بہار

باد گوئی مشک سودہ دارد اندر آستیں — باغ گوئی لعبتان جلوہ دارد در کنار

نسترن لولوے بیضہ دارد اندر مرسلہ — ارغواں لعل بدخشی دارد اندر گوشوار

تا بر آمد جامہاے سرخ مل بر شاخ گل — پنجہاے دست مردم سر فرو کرد از چنار

باغ بوقلموں لباس و شاخ بوقلموں نمای — آب مروارید گون و ابر مروارید بار

راست پنداری کہ خلعتہاے رنگیں یافتند — باغہاے پرنگار از داغگاہ شہریار

خواجہ عمید یہ قصیدہ سنکر حیران رہگیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسے اشعار اس کے
گوش زد نہیں ہوئے تھے۔ تمام کام چھوڑ چھاڑ فرخی کو اپنے ساتھ لے امیر کی خدمت میں حاضر
ہوا اور عرض کیا کہ خداوندا! دقیقی کے بعد سے اب تک ایسا شاعر نہیں پیدا ہوا اور تمام واقعہ
بیان کیا غرضکہ ابو المظفر کے دربار میں اُسے جگہ مل گئی اور ابو المظفر نے جوہر قابل دیکھکر کچھ
عرصہ کے بعد محمود کے دربار میں پہنچا دیا جہاں اس نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی بیس سیمیں
کمر غلام اس کی رکاب میں چلتے تھے (۱)

فرخی کی تعلیم و تربیت دیہات میں ہوئی اس کی شاعری نے بھی اگرچہ بعد میں ترقی

---

(۱) مولنا شبلی نے شعر العجم میں .... زریں کمر لکھا ہے لیکن چہار مقالہ میں سیمیں
کمر ہے۔

کے منازل طے کئے لیکن اس کی ابتدائی نشو ونما دیہات ہی میں ہوئی۔ اسی لئے اس میں وہ
تمام اوصاف موجود ہیں جو ایک فطرتی شاعر میں ہونے چاہئیں ۔ زبان کی صفائی روانی اور سلاست
اس کے کلام کا عام جوہر ہیں اس کی فطری ذکاوت وذہانت اور شاعرانہ کمال کی محمد عوفی اس
طرح مدح سرائی کرتا ہے ۔

فرخی کہ رخ خوب روئے بلاغت را مشاطۂ فصاحت او چناں آراست کہ ہیچ قادح
انگشت بر حرف آں نہہا و شعراو عذب در معنی است باول در صنعت سخن و بدقت
معانی کوشید و دراں از اقران سابق آمد و بآخر سخن سہل ممتنع ایراد می کرد۔[1]

دولت شاہ سمرقندی ایک قدم اور آگے بڑھ گیا ہے ۔ چنانچہ اس نے فرخی کی تعریف
کے سلسلہ میں وطواط کا قول بھی نقل کیا ہے وہ کہتا ہے ۔

ذہنے سلیم و طبع مستقیم داشتہ استاد رشید وطواط می گوید کہ فرخی عجم راچناں است کہ
متنبی عرب را و ایں ہر دو فاضل سخن را سہل ممتنع می گویند[2]

قصیدہ اور واقعہ نگاری میں اس نے کمال حاصل کیا تھا۔ مرثیہ کے اشعار پہلے
فارسی میں بہت کم پائے جاتے تھے شاعری کی اس صنف کو بھی اس نے درجہ کمال تک
پہنچا دیا اس نے سلطان محمود کی وفات کے بعد اسکا زبردست مرثیہ لکھا تھا ۔ مولنا شبلی
اس کے متعلق لکھتے ہیں :۔

" فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا وہ نہ صرف پر درد اور اثر سے بھرا ہوا ہے
بلکہ اس فن کے تمام اصول اور قوانین اس سے منضبط کئے جا سکتے ہیں"[3]

---

(۱) لباب الالباب صفحہ ۴۷

(۲) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۵۵

(۳) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۸۸

اس مرثیہ کے چند اشعار نمونہ کے طور پر ہم یہاں درج کرتے ہیں :-

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم پار ۔۔۔ چہ فتاد ست کہ امسال وگرگوں شد کار

کو یہا بینم پر شورش و سر تا سر کوے ۔۔۔ ہمہ پر جوشن و جوشن در و پر خیل و سوار

مہتران بینم بر روئے زنان ہمچو زناں ۔۔۔ چشمہا کردہ ز خون نابہ برنگ گلنار

ملک امسال وگر باز نیامد ز غزا ۔۔۔ وشمنے روئے نہادہ است دریں شہر و دیار

سیر مے خوردہ مگروی کہ بخفتہ است امروز ۔۔۔ دیر تر خاست مگر رنج رسیدش زخمار

خیز شاہا کہ رسولاں شہان آمدہ اند ۔۔۔ ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار

کہ تواند کہ برانگیزد از یں خواب ترا ۔۔۔ خفتنی خفتنی کز خواب نگردی بیدار

خفتن بسیار اے خواجہ نہ خوے تو نبود ۔۔۔ ہیچ کس خفتہ ندیداست ترا زیں کردار

یکدمک بارے در خانہ ببایست نشست ۔۔۔ تا بدیدیمے روئے تو عزیزان و تبار

بہ حصار از فزع و بیم تو رفتند شہاں ۔۔۔ تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بہ حصار

شعرا را بہ تو بازار برافروختہ بود ۔۔۔ رفتی و با تو بہ یکبارہ برفت آں بازار

اس کے دیوان کو ماوراء النہر میں بہت شہرت حاصل ہوئی ۔نظم کے علاوہ نثر میں بھی اسکی ایک تصنیف ہے جو اس نے فصاحت و بلاغت پر لکھی ہے " ترجمان البلاغت " نام ہے[1] لیکن رشید الدین وطواط[2] نے اس کتاب کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی ہے[2] اور

---

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۵۷

(۲) رشید الدین محمد بن عبد الجلیل سلسلہ نسب حضرت عمر بن الخطاب سے جاکر ملتا ہے ۔ بہت بزرگ فاضل اور ادیب تھا بہت سے فنون میں مہارت تھی اس کی قابلیت علم کا اعتراف وقت کے تمام اکابر کو تھا اصل مسکن بلخ تھا لیکن خوارزم میں سکونت اختیار کی قطب الدین خوارزم شاہ کے عہد میں نشو و نما پائی ۔ دور دور سے لوگ آکر شعر و شاعری میں اس سے استفادہ کرتے تھے ۔ نہایت تیز زبان اور فصیح تھا فن نقد میں خاص کمال

اور لکھا ہے کہ یہ ایک لغو کتاب ہے

اسدی طوسی

یہ بھی سلطان محمود کی بزم ادب کا ایک اہم رکن ہے شاعری کے اعتبار سے اسکا مرتبہ اپنے ہمعصر شعرا سے کسی طرح کم نہیں ۔ دولت شاہ نے اس کو فردوسی کا استاد لکھا ہے ۔ لیکن مولنا شبلی نے اس کی تردید کی ہے اور خود اسدی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فردوسی کا استاد نہیں بلکہ ہمعصر ہے ۔ محمود کے زمانہ میں وہ خراسان کے شعرا کا استاد تھا ۔ اسے بار ہا شاہنامہ نظم کرنے کے لئے مجبور کیا گیا لیکن اس نے ہمیشہ اس سے پہلو تہی کی اور اپنے بڑھاپے کا عذر پیش کرتا رہا ۔ البتہ فردوسی سے ہمیشہ شاہنامہ نظم کرنے کی فرمائش کرتا رہا کہ اُسے وہ اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں سمجھتا تھا۔[1] دولت شاہ نے ایک روایت اور بھی نقل کی ہے یعنی یہ کہ فردوسی جب غزنین سے بھاگ کر دوسرے مقامات سے ہوتا ہوا اپنے وطن پہنچا ہے تو موت کے کنارے آن لگا تھا ۔ اس نے اپنے استاد اسدی کو بلا کر کہا کہ استاد ! موت کا وقت قریب پہنچ گیا ہے اور شاہنامہ ہنوز مکمل نہیں ہوا ہے اگر میں مر گیا تو مجھے خوف ہے کہ میرے بعد کسی کو اس کی تکمیل کی ہمت اور توفیق نہیں ہوگی ۔ اسدی نے کہا کہ عزیز من کچھ فکر مت کرو اگر زندگی رہی تو تمہارے بعد میں اسے پورا کروں گا فردوسی نے کہا کہ آپ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اس لئے کس طرح آپ اس کام کو انجام دے سکیں گے اسدی نے کہا کہ انشاءاللہ سب ہو جائے گا یہ کہکر وہ مکان پر واپس ہوا اور اسی روز دوسری نماز کے وقت

حاصل تھا اس لئے اکثر شعرا اس سے ناراض تھے ۔ بہت سے شعرا نے اس کی ہجو بھی لکھی ہے اور طرح طرح کے الزامات بھی قائم کئے ہیں لیکن وہ ان تمام الزامات سے بالاتر ہے ۔ تذکرۃ الشعرا صفحہ ۸۷

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۵۳

تک ۴۰۰۰۰ چار ہزار شعر کہہ ڈالے - الیٰ آخرہ[1] لیکن مولانا شبلی نے اس کو بھی نہایت معقول دلائل کے ساتھ فرضی اور غلط ثابت کیا ہے[2] اسدی کا اصلی نام علی بن احمد اور کنیت ابو نصر ہے - طوسی وطن میں تعلیم سے فراغت حاصل کرکے عراق آیا اور دیلمیوں کے دربار میں اسکی رسائی ہوگئی یہاں سے آذربائیجان رخ کیا وہاں کے رئیس ابو دلف کا وزیر نہایت قدرشناس تھا اس نے اسے شاہنامہ کے طرز پر ایک کتاب لکھنے کی ترغیب دی چنانچہ گرشاسپ نامہ اسی ترغیب کا نتیجہ ہے[3]

فارسی مصطلحات پر بھی اس کی ایک کتاب ہے اور یہ اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف بتائی جاتی ہے - چنانچہ خود اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ ویانا کے کتب خانہ میں موجود ہے اور یہ ایک یوریپین مستشرق نے اسے چھاپ کر شائع بھی کیا ہے[4]

عسجدی

عسجدی بھی محمود کے دربار کے مقبول شعرا میں تھا دولت شاہ نے اسے "از جملہ شاگردان استاد عنصری[5]" لکھا ہے وطن کے متعلق بھی تذکروں میں اختلاف ہے عوفی اسے مرو کا باشندہ بتاتا ہے[6] دولت شاہ نے ہروی الاصل لکھا ہے[6] دولت شاہ اس کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "قصائد را متین و ملائم می گوید" عسجدی کے دیوان کو شہرت نہیں نصیب ہوئی لیکن اسکا جستہ جستہ کلام مختلف رسائل اور تذکروں وغیرہ میں پایا جاتا ہے محمود نے جب سومنات فتح کیا تو اس نے بھی ایک قصیدہ لکھا چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں -

تا شاہ خسرواں سفر سومنات کرد   کردار خویش را علم معجزات کرد

آثار روشن ملکاں گذشتہ را   نزدیک بجز داں ہمہ از مشکلات کرد

---

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۳۶ (۲) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۸۳ (۳) ایضاً صفحہ ۱۸۴ (۴) " " " " ...تذکرۃ الشعرا صفحہ ۴۷ (۶) ایضاً

بزدود زاہل کفر جہاں را بر اہل دیں | لشکر دو عا خویشتن از واجبات کرد
محمود شہریار کریم آنکہ ملک را | بنیاد بر محامد و بر مکرمات کرد الخ

یہ مشہور رباعی اسی کی ہے۔

از شرب مدام ولاف مشرب توبہ | از عشق بتاں سیم غبغب توبہ
دل در ہوس گناہ و برلب توبہ | زیں توبۂ نادرست یارب توبہ[1]

غضائری

شعرائے عراق کا سرتاج سمجھا جاتا ہے سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں رَے سے ملازمت کی غرض سے غزنین آیا۔ شاعری کے تمام اصناف پر اسے قدرت تھی۔ صنعت اغراق میں خصوصاً کمال حاصل تھا۔ سلطان محمود کی شان میں متعدد قصیدے کہے ہیں۔ ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

اگر مراد بجاہ اندر است وجاہ بمال | مرا بہ بیں کہ ببینی جمال را بکمال
من آں کیم کہ بمن تا بحشر فخر کند | ہر آنکہ بر سر یک بیت بر نویسد قال

اس قصیدہ میں صنعت اغراق ہے جس کے صلہ میں محمود نے سات توڑے دئے جن کی قیمت ۱۴ ہزار درہم تھی۔ اغراق یہ ہے

صواب کرد کہ پیدا نہ کرد ہر دو جہاں | یگانہ ایزد دادار بے نظیر و ہمال
وگرنہ ہر دو بہ بخشیدے او بزور سخا | امید بندہ نماندے با یزد متعال

روایت دولت شاہ کی ہے مولانا شبلی نے ۷ کے بجائے ۱۴ توڑے لکھے ہیں اور خود غضائری کے ان اشعار سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

---

(۱) یہ بیان تمامتر لباب الالباب جزو دوم اور تذکرہ دولت شاہ سے ماخوذ ہے۔ (۲) شعر العجم جلد اول

مرا دو بیت بفرسود شہریار جہان ۔ بداں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم ۔ برغم حاسد ذ تیار بد سگال مکال[1]

---

(۱) غضائری کا بیان بھی لباب الالباب جلد دوم تذکرۃ الشعرا اور شعر العجم حصہ اول سے ماخوذ ہے ۔

غزلیات

(از جناب احسان احمد صاحب بی۔ اے ایل ایل بی وکیل اعظم گڈھ)

کئی مہینے ہوئے یہ غزلیں حضرت احسان نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی درخواست پر عطا فرمائی تھیں۔ ادارت کی غفلت سے ابتک شائع نہ ہو سکیں۔ دینے والے اور دلانے والے دونوں سے معافی کی التجا ہے ۔

(۱)

محسوس ہو رہی ہیں خود اپنی تجلیاں ۔ اب کعبہ چاہئے نہ صنم خانہ چاہئے
وہ شمع حسن آج بھی ہے مائل کرم ۔ سوز و گداز سینۂ پروانہ چاہئے
کیا کیا لطافتیں انہی ناکامیوں میں ہیں ۔ احساس لذت غم جانانہ چاہئے
دیکھوں تو پھر حقیقت اوج حریم ناز ۔ اک بیخودی کا نعرۂ مستانہ چاہئے
نغمے عجیب شور سلاسل میں ہیں نہاں ۔ سننے کو لیکن اک دل دیوانہ چاہئے
اس بزم قدس تک تو پہنچنے کے واسطے ۔ زاہد مری یہ لغزش مستانہ چاہئے

اس تشنگی کو میں تو سمجھتا ہوں زندگی اہل ہوس کو ساغر و پیمانہ چاہیے
یہ نالہ و بکا تو نہیں کار عاشقی ہر مایہ عزیز کا نذرانہ چاہیے
آساں نہیں ہے جیب و گریباں کا پھاڑنا اس کے لیے بھی عاقل و فرزانہ چاہیے
اس راہ عشق میں تو بس اتنا ہے مجکو ہوش ہر ہر قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے

دشواریاں حیات کی احسان کچھ نہیں
فکرِ بلند و ہمتِ مردانہ چاہیے

(۲)

کس کے فیضانِ تجلی سے یہ دل سیراب ہے آج ہر داغ چمکتا ہے گلستاں ہو کر
راحت روح ملی، دولت کونین ملی محرم جلوۂ کیفِ غم پنہاں ہو کر
دیکھ پھر ہوتی ہے کیا بارش انوار کرم مشہد عشق میں آ سر بہ گریباں ہو کر
کر دیا بزمگہِ دہر کو معمور "گداز" خاک پروانہ کے ذرے نے پریشاں ہو کر
وادیٔ عشق ہے یہ، نالہ و شیون کیسا ہاں، اٹھا گام طلب محو و در قصاں ہو کر
کر دیا برق سر طور کو محروم جمال جلوہ ہائے دل بیتاب نے عریاں ہو کر
اب تو اس برق تجلی سے ہے اک ربط لطیف مجھکو کیا چیز ملی سوختہ ساماں ہو کر
بزم اسرار کے پردوں کو اٹھنا تھا جسے رہ گیا ہاتھ وہ پابند گریباں ہو کر
دل میں اک رقص تو ہے روح میں اک وجد تو ہے گرچہ کچھ بھی نہ ملا چاک گریباں ہو کر
کاش رہ جائے مرے سینہ میں یہ داغ جنوں اک نشاط ابدی کا چمنستاں ہو کر
تجھکو گرنا تھا مرے قلب پہ اے برق جمال کیا ملا طور پہ تجھکو شرر افشاں ہو کر

دو عینکیں

بابو صاحب علیگڑھ کے گریجوایٹ تھے اور کچہری میں منصرم تھے۔ مولوی صاحب اپنے استاد مرحوم کے شاگرد تھے اور گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ مولوی تھے۔ بابو صاحب دبلے پتلے آدمی تھے، داڑھی منڈاتے تھے، مونچھیں اتنی بڑی رکھتے تھے کہ دودھ کی بالائی اُن میں اٹک کر رہجاتی تھی۔ مولوی صاحب فربہ اندام تھے۔ انکی داڑھی عرض میں زنخداں تک محدود تھی مگر طول میں بہت دور تک پہنچی تھی۔ مونچھیں صاف رہتی تھیں یخنی، حریرہ، ہریسہ، مارالحم کسی چیز کے پینے میں دقت نہ ہوتی تھی۔ بابو صاحب گھر پر قمیص اور ڈھیلا پاجامہ پہنتے تھے اور دفتر میں سوٹ سے مشابہ ایک چیز جو چھاؤنی کا درزی انہیں سی کر دیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب گھر پر اور مدرسے میں ہر جگہ نیچا کرتہ اور اونچی ازار پہنتے تھے جو انکی بیوی سیتی تھیں۔ بابو صاحب ولایتی چشمہ لگاتے تھے جس کی کمانی پر سونے کا ملمع تھا مولویصاحب بہت موٹے شیشے کی عینک استعمال کرتے تھے جس میں بٹا ہوا دھاگا کمانی کا کام دیتا تھا۔

بابو صاحب پہلے لیڈر کے خریدار تھے مگر جب سے پائنیر کا چندہ کم ہوگیا، پائنیر منگواتے تھے۔ مولوی صاحب کوئی اخبار خریدتے نہیں تھے مگر اسکول کے دارالمطالعہ میں جتنے اردو اخبار آتے تھے سب کو پڑھا کرتے تھے۔ بابو صاحب کو کتب بینی کا شوق نہ تھا۔ اخبار کے علاوہ اگر وہ کچھ پڑھتے تھے تو اپنے صوبے کی سول لسٹ۔ مولوی صاحب کے مطالعہ میں کوئی نہ کوئی موٹی سی عربی کی کتاب ہمیشہ رہا کرتی تھی۔ بابو صاحب کو سوائے اصلاح معاشرت کے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ مولوی صاحب کو علاوہ دینیات کے علمی اور سیاسی مسائل سے بھی شغف تھا۔ اور انہیں بھی وہ دینیات کا جزو سمجھتے تھے۔ بابو صاحب اپنے آپ کو آزاد خیال اور مولوی صاحب کو تنگ نظر اور متعصب سمجھتے تھے مولوی صاحب اپنے آپ کو مسلمان اور بابو صاحب کو ملحد کہتے تھے۔

باوجود ان اختلافات کے بابو صاحب اور مولوی صاحب میں بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے جس میں زنانے کے دو الگ حصے تھے، مگر مردانہ مشترک تھا۔ مردانے میں غسلخانے، پاخانے اور نوکروں کی کوٹھری کے علاوہ چار بڑے کمرے تھے جس میں سے ایک بابو صاحب کی نشستگاہ کا کام دیتا تھا۔ اس میں دری بچھی تھی اور چند بید کی کرسیاں اور چند مونڈھے۔ دوسرا بابو صاحب کے مطالعہ کا کمرہ تھا جس میں ایک میز تھی اور دو کرسیاں۔ میز پر لکھنے کا سامان دفتر کی سلیں، تار اور منی آرڈر وغیرہ کے فارم، سول لسٹ اور ریل کا ٹائم ٹیبل سب چیزیں قرینے سے رکھی رہتی تھیں۔ تیسرے کمرے میں مولوی صاحب رہتے تھے۔ اس میں آدھے کمرے میں چٹائی پر ایک بوسیدہ چاندنی بچھی ہوئی تھی صدر میں ایک میلا سا گاؤتکیہ رکھا تھا۔ اس کے آگے چار پانچ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ چھوڑ کر سو سوا سو کتابیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ کمرے کے بقیہ نصف حصے میں نماز کی چوکی تھی اور ایک تخت جس پر مولوی صاحب کے کپڑے اور گھر کی بہت سی چیزیں جن کے رکھنے کا کہیں اور ٹھکانا نہ تھا، پڑی رہتی تھیں۔ چوتھے کمرے میں بابو صاحب کا لڑکا اور مولوی صاحب کا لڑکا جو ہم عمر تھے اور گورنمنٹ اسکول میں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے، رہا کرتے تھے۔

مولوی صاحب دونوں لڑکوں کے ساتھ مدرسے سے ساڑھے چار بجے واپس آیا کرتے تھے اور ساڑھے پانچ بجے تک عصر کی نماز سے اور سہ پہر کے ناشتے سے فارغ ہو جاتے تھے۔ اس وقت بابو صاحب اپنے دفتر سے لوٹتے تھے۔ بابو صاحب کا معدہ کمزور تھا اس لئے وہ سہ پہر کو ناشتہ نہیں کرتے۔ دفتر سے لوٹ کر وہ منہ ہاتھ دھوتے تھے اور پھر اپنے نشست کے کمرے میں یا گرمی کے دن ہوں تو صحن میں ایک تکیہ دار مونڈھے کے سامنے ایک تپائی رکھ کر دراز ہو جاتے تھے۔ مولوی صاحب بھی آ بیٹھتے تھے اور محلے کے بعض احباب بھی جمع ہو جاتے تھے مغرب تک یہیں نشست رہتی تھی۔ مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی تھی جس میں مولوی صاحب بہت زیادہ اور بابو صاحب بہت کم حصہ لیتے تھے۔ اس کے بعد مولوی صاحب اور دوسرے حضرات

جو نماز کے پابند تھے محلے کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے چلے جاتے تھے اور بابو صاحب اور یاران بے نماز بدستور باتیں کرتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے مسجد سے واپس آنے پر سب احباب رخصت ہو جاتے تھے اور مولوی صاحب اور بابو صاحب اور دونوں لڑکے سب مل کر کھانا کھاتے تھے کھانا کھا کر بابو صاحب اپنے مطالعے کے کمرے میں چلے جاتے تھے اور دفتر سے جو مسلیں ساتھ آتی تھیں انکے ساتھ تین چار گھنٹے مصروف رہتے تھے۔ مولوی صاحب اپنے کمرے میں مطالعہ کیا کرتے تھے۔ عشا کی نماز مولوی صاحب گھر پر پڑھتے تھے اور نماز سے فارغ ہو کر گھر میں آرام کرنے چلے جاتے تھے۔ بابو صاحب کو بارہ بجے کے قریب سونا نصیب ہوتا تھا۔ مولوی صاحب صبح کو تڑکے اٹھتے تھے، نماز اور تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر ٹہلنے جاتے تھے وہاں سے واپس آکر دونوں لڑکوں اور بعض طالب علموں کو عربی فارسی اور دینیات کی کتابیں پڑھاتے تھے اور ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر مدرسے کی راہ لیتے تھے۔ بابو صاحب ساڑھے سات بجے بیدار ہوتے تھے اور ناشتہ کرتے ہی جج صاحب کے گھر چلے جاتے تھے کیونکہ دفتر کے وقت سے پہلے انہیں وہاں بھی کام کرنا پڑتا تھا۔

یوں تو بابو صاحب اور مولوی صاحب میں روز شام کو باتیں ہوتی تھیں لیکن چونکہ بابو صاحب ذرا محتاط اور خوددار آدمی تھے اس لئے اور لوگوں کی موجودگی میں اپنے اصلی خیالات ظاہر کرنا وہ خلاف مصلحت اور خلاف شان سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب کا مزاج بہت تیز تھا اور اور جب ان سے اور کسی شخص سے مجمع میں گفتگو ہوتی تھی تو ذرا سی دیر میں گفتگو مناظرہ بن جاتی تھی اور مناظرہ مجادلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ بہ خلاف اس کے جب وہ کسی سے تنہائی میں باتیں کرتے تھے تو انکا رویہ اول سے آخر تک عدم تشدد کا رہتا تھا۔ اس لئے بابو صاحب ان سے اگر کبھی کھل کر باتیں کرتے تھے تو اتوار سے پہلی رات کو جب ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا نہیں ہوتا تھا۔ اس رات کو عموماً دونوں صاحب کام نہیں کرتے تھے اور اکثر کھانے کے بعد دو ایک گھنٹے تبادلہ خیالات میں صرف کرتے تھے۔ موضوع بحث عموماً معاشرت کے مسائل ہوتے تھے کیونکہ بابو صاحب کسی اور مبحث سے ذوق نہیں رکھتے تھے۔

اس تبادلہ خیالات کی عجیب شان ہوتی تھی۔ دوران گفتگو میں مولوی صاحب ٹکٹکی باندھ کر چھت کی طرف دیکھتے تھے اور آنکی آنکھوں کی چمک سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انکی نظر نامحدود فضا سے گذر کر آسمانی بلندیوں کی سیر کر رہی ہے اور بابو صاحب بڑے گہرے غور و فکر کے انداز سے فرش پر نظر جما دیتے تھے گویا طبقات ارض کے نیچے تحت الثریٰ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دونوں عجب محویت کے عالم میں باری باری سے گفتگو کرتے تھے اور بیچ بیچ میں بابو صاحب اپنے رومال سے اور مولوی صاحب اپنے کرتے کے دامن سے عینک صاف کرتے جاتے تھے۔ اس حالت میں کوئی انہیں دیکھتا تو یقیناً یہ سمجھتا کہ ان دونوں حضرات کے پیش نظر یہ زندگی اور یہ دنیا نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی عینک کی مدد سے کسی اور طلسمی عالم کا نظارہ کر رہا ہے۔ اور دوسرے کے سامنے اپنے منظر کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ ان دونوں کے طرز گفتگو سے اس خیال کو اور تقویت ہوتی تھی۔ مثلاً بابو صاحب حکیمانہ شان سے پیشانی پر شکنیں ڈال کر فرمایا کرتے تھے "مجھے یہ نظر آرہا ہے کہ ایشیا جہالت اور تعصب کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو گیا ہے اور اصلاح و ترقی کی شاہراہ پر تیزی سے قدم بڑھ رہا ہے۔ قدامت پرستی اور تنگ نظری قصہ پارینہ ہو گئی ہے، روشن خیالی کا دور دورہ ہے۔ تہذیب و تمدن کا چاند جو مغرب سے طلوع ہوا تھا مشرق کی تاریکی کو آہستہ آہستہ دور کر رہا ہے۔ اسکی چاندنی کا دریا دو طرف سے بڑھ رہا ہے امریکہ کی طرف سے اور یورپ کی طرف سے اور ظلمت شرق اس سیلاب میں غرق ہوتی جاتی ہے۔ جاپان اس نور سے منور ہو چکا ہے اور چین اب منور ہو رہا ہے۔ ترکی اور مصر اس کی تابانی سے جگمگا اٹھے ہیں۔ ایران، شام اور عراق، وسط ایشیا اور افغانستان کی نظریں اس کی درخشانی سے خیرہ ہو رہی ہیں۔ ہندوستان پر اس کی کرنیں مدت سے پڑ رہی ہیں اور اس کی روشنی سارے ملک میں پھیل چکی ہے لیکن چونکہ یہاں کی فضا میں غیر معمولی تاریکی ہے اس لئے یہ چاندنی ابتک رندھی ہوئی ہے۔ جیسے جیسے دن گذرتے جائیں گے اندھیرا چھٹتا جائے گا اور چاند کی روشنی اُجلی ہوتی جائے گی،، مولوی صاحب یہ سُنکر تھوڑی دیر خاموش رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ انکے

چہرے پر عارفانہ جبروت کے آثار ظاہر ہوتے تھے اور انکی زبان یوں شعلہ فشانی کرتی تھی۔ ”میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ایشیا یورپ کی تقلید میں آنکھ بند کرکے ہلاکت کے غار میں گرنے کو تیار ہے۔ عقل شیطانی کے غرور میں ڈوبا ہوا، علم انسانی کے نشے میں بدست وہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کو پامال کر رہا ہے اور بہائم کی طرح شرم وحیا کی رسیاں تڑا کر ہوائے نفس کے میدان میں بھاگا چلا جاتا ہے۔ کفر و الحاد کی ایک آگ بھڑک اٹھی ہے جو ایمان اور عقیدے کے خرمن کو پھونکے ڈالتی ہے۔ اس کی چمک نے جسے نور کہنا نور کی توہین ہے چین وجاپان، روم وروس، ایران افغانستان سب کی آنکھوں میں چکا چوند ڈالدی ہے اور اسکی آنچ نے سب کے منہ کو جھلس دیا ہے۔ اسکے شعلے ہندوستان میں زمین کے اندر اندر پھیل رہے ہیں اور ایک دن سارے ملک کو جلا کر خاک کر دیں گے۔ وہ خدا جس نے ابراہیم پر آگ کو گلزار کر دیا تھا اگر چاہے تو اس بدنصیب ملک کو بچا سکتا ہے اور اپنے برگزیدہ بندوں کو یہ قوت دے سکتا ہے کہ دہریت کی آگ کو اپنے پیروں سے کچل کر بجھا دیں۔“

بابو صاحب یہ سنکر ذہنی تفوق کے احساس سے مسکراتے تھے اور کہتے تھے ”دنیا میں جہالت کی قوتیں ہمیشہ مذہب کے نام سے ترقی اور اصلاح کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتی ہیں مگر کبھی کامیاب نہیں ہوتیں مجھے وہ دن نظر آ رہا ہے جب لوگوں کی آنکھوں سے توہمات کے پردے اٹھ گئے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ انکے دینی پیشواؤں نے انہیں صدیوں تک گمراہی میں مبتلا رکھا اپنی کوتاہ بینی اور بزدلی سے انہیں خدا کی بہترین نعمتوں سے فائدہ نہ اٹھانے دیا۔ دھوکے کا طلسم ٹوٹنے کے بعد یہ فریب خوردہ بھیڑیں شیر بن گئی ہیں اور فریب دینے والوں کو غضبناک تیور سے گھور رہی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے، اسے دیکھ کر دل ہلتا ہے اور اسے بیان کرتے ہوئے زبان کانپتی ہے“

اب مولوی صاحب کا چہرہ روحانی طیش سے سرخ ہو جاتا تھا۔ اور انکی آواز سارے کمرے میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی تھی ”روز ازل سے شیطان اور اس کے پیرو ترقی اور اصلاح

کے بہانے سے احکام خداوندی سے سرکشی کرتے آئے ہیں مگر انکا انجام دائمی ذلت اور ابدی ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ۔ میں وہ دن دیکھ رہا ہوں جب لوگوں کے اعمال میزان عدل میں تولے جا رہے ہیں اور انہیں بہ قدر استحقاق جزا و سزا مل رہی ہے، بندوں کو خدا کی راہ سے ہٹانے والے انکے دلوں میں نافرمانی اور غرور کا بیج بونے والے کیفر کردار کو پہنچ رہے ہیں۔ جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی زبانیں ایندھن مانگ رہی ہیں ۔ اس کے بعد جو آنکھوں کے سامنے گذرتا ہے اس سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور روح لرزتی ہے "

اس نقطے پر پہنچ کر گفتگو عام مباحث سے ہٹ کر ذاتی مسائل پر آجاتی تھی ۔ دونوں حضرات بہ تقاضائے دوستی ایک دوسرے کے عیوب اور نقائص گنانے لگتے تھے اور حق گوئی میں اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ حق کی تلخی کام و دہن کے لئے اور اس کی بو مشام جاں کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی تھی ۔

ایک بار جمعے کے دن مولوی صاحب نے اپنے لڑکے کو مارا کیونکہ اس نے نہانے میں دیر کر دی اور نماز جمعہ میں شامل نہ ہو سکا اور اتفاق سے بابو صاحب نے بھی اسی دن اسکول دیر میں پہنچنے کے قصور میں اپنے نور عین کی گوشمالی کی ۔ سنیچر کے دن صبح کو دونوں لڑکوں نے آپس میں صلاح کر کے ان پدرانہ مظالم کا انتقام اس طرح لیا کہ مولوی صاحب اور بابو صاحب دونوں کی عینکیں خدا جانے کہاں چھپا دیں کہ لاکھ ڈھونڈھا مگر نہ ملیں ۔ عینک نہ ہونے سے دونوں کو دن بھر بڑی دقتوں کا سامنا ہوا ۔ مولوی صاحب لڑکوں سے درسی کتابوں کا آموختہ نہ سن سکے اور انہیں اس پر قناعت کرنا پڑی کہ صرف و نحو کے پیچیدہ مسائل زبانی سمجھائیں اور لڑکوں کی سمجھ میں کچھ نہ آئے تو قیچی سے ان کی تشریح کریں ادھر بابو صاحب کو مسلیں ایک محرر سے پڑھوا کر سننا پڑیں جس میں بہت وقت ضائع ہوا اور جج صاحب کے سامنے کاغذات پر دستخط کرانے وہ اس دن نہ جا سکے ۔ شام کو واپسی کے بعد دونوں صاحبوں نے پھر عینکیں تلاش کیں مگر کہیں پتہ نہ چلا ۔ مجبوراً

یہ فیصلہ کیا کہ اگلے دن تعطیل ہو بازار جاکر دوسری عینکیں خرید لائیں گے۔

کھانے کے بعد حسب معمول دونوں حضرات بابو صاحب کی نشست گاہ میں رونق افروز ہوئے اور پھر وہی ہفتہ وار باتیں چھڑ گئیں۔ پہلے تو کچھ یوہیں سی ردو بدل ہوتی رہی پھر رفتہ رفتہ دونوں گرمانے لگے اور اپنی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بابو صاحب کی نظر فرش پر جم گئی اور انہوں نے چہرے کو فلسفیانہ ساز و سامان سے آراستہ کرکے اسی پرانے انداز میں گفتگو شروع کرنا چاہی۔ مگر خدا جانے عادت کا اثر تھا یا کوئی اس سے زیادہ گہرا بھید کہ پہلا لفظ منہ سے نکالتے ہی بابو صاحب کا رومال والا ہاتھ عینک کو تلاش کرتا ہوا آنکھ تک پہنچا اور جب عینک نہ ملی تو ان پر گھبراہٹ طاری ہوگئی انکے ہاتھ پیر کانپنے لگے ان کی زبان رکنے لگی "مجھے نظر آتا ہے ــ مجھے۔ یہ۔ مجھے کچھ نظر نہیں ۔آتا۔ اندھیرا۔ ہے۔ ہر طرف۔ اندھیرا۔

بابو صاحب کی یہ حالت دیکھ کر مولوی صاحب بھی سراسیمہ ہوگئے۔ انکے کرتے کا دامن اٹھا اور آنکھ کی طرف بڑھا مگر وہاں عینک کہاں تھی۔ ان کی زبان بھی لغزش کرنے لگی" میں یہ دیکھتا ہوں۔ میں۔ یہ۔ دیکھتا۔ میں۔ مجھے۔ کچھ۔ دکھائی۔ نہیں۔ دیتا۔ کچھ۔ ہے۔ مگر۔ خدا۔ جانے۔ کیا"

غزل

از حضرت جلیل قدوائی بی اے (علیگ)

خوبیِ حسن یار کی باتیں
سر بسر ہیں بہار کی باتیں

مجھکو دیکھا تو ہنس دیا وہ شوخ
اس تغافل شعار کی باتیں

آہ، وہ ابتدائے عشق کے دن
وہ زمانِ بہار کی باتیں

ذکرِ ایام کامرانِ وصل
طالع سازگار کی باتیں

چشم پرشوق کے پیام لطف
نگہ شرمسار کی باتیں

دل مرحوم کی اٹھان کی شان
ہائے اس ہونہار کی باتیں

اب نہ دل ہے نہ دلمیں سوز نہ ساز
نہ وہ اس دل فگار کی باتیں

چپ لگے اس کو ایک سال ہوا
ہیں یہ پچھلی بہار کی باتیں

اب نہیں ہے بہار، اب نہ کرو
اس خزاں میں بہار کی باتیں

بے رخی کا کسے یقیں ہو جلیل
یاد ہیں اس کے پیار کی باتیں

شذرات

پچھلے مہینے متعدد قومی اخباروں اور رسالوں میں "عربوں کا تمدن" مورد اعتراض قرار پایا۔ ہم نے مولانا محمد علی صاحب، مولنا ابوالکلام صاحب اور علامہ اقبال سے شورہ کیا۔ تینوں حضرات نے یہ رائے دی کہ مصنف کی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں پر جو تردیدی نوٹ مترجم نے لکھے ہیں وہ کافی مفصل اور مدلل نہیں ہیں۔ اس سے زیادہ گہری تنقید کی ضرورت ہے۔ جناب شیخ الجامعہ حیدرآباد میں تشریف رکھتے ہیں ان کی خدمت میں یہ روداد پیش کی گئی۔ انھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ اپنی واپسی پر جو بہت جلد ہونیوالی ہے۔ ہمدردان جامعہ کی شکایت کے رفع کرنیکا معقول انتظام فرمائیں گے۔ ممدوح کی طرف سے اس کا اعلان اس رسالے کے چھپنے سے پہلے اخبارات میں شائع ہوجائے گا۔

---

۳۰ نومبر کو الہ آباد یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسے میں سر مالکم ہیلی گورنر صوبجات متحدہ نے ایک مختصر گر پر مغز خطبہ صدارت پڑھا جس کا لب لباب یہ ہے کہ ہندوستان میں مغربی اور مشرقی تمدنوں کا امتزاج ہو رہا ہے لیکن ابھی تک اسکا فیصلہ نہیں ہوا کہ آیا یہ ملک یورپ کے سیاسی، اقتصادی، سماجی اور علمی نظاموں کو اختیار کرکے ان میں اپنی ضروریات کے مطابق تصرف کرے گا یا اپنی زندگی کی بنیاد اپنی قدیم روایات پر رکھے گا اور مغربی تہذیب سے محض وہ عناصر لے گا جو مشرقی تہذیب میں کھپ سکیں۔ موصوف نے بہت افسوس کا اظہار کیا کہ ہندوستانی رہنمایان ملت آج اور کل کی فکر میں دور و دراز مستقبل کی طرف سے غافل ہیں اور انہیں نصیحت فرمائی کہ جہانتک ممکن ہو وہ جذبات کے جوش سے دل کو خالی کرکے حکیمانہ بے تعلقی سے ان مسائل پر غور کریں اور اس غور کا جو نتیجہ نکلے اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔ موصوف نے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ خود اور دوسرے

انگریز بڑے خلوص اور گرمجوشی سے اس دن کے منتظر ہیں جب ہندوستان راہ ترقی کے دشوار مرحلوں سے گذر کر منزل مقصود تک پہنچ جائے

سر مالکم نے جن مسائل کیطرف توجہ دلائی ہے انکی اہمیت میں کوئی شبہ نہیں۔ہندوستان ایشیا کے اور سب ملکوں کی طرح مشرق و مغرب کے تمدنوں کا جولانگاہ ہے اور اگر اس نے ان دونوں میں مصالحت کی کوشش نہ کی تو انکے آپس میں ٹکرانے سے اس کے پس جانے کا اندیشہ ہے لیکن موصوف کی فلسفیانہ وسعت نظر سے تعجب ہے کہ انہیں وہ مجبوریاں نظر نہیں آئیں جو ہندوستان کو اپنے مستقبل پر غور کرنے میں پیش آرہی ہیں۔جب ایک ملک اپنی زندگی کے تمام اہم مسائل میں اپنے حکمرانوں کی مرضی کا پابند ہے تو وہ کس بنیاد پر اپنی آئندہ نشو و نما کا اندازہ کرے اور کس برتے پر اس کی تشکیل کی تدابیر سوچے۔جب تک وہ قوت جو دریا کی دھار کو موڑ سکتی ہے اپنے ہاتھ میں نہ ہو اس کے بہاؤ کا رخ پہلے سے کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے۔یہی احساس ہے جس کی بدولت اکثر ارباب فکر اور ارباب عمل جو واقعی ملک و قوم سے محبت رکھتے ہیں دوسرے کام چھوڑ کر سیاسی آزادی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور بعض عام تعلیم اور صنعتی تعلیم کے ذریعے ملک سے افلاس و جہالت کو دور کرنے کی دھن میں ہیں۔

سر مالکم کی نصیحت سن کر اکبر مرحوم کا ایک شعر یاد آتا ہے

غنیمت ہے شب فرقت کی فرصت　　رسالہ لکھو تحقیق کمر میں

مگر اکبر مرحوم خوب جانتے تھے کہ شب فرقت میں جو کرب اور بےچینی ہوتی ہے اس میں سوائے اختر شماری کے اور کسی قسم کی علمی تحقیقات ممکن نہیں۔سر مالکم بھی اسے خوب سمجھتے ہیں لیکن ان کی حکمت عملی کا یہی تقاضا ہے کہ ملک کی توجہ کو جس طرح ممکن ہو آزادی کی تحریک سے

ہٹاکر کسی اور طرف لگائیں۔ افسوس تو یہ ہو کہ جو ہندوستانی حضرات ایسے موقعوں پر خطبات صدارت ارشاد فرماتے ہیں وہ بھی اپنے آقا کی آواز کو دہرایا کرتے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے قومی تحریک پر چوٹ کرنے سے نہیں چوکتے۔

سر مالکم کی زبان سے یہ خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ انگریزوں کو بھی ہماری بہبود و ترقی سے دلچسپی ہو اور وہ اس کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم سفر کی کڑیاں جھیل کر منزل مقصود تک پہنچ جائیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ ہمارے ہمدرد ترقی کسے کہتے ہیں اور منزل مقصود سے ان کی کیا مراد ہے۔ اگر گول میز کانفرنس جس کا آج ہر طرف شہرہ ہو کبھی منعقد ہوئی تو یہ راز بھی غالباً کھل جائیگا۔

بے اعتمادی بھی عجیب چیز ہو۔ اگر کوئی دوسرا ہم سے کہتا کہ وقتی جھگڑوں میں زیادہ نہ الجھو بلکہ ابدی مسائل کیطرف توجہ کرو یا سیاسی اور اقتصادی آزادی پر زیادہ زور نہ دو بلکہ ذہنی اور روحانی آزادی کی کوشش کرو تو ہم اپنا سب سے بڑا خیر خواہ سمجھتے لیکن سر مالکم کی زبان سے یہ باتیں سن کر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ ہمیں لامکان ولازمان کا خواب اس لیے تو نہیں دکھاتے ہیں کہ زمان و مکان کو اپنے لئے محفوظ کرلیں، کہیں موصوف کی یہ کشادہ دلی اس بڑے بھائی کی فیاضی تو نہیں ہے جس نے چھوٹے بھائی سے کہا تھا۔

از صحن خانہ تا بہ لب بام از آں من
از سقف بام تا بہ ثریا از آں تو

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۳ بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء نمبر ۶

فہرست مضامین

۱۔ مسئلہ قضا و قدر — جمال الدین افغانی مترجمہ محمد حسین صاحب محوی لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن — ۴۱۰

۲۔ ادبیات ایران کی ترقی میں سلطان محمود کا حصہ — حسین حسان صاحب متعلم جامعہ — ۴۲۶

۳۔ طولسطائے اور میکا ئیلووچ کی خط و کتابت — محمود حسین خانصاحب سابق طالب علم جامعہ حال متعلم ہائیڈلبرگ یونیورسٹی — ۴۳۹

۴۔ بنیادی اصلاح — الفیم زوزلیا (ترجمہ از روسی) — ۴۶۳

۵۔ غزل فارسی — حضرت اصغر — ۴۸۱

۶۔ غزل اردو — حضرت جگر — ۴۸۲

۷۔ شذرات — ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ — ۴۸۳

مسئلۂ قضا و قدر

تعلیم یافتہ اور باخبر مسلمانوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو سید جمال الدین افغانی، اور اُنکے زندہ کارناموں سے واقف نہ ہو، اور یہ نہ جانتا ہو کہ سید صاحب موصوف اپنے مذہب و ملت کے کیسے سچے فدائی، غمخوار اور مسلمانوں کے کتنے بڑے محسن تھے۔

یہ مضمون انہیں کے پر زور، حقیقت شناس قلم اور حساس فکر کا نتیجہ ہے جسے محمد فواد شقارہ طرابلسی نے جو جامعۂ ازہر مصر کے متعلم تھے ۱۳۴۲ھ میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک رسالے کی صورت میں چھپوا کر شائع کیا تھا۔ اس کے نشر و اشاعت کا فخر مصر کے مشہور مطبعۃ المنار نے حاصل کیا، چونکہ غرض اس کی اشاعت سے ناشر کی ہے، اسی نے مجھے بھی اس کی اشاعت پر آمادہ کیا کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی بدقسمتی سے قسمت اور تقدیر کے معنی نہایت ہی غلط سمجھ رکھے ہیں۔

علامہ سید افغانی (رح) نے مسئلہ قضا و قدر کے ذیل میں جن حکیمانہ باتوں کو حوالۂ قلم کیا ہے کہ ہر متنفس مسلمان بلکہ ہر مشرقی شخص کا ان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مولنا کے زور قلم کی داد نہ دینا بھی انصاف کا خون کرنا ہے۔

نحوی

اپنی مخلوقات میں خدائے تعالیٰ کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ انسان کے دلی عقائد کا جسمانی اعمال پر زبردست اثر ہوتا ہے یعنی افعال میں جو کچھ بُرائی یا بھلائی ہوتی ہے اُسکا اصل سرچشمہ عقیدے کی عمدگی یا خرابی ہے۔ اور بار ہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عقیدہ انسان کے تمام خیالات پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ دوسرے عقائد اور معلومات بھی اسی کے تابع بن جاتے ہیں اور انسان کے تمام اعضا اور جوارح سے اسی عقیدے کے موافق ایسے اعمال ظاہر ہوتے ہیں

جس کا اثر نفس انسانی پر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان پر خواہ کیسا ہی مفید اور بہتر اصول پیش کیا جائے کیسی ہی بہتری کی بات بتائی جائے، خواہ وہ تعلیمی ہو یا تبلیغ مذہب کے لئے لیکن وہ اسے قبول کرنے میں تامل کرتا ہے اور اس کی بھلائی میں شبہ کرتا ہے۔ اور یہ شبہ بدستور اسے اصل عقیدے کے بالکل منافی اعمال میں مبتلا رکھتا ہے۔ اصل عقیدے کی ظاہری و معنوی صورت بدل جاتی ہے اور اپنی غلط فہمی یا خبث استعداد کی بدولت اُن سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ ان کا معتقد تو ہوگیا مگر یہ نہیں جانتا کہ اس کے غلط اور گمراہ کن اعتقاد نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ بظواہر کا فریب خوردہ انسان سمجھتا ہے کہ میرے تمام اعمال اُس مبارک اور سچے اعتقاد کا نتیجہ ہیں۔ اس قسم کے انحراف عقیدہ سے مذاہب و ادیان کے بعض اصولی اعتقادات میں تحریف پیدا ہو جاتی ہے اور غالبًا کیا بلکہ یقینًا یہی چیز ہر مذہب میں بدعت و گمراہی کی اصلی علت ہے۔ اکثر و بیشتر یہی انحراف عقیدہ اور اس کے توابع دوسری بدعتیں انسانی طبائع کی بربادی اور اُن سے بدترین اعمال کے ظہور کا سبب ہو جاتی ہیں۔ خدا جسے اس نامبارک بلا میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ بلا اُسے ہلاکت و تباہی تک پہنچا دیتی ہے، اور یہ انسان کا بدترین آل کار ہے۔ "اللهم احفظنا"، یہی چیز اُن لوگوں کو جو اصل راز سے بے خبر ہیں ایک سچے اور پاک مذہب پر طعن کی زبان کھولنے اور صحیح و حق عقیدے پر نکتہ چینی کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ اس طعن و طعن کی بنیاد زیادہ تر اُن سادہ لوحوں کے اعمال ہوتے ہیں جو اس دین کے نام لیوا ہوتے ہیں۔

اسی قسم کے عقائد میں سے ایک عقیدہ قضا و قدر بھی ہے جو اسلام کے سچے اور حق مذاہب کے اصولی عقائد میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر بہت سے یورپین غفلت کیش نکتہ چینیوں نے چیخ پکار مچائی ہے اور بہت خیال آرائیاں کی ہیں۔ وہ یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ جس قوم کے افراد میں یہ عقیدہ متمکن ہوگیا ہے اس نے ساری قوم کی ہمت و قوت سلب کر لی ہے۔ اور ان میں ضعف و انحطاط پیدا کر دیا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اس قسم کی بہت سی صفتوں سے

منسوب کرکے نشانہ ملامت اور ہدف ذلت بناتے ہیں، اور اُس کی علت غائی عقیدۂ قضا و قدر کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:-

مسلمان فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ وہ دنیا کی تمام قوموں سے جنگی اور سیاسی قوتوں میں پیچھے ہیں۔ ان میں کثرت سے اخلاقی برائیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ مثلاً بہت زیادہ جھوٹ بولنا، باہمی نفاق، بدعہدی و خیانت۔ ایک دوسرے پر حسد، اور بغض و کینہ۔ ان کا شیرازہ اتحاد منتشر ہوچکا ہے۔ وہ اپنے موجودہ اور آنے والے حالات سے بالکل بے خبر ہیں، وہ نہیں جانتے کہ کیا چیز اُن کے لئے مفید اور کیا ضرر رساں ہے۔ وہ ایسی زندگی پر قانع ہیں جس میں کھانے پینے اور سو رہنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں برتری حاصل کرنے کا خیال بھی کبھی اپنے دلوں میں نہیں لاتے۔ البتہ جب کبھی کوئی مسلمان اپنے کسی مذہبی بھائی کو نقصان پہنچانے پر آمادہ و قادر ہوتا ہے تو ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتا۔ اُن کا خوف و رعب آپس ہی میں ایک دوسرے پر مسلط ہے۔ اور اُن کی قوتیں باہم صرف ہو رہی ہیں۔ دنیا کی دوسری بیدار قومیں لقمہ کرکے ان کو چبا رہی ہیں اور نگلتی جا رہی ہیں۔ مگر وہ ہر پیش آنے والی مصیبت پر راضی اور ہر حادثے کو انگیز کرنے پر آمادہ ہیں، وہ اپنے مکانوں کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں نہایت سکون کے ساتھ رہتے ہیں۔ صبح اپنی چراگاہوں میں جاتے ہیں اور شام کو اپنے دارالامن (گھروں) میں پلٹ کر آتے ہیں۔ یہی اُن کی زندگی کا معیار ہے اور بس۔

مسلمان امراء دولت کے نشہ میں مست ہیں، کھیل کود میں مصروف ہیں۔ نفسانی خواہشوں کی تکمیل میں اپنی عزیز زندگی کی منزلیں آرام سے قطع کر رہے ہیں۔ حالانکہ انکے لئے اور بھی بہت سے فرائض ہیں، جن کے ادا کرنے میں انہیں اپنی عمریں صرف کردینی چاہئیں۔ مگر یہ ان فرائض کا ادنےٰ حصہ بھی ادا نہیں کرتے۔ اپنی عزیز دولت کو صرف اُن چیزوں پر اٹھاتے ہیں جن میں اپنی حیات کے عزیز لمحات کاٹ رہے ہیں، وہ بھی نہایت فضول خرچی و بے دردی کے ساتھ۔ اُن کے مصارف نہایت وسیع ہیں، مگر مصارف کے ذیل میں کوئی ایسی مد نہیں

جس کا نفع قوم وملت کو پہنچتا ہو۔ اپنے ذاتی مصالح اور فوائد پر وہ عمومی مصلحتوں اور فائدوں کو بیکار جانکر نہایت بے دردی سے قربان کر دیتے ہیں۔ ان سے نفرت کرتے اور پس پشت ڈالتے رہتے ہیں۔ اور بسا اوقات دو امیروں کا باہمی تنافر پوری قوم کو تباہ کرڈالتا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک امیر دوسرے کو خوشی سے برباد کرتا ہے اور اس پر اُس کی کسی ہمسایہ حکومت کو مسلط کرکے مسرور و مطمئن ہوتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ایک اجنبی حکومت محسوس کرلیتی ہے کہ ان میں ایک فانی قوت اور ضعف قاتل پیدا ہوگیا ہے تو دونوں امیروں کے مقبوضات سے اتنا حصۂ ملک خود ہڑپ کرلیتی ہے جن سے بظاہر اُن کو کوئی تکلیف و تکلف نہ ہو۔ مسلمانوں میں خوف ورعب عام طور پر پھیل گیا ہے۔ بزدلی و کاہلی اُن پر چھا گئی ہے، وہ ہنگامے سے گھبراتے ہیں۔ ذرا سی مصیبت سے چیخ اٹھتے ہیں۔ دوسری قوموں اور حکومتوں کو جو شوکت و قوت حاصل ہے اُسے خود حاصل کرنے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس باب میں وہ کھلم کھلا غلطی پر ہیں وہ اپنے احکام دین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ باوجودیکہ اپنی ہمسایہ قوموں کے اقدام کو دیکھ رہے ہیں، بلکہ جو قومیں اُنکے اقتدار و اثر میں تھیں وہ بھی اُن سے آگے نکل گئی ہیں اور اپنے حاصل کئے ہوئے مرتبے پر بجا طور پر فخر کر رہی ہیں۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ جب کسی ایک اسلامی ملک پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے یا کوئی دشمن دست درازی کرتا ہے تو دوسرے ملک کے عاقل مسلمان اُن کی مصائب کو دور یا کم کرنے میں بالکل حصہ نہیں لیتے۔ نہ اُس مظلوم کی امداد کے لئے اُٹھتے ہیں۔ ان میں بڑی بڑی ملکی و ملی انجمنوں کا وجود نہیں ہے نہ ایسی خفیہ یا علانیہ مجلسیں ہیں جن کے مقاصد میں یہ باتیں داخل ہوں:۔ مذہبی غیرت اور جوش کو زندہ کرنا، قومی حمیت کے جذبے کو ابھارنا۔ کمزوروں کی دستگیری کرنا، غربا، اور کمزوروں کے حقوق کو طاقتوروں اور سرکشوں کے ہاتھوں پامال نہ ہونے دینا۔ اپنے حقوق کی حفاظت کرنا ...... وغیرہ وغیرہ"

غرض ایسی بہت سی باتوں سے ارباب مغرب مسلمانوں کو متصف کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی

کہتے ہیں کہ اس کا سبب اصلی اور حقیقی سرچشمہ مسلمانوں کا عقیدۂ قضا و قدر ہے یعنی ‘‘ اپنے تمام اہم مقاصد اور معاملات کو قدرت خداوندی کے سپرد کر دینا’’، ان لوگوں کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ اگر مسلمان اس عقیدے پر یونہیں ہمیشہ قائم رہے تو ایک دن دنیا میں اُنکا کوئی مرکز و مرتبہ نہ رہے گا۔ اور نہ وہ کبھی عزت کے اعلیٰ مدارج پر قائم ہو سکتے، نہ اپنے حقوق پا سکتے، نہ دوسروں کے مظالم اور حقوق کی پامالی کو دور کر سکتے نہ اپنے کسی بادشاہ کی حمایت کے لئے اٹھ سکتے بلکہ برابر اُن کا قومی زوال بڑھتا اور اُن کے نفوس میں گھُن کی طرح اپنا کام کرتا رہے گا۔ اُن کے دلوں کو پیچھے ہٹاتا رہے گا۔ یہانتک کہ اُن کو منتہائے فنا تک پہنچا دے گا۔ معاذ اللہ خدانخواستہ خود اُن میں سے ایک دوسرے کو اپنی ذاتی خصومتوں کی بدولت ہلاک کر دے گا۔ اور جو کچھ اُس کے ہاتھوں سے بچ رہے گا اُسے اغیار چھین لیں گے۔

دانایان مغرب کا یہ خیال بلکہ عقیدہ ہے کہ عقیدۂ قضا و قدر، اور عقیدۂ جبر یہ میں (جو یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال میں مجبور محض ہے) کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ مسلمان اس عقیدۂ تقدیر کی بنیاد پر بالکل اُس تنکے کے مانند ہیں جو ہوا میں معلق ہو۔ ہوا اُسے ہچکولے دیتی رہتی ہے اور جدہر چاہتی ہے جھکا دیتی ہے۔ اور جب کسی قوم میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ اُس کو قول، فعل، حرکت، سکون، غرض کسی بات میں بھی کچھ اختیار نہیں۔ بلکہ وہ مجبور محض ہے، اور یہ سب ایک زبردست طاقت، ایک قوی قدرت کے ہاتھ میں ہے تو یقیناً اس قوم کے تمام قوے بالکل معطل اور بیکار ہو جائیں گے اور خدائے تعالےٰ نے مدارج اور عقل انسانی کا جو حصہ انہیں دیا ہے وہ بالکل معدوم ہو جائے گا۔ اُن کے دلوں سے سعی و عمل کا پاک جذبہ فنا ہو جائے گا۔ اس صورت میں تو ایسی قوم کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ اس عالم وجود سے ہمیشہ کے لئے سیدہا عالم عدم کا رستہ لے۔

یوروپ ہی کے ایک گروہ کا یہ خیال ہے اور وہ قوی سے قوی تر بھی ہے کہ ضعیف العقول ...

گمان بالکل جھوٹ ہے، یہ خیال سرتاپا غلطی پر مبنی ہے، اور یہ وہم تمامتر باطل و بے سروپا ہے۔ یہ گروہ خدائے پاک اور تمام مسلمانوں پر افترا کرتا اور جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں ایک متنفس بھی، شیعہ، سنی، زیدی، اسماعیلی، وہابی یا خارجی ایسا نہیں جو محض جبر کا قائل ہو۔ اور اپنے کو بالکل غیر مختار جانتا ہو۔ بلکہ ان تمام اسلامی فرقوں میں ہر ایک کا یہ اعتقاد ہے کہ ہمیں اپنے اعمال میں یقیناً اختیار کا بھی ایک جز حاصل ہے۔ اور اس فرد کو وہ "کسب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس پر ثواب و عذاب کا دارومدار ہے۔ ان سب کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ خدا نے جتنا اختیار کا حصہ دیا ہے، اس کا محاسبہ کیا جائے گا۔ اُن سے تمام خداوندی احکام کی بجاآوری اور ممنوعاتِ ربانی سے بچنے کا مطالبہ ہوگا۔ یہی اوامر و نواہی در اصل فلاح و خیر کی جانب انسان کو لیجانے والے ہیں اور یہی ہر بہبودی کی طرف راہ نما ہیں۔ اختیار کی یہی وہ قسم ہے جسے تکلیفات شرعیہ کا سرچشمہ کہتے ہیں۔ اور اس پر حکمت و نصفتِ الٰہی کی تکمیل ہوتی ہے۔

ہاں، بیشک، مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا تھا جسے "جبریہ" کہتے ہیں۔ اُس کا یہ مسلک تھا کہ انسان اپنے تمام اعمال میں ایسا مجبور ہے کہ اُسے اختیار کی ہوا تک نہیں لگی۔ اس کا خیال تھا کہ آدمی کھانے اور چبانے کے لئے اپنے جبڑوں کو جو حرکت دیتا ہے، شدت سردی سے کپکپاتا ہے، اس میں بھی مجبور محض ہے مگر عام مسلمان اسے "لا ادریہ" کے جاہلانہ اور فاسدانہ نزاعات میں شمار کرتے ہیں۔ اس عقیدے کے قائل چوتھی صدی ہجری کے آخر میں دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے، اُن کا نام و نشان تک آج صفحہ ہستی پر باقی نہیں۔ وہ عقیدۂ قضا و قدر، بعینہٖ "عقیدۂ جبر" ہرگز نہیں ہے۔ اور نہ اس عقیدے کے وہ نتائج اور مقتضیات ہیں جو یہ مغربی وہمی اور خیالی پلاؤ پکانے والے سمجھے ہوئے ہیں۔
اب رہا "عقیدۂ تقدیر" اس کی تائید ایک زبردست دلیل سے ہوتی ہے۔ بلکہ خود فطرت اس کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ جس کو غور و فکر کا مادہ قدرت نے دیا ہے۔

اس کے لئے یہ کچھ دشوار نہیں کہ ہر پیش آنے والی چیز کی طرف ایک نگاہ ڈالے اور ذرا التفات سے کام لیکر یہ سمجھے کہ ہر پیش آنیوالی چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے، جو دنیا میں اُس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ غور و فکر کرنے والا اس سلسلہ اسباب میں انہیں اسباب کو دیکھ سکتا ہے جو خود اُس کے پیش نظر ہوں۔ اور ان کے ماضیات کو اُس خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا جو خود اس کے نظام کو عدم سے وجود میں لانیوالا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک سبب کا اپنے آگے آنے والے واقعات میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ خود خدائے عزیز و علیم کا مقرر کیا ہوا نظام ہے۔ انسانی ارادہ اس سلسلہ کی کڑیوں میں سے صرف ایک کڑی ہے۔ یہ ارادہ بھی آثار و ادراک کا ایک نشان و اثر ہے اور ادراک کیا چیز ہے؟ نفسانی خواہشات کا علم جو حواس اور شعور پر صادر ہوتی ہیں اور جو انسانی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں اُن سے نفس کی اثر پذیری کائنات کے ظاہری حالات کو ارادہ و فکر پر جو قدرت و تسلط حاصل ہے اُس سے کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی انکار نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ عقلمند آدمی! ـــ جن اثرات کو تم مظاہر میں موثر دیکھتے ہو۔ ان سب کا مبدا اُس کائنات کے مدبر اعظم کے ہاتھ میں ہو۔ جس نے تمام اشیاء کو اپنی حکمت و مصلحت کی بنیاد پر پیدا کیا ہے۔ اور ہر نوپیدا کو اپنی ہی جیسے کا تابع بنایا ہے۔ گویا وہ اس کا ایک بدل ہے۔ تا عنصر عالم انسانی میں۔

اگر ہم فرض کر لیں کہ ایک جاہل ایسے معبود کے ماننے سے منکر ہے جو اس عالم کا بنانے اور ایجاد کرنے والا ہے۔ پھر بھی اُس کے امکان سے یہ باہر ہے کہ بشری ارادوں میں حوادث زمانی اور موثرات طبعی کی تاثیر کو ماننے سے وہ پہلو تہی کرے۔ کیا کسی انسان کے امکان میں یہ ہے کہ وہ اپنے کو خدا کے اس قانون و قاعدے سے الگ رکھ سکے۔ جو اس کی مخلوق میں جاری اور نافذ ہے۔ یہ وہ بات ہے جسے تمام طالبان حق و صداقت مانتے ہیں۔ و اصلین کا تو کہنا ہی کیا ہو۔

اس کے علاوہ یورپ کے بعض فلاسفہ اور علمائے سیاست خود قضا و قدر کی طاقت و سطوت کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ اور انہوں نے بہت تفصیل سے اثبات

قضاو قدر پر اپنے بیانات و مضامین میں کام لیا ہے۔ مگر ہمیں اُن کی آرا، و افکار سے سند و شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تاریخ کے لئے روایت سے بالاتر ایک علم اور ہے۔ جس کی طرف ہر قوم و ملت کے علمار نے اپنی پوری توجہ صرف کی ہے۔ یہ وہ علم ہے جو قوموں کے عروج و زوال، انحطاط و اقبال کے باب میں اُن کی اخلاق و سیرت سے بحث کرتا ہے، اور اہم ترین حوادث کے عام و خاص وجوہ، اصلی راز و خصائص سے پتا چلاتا ہے کہ اُن کے عادات اور خیالات کیا ہوں گے۔

اس کے تابع قوموں کے نشوو ارتقا اور نئی حکومتوں کا وجود میں آنا۔ یا بعض قوموں کا فنا ہونا، کہنہ و فرسودہ ہونا، غرض کیا کیا تغیرات ہوتے ہیں۔ کیا کیا صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان سب سے زیادہ اہم اور بلحاظ فائدہ سب سے بالاتر قرار دیا ہے۔ اس علم کی بنیاد بحث عقیدۂ قضاؤ قدر پر ہے اور اس یقین و ایمان پر کہ تمام بشری طاقتیں، مدبر کائنات (باری تعالیٰ) ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جو کائنات کا منتظم اور واقعات و حادثات کو عمل میں لانے والا ہے اور اگر قدرت بشری بلحاظ اثراندازی کچھ قادر و موثر ہوتی تو نہ کوئی بلند مرتبہ آدمی زوال کا شکار ہوتا۔ نہ کوئی ضعیف و کمزور طاقتور ہو سکتا نہ کوئی اپنے مرتبے سے گرتا اور نہ کسی سلطنت و سطوت کا بھی خاتمہ ہوتا۔

قضاؤ قدر کا مسئلہ اگر جبر محض کسی بداثری سے الگ ہو تو یہ حقیقت ہے کہ اس کے ساتھ ہی جرأت و اقدام کی صفت اور بہادری و دلاوری کی خصلت ظہور میں آتی ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو ہلاکت آفریں معاملات میں گھس پڑنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ وہ معاملات جن سے بڑے بڑے شیروں کے دل لرزتے اور جن سے دلاور چیتوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ یہی اعتقاد نفوس انسانی کو ثبات کا خوگر، مصائب کی برداشت کا عادی، اور ہولناک مہمات میں کود پڑنے کا متحمل بنا دیتا ہے۔ انسان کو سخاوت و دریا دلی کے نفیس زیوروں سے آراستہ کر دیتا ہے۔ ہر اُس چیز پر آمادہ کر دیتا ہے۔ جو آدمی پر گراں ہو سکتی ہے۔ بلکہ انہیں اپنی جانیں فدا کر ڈالنے، شادی

حیات سے کنارہ کش ہو جانے تک پر بخوشی تیار کر دیتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ حق و انصاف کی راہ میں صرف اُسکا عقیدۂ قضا و قدر ہی آمادہ کرتا ہے۔

جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ زندگی محدود ہے۔ رزق مقرر ہے۔ تمام اشیاء اور اُن کا نظام خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ انہیں جس طرح چاہتا ہے تصرف میں لاتا ہے ظاہر ہے کہ ایسا آدمی حق و صداقت کے لئے مدافعت کرنے میں موت کی کیا پروا کر سکتا ہے، اپنی قوم و ملت کا بول بالا ہونے نیز خدا نے جو فرض اُس پر عائد کیا ہے اُس کے بجالانے میں موت سے کیا ڈر سکتا ہے۔ اپنے عزیز مال و دولت کو حمایتِ حق، اور اپنے مجد و شرف کے استحکام میں صرف کرنے پر اور وہ بھی اوامر خداوندی کے بموجب، نیز انسانی تمدن و اجتماع کے موافق، وہ تنگ دستی و فقر کے خوف سے کیا اثر پذیر ہو سکتا ہے۔

خدائے بزرگ و برتر نے اس عقیدے کی بنیاد پر مسلمانوں کی تعریف کی اور فضیلت بیان فرمائی ہے۔ وہ ارشاد فرماتا ہے:-

الذین قالوا ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوہم
فزادہم ایماناً و قالوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔
فانقلبوا بنعمۃ من اللہ و فضل لم یمسسہم سوء
واتبعوا رضوان اللہ واللہ ذو فضل عظیم۔

مسلمانوں نے اپنی نشأت اولین میں اقطار عالم کی طرف پیش قدمی کی اُن کو فتح و تسخیر کرتے، اور اُن پر اپنی سطوت و جبروت کا سکہ قائم کرتے چلے گئے۔ اس شان سے کہ انسانی عقلیں محو تعجب رہ گئیں اور فہم و خرد سراپا تصویر تھی۔ یہ دیکھکر کہ بڑی بڑی با جبروت حکومتوں کی انہوں نے اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور زبردست قوموں کو مغلوب کر لیا۔ اُن کی حکومت کا سکہ برنیز کے پہاڑوں سے، جو اسپانیا اور فرانس کے درمیان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیوار چین تک رائج ہو گیا باوجودیکہ اُن کی تعداد قلیل تھی اور مختلف آب و ہوا کے خوگر، رنگا رنگ ممالک کے موسمی اثرات کے

عادی نہ تھے۔ بڑے بڑے گردن فراز بادشاہوں کی ناکیں رگڑوادیں۔ پرشوکت قیصروں اور کسراؤں کو مجبور دمقہور کردیا۔ اور وہ بھی اتنی قلیل مدت میں جو اسّی سال سے زیادہ نہیں کہی جاسکتی۔ حقیقت میں یہ چیز خوارق عادات، اہم ترین معجزات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ یہ مافوق الفطرت ہے۔ مسلمانوں نے بڑے بڑے ممالک کو زیرنگیں کیا۔ سربفلک دھسوں اور ٹیلوں کو ملیامیٹ کردیا، زمین کے اس ساتویں طبقے پر جنگی گردوغبار سے ایک آٹھواں طبقہ اورکھڑا کردیا۔ انہوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا۔ اور اُن کی جگہ اُن کی سطوت کے خلاف سر اٹھانے والوں کے سروں سے پہاڑ اور ٹیلے کھڑے کردئیے ہر دل کو لرزادیا۔ اور ہر شانے کو پھڑکا دیا۔ دیکھو تو ان کو ان مہموں میں آگے بڑھانے والا عقیدۂ قضا وقدر کے سوا کون تھا۔

یہ اعتقاد ہی وہ زبردست قوت ہے جس کی بنیاد پر مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے قدم اُن جرار لشکروں کے سامنے جمے رہے اور نہ ڈگے۔ جن سے قضائے الٰہی برہم تھی۔ اور یہ بسیط ارض ان پر تنگ ہوگیا تھا پس ان جاں باز ٹکڑیوں نے دشمنوں کو اُنکے مرکزوں سے ہٹا دیا۔ اور پیچھے پاؤں لوٹا دیا۔

اسی اعتقاد کی بدولت مشرق میں اُن کی خارا شگاف تلواریں چمکیں اور اُنکے جہاں سوز شعلوں نے جنگ کی آندھیوں میں مغرب کے برگشتہ نصیبوں کو خاک کردیا۔ یہی اعتقاد تو ہے جس نے مسلمانوں کو اپنی دولت اموال لٹا دینے پر آمادہ کردیا تھا۔ اور اپنی تمام املاک کو محض اپنی قومی حکومت کے اعلاء کلمہ (بول بولا) کے لئے خرچ کرکے نہ وہ فاقے سے ڈرتے تھے۔ نہ فقر کے اندیشے سے سراسیمہ و پریشان ہوتے تھے۔ یہی اعتقاد تو ہے جس نے مسلمانوں پر یہ اثر کیا کہ وہ اپنی بیویوں، بچوں، اور جو کچھ اُن کی گودوں میں تھا، سب کو جدال وقتال کے میدانوں میں لیکر پہنچ جاتے تھے۔ اور وہ بھی دنیا کے بالکل آخری سرے تک اور اس طرح جیسے سیر وتفریح کے لئے باغوں کو جارہے ہیں، گویا وہ اپنی جانوں کا ہر آفت وبلا سے خدا کے

بھروسہ کا بیمہ کرا چکے تھے۔ اور اپنی عزیز جانوں کے گرد انہوں نے خدا پر اعتماد کا ایک مضبوط حصار تیار کر لیا تھا۔ وہ حصار جو رات کی آنے والی تاریکیوں میں آنے والی مصیبت سے اُن کو، اُن کے بچوں، اور بیویوں کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔ وہ بیوی، بچے جنہیں یہ مٹھی بھر مسلمان اپنی فوج ظفر موج کو پانی پلانے اور دیگر احتیاج کی فراہمی و خدمت پر مامور کرتے تھے۔ ان معرکوں میں عورتیں اور بچے جوانوں اور بوڑھوں سے الگ نہیں رہتے تھے۔ نہ اُن میں کوئی ما بہ الامتیاز فرق رکھا جاتا تھا۔ نہ عورتوں پر کوئی خوف طاری ہوتا تھا۔ نہ بچوں پر کوئی خطرہ کی حالت۔ یہی وہ اعتقاد تھا جس نے مسلمانوں کو اس حد پر پہنچا دیا تھا کہ اُن کا نام لینا دلوں کو دہلا دیتا تھا۔ اور جگر کے ٹکڑوں کو پراگندہ کر دیتا تھا۔ یہانتک کہ وہ صرف رعب سے فتح حاصل کر لیتے تھے اور اپنے دشمنوں کے دلوں کو نشانہ بناتے چلے جا رہے تھے۔ وہ محض اپنی سیاہ رعب و سطوت سے دشمنوں کو شکست دیدیتے تھے۔ قبل اس کے کہ دشمن اُن کی تلواروں کی بجلیوں کو کوندتا ہوا دیکھیں۔ اور اُن کے بھالوں، برچھیوں اور نیزوں کی تڑپ اور چمک کا روح فرسا نظارہ کریں بلکہ اس سے بھی پہلے کہ دشمنوں کے حدود میں مسلمانوں کے لشکر پہنچیں۔

میں روتا ہوں اُن بزرگوں پر اور نوحہ و ماتم کرتا ہوں ان اسلاف پر۔ کہاں ہو تم اے حزب اللہ؟ کہاں ہو تم اے انصار اللہ! کہاں ہو تم اے بہادری اور دلاوری کے اٹل جھنڈو! کہاں ہو تم! اے قوت و شوکت کے بلند ستونو؟ کہاں ہو تم اے شرفا کی اولاد امجاد؟ اور مصیبت کے وقتوں میں مظلوموں کے فریاد کو پہنچنے والو؟! کہاں ہو تم اے

خیر اُمتہ اخرجت للناس تامرون
بالمعروف وتنہون عن المنکر؟

کہاں ہو تم اے شرفاء و معزز لوگو؟! اے عدل و انصاف کے علم بردارو! اے مساوات کے قائم کرنے والو! اے حکمت کی ما... بولنے والو! اے امت کی بنیاد رکھنے اور مضبوط کرنے والو! تم اپنی قبروں کے شگافوں سے کیا نہیں دیکھتے کہ تمہارے خلف کس درجہ کو پہنچ گئے ہیں؟! وہ تمہاری

اولاد کس مصیبت کا شکار ہے؟ تمہارے لگائے ہوئے پودے میں کیا گھن لگ رہا ہے؟ آہ!
یہ تمہارے نقوش قدم سے ہٹ گئے، یہ تمہارے طریقوں سے دور ہو گئے، تمہارے راستے سے
الگ جا پڑے ہیں، ٹکڑیاں ٹکڑیاں ہو گئے ہیں، ضعف و انحطاط کی آخری حد کو پہنچ گئے ہیں۔
اُن پر افسوس و تاسف سے دل پانی پانی، رنج و حزن سے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جاتے
ہیں۔ وہ آج غیر قوموں کے شکار ہیں۔ آج اتنی سکت نہیں رکھتے کہ اپنے دائرہ حکومت سے
مدافعت کر سکیں۔ دشمنوں کو اپنے احاطہ مملکت سے باہر نکال سکیں۔ کیا تمہارے برزخوں میں
کوئی اتنا پکار کر کہنے والا نہیں جو غافلوں کو ہشیار اور سوتوں کو بیدار کرے۔ گمراہوں کو سیدھا
راستہ بتائیے۔ (انا للّٰہ وانا الیہ راجعون)

میں کہتا ہوں، اور کسی ایسے خام خیال سے نہیں ڈرتا جو مجھ سے میرے اس قول میں
بحث کرے، کہ انسانی تمدن و اجتماع کے آغاز تاریخ سے آجتک کوئی ایسا زبردست فاتح
نہیں پایا جاتا۔ اور نہ ایسا جنگ جو گزرا جو متوسط طبقے میں پیدا ہوا ہو۔ اور محض اپنی ہمت سے ترقی
کر کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ گیا ہو۔ کہ بڑے بڑے سورما اُس کے آگے جھک گئے ہوں اور
گردنیں اُس کے آگے خم ہو گئی ہوں۔ اُس نے ملک و حکومت کو اتنا وسیع کر لیا ہو کہ موجب حیرت
ہو۔ اور اپنی فکر کو حصول منافع کے لئے انتہائی حد تک جولانی دی ہو۔ مگر یہ کہ وہ قضا و قدر کا
ضرور قائل ہو گا۔ "سبحان اللہ" انسان اپنی زندگی پر حریص ہے، وہ فطرت و جبلت کے موافق
اپنے کو زندہ و برقرار رکھنے کا آرزومند ہے، پھر وہ کیا چیز ہو سکتی ہے جو اُس کے لئے ہولناکیوں
میں گھس پڑنے، اور خطرناک مہموں میں در آنے، موت و فنا سے دو بدو مقابلہ کرنے کو آسان کر دے۔
اور کچھ نہیں صرف یہی عقیدۂ قضا و قدر ہے۔ اور دل کو اس اعتقاد پر ثابت رکھنا!۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کورش فارسی (کے خسرو) جو تاریخ قدیم میں دنیا کا پہلا فاتح تھا۔
اُس کے وسیع ترین فتوحات کے سلسلے کو جس چیز نے جاری رکھا وہ یہی قضا و قدر کا اعتقاد تھا۔
اس اعتقاد کی وجہ سے کوئی خطرہ اُسے ہراساں اور کوئی مصیبت اس کے عزم کو شکست نہیں

کرتی تھی - یونان کا اسکندر اعظم بھی انہیں لوگوں میں تھا جن کے دلوں میں یہ عقیدہ جلیلہ راسخ تھا
چنگیز خاں تاتاری، صاحب فتوحات مشہورہ بھی اس عقیدے کے لوگوں میں تھا۔ بلکہ نپولین اول
بوناپارٹ (فرانسیسی) قضا و قدر پر سب سے زیادہ اعتماد رکھنے والا سردار تھا۔ یہی عقیدہ تو
تھا جو اُس کے مختصر سے لشکر کو ایک ٹڈی دل پر بڑھائے لئے چلا جا رہا تھا - اُس کے فتح و نصرت
کے سامان پیدا کر رہا تھا، اور وہ حسب آرزو فتح حاصل کرتا چلا جاتا تھا۔

پس کیا اچھا اعتقاد ہے وہ، جو نفوس انسانی کو نامردی و بزدلی کی کثافت سے پاک
کرے - وہ بزدلی جو اپنے مبتلا کو اس کے طبقے میں درجۂ کمال پر پہنچنے سے سب سے پہلا مانع ہو
- ہاں، بیشک! میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ اس عقیدے کو بعض عوام مسلمانوں کے
دلوں میں عقیدۂ جبر کے شائبوں سے مخلوط کر دیا ہے - اور یہی خلط ملط بعض مصائب میں ان
کے گھر جانے کا سبب ہو گیا جس کی وجہ سے آخری صدیوں میں اُن کو چند حوادث نے
گھیر لیا -

اب ان علما ء عصر سے جو راسخ العقیدہ ہیں - ہماری یہ استدعا ہے کہ اس مبارک عقیدے
پر جو بدعات وغیرہ طاری ہو گئے ہیں۔ اُن سے اسے چھڑانے اور بچانے پر کوشش و توجہ مبذول
کریں۔ عامتہ الناس کو سلف صالحین کے عقیدے یاد دلائیں - اور جو کچھ وہ کرتے تھے۔ ان میں
بھی اس کا رواج پھیلائیں - ہمارے ملت کے امام جیسے غزالی اور اُن کے مانند دیگر علما رتے جو
کچھ بیان کیا ہے کہ قضا و قدر پر توکل و تکیہ کا اصل مفہوم کیا ہے - اس کو سمجھائیں کہ شریعت غرار
تو ہم سے عمل میں توکل چاہتی ہے نہ کہ غفلت اور کاہلی و سستی میں نہیں خدا نے یہ حکم نہیں دیا ہے
کہ اپنے فرائض کو چھوڑ دیں - جو ہمارے حیاتی و قومی واجبات ہیں . خدا پر توکل کر کے اُن سے
کنارہ کشی ہو جائیں - یہ دلیل تو دین سے نکل جانے اور پھر جانے کی ہے - اہل اسلام میں سے
کوئی بھی اس میں شک نہیں کر سکتا کہ اس وقت ہر مسلمان مکلف پر " دفاع عن الملۃ " فرض
عین ہے - اس وقت کوئی ایسی چیز نہیں جو مسلمانوں کو اُن کے عقائد حقہ کی طرف ملتفت کرے،

اُن کی جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرے اُن کی عزت و عظمت کو دوبارہ دلائے، اپنی پہلی شان دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اُن کی غیرتوں کو ابھارے۔ سو علماء کی بہترین دعوت کے۔ اور یہ انہیں علماء کے ذمے اور انہیں کی توجہ پر منحصر ہے۔

اب رہا مسلمانوں کا انحطاط، اور دوسری قوموں سے پیچھے رہنا، اس کا سبب نہ یہ عقیدہ ہے اور نہ اسلامی عقائد میں سے کوئی اور دوسرا عقیدہ۔ اس عقیدے کی طرف مسلمانوں کے قومی انحطاط کی نسبت کرنا، گویا ایک نقیض کی نسبت دوسری نقیض کی طرف کرنا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ایسا ہے جیسے حرارت کی نسبت برف کی طرف اور برودت کی آگ کی طرف۔ ہاں! مسلمانوں کی نشأت کے بعد اُن کی فتح و ظفر کو دھچکا لگا اور اُن کے اقتدار و عظمت کو صدمہ پہنچا۔ وہ یہ کہ مسلمان اس عالم ترقی میں تھے کہ اچانک دو زبردست صدمے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ ایک مشرق سے۔ یہ تاتاریوں یعنی چنگیز خاں اور اس کے اخلاف کی غارتگری تھی۔ دوسرا صدمہ مغرب کی جانب سے۔ یہ یوریبین اقوام کا اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں پر حملہ تھا۔ بڑھتی ہوئی حالت میں ایکدم ایسا صدمہ انسان کی صحیح رائے کو کھو دیتا ہے۔ اور تقاضائے فطرت دہشت و خوف اور پھر غشی و بے ہوشی کا سبب ہو جاتا ہے۔ آخر یہی ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں مختلف حکومتیں رہیں۔ امارت نااہلوں کے ہاتھ آئی۔ اور مہمات کی باگ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی جو ریاست کے حسن و خوبی سے بیگانہ تھے۔ یہی حکام اور امراء مسلمانوں کے اخلاق اور طبائع میں نقائص پیدا کرنے والے جراثیم تھے۔ اور اُن پر ادبار و بدبختی کی بلا لانے والے۔ اس سے مسلمانوں کے نفوس میں ضعف جاگزیں ہو گیا۔ اور اُن میں سے بہتوں کی نظریں جزئیات تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ جو موجودہ لذت و لطف سے متجاوز نہ تھیں۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی کھوپری پکڑ لی اور ہر پہلو، ہر صورت سے اس کو نقصان پہنچانے اور تباہی و خرابی میں مبتلا کرنے کی ٹوہ میں رہنے لگے۔ وہ بھی بغیر کسی صحیح و مناسب سبب، اور کسی قوی و واقعی باعث کے اس کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھنے لگے۔ آخر اُن کا ہر شعبۂ حیات ضعف و یاس تک پہنچ گیا، جو آج نظر آ رہی ہے۔

مگر میں یہ دیکھتا اور کہتا ہوں کہ یہ قوم کبھی مردہ نہیں ہو سکتی۔ جبتک یہ پاکیزہ عقائد اس قوم کے دلوں میں راسخ اور اپنے صحیح مرکز پر ہیں اور جب تک ان عقائد کے نقوش انکے ذہنوں میں تاباں نظر آتے ہیں۔ اس وقت جو مرض بھی عقلی ہو کہ نفسی ان کو عارض ہو گیا ہے ان عقائد صحیحہ کی قوت اُسے دفع کرے گی۔ وہ انشاء اللہ پھر اُسی حالت پر پہنچ جائیں گے جس پر پہلے تھے۔ اور اپنے مضبوط بندھنوں سے کھل جائیں گے۔ اپنے ممالک کو نجات و آزادی دلانے میں طامع و حریص اقوام کو مرعوب و خوف زدہ کرنے میں حکمت و بصیرت کے جو طریقے ہیں وہ اختیار کریں گے۔ اور انہیں اُن کی حد پر رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔ یہ مشکل آسان ہونا دور نہیں ہے، تاریخی واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔ تم ذرا انہیں ترکوں کو دیکھو جو اسی قوم کے زبردست صدمات اور نقصانات کے بعد بیدار ہوئے ہیں۔ (یعنی تاتاری اور صلیبی جنگوں کے بعد) انہوں نے اپنے جرار لشکر اطراف عالم میں دوڑا دیے۔ اور فتوحات کے میدان اُن کے لئے برابر وسیع ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے بڑے بڑے ملکوں کو روند ڈالا۔ گردن فراز بادشاہوں کی ناکیں رگڑوا دیں۔ اور یورپ کی حکومتوں کی گردنیں اپنی سطوت و جبروت کے آگے جھکوا دیں۔ حتیٰ کہ دول یورپ عثمانی سلطان کو "سلطان اعظم" کے نام سے یاد کرتی تھیں۔

پھر اب ذرا نظر پھیر کر دیکھو! تم اب بھی ان میں ایک لہر اور ایک حرکت پاؤ گے۔ آخری حادثات کے انجام، اور نامبارک نتائج کے بعد جو خوفناک اثرات ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ترکوں میں یہ حرکت اُن سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ حرکت ترکوں کے ارباب دانش و بصیرت کے افکار و خیالات میں ساری ہو گئی ہے۔ انکے ملک کے اکثر حصوں میں، مشرق و مغرب میں حمایت حق کے لئے بہترین لوگوں کی جماعتیں بن گئی ہیں۔ جنہوں نے اپنی جانوں پر عدل و انصاف کی مدد، شریعت و قانون کی اعانت، اور سعی و عمل کو فرض کر لیا ہے۔ اپنے افکار و خیالات پھیلانے اور اتحاد کے منتشر شیرازے کو جمع کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہ متفرق ٹکڑیوں کو ملانے پر کامیاب ہو گئے ہیں اُنہوں نے اپنے کاموں کی فہرست میں سب سے چھوٹا کام ایک عربی اخبار کا اجرا

قرار دیا ہے، تاکہ جو کچھ اُس میں لکھا جائے وہ دور دراز مقامات پر رہنے والوں تک پہنچ جائے۔ اور دوسرے اُن کی نسبت جو کچھ دل میں لئے ہوئے ہیں وہ اُن تک منتقل ہو جائے۔ میں دیکھتا ہوں کہ بہترین سیاسی انجمنوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ان انجمنوں کو ان کے ارادوں میں کامیابی ہو۔ ان کا جو سچا اور حق مقصد ہے۔ تائید الٰہی اس کے شامل حال رہے۔ اور اُسی کے فضل و کرم سے مجھے یہ بھی توقع ہے کہ ان انجمنوں کی حسن سعی کا کوئی ایسا اثر مرتب کرے جو مشرقیوں کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصیت سے مفید ہوگا۔ انشاء اللہ۔

ادبیات ایران کی ترقی میں

سلطان محمود غزنوی کا حصّہ

(بسلسلۂ گذشتہ)

محمود غزنوی کی علمی قدردانیاں اس سے پہلے آپ جو کچھ پڑھ چکے ہیں اس سے آپنے اندازہ کیا ہوگا کہ محمود غزنوی کی ادبی قدردانیوں نے ایرانی شاعری اور زبان کو عروج کمال پر پہنچا دیا تھا لیکن اس نے ادبی قدردانی اور شعرانوازی پر ہی اکتفا نہیں کی تھی بلکہ اس کے ساتھ وہ علماء کا بھی ویسا ہی قدردان تھا۔ اگر ایک طرف عنصری فردوسی اور فرخی جیسے مایۂ ناز شعرا اس کے دربار کی زینت تھے تو دوسری طرف البیرونی احمد بن حسن میمندی او بیہقی اور ابن الفارجیسے مشہور اہل علم اس کی قدر افزائیوں کے خوشہ چیں تھے۔ علمار کی صحبت سے فیض حاصل کرنیکا اسے شوق نہیں حرص تھی۔ مشہور علمار کو اپنے دربار میں لانے کے لئے وہ اپنی پوری کوشش صرف کردیتا تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ خوارزم شاہیوں سے معرکہ آرائی کا [illegible] مقصد [illegible] وہ بیرونی اور دوسرے علماء کو حاصل کرے۔ اور وہ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ اس نے بو علی سینا کو بھی اپنے دربار میں بلانیکی کوشش کی لیکن اس نے متعدد مصالح کی بنا پر اس کو قبول نہیں؛ اور بدقسمتی سے محمود کا دربار ایک ایسے نادرۂ روزگار عالم سے محروم رہا۔ بیرونی کے علاوہ اس کے دربار میں احمد بن حسن میمندی اور دیگر علمائے وقت بھی موجود تھے گو انہوں نے کچھ ایسی نمایاں شہرت حاصل نہیں کی لیکن کوئی شک نہیں کہ یہ اپنے وقت کے کامیاب لوگوں میں تھے اور محمود کے دربار کی زینت تھے۔ یہاں مختصر طور سے محمود کے دربار کے بعض مشہور علمار کا مختصر طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

بیرونی[۵۱]

البیرونی کی پیدائش نیوا یا خوارزم[۵۲] کے ایک قریہ میں ہوئی۔ سنہ پیدائش ۳۶۲ھ (۹۷۳ء) ہے
بعض مورخین نے اسکا وطن سندھ بتایا ہے لیکن انہیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے
سندھ میں نیرون (بالنون) ایک قصبہ تھا جسے بعض مورخین نے بیرون پڑھ لیا اور بیرونی کو
اسی بیرون کا باشندہ سمجھ لیا لیکن یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ وہ مضافات خوارزم کے ایک قریہ کا
رہنے والا تھا۔ جس کا نام غالبًا بیرون تھا (یا وہ بیرون شہر کا رہنے والا تھا) بیرونی کے ابتدائی
حالات تاریکی میں ہیں اتنا معلوم ہے کہ اس کی ابتدائی تربیت آل عراق (خوارزم کا شاہی خاندان)
کی سرپرستی میں ہوئی۔ خصوصًا ابونصر منصور بن علی بن عراق نے اس کی طرف خاص توجہ
کی افسوس ہے کہ باوجود بہت کچھ تلاش و تفحص کے بیرونی کا سلسلہ نسب دریافت نہ ہو سکا معلوم
ہوتا ہے کہ اس کے والدین کی کوئی غیر معمولی حیثیت نہیں تھی۔ کسی معاصر شاعر نے اس کے
مجہول النسب ہونے کا طعنہ بھی دیا ہے لیکن بیرونی نے اسکا نہایت معقول اور مناسب جواب
دیا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ اسکی عظمت و شہرت بجز ذاتی کمال کے کسی دوسری چیز کی مرہون منت
نہ تھیں۔

بیرونی نے جس زمانہ میں جنم لیا تھا وہ عجمی ممالک میں علوم و فنون کی اشاعت کے لحاظ سے

---

[۵۱] "البیرونی" کے نام سے انجمن ترقی اردو کی جانب سے بیرونی کی سوانحعمری شائع ہو چکی ہے (نوشتہ
سید حسن برنی علیگ) ہم نے اسی کتاب کو زیادہ تر اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ (کتاب الہند
مرتبہ زاخو وغیرہ) بھی دو تین کتابیں پیش نظر ہیں لیکن زیادہ تر مدد اسی سے لی گئی ہے حسن برنی صاحب
شکریہ کے مستحق ہیں کہ بیرونی جیسی عظیم الشان شخصیت کی ایک مستند سوانحیات لکھکر انہوں نے علمی طبقہ پر
احسان عظیم کیا ہے۔

[۵۲] مقدمہ کتاب الہند از زاخو۔

نہایت شاندار دور تھا۔ وسط ایشیا کا ہر ہر حصہ علوم و فنون کا مرکز بن رہا تھا۔ بیرونی سے پہلے ان ممالک میں علم و فضل میں ممتاز شخصیتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ خود بیرونی اور ابن سینا اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ بیرونی کی تربیت بھی تمامتر علمی ماحول میں ہوئی۔ ابو نصر منصور جس نے اس کی تربیت کی جانب خاص طور پر توجہ کی تھی خود بھی اس زمانہ کا زبردست فاضل اور علوم ریاضی کا ماہر تھا۔ اس نے بیرونی کے نام متعدد کتابیں بھی معنون کی تھیں۔ بیرونی نے ایک قصیدہ میں اپنے مربیوں کے احسانات کا اعتراف کیا ہے اور آل عراق کے سلسلہ میں ابو نصر منصور کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے

مضیٰ اکثر الایام فی ظل نعمۃ
علی رتب فیہا علوت کراسیا
فآل عراق قد غذونی بدرہم
ومنصور منہم قد تولی غراسیا

۲۳ سال کی عمر تک بیرونی اپنے وطن میں حکومت کی زیر سرپرستی علمی تحقیقات میں مصروف و منہمک رہا۔ بالآخر اس کے مربیوں کی حکومت ختم ہو گئی تو اسے ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا کئی سال تک وہ پریشانی کی حالت میں ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر کار شمس المعالی والی جرجان و طبرستان کے دربار میں کسی طرح اس کی رسائی ہو گئی۔ یا یہ کہ شمس المعالی نے خود اسے اپنے ہاں مدعو کیا شمس المعالی خود ایک بڑا ادیب اور فاضل تھا۔ علوم حکمیہ سے اسے خاص تعلق تھا اسی لئے اس نے بیرونی کی زیادہ سے زیادہ عزت کی لیکن وہ ایک سخت گیر حکمران تھا بیرونی کو بھی اُس کی حرکات پسند نہیں تھیں اس لئے وہ زیادہ عرصہ تک وہاں نہیں رہا۔ اس زمانے میں علی بن مامون خوارزم کا حکمراں تھا اُسے جب بیرونی کی قدر و منزلت معلوم ہوئی۔ نیز شمس المعالی سے اس قدر تقرب کے حالات سنے تو اس نے خود اپنے یہاں مدعو کیا۔ اپنے ہی قصر میں اسے فروکش کیا۔ اور اس کی عزت و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ دیگر والیان ملک کی

طرح وہ بھی علم وفن کا شائق اور اہل علم کا قدردان تھا۔ اس کے دربار میں ابوالحسین احمد بن محمد السہیلی[۵۱] جو وزارت کے عہدہ پر فائز تھا علوم حکمیہ کا خاص ذوق رکھتا تھا علی بن مامون کے بعد اس کا بھائی ابوالعباس مامون تخت حکومت پر متمکن ہوا وہ بھی نہایت ذی علم اور قدردان علم وفن بادشاہ تھا۔ اس کی علمی قدردانی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا دربار ماہرین علم کا مرکز بن گیا تھا۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ علوم حکمت میں تاریخ اسلامی کی سب سے بڑی شخصیتیں جمع ہوگئی تھیں[۵۲] یعنی ابوریحان بیرونی اور بوعلی سینا ان دونوں میں عرصہ تک علمی بحثیں بھی چھڑی رہیں خوارزم کے بعد ابن سینا اور بیرونی کو پھر کبھی باہم مجتمع ہونے کا موقع نہیں ملا۔ بالآخر ناساعدت روزگار سے یہ علمی مجلس درہم برہم ہوگئی۔ محمود غزنوی نے خوارزمی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ابوالعباس مامون اپنی قوم کے ہاتھوں قتل ہوا اور

---

۵۱ السہیلی خوارزم کے اکابرین سے تھا اور اسکا خاندان ریاست و وزارت کا گھرانہ تھا۔ ثعالبی نے لکھا ہے کہ وہ وزیر بن وزیر تھا اور ریاست کے ساتھ علوم و آداب میں بھی امتیاز رکھتا تھا۔ اور کرم و حسن خلق کے لئے مشہور تھا۔ کتاب روضۃ السہیلیہ اس کی تصنیف تھی۔ اسی کے حکم سے الحسن بن الحارث نے کتاب السہیلی تصنیف کی تھی جس میں فقہ شافعی و حنفی سے بحث کی گئی تھی۔ وہ شعر بھی کہتا تھا۔ ابن سینا نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ وہ علوم حکمیہ کا محب تھا۔ اور اسی کے توسط سے ابن سینا بخارا سے آکر علی بن مامون کے دربار میں پہنچا۔ الخ البیرونی صفحہ ۵۵

۵۲ نظامی سمرقندی لکھتا ہے۔

ابوالعباس مامون خوارزم شاہ وزیرے داشت نام او ابوالحسین احمد بن محمد السہیلی۔ وے حکیم طبع و کریم نفس و فاضل۔ خوارزم شاہ ہم چنیں حکیم طبع و فاضل دوست بود۔ وبسبب ایشاں چندے حکیم و فاضل بر آں درگاہ جمع شدہ بودند چوں بوعلی سینا و ابوسہل مسیحی و ابوالخیر خمار و ابوریحان بیرونی و ابونصر عراقی الخ (چہار مقالہ مطبوعہ یورپ)

خوارزم کی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ اس کے دربار کے علماء کچھ تو پہلے ہی محمود غزنوی کی خواہش کے مطابق اس کے دربار میں منسلک ہوگئے تھے[۱] کچھ اس انقلاب کے کے بعد محمود کی معیت پر مجبور ہوئے۔ البیرونی نے اس موقع پر جب کہ ابوالعباس مامون

---

[۱] نظامی عروضی نے اس شاندار علمی مجلس کی تباہی اور انتشار کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے :-

روزگار بر نہ پسندید و فلک روا نہ داشت آں عیش بر ایشاں منغص شد و آں روزگار بر ایشاں بزیاں آمد از نزدیک سلطان یمین الدولہ محمود معروضے رسید با نامہ آں کہ شنیدم کہ در مجلس خوارزم شاہ چند کس اند از اہل فضل کہ عدیم النظیر اند چوں فلاں و فلاں۔ باید کہ ایشاں را بمجلس ما فرستی تا ایشاں شرف مجلس ما حاصل کنند تا بعلوم و کفایات ایشاں مستظہر شویم و آں منت از خوارزم شاہ داریم و رسول وے خواجہ حسین بن علی میکال بود کہ یکے از افاضل و اماثل عصر و اعجوبہ بود در میاں زمانہ و کار محمود در اوج ملک او رونقے داشت و دولت او علوے۔ و ملوک زمانہ او را مراعات ہمی کردند و شب از وے اندیشہ ہمی خفتند۔ خوارزم شاہ خواجہ حسین میکال را بجائے نیک فرود آورد و نزلے شگرف فرمود و پیش از انکہ او را بار داد حکما را بخواند و ایں نامہ بر ایشاں عرضہ کرد و گفت محمود قوی دست است و لشکر بسیار دارد و خراساں و ہندوستان ضبط کردہ است و طمع در عراق بستہ من نمی خواہم کہ مثال او را امتثال ننمایم و فرمان او را بنفاذ نہ پیوندم۔ شما دریں چہ گوئید۔ ابوعلی و ابوسہل گفتند ما نرویم اما ابونصر و ابوالخیر و ابوریحان رغبت نمودند کہ خبار صلات و ہبات سلطان ہمی شنیدند۔ پس خوارزم شاہ گفت شما دو تن را کہ رغبت نیست پیش از انکہ من ایں مرد را بار دہم شما سر خویش گیرید . . . . روز دیگر خوارزم شاہ حسین علی میکال را بار داد . . . . و گفت نامہ خواندم و بر مضمون و فرمان پادشاہ وقوف افتاد۔ بوعلی و ابوسہل برفتہ اند لیکن ابونصر و ابوریحان و ابوالخیر بسیج می کنند کہ پیش خدمت آیند۔ (از چہار مقالہ نظامی مطبوعہ یورپ)

کی سلطنت خطرہ میں پڑی ہوئی تھی اور محمود اس کو فتح کرنیکی فکر میں تھا۔ بادشاہ کے لئے بہترین مشیر ثابت ہوا اگر اس کی تدبیریں اور مشورے سلطنت کے استحکام میں کارگر نہ ہوئے تو یہ قصور اسکا نہیں مامون کی قسمت کا ہے کہ خود اس کی قوم اس کی دشمن ہوگئی۔

خوارزم کی فتح کے بعد بیرونی بھی دیگر اعیان و مشاہیر خوارزم کی طرح محمود کے ساتھ غزنین پہنچا۔

محمود اور بیرونی کے تعلقات[1]

اس خصوص میں ہم محمود کے بیان میں تفصیلی بحث کر آئے ہیں اس لئے یہاں اس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔ جناب سید حسن برنی صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ عام طور پر محمود کا سلوک بیرونی کے ساتھ ایسا نہیں تھا کہ اس سے کسی خاص شکایت کا موقع پیدا ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود محمود کے علم میں اسقدر گہرائی نہیں تھی کہ وہ اس کی قدر پہچانتا۔ اور اس کے شایاں شان اس سے سلوک کرتا۔

شروع میں انہوں نے معجم الادبا اور خود اس کے ایک قصیدہ کے کچھ اقتباسات دیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود کا سلوک بیرونی کے ساتھ کس قسم کا تھا مسئلہ کی وضاحت کے

---

[1] زاخو نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمود اور بیرونی کے تعلقات آخر تک ناخوشگوار رہے اس سلسلے میں اس نے بہت سے دلائل پیش کئے ہیں مثلاً بیرونی سے احمد بن حسن کی رقابت۔ احمد کے مشورے سے بیرونی کو ہندوستان جلاوطن کر دینا۔ کتاب الہند کا انتساب سلطان مسعود کی جانب حالانکہ کتاب سلطان محمود کے زمانے میں لکھی گئی نیز کتاب میں جہاں کہیں محمود کا تذکرہ آیا ہے وہاں بجائے سلطان کے امیر لکھا ہے برخلاف اسکے اپنے گذشتہ محسنین کا جو محمود سے کہیں فروتر تھے نہایت شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ محمود کی فتوحات کے متعلق اسکا خیال تھا کہ اس نے ہندوستان کی خوشحالی کو تباہ کر دیا اور ایسے حیرت انگیز حملے کئے جن سے ہندی مثل ذروں کے تمام طرف بکھر گئے: لیکن برنی صاحب نے زاخو کے اس خیال کی تردید کی ہے تفصیل کیلئے دیکھو البیرونی طبع دوم)

مقدمہ زاخو بر کتاب الہند

ہم یہ دونوں اقتباسات ذیل میں نقل کرتے ہیں:۔

(۱) بیرونی نے ابوالفتح بستی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا اس میں اس نے محمود کا بھی تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

ولم یقبض محمود علی بنعمتہ
فاغنی واقنی معضیا عن مکاسیا
عفا عن جہالاتی وابدی تکرما
د، د، د، وطری بجاہ رونقی ولباسیا

محمود نے کسی نعمت کو مجھ سے دریغ نہیں کیا۔ مجھے مالا مال کر دیا اور میری سخت طلبی سے چشم پوشی کی۔ میری جہالتوں کو معاف کیا اور میری توقیر کرنے لگا۔ اور اس کے جاہ سے میری رونق اور لباس تازہ ہو گئے

(۲) یاقوت الحموی نے محمد بن محمود النیشاپوری سے ایک روایت نقل کی ہے جس سے محمود اور بیرونی کے تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

ولما استبقاہ السلطان الماضی لخاصتہ امرہ وحوجار صدرہ کان یقادس فیما یسنح لخاطرہ من امر السمار النجوم فیحکی انہ ورد علیہ رسول من اقصی بلاد الترک وحدث بین یدیہ بما شاہد فیما ورار البحر نحو القطب الجنوبی من دور الشمس علیہ ظاہرۃً فی کل دورہا فوق الارض بحیث یبطل اللیل فنازع علی عادتہ فی التشدد فی الدین الی نسبتہ الرسل الی الحاد والقرمطۃ علی براءۃ اولئک القوم عن ہذہ الآفات حتی قال ابونصر مشکان ان ہذا لا یذکر ذلک من رای برئیتہ ولکن عن متشاہدۃ تحکیہ

چونکہ سلطان ماضی (محمود) نے البیرونی کو اپنے خاص کام اور دلی حاجت کے لئے محفوظ رکھا تھا اس لئے امور سماوی نجوم کے متعلق جو بات اس کے دل میں آتی تھی اس کے تفویض کرتا تھا۔ اس سے ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ اقصائے بلاد ترک سے ایک ایلچی آیا اور اس نے محمود کے روبرو بیان کیا کہ میں نے سمندر پر قطب جنوبی کے قریب دیکھا کہ سورج کا پورا دور وہاں زمین پر ظاہر رہتا ہے اور رات نہیں ہوتی۔ یہ سنکر محمود نے بوجہ اپنی تشدد دینی کی عادت کے فوراً اس شخص کو ملحد اور قرمطی قرار دیدیا۔ حالانکہ ترک ان آفات سے محفوظ ہیں۔ اس پر ابونصر مشکان نے کہا کہ یہ شخص

و تلا قوله عزوجل وجدها تطلع علی قوم لم نجعل لهم من دونها ستراً فسال ابا الریحان عنه فاخذ یسف له علی وجه الاختصار ویقرره علی طریق الاقناع وکان السلطان فی بعض الاوقات یحسن الاصغار ویبذل الانصاف فقبل ذلک وانقطع الحدیث بینه وبین السلطان وقتئذٍ

(معجم الادبا بحوالہ البیرونی)

اپنی طرف سے کسی رائے کو پیش نہیں کر رہا ہے بلکہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے بیان کرتا ہے اور اس کے بعد قرآن شریف کی یہ آیت وجدہا تطلع الخ پڑھی۔ محمود نے اس کے متعلق ابوریحان البیرونی سے پوچھا تو البیرونی نے مختصر مگر شافی طریق پر اس بحث کو سمجھا دیا۔ سلطان محمود بعض اوقات بغور سنتا اور انصاف کرتا تھا۔ اس نے اس کو تسلیم کر لیا اور وہ بات اسوقت وہیں ختم ہو کر رہ گئی۔

بیرونی کے علمی کارنامے | بیرونی کے علمی کارناموں کی تفصیل کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ابتدائے عمر سے لیکر موت کے آخری دم تک وہ علمی تحقیق و تفحص میں منہمک رہا۔ اوپر کسی موقع پر ہم بیان کر آئے ہیں کہ اس کی تربیت ابونصر منصور کی سرپرستی میں ہوئی جو خود بہت بڑی علم اور علوم حکمیہ کا ماہر تھا۔ البیرونی ایک غیر معمولی ذہن و دماغ لیکر پیدا ہوا تھا اسپر شفیق اور علم دوست اُستاد اور مربی کی سرپرستی نے سونے پر سہاگے کا کام دیا اور بہت جلد اس زمانے کے مشہور علماء میں اس نے امتیاز پیدا کر لیا اور علمی دنیا میں اس کا ایک خاص وقار قائم ہو گیا۔ غیر معمولی ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ محنتی بھی بہت زیادہ تھا۔ اس کا ذوق تفحص اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ایک کتاب کے لئے وہ ۴۰ سال تک سرگردان رہا ہے[1]۔

علم و فن کے ہر شعبہ میں اسے یکساں مہارت حاصل تھی، فلسفہ، علم ہیئت، ریاضی، جغرافیہ تاریخ، تمدن، علم آثار اور علم المذاہب سب میں اسے کامل دسترس تھی۔ ان تمام شعبہ ہائے علوم میں اس کے کارنامے آج بھی حیرت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ عربی و فارسی کے علاوہ اپنی

---

[1] البیرونی صفحہ ۲۱۴

علمی تصنیفات کے سلسلہ میں اسے اور بھی بہت سی زبانیں سیکھنا پڑیں۔ فارسی اس کی مادری زبان تھی۔ عربی چونکہ اس وقت کی تصنیفی زبان تھی اس لئے اس میں بھی اس نے پوری دستگاہ حاصل کی۔ ہندوستان میں اسے سنسکرت زبان سے واسطہ پڑا جو اس وقت کی مشکل ترین زبانوں میں تھی لیکن اس نے اس پر بھی عبور حاصل کرلیا اور غالباً عبرانی اور سریانی زبانوں سے بھی واقفیت پیدا کرلی[۵۱]۔ ان زبانوں کے سیکھنے میں اسے کیا کچھ دقتیں نہیں اٹھانا پڑی ہوں گی۔ اسکی طالبعلمانہ شوق اور محنت کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سنسکرت اس نے پچاس برس کی عمر میں سیکھی۔ شب و روز وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں محو رہتا تھا شہرزوری اس کے علمی انہماک اور محویت کے متعلق لکھتا ہے۔

"بیرونی ہمیشہ علوم کے حاصل کرنے میں محو رہتا تھا اور کتابوں کی تصنیف پر جھکا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ سے قلم کو، دیکھنے سے آنکھ کو اور فکر سے دل کو کبھی جدا نہیں کرتا تھا مگر سال میں صرف دو روز یعنی نوروز اور مہرجان کے دن جب وہ اپنے کھانے وغیرہ کے سامان کو مہیا کرتا تھا[۵۲]۔"

بیرونی کے علمی کارناموں کا "البیرونی" میں تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے اس لئے یہاں انکا بیان تحصیل حاصل ہوگا۔ اس کے علم و فضل کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آخر عمر تک اس نے تقریباً ۱۴۷ کتابیں لکھیں جن میں مختصر رسائل اور ضخیم کتابیں سب کچھ شامل ہیں۔ اس کی ان تالیفات و تراجم میں ہر علم و فن کی کتابیں ہیں اور تقریباً تمام علوم و فنون کو محتوی ہیں[۵۳]۔ لیکن اس حقیقت کا اظہار کس قدر افسوسناک ہوگا کہ ان بے شمار کتابوں میں سے ہندوستان یورپ اور دیگر ممالک کے کتب خانوں میں ہنوز صرف ۱۲ کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ بہت سے مشہور علماء نے خود اس

---

[۵۱] البیرونی صفحہ ۲۱۳ [۵۲] شہرزوری بحوالہ البیرونی صفحہ ۲۱۴

[۵۳] تفصیل کے لئے دیکھو البیرونی صفحہ ۱۱۴ تا ۱۱۹ ایضاً ۱۲۹

کے نام پر بھی اپنی کتابیں معنون کی ہیں ان میں ابونصر منصور اور ابوسہل مسیحی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کو بیرونی سے کس قدر محبت و عقیدت تھی۔ اسکی بعض کتابیں کتاب الہند وغیرہ یورپ سے شائع ہو چکی ہیں۔ اب ہندوستان میں بھی اس طرف توجہ ہوئی ہے چنانچہ قانون مسعودی کو (مع ترجمہ انگریزی و اردو) مسلم یونیورسٹی سے شائع کیا جا رہا ہے انجمن ترقی اردو سے کتاب الہند کا ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ ممکن ہے انکے بعد دوسری کتابوں کی طرف بھی توجہ ہو۔

خواجہ احمد بن حسن میمندی

خواجہ احمد بن حسن میمندی کے ابتدائی حالات افسوس ہے کہ تفصیل سے معلوم نہ ہوسکے وہ محمود غزنوی کا بہت کامیاب وزیر تھا۔ زاخو کا خیال ہے کہ اس کے اور بیرونی کے تعلقات نہ صرف کشیدہ تھے بلکہ اسی کے مشورے سے بیرونی کو ہندوستان جلاوطن کیا گیا تھا لیکن محمود کے دربار میں حسنک نام ایک اور ہستی بھی تھی اس کی تربیت خود محمود کے ہاتھوں ہوئی تھی اس لئے وہ اسکا خاص خیال رکھتا تھا۔ حسنک اور احمد بن حسن کے درمیان معاصرانہ چشمک تھی اور اسکا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ احمد بن حسن کو بھی ہندوستان کے قیدخانوں میں ڈلوا دیا گیا۔ محمود کے انتقال کے بعد مسعود اور احمد دونوں بھائیوں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی جس میں مسعود کو فتح اور محمد کو شکست ہوئی۔ حسنک محمد کا طرفدار تھا اس لئے اس پر قرمطی ہونیکا الزام لگا کر پھانسی دیدی گئی، خواجہ احمد بن حسن کے دن پھرے اور ہندوستان کے قیدخانہ سے رہائی ملی۔ مسعود نے تمام بڑے بڑے عہدیداروں کا تقرر کیا لیکن وزیراعظم کی جگہ ہنوز خالی تھی۔ سب کی نظریں احمد بن حسن میمندی پر پڑ رہی تھیں۔ مسعود نے ابوسہل ہمدانی کے ذریعہ پیام بھیجا لیکن احمد بن حسن بوڑھا ہو گیا تھا اور گوشہ عافیت اختیار کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے ابوسہل پر ٹالدیا کہ اس کام کے لئے تم مجھ سے زیادہ انسب ہو آخر مجبور ہو کر سلطان مسعود نے خود اس سے درخواست کی اسے تخلیہ میں بلا کر دیر تک گفتگو کی اور کہا

"خواجہ آپ کیوں نہیں اس فرض کو اپنے ذمہ لیتے ہیں آپ جانتے ہیں کہ آپ
میرے لئے بمنزلہ باپ کے ہیں میرے سر پر اس وقت بہت سے اہم کام ہیں اور یہ
مناسب نہیں کہ ایسے موقع پر آپ اپنی قابلیت سے مجھے محروم رکھیں۔

احمد بن حسن نے ضعیفی کا عذر پیش کیا لیکن مسعود کا اصرار برابر جاری رہا اس نے وعدہ کیا کہ بجز سیر و شکار اور شراب و کباب کے سلطنت کے تمام معاملات اسی پر چھوڑ دے گا بالآخر خواجہ احمد بن حسن نے چند شرائط کے ساتھ اسے منظور کر لیا۔ تفویض منصب کی رسم بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ادا کی گئی اور نہایت اہتمام سے خلعت اور قلمدان وزارت تفویض کیا گیا۔

خواجہ نے نہایت تدبر اور ہوشمندی کے ساتھ وزارت کے فرائض انجام دئے۔ اور تھوڑے عرصہ میں تمام سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا۔ باوجودیکہ امراء اور اہل دربار میں باہمی نزاع اور مخاصمت بھی جاری رہی لیکن محض خواجہ احمد بن حسن کے اثر سے مملکت کے نظم و نسق پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کے مشورے سے تمام بڑے بڑے خود سر عمال معزول کر دیے گئے جس کی وجہ سے سلطنت میں کسی بغاوت اور شورش نے جڑ نہیں پکڑی

بیہقی

پورا نام ابوالفضل بن الحسن البیہقی۔ پیدائش ۳۸۶ھ (۹۹۵ء) وفات ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) اپنے وقت کا مشہور عالم و فاضل اور تاریخ کا ماہر تھا اس کی کتاب کا نام "تاریخ بیہقی" یا "تاریخ آل سبکتگین" ہے تمام جلدیں مجلدات بیہقی کے نام سے موسوم ہیں۔ ابتدائی حصہ یمین ناصرالدین سبکتگین کے متعلق "تاریخ ناصری" کے نام سے مسعود کے متعلق حصہ "تاریخ مسعودی" اور محمود کے متعلق "تاج الفتوح" کے نام سے بھی علیحدہ علیحدہ طور پر موسوم کیا جاتا ہے "روضۃ الصفا" کے مقدمہ میں ہے کہ یہ کتاب کل ۳۰ جلدوں میں ہے۔ مصنف کا ذکر حیدر رازی، ضیاالدین برنی، ابوالفضل اور جہانگیر نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ باوجود اس قدر مشہور ہونے کے

تمام جلدوں کا کہیں پتہ نہیں بچی کھچی جلدیں بھی اب ہندوستان میں نایاب ہیں صرف تین نسخہ یہاں تھے جو ایک انگریز مستشرق مسٹر مارے نے حاصل کئے اور تین اور نسخوں کی مدد سے جو یورپ کے کتب خانوں میں تھے۔ ایک ایڈیشن شائع کیا۔ اس ایڈیشن میں ۷، ۸، ۹ مکمل اور ۶، ۱۰ کے کچھ اجزا شامل ہیں۔

بیہقی کی تاریخی فضیلت اس کے ان الفاظ سے عیاں ہو سکتی ہے۔

آدمی، آدمی کے دل سے پہچانا جا سکتا ہے۔ دل قوی یا ضعیف ہوتا ہے جو کچھ کہ وہ سنتا ہے یا دیکھتا ہے اور جب تک کہ وہ برا یا بھلا نہیں سنتا یا دیکھتا اس وقت تک وہ اس دنیا کی رنج و خوشی سے بے خبر رہتا ہے لہذا معلوم ہونا چاہئے کہ آنکھ اور کان (انسان کے) دل کے پاسبان اور مخبر ہیں وہ جو کچھ دیکھتے یا سنتے ہیں۔ اس کی خبر وہ دل سے کر دیتے ہیں تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھا کر عقل کو پہنچا دے جو نیک و بد کی تمیز کر سکتی ہے اور پہچان سکتی ہے کہ کونسی چیز مفید ہے اور کونسی مضر۔ یہ غرض ہوتی ہے جس کے لئے انسان مخفی باتوں اور اُن چیزوں کا جن کے متعلق اس نے کبھی کچھ سنا ہے اور نہ دیکھا ہے اور ان باتوں کا جو زمانہائے ماضی میں واقع ہوئی ہیں علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ابو الخیر الحسن

ابو الخیر الحسن بن سوارین یا ابن بہرام (وبقول ابن ابی اصیبعہ بہنام) المعروف (یا ابن الخمار) ۳۳۱ھ میں بغداد میں پیدا ہوا۔ یحییٰ بن عدی مشہور منطقی سے فلسفہ پڑھا۔ بعد ازاں خوارزم میں مامون کے دربار میں پہنچا جہاں خوارزم شاہیہ کے کنف حمایت میں انکے انقراض حکومت تک بسر کرتا رہا ۴۰۷ھ (۱۰۱۶ء) میں خوارزم کی تباہی کے بعد وہ محمود کے ساتھ چلا گیا محمود اس کی کمال تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ یہاں تک مشہور ہے کہ اس کے سامنے زمین بوس ہوتا تھا۔ ابو الخیر نہایت منکسر

مزاج تھا لیکن سلاطین و امرا سے تزک و احتشام سے ملتا تھا تین سو غلام رکاب میں رہتے تھے۔ اہل علم اور زہاد کی خدمت میں پا پیادہ جاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اس پیادہ روی کو جابرون اور فاسقون کی عبادت کا کفارہ قرار دیتا ہوں۔ ایک مرتبہ محمود کے دربار سے واپس آتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ضربات کے صدمہ سے ایسا بیمار رہا کہ جاں بر نہ ہو سکا۔

ابو الخیر اخیر زمانے میں عیسائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تھا وہ سریانی سے عربی میں کتب حکمت کا ترجمہ کرتا تھا اور اپنے زمانے کے مشہور حکما میں شمار ہوتا تھا۔[۱]

اس مضمون کے لکھتے وقت مندرجہ ذیل کتابیں پیش نظر تھیں۔

۱۔ تذکرۃ الشعرا مطبوعہ یورپ

۲۔ چہار مقالہ "

۳۔ لباب الالباب "

۴۔ شعر العجم حصہ اول و چہارم

۵۔ مقالات شبلی

۶۔ البیرونی

۷۔ مقدمہ زاخو بر کتاب الہند

۸۔ ایلیٹ

۹۔ آثار الکرام

۱۰۔ محمود غزنوی کی بزم ادب

۱۱۔ تنقید شعر العجم از محمود شیرانی

مضمون مولانا مسلم عظیم آبادی (رسالہ جامعہ)

---

[۱] البیرونی صفحہ ۵۷ و ۵۸

طولسطائے اور میکائیلو وچ کی خط و کتابت

لیو طولسطائے اور نواب اعظم نکولائی میکائیلو وچ کی یہ خط و کتابت جو اب تک شائع نہیں ہو سکی اس صدی کی ابتدا سے متعلق ہے۔ روسی زبان سے ہر۔ ی۔ لیون نے جرمن میں ترجمہ کیا ہے جو سہ ماہی رسالہ "سیاست و تاریخ" میں شائع ہوا ہے۔ خاکسار اسے اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سب سے پہلے جرمن مترجم کا ایک نوٹ ہے اس کے بعد ایک خود نواب اعظم کا۔ اور پھر وہ خطوط ہیں جو انھوں نے ایک دوسرے کو لکھے۔ جرمن مترجم کا جو مقدمہ ہے اس کے ترجمے میں میں نے ذرا اجمال سے کام لیا ہے اور صرف ضروری حصوں کا ترجمہ "جامعہ" کے ناظرین کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ مگر نواب اعظم کے مقدمے اور خطوط کا پورا پورا ترجمہ کیا گیا ہے۔

محمود

دیباچہ مترجم

اس خط و کتابت کے متعلق بعض تشریحات ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ نواب اعظم نکولائی میکائیلو وچ، زار روس نکولا اول کا نواسا تھا۔ اور زار سکندر سوم کا چچا زاد بھائی عام سیاسی کاموں میں اس نے کبھی کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ اس فوجی خدمت کے بعد جو شاہی خاندان کے ہر رکن پر فرض ہوتی تھی اس نے اپنی زندگی روسی تاریخ کے لئے وقف کر دی۔ اس نے روس کی تاریخ جدید یعنی سکندر اول کی حکومت پر جس سے اسے خاص ذوق تھا کئی معرکۃ الآرا تصانیف کی ہیں۔ اسکی بعض تصانیف کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوا ہے، اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ روسی تاریخی مجلس کا صدر تھا۔ ۱۹۱۹ء کی ابتدا پر شاہی خاندان کے بعض دوسرے ارکین کے ساتھ اسے بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا حالانکہ سیاسیات میں اس نے کبھی کوئی حصہ نہ لیا تھا۔

نواب اعظم کے بعض پرانے کاغذات میں جو ابھی حال میں دستیاب ہوئے ہیں طولسطائے کے خطوط اور انکے جوابات ملے ہیں۔ نواب اعظم اور طولسطائے کی پہلی ملاقات ۱۹۰۱ء میں کریمیا میں ہوئی طولسطائے کی عمر اس وقت ۷۳ سال کی تھی۔ نواب اعظم کو طولسطائے کے متعلق سرکاری حلقوں میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ بالکل غلط اور بے بنیاد تھیں۔ ان کی پہلی گفتگو کا موضوع فرقہ "دوخوبور،، تھا۔ (اس لفظ کا ترجمہ اردو میں معقولئے اور انگریزی میں Rationalist کیا جا سکتا ہے) اس فرقے کے متعلق انیسویں صدی کے آخر میں بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ روس میں اس فرقے کی ابتدا سترہویں صدی ہی میں ہو چکی تھی۔ یہ لوگ تمام مذہبی اصولوں کی بنیاد عقل پر رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں کلیسا کے ناقابل تبدیل اصولوں اور ہر طرح کی پابندیوں، یہانتک کہ سیاسی اور فوجی فرائض اور لگان کی ادائگی میں بھی عذر تھا۔ اس فرقے اور حکومت کے تعلقات میں ۱۷۷۰ء ہی سے کشیدگی شروع ہوگئی۔ اور اس جماعت کے اراکین کو خاص طور پر خطرناک سمجھا جانے لگا ۱۸۳۰ء میں ان سے بعض کو جلا وطن بھی کیا گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں اختلافات نے اور بھی شدید صورت اختیار کرلی اور طولسطائے اور اس کے ساتھیوں کے مشورے کے مطابق اس جماعت کے ۴۰۰۰ اشخاص کنیڈا چلے گئے۔ طولسطائے کو ان لوگوں سے دلی ہمدردی تھی۔ ان لوگوں کے اصول کچھ ایسے واقع ہوئے تھے کہ کنیڈا میں بھی وہاں کی حکومت انکے لئے بعض قوانین بنانے پر مجبور ہوئی۔ اس کے بعد ان میں سے کچھ تو وہاں رہنے پر راضی ہو گئے اور کچھ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے برطانی کولمبیا چلے گئے۔ ان معقولین کی ہجرت کے مسئلہ پر طولسطائے اور میکائیلووچ میں بہت گفتگو ہوئی ہے۔

طولسطائے نے نواب اعظم کے نام جو خط لکھا ہے اس میں ایک دوسرے نہایت اہم مراسلے کا ذکر ہے جو طولسطائے نے زار نکولائی دوم کے نام لکھا تھا۔ اور جو نواب اعظم نے زار تک پہنچایا تھا۔

طولسطائے ہنری جارج کے مسلک کا پیرو تھا۔ اس کی کتاب "اجتماعی مسائل" کے روسی ترجمہ پر طولسطائے نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ ہنری جارج کے خیال میں تمام مصائب کی وجہ زمین کی تقسیم ہے۔ زمین پر ہر شخص کو وہی حق حاصل ہے جس طرح ہوا اور سورج کی روشنی پر۔ زمین پر جو لگان ہوگا وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ ریاست کی ملک ہوگا اور سب کے کام آئے گا۔ ریاست کو اس کے بعد کسی اور قسم کی آمدنی کی ضرورت بھی باقی نہ رہے گی اور اس کی ضروریات کے لئے یہی رقم کافی ہوگی۔ ہنری جارج کے اس طریق کو "Single Tax System" یا "وحدانی طریقہ مالگذاری" کہا جاتا ہے۔

طولسطائے ہنری جارج کا ہم خیال تھا۔ اس نے زار کے نام جو خط بھجوایا تھا اس میں اس نے اسی طریق پر کاربند ہونے کی درخواست کی تھی۔ اس خط میں اس نے حکومت وقت کی اچھی طرح خبر لی ہے اور زار کو جسے خط میں وہ "برادر عزیز" کے لقب سے یاد کرتا ہے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ قوم کو آزادی رائے اور آزادی تقریر عطا کرے۔ خط میں طولسطائے یوں رقمطراز ہے :-

"اگر روسی قوم کو اس بات کی آزادی ہو کہ وہ اپنے دل کی بات زبان پر لا سکے تو میرے خیال میں وہ اس وقت یہی کہے گی۔ سب سے پہلے تو مزدور پیشہ لوگوں کا مطالبہ ہوگا کہ تمام غیر مساوی قوانین ختم ہو جانے چاہئیں جنہوں نے ان کی حیثیت "اچھوت" کی سی بنادی ہے اور جن کی وجہ سے انہیں وہ تمام حقوق حاصل نہیں جو اور شہریوں کو حاصل ہیں۔ انہیں اس بات کی آزادی ہو کہ وہ جہاں چاہیں آباد ہو سکیں، جو چاہیں پڑھیں اور اپنی روحانی ضروریات کے مطابق جس عقیدہ کی چاہیں پیروی کریں مگر جو سب سے بڑی بات ہے وہ یہ ہے کہ تمام کے تمام دس کروڑ نفوس بیک زبان یہ کہیں گے کہ زمینداری کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ زمین پر سے شخصی قبضے کے اٹھنے کا سوال ایسا ہے جو میری رائے میں تمام روسی قوم کے پیش نظر ہے۔ زندگی کے ہر دور میں انسان کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو ایک قدم آگے اعلیٰ معیار

کی طرف لے جائے۔ آج سے پچاس سال پہلے یہ قدم روس سے غلامی کا ملیامیٹ کرنا تھا۔ آج یہ قدم یہی ہے کہ مزدور پیشہ لوگ اس جماعت کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں جو بلا وجہ انکے سر پر سوار ہے روس میں جہاں آبادی کا بیشتر حصہ کھیتی سے پیٹ پالتا ہے یہ ممکن نہیں کہ محض کارخانوں اور فیکٹریوں کو تومیانے (nationalise) سے یہ مشکلات دور ہو جائیں۔ روسیوں کے لئے تو ناگزیر ہے کہ اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ زمین مخلوق خدا کی ملکیت ہے۔ یہی ہے وہ آرزو جو آج روسیوں کے دل میں جگہ کئے ہوئے ہے اور تمام قوم حکومت سے اس بات کی متوقع ہے کہ وہ اسے واقعہ کی صورت دے گی۔ پھر رعایا کو روز روز دبانے کے لئے نئے ہتھیاروں کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ حکومت کا بھی وہی مقصد ہو گا جو قوم کا ہے۔ اور وہ مقصد بس یہی ہے کہ زمین کو شخصی ملکیت سے نجات دلائی جائے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ آج یہ "ارضی جائداد" اسی قدر بے انصافی پر مبنی ہے جتنی آج سے پچاس سال پہلے "جسمانی جائداد" تھی۔ اور میں خیال کرتا ہوں اس کے دور ہو جانے سے روسی قوم اپنی آزادی، خوشحالی اور اطمینان کے اعتبار سے بہت آگے بڑھ جائے گی۔ میں یہ بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حکومت نے اس قسم کا قدم اٹھایا تو روز کے ان تمام انقلابی اور ایسے تمام جھگڑوں کا خاتمہ ہو جائیگا جو آج مزدور پیشہ جماعت کو بھڑکا رہے ہیں اور یہ جو قوم اور حکومت کے لئے خطرے کا باعث ہیں۔"

یہ ہے وہ خط جو طولسطائے نے زار کے نام لکھا اور نواب اعظم کو بھیجا جنہوں نے خود اپنے ہاتھ سے اسے زار تک پہنچایا۔ اس موضوع پر خود نواب اعظم کے وہ خطوط طولسطائے کو لکھے ہیں جن میں انہوں نے طولسطائے سے اپنا اختلاف رائے ظاہر کیا ہے۔ مگر ان میں یہ بیان تھا کہ سرکاری عمال و محکموں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ یہ بھی واضح ہو نا چاہیے کہ خطوط جتنے روسی انقلاب (۱۹۱۷ء) سے پہلے کے لکھے ہوئے ہیں ان میں جو تاریخیں ہیں وہ پرانی روسی جنتری کے حساب سے ہیں جسے یورپی کیلنڈر سے ۱۳ دن پیچھے سمجھنا چاہیے۔

طولسطائے اور نواب اعظم کے خطوط سے پہلے اسی موضوع پر نواب اعظم نے ایک نوٹ لکھا ہے جسکا ترجمہ درج ذیل ہے۔

مقدمہ خط و کتابت

میں عرصہ سے لیوطولسطائے سے نیاز حاصل کرنے کا متمنی تھا، خزاں ۱۹۰۱ء میں بمقام کریمیا مجھے اسکا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا۔ میں وہاں دو ہفتے کے لئے اپنے بھائی سکندر سے ملنے گیا ہوا تھا۔ طولسطائے بیگم پانین[۱] کے مکان میں جو پاس ہی تھا مقیم تھے۔ میں ۲۲ر اکتوبر کو کریمیا پہنچا۔ میں نے سنا تھا کہ طولسطائے اکثر پیدل اور گھوڑے پر سیر کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان سے ملاقات کے خیال سے میں بے نتیجہ روزانہ ادہر اُدہر گھوما کیا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چل سکتا تو پھر فیصلہ کیا کہ انکے نام ایک پرچہ لکھ کر خود دریافت کروں کہ کیا میں مل سکتا ہوں۔ اسکا جواب میں نے ان سے صاف صاف اور بے تکلفانہ مانگا۔ ادہر زبان پر بات آئی اور اس نے واقعہ کی صورت اختیار کی۔ میں نے ۲۶ر کی صبح کو خط بھیجا اور میرے پاس فوراً جواب آیا کہ میں اسی دن ایک بجے ان سے مل سکتا ہوں۔ میں پہنچا تو بیگم طولسطائے نے میرا بڑے جوش سے خیر مقدم کیا اور کہا کہ ان کے شوہر ابھی اوپر کی منزل سے نیچے آتے ہیں۔ دو منٹ میں طولسطائے تشریف لے آئے مجھے نہایت محبت سے سلام کیا اور مجھ سے اس بات کی معافی چاہی کہ انہوں نے میرے پرچے کا جواب تحریری نہیں بلکہ ٹیلیفون کے ذریعے دیا۔ لیکن اس کا سبب یہ بتایا کہ وجع مفاصل کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں درد تھا۔ بیگم صاحبہ چلی گئیں، ہم دونوں پاس پاس بیٹھے اور گفتگو شروع ہوئی۔ ان کی جسمانی حالت کے متعلق پہلی نظر میں تو یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہت معمر اور ناتواں ہیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد یہ خیال تبدیل کرنا پڑا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ خوب تندرست اور

---

[۱] انقلاب سے پہلے بہت رئیس عورت تھی اور اپنی فیاضی اور نیک دلی کے لئے مشہور تھی۔

توانا ہیں۔ انکا لباس سادہ تھا۔ ایک خاکی رنگ کا کرتہ اور پیٹی۔ اسی رنگ کا چوڑے پائینچے کا پاجامہ
سادے جوتے جن کا اوپر کا حصہ پائینچوں کو ڈھک لیتا تھا۔ اگر کوئی کہے کہ ملو لسطائے کا لباس
میلا کچیلا اور جسم صاف نہیں رہتا تو اسکا اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ برخلاف اس کے وہ نہایت صاف
ستھرے۔ ان کے ہاتھ پاکیزہ اور ناخون بالکل ٹھیک ہیں۔ البتہ ان کی زبردست سفید ریش ہیں
کسی قدر شاعرانہ بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ مگر اس میں بھی کنگھی کی ہوئی ہوتی ہے جس چیز کا
سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے وہ ان کی نیلے رنگ کی آنکھیں ہیں۔ انکی نگاہ دل کے پار ہو جاتی
ہے۔ آنکھیں کسی قدر بیٹھی ہوئی ہیں اور گال خوب ابھرے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے اور بھی
اثر ہوتا ہے۔ آنکھوں سے خوش اخلاقی اور کسی قدر رنج مگر اس کے ساتھ ہی فہم و عقل پختگی تیز
اور اصابت رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ نہ تو ان کی آنکھوں میں کج نگہی اور نہ انکے طرز عمل میں
کسی قسم کی خرابی ہے۔ تمام چیزیں نہایت متناسب اور موزوں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ دوران گفتگو میں ان کی نگاہ مخاطب پر جمی رہتی ہے۔ خصوصاً ایسے موقع پر جب
انہیں کسی بات سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی ہو اور اسے وہ تشریح کے ساتھ بیان کر رہے ہوں
ان کی نگاہ مخاطب کی آنکھوں پر جم جاتی ہے۔ مجھے تو ان کی شخصیت بہت ہی بھلی معلوم ہوئی۔

ہماری گفتگو تین مسائل پر ہوئی:۔

۱۔ زار سکندر اول اور فیودو کسیچ[1]

۲۔ کوہ قاف کے درخوبور

۳۔ میرا اپنا نجی مسئلہ

---

[1] فیودو کسیچ۔ پیدائش ۱۸۳۶ء سکندر اول کی موت کے بعد لوگوں میں یہ خیال عام تھا کہ یہ بعد میں اصل سکندر اول ہے۔ اور سکندر اول کا انتقال ہوا ہی نہیں۔ ان کی جگہ کسی اور کو دفن کر دیا گیا ہے۔ بعض مورخین نے بھی اس شبہ کا اظہار کیا ہے خود نواب اعظم نے اس موضوع پر مفصل کتاب لکھی ہے۔

یہ آخری سوال ان کے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث ہوا۔ انہوں نے بہت داد دی اور میری طرف محبت بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا کہ "یہ سوال بہت نادر اور یہ واقعہ نادرتر" ہے۔ مگر میں اب اس اجمال کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا۔

دوسرے موضوع کے سلسلہ میں طفلس کے سابق گورنر نواب شیرواکلدزے کے رویے اور خود طولسطائے نے اس میں جو حصہ لیا اس پر ان میں اور مجھ میں اختلاف تھا۔ یہاں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ طولسطائے اپنی رائے میں پکے تھے اور مجھ پر اعتراضات کر رہے تھے۔ مگر پھر بھی انکی آواز بلند نہ ہوئی اور اس طرح وہ مجھے ہمیشہ موقع دیتے رہے کہ میں اپنی رائے کا اظہار کروں۔ گورنر کے متعلق طولسطائے مجھے اس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے کہ ویسے وہ نہایت نیک آدمی ہیں مگر حاکم اچھے نہیں۔ دوخوبوردں کے طفلس میں آباد ہو جانے کے بعد وہ حالات کو سدھارنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ مگر میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایک طرف تو ریاست کے تمام کل پرزوں کا ڈھیلا ہونا اور دوسری طرف خود طولسطائے کی تعلیمات جن کی وجہ سے اس جماعت کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ ایسی مشکلات تھیں جنہوں نے نواب کے کام کو بہت دشوار بنا دیا۔

مگر طولسطائے مجھے یہی یقین دلا رہے تھے کہ اس جماعت کو روسی سرحد میں رکھنے کے لئے خود ان سے جو کچھ بن پڑا انہوں نے کیا۔ مگر جب انہوں نے حکومت کی بے پرواہی کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تو ان کی بھلائی کی خاطر انہیں غیر ملک میں جانے کا مشورہ دیا۔ طولسطائے کی رائے میں اب دوخوبورکناڈا میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر میری معلومات اس کے برعکس ہیں۔ ہاں جب میں نے کہا کہ دوخوبوروں کے نواب شیرواکلدزے سے اب بھی اچھے تعلقات ہیں اور وہ انہیں کنیڈا سے خطوط لکھتے ہیں تو طولسطائے بہت پریشان ہوئے۔ میں نے خاص طور پر طولسطائے کے دو شاگردوں چلکو اور برچکو کا ذکر کیا جو اکثر حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور جن کا اس جماعت پر ہمیشہ اچھا اثر نہیں ہوتا۔ اس پر طولسطائے نے دبی زبان سے

یہ تسلیم کیا کہ ان کے شاگرد انہیں ہمیشہ اچھی طرح نہیں سمجھتے ہیں مگر بہرحال وہ حکام اور عمال سے تو بہتر ہی ہیں۔

سکندر اول پر ہماری گفتگو نے بہت طول کھینچا۔ طولسطائے نے کہا کہ ان کا اپنا ارادہ تھا کہ اس روایت پر جو سکندر اول کی موت اور ہیرفیودر کسیچ کے بھیس میں سائبیریا میں زندگی بسر کرنے کے متعلق مشہور ہے کچھ لکھیں۔ اگرچہ ابھی تک اس روایت کی نہ صرف تصدیق نہیں ہو سکی ہے بلکہ اکثر واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ بہرحال طولسطائے کو سکندر اول کی زندگی سے بہت دلچسپی تھی اور واقعی اس میں بہت کچھ جدت، ایچ زاور دو رنگی پائی بھی جاتی ہے طولسطائے کے خیال کے مطابق اگر سکندر نے اپنی زندگی تنہائی ہی میں بسر کرنے کی ٹھان لی تو واقعی اس نے پورا پورا جرمانہ ادا کر دیا۔

اسی سلسلے میں ذاتی مزاج کی بحث چھڑ گئی جس کے متعلق مجھے خاموشی اختیار کرنی چاہئے اس کے بعد ان لوگوں کے متعلق گفتگو ہوئی جنہیں ہم دونوں جانتے ہیں مثلاً بیگم بیلیپے اور الوناشو والوا اور بیگم الیزابتھا اونا چرتکوزا۔ یہ دونوں لارڈ رڈ اسٹوک[۵۱] اور ریچکو[۵۲] کی تعلیمات کی پیرو ہیں۔ ان تعلیمات کے بارے میں طولسطائے نے کہا کہ چاہے ان کی نیت اچھی ہو مگر ان کی تعلیمات بنیادی طور پر غلط اور غیر اطمینان بخش ہیں۔ بیٹھے بیٹھے جب ایک گھنٹہ ہو گیا تو میں نے رخصت چاہی۔ پہلی ملاقات میں میں انکا زیادہ وقت نہ لینا چاہتا تھا۔ انہوں نے مجھے دروازے تک پہنچایا اور کہا کہ انہیں مجھ سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی۔

دوسری مرتبہ شام کے کھانے سے قبل میں طولسطائے سے ملنے گیا۔ انہوں نے

---

۵۱ انگریز نواب۔ ایک طرح کے مذہبی و اخلاقی استیاغ کا بانی۔ اٹھارہویں صدی میں روس کے اعلیٰ طبقوں میں اس کے بہت سے پیرو تھے۔

۵۲ لارڈ رڈ اسٹوک کی موت کے بعد اس کے خیالات کی اس شخص نے روس میں ترویج و اشاعت کی۔

مجھے اوپر خلوت خانہ میں بلایا۔ اور میرا ان الفاظ سے استقبال کیا:۔

"آپ کو دیکھ کر مجھے صد درجہ مسرت حاصل ہوئی۔ مجھے آپ کا انتظار تھا میرا ضمیر مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ کیا کر رہے ہیں اس پر آپنے اچھی طرح غور بھی کر لیا ہے کہ نہیں؟ اس لئے کہ آپ مجھ سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔ میں بذات خود طاعون ہوں، مجھے کلیسا سے نکال باہر کیا گیا ہے۔ لوگ مجھ سے خوف زدہ ہیں اور آپ پھر بھی میرے پاس آتے ہیں۔ میں پھر دہرا دوں کہ میں طاعون ہوں۔ مجھے ایک طرح کی وبا خیال کیا جاتا ہے۔ آپ کو میری وجہ سے کہیں دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لوگ آپ کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھیں گے کہ آپ ایسے شخص سے ملتے ہیں جو سیاسی اعتبار سے بہت مشکوک ہو۔"

اس غیر متوقع تمہید کا جواب میں نے یہ دیا کہ "میری عمر اس وقت ۴۲ سال کی ہو چکی ہے۔ شادی میری ہوئی نہیں۔ لوگ مجھ سے خوب واقف ہیں۔ مجھے نتائج کا ذرہ برابر خوف نہیں۔ اور پھر جہاں تک حکومت کا تعلق مجھے اس کے متعلق آپ کی نسبت ذرا زیادہ حسن ظن ہے۔"

پھر وہی دخوبورون اور رشید واشد نے کا قصہ شروع ہوا، مگر طولسطائے میری رائے بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میں نے اس بات پر بہت زور دیا کہ ان کو اپنے مختلف النوع شاگردوں[1] اور پیروؤں کی بات ہمیشہ بلا چون و چرا تسلیم کر لینا چاہئے۔ ان کی وجہ سے طولسطائے کی حیثیت نازک ہو جاتی ہے۔ اکثر تو یہ بات سمجھتے ہی نہیں اور اکثر ان کا عمل طولسطائے کی مرضی کے سراسر خلاف ہوتا ہے۔ طولسطائے اپنے شاگردوں میں سے چرتکو[1] اور برجکو کو نہایت ہوشیار اور عقلمند تصور کرتے ہیں۔

ان میں سے پہلے سے میں بھی واقف ہوں۔ گو وہ صاف دل، ایمان دار اور مخلص سہی مگر میری رائے میں وہ غیر معمولی طور پر کم سخن ہیں۔ اس کے بعد ہم نے وقت کی مشہور

---

[1] طولسطائے کا مشہور شاگرد اور اس کی تصانیف کا ناشر۔

شخصیت میکا اشا خودیچ[۵۱] اور مسئلہ ضمیر پر اس کی جو معرکۃ الآرا تقریر ہوئی ہے اس پر گفتگو شروع کی۔ اگرچہ طولسطائے کی رائے میں وقت آگیا ہے کہ روس کو آزادی ضمیر حاصل ہو جائے مگر میکا اشا خودیچ کے متعلق ان کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ وہ اسے شہرت کا بندہ اور کم ظرف انسان تصور کرتے ہیں مجھے یہ معلوم کرکے دلی مسرت ہوئی اس لئے کہ میری بھی اس کے متعلق یہی رائے تھی۔ کہ وہ محض ہردلعزیزی حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ کہتا ہے ورنہ اسے خود اپنی بات پر یقین نہیں!

پھر روس کی موجودہ صورت حال مثلاً انتشار حکومت، طریق کار کا نقدان، وزرا کی ضد اور ناعاقبت اندیشی۔ سپ ایگنس[۵۲] کی ناقابلیت۔ وٹس کی گستاخی عام لامذہبیت وغیرہ پر بات چیت ہوتی رہی۔ طولسطائے نے لامذہبیت پر بہت تفصیل سے گفتگو کی اور اسی کو تمام موجودہ مصیبتوں کی اصل وجہ قرار دیا۔ جب میں نے ان سے کہا کہ "آپ کی تصانیف کے اکثر قارئین یہ سمجھتے ہیں کہ آپ روح کے دوام کے قائل ہیں؟" تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ وہ کیا واقعی ان میں سے بعض کی یہ رائے ہے اور یہ نے خیالات کی وہ اس طرح تعبیر کرتے ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے تو سوائے افسوس کے میرے لئے اور کیا چارہ کار ہے۔ مجھے خود اس بات کا احساس ہے کہ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں مجھے اب پہلے کی طرح لکھنا نہیں ہوتا اور بعض اوقات تو بالکل ہی نہیں۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری لے دے کر ایک ہی تمنا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح بھی ممکن ہو میں بنی نوع انسان کی مدد کروں۔ آج کل

---

[۵۱] مجلس قانون ساز کا رکن۔ رئیس۔ خیالات میں لبرل "آزادی ضمیر" پر تقریر کرنے کے بعد تمام روس میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء میں بحالت ہجرت انتقال ہوا۔

[۵۲] ۱۹۰۱ء میں وزیر داخلہ مقرر ہو۔ ۱۹۰۲ء میں کسی اجتماعی نے کام تمام کر دیا۔

[۵۳] مشہور سیاسی۔ وزیر مال

میں ایک کتاب " ایمان " کی تصنیف میں منہمک ہوں ۔ میری آرزو ہے کہ اسے میں اپنی موت سے پہلے تکمیل کو پہنچا دوں ۔ یہ میری بڑی خوش قسمتی ہو گی اگر میں موت سے پہلے اسے اختتام تک پہنچا سکا ۔ تقریباً دو تہائی حصہ ختم ہو چکا ہے ۔ ایک تہائی باقی ہے ۔ مگر اس میں کامیابی مشکل نظر آتی ہے ۔ طبیعت موزوں ہی نہیں ہوتی ۔ اکثر بیمار رہتا ہوں اور اسی وجہ سے یہ کام پڑا ہوا ہے "

طولسطائے کی گفتگو میں موت کا اکثر ذکر آیا گیا ۔ یہ سوال اس وقت انہیں بہت پریشان کر رہا ہے ۔ گو وہ صاف صاف نہیں کہتے مگر پھر بھی انہیں اپنی زندگی کے متعلق جو شبہ پیدا ہو گیا ہے اس کا اظہار اکثر انکے الفاظ سے ہو جاتا ہے ۔

اس دفعہ میری ملاقات ٹھیک دو گھنٹے تک جاری رہی ۔ اور ہمیں دونوں میں گفتگو ہوا کی ۔ طولسطائے کی گفتگو کا وہ حصہ خاص طور پر دلچسپ تھا جو سکندر اول کی سوانح اور اس کے عہد کی عام زندگی سے متعلق تھا ۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے ناول " جنگ و صلح " کا بھی ذکر کیا ۔ اس تمام بات چیت کا مجھ پر جو خاص اثر ہوا وہ یہ تھا کہ مجھے یقین آ گیا کہ وہ بالکل بے تکلفانہ بول رہے ہیں اور انہیں میرے سامنے کسی طرح بننے کا خیال نہیں ۔ انہوں نے نہایت بے باکی سے تمام مسائل پر گفتگو کی اور میں ان کی ملاقات سے حد درجہ متاثر ہوا ۔

جس روز میں وہاں سے رخصت ہونے والا تھا تو صبح کے پہر میں آخری مرتبہ اس قابل تعظیم بزرگ سے ملاقات کی غرض سے گیا ۔ ملاقات کا سلسلہ پھر گھنٹہ بھر رہا ۔ اس مرتبہ طولسطائے نے جنگ کریمیا (۱۸۵۳ء-۱۸۵۶ء) کا تفصیل سے ذکر کیا جس میں وہ خود نوجوان کی حیثیت سے شریک تھے ۔ اور جس میں سے محاصرہ سیباسٹوپل کا انہوں نے اپنی بعض مشہور تصانیف میں بھی ذکر کیا ہے ۔ یہ یادگار انکے حافظے میں اس طرح محفوظ ہے کہ واقعہ کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آ جاتی ہے ۔ اور اس کے سننے میں طبیعت کو عجیب حظ حاصل ہوتا ہے ۔

اس کے بعد انہوں نے موجودہ زار نکولاؤ دوم کا ذکر کیا ۔ طولسطائے کو ان سے بہت ہمدردی ہے اور وہ ان کی بڑی خوشی سے مدد کرنے کے لئے تیار ہیں ۔ انہیں شہنشاہ نہایت بھلے مانس ۔

نیک طبیعت اور مدد کرنے والے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ساری مصیبت انکے اردگرد کے لوگ ہیں۔ انہوں نے مرحوم زار سکندر سوم کا بھی اچھے الفاظ میں ذکر کیا اور کہا کہ "اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ ذلیل پادری مجھے کلیسا سے نکال باہر نہ کر پاتے۔" پھر انہوں نے مجھ سے میرے والد کی خیریت دریافت کی جن سے ان کی ملاقات ۱۸۵۴ء میں جنگ کریمیا میں فوجی افسر کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ طولسطائے نے انکے مزاج کی بابت دریافت کیا اور یہ سب اتنے پیارے اور بھلے انداز میں کہ میں تو یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ طولسطائے کو "مزاجی" کہنا ظلم ہے۔ ایک بات اور کہہ کر میں مقدمہ ختم کرتا ہوں اور وہ یہ کہ طولسطائے مصنف کی حیثیت سے ایک ہیں اور انسان کی حیثیت سے دوسرے۔ اور میں بہت ہی خوش قسمت ہوں کہ انہیں بچشم خود دیکھ سکا۔

- . . ⁘ . . -

۵ اپریل کو طولسطائے نے نواب اعظم[1] کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا ہے:

مہربانم نکولائی میکائیلوویچ۔ مجھے آپ کا تار ملا۔ میں فوراً ہی جواب دینا چاہتا تھا مگر مجھے صاحب فراش ہونا پڑا۔ دو ہفتے تک بستر سے اٹھنے اور قلم ہاتھ میں لینے سے قاصر رہا۔ فوراً میں یوں لکھنا چاہتا تھا کہ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا خاص طور پر اس وجہ سے کہ آپ نے میری درخواست پوری کی باوجود اس کے کہ اس سے آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اور جو خط آپ نے پہنچایا ہوا اور جسے آپ نے غالباً میری درخواست کے بموجب پڑھا بھی ہوگا۔ وہ آپ کے خیالات کے صریح مخالف اور طبیعت کو ناگوار ہوا ہوگا۔ اگر اس میں میری غلطی ہو تو مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ میرے شکوک کو معاف فرمائیں۔ بہرحال آنجناب کی مرتبہ طبیعت منفعل ہے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چرتکو کے ذریعہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ میرا خط نہایت پیشانی کے ساتھ وصول کیا گیا۔ یہ بہت خوب۔ اور یہ وعدہ کیا گیا کہ اسے کسی کو نہ دکھایا

---

[1] یعنی نواب اعظم میکائیل نکولائیوچ۔ زار سکندر کے بھائی جو مدت تک کوہ قاف کے حاکم رہے۔

جائے گا۔ مگر میں نے تو اس قسم کی کوئی درخواست نہ کی تھی۔ اب آپ نے اسے ضروری خیال
کیا تو آپ کے پاس اس کے وجوہ بھی ہوں گے اور مجھے اس میں کوئی خاص عذر نہیں۔

اب میں اپنے بعض ان خیالات کی تشریح کرنا چاہتا ہوں جو میں نے آپ کے سامنے
پیش کئے تھے اور جو میں خط میں اچھی طرح ذکر پایا تھا۔ اور یہ اس امید پر کہ اگر آپ میرے ہم خیال
نہ بھی ہو جائیں تو کم از کم مجھے اچھی طرح سمجھ سکیں اور میری تجاویز کو ایک غیر عملی شخص کے تخیل کی
بلند پروازی نہیں۔ (اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سرکاری حلقوں میں مجھے یوں ہی
سمجھا جاتا ہے) بلکہ سنجیدہ اور طویل فکر و خیال کا نتیجہ سمجھیں۔ میرا ایمان ہے کہ یہی ایک ذریعہ ہے جو
اس مطلق العنانی کو مکمل تباہی و بربادی سے بچا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ حکومت ترقی کی ان تمام
خواہشات کو جن کے حصول کی کوشش میں لوگ لگے ہوئے ہیں اپنا بنائے اور اپنی قوت سے
رعایا کے مقاصد کی تکمیل کرے۔ میرے خیال میں روسی قوم کے سامنے اس قسم کا جو مطمح نظر آج تک
رہا ہے اور آج بھی یہی ہے کہ زمین کو شخصی ملکیت سے نجات دلانی چاہئے۔ اس مضمون پر بہت
کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی اور لکھا جائے گا۔ مگر بنیادی طور پر اس سوال سے امریکن مصنف ہنری
جارج نے اپنی شاندار کتاب "ترقی اور افلاس" اور چھوٹے سے رسالے "اجتماعی مسائل" میں
بحث کی ہے۔ یہ سوال میرے خیال کے بموجب اسی قدر اہم اور حل کا محتاج ہے جتنا اٹھارہویں
صدی کے نصف اول میں غلامی کا مسئلہ تھا۔ مگر دقت یہ ہے کہ آج اسکا حل تو درکنار اسکا ذکر
بھی بدیں وجہ ممنوع ہے کہ یورپ اور امریکہ کے امراء اور امراء ہی نہیں تمام جائداد رکھنے والے
جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ہے اس بات کے کوشاں ہیں کہ یہ مسئلہ یہیں کا یہیں ختم کر دیا
جائے اور اس پر سرکاری حلقوں میں گفت و شنید بھی نہ ہو۔ اس مسئلہ کا حل صرف روس میں
مطلق العنانی کے وجود کی وجہ سے ممکن ہے اور روس میں اسے خاص اہمیت بھی حاصل ہے اس
وجہ سے کہ روسی قوم کا بڑا حصہ کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے اور اس کے لئے زمین کی کمی اور غیر مساوی
تقسیم نے بڑی دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ ہنری جارج کا بتایا ہوا طریقہ جسے "وحدانی طریقہ مالگذاری"

کہا جاتا ہے اور جس کا غالباً آپ کو علم ہوگا نہایت آسان اور قابل عمل ہے - اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ تمام زمین پر اس کی پیداوار کے مطابق لگان مقرر کر دیا جائے جو زمین جوتنے والے سرکار کو خود ادا کر دیا کریں - یہی ریاست کی آمدنی ہو اور وہ تمام دوسرے محصولوں کی جگہ لے لے میں اسکا بآسانی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ سرکاری فرمان کی رو سے ایک مرکزی بورڈ اس غرض سے بنایا جائے جو زمین پر سے شخصی ملکیت اٹھالے - اور حکومت کی ایک کمیٹی بنا دی جائے جو زمین پر لگان لگائے اور دوسرے امور کی انجام دہی کرے - جو روسی شہنشاہ صرف روسیوں کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے یہ خدمت انجام دے گا وہ کتنا بڑا کام کرے گا - اور وہ کتنی خوبی کے ساتھ روز کے اجتماعیوں کے جھگڑے اور انقلابیوں کی چالبازیوں سے محفوظ ہو جائے گا - وہ اپنے آپ کو اپنی جگہ پر کس قدر محفوظ محسوس کرے گا - قوم کے بہترین افراد اسے مدد دیں گے اور اسی طرح عام رعایا جو اپنی سب سے اہم اور دلی خواہشات کو اس کے ذریعے پورا ہوتے ہوئے دیکھے گی - اور وہ خواہش یہی ہے کہ ہر شخص اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے لئے زمین سے اپنی خوراک حاصل کرے جو خدا نے کسی ایک کو نہیں بلکہ بلا تفریق ہر ایک کو عطا کی ہے - یہ ہے میرا ایمان - مگر جیسا میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں یہ بہت ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں اور کوئی اور مطمح نظر ہو جسے حاصل کرنے کی دھن میں انسان لگا ہوا ہے اور جو حکومت کا بھی مطمح نظر ہونا چاہئے یہ تو ممکن ہے مگر ایک چیز بہر حال ناممکن ہے اور وہ یہ کہ ایسی حکومت ہرگز زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی جو موجودہ طریقہ پر چل رہی ہے، جو اپنی زندگی میں لوگوں سے بے تعلق ہو چکی ہو اور جو اپنے آپ کو رعایا کی خدمت کے لئے پیش کرنے پر آمادہ نہیں اور نہ رعایا کی اس مقصد کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس کا حصول واقعی اسے خوشحالی دے سکتا ہے -

کل سپ یاگنس[1] کے قتل کی اطلاع ملی - یہ واقعہ بہت تکلیف دہ ہے - خاص طور پر نفرت

---

[1] ۱۹۰۰ء تا ۱۹۰۲ء وزیر داخلہ - ۱۹۰۲ء میں کسی انقلابی نے قتل کر دیا -

غصہ اور انتقام کے ان جذبات کی وجہ سے جنہوں نے اسکا ہونا لازمی بنا دیا۔ یہ بات بہرحال ایک دن ہونیوالی تھی۔ اور اگر حکومت نے اپنے رویہ میں پوری پوری تبدیلی نہ کی تو در اصل یہ اور بھی آنے والی تباہی کا پتہ دیتی ہے۔ کامل نظم و نسخ صرف معقول سمجھوتے اور محبت پر قائم ہوسکتا ہے۔ قوت، مقابلہ اور انتقام پر کسی چیز کی بھی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

مجھے معاف فرمائیے کہ میں نے آپ کو اتنا بڑا خط پڑھنے کی تکلیف دی، مگر اس سے میرا مقصد صرف اس قدر تھا کہ آپ میرے مطلب کو سمجھ سکیں۔ کچھ تو کمزوری کی وجہ سے جس کا اندازہ آپ اسی سے کرسکتے ہیں کہ میں لیٹے لیٹے لکھ رہا ہوں اور خاص طور پر سپ یاکنس کے مظلومانہ قتل کے واقعہ کی وجہ سے میں غیر معمولی بے قراری محسوس کر رہا ہوں۔ یہ واقعہ جانبین میں دشمنی اور سختی کے جذبات کو اور بھی بھڑکائے گا حالانکہ اس کو دور کرنا کس قدر آسان تھا۔

اچھا اب رخصت۔ میں تہ دل سے آپ کی جسمانی تندرستی اور روحانی مسرت و اطمینان کی دعا کرتا ہوں۔

آپکا مخلص

لیوطولسطائے

ان خطوں کے جواب میں نواب اعظم نے طفلس سے دو خط لکھے ہیں جہاں ان دنوں انکا قیام تھا۔ پہلا خط ۱۵ر نومبر کا لکھا ہوا ہے:-

صدیقی لیونکولائیوچ۔ آپ کے خط نے جو مجھے کل ملا۔ مجھے حد درجہ خوشی بخشی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ اب اتنے تندرست ہیں کہ خط لکھ سکیں اور دوسرے اس وجہ سے کہ مجھے آپ کے جس خط کا انتظار تھا وہ عین ایسٹر کے موقع پر ملا۔ آپ کی صحت کے متعلق اب تک جو اطلاعات شائع ہوئیں انکا میں بڑی توجہ سے مطالعہ کرتا رہا ہوں اور خیال تھا کہ میں خود اب اپنی خاموشی کو توڑدوں اور ڈھائی مہینے کے بعد کہ اس زمانہ میں سفر بھی کیا اور آرام بھی۔ آپ کو پھر اپنی بکواس سے تکلیف دوں۔

اب آپ اپنے خط کا جواب سنئے۔ ۲۲ جنوری کو جب میں پیٹرس برگ پہنچا تو دوسرے ہی دن آپ کا خط ملا۔ ظاہر ہے کہ اسے میں نے پڑھا۔ اس کی ایک نقل کی اور خیال کیا کہ میں اسے بزالیس ویتیس اس تک پہنچا سکتا ہوں جس کے نام وہ لکھا گیا تھا[1]

جب میں نے قیصر سے پوچھا کہ کیا میں خط آپ تک پہنچا سکتا ہوں تو انہوں نے جواب دیا "یقیناً"۔ چنانچہ تین دن کے بعد جب ایک خاندانی دعوت ہوئی تو اس کے اختتام پر میں نے خود انہیں آپ کا خط دے دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنی طرف سے یہ بھی کہا کہ "نیو نکولائے وچ کی عزت کے خیال سے میں آپ سے ایک درخواست کرتا ہوں جسے اگر شرف قبول بخشا گیا تو مجھے دلی مسرت ہوگی اور وہ درخواست یہ ہے کہ آپ اپنے وزرا میں کسی کو بھی یہ خط پڑھنے کے لئے نہ دیں۔ یہ میری اپنی درخواست ہے۔" قیصر نے یہ وعدہ کیا کہ وہ خط کسی کو نہ دکھائیں گے اور فرمایا کہ وہ اسکا بہت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے۔ اس کے بعد مجھے کوئی اور موقع نہ مل سکا۔ میں اس خط پر ان سے گفتگو کر سکتا۔ اور خود اس موضوع پر ان سے گفتگو چھیڑنا میں نے مناسب خیال نہ کیا۔

میں اس بات سے ان کی نوازش کا اندازہ لگا سکتا ہوں کہ انہوں نے مجھے خط پہنچانے کی اجازت دی اور پھر اسے بڑی مہربانی کے ساتھ راز میں رکھنے کا وعدہ کیا۔ ہمارا قیصر واقعی نہایت نیک دل اور دوسروں کی مشکل میں کام آنے والا انسان ہے۔ ساری مصیبت تو وہ لوگ ہیں جو اس کے رازدار ہیں۔ میں نے جب قیصر سے درخواست کی کہ وہ خط کسی اور کو نہ دکھائیں تو یہ محض آپ کی عزت کے خیال سے تھا۔ اور اس خواہش کی بنا پر کہ ہزار قسم کی افواہوں اور وزرا کی تشریحات کا سدباب ہو سکے جن کا ہمیشہ یہ مقصد رہتا ہے کہ وہ قیصر کے سامنے آپ کی نہایت بھیانک تصویر پیش کریں۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

---

[1] یعنی زار نکولاؤ دوم کے نام

موجودہ حکومت اور مادر وطن کو اس انتشار کی حالت سے نکالنے کے لئے آپ اپنے ۵ راپریل کے خط میں جو نسخہ تجویز کرتے ہیں اس کے متعلق اگر آپ براہ مانیں تو میں عرض کروں کہ آپ کا تخیل بہت زیادہ بلند ہے۔ اور اس کے محض تخیل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آپ روس میں اس بات کو ممکن سمجھتے ہیں جس کا یورپ اور یہانتک کہ امریکہ میں بھی کوئی شخص خیال تک دل میں نہیں لاتا۔

مانا کہ ہر کسان اپنی چھوٹی سی ملکیت کا خود ہی ذمہ دار ہو اور اسکا لگان ادا کرے۔ مگر جہانتک میں سمجھ سکا ہوں آپ کا منشا تو یہ ہے کہ تمام جائداد مع اپنی تمام آمدنی کے ریاست یعنی شاہی خزانہ کی ملک ہوجائے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر مالکوں کی پوری جماعت یعنی ہر قسم اور رتبے کے مالک اس شرط کے ساتھ کہ آمدنی کا ایک حصہ انکے لئے مخصوص ہوگا اس پر راضی بھی ہوگئے تو آپ کو خود کسانوں کی نہایت خوفناک مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اتنے عظیم الشان مقصد کی تکمیل کے لئے ایک غیر معمولی زار کا وجود لابدی شے ہے۔ مثلاً پیٹر اعظم جو اس کے ساتھ ایسے ہی دوسرے مددگار لئے ہوئے ہوں نہ کہ وہ جو آج نکولاؤ دوم کے احکام کی تکمیل کرتے ہیں۔ آج وہ محکمے جن کے قیام کو سو سال سے اوپر ہو چکے ہیں مجلس قانون ساز، مجلس عدلیہ اور وزارت خانوں کی از سر نو اصلاح اور ان میں نئی روح پھونکنے کے لئے یہ اشد ضروری امر ہے۔

میں اس موضوع کو اسپر ختم کرتا ہوں کہ آپ کے خیالات جس قدر بلند اور ہمدردانہ ہیں انہیں عملی جامہ پہنانا اسی قدر دشوار ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ "کل جگ" اصلاح کا محتاج ہے۔ مگر اصلاح قابل ہونا چاہئے نہ کہ عجلت پسندانہ۔ اب سب سے اہم سوال یہ باقی رہتا ہے کہ اصلاح کا کام شروع کہاں سے کیا جائے۔ کتنے مسائل ہیں۔ تعلیم، تربیت، مدرسین، اساتذہ مزدور، نقصان پہنچانے والے افسر، جماعت حکام، عام مصیبتیں، دولت پیدا کرنے کا سوال ناقابل برداشت فوجیت، ضابطہ کا فقدان۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہی مسائل کیا کم ہیں کہ آپ کاشتکاری

کی اصلاح کا مسئلہ بھی چھیڑنا ممکن خیال کرتے ہیں۔ انسان جماعت کا ساتھ دے کر ہی تو لڑائی لڑ سکتا ہے
مگر آپ کو اس کی کوئی نہیں کہ آپ اس معاملہ میں تنہا ہیں۔ اس لئے کہ جب آپ کے خیالات کو عملی جامہ
پہنانے کا سوال آئے گا تو وہ لوگ بھی جو آپ سے ہمدردی رکھتے ہیں آپ کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔
میرے خیال میں تو ہماری سوسائٹی اس قدر قعرِ مذلت میں جا چکی ہے کہ اس کی اصلاح صرف حکومت
کی مستحکم اور مسلسل کوشش اور اس کی پوری پوری رضامندی ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ میری رائے
میں شہنشاہیت اب بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری کو ۱۳ کروڑ انسانوں کے سامنے
کم کرے اور وزرا کی ذمہ داری بڑھا دے۔ خرابی کی جڑ یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں بہت پرانی ہو گئی
ہیں۔ انیسویں صدی میں زندگی اور اس کی ضروریات کہیں آگے نکل گئیں مگر ہمارے سرکاری
محکمے وہیں کے وہیں رہے۔ اس کی اگر اصلاح ہوئی اور اسے پھر زندہ کیا گیا تو پھر اسکا بھی امکان
ہوگا کہ اس پیچیدہ مسئلہ پر جو آپ نے چھیڑا ہے غور کیا جائے اور یہ بلند تخیل خوبی کے ساتھ
عملی جامہ پہن سکے۔

آپ کو مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ سپیاگنس کے قتل کی وجہ سے جوش
اور غصے کے ایسے جذبات پیدا ہوں جو نہ ہونے چاہئے تھے۔ اب مجھے تو یہ دیکھنے کا شوق ہے کہ
پلیوے[1] معاملہ کو کیونکر طے کرتا ہے۔ مجھے تو فن لینڈ اور کوہ قاف میں اچھی علامات نظر آ رہی ہیں۔
خدا کرے میں اپنے اس خیال میں غلطی پر نہ ہوں۔ اب وانوسکی[2] کے استعفے پر کیا رائے زنی کی
جا سکتی ہے۔ کیا اپنی ہر دلعزیزی کی خاطر اور خود اپنی مرضی سے اپنے قیصر کو ایسے وقت میں خیرباد کہنا

---

[1] ورک۔ پلیوے۔ جو سپیاگنس کی جگہ وزیر داخلہ مقرر ہوا تھا ۱۵؍جولائی ۱۹۰۴ء کو ایک انقلابی کے ہاتھ مارا گیا۔
[2] وانوسکی (۱۸۲۲ء تا ۱۹۰۴ء) ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۸ء تک وزیر جنگ تھا۔ اس زمانہ میں اس نے بہت سی
اصلاحات کیں۔ ۱۹۰۱ء میں جب وزیر تعلیم کے قتل کا واقعہ ہوا تو اسے وزیر تعلیم مقرر کیا گیا۔ ایک سال تک
نوجوانوں کی انقلابی تحریکوں سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا رہا اور ۱۹۰۲ء میں اپنی جگہ سے مستعفی ہو گیا۔

اور اس کے لئے اور دشواریاں پیدا کرنا مناسب تھا؟

مگر میں نے اپنے خط کو بہت طول دیا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں آپ اسے پڑھتے پڑھتے تھک نہ جائیں۔ میں اس طویل تحریر کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو مجھے لکھئے۔ مجھے جانچ پڑتال کا ذرہ برابر خوف نہیں اور مجھے آپ سے گفتگو کرنے میں بہت لطف آتا ہے۔ آپ کی ۵ نومبر کی سطروں کا تہ دل سے شکریہ جنہوں نے مجھے اطمینان اور یقین دلایا ہے کہ آپ کے دل میں میرے لئے جگہ ہے۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ آپ جلد سے جلد دوبارہ تندرست و توانا ہو جائیں۔ آپ اپنی صحت کا بہت خیال رکھئے۔ اور بغیر سوچے سمجھے زیادہ تفریح کے لئے باہر نہ جائیے۔ نہ پیدل اور نہ گھوڑے پر۔ براہ کرم اپنی بیگم صاحبہ کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام پہنچا دیجئے۔ میں آپ سے پوری قوت کے ساتھ مصافحہ کرتا ہوں۔

آپ کا نہایت ہی مخلص

نکولاؤ میکائیلووچ

نواب صاحب کا دوسرا خط یہ ہے:-

جیبی لیو نکولائی ویچ۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ ملیریا کے حملہ کی وجہ سے دوبارہ کمزوری محسوس کر رہے ہیں۔ مگر امید ہے کہ موسم گرما کے ساتھ ساتھ آپ کی قوت بھی عود کر آنے گی۔ آپ نے از راہ کرم مجھے جو خط لکھا ہے اس میں اس قدر اہم، بنیادی اور دلچسپ سوالات سے بحث کی گئی ہے کہ میں نے اسے کئی بار پڑھا، مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں آپ سے بہت سی باتوں میں متفق نہیں ہو سکتا۔ اس کی سب سے پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ مجھے ہنری جارج کی کتاب کے متعلق پوری معلومات نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس کے مطالعہ سے قاصر رہا اور میرے ذہن میں اس کتاب کا صرف ایک دھندلا سا خاکہ ہے۔ مجھ پر اتنی نوازش کیجئے کہ مجھے اس کتاب کا روسی یا فرانسیسی ترجمہ بھیج دیجئے۔ اس لئے کہ اگر میں انگریزی میں پڑھوں تو جلد پڑھنے میں بہت سے الفاظ کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اختلاف کی دوسری وجہ غالباً زراعتی معاملات سے میری

ناواقفیت ہی ظاہر ہے کہ اس موضوع پر میرے تمام دلائل کچھ زیادہ وقیع نہیں ہو سکتے۔ اور خصوصاً آپ کے سامنے کہ آپ نے اتنی کثرت کے ساتھ اور بغیر دم لئے ہوئے ان مسائل کا مطالعہ کیا ہے۔ تجربہ اور علم اشیا آپ کی پشت پر ہیں اور میری طرف صرف مباحثہ کی قابلیت۔

اگر مجھے روزانہ کے مسائل سے دلچسپی ہو بھی تو میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ میں اس کی طرف صرف اس وقت توجہ کرتا ہوں جب مجھ پر کوئی ذمہ داری عائد کیجائے۔ لیکن آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے ان معاملات سے کتنا واسطہ ہے اور پیٹرس برگ کے سرکاری حلقوں سے میں اپنے آپ کو کس قدر دور رکھتا ہوں۔ لہذا مخلوق کے معاملات میں کسی طرح کا فائدہ یا نقصان پہنچانے کا سوال تو جاتا رہا۔ البتہ میں بیٹھے بیٹھے کاغذ پر نظریے بنا سکتا ہوں اور آپ کا مشکور ہوں کہ آپ مجھ سے خط و کتابت پر آمادہ ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب سے آپ نے گذشتہ خزاں کے موقع پر مجھ سے چند گھنٹوں کے لئے ملاقات کی ہے اور آپ کا دل میری طرف سے مطمئن ہو گیا ہے۔ اس وقت سے آپ میرے حال پر جو عنایت فرماتے ہیں اسے میرا دل اچھی طرح محسوس کرتا ہے لیکن اس قدر پیچیدہ مسائل پر خط و کتابت، آمنے سامنے گفتگو کے ذریعہ تبادلۂ خیالات کی نسبت بدرجہا دشوار ہے۔ اور افسوس اس بات کا ہے کہ نہ معلوم اسکا موقع مل سکے گا کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور جی بھر کے گفتگو کروں۔ مجھے یقین ہے کہ اس صورت میں آپ کے پیش کردہ مسائل کے متعلق مجھے جو غلط فہمیاں یا شبہات ہیں وہ فوراً رفع ہو جائیں گے۔ مگر کاغذ پر یہ ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ آپ کے خط کی بعض باتوں کا جواب نہ دوں:۔

۱۔ اگر آپ خلق العنان حکومت کو اس کا اہل سمجھتے ہیں کہ وہ اس قسم کی زراعتی اصلاحات کر سکے جن کا خاکہ ہنری جارج نے اپنی کتاب میں کھینچا ہے تو پھر گویا آپ اس کی موجودہ ساخت کو بھی اس قابل سمجھتے ہیں۔ مگر آپ تو خود ہی فرماتے ہیں کہ موجودہ [illegible] اس قابل نہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بدتر ہے۔ اس سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ صاف ہے۔

یعنی یہ کہ ان کی جگہ اوروں کو مقرر کرنا چاہیے۔ مگر کیسے؟ کیا شاہ نکولاؤ دوم کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ حکومت کا تمام عملہ بیک وقت بدل سکے؟ آپ پرانے محکموں کو پرانے زمانہ کی یادگار تو سمجھتے ہیں مگر اس کے ساتھ "پرانی قمیص پر نئے پیوند لگانا"، آپ مناسب نہیں خیال کرتے۔ پھر میری سمجھ میں کوئی دوسرا اصل نہیں آتا کہ نئے عناصر کیونکر ان اجسام میں داخل کئے جا سکتے ہیں جو اپنی زندگی ختم کر چکے ہیں۔

۲۔ اب فرض کیجئے ہمیں ایسے اشخاص مل بھی گئے کہ جو کام کر سکیں اور روس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ (یہ دوسری شرط میں اپنی طرف سے لگاتا ہوں) آپ کے خیال میں تو ایسے لوگوں سے "روس بھرا پڑا ہے" مگر میں اسے آسانی یقین نہیں کر سکتا۔ میری رائے میں یہ بہت مشتبہ امر ہے۔ مگر پھر بھی فرض کیجئے کہ آپ کو ایسے اشخاص مل گئے تو کیا آپ کے خیال میں یہ ممکن ہے کہ ان تمام کے تمام دس یا بیس عہدہ داروں کے دل میں بھی زراعتی اصلاح اور اس کے فوائد کا خیال گھر کرلے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر نکولاؤ دوم کے ذہن میں آپ کی تجاویز کے فوائد آ گئے اور اس نے انہیں پورا بھی کرنا چاہا تو سب سے پہلے راہ میں جو رکاوٹ آتی ہے وہ عہدہ داروں کا انتخاب ہے اور واقعہ یہ ہے کہ پھر وہی "گھڑیال، راج ہنس، اور جھینگے" کی کہانی اپنے آپ کو دہرائے گی۔

۳۔ اسی خیال سے میں نے آپ کو لکھا ہے کہ اس قسم کی بلند پایہ اصلاح کے لئے (اگر اسے عنقا نہ سمجھا جائے) تو پیٹر اعظم جیسی شخصیت کی ضرورت ہے یعنی ایسا شہنشاہ جو قوی ہو۔ آزاد ہو، اپنی تجاویز پر آخری دم تک اڑا رہنے والا ہو اور پھر لوگوں کے انتخاب کا ملکہ رکھتا ہو۔ محض نیکی اور خوش خلقی کے ذریعہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس میں سے عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس پر میرا پورا پورا یقین ہے۔ اس لئے کہ شہنشاہ کی یہ خوبیاں دراصل اس کی مطلق العنانی کے قیام کی بنیاد ہیں۔

۴۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی موجودہ حالت کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیئے اور یہ نہیں کہ

زار نکولاؤ دوم سے ناممکنات کا مطالبہ کیا جائے۔ ضروری یہ امر ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔ اور یہی ہر اس روسی کا اولین فرض ہے جو اپنے وطن اور اپنے بادشاہ کو عزیز رکھتا ہے۔ ہاں ابھی پھر اعلیٰ محکموں کی نئی اصلاحات کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ یہ کام وزرا کے ذمہ کر دینا چاہئے۔ مگر آپ پوچھیں گے کہ وہ کس کے سامنے ذمہ دار ہوں؟ اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ رائے عامہ کے سامنے کوئی وجہ نہیں کہ سرکاری اطلاعات میں مجلس قانون ساز کے اجلاس اور اس کے محکموں کی ٹھیک ٹھیک کارروائی شائع نہ کی جائے۔ جب ہر وزیر کو اس کا علم ہوگا کہ جو لفظ بھی اس کی زبان پر آئے گا۔ اس کا رعایا کو علم ہو جائے گا۔ تو پھر اسے کہنے سے پہلے ذرا اچھی طرح غور کر لینا ہوگا۔ اس صورت میں کام کی مقدار زیادہ ہو جائے گی اور فضول گوئی کم۔ اور اسی سے ایک طرح کی اخلاقی جوابدہی کی ابتدا ہو سکے گی۔ ایک طرف زار کے سامنے اور دوسری طرف پبلک کے سامنے۔

موجودہ محکموں کی تعداد اور یہ تمام لکھا پڑھی جو حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے کیوں نہ کم کر دی جائے؟ اور ایسے حکام جو بے لگام چھوڑ دیئے گئے ہیں اور جن کی حیثیت اس کیڑے کی سی ہے جو درخت کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ وہ حکام جنہیں جب بھی موقع ملتا ہے حکومت کے نام پر بٹہ لگاتے ہیں ان کو کیوں نہ اچھی طرح قابو میں رکھا جائے؟ بہت کچھ جو ابتک زار کی آنکھ سے پوشیدہ ہے پھر وہ اس کے سامنے آئے گا۔ اور اس کی آنکھیں کھلیں گی۔ تب اس کے لئے یہ آسان ہوگا کہ وہ معتبر اور اپنی مرضی کے مطابق حکام کا انتخاب کرے۔

اس طرح تمام اعلیٰ محکموں کی از سر نو ترتیب کے ساتھ نئے لوگ بھی خود بخود سامنے آئیں گے اور شاید آپ کی تجویز وقت کی صورت اختیار کر سکیں گی۔ گزشتہ صدی میں بھی آخر لوگ تھے جو موت کی بات سے خوش تھے۔ زندگی میں انہیں پہنچیں گئے بیچ کی نظر سپرانسکی[1]

---

[1] سپرانسکی [illegible] مشہور روسی سیاست داں۔ روس میں بہت سی اصلاحات کا

ن۔س۔ موردوینوف[۵۱] نواب کامکران[۵۲]، ن۔ا۔ ملیوتن[۵۳]۔ اور خود قیصر سکندر دوم کی شخصیتوں پر نہیں جاتی ؟ ۔ اس طرح زار سکندر سوم نے اپنے خاص روسی انداز میں تمام چیزوں کو روسی رنگ دینے کی کتنی کوشش کی ؟ اندرونی سیاست میں ہمیشہ ریاست کی بھلائی ان کے پیش نظر رہی اور بیرونی سیاست میں ان کے ۱۴ سالہ عہد میں روس نے وہ حیثیت حاصل کی جو اس سے پہلے اسے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری روسی زندگی میں مطلق العنان بادشاہ کو کتنا اہم درجہ حاصل ہے۔ مگر میں پھر دہراؤں کہ محض نیکی اور نرمی سے کام نہیں چل سکتا۔

میں نے پھر اپنے شبہات اور بعض فروعات کے بیان میں طول کو بہت دخل دیا اور پھر بھی مجھے خوف ہے کہ میں آپ کو ذرہ برابر بھی مطمئن نہیں کر سکا ہوں۔ مگر میں دوبارہ عرض کروں کہ میں ہمیشہ وہی ایمانداری کے ساتھ لکھ دیتا ہوں جو کچھ میرے دماغ میں آتا ہے۔ بہر حال اس بات پر ہم دونوں متفق ہیں کہ موجودہ صورت حال زیادہ عرصہ تک قائم رہنے والی نہیں۔ اور اگر یہ ڈھرا یوں ہی چلتا رہا تو تباہی و بربادی یقینی ہے۔ اب اس مرض کے علاج کے متعلق مجھ میں اور آپ میں اختلاف ہے۔ میرے لئے یہی بات اطمینان بخش ہے کہ میں آپ سے صاف صاف اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہوں اور آپ اسے صبر کے ساتھ سن لیتے ہیں۔

ذ۔ س۔ د۔ ا۔

۵۱ نواب ن۔س۔ موردوینو (۱۸۴۳ء تا ۱۸۴۵ء) اعتدال پسند روسی سیاست داں۔

۵۲ نواب ا۔ ف۔ کو مکرین (۱۸۰۰ء تا ۱۸۸۰ء) المانی النسل، ۲۲ سال کی عمر میں روس گیا اور وہاں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۸۱ء تک وزیر مالیات رہا۔

۵۳ ن۔ا۔ ملیوتن (۱۸۱۸ء تا ۱۸۷۲ء) سکندر دوم کے عہد کا مشہور مدبر۔

آخر میں پھر آپ سے درخواست ہے کہ آپ بہت احتیاط سے کام لیں۔ اور جب تک طبیعت بالکل صاف نہ ہو جائے کسی قسم کی مشقت نہ کریں مجھے امید ہے کہ کریمیا کی آب و ہوا اور موسم گرما کا آپ کی صحت پر اچھا اثر ہوگا۔ میں آپ سے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص ترین نیازمند
نکولائیو میکائیلووچ

غزل

(از حضرت احسانؔ)

نہاں ہے جسکی ہر اک موج میں پیام سُرُوش — وہ ہم شکستہ دلوں کا ہے نغمۂ خاموش
نگاہ شوق لطافت سے ہو اگر معمور — تو رقص گاہ تجلی ہے ذرّہ کا آغوش
نظر سے بچ نہ سکا کوئی نکتۂ فطرت — جنونِ عشق میں اللہ ری یہ عالمِ ہوش
کسی نصیب کہاں ذوق یہ بھی دل کو — اک اضطراب ہے پھر بھی یہ اضطراب خموش
نکل گئے ہیں بہت دور تیرے دیوانے — غضب ہوا جو کہیں آ گیا انھیں ہوش

بنیادی اصلاح

(ریفیم زوٗ: لیا جدید روس کا مشہور افسانہ نگار ہے۔ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوا۔ بچپن ایک صنعتی شہر میں گزرا۔ لڑکپن کا زمانہ اوڈیسا میں ایک مدرسہ میں کاٹا اور اپنے وطن میں آن بسا۔ بچپن ہی سے اُس کی نظر بہت تیز اور زبان بہت شوخ تھی۔ انقلابی تحریکوں میں حصہ لیا، اس لئے کئی مرتبہ قید خانہ میں رہنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اس نے ۱۸ سال کی عمر میں افسانے لکھنا شروع کر دئے تھے لیکن پھر کچھ عرصہ کے لئے اس شغل کو ترک کر دیا۔ اس کی طنزیہ تحریریں روس میں تلوار کا کام کرتی ہیں۔ بولشوکوں نے اسے اپنا لیا ہے، لیکن یہ ان پر بھی وار کرہی دیتا ہے۔ ذیل کا افسانہ نہ معلوم روس کے انسانوں کی ہجو ہے یا ان کے مصلحین کی!)

اشتہار

گھر بھی روز جیسے ہیں۔ گلیاں بھی۔ سر پر وہی نیلا آسمان۔ سڑک کے پتھر اُسی پرانے مٹیالے لباس میں ہیں۔ مگر کچھ آدمی ہیں، بدحواس و پریشان، جو دیواروں پر بڑے بڑے اشتہار چسپاں کر رہے ہیں آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں اور لیئی کی بالٹی میں جو سیڑھی کے ڈنڈے میں لٹکی ہے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔

اشتہار کی عبارت نہایت سادہ ہے، بے رحم اور بے پناہ۔ ملاحظہ ہو:۔

ہر شخص کے لئے

بلا استثنا

عدالت العالیہ نے ایک خاص تحقیقاتی کمیشن کا تقرر فرمایا ہے۔ جو شہر کے باشندوں کا امتحان کریگا۔ نیز محلہ محلہ تحقیق کر کے فیصلہ کریگا کہ شہریوں

میں کس کس کو زندہ رہنے کا حق ملنا چاہئے۔ جو باشندے مد زائد میں درج کئے جائیں گے اور جن کا وجود غیر ضروری قرار پائے گا انھیں برخاستی کا حکم ملے گا اور انہیں ۲۴ گھنٹہ کے اندر دنیا کو چھوڑنا ہوگا۔ حکم برخاستی کے خلاف ۲۴ گھنٹہ کے اندر مرافعہ دائر ہو سکتا ہے۔ مرافعہ تحریری ہونا چاہئے۔ یہ درخواست مرافعہ عدالت العالیہ کی مرکزی کوٹھی کے سامنے پیش کردیجائیگی تین گھنٹہ کے اندر فیصلہ صادر ہو جائے گا۔ غیر ضروری انسان جو قوت ارادہ کے ضعف یا زندگی سے محبت کے باعث زندگی ترک کرنے پر بخوشی آمادہ نہ ہونگے اُن کے متعلق عدالت العالیہ مناسب کارروائی کرے گی اور اُن کے دوستوں، پڑوسیوں، یا خاص مسلح ٹولیوں کے ذریعہ تعمیل حکم کرائے گی۔

لوٹ:۔ ۱۔ باشندگان شہر پر واجب ہے کہ کمال اطاعت کے ساتھ عدالت عالیہ کے اراکین کے احکام کو مانیں۔ ان کے سوالات کے جواب صحیح صحیح دیں۔ ہر غیر ضروری شخص کے خصائص کے متعلق ایک سرکاری رپورٹ بھی شائع کی جائے گی۔

۲۔ اس حکم پر بلا رو رعایت عمل ہوگا۔ انسانی فضلہ جو زندگی کو عدل و مسرت کی بنیادوں پر تعمیر نہیں ہونے دیتا اُسے بے رحمی کے ساتھ صاف کرنا ہے۔ یہ اعلان بلا امتیاز سب کے لئے ہے۔ مرد عورت، غریب امیر کوئی مستثنیٰ نہیں۔

۳۔ حق زندگی کی تحقیقات کے دوران میں شہر چھوڑ کر جانا سخت ممنوع ہے۔"

"ادارت بھائی۔ ترسنے پڑھیے؟"

"تم نے پڑھا بھی؟"

"کیوں جی، پڑھا، یہ پڑھا؟"

"تم نے پڑھا؟"

"پڑھا؟ پڑھا؟"

شہر میں ہر جگہ آدمیوں کا جھمگٹا۔ راستے بھیڑ سے بند۔ کسی کے پانوں جواب دے گئے، اشتہار پڑھتے پڑھتے وہیں دیوار کا سہارا لے لیا۔ کوئی زار و قطار رو رہا ہے۔ کوئی غش کھا کر گر پڑا۔ شام تک بے تعداد لوگوں کو ضعف کے دورے پڑ گئے۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ جو ہے بس یہی "تم نے پڑھا، تم نے سنا؟"

"ارے کیسا غضب ہے۔ کسی نے ایسا اندھیر نہ سنا نہ دیکھا۔"

"کیوں بھائی ہمیں نے تو عدالت عالیہ کو منتخب کیا تھا، ہمیں نے تو انھیں سارے اختیارات دئے تھے!"

"ہاں، یہ تو سچ ہے"

"اس مصیبت کے ہمیں ذمہ دار ہیں، ہمیں ہی، جی ہیں"

"ہاں، یہ تو سچ ہے۔ تصور تو اپنا ہی ہے۔ ہمیں نے تو بہتر زندگی کی خواہش کی تھی۔ مگر یہ کسے خبر تھی کہ اس کی تدبیر ہو گی۔ عدالت نے جو سہل اور سخت طریقہ نکالا وہ کسی کے خیال میں بھی نہ تھا۔"

"نام تو دیکھو، کمبختوں کے نام، جو اس کمیٹی میں ہیں۔ اللہ اللہ کیا لوگ ہیں؟"

"کون، کون۔ تمہیں کیا خبر؟ کیا نام بھی نکل گئے؟"

"ایک جان پہچان والے سے سنا ہے۔ کمیٹی کا صدر "آک" ہے۔"

"سچ؟ خدا کا شکر ہے۔ یہ بھی خوش قسمتی جانو۔"

"ہاں ہاں۔ وہی صدر ہے۔"

"یہ بڑا ہی اچھا ہے۔ واللہ کیا آدمی ہے!"

"ٹھیک۔ پھر زیادہ فکر نہیں۔ وہ تو واقعی فضلا ہی کو صاف کرے گا۔ وہ ناانصافی نہیں کرنے کا۔"

"بھائی کیا کہتے ہو۔ مجھے چھوڑ دینگے؟ میں تو اچھا خاصہ آدمی ہوں۔ تجربہ؟ ایک دفعہ ایک جہاز ڈوبا تو بیس آدمیوں نے ایک کشتی میں اپنی جان بچائی۔ مگر کشتی اتنے آدمیوں کا بوجھ نہ سہار سکی اور سب کے سب ڈوبنے ہی کو تھے۔ پندرہ کشتی میں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کی جان بچانے کے لئے پانچ کو سمندر میں کودنا ضرور تھا۔ میں ان پانچ میں پہلا تھا۔ میں سب سے آگے کودا۔ دیکھئے کیا ہو، یقین نہیں آتا؟ اب بڈھا ہو گیا، کمزور ہو گیا۔ کیوں تم نے کیا واقعی یہ بات پہلے نہیں سنی تھی؟ اس وقت تو سارے اخبار کے اخبار اس سے بھرے پڑے تھے۔ میرے چار ساتھی تو مر گئے۔ میں اتفاق سے بچ گیا۔ کیوں کیا سمجھتے ہو؟ مجھے چھوڑ دینگے؟"

"اور مجھے؟ اور مجھے؟ میں نے اپنا سارا مال دولت غریبوں کو دے ڈالا۔ بہت دن ہوئے۔ میرے پاس ثبوت کے کاغذ موجود ہیں۔"

"بھائی کیا خبر۔ یہ سب اُس پر منحصر ہے کہ عدالت کے پیش نظر کیا چیز ہے؟"

"اجی حضرت۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اپنے پڑوسی کو تھوڑا سا فائدہ پہنچا دینے سے آدمی کو زندہ رہنے کا حق نہیں ملجاتا۔ یوں تو پھر ہر بیوقوف اتنا دودائی کو زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیئے۔ یہ تو پرانے دقیانوسی خیالات ہیں۔ زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ آپ ہیں کہاں؟"

"اچھا تو پھر آدمی کی اصلی قدر و قیمت کا سبب ہے؟"

"ہاں، واقعی بتائیے کا سبب ہے؟"

"ہم کیا جانیں، کا سبب ہے"

"خوب، یہ خوب رہی۔ جب نہیں جانتے تو پھر خواہ مخواہ ہر بات میں اپنی ناک کیوں گھسیڑتے ہو؟"

"معاف کیجئے گا۔ میں جو سمجھتا تھا وہ میں نے کہہ دیا۔"

"لوگو، لوگو، ذرا دیکھو تو، دیکھو تو، اسب کے سب بھاگ رہے ہیں۔ گڑبڑ تو دیکھو! ہنگامہ!!!"

"یا اللہ، یا اللہ...... اوہو، اُفوہ...... جان بچاؤ، جان۔"

بھاگڑ

سڑکوں اور گلیوں میں بھاگڑ پڑی تھی۔ آدمیوں کے غول کے غول ادھر سے اُدھر دوڑتے دوڑتے پھرتے تھے۔ لال لال منہ والے نوجوان، چہروں پر ہوائیاں۔ دفتروں اور دکانوں کے بیچارے غریب منشی اور محرر۔ نئے نئے کھڑکھڑاتے جوڑے پہنے ہوئے دولہا۔ گویّے، نچکیّے، بانکے، قصہ گو، اٹیں کھیلنے والے، ہر شام کو سینما میں جانے والے، سفارشی ٹٹو، بدکار، بدمعاش، ٹھگ، سفید پیشانی اور گھونگردار بالوں والے، لچے، شہدے، لفنگے، نشہ باز، ٹھٹھے لگانے والے، ہلڑ مچانے والے، شوقین چھیلے، عشاق، سائیکلوں پر چڑھنے والے، ہٹے کٹے جھگڑالو جنھیں بیکاری کی وجہ سے سوائے ٹھٹھے ٹھٹھولی کے کوئی کام نہیں، باتیں بنانے والے، نرمی لمبے لمبے بال والے مکار کیٹی پاکھنڈی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آہ سرد بھرنے والے، غمگین اداس آنکھوں والے جنکے غم کے پردہ میں بس کچھ نہیں۔ نوجوان بانکے گنوار، بھرے بھرے چہرے، لال لال ہونٹ والے، چکنی چپڑی باتیں کرنے والے، شیخی باز، بدگو، نیک دل بھولے ناکام لوگ، اور چالاک خراباتی۔

موٹی موٹی، ٹھوس ٹھوس کر کھانے والی سست عورتیں بھی دوڑ رہی تھیں

اور تپلی دبلی لڑاکو جھگڑالو عورتیں بھی چنچل چلبلی، کان کھاؤ مغز چاٹ، عقلمندوں کی بیویاں
اور بیوقوفوں کی؛ بے وفا، باتونی، حاسد، لالچی، خوف کے مارے سب کے چہرے بگڑے
ہوئے۔ مگری مدبغ آنکھیں؛ نیک پارسا مگر بیکلا عورتیں، جو بیکاری میں اور کچھ نہیں تو اپنے
بال ہی رنگا کرتی ہیں؛ بے وارث، بے یار، بے سہارے اور بے مددگار عورتیں؛ بےشرم
بے لاج عورتیں، فقیرنیاں، بھک منگیاں؛ مارے ڈر کے سب خراب حال، شائستگی،
پاس لحاظ سب بالائے طاق۔

کمر جھکے بوڑھے بھی دوڑ رہے تھے، اور موٹے ہٹے کٹے بھی۔ ٹھگنے بھی لمبے بھی۔
خوبصورت بھی بدصورت بھی۔ طوائف خانوں کے مالک، مال گردی رکھنے والے، لوہار،
بڑھئی، بنیئے بقال، جیل خانوں کے منتظم، سربراہ کار، سلیقہ شعار بڈّے بڈّے خدمتگار،
اچھے کھاتے پیتے گرہست، لوگوں کو دھوکہ دے دیکر موٹے ہونے والے، معزز ٹھگ،
مقدس ڈاکو۔

سب کے سب دوڑ رہے ہیں۔ ایک پر ایک چڑھا جاتا ہے۔ بدن پر ہاتھوں
میں، سر پر، کپڑے گدڑے لدے ہیں۔ منہ سے لعاب نکل رہی ہے۔ خاموش اور
افسردہ گھروں سے ان کے چیخنے چلانے، رونے پیٹنے کی صدائے بازگشت اٹھ رہی
ہے۔ بتیرے ہیں کہ اپنا سارا مال اسباب لئے جارہے ہیں۔ کسی کی انگلیاں اپنے تکیے
ہی میں گڑی ہیں۔ کوئی اپنا صندوق گھسیٹ رہا ہے۔ کوئی زر و جواہر سے جد رہا ہے۔
کوئی اپنے بچوں کو کھینچ رہا ہے۔ ایک گھر سے جوتا پیٹتا نکلا، پھر لوٹا، سر پیٹنے لگا، اور پھر
سڑک پر دوڑا۔

مگر سب کو لوٹا دیا جاتا تھا۔ سب کو۔ انھیں کتے دوسرے نئے ان پر
بے دریغ گولی چلا رہے تھے: ان کا راستہ روک رہے تھے۔ ڈنڈوں سے خوب
پیٹ رہے تھے۔ گھونسے بھی مل رہے تھے، پتھر بھی۔ کوئی تو گر جاتا تھا اور دانتوں

کے استعمال کی نوبت بھی آجاتی تھی ۔ ایسا شور، ایسا ہنگامہ، الاماں ۔ آخر کو شہریوں کو لوٹنا پڑا۔ پھر گھروں کی طرف بھاگے اور میدان میں اپنے زخمیوں اور مردوں کو چھوڑ آئے ۔

شام ہوتے ہوتے شہر میں پھر کچھ یہ سکون سا ہو گیا ۔ روتے کانپتے لوگ گھروں کو واپس آئے اور اپنے بستروں پر پڑ پڑ کر سو گئے ۔ سر سب کے ایسے گرم تھے جیسے آگ جل رہی ہو۔ مگر ان میں تھوڑی دیر کے لئے امید کی جھلک پیدا ہو جاتی تھی ۔

سیدھی سادی کارروائی

"تمہارا نام ؟"

"بسو"

"عمر ؟"

"تمیس برس"

"پیشہ ؟"

"سگریٹ بناتا ہوں"

"سچ بولو! جی!"

"حضور، سچ عرض کرتا ہوں ۔ میں نے ایمانداری سے ۱۲ برس یہی کام کیا ہے اور اپنے بال بچوں کی پرورش کی ہے ۔"

"بال بچے کہاں ہیں ؟"

"یہ حاضر ہیں ۔ یہ میری بیوی ہے ۔ یہ میرا لڑکا ہے ۔"

"ڈاکٹر، بسو کے بال بچوں کا امتحان کرو ۔"

"جی، کر چکا ۔"

"پھر، کیا کہتے ہو ؟"

"شہری لیبو کے بدن میں خون کی کمی ہے۔ عام حالت اوسط۔ اس کی بیوی کو سر کے درد اور گٹھیا کی شکایت ہے۔ لڑکا تندرست ہے۔"

"اچھا، ڈاکٹر، تم جا سکتے ہو۔ شہری لیبو، تمہاری دلچسپیاں کیا ہیں؟ تمہیں کیا چیزیں پسند ہیں؟"

"مجھے سب آدمی پسند ہیں۔ زندگی پسند ہے۔"

"زیادہ واضح بات کرو۔ ٹھیک ٹھیک صراحت سے!"

"مجھے پسند .... ہاں، کیا پسند ہے؟ .... مجھے اپنے لڑکے سے محبت ہے .... وہ بڑی اچھی بانسری بجاتا ہے .... مجھے کھانا پسند ہے .... یہ نہیں کہ میں کوئی پیٹو ہوں .... مجھے عورتیں پسند ہیں ..... عورتوں اور لڑکیوں کو سڑک پر چلتے دیکھنا اچھا لگتا ہے ..... جب تھک کر شام کو گھر آتا ہوں تو آرام کرنا مجھے بھاتا ہے .... مجھے سگریٹ بنانا پسند ہے .... مجھے زندگی پسند ہے۔"

"بس بس سنبھلو۔ روں روں مت کرو ..... کیوں نفسی صاحب، آپ کیا کہتے ہیں؟"

"فضول بکتا ہے۔ کچرا ہے کچرا۔ نہایت معمولی ہستی۔ لغو مخلوق۔ طبیعت کچھ بلغمی کچھ دموی۔ چستی کم۔ درجہ: آخری۔ ترقی کی امید۔ مفقود۔ مجہولیت: ۵۰ فی صدی۔

شہری لیبو اس سے بھی پست۔ لڑکا بھی معمولی ہے مگر شاید .... کیوں جی، تمہارے لڑکے کی کیا عمر ہے۔ روں روں کیوں کرتے ہو؟"

"تیرہ برس"

"گھبراؤ مت۔ فی الحال تمہارا لڑکا زندہ رکھا جائیگا۔ سے تم ہو .... تیرے میں ہیں کام نہیں۔ آپ صاحبان فیصلہ صادر فرمائیں۔"

"عدالت عالیہ کی کمیٹی کی طرف سے جو حیات انسانی کو جمع اور منضبط کرنے کے لئے قائم کی گئی ہیں تم کو حکم دیتا ہوں۔ شہری لیبو اور تمہاری بیوی کو قتل دونوں

۲۴ گھنٹے کے اندر زندگی سے رخصت ہو لو۔ بس چپ رہو۔ چلاؤ مت۔ داروغہ صفائی، تم عورت کو چپ کرو۔ سنتری کو بلاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلا خارجی مدد کے تعمیل حکم نہیں کر سکیں گے۔"

فضول اور فالتو لوگوں کی خصوصیات

بھورا کمرہ

عدالت العالیہ کی غلام گردش میں ایک طرف کو ایک بھوری کوٹھری تھی ایک کوٹھری جیسی بہتیری کوٹھریاں ہوتی ہیں، چھوٹی جس میں دم گھٹے۔ لمبائی چوڑائی کوئی ڈھائی ڈھائی گز ہوگی، چھت بھی کچھ زیادہ اونچی نہ تھی۔ لیکن اسی چھوٹی سی کوٹھری میں کئی ہزار انسانوں کی قبر تھی۔ ایک الماری تھی جس پر موٹا موٹا لکھا تھا: "غیر ضروری آدمیوں کی فہرست"۔ اس فہرست کے کئی حصے تھے، منجملہ اُن کے ایک حصہ "بلا امتیاز اثر پذیر لوگوں" کے لئے تھا؛ ایک چھُٹ بھیئے طرفداروں کے لئے؛ ایک محبوبوں کے لئے؛ ایک توازن بگڑوں کے واسطے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہر شخص کی خصوصیت نہایت مختصر لکھی گئی تھی اور بالکل بے تعلقی کے ساتھ۔ بعض بعض کے متعلق بیشک ایک آدھ سخت بات درج تھی۔ لیکن ایسی عبارتوں پر بلا استثناء آگ نے سرخ پنسل سے نشان کر دئے تھے اور حاشیہ پر لکھدیا تھا کہ غیر ضروری لوگوں کو بھی خواہ مخواہ بُرا کہنا مناسب نہیں۔ غیر ضروری لوگوں کی مسلوں کے چند نمونے یہ ہیں:۔

غیر ضروری نمبر ۱۴۷۱

صحت: اوسط۔ اپنے جان پہچان کے لوگوں سے ملنے جاتا ہے، لیکن اُس کی صحبت سے نہ کسی کو فائدہ ہوتا ہے نہ دلچسپی۔ ہر بات میں ہر ایک کو صلاح و مشورہ ضرور

دیتا ہے۔ عنفوانِ شباب میں ایک لڑکی کو بھگا لایا تھا، پھر اُسے چھوڑ دیا۔ شادی کے بعد سامانِ آرائش کی خریداری اُس کے نزدیک زندگی کا سب سے اہم مقصد ہے۔ دماغ کند اور دُھندلا ہے۔ کام کی بالکل صلاحیت نہیں۔ جب پوچھا گیا کہ زندگی میں سب سے دلچسپ تجربہ کیا ہوا تو جواب دیا کہ پیرس کے ایک قہوہ خانہ میں جانا۔ نہایت معمولی درجہ کی مخلوق۔ سب سے نیچی تہ کا فرد۔ دل کمزور۔ ۲۴ گھنٹہ کے اندر۔

غیر ضروری نر نمبر ۲۳ ۱۴۶

ایک چھوٹی سی دوکان میں نوکر ہے۔ درجہ: متوسط۔ کام سے ذرا دلچسپی نہیں ہر کام میں بس وہ راستہ اختیار کرتا ہے جس میں سب سے کم دشواری ہو۔ جسمانی طور پر: اچھا۔ دماغی اعتبار سے اسی عام مرض کا شکار ہے: یعنی زندگی کا خوف، آزادی کا ڈر۔ جب چھٹیوں میں آزاد ہوتا ہے تو شراب سے اپنے حواس مختل کر لیتا ہے۔ انقلاب کے زمانہ میں ذرا جلدت بہت دکھائی تھی۔ ایک لال تسمہ بھی لگا لیا تھا اور حقیقۃً آلو اور قبا غلہ کہیں ملتا سب جمع کر رہا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں کھانے پینے کی چیزیں کم نہ پڑ جائیں اس پر فخر کرتا تھا کہ غریبوں کی اولاد ہے۔ خود انقلاب میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ مارے ڈر کے۔ کھٹی بالائی اسے پسند ہے۔ بچوں کو مارتا ہے۔ زندگی کی رفتار سست ہے۔ ۲۴ گھنٹہ کے اندر۔

غیر ضروری نر نمبر ۱۵۲۰۱

آٹھ زبانیں جانتا ہے مگر کہتا ہے کہ سب سے جی اُکتا گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ذہانت جتلاتا ہے۔ بہت بر خود غلط ہے۔ زبانیں جاننے پر بڑا گھمنڈ ہے۔ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی عزت کریں۔ گپ بہت لگاتا ہے۔ زندہ چیزوں کی طرف بے اعتنا ہے جیسے بیل کو ہو۔ نقیدوں سے بہت ڈرتا ہے۔ مکھیاں اور جھینگے مارنے کا بڑا شوق ہے۔ شاذ ہی اسے دلی خوشی حاصل ہوتی ہو۔ ۲۴ گھنٹہ کے اندر۔

غیر ضروری مادہ نمبر ۴۳۵۶

خواہ مخواہ نوکروں کو بُرا بھلا کہتی رہتی ہے۔ چھپکر دودھ پر سے بالائی اور شوربہ پر سے تار اُتار لیتی ہے۔ ہفتوں صوفہ پر پڑے پڑے گزار دیتی ہے۔ اس کی سب سے عزیز آرزو یہ ہے کہ اس کے پاس ایک چاکدار زرد آستینوں کا لباس ہو۔ بارہ برس تک ایک نہایت قابل موجد اس پر عاشق رہا۔ اور اسے اپنے عاشق کے شغل تک کا علم نہ ہوا۔ یہی سمجھا کی کہ کوئی بجلی کا کام کرنے والا ہے۔ اس غریب کو چھوڑ کر اس نے ایک چمڑے کے تاجر سے شادی کر لی۔ اولاد نہیں ہے۔ اکثر بلاوجہ تلون مزاجی کا اظہار کرتی ہے۔ رات میں سوتے سوتے اُٹھکر چار اور توس نبوا تی ہے۔ بالکل غیر ضروری ہستی۔ ۲۴ گھنٹہ کے اندر۔

ماہرین فن کی ایک فوج آک کے ساتھ عدالت العالیہ کی کمیٹی میں کام پر لگی ہوتی تھی۔ اس میں ڈاکٹر بھی تھے، ماہران نفسیات بھی، بڑے بڑے مبصر اور مشہور مصنف بھی۔ یہ سب بہت غیر معمولی رفتار سے کام کرتے تھے۔ بعض بعض موقعوں پر یہ ماہر گھنٹہ بھر میں سیکڑوں آدمیوں کو دوسری دنیا کی راہ بتلا دیتے تھے اور غیر ضروری انسانوں کی شلیں تھیں کہ بھوری کوٹھری میں بھری جا رہی تھیں۔ ان کاغذات میں بیان کی روانی کا مقابلہ اگر ممکن ہے تو مصنفین کے راسخ تیقن کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

صبح سے رات تک کام جاری رہتا تھا۔ گھروں پر جانے والے کمیشن آتے تھے اور جاتے تھے۔ احکام عدالت کو نافذ کرنے والوں کی ٹولیاں آتی تھیں جاتی تھیں۔ اور میزوں کے پیچھے درجنوں آدمی بیٹھے ہوئے نہایت تیزی اور بے تعلقی کے ساتھ لکھے جاتے تھے۔

آک ان سب کو اپنی چھوٹی چھوٹی تیز اور ناقابل فہم آنکھوں سے دیکھتا تھا اور کچھ سوچا کرتا تھا۔ اسی فکر میں اس کا بدن روز بروز جھلکتا جاتا تھا اور اس کے بڑے، جھلے، اور ضدی سر میں سفیدی کے آثار زیادہ نمایاں ہوتے جاتے تھے۔

رفتہ رفتہ اس کے اور اس کے ملازموں کے درمیان ایک دیوار سی پیدا ہو گئی ۔ جو اسکی اختر شماری، اسکی فکر، اور اس کے احکام کو نافذ کرنے والوں کی کور چشمی اور ان کے ہاتھوں کی بے تعلقی کے درمیان حائل ہو گئی ۔

آگ کے شبہات

ایک دن کمیٹی کے اراکین اپنے کمرہ میں اپنی رائیں سنانے کے لئے جمع ہوئے آگ اپنی روز والی جگہ پر نہ تھا ۔ بہت ڈھونڈھا کہیں پتہ نہ لگا ۔ انہوں نے ادھر ادھر آدمی دوڑائے، ٹیلیفون کئے مگر بے سود ۔ کوئی دو گھنٹے بعد اتفاق سے دیکھا تو یہ بھوری کوٹھری میں بیٹھے ہیں ۔ یہ کوٹھری میں غیر ضروری آدمیوں کی مسلوں پر بیٹھا تھا ۔ آنکھوں میں شدید تفکر کے آثار تھے جو خود آگ تک کے لئے بھی غیر معمولی سی چیز تھی ۔

سب نے پوچھا "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں ؟"

"دیکھتے ہو نہ کہ سوچ رہا ہوں" آگ نے تھکی ہوئی آواز سے جواب دیا ۔

"مگر یہاں اس کوٹھری میں کیوں ؟"

"یہی سب سے مناسب جگہ ہے ۔ میں آدمیوں کی بابت کچھ سوچ رہا ہوں اور اگر انسانوں کے متعلق کارآمد فکر ممکن ہے تو وہ انکی تباہی کے کلناموں کے قرب ہی میں ممکن ہے ۔ انسان کی تباہی کے دستاویزوں کے پاس بیٹھکر اس کی عجیب و غریب زندگی کے متعلق کچھ سیکھا جا سکتا ہے ۔"

کسی نے ایک سوکھا ٹھٹھا لگایا ۔

"ہنستے ہو ؟" آگ نے ہاتھ میں ایک مسل لیکر کہا "سنو مت میں سمجھتا ہوں کہ عدالت العالیہ کے خیال میں ایک تبدیلی پیدا ہو رہی ہے ۔ مرنے والوں کی مسلوں کو دیکھکر مجھے ترقی کے کچھ نئے راستے سوجھے ہیں ۔ تم سب نے تیزی اور صفائی سے مختلف ہستیوں کو

غیر ضروری قرار دے دینا سیکھ لیا ہے۔ تم میں سے ناقابل سے ناقابل چند جملوں میں یقین کے ساتھ یہ حکم لگا دیتا ہے۔ اور میں ہوں کہ یہاں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ آیا تمہارا یہ طریق درست بھی ہے؟"

آک پھر سوچتے سوچتے کچھ بہک سا گیا، ایک ٹھنڈی سانس لی، اور آہستہ سے کہا:
"کرنا کیا چاہیئے؟ اصل بات کیا ہے؟ اگر زندوں کی زندگیوں کو دیکھو تو نتیجہ نکلتا ہے کہ ان میں سے تین چوتھائی کو ختم کر دینا چاہیئے۔ مگر جب ان بڑھیاں کو جو مر گئے ہیں تو کچھ شبہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ان سے محبت کی جاتی اور ان پر رحم کیا جاتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ بس یہی مسئلہ انسانیت کی، اور تاریخ انسانیت کی اندھی گلی ہے۔"

آک پر ایک غم آمیز خاموشی طاری ہو گئی۔ اس نے مرے ہوؤں کی مسلوں کو پھر الٹ پلٹ کرنا شروع کیا اور ان کے تکلیف دہ اختصار پر غور کرتا رہا۔ عدالت کے اراکین چلے گئے۔ کسی نے آک کے خیال کی تردید نہ کی۔ اول تو اس لئے کہ آک کی تردید بیکار تھی، دوسرے اس لئے کہ کسی میں اس کی ہمت بھی نہ تھی۔ مگر سب نے یہ محسوس کر لیا کہ کوئی نئی تجویز پک رہی ہے اور سب اس سے غیر مطمئن تھے۔ موجودہ صورت کی انہیں عادت پڑ چلی تھی اور یہ تجویز تھی بھی نہایت واضح اور قطعی۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نئی صورت اختیار کی جانے والی ہے۔ مگر کیا؟ یہ کسی کو نہ معلوم تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس عجیب و غریب آدمی کا دماغ کیا نئی چیز نکالے گا، یہ جس کو اس شہر پر ایسا حیرت خیز تسلط حاصل تھا۔

آک غائب ہو گیا۔ یہ اس کی عادت تھی، جب کوئی خاص فکر ہوتی تو غائب ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے ہر جگہ ڈھونڈا پر نہ پایا۔ کسی نے خبر دی کہ آک شہر کے باہر بیٹھا رو رہا ہے۔ کسی اور نے خبر دی کہ آک اپنے باغ میں چاروں ہاتھ پاؤں پر جانوروں کی طرح چل رہا تھا اور مٹی منہ میں لے لیکر چبا رہا تھا۔

عدالت العالیہ کا کام ڈھیلا پڑ گیا۔ آک کے غائب ہونے سے کام میں وہ انہماک کہاں

رہ سکتا تھا۔ شہریوں نے اپنے دروازوں میں لوہے کی سلاخیں چڑھالی تھیں اور عدالت کے آدمیوں کو گھر میں گھسنے ہی نہ دیتے تھے۔ بعض محلوں میں تو عدالت کے سوال پر کہ تمہیں زندہ رہنے کا حق ہے یا نہیں لوگ ٹھٹھے لگاتے تھے۔ اور ایک جگہ تو یہ تک ہوا کہ لوگوں نے عدالت کے اراکین کو پکڑ کر ان کے حق زندگی کی تحقیقات کر ڈالی اور ان کی مسلیں تیار کر دیں جو کسی طرح بھوری کوٹھری والی مسلوں سے کم نہ تھیں۔

شہر میں پھر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ "غیر ضروری" شہری جن پر ابھی عدالت کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکی تھی ایسے مطمئن اور دلیر بن گئے تھے کہ خوب مزے سے سڑکوں پر اکڑتے پھرتے تھے ہر طرح کی دل لگی کرتے اور غضب یہ کہ شادیاں تک کر رہے تھے۔ لوگ راستوں میں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔ "شکر ہے، شکر ختم ہوئی مصیبت، ختم ہوئی۔" "حق زندگی کا امتحان خدا خدا کر کے ختم ہوا۔" "کیوں، میاں، سچ کہو، کیا واقعی زندگی زیادہ مزہ کی نہیں ہو گئی۔ انسانی کچرا پہلے سے کم ہے۔ اب آدمی ذرا اطمینان سے سانس تو لے سکتا ہے!"

"ارے، ارے، تمہیں شرم نہیں آتی؟ کیا سچ تم سمجھتے ہو کہ جن بیچاروں کو ختم کیا گیا ہے انہیں زندگی کا حق نہ تھا۔ اجی کیا کہتے ہو۔ میں کتنے ہی ایسے آدمیوں کو جانتا ہوں جنہیں ایک منٹ زندہ رہنے کا حق نہیں اور وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اور ذرا سوچو تو کتنے اچھے بھلے آدمی ختم کر دیئے گئے۔ اُفوہ۔ کاش تمہیں خبر ہوتی۔"

"یہ کیا بات ہے، غلطیاں تو لازمی ہیں۔ یہ تو کہو، کچھ آگ کی بھی خبر ہے۔"

"کچھ پتہ نہیں۔"

"سنا ہے کہ شہر کے باہر ایک درخت پر بیٹھا رو رہا ہے۔"

"نہیں جی۔ چاروں ہاتھ پاؤں پر جانوروں کی طرح چل رہا ہے اور مٹی چبا رہا ہے۔"

"رونے دو جی" "ہاں، ہاں، مٹی چبانے دو۔"

"شہریو۔ تمہاری یہ خوشی قبل از وقت ہے۔ سچ کہتا ہوں، قبل از وقت ہے۔ آگ آج شام کو آنے والا ہے اور عدالت کا کام پھر شروع ہو جائے گا۔"

"تمہیں کیا خبر؟"

"مجھے معلوم ہے۔ ابھی بہت سا کچرا باقی ہے۔ پوری پوری صفائی لازمی ہے۔ پوری پوری۔"

"بڑے بے رحم ہو، بھائی۔"

"دیکھو لوگو، دیکھو........ نئے اشتہارات لگ رہے ہیں۔"

"دیکھو تو...... کیسی خوش خبری، کیسی خوش قسمتی ہے۔"

"پڑھو، پڑھو"

"ذرا پڑھو تو"

"پڑھنا ذرا پڑھنا"

نئے اشتہار

آدمی چاروں طرف دوڑ رہے تھے۔ سانس پھولے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں لئی کی بالٹیاں تھیں، اور گلابی رنگ کے اشتہارات کے کٹے۔ اس کٹے سے اشتہار نکالکر خوشی خوشی مکانوں پر چسپاں کئے جا رہے تھے۔ ان کا مضمون بھی نہایت واضح، سادہ اور قطعی تھا:

سب کے لئے

بلا استثنا

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی سب شہریوں کو حق زندگی ملجائیگا۔ زندہ رہو، بڑھو، اور زمین میں پھیلو۔ عدالت العالیہ اپنا سخت فرض انجام دے چکی۔ آئندہ سے اس کا نام عدالت ترحمات عالیہ ہوگا۔ تم سب اچھے لوگ ہو اور تمہارا حق زندگی مسلّم۔ عدالت ترحمات عالیہ

تین تین اراکین کے خاص کمیشن مقرر کریگی جو روزانہ شہریوں کے گھروں پر جاکر انہیں مبارکباد دینگے اور اس پر ان کے خیالات جمع کرکے "خوشی کی مسلوں" میں شامل کریں گے۔

اس کمیشن کے اراکین کو شہریوں سے اُن کے طریقِ زندگی کی بابت مفصل سوالات کا اختیار ہوگا۔ اور شہری اگر چاہیں تو تفصیل سے جواب دے سکتے ہیں بلکہ یہی بہتر ہوگا۔ شہریوں کے مسرت خیز جواب مرتب کرکے ایک گلابی دفتر میں آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کردیئے جائینگے۔"

سارا شہر باغ باغ تھا۔ سارے دروازے، دریچے، کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ گھروں سے گانے بجانے، ہنسنے کھلکھلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ موٹی موٹی ہنس مکھ لڑکیاں بیٹھی پیانو بجاتی تھیں۔ صبح سے شام تک گراموفون چلتے ہی رہتے تھے۔ بانسریں، ستار، شہنائیاں سب بج رہی تھیں۔ شام کو لوگ کوٹ اُتار کر پیر پھیلا کر اپنے چھجوں پر بیٹھتے تھے۔ سڑکوں پر چہل پہل دیکھنے کی تھی۔ مٹھائی کی دوکانوں اور قہوہ خانوں میں مرد عورتوں کی بھیڑ تھی۔ کوئی مٹھائیاں اُڑا رہا تھا، کوئی ٹھنڈا شربت پی رہا تھا۔ بساطیوں کے یہاں جہاں آئینے بکتے تھے ایک ہجوم تھا۔ مرد عورت سب کے سب آئینہ خرید کر اپنا اپنا منہ دیکھ رہے تھے۔ مصوروں کے یہاں تصویروں کے بے تعداد آرڈر آرہے تھے۔ ہر شخص اپنی تصویر پر چوکھٹہ چڑھوا کر دیوار پر لگوا رہا تھا۔ ایک جگہ تو قتل ہی ہوگیا۔ جس کا اخباروں میں بڑا چرچا رہا۔ بات یوں تھی کہ ایک نوجوان نے کسی مکان میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ اور مالک مکان سے مطالبہ کیا کہ دیوار پر اُس کے ماں باپ کی تصویریں لٹکی ہیں وہ اُتار لے۔ مالک اور اُس کی بیوی اس پر بہت ناراض ہوئے۔ آخر کو بات بڑھی اور ان دونوں نے ملکر نوجوان کو مار ڈالا اور باغیچے میں خندق سے اُس کی لاش نیچے پھینکدی۔

احساسِ نفس اور خود پرستی کے جذبے بڑی ترقی پر تھے۔ جھگڑے ٹنٹے روز کا قصہ بن گئے تھے۔ ایسی باتیں ہر وقت سننے میں آتی تھیں: ٹھیک ٹھیک۔ تو بہت کوئی غلطی ہوگئی

کہ تم زندہ ہو۔ عدالت عالیہ نے اپنا کام بے پروائی سے کیا" "جی ہاں، بہت بے پروائی سے کیا، جبھی تو آپ جیسے جیتے پھر رہے ہیں۔" مگر روزانہ زندگی میں ان جھگڑوں کا کوئی زیادہ خیال نہ کرتا تھا۔ آدمیوں نے بہتر کھانا شروع کر دیا تھا۔ طرح طرح کے مربے بنتے تھے۔ گرم کپڑے کی مانگ بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ صحت کی بڑی قدر کرنے لگے تھے۔ عدالت ترحمات عالیہ کے اراکین روزانہ گھروں پر جاتے اور لوگوں سے دریافت حال کرتے تھے۔ اکثر کا جواب یہی ہوتا تھا کہ ہم بڑے مزہ میں ہیں۔ اور بہت سے اس کا ثبوت دینے پر بھی اصرار کرتے تھے۔ ..... بعض کچھ شکایت بھی کرتے تھے کہ عدالت العالیہ نے اپنا کام قبل از وقت ختم کر دیا۔ "کل شام میں ٹرام میں آ رہا تھا۔ اور غضب ہے خدا کا ایک جگہ بھی تو خالی نہ تھی۔ مجھے اور میری بیوی کو برابر راستہ بھر کھڑا رہنا پڑا۔ ابھی بہت سے غیر ضروری آدمی زندہ ہیں۔ قدم قدم پر سامنا ہوتا ہے۔ شیطان ان کی خبر لے۔ کیسا افسوس ہے کہ جب موقع تھا تو انہیں ختم نہیں کیا گیا"۔ بعض کو اور شکایتیں تھیں۔ مثلاً "ذرا دیکھو تو، کسی نے مجھے زندگی کی مبارکباد نہ دی، نہ بدھ کو، نہ جمعرات کو میں انتظار ہی کرتا رہا۔ عجیب لوگ ہیں۔ کیوں جی۔ کیا اب میں خود ان کے پاس جاؤں کہ مجھے مبارکباد دو؟"

خاتمہ

آگ کے دفتر میں حسب معمول کام جاری تھا۔ لوگ بیٹھے تھے اور لکھ رہے تھے۔ گلابی دفتر خوشی کی مسلوں سے بھر گیا تھا۔ ان میں نہایت تفصیل کے ساتھ لوگوں کی سالگرہ، شادیوں، سفر، دعوتوں، اور عشق و محبت کی روداد درج تھیں۔ بعض مسلیں تو ناول و افسانہ معلوم ہوتی تھیں۔ باشندوں نے درخواست دی کہ عدالت ترحمات عالیہ ان مسلوں کو کتابوں کی صورت میں شائع کر دے۔ جب شائع ہوئیں تو لوگوں نے خوب پڑھیں۔ ادھر آگ پر خاموشی طاری تھی۔ بس روز بروز کم جھک رہی تھی، سر سفید ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی یہ گلابی دفتر میں جاتا اور

گھنٹوں وہاں بیٹھا رہتا جس طرح پہلے بھوری کوٹھری میں بیٹھا کرتا تھا۔

ایک دن ایک چیخ مار کر گلابی دفتر سے نکلا "ان کو ختم کرنا ضروری ہے۔ ان کو قتل کرنا۔ ان کو مار ڈالنا چاہئے۔" مگر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے نوکر اپنی سفید سفید انگلیوں سے اب اُسی تیزی کے ساتھ زندوں کا حال کا غذ پر لکھ رہے ہیں جیسے پہلے مُردوں کا لکھتے تھے تو اُس نے عجیب طرح سے اپنا ہاتھ ہلایا اور دفتر سے باہر بھاگ کر غائب ہو گیا۔ اور ہمیشہ کے لئے ہی غائب ہو گیا۔

آک کے غائب ہونے کی بابتہ سیکڑوں افسانے نکلے اور طرح طرح کی افواہیں مشہور ہوئیں مگر آک کا پتہ پھر نہ چلا۔

اور وہ کثیر التعداد انسان جنہیں آک پہلے ختم کرنا چاہتا تھا، جن پر بعد کو اسے رحم آگیا تھا اور تھوڑے دن بعد اس نے جنہیں قتل کرنے کی پھر ٹھانی تھی، وہ انسان جنہیں بہت سے اچھے لوگ بھی تھے اور بہت کچھ غیر ضروری کچرا بھی وہ انسان آج تک زندہ چلے جاتے ہیں۔ جیسے کبھی آک تھا ہی نہیں، جیسے کبھی ان کے حق زندگی کا سوال ہی کسی نے نہ اٹھایا تھا۔

غزل

(از حضرت جگر)

اک مے بے نام جو اس دل کے پیمانے میں ہے
وہ ترے شیشہ میں ہے ساقی نہ پیمانے میں ہے

پوچھنا کیا کتنی وسعت میرے پیمانے میں ہے
سب الٹ دے ساقیا جتنی بھی میخانے میں ہے

ایک ایسا راز ہی دل کے نہاں خانے میں ہے
لطف جس کا کچھ سمجھنے میں نہ سمجھانے میں ہے

یوں تو ساقی ہر طرح کی تیرے میخانے میں ہے
وہ بھی تھوڑی سی جو ان آنکھوں کے پیمانے میں ہے

ایک کیف ناتمام درد کی لذت ہی کیا
درد کی لذت سراپا درد بن جانے میں ہے

غرق کر دے تجھکو زاہد تیری دنیا کو خراب
کم سے کم اتنی تو ہر میکش کے پیمانے میں ہے

شیشہ مست و بادہ مست و عشق مست و حسن مست
آج پینے کا مزا یکسر بہک جانے میں ہے

تجھکو اے جذب طلب حسن ازل ہی کی قسم
دیر کتنی دل پہ اک تصویر اترانے میں ہے

حسن کی ایک ایک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گذر جانے میں ہے

منتشر کر دے اسے بھی حسن بے پایاں کیا تھا
زندگی شیرازۂ دل کے بکھر جانے میں ہے

اٹھ گیا کافر جگر سا کیا کوئی پھر حق پرست
حشر ہے کعبہ میں برپا شور بتخانے میں ہے

غزل فارسی

(از حضرت اصغر)

زفیضِ ذوقِ رنگیں صد بہارے کردہ ام پیدا
زخونِ دل کہ می جوشد نگارے کردہ ام پیدا

بے روحانیاں را در کمندِ شوق آوردم
بہ اوجِ عرشِ اعلیٰ ہم شکارے کردہ ام پیدا

زموجِ خونِ دل صد بار من رنگیں قبا گشتم
بخاکِ کربلا ہم صد بہارے کردہ ام پیدا

ز "لا" تسخیر کردم ایں جہانِ ماہ و انجم را
زجوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

بلے از جلوۂ حسنت جہاں یکسر نمی ماند
بیا اکنوں کہ خود را پردہ دارے کردہ ام پیدا

جہانے را تپش بخشم، جہانے را بوجد آرم
دریں خاکسترے حسن شرارے کردہ ام پیدا

من مسلم چہ مسلم؟ آنکہ او را زندیگوید
پس از عمرے ہمی زنار دوشے کردہ ام پیدا

جہانِ مضطرب را پرسکوں دانی نمی دانی
چہ ساں در بیقراری ہا قرارے کردہ ام پیدا

مگر اے پیرو خسرو زجنونِ من نمی دانی
پس محمل نشینے صد غبارے کردہ ام پیدا

من از رنگِ وجودِ خویش تنہا نقشہا بینم
برائے جان بیخود ستائے کردہ ام پیدا

شذرات

۱۹۲۹ء بھی ختم ہوگیا۔ سال کے ختم پر عموماً ادارے اپنے کام کا محاسبہ کرتے ہیں، ان مفید کاموں کو گنواتے ہیں جو انکے ہاتھوں گذشتہ بارہ مہینے میں انجام پائے، دبی زبان سے اپنی خامیوں کا ذکر بھی کردیتے ہیں شاید اس لئے کہ اس سے ان کی خدمات ذرا اور چمک جاتی ہیں، اور پھر آئندہ سال کے متعلق وعدے کرتے اور اپنے ارادوں کا اعلان کرتے ہیں۔ جامعہ والے اپنی خدمات کیا گنوائیں؟ اگر ان سے کوئی خدمت بن پڑی تو اللہ کا احسان ہے۔ سچی خدمات کا سچا اجر اسی کے یہاں سے ملتا ہے۔ اگر ہم میں خامیاں ہیں (اور اس دنیا میں ان خامیوں کا خود جامعہ والوں سے زیادہ کسے احساس ہوگا) تو ہم انہیں سب کے سامنے بیان کرکے اپنے دل کے بوجھ کو کیوں ہلکا کریں، خدا کرے اگلے سال ہماری زندگیاں پچھلے سال سے بہتر، ہماری خدمت زیادہ پرخلوص، ہماری فکر زیادہ حق پسند، ہماری نظر زیادہ پاک بیں ہو۔ آئندہ کے لئے وعدے ہم کیا کریں اور کیسے کریں؟ اپنی خامیوں کے بھروسہ پر؟ اپنی قوم کی بے اعتنائی کے زعم پر؟ تنگ نظر خیر خواہوں اور تنگ دل مخالفوں کے اعتماد پر؟ نہیں۔ نہ ہم اپنی خدمات کی اہمیت جتانا چاہتے ہیں، نہ اپنی غلط اندیشیوں اور خامکاریوں کا اعلان کرکے اپنی ذمہ داری کو کم کرنا چاہتے ہیں، نہ ہم بڑے بڑے وعدے کرکے اپنے ہمدردوں کے لئے اس وقت خوشی لیکن بعد کو مایوسی کا سامان مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہماری خدمات کی قدر کرنا چاہے یا بے قدری وہ خود انہیں معلوم کرے۔ جس کا دل ہماری خامیوں پر دکھتا ہو اور وہ انکی اصلاح میں ہماری مدد کرنا چاہے اسے ہماری کھلی ہوئی برائیاں تو معلوم ہی ہوسکتی ہیں، وہ جو اسے معلوم نہیں وہ بھی اس پر دیانت داریا نداری سے ظاہر کردی جائیں گی؟ اور جس کا جی ہماری برائیوں اور ان کی تشہیر سے خوش ہوتا ہوا سے

اسے اپنی خوشی کے وسائل اپنی ہی محنت سے تلاش کرنے چاہئیں۔ ہم سال کے ختم پر جب اپنا
اور اپنے کام کا محاسبہ کرتے ہیں تو ہماری گردن اس کے دربار میں جھک جاتی ہے جس کی
منشا کی تلاش اور جس کی رضا کی طلب ہمارے وجود کی غایت ہے۔ اسی کے سامنے اپنی کوتاہیوں
کا اقرار صراط مستقیم کے ملنے کا وسیلہ ہے اور اسی کے منشا کی تکمیل اصلی ندامت۔ آئندہ کے وعدے
اور ارادے بھی اس کے سامنے پیش کرتے ہیں جس کے سامنے ہماری روحیں ایک جانے
سوال کے جواب میں نہ جانے کب کی "بلا" کہہ چکی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ جامعہ کو اس کا
کام بنائیں۔ وہی اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حسبنا اللہ و نعم الوکیل

اس سال ہندوستان کی سیاسی زندگی کا سب سے اہم واقعہ کانگریس کا وہ رزولیوشن ہے
جس میں ملک کی سیاسی جد و جہد کے مقصود "سوراج" کی وضاحت کردی گئی ہے اور اس کے معنی
کامل خود مختاری مقرر کیے گئے ہیں۔ ملک کے اخباروں اور دوسری سیاسی انجمنوں و جلسوں
کے مباحثوں میں اس کی وجہ سے کامل آزادی اور ڈومینین سٹیٹس کی حیثیت کے فرق اور ان کے
اعتباری محاسن و معائب کا سوال بہت اہم بن گیا ہے۔ حالانکہ اس کی کچھ زیادہ ضرورت نظر
نہیں آتی۔ دنیا کی ہر قوم کا حق ہے کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی روایات اور اپنے مخصوص
حالات کے اعتبار سے ترقی دے۔ متمدن دنیا ہر قوم کے اس حق کو نظری حیثیت سے تسلیم
بھی کرچکی ہے۔ سب مانتے ہیں کہ تمدن انسانی کا گلدستہ اپنے کمال حسن کو اسی وقت پہنچ سکتا ہے
جب اس کا ہر پھول اپنی تاریخ اور روایات کی سرزمین سے کسب فیض کرکے پوری شادابی حاصل
کرے اور اپنے اندر اپنے مخصوص رنگ و بو کے اعتبار سے کمال پیدا کرے۔

ہندوستان میں آزادی کی جو تحریک آج تقریباً پچاس سال سے جاری ہے [illegible] کے

سامنے ابتک یہ ابتدائی حقیقت نہ تھی؟ پھر وہ کیوں ابتک "ڈومینین" جیسے مرتبہ سے زیادہ کا
مطالبہ نہ کرتا تھا؟ ہوسکتا ہے کہ کمزوری کے باعث، ممکن ہے اپنی بزدلی کیوجہ سے۔ یا ضرورت
زمانہ اور مصلحت وقت کا لحاظ کر کے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب چیزیں بھی اس ظاہری اعتدال
مطالبات میں شامل تھیں لیکن ہندوستانی آزادی کے مجاہدوں میں سب کے سب تو کمزور،
بزدل، صرف مصلحت اندیش اور ابن الوقت نہ تھے۔ نہ آج بظاہر ان میں کسی مخصوص عزم و
شجاعت کا ظہور ہو گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر محکوم قوم جب وہ اپنی محکومیت کے معنی کو جان جاتی ہے
تو آزادی ہی کی طالب ہوتی ہے اور آزادی "کامل" ہی ہوتی ہے۔ اسکے ٹکڑے کرنا مشکل ہے
اور اس کی تفصیل متعین کرنا ممکن نہیں۔ اسلئے ہندوستان نے بھی جس دن سے اپنی محکومیت
کی ذلت کو محسوس کیا اس وقت سے آزادی کا مطالبہ شروع کیا اور ہمیشہ اسکا مطلب کامل
آزادی تھا۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ و روایات کی حقیقی روح یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں اختلافات
کو رفع کر کے ہم آہنگی پیدا کرے۔ کل کی بھلائی کے آگے جزو کا دھیان نہ کرے۔ ہندوستان
کی سیاست میں اسکی اس تمدنی روح اور مسلمانوں کے اس عقیدہ نے کہ قوم، نسل، ملک کا
امتیاز حیات انسانی کے ارتقاء صحیح کا دشمن ہے ہمیشہ اس کے مفکرین کو تنگ نظری اور
یورپ جیسی انسانیت دشمن قوم پرستی سے بچایا ہے۔ اس لئے اس کے ان مجاہدین راہ
حریت نے بھی جو کلمہ حق زبان سے نکالکر قید و بند کی صعوبتوں کے برداشت کرنے کے لئے
آمادہ تھے کبھی آزادی کے یہ معنی نہیں سمجھے کہ ساری دنیا سے الگ، سب ملکوں سے بے تعلق
ہندوستان اپنی سیاسی زندگی کا ڈھچر کھڑا کرے۔ انہوں نے اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں
کرنی چاہی کہ دنیا میں الگ الگ قوموں کے دن ختم ہو گئے اور معیشت و صنعت کے
انقلابات عظیم نے اتحاد اقوام کو حیات عالم کے لئے لازمی بنا دیا ہے۔ اور وہ اس حقیقت کو
کس طرح بھولتے؟ ان میں خود وہ لوگ شامل تھے جو اتحاد دول اسلامی کے لئے کوشاں تھے۔
وہ شامل تھے جو اتحاد ایشیا کے خواب کی تعبیر اپنی جد و جہد سے کرنا چاہتے تھے اور رہال

وہ بھی تھے جو آزاد قوموں کے اس اتحاد کو جس نے صرف مصر اور ہندوستان کے ساتھ انصاف نہ کرکے اپنے نیک نام کو بٹہ لگایا ہے۔ یعنی سلطنت برطانوی کو سیاست عالم میں ایک مفید جمعیۃ اقوام سمجھتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ اگر ہندوستان اور مصر کے ساتھ بھی یہ جمعیت وہی رویہ اختیار کرے جو اس نے اپنی نوآبادیوں کے ساتھ کیا ہے تو یہ جمعیۃ دنیا کے لئے سیاسی رحمت ثابت ہوسکتی ہے۔ اسلئے کہ حقیقی طور پر آزاد قوموں اور ملکوں کا ایسا اتحاد جو اشتراک مقاصد کی وجہ سے اس درجہ مستحکم ہو دنیا کی تاریخ نے آجتک نہیں دیکھا لیکن اسکے افادہ اور اس کے استحکام کی شرط اصلی یہی ہے کہ اسکا ہر رکن پورا پورا آزاد ہو کہ جب چاہے اس جمعیۃ کو چھوڑ دے اور جبتک رہے اشتراک مقاصد کی وجہ سے ساری ذمہ داریوں میں برابر کا شریک ہو۔ سلطنت برطانوی میں مصر اور ہندوستان کے علاوہ اور کونسا حصہ ہے جسے برطانیہ آج بجبر اپنے ساتھ رکھ سکتا ہو؟ کنیڈا آج چاہے تو بلا اسکے خون کا ایک قطرہ گرے ریاستہائے متحدہ امریکہ کا جزو بنجائے۔ اور دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ اور کنیڈا دونوں کی طرف سے اس قسم کے اتحاد کی کوششیں ہو رہی ہیں لیکن کیا کوئی برطانوی مدبر خواب میں بھی یہ خیال کرسکتا ہے کہ اس اتحاد کو بجبر روکا جائے۔ نہیں۔ برطانیہ کنیڈا کو صرف باہمی اشتراک مقاصد اور اس کے مفاد ملی کا یقین دلا کر ساتھ رکھ سکتی ہے۔

غرض ہندوستان کی آزادی خواہ جماعت نے اگر ایک ڈومینین جیسے مرتبہ کو اپنی سیاسی جدوجہد کا مقصد قرار دیا تھا تو کمزوری اور بزدلی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے قومی روایات اور تاریخ عالم کے رجحانات کو پیش نظر رکھ کر ایسا کیا تھا۔ اسلئے کیا تعجب ہے کہ جب لارڈ ارون کے مشہور اعلان سے یہ توقع قائم ہوئی کہ انگلستان اس کے لئے آمادہ ہے کہ ہندوستان کو بھی اس جمعیتہ اقوام میں جس کا نام سلطنت برطانوی ہے برابر کے شریک کی حیثیت سے شامل کرے تو وہ اس کی طرف بھوکوں کی طرح دوڑ پڑے۔ مگر جب بعد کو معلوم

ہوا کہ ہندوستان کے لئے ڈومینین والا مرتبہ کچھ اور ہی ہے، اور وزیر ہند نے بتلا دیا کہ ہندوستان کو تو بڑی حد تک یہ مرتبہ حاصل ہی ہو چکا ہے تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے۔ اس لئے کہ جو ہمیں حاصل ہے اسکا حال تو ہم سے بہتر اور کون جانتا ہے۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ کانگریس نے لفظ سوراج کے معنی کامل آزادی، متعین کر دئے۔

کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کسی حالت میں سلطنت برطانیہ کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی منفی پابندی کا تحمل اس کی کامل آزادی کا تصور نہیں کر سکتا۔ کامل طور پر آزاد ہندوستان ممکن ہے کہ آج بھی سلطنت برطانیہ کا رکن بننے پر آمادہ ہو جائے بشرطیکہ وہ ویسا ہی رکن ہو جیسے کنیڈا ہے جیسے جنوبی افریقہ اور اسٹریلیا ہیں۔ اگر انگلستان اسکے لئے تیار ہے تو ہندوستان کی طرف سے غالباً کبھی صلح کا دروازہ بند نہ ہوگا لیکن اگر ایسا نہیں تو ڈومینین مرتبہ کا ذکر دھوکا ہے اور رہا نگر سیاست میں کون دھوکا کھاتا ہے

ہم جانتے ہیں کہ ہم نے کامل آزادی کے متعلق جو لکھا ہے کانگریس کے ذمہ دار لوگوں کا بھی یہی خیال ہے لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری سیاست ملکی میں ایک ایسا گروہ کا اثر روز بروز بڑھ رہا ہے۔ جو تحریک سیاسی کو ایک خاص قسم کے جماعتی انقلاب کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے۔ اس جماعتی انقلاب کے مقاصد اگرچہ ابھی متعین نہیں ہیں لیکن ہوا کا رخ بتلاتا ہے کہ اس آندھی کے جھونکے روس کی طرف سے آرہے ہیں ہمارے نزدیک مفکرین سیاسی کا فرض ہے کہ روس کے معاملات کا غور سے مطالعہ کریں۔ اسلئے کہ ہمارے خیال میں انقلاب روس تاریخ انسان کی سب سے عبرتناک ٹریجڈی ہے۔ اسکے بعض مفید نتائج سے انکار ممکن نہیں لیکن اسکی بنیادی غلطی سے انکار بھی اسی قدر مشکل ہے۔ زندگی کی گوناگونی کو کسی ایک کٹے چھنٹے منطقی اصول کے تحت لے آنیکی سعی ناکام، ملکیت شخصی کو مٹانے کے لئے اٹھنا اور نہایت وسیع پیمانے پر ملکیت اراضی کے حق قائم کرا دینا۔ آزادی کے لئے انقلاب کرنا اور کروڑوں انسانوں کی آزادی ضمیر تک چھین لینا فرقوں کے امتیاز کو مٹانیکا دعوے کرنا اور آج دس سال گذر جانے تک ان نوجوانوں کو مدرسوں تک